علی گڈھ منتھلی

جلد ۴ } بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۰۶ ع { نمبر ۵

فہرست مضامین حصہ اُردو

ALIGARH MONTHLY.

Annual subscription: Rs. 4. Post free.

Advertisement Rates :

One page per year	... ...	Rs. 32	0 0
" " " six months	... ...	" 18	0 0
" " " three months	... ...	" 10	0 0
" " " one month	... ...	" 4	0 0

Half page—Half the above rates.

شرح چھپائي اشتہارات حصه اُردو

ايک صفحه	واسطے ايک سال	۲۴ روپيه
"	واسطے نصف سال	۱۳ روپيه
"	واسطے تين ماه	۷ روپيه
"	واسطے ايک ماه	۲ روپيه ۸ آنه

نصف صفحه کے ليئے مذکوره بالا شرح کا نصف ليا جاليگا اور نصف صفحه سے کم هونيکي صورت مين بهي نصف صفحه کي اُجرت ليجاليگي۔ اُجرت هميشه پيشگي وصول هوگي —

ولايت حسين انريري منيجر

عليگڑه منتهلي مدرسة العلوم عليگڑه

چیزیں مثل مشک۔ زعفران وغیرہ کے غربا کو تقسیم کرتے تھے۔ جدید تعلیم کے رواج سے اس دستور میں کمی ہی۔

(۴) پڑہانا۔ پہلے زمانہ میں بڑے بڑے معزز عہدہ دار اپنے قیمتی وقت میں سے چند گھنٹے نکالکر طلبہ کو باقاعدہ درس دیتے تھے اور انکے رہنے اور کھلانے کا بھی کچھ انتظام کرتے تھے۔ اور اسے بہت ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ اب غربا کو درس دینے کا دستور نہیں رہا۔ البتہ کالجوں میں وظائف دیکر پڑہانے کا دستور ہوتا جاتا ہی۔ مگر وظائف وغیرہ کے لیے جس شکل سے چندہ وصول ہوتا ہی اُسکا حال وصول کرنے والے بتا سکتے ہیں

ایک خاص بات یہ ہی کہ سابق میں اکثر پہلے کام منفرداً کیے جاتے تھے اور مذہبی اور ثواب کے کام سمجھ کر کیے جاتے تھے۔ اب اُنھوں نے پنچایتی شکل اختیار کرلی ہی اور ایسے کام عام چندہ سے قومی اور ملکی مفاد کی غرض سے کیے جاتے ہیں۔ اس ذریعہ سے ملکر کام کرنے کا شوق بڑھتا جاتا ہی اور ملکر کام کرنے کی عادت ہوتی جاتی ہی۔ ہر شخص اہم معاملات میں رائے زنی کرنے کی جرات کرتا ہی اور اُسے زور کے ساتھ پیش کرتا ہی جو فی الجملہ انسانی ترقی کے لیے مفید ہی۔ مگر فی الحال اس میں ایک نقص بھی ہی۔ وہ یہ کہ ہر شخص اخبارات کے ذریعہ سے پبلک کے سامنے نئی تجویزیں پیش کرتا ہی۔ اور چاہتا ہی کہ فوراً انپر عملدرآمد شروع ہوجاے۔ اور جب نہیں ہوتا تو معدودے چند لوگوں کو جو اپنا زیادہ وقت قومی کاموں میں صرف کرتے ہیں اور متفقہ تجاویز کو عملی شکل میں لانے کی دُھن میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ بُرا بھلا کہتا ہی اور انھیں لیڈر کہکر چڑاتا ہی۔ اصل یہ ہی کہ ہر شخص کے دماغ میں ہر قسم کے خیالات اور خاص قسم کی تجاویز موجود ہوتی ہیں اور اس سے کوئی فرد خالی نہیں۔ یہ تجویزیں کچھ ذاتی اور کچھ قومی منفعت کی ہوتی ہیں۔ کثرت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کی تجاویز کو بھی عمل میں لانے کی قابلیت نہیں رکھتے اور دنیا سے اپنے خیالات اپنے ساتھ لیجاتے ہیں۔ انمیں سے قوی تر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کی تجویزوں کو عملی صورتوں میں لاتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ قوی وہ لوگ ہوتے ہیں جو بنی نوع انسان کے فائدوں کی تجویزوں کو عملی شکل میں لاتے ہیں اور اپنی

قوت سے ایک بڑی جماعت کے دماغوں کو اپنا دماغ۔ اُنکے دلوں کو اپنا دل۔ اُنکے ہات پاؤں کو اپنے ہات پاؤں بنا لیتے ہیں اور اُنکے ذریعہ سے اپنے ارادوں کو پورا کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہی کہ ہر شخص کو اپنی خاص تجویز سے قدرتی طور پر جو دلچسپی ہوتی ہی وہ دوسرے کو ہرگز نہیں ہوسکتی۔ ہر شخص کی تجویز مثل اُس کی اولاد کے ہی۔ اسلیے جس طرح ہر انسان کا فرض ہی کہ اپنی اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا انتظام بقدر امکان خود کرے۔ امکان سے باہر ہو تو البتہ مجبوری ہی۔ اسی طرح ہر مجوز کا فرض ہی کہ سب سے اول اپنی تجویز کو سرسبز کرنے کی کوشش کرے۔ اور خود کچھ کیے بغیر دوسروں کی بے اعتنائی اور غفلت کی شکایت نہ کرے۔ موجودہ انقلاب سے جو جدید اثر سے اس ملک میں ہوا ہی عام بھلائی کے کاموں پر غور کرنے۔ اُن پر بحث و مباحثہ کرنے۔ کام کرنے والوں کی غفلت پر ملامت کرنے۔ گورمنٹ کے طرزعمل پر اعتراض کرنے کی عادت تو کافی سے زیادہ ہوگئی ہی مگر خود کچھ کرنے کی عادت اتنی بھی نہیں رہی جتنی اُن لوگوں کو تھی جنھیں اب ہم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جو ایسے زمانہ میں جبکہ محض مضمون نگاری سے ملک میں شہرت نہو سکتی تھی۔ اور جبکہ چندوں کا اعلان اخبارات کے ذریعہ سے نہو سکتا تھا۔ بھوکوں کو کھانا۔ مریضوں کو دوا۔ اور طلبہ کو سبق دیتے تھے۔ اپنے عزیزوں اور ہمسایوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے۔ یہی وجہ ہی کہ مخلوق کی بھلائی کے چھوٹے چھوٹے کام جن کی اوپر تفصیل ہوئی اور جو ہر شخص بقدر امکان کرسکتا ہی بند ہوتے جاتے ہیں۔ ہر شخص چاہتا ہی کہ کام کرنے سے پہلے ملک میں اُس کی شہرت ہو۔ اُس کی تجاویز مقبول ہوں اُسکے نام سے کوئی اسکیم موسوم ہو اُسکے ہات میں کوئی مد ہو اور ہر شہر میں بجز خاص اُسکے مسکن کے اُسکی شاخیں ہوں۔ یہ ایک ایسی غلطی ہی جس سے اسپنسر صاحب کے مقولے کے موافق ایک نہ ایک دن ہم ضرور نکلینگے۔ مگر جب تک نہیں نکلتے تب تک ہمارے پریشان اور ناکام رہنے میں کچھ شبہہ نہیں اسلیے ضرورت ہی کہ ہر شخص اپنی طاقت اور حیثیت کے مطابق تنہا یا ملکر کچھ کرے۔ یہ ضرور نہیں کہ ہر جگہ کوئی سوسائٹی قائم ہو یا کچھ لوگ ہم خیال ہوں تب ہی کوئی مفید کام ہوسکے۔ پہلے نیک کام اگر قابل ترمیم ہیں تو اُنھیں ترمیم کرو۔ اور قابل منسوخی ہیں تو بیشک اُنھیں منسوخ کردو۔ مگر اُن کی جگھ

دوسرے چھوٹے چھوٹے قابل عمل کام ضرور تجویز کرو۔ یہ نہیں کہ قومی یونیورسٹی بنجانے اور گورنمنٹ میں کچھ رزولیوشن منظور ہوجانے اور چند خیالی تجاویز کے شکل پذیر ہونے کے انتظار میں ہات پر ہات رکھے بیٹھے رہو۔

یہ امر مسلم ہی کہ اس ملک کے ادبار کا باعث جہالت ہی جسکو دور کرنے کی ہر طرف کوشش ہورہی ہی۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں کہ اعلے تعلیم کے کاموں میں کوشش کرنے کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ملک میں روشن خیالی پھیلانے کا نہیں ہی کسی متفقہ تعلیمی کام میں سال بھر میں کچھ چندہ دیکر یا دلا کر ہم اپنے قومی فرض سے سبکدوش نہیں ہوسکتے اور نہ قوم کو معتد بہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں جب تک کہ اپنے عزیز وقت کا کچھ حصہ مثل اپنے بزرگوں کے بھلائی کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں صرف نہ کریں اور اپنے سے کمتر لوگوں کی حالت بہتر کرنے کی کوشش نہ کریں۔

اُمرا اور غربا کے درمیان جو تفریق اس زمانہ میں ہوتی جاتی ہی وہ بھی ہماری ترقی میں ایک سدراہ ہی۔ پہلے زمانہ میں عبادت گاہوں۔ مذہبی مجمعوں۔ عُرسوں۔ مجالس عزا و میلاد شریف وغیرہ میں اُمرا و غربا کو اکثر یکجا جمع ہونے کی نوبت آتی تھی۔ مگر ان مجمعوں کے قائم مقام ملکی اور قومی مفاد کی غرض سے جو کانفرنسیں اور کانگریسیں قائم ہوئی ہیں اُن میں بجز خدمتگاروں کے عوام الناس کی شکل بھی نظر نہیں آسکتی۔

یورپ اور امریکا اور دوسرے ملکوں میں جو اسوقت ترقی پر ہیں لباس اور طرز معاشرت کا چونکہ ایک معیار قائم ہوچکا ہی اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے اس سے بہتر کوئی اور طرز معاشرت نہیں ہوتا جسے وہ اختیار کریں اور بجز زیادتی معلومات کے اور کسی امر میں وہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے مختلف نہیں ہوتے اس لیے اُن سے غیر مانوس ہونے۔ اُنسے ملنے جلنے اور تعلقات رکھنے سے گریز کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی اور قدرتی طور پر اُنکے علم و اخلاق اور صحبت سے اُنکے اہل ملک کو نفع پہنچتا ہی برخلاف اسکے ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ اور اہل دول کے سامنے حکمراں قوم کا طرز معاشرت موجود ہوتا ہی جسمیں ہر اعتبار سے کشش ہی اور جس میں تعلیم کے زمانہ میں اُنکا نشو و نما ہوتا ہے

ایک مہذب قوم کا طرز معاشرت ہونے سے اگرچہ اُس میں خوبیاں ہیں اور اگرچہ وہ آگے چلکر ملک کے لیے مفید ثابت ہو مگر فی الحال اُس میں یہ نقص ہی کہ اُسے اختیار کرنے کے بعد ہمارے نوجوانوں اور عام لوگوں میں بہت کم باتیں مشترک رہجاتی ہیں۔ اور وہ اپنے حالات کے لحاظ سے ایسے پیشے اختیار کرنے پر مجبور رہیں جنکا تعلق سلطنت سے ہی اسلیئے وہ عوام الناس سے علیحدہ رہنے پر ذاتی طور پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور اپنے سے کمتر لوگوں کو کماحقہ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ بلاشبہ یہ شکایت اُسوقت رفع ہوجائیگی جب ملازمتیں نہ ملنے سے دوسرے پیشوں میں بھی تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت ہوجائیگی مگر جب تک یہ نقص رفع ہو اور لکھے پڑھے لوگ مثل اپنے بزرگوں کے جاہل لوگوں کی حالت بہتر کرنے کی طرف متوجہ نہوں تب تک ہمارے ملک کے بدقسمت ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔

یہ ضرور نہیں کہ پہلے لوگوں کی طرح ہم گھنٹوں طلبہ کے ساتھ مغز زنی کریں اور انھیں جید عالم بنانے کی کوشش کریں۔ اس زمانہ میں اعلے تعلیم جسقدر گراں اور مشکل ہی ادنی تعلیم اُسیقدر ارزاں اور سہل ہی۔ عام واقفیت کی مفید باتیں دیسی زبانوں میں کثرت سے ترجمہ ہوگئی ہیں۔ کثرت سے چھوٹے چھوٹے مفید رسالے ملک میں رائج ہوگئے ہیں۔ دیسی زبان کے اخبارات ہر شہر سے نکلتے ہیں۔ ایک محض ناخواندہ شخص اپنی دیسی زبان کے حروف اور الفاظ سے چند مہینوں میں واقف ہوسکتا ہی اور اگر اس کی رہنمائی کیجاے تو مفید معلومات کی چھوٹی کتابیں پڑھ کر کام کا آدمی بن سکتا ہی

یورپ میں سُنا ہی کہ ہر پیشہ ور اور ہر مزدور کتابیں اور اخبار پڑھتا ہی وہ زمانہ کی ضروریات سے واقف ہی اُسے ترقی کا راستہ معلوم ہی۔ یہی وجہ ہی کہ اُس ملک میں ان ہی حرف شناس دوکانداروں مزدوروں اور کاریگروں میں سے ملک التجار اور بڑے بڑے موجد اور نامور لوگ ہوجاتے ہیں جنکے حالات بڑے شد ومد سے اخبارات میں مثالاً پیش کیے جاتے ہیں

مگر ہندوستان کے تیس کروڑ آدمیوں میں صرف دس بارہ لاکھ ایسے بیان کیے جاتے ہیں جو اخبارات اور کتابیں پڑھتے ہیں۔ نہیں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہی جو قانون پیشہ ہیں یا سرکاری

اور نجی ملازم ہیں اور اپنے دل و دماغ کو فروخت کر دینے کی وجہ سے بجز اپنے محکمہ میں ذاتی ترقی کرنے یا کبھی کبھی اخبارات میں مثل راقم کے خیالی تجاویز اور مضامین لکھدینے کے اور کسی طرح ملک کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ باقی رہا ملک کے دوکانداروں۔ کاریگروں اور کاشتکاروں میں جنپر ملک کی ترقی کا دارومدار رہی قطعاً کسی قسم کا علمی چرچا نہیں ہی۔ اُن میں کوئی حرکت یا ترقی کا خیال نہیں۔ انیں کروڑوں کی تعداد میں ایسے ہیں جو مثل جانوروں کے تمام عمر یکساں قسم کی زندگی بسر کرکے مرجاتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کی ترقی کے حالات پڑھ کر تعلیم یافتہ جماعت میں ایک تلاطم پیدا ہوگیا ہی اور اُنھوں نے اپنے شور سے نہ صرف اپنے ملک کو بلکہ انگلستان تک کو سر پر اُٹھا لیا ہی مگر افسوس کہ دوسری جانب اُن کی یہ آواز اُنکے ناخواندہ ہمسایوں تک بھی نہیں پہنچتی۔ یورپ کی بدولت ترقی کی راہ معلوم ہونے پر بجائے شکر گزار ہونے کے ہم اُن ہی کو اپنی بربادی کا باعث ٹھہراتے ہیں اور بجائے اپنے غریب بھائیوں کو ترقی کا راستہ دکھا کر اپنی جماعت اور قوت بڑہانے کے ہم ان لوگوں کو ناراض کرنا اپنے ملک کے لیے مفید سمجھتے ہیں جنھوں نے ہمیں تعلیم دیکر ترقی کی راہ دکھائی۔ جو ہم سے زیادہ ہمارے جاہل اہل ملک کی تعلیم میں ساعی ہیں اور جو اب بھی اگر تعلیم عامہ سے پہلوتہی کریں تو تمام ملک میں اندھیرا چھا جائے۔

بہرحال تعلیم یافتہ جماعت میں ہر شخص جو گھنٹوں محنت کرکے کوئی لکچر یا اسپیچ تیار کرتا ہی۔ یا کوئی عمدہ مضمون لکھنے میں دماغ سوزی کرتا ہی اگر اسوقت کا کوئی حصہ اپنے سے کمتر لوگوں کو مفید انسان بنانے میں صرف کرے اور مختلف اوقات میں پانچ آدمیوں کو بھی معمولی اخبار اور دیسی کتابیں سمجھنے کے قابل کرد ے تو چند دنوں میں ہم سے پانچ گونہ تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہوسکتی ہی جو ملک کی حقیقی ترقی میں حصہ لے سکیں۔ اپنے آلات کو ترقی دیں۔ اپنے پیشوں میں ترقی کریں۔ ہمارے استعمال کے لیے عمدہ عمدہ چیزیں بنائیں۔ مدتوں سے جو سرکار نے محکمۂ زراعت قائم کر رکھا ہی اُس سے مستفید ہو کر ملک کی پیداوار بڑہائیں۔ اپنے گھروں کو صاف رکھکر وبائی امراض سے محفوظ ہوں۔ جھاڑ پھونک کی جگہ باقاعدہ علاج کی قدر جانیں۔ اپنے بچوں کی جو اب گلیوں میں آوارہ اور گالیاں دیتے پھرتے ہیں عمدہ تربیت

کریں اور انھیں زندگی کی کش مکش کے لیے تیار کریں۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اسوقت ترقی دادہ آلات رائج کرنے کی ضرورت ہی اور کپڑا بننے کی جدید راچھ استعمال کرنے کی ضرورت ہی مگر اُسی کے ساتھ اُن لوگوں کے تعصبات دُور کرنے اور اُنھیں جدید آلات سے فائدہ اُٹھانیکے قابل بنانے کی بھی ضرورت ہی۔ جدید آلات کے ذریعہ سے کام کرنے کے جو کارخانے قائم ہوتے جاتے ہیں اُن میں بھی زیادہ تر اُن ہی لوگوں کا نفع ہے جو سرمایہ دار ہیں اور جو ان تجاویز کے محرک ہیں۔ غریب کاریگر محض اس تدبیر سے سرمایہ داروں کی غلامی سے نہیں نکل سکتے۔ وہ صرف اُسوقت نکل سکتے ہیں جبکہ انھیں پڑھا کر زیادہ سمجھدار۔ زیادہ عاقبت اندیش اور زمانہ کے حال سے زیادہ واقف بنایا جاے۔ مثل یورپ کے اپنی ترقی کیلیے وہ خود اپنی سوسائٹیاں بنائیں اور اپنی انجمنیں قائم کریں۔

ہر شخص کے پاس جسے قومی ترقی کا خیال ہی کوئی نہ کوئی دیسی زبان کا اخبار ضرور آتا ہی معمولی توجہ سے وہ اپنے اخبارات تھوڑے لکھے پڑھے دوکانداروں اور کاریگروں کو پڑھنے کے لیے دیسکتا ہی۔ نہ صرف دوکانداروں بلکہ بدقسمتی سے تمام ملک میں یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہی کہ دنیوی کامیابی چالاکی اور عیاری سے حاصل ہوتی ہی۔ چنانچہ اسی بنا پر دہوکے بازی کا نام دوکانداری ہوگیا ہی۔ ایک دوکاندار اپنی پرانی چیز ایک ناواقف کے ہات پورے داموں فروخت کرکے اپنی ہوشیاری پر فخر کرتا ہی۔ جب اُس کی آمدنی بڑھ جاتی ہی تو وہ خریداروں کے ساتھ کج خلقی سے پیش آتا ہی۔ اور پھر اُسپر نازاں ہوتا ہی۔ ہوشیار کاریگر کی شناخت یہ ہی کہ وہ نہایت کج خلق۔ بدمعاملہ۔ وعدہ خلاف اور مفلس ہو اور اُسپر بھی اپنے فن میں کامل ہونے کی وجہ سے لوگ اُسے اُستاد اُستاد کہیں اور اُسکے سامنے شیرینی رکھیں۔ غرض کہ تمام ملک کو ایسے مضر خیالات نے برباد کر رکھا ہی۔ جو صرف اُن میں جدید علمی تذکروں اور اخلاقی نصیحت کی کتابوں اور دوسرے ملکوں کے کامیاب خوش معاملہ تاجروں اور کاریگروں کی سوانح عمریوں کے رائج کرنے سے دُور ہو سکتے ہیں اور انھیں کامیاب کرنے میں مدد دیسکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ سرکاری مدارس کے علاوہ دیسی مکاتب قائم کرنا۔ جو قائم ہیں اُن کی نگرانی اور

اصلاح کرنا۔ قران شریف کے مکاتب میں دینیات کے اُردو رسالے اور قران شریف کا ترجمہ رائج کرنا آوارہ بچوں کو سرکاری دیہی مکاتب میں داخل کرانا۔ بڑی عمر کے لڑکوں کو جو پڑہنے کے قابل نہیں اور جو امن عامہ میں خلل ڈالتے ہیں اور آگے چلکر جیلخانوں کو بھرتے ہیں کسی کام یا پیشہ میں لگانا۔ مزدوروں۔ کاریگروں کے لئے رات کی خواندگی کا انتظام کرنا۔ جو لوگ خواندہ ہیں اُنکا مذاق درست کرنا اور اُنہیں صحیح الخیال بنانا۔ ناول در افسانوں کی جگہ انہیں قومی اور ملکی فائدہ کی کتابوں کی قدر سے آگاہ کرنا۔ اگر ممکن ہو اپنے پاس سے مفید کتابیں پڑہنے کو دینا۔ بازاروں۔ گذرگاہوں میں چھوٹے دارالاخبار بلافیس کے قائم کرنا۔ یہ سب ایسے کام ہیں جو ہر شخص کم و بیش منفرداً خواہ مشترکاً بغیر زیادہ اہتمام کے کرسکتا ہی اور جو حقیقی طور پر ترقی کی بنیاد ہیں۔

اکثر تعلیم یافتہ لوگ اسبات کے شاکی رہتے ہیں کہ انہیں کوئی خوش خیال اور ہمصحبت نہیں ملتا اُنکے گرد ہر طرف تاریک خیال لوگ رہتے ہیں اسلئے کوئی عملی کام نہیں ہو سکتا۔ مگر کتنے ایسے ہیں جو اپنے گرد و پیش کی تاریکی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے ہمسایوں میں علم کی روشنی پھیلاتے ہیں اور اپنا ہمخیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم لوگ اپنے علما کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ ایسے دیہات میں جہاں اُنھیں مرغن کھانا نہیں ملتا جاکر اصلاح نہیں کرتے۔ حالانکہ علما نہ معاش سے فارغ البال ہیں اور نہ ضروریات زمانہ سے واقف ہیں۔ ہم لوگوں میں فارغ البال اور ضروریات زمانہ سے واقف ہونے پر کتنے ایسے ہیں جو ایک جاہل آدمی سے سیدہے مُنہ بات کرنا گوارا کرتے ہیں۔ کتنے ایسے ہیں جو کاشتکاروں اور دیہاتیوں کو فائدہ کی بات بتلاتے ہیں۔ کتنے ایسے ہیں جو وبا کے زمانہ میں غربا کو کم قیمت دوائیں تقسیم کرنیکا خیال کرتے ہیں۔

غرضکہ ہم سب ایک بلا میں گرفتار ہیں۔ عالم اور جاہل۔ واقف اور ناواقف۔ طبیب اور مریض سب کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہیں۔ یا یہ کہ ہم سب کے سب ایک دلدل میں پھنسے ہیں جس میں سب سے زیادہ وہی دہستے جاتے ہیں جو اپنے کو ہوشیار سمجھکر زیادہ شور کرتے اور زیادہ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں ممکن ہی کہ ہماری ہر حرکت کا نتیجہ بالآخر ترقی اور بلندی ہو مگر فی الحال تو ہم دلدل میں نیچے ہی کو چلے جاتے ہیں

ہیں۔ خدا سے دعا ہی کہ ہمارا یہ اندیشہ غلط اور اسپنسر صاحب کا فلسفہ جلد صحیح ثابت ہو۔ آمین۔

راقم۔ طفیل احمد

کیا علم طب صحیح ہی؟

یہ ایک ایسا انوکھا سوال ہی کہ شاید ابتک بہت کم لوگوں کے دل پر کھٹکا ہوگا۔ صدیوں بلکہ ہزاروں سال کے تقلیدی اعتقاد نے جو انسانی فطرت کا ایک خاصہ ہی لوگوں کے دماغ میں اس بات کی بہت ہی کم گنجایش چھوڑ رکھی ہی کہ اسکے متعلق وہ تحقیق کریں۔ مگر چونکہ اس زمانہ میں عام طور پر تحقیق کی طرف میلان پیدا ہو رہا ہی اسلیئے اسکے متعلق کچھ لکھنا نامناسب نہوگا۔

اس سوال کا جواب حکما اثبات میں دیتے ہیں۔ یعنی اُنکا قول ہی کہ علم طب صحیح ہی۔ لیکن ہم سے کوئی پوچھے تو ہم اسکا جواب نفی میں دینگے۔

قبل اسکے کہ اسکے غلط ہونے کے دلائل بیان کیئے جائیں پہلے صحت کے معنی پر غور کر لینا چاہیئے۔ جو فلسفی پہلو سے ہوگی نہ کہ منطقی۔

ہر ایک خبر۔ یا قضیہ۔ یا علم کے مسائل جو قضایا سے تعبیر کیئے جاتے ہیں بحیثیت صدق اور کذب کے چار حیثیتیں رکھتے ہیں مثلاً زید مرگیا۔ یہ ایک خبر یا قضیہ ہی۔ سامع کے نزدیک اگر اس میں اثبات کا پہلو کمزور ہی اور نفی کا قوی یعنی اُسکے علم میں زید کا مرنا بہ نسبت اُسکے نہ مرنے کے کم وثوق کے قابل ہی تو اسکو وہم کہتے ہیں۔ اگر دونوں پہلو برابر کی حیثیت رکھتے ہیں تو شک ہی۔ اگر ایجاب کا پہلو قوی ہی اور سلب کمزور ہی تو ظن ہی۔ اور اگر ایجاب ہی ایجاب ہی تو یقین ہی۔ یعنی اگر زید کا نہ مرنا اُسکے خیال میں بھی نہیں آتا اور مرنے کا وثوق کامل ہی تو اُسکو یقین کہتے ہیں۔

منطقی لحاظ سے ظن۔ اور یقین دونوں تصدیق کے درجہ میں داخل ہیں۔ لیکن فلسفی لحاظ سے ظن تصدیق نہیں ہی یعنی اُسکو صحیح کامل نہیں خیال کر سکتے۔ اسکے اوپر میں شیخ قطب الدین رازی کی عبارت نقل کرتا ہوں وہ محاکمات میں لکھتے ہیں والصحیح المتیقن مالا یشوبہ الظن فان الظن

لا یغنی من الحق شیئاً (یقینی صحیح وہ ہی جس میں ظن کا شائبہ نہو۔ کیونکہ ظن ذرا بھی حقیقت کے لیے مفید نہیں ہوتا) یہ قول اُس شخص کا ہی جو منطقیوں کا ایک امام تسلیم کیا جاتا ہی۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اُسنے فلسفہ کی حد میں کر یہ بات کہی ہی لیکن کسی چیز کی حقیقت سے بحث کرنا بھی ایک فلسفی مسلہ ہی۔ اسلیے ظن کو ایسے مسائل میں کوئی دخل نہیں۔

حکمار نے جو علم طب کی نسبت صحت کا دعوی کیا ہی وہ صرف ظن تک محدود ہی۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ علم طب ظنّی ہی۔ اسکے مسائل میں اثبات کا پہلو قوی اور نفی کا پہلو کمزور ہی۔ اولاً تو ہمیں اسکے تسلیم کرنے میں بھی تامل ہی کہ علم طب ظنّی ہی۔ اور بالفرض ہم نے مان بھی لیا تو فلسفی لحاظ سے وثوق کامل نہیں ہوسکتا۔ اسلیے ہمارا یہ کہنا بالکل بیجا نہوگا علم طب صحیح نہیں ہی۔ کیونکہ فلسفہ کے لحاظ سے کوئی چیز صحیح اور حقیقی اُسیوقت تسلیم کی جاسکتی ہی جبکہ اُس میں نفی کی گنجایش باقی نہ رہے۔

مذہب بھی ایسی چیزوں کے اوپر اعتبار کرنیکا نام توہم پرستی رکھتا ہی۔ چنانچہ ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً قرآن میں اللہ تعالٰی نے صاف صاف فرمادیا ہی۔

حکمار نے ایک اور بھی یقین کی قسم پیدا کی ہی یعنی تجربہ و مشاہدہ ہی جو چیز بارہا تجربہ میں آچکی ہو۔ اُس سے بھی یقین ہوجاتا ہی۔ ہم بیشک اسکو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ تجربہ میں پوری خصوصیات کا لحاظ رکھا جائے۔ مثلاً ہر زمانہ۔ ہر زمین۔ ہر ملک میں خواہ وہ گرم ہو یا سرد ہر ایک قوم کے آدمیوں نے دیکھہ لیا ہی کہ گیہوں سے گیہوں پیدا ہوتا ہی اور جو سے جو آم سے آم اور جامن سے جامن۔ اسلیے اسکے یقین کرنے میں ہمکو کوئی شبہ نہیں ہی۔

اگر تجربہ محض چند جزئیات کے دیکھنے کا نام رکھا جائے تو وہ کبھی یقینی نہیں ہوسکتا۔ مثلاً عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ آم اور جامن گرمی کے آخری موسم میں پھلتے ہیں۔ اگر اس سے یہ قاعدہ بنالیا جائے کہ آم جب پھلیگا تو گرمی کے آخر ہی میں پھلیگا تو یہ یقینی نہیں ہوگا۔ کیونکہ بہت سے آم بارہوں مہینے پھلتے رہتے ہیں۔ کوئی کوئی بارش کے آخر میں پھلتے ہیں۔ الغرض تجربہ یا مشاہدہ ایک استقرا ہی اور جس طرح استقرا کی دو قسمیں مکمل اور غیر مکمل ہوتی ہیں اسی طرح تجربہ بھی تام اور غیر تام

ہوتا ہی -

اسکے بعد جب میں طبی تجربات کو دیکھتا ہوں تو صاف معلوم ہوجاتا ہی کہ اُن میں سے کوئی بھی تام نہیں ہی - اور زیادہ تر اسکے تجربے جنپر خود طب کا دارومدار ہی محض چند حالتوں سے تعلق رکھتے ہیں جو بعض بعض اطبار کو پیش آئیں - ایسی حالت میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ طب کے اکثر اصول اعتماد کے قابل نہیں ہیں کیونکہ اُن کی بنیاد چند جزئی تجربوں پر ہی -

یہی وجہ ہی کہ جالینوس اور بقراط کے زمانہ سے ابتک اسکے بہت سے اصول میں فرق پڑتا گیا مثلاً تیسری صدی ہجری کے اوائل تک لقوہ اور استرخار کا علاج گرم معجونوں سے کیا جاتا تھا - لیکن بغداد کے ایک طبیب نے ان امراض میں ٹھنڈی دوائیاں استعمال کرنی شروع کیں - اور اسکو بہت کامیابی ہوئی - تمام سرکاری طبیبوں نے اُسکے اصول کو قابل عمل تسلیم کیا - اور ان امراض میں عرقیات باردہ اور بعض صورتوں میں دوسری دوائیاں بھی استعمال کرنے لگے - کچھ زمانہ کے بعد اہمیں اور بھی تبدیلیاں ہوئیں اسی طرح اور علاجوں کی کیفیت کو بھی سمجھ لیجئے -

علم طب کی بنیاد وہی ایسے وہمی اصولوں کے اوپر قائم کی گئی تھی جو ایک حقیقت بین شخص کی نگاہ میں بہت ہی ناقابل اعتبار ہیں -

اس فن کی ابتدا اُسوقت ہوئی جب شام میں انسانی تمدن کا آغاز ہو رہا تھا - بابل میں جو ملک شام کا مشہور شہر اور دنیا کی پہلی سلطنت کا پایۂ تخت تھا اس میں ملکہ سمیراطوس کے زمانہ میں یہ قاعدہ لوگوں نے مقرر کیا تھا کہ جو شخص کسی عارضہ میں مبتلا ہوجاتا تھا اُسکو شاہراہ عام پر لاکر ڈالدیتے تھے - لوگ وہاں سے گذرتے تھے اور اُسکو دیکھتے تھے جب اتفاق سے کوئی ایسا آدمی گذرتا جو کہ اسی بیماری میں مبتلا ہوا تھا اور اُسکو کسی خاص دوا سے فائدہ ہوا تھا تو وہی دوا اُسکو بتلا دیتا اگر وہ اُسے بھی فائدہ کرتی تو طب کے دیوتا کی ہیکل میں ایک تختی پر اُس دوا کا نام لکھکر لٹکا دیا جاتا اور لوگ وہی دوا اُس بیماری میں استعمال کرتے -

عرصہ تک یہی عطائے وہمیات طب کا مکمل ذخیرہ خیال کی جاتی تھیں - جب اہل فنیشیا نے

ترقی کی تو وہان بھی اسی طریقہ سے عمل درآمد ہوتا رہا۔ لیکن ستاروں کی تحقیقات کی وجہ سے اُن لوگوں نے اُس میں نجوم کے اثرات کا ایک اور بھی توہم شامل کر دیا۔ الغرض فنشیا سے مصر اور مصر سے یہی طب یونان میں پہونچی۔ وہاں کے بعض لوگوں نے اسکے تجربے جمع کرکے اُنکے مختلف اصُول قائم کئے۔ اور یہیں سے طب نے علمی صورت اختیار کی۔ مگر یہاں بھی وہ توہم پرستی نجوم کے شامل تھی۔ دوا دینے اور پینے میں اُسکے اثرات کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ اہل روما نے بھی اس میں کچھ معتدبہ اضافہ نہیں کیا اور وہی طب اُنکے یہاں بھی رہی جو یونانیوں سے ورثہ میں انکو ملی تہی۔ مسلمانوں نے علم نباتات میں ترقی کی لیکن اصُول میں بہت ہی کم اختلاف کیا۔ کیمسٹری چونکہ بالکل غیر مکمل تھی اسلیے اُن کو بھی نباتات اور عناصر کی حالت زیادہ نہیں معلوم ہوسکی۔

اہل روما کے سوائے جنھوں نے بعض مدارس میں مُردوں کے ڈسیکشن کا بندوبست کیا تھا۔ اور طلبار کو تشریح پڑہانے کے لئے کئی صدی تک ایک آدہ لاشیں بعض بعض میڈیکل کالجز میں آتی رہیں اور قومیں تشریح سے بہت زیادہ بیخبر رہیں۔ یونانیوں کی تشریح تو بہت زیادہ نیدرول کے ڈسیکشن سے حاصل کی گئی ہے۔ مسلمانوں کو بھی اسکی طرف توجہ نہیں رہی۔ اکثر تشریح کے شوقین طالب علم مسلخ میں صبح کو پہونچ جاتے تھے۔ اور جب گائے بکریاں ذبح ہوتی تھیں تو اُنکے اندرونی اعضا کی ساخت پر غور کرتے تھے۔

طب کی سرسری حالت دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کہانتک یہ علم وثوق کے قابل ہے یہی وجہ ہے کہ اطبار کے زیر علاج مرضا اسی نسبت سے مرتے اور صحت یاب ہوتے ہیں جس نسبت سے وہ مرضار جو علاج نہیں کرتے۔ میں نے خود دیکھا ہے اور غالباً کوئی شخص اسکا انکار نہیں کرسکتا کہ اُن ممالک میں جہاں علاج بالکل نہیں ہوتا بہ نسبت اس ممالک کے جہاں اطبار کی کثرت ہے اور لوگ معالجہ کے عادی ہیں صحت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ حجاز کی حالت دیکھئے اور پھر اُسکا مقابلہ شام سے کیجیے نسبتاً حجاز میں تندرستی زیادہ ہے حالانکہ وہاں اطبار کی تعداد کم ہے

شام کے لوگ اُنسے کمزور ہوتے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے بھی کوئی فرق نہیں ہے۔
اسلیے میں سمجھتا ہوں کہ سوسائٹی کے لئے طب زیادہ مفید نہیں ہے۔ جبکہ بلا طب کے بھی کوئی نقصان نظر نہیں آتا۔ علاوہ بریں یہ امر غور طلب ہے کہ ایلوپیتھک (ڈاکٹری و طب یونانی) میں علاج بالضد ہوتا ہے۔ یعنی اگر مرض کسی گرم سبب سے پیدا ہوا ہے تو سرد دوا دیجاتی ہے اور اگر سردی سے پیدا ہوا ہے تو گرم۔ اسکے برخلاف ہومیوپیتھک میں علاج بالموافق ہوتا ہے۔ اور بھولی بھالی سوسائٹی دونوں کو اوٹا ئر کرتی ہے۔ اور بجائے خود ہر ایک کو مفید سمجھتی ہے۔ حالانکہ دونوں کا صحیح ہونا ایسا ہی محال ہے جیسے اجتماع نقیض۔ اور یہ وہ اصل الاصول ہیں جنپر ایلوپیتھک یا ہومیوپیتھک کا دار مدار ہے۔ اگر علاج بالموافق صحیح ہے تو طب یونانی و ڈاکٹری ایک طرف سے غلط ثابت ہوتی ہیں۔ اور اگر صحیح نہیں ہے تو ہومیوپیتھک غلط ہے۔
اسکے ساتھ ہی جب میں دیکھتا ہوں کہ جنتر منتر اور ٹوٹکوں سے علاج کرنے والے بھی اپنے زعم میں طبیبوں اور ڈاکٹروں سے کم کامیاب نہیں ہوتے تو اور بھی علم طب کی قلعی کھلجاتی ہے۔ ایک آرتھوڈکس پرانے خیال کی بڑھیا مسجد کے مُلاں صاحب کے تعویذ سے جلد شفا حاصل کرسکتی ہے بہ نسبت طبی علاج کے۔ ایسی حالت میں ٹوٹکوں اور تعویذ گنڈوں سے علاج کرنے کو توہّم پرستی قرار دینا اور طب کو حقیقی سمجھنا سخت ناانصافی ہے۔ میرے خیال میں طب بھی تنہا توہم پرستیوں کی ایک توہم پرستی ہے۔
بہت سے احباب میرے اس نئے خیال کو شاید پسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھیں گے۔ لیکن اگر ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک کے طریقہ علاج اور اُنکے اصول پر غور سے نگاہ ڈالینگے تو آسانی سے اس نتیجہ پر پہونچ جائینگے جس نتیجہ پر میں پہونچا ہوں۔ کسی چیز کو اگر ایک دنیا کی دنیا تسلیم کرے تو اُسکے تسلیم سے یہ بات ثابت نہیں ہوسکتی ہے کہ وہ چیز حقیقی بھی ہے۔ طب ہی کی طرح ہندوستانی۔ یونانی۔ سریانی۔ کلدانی۔ قبطی۔ رومن۔ اقوام اور دیگر اہل یورپ و ایشیا علم نجوم کو صدیوں نہیں بلکہ ہزاروں سال تک یقینی اور صحیح مانتے چلے آئے تھے۔ لیکن آخر رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تحقیق نے دنیا پر اس

بات کو ظاہر کر دیا کہ علم نجوم سراسر توہم پرستی ہی۔ اور اب موجودہ روشن خیال قومیں اُسکو لغو اور پوچ سمجھنے میں کوئی شبہ نہیں کرتیں۔ اسلیے کوئی تعجب نہیں ہے کہ طب بھی وہمی ثابت ہو جائے۔
جرمنی کے مشہور ڈاکٹر لوئی کہنے نے علم طب کو غلط ثابت کرنے کے لئے مختلف کتابیں لکھی ہیں وہ صرف طبیعت کے روک تھام کو اغذیہ و اشربہ کے ذریعہ سے ضروری خیال کرتا ہی اور علاج کے لیے دوا استعمال کرنے کو بالکل توہم پرستی قرار دیتا ہی۔ یہ خیال کچھ اسکا ذاتی پیدا کیا ہوا نہیں ہی بلکہ اسلام کے بانی شرع نے بھی یہی خیالات ظاہر کیے ہیں۔ گو اُنکے مبارک زمانہ میں طب نے کوئی ترقی نہیں کی تھی اور نہ عرب میں زیادہ رواج تھا تاہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اکثر انہیں چیزوں کے خواص کی طرف لوگوں کی طبیعت کو مائل کیا کرتے تھے جو اغذیہ اشربہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ادویہ کی طرف اُنہوں نے کبھی سوائے چند حالتوں کے رجوع کرنے کے رائے نہیں دی۔ وہ چند حالتیں ایسی تھیں کہ بعض لوگ مرض میں مبتلا تھے اُنکو طبیبوں کے ساتھہ بہت زیادہ اعتقاد تھا ایسے لوگوں کو آپ نے خیبر کے مشہور یہودی طبیب کی طرف رجوع کرنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ انسان کی صحت اور بیماری پر زیادہ اثر اعتقاد کا ہوتا ہی۔ اور دراصل اعتقاد ہی ایک ایسا امر ہی جسنے طب کو ابتک رائج رکھا ہی۔ طب میں تو ایک خارجی تاثیر ادویہ کی بھی شامل ہوتی ہی گو وہ موافق ہو یا مخالف مگر مسمریزم۔ ہپناٹزم۔ میگناٹزم۔ تعویذ۔ ٹوٹکے۔ جنتر منتر تو سراسر اعتقاد ہی سے تعلق رکھتے ہیں ورنہ ان خیالی امور کی حقیقت ہی کیا ہی۔ اسکے ساتھ ہی طب کی وہ شاخیں جو حقیقت سے تعلق رکھتی ہیں ہم اُنکو غلط نہیں کہتے مثلاً فزکس کیمسٹری۔ اناٹمی (جو حدیث العلم علمان۔ علم الادیان و علم الابدان میں علم ابدان سی مراد ہی) اور بانٹی ہم صرف معالجہ کو غیر صحیح بتلاتے ہیں۔ اور اسکا غیر صحیح ہونا انسانی علم کی کمی سے ہی۔ آپ ایک ڈاکٹر کے پاس جایئے وہ کچھہ اور دوا آپکے لیے تجویز کریگا اور اسی مرض میں دوسرے ڈاکٹر سے مشورہ لیجیے تو وہ کچھہ دوسری دوا بتلائیگا۔ یونانی اطبا کے نسخوں میں تو اس سے بھی زیادہ اختلاف ہوتا ہی۔ اس سے خود ظاہر ہوتا ہی کہ مرض اور علاج بالکل حکیموں اور

ڈاکٹروں سکو وہم پر مبنی ہی۔ اور حقیقت کو کوئی نہیں دریافت کر سکتا۔ اسکے علاوہ ایک ایم ڈی کے ڈگری یافتہ یا طبیب حاذق کا علاج بعض اوقات اسقدر مفید نہیں ہوتا ہی جسقدر پنجاب کے اشتہار باز طبیبوں کی دوا حالانکہ ہر ایک شخص جانتا ہی کہ اشتہاری دوا طب۔ عقل۔ اور اصُول کے کسقدر خلاف ہی۔ کیونکہ جبتک طبیب مرض نہ پہچانے اُسکے اسباب پر غور نہ کرے۔ موسم اور مزاج کے لحاظ سے اُسکے دفعیہ کی دوا نہ تجویز کرے اسوقت تک طباً علاج ٹھیک نہیں ہوتا اور اشتہاری دواؤں میں ان میں سے کسی بات کا بھی خیال نہیں۔

الغرض طب ایک وہمی علم ہی۔ اُسکی غلطیوں کی پردہ پوش خاک ہی۔ اسی وجہ سے دنیا پر اُنکا اظہار نہیں ہوتا۔

اسلم جے راج پوری

سُورج مکھی

کس طرح اس ننھے پودے سے نکل آیا ہی تو
دیکھنی منظور ہی کیا باغِ عالم کی بہار
لوگ کہتے ہیں کہ تو پھرتا ہی اسکے ساتھ ساتھ
جستجو کس کی ہی تیرے دیدۂ بیخواب کو
ساغرِ جم۔ یا کنول ہی دل کا یا چشمِ پری
رات بھر اک پانوں پہ رہتا ہی کسکا منتظر
قطرۂ شبنم ہی رخ پر۔ منفعل۔ چہرہ اُداس
کون ہی وہ جسکا سوزِ عشق پنہاں تجھ میں ہی

سبز تھی ٹہنی سنہرا رنگ کیوں لایا ہی تو
چشم بنکر جو ہمہ تن اس طرح آیا ہی تو
سچ تو بتلادے کہ سورج کا کوئی سایا ہی تو
کیا نہیں تجکو نظر آتا جو گھبرایا ہے تو
یا ہی یہ کوئی سنہرا جامِ صہبا۔ یا ہی تو
کسکے نظارے کی خاطر اتنا للچایا ہی تو
کونسی وہ چیز کھوئی جس سے پچھتایا ہی تو
رنگ ہے کیوں زرد کیوں اسطرح مرجھایا ہی تو

کہہ رہی ہی تیری صورت سختیاں سہتا ہے تو
رازِ مخفی ہی کوئی لیکن نہیں کہتا ہے تو

دل ترا نورِ شعاعِ مہر کا کاشانہ ہے
جس میں صہبای محبت ہو تو وہ پیمانہ ہے

ڈھونڈنے نکلا ہے تو اُس مہرِ عالمتاب کو
جو ازل کا اک حُبابِ ساغرِ میخانہ ہے

طائرِ قبلہ نما کے ساتھ سرگرداں ہے تو
اُسکی الفت میں تجھے یہ جوشِ بیتابانہ ہے

سادگی تیری تمنا کی عجب ہے دلفریب
سچ تو بتلا وہ ابھی سورج کا تو دیوانہ ہے

چشمِ حیراں نے ترے سورج میں دیکھی کیا وہ بات
تو جو اس شمعِ جہاں افروز کا پروانہ ہے

کون ہے مستور سورج کے حجابِ نور میں
حُجلۂ زرّین میں کس کا جلوۂ جانانہ ہے

دور کی سوجھی ہے تیرے دیدۂ بے نور کو
ہوشیارانہ تری لغزشِ مستانہ ہے

نام کو کہتے ہیں سب سورج کا سودائی ہے تو
کھُل گیا رازِ حقیقت جسکا شیدائی ہے تو

آہ اے دردِ محبت ہر جگہ پنہاں ہے تو
کائناتِ دہر میں ساری برنگِ جاں ہے تو

کونسا وہ دشت ہے جو وادیِ ایمن نہیں
ہر شجر میں مثلِ شمعِ طور کے سوزاں ہے تو

شادمانی ہو فدائی جس کی تو وہ درد ہے
عیش ہو قربان جسپر وہ غمِ پنہاں ہے تو

تو وہ کلفت ہے کہ ہو جسمیں نہاں کیفِ سرور
درد ہو جسمیں بھرا وہ عیشِ بے پایاں ہے تو

وہ جگر پھٹ جائے ہو جسمیں نہ کچھ تیری کسک
دل وہ جلجائے نہیں جسمیں شرر افشاں ہے تو

میرے دل سے کوئی پوچھے آکے کیفیت تری
مرہمِ ناسورِ زخمِ سینۂ بریاں ہے تو

رشتۂ وابستگیِ کائناتِ دہر ہے
روشنیِ شمعِ بزمِ عالمِ امکاں ہے تو

ازجہاں زیبانگاری دستۂ نابی مرا ؎
گر بود حاصل بہ از ملکی و اسبابی مرا ؎

اسلم جیراجپوری

خمسۂ متناسبہ

کائنات موجودہ میں صرف اربعہ یا اربعین عناصر یا اربعہ متناسبہ ہی نہیں پائے جاتے - ہر ہستی جداگانہ شاہد ہے کہ اس میں مختلف اقسام کے عناصر اور اربعہ متناسبہ کس کس مقدار میں پائے جاتے ہیں - پرانی تحقیقات میں ہوا - مٹی - آگ - پانی - اربعہ عناصر اور علت مادی - صوری - فاعلی - غائی - اربعہ متناسبہ کے نام سے موسوم ہیں - نئی تحقیقات میں اربعہ عناصر کی ہستی کے بجائے بیسوں عناصر کی ہستی تسلیم کرائی جاتی ہے - چاہے یہ زوائد انہیں اربعہ عناصر کی ذریات میں سے ہوں اور چاہے انکے سوائے - لیکن انکے ماننے میں علمی اعتبارات سے کوئی بھی استحالہ لازم نہیں آتا - کہ اور بھی عناصر یا متناسبات ہو سکتے ہیں -

جیسے جسمانی اطبار اور حکمار کی تحقیقات میں عناصر اور اربعہ متناسبہ کی کیفیت قابل بحث چلی آتی ہے ایسے ہی ذہنی حکمار کے نزدیک ذہنی عناصر اور امور متناسبہ کی بحث بھی دلچسپی سے خالی نہیں - ماہرین فلسفہ ([illegible]) اور محققین سائی کولوجی (Psychology) نے بعض مواقع میں عناصر ذہنی کی تحقیقات اور بیان میں طب جسمانی سے بھی کام لیا ہے - لیکن اُس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ان عناصر کا تعلق بمقابلہ ذہنیات[1] کے جسمانیات سے

---

[1] ذہنیات اور روحانیات میں بعض نے ایک نسبت تسلیم کی ہے - اور بعض کے خیال میں ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے - اور ایک تیسرے فرقہ کی رائے میں دونوں لفظ مترادف ہیں - انہیں حکمار ذہنیات سے تعبیر کرتے ہیں اور مذہب میں روحانیات سے تعبیر ہوتی ہے - جو لوگ تیسرے فرقہ سے ہیں - انکے خیال میں ذہنیات اور جسمانیات میں تبائن ظاہر اور مشتبہ ہے جو حالت جسمانیات سے متبائن ہے وہ سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ روحانیات سے ہی ہے اس بحث میں دو لفظ استعمال کئے جاتے ہیں -

"لفظ ذہن" "لفظ روح"

یہ دونوں الفاظ غیر مادی طاقتوں کی تشریح یا مقدمہ میں یعنی نفس ذہن اور روح فی نفسہ متحد المفہوم ہوں - یا

زیادہ ہی۔ طبیب ہمیشہ اُن مواد سے بحث کرتا ہی جو جسمانیات سے متعلق ہیں۔ اور جہاں کہیں طبی بحث ذہنیات سے ٹکر کھاتی ہی وہ محض اوس رشتہ کے سبب سے ہی۔ جو جسمانیات اور ذہنیات میں مربوط اور موجود ہی۔

نوٹ بقیہ صفحہ ۱۹۴ یا متضاد المفہوم۔ عالم مادی کے ضد ہیں۔ فرق امتیازی نفس ذہن اور روح اور اجسام مادیہ کے درمیان یہ ہی کہ نفس ذہن یا روح کا کوئی تعلق ابعاد ثلاثہ سے نہیں ہی اور اجسام مادیہ ابعاد ثلاثہ سے متعلق ہیں۔ حکمار کا ان دونوں شقوں میں بھی اختلاف ہی۔ بعض کے نزدیک صرف وجود مادی ہی وجود نفس ذہن کوئی شے نہیں ہی کوایف باطنیہ کا ادراک جن کوایف جسمانی کے زور یا اعتبار پر ہی۔ دوسرا اگروہ وجود مادی اور وجود نفس ذہن دونوں کا قائل ہی۔ اس فرقہ کے نزدیک دونوں حالتوں یعنی حقیقت مادہ اور حقیقت نفس ذہن میں بیّن فرق ہی۔ یا یہ کہ مادہ اور نفس ذہن ضدّین ہیں۔ اور ان دونوں میں لایجتمعان کی کیفیت پائی جاتی ہی۔ اور باوجود ان اعترافات کے بھی اس فرقہ کے نزدیک نفس ذہن مادہ پر اثر ڈالتا ہی۔ اور اسکی وجہ سے انواع و اقسام کے آثار مادہ میں پیدا ہوتے ہیں

جب نفس ذہن غیر مادی قرار دیا جاتا ہی۔ تو اسپر تعریف روح کی بھی صادق آتی ہی۔ کیونکہ روح بھی غیر مادی ہی۔ ان حالات میں تیسرے فرقہ کی رائے درست اور مرجح ہی۔ جو لوگ ان دونوں میں کوئی نسبت نہیں مانتے۔ وہ انکے افعال سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ نفسِ ذہن جسے وہ دوسرا نام قلب یا مائنڈ (mind) دیتے ہیں۔ وہ کیفیت رکھتا ہی۔ جو روح کے مغایر ہی۔ جو فرقہ ان دونوں میں ایک نسبت تسلیم کرتا ہی۔ وہ گویا قریب قریب تیسرے فرقہ کے ہی اسکے نزدیک بعض حالات میں اسے نفس ذہن کہا جاتا ہی۔ اور بعض میں روح۔ لیکن یہ فیصلہ ہی کہ مادیات سے اس شق کا کوئی تعلق نہیں ہی۔ گو بعض لوگ محض مادیات ہی کے قائل ہیں۔ اب انکا استدلال واقعات موجودہ یا شواہد بینہ کے خلاف ہی۔ یہانتک کہ بعض کا یہ بھی خیال ہی کہ مادہ بھی جبتک کہ اُسمیں ذہنیات کا اثر نہو۔ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ آنکھ ابعاد ثلاثہ کی ذیل میں آسکتی ہی۔ لیکن آنکھ کا نور یا بصارت اول تو کسیقدر اس تعریف سے باہر نکل جاتا ہی۔ دوسرے یہ کہ دراصل یہ آنکھ بھی سوائے ذہنی روابط کے پورے طور پر اپنا کام نہیں کر سکتی۔ اختلال حواس کی حالت میں بصارت بھی دگرگوں ہو جاتی ہی۔ جب ذہنیات کا زور یا رابطہ مرنے پر ختم ہو جاتا ہی۔ تو مادہ بالکل ناکارہ پڑ جاتا ہی۔ نہ اُسمیں طاقت رہتی ہی اور نہ کوئی احساس۔ اس سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ کہ کسی نہ کسی حالت میں یہ کہنا ہی پڑتا ہی

ہم مان لیتے ہیں۔ کہ ہماری ہستی اربعہ عناصر کے ماتحت ہے۔ یا اس میں اربعہ عناصر موجود ہیں۔ یا یہ کہ بجائے ان اربعوں کے چالیس اور عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا ہے۔ کہ ذہنی عناصر یا تناسبات کا وجود نہیں ہے۔ یا نہیں ہونا چاہیئے۔ حواس ظاہری کے مقابلہ میں جیسے حواس باطنی کا وجود مانا جاتا ہے ایسے ہی عناصر اور تناسبات باطنی کا وجود بھی قابل تسلیم ہے۔ کسی حالت میں یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ کہ عناصر باطنی کسقدر اور کس مقدار میں تسلیم کئے جا سکتے ہیں۔ جبتک استقرائی بحث باقی ہے۔ تب تک کوئی انحصار انسانی تحقیقات پر نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ ایک ہی حالت کے مختلف نام ہوں۔ جیسے کہ بعض حکماء کا عقیدہ بھی ہے اور یہ ممکن بھی ہے۔ کہ ہر حالت بجائے خود جداگانہ یا متفرع ہو۔ یا یہ کہ حواس باطنی کے مختلف آثار اور جذبات ہی وہ مختلف کیفیتیں یا حالتیں رکھتے ہیں۔ اور ان مختلف آثار سے مختلف استدلال کئے گئے ہوں۔

انسان کی باطنی قوتیں حواس خمسہ سے تعبیر کیجاتی ہیں۔ محققین نے انہیں مختلف صورتوں اور مختلف جذبات سے ثابت کیا ہے۔ اور ہر ایک قوت کیواسطے جدا جدا کام مقرر کر رکھے ہیں جس طرح کان آنکھ کا اور آنکھ کان کا کام نہیں دیتی اسی طرح ایک حواس باطنیہ دوسرے حواس باطنیہ کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ حس مشترک حافظہ کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اور حافظہ حس مشترک کی قائم مقامی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہے۔ ناک باوجود زبان کی ہمسائگی کے زبان کے افعال سے کوئی فعل بھی اپنے حصہ میں نہیں رکھتی۔

نوٹ بقیہ صفحہ ۱۹۵۔ کہ اس میں سے کوئی طاقت نکل گئی ہے۔ یا اس میں کوئی طاقت نہیں رہی۔ یا کم سے کم کوئی طاقت سلب یا جذب ہو گئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مادہ کے اندر ایک اور طاقت ہوتی ہے۔ جسکے ازالہ اور سلب سے اسکی حالت میں فرق آجاتا ہے۔

تیل کے ختم ہو جانے سے بتی عموماً ختم نہیں ہوتی۔ لیکن بجھ ضرور جاتی ہے۔ جب اور تیل اس میں ڈالدیا جائے تو پھر جلنے لگتی ہے۔ بیشک بعض دفعہ بتی ختم ہو جاتی ہے۔ اور تیل باقی رہجاتا ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی تیل ہی مقدم ہوگا۔ کیونکہ بغیر تیل کے بتی وہ روشنی اور وہ کیفیت نہیں دیسکتی۔ جو بہ معیت تیل دیتی ہے۔ خیر یہ ایک لمبی اور پیچدار بحث ہے۔ بحث مادہ میں اسپر مزید روشنی ڈالینگے۔ ۱۲۔

اسی طرح چشم انعال بینی سے کوسوں دور رہتی ہے۔ انسان اپنی زندگی میں جو کچھ حاصل کرتا اور سیکھتا ہی یا جس قسم کی ترقی اور عروج علمی یا عملی پاتا ہے۔ اسکی بنیاد خمسہ عناصر یا خمسہ متناسبات پر ہے۔ چاہیے اس خمسہ متناسبہ کا تعلق حواس خمسہ باطنیہ سے رکھو۔ اور چاہیے انھیں کوئی جداگانہ کیفیت قرار دو۔ مگر ان مدارج خمسہ سے گریز نہیں۔ ہم اس بحث میں اور حواشی یا تعلقات سے بحث نہیں کرینگے صرف یہ شق لیتے ہیں۔ کہ انسان کا علم کن کن خمسہ متناسبہ سے پرورش یا نشوونما پاتا ہے۔ اور حواس خمسہ باطنیہ سے بھی بحث نہیں کرینگے۔ بلکہ اُنکے آثار یا اُن دیگر کیفیات سے جو ہمارے خیال میں خمسہ متناسبہ سے تعبیر ہو سکتی ہیں۔

انسان کے باطن یا اندرونہ میں پانچ متناسبہ حالتیں پائی جاتی ہیں۔ اور انہیں خمسہ حالتوں سے انسان کے علم اور ادراک کا پودہ نشوونما پاتا ہے۔

وہم[1] - خیال[2] - قیاس[3] - یقین[4] - حقیقت[5]

ان ہر پانچ حالتوں میں فرق ہے۔ اور ہر حالت دوسری حالت سے ایک نسبت عملی رکھتی ہے۔ اور ہر حالت کا درجہ اپنی پہلی حالت کے درجہ سے دوسرے درجہ پر رہتا ہے۔ وہم[1] اور قیاس میں گو ایک عملی نسبت موجود ہے۔ لیکن خیال بہر صورت وہم سے دوسرے درجہ پر ہے۔

---

[1] وہم اور خیال کے مقابلہ میں تصور بھی ہے۔ بعض نے ہر سہ کیفیتیں ایک ہی سمجھی ہیں۔ مگر یہ درست نہیں۔ ان ہر سہ میں فرق ہے۔ گو وہ فرق کیسا ہی باریک کیوں نہو۔ چونکہ یہ حالتیں ہمارے اندر پائی جاتی ہیں۔ اسواسطے ایک آسانی سے انہیں امتیاز اور فرق کر سکتے۔ اور یہ جان سکتے ہیں کہ انمیں سے ہر ایک کا کیا کیا تمیز ہے۔ بیشک وہم بھی ہمارے اندرونہ کی ایک حالت ہے۔ اور تصور بھی اس چشمہ کا قطرہ۔ لیکن پھر بھی ان دونوں میں فرق ہے۔ تصور صرف اُن مناظر ذہنی کا نام ہے۔ جنہیں ہر آنکھہ پہلے کسی وقت دیکھ چکی۔ یا کان سُن چکے ہیں۔ وہم اُن مناظر کا خاکہ ہے۔ جن میں سے اکثر مناظر مناظر سابقہ سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ تصور میں قصد لازمی ہے۔ خلاف اسکے وہم کا اکثر بالخصوص ابتدائی حصہ عموماً بے قصد اور بے گماں ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اسکے سب اجزاء ٹھیک نکلیں۔ لیکن تصور کے اکثر اجزا مطابق وقوع منظر ماسبق کے ہوتے ہیں اور انسے انسان پہلے سے ہی کچھ نہ کچھ آشنا ہوتا ہے۔ ۱۲ -

نہ باعتبار آثار اور تصرفات کے بلکہ باعتبار حدوث اور نشو و نما کے عملی حالتوں میں اسکے خلاف ہے۔ مثلاً وہمسے خیال کا درجہ برتر ہوگا۔ اور خیال سے قیاس فوقیت رکھیگا۔ قدرت نے ہر ہستی میں جسقدر چھوٹے بڑے پُرزے رکھے ہیں۔ اُن سب کیواسطے جداگانہ ایک ایک کام یا ڈیوٹی مقرر کردی گئی ہے۔ اگر کوئی پرزہ اس ڈیوٹی سے انحراف کرے تو سارے جسم میں ایک قسم کا انقلاب یا نقص آنے لگتا ہے۔ اسوقت تک جو چند در چند تحقیقاتیں یقین کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ ایک تحقیقات بھی اُن میں سے ایسی نہو گی جسنے ایک قدرتی پرزہ سے کام لیا ہو۔ یہ جدا بات ہے کہ ایک پُرزہ کی حالت سے دوسرے پرزہ کا کام لیا گیا ہو۔ جیسے آگ اور پانی یا بجلی سے کام لینا۔

جب تک انسان کسی مفہوم یا کسی شئے یا کسی وجود کا اچھی طرح سے مطالعہ نہیں کر لیتا۔ تب تک اُسکے مقابلہ میں ہر شئے یا ہر وجود اور ہر مفہوم ایک خفا اور حجاب رکھتا ہے۔ پہلے انسان جب کبھی کسی وجود یا کسی شئے یا کسی کیفیت کا مشاہدہ عینی یا احساس سمعی کرتا ہے (بشرطیکہ وہ اسکے ملاحظہ یا احساس میں پہلے نہ آیا ہو) تو اُسکے دل پر ایک دھندلا سا عکس یا سایہ پڑتا ہے۔ اسپر نہ تو کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے۔ اور وہ ہی دل پر کندہ ہوتا ہے جب راہ جاتے کوئی نئی چیز جو ہم نے پہلے نہ دیکھی ہو دیکھتے ہیں تو بفور رویت ایک عکس سا اسکا دل پر پڑتا ہے۔ اس میں نہ تو کوئی زور ہوتا ہے۔ اور نہ کوئی کشش۔ یہ تو ایک صورت ہوئی۔ دوسری حالت میں صدہا منظر بے قصد بے تردد خطیر خاطر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ہم انکے پیدا ہونے اور بے نتیجہ گذر جانے کا ایک رجسٹر کھولیں تو ہمیں ثابت ہو جائیگا کہ صدہا کے مقابلہ میں کوئی دو چار ہی نشو و نما پاتے اور طبعی عروج حاصل کرتے ہیں۔ دنیا میں بچے ہی چھوٹی عمر میں نہیں گذر جاتے اطفال اوہام بھی صدہا ایک ایک منٹ میں رہ گرائے عالم عدم ہوتے ہیں۔ ایک مضغہ انسان میں تو جان بقدرت قادر کریم آسانی سے پڑ سکتی ہے۔ لیکن ایک مضغہ وہم کے قالب خیال میں آنیکے واسطے بہت کچھ چاہیئے۔ اگر اس مدت اور اس صعوبت پر نظر کیجائے۔ جو وہم اور خیال اور خیال یا قیاس اور قیاس اور یقین اور یقین اور حقیقت کے مابین درجہ بدرجہ واقع یا حائل ہے۔ تو پتہ لگ سکتا

ہے۔ کہ دنیا کی حقیقتیں اور تحقیقاتیں کن کن منازل سے ہوتی ہوائی اپنے اپنے مدارج پر پہونچتی ہیں۔ موتیوں کے لوگ فدائی اور تمنائی تو ہیں۔ لیکن کتنے اسپر غور کرتے ہیں کہ وہ قدرت کے ہاتھوں کن کن امواج اور سواحل نشو و زیست سے گذر کر اپنی آب و تاب قعر گمنامی سے منصۂ ظہور میں آئے ہیں۔ اور کتنوں نے ان منازل سارہ پر عبور کیا ہے۔ جو ایک موتی اپنے پورے نشو و نما تک طے کرتا آتا ہے۔ لوگ اس بات کے تو بہت شوقین ہیں۔ کہ موتی مل جاویں۔ لیکن یہ بہت کم سوچتے ہیں۔ کہ اُن کی ہستی قعر بحر میں کیونکر جلوہ افروز ہوتی ہے۔ غواص بحر حقیقت خوشی میں حقیقت قبول تو کرتا ہے۔ لیکن یہ کم سوچتا ہے کہ وہ کن کن راہوں سے گذرتی ہوئی۔ اس تک پہونچتی ہے۔ اور اسکے مناسب ولیہ کیا کیا تھے۔

چونکہ وہم کی زیست یا ہستی بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اسواسطے اسکی نسبت ہمیشہ بہت کم وثوق کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہدیا جاتا ہے کہ یہ تو صرف ایک وہم ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ تمام اوہام باطل یا عدم پذیر نہیں ہوتے۔ اُنمیں سے چند وجود پذیر بھی ہوتے ہیں۔

جو اوہام وجود پذیر ہوتے ہیں۔ درصل ہمارے تمام علوم اور فنون کی اساس یا بنیادی پتھر ہیں۔ اگر ایک بچہ کا مضغہ دیکھا جائے تو اُس سے کبھی بھی بادی النظر میں یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اس سے اس قسم کے حکیم اور فلاسفر پیدا ہونگے۔ اسی طرح ایک وہم بھی اُن حقایق کا یقین نہیں کرا سکتا کہ جو بعد میں اسکی بدولت وجود پذیر ہوتی ہیں۔ اوہام کی دوسری مثال حباب کی ہے۔ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بلبلے اُٹھتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ دریا میں موج یا لہریں نہیں آتی ہیں۔ بلبلا بھی ایک چھوٹی ہستی کی لہر یا پیش خیمہ موج ہے۔ اپنی ہستی مٹاتے مٹاتے لہر یا موج کی ہستی کا دلچسپ نظارہ بھی کرا ہی دیتا ہے۔

وہم کا وجود دو نوع پر ہے۔

(۱)　(الف) نوع اولیہ　(۲)　(ب) نوع ثانیہ۔

پہلے نوع میں وہ تمام اوہام داخل ہیں۔ جو عموماً منظر پیوستہ نہیں رکھتے۔ ان کی شاخ ہستی زمین طبیعت میں سے ہی پھوٹتی اور نکلتی ہے۔ گو مجموعہ مشاہدات میں اسکا کوئی مرکز یا محور ثانی

بھی ہوگا۔ لیکن ایک خاص سرزمین طبیعت میں ایسا نشوونما بعض اوقات کسی ذریعہ ہی کے ہوتا ہے۔ بعض کا یہ قول ہے کہ انسان کے دل میں کوئی ایسا وہم پیدا نہیں ہو سکتا۔ جسکا منظر پہلے سے موجود نہو۔ یا طبائع نے اسپر عبور نہ کیا ہو۔ اُن کی اسپر یہ دلیل ہے۔ کہ جب تک صورت تغذیہ نہو تب تک کوئی خلطہ بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

ہماری رائے میں یہ درست نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوہام مناظر پیوستہ یا ملحقہ سے تعلق پذیر ہوتے ہیں۔ اور اُن میں نسبتاً جدت نہیں ہوتی۔ لیکن ایسے اوہام بھی ہیں جنکی ذات میں بالکل جدت ہوتی ہے۔ بیشک تولید اخلاط اغذیہ پر موقوف ہے۔ لیکن یہ کہاں سے ثابت کیا گیا ہے۔ کہ قوت واہمہ کی کوئی غذا نہیں ہوتی۔ یا ہمیشہ باہر سے ہی وہ غذا پاتی ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ قوت واہمہ ہمیشہ اغذیہ بیرونی ہی کی محتاج ہے تو اس سے یہ استحالہ لازم نہیں آتا کہ وہ جدت اوہام پر قادر نہو۔ جب ہم بعض اوقات دنیا ومافیہا سے ایکدم کے لئے الگ ہوتے ہیں۔ تو اسوقت بھی ہمارے دل میں اوہام کا تانا بانا لگا رہتا ہے۔ سینکڑوں پیدا ہوتے اور سینکڑوں نیست و نابود ہوتے جاتے ہیں۔ اور چند اُن میں سے زیست بھی پاتے ہیں۔ یہانتک کہ اُنسے صدہا شاخیں پھوٹتی اور پھل لاتی ہیں۔ اس سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے کہ آخر قدرت نے بھی تو اس خلقت عظمیٰ کو نسبتاً سیراً وافر دیا ہے۔ جسکے اکثر اجزا قدرتی اور خلقی ہیں۔

دوسری قسم وہ ہے۔ جو گویا اکثر معکوس اجزا رکھتی ہے۔ انسان جو جو مناظر دیکھتا اور مشاہدہ میں لاتا ہے وہ بھی تحدیث اوہام کے موجب ہوتے ہیں۔ ان میں بھی گو ایک قسم کی جدت ہوتی ہے۔ مگر ان کی بنیاد مناظر پیوستہ پر ہی قائم ہوتی ہے اور ایک صورت میں اُن مناظر پیوستہ کے متعلق بھی اوہام پیدا ہوتے ہیں۔ اُن میں سے بعض اوہام جو باعتبار عمدگی اور خوبی کے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایک خاص قسم کی جدت رکھتے ہیں۔ اگر جدت نہ ہو تو اُن سے صور جدیدہ صورت پذیر نہیں ہو سکتی ہیں۔

وہم سے اتر کر دوسرا درجہ خیال کا ہے۔

جیسے یہ تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ انسان وہم کی طاقت رکھتا ہے۔ ایسے ہی یہ بھی مان لیا گیا ہے کہ وہ خیال

کنندہ یا صاحب خیال بھی ہے۔ جب انسان وہم کے درجہ سے گذر جاتا ہے۔ تو اس کی قوت خیالیہ پر ایک خفیف سی ضرب لگتی ہے۔ جس سے قوت خیالیہ کا منہ کھلکر ندوختہ وہم کیجانب منتقل ہوجاتا ہے۔ اس پردہ میں جاکر وہم میں ایک خاص قسم کی طاقت یا حرکت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور قوت خیالیہ اُسے اپنی گود میں لیکر پرورش کرتی ہے۔ یہانتک کہ وہ وہم کی صورت بالکل چھوڑ دیتا اور خیال کے وجود میں آجاتا ہے اور اُس حالت میں یہ کہا جاتا ہے۔ کہ انسان خیال کرتا یا صاحب خیال ہے۔ جبتک وہم کے منفلات تفویض قوت خیالیہ نہوں۔ تب تک ہم کوئی خیال کرہی نہیں سکتے۔ تخیل کا یہ مفہوم نہیں کہ ہم بلا منتقلات قوت وہمیہ کوئی خیال کرسکتے ہیں۔ بلکہ یہہ کہ جو کچھہ ہمیں قوت وہمیہ دیتی ہے اسکی نسبت ہم خیال کرتے ہیں۔ یا یہ کہ اُسے بھی ایک اور صورت اور وجود میں لاتے ہیں۔

مثلاً ہم نے ایک شے دیکھی پہلے ہمارے وہم نے اسپر فوری تصور کیا۔ جب شین وہم سے وہ شے نکلی تو مشین خیالیہ میں آگئی۔ ایک دوسری مشین میں آکر اسپر ایک مزید روشنی پڑنے لگی۔ یا تو اسکا ایک دہندلا سا سایہ تھا۔ اور یا خانہ خیال میں آکر ایک بت ساد کھائی دینے لگا۔ اور طبیعت نے اُس سے تمسک کرنا چاہا۔ اس خانہ میں بھی آکر بہت کم اوہام باقی رہنے میں آتی ہیں اور گذر جاتے ہیں۔ بعض اوقات اسی واسطے خیالات کی نسبت یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ "ایک خیال ہی تھا" یہاں خیال بھی وہم کے معنوں میں ہی لیا جاتا ہے۔ جو اوہام خانہ خیال میں رہ جاتے ہیں وہ بھی قسمیں رکھتے ہیں

"خیالِ مستقل یا خیال سلیم

"خیال عارضی یا خیال ہوائی

پہلی قسم کے وہ خیالات ہیں۔ جو مشین خیال میں جوش کھا کھا کے پختہ ہوجاتے ہیں۔ اور جنھیں زوائد اور حواشی سے پاک کیا جا..., جنکے خام اجزا خود بخود الگ ہوجاتے ہیں۔

کوئی خیال پہلے پہل ہی مستقل یا سلیم نہیں ہوتا۔ عموماً ہر خیال میں ایک خامی اور عجلت ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ ہی اُن میں ایک تازہ روح پھنکتی ہے۔ وہم ہی بسا اوقات ایک بے حقیقت ہستی نہیں ہوتا

[1] یہ ایک لمبی بحث ہے۔ ہمنے رسالہ مراۃ الخیال میں تخیل کے متعلق وضاحت سے ان امور کا بیان کردیا ہے۔ ۱۲

خیالات میں سے بھی صدہا خیالات وہم کے نقش قدم لیتے اور حباب آسا گذر جاتے ہیں۔ ایک دوسری پختت وپز کے بعد شین خیال سے خیال نشو ونما پاتا اور ایک خاص ہستی اختیار کرتا ہی۔ اگر ہم اپنے خیالات پر غور کرنے کی عادت سلیم ڈالیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ کن کن خیالات کے بعد ایک وہم خیالی صورت میں آتا اور پھر اُس میں ایک سلامت روی اور استقلال پیدا ہوتا ہی تو ہمیں پتہ لگ جائیگا کہ ایک خیال کی سلامتی اور خوبی یا استقلال کیواسطے بیسیوں انقلابات کی ضرورت ہی۔ ہم نے آسمان پر ایک نیا ستارہ یا سیارہ دیکھا پہلے اس مشاہدہ کا وجود صرف تابع وہم تھا۔ بعد ازاں مشین خیالیہ میں اسکا حلول ہوا۔ اب ہم نے اسپر مزید غور شروع کی۔ یہانتک کہ ہم خیالی زور سے ہی علم ہیئت کے مبادیات یا اولیات تک پہونچ گئے۔ اور ایسے خیالات کا نشو ونما ساتھ کے ساتھ ہوتا گیا۔ آخیر یہ وہی ایک چمکتا ہوا ستارہ یا سیارہ ہمارے قیمتی معلومات کا اصُول یا بنیاد[۱] قرار پایا اور ہم نے استقرائی طریقہ کی مدد سے ایک وہم یا ایک خیال کی بدولت صدہا دیگر اشیا پر روشنی ڈالی۔ اور ہم نے اپنے دل ودماغ میں چند ایسے اجزا پائے جو ہمارے واسطے ایک نئی حالت تھے۔

جب ایک خیال تذبذبی حالت سے گذر جاتا ہی۔ تو اسکا نام دوسرے الفاظ میں بجائے خیال مستقل یا خیال سلیم کے ایک رائے رکھا جاتا ہی۔ یا یہ کہ یہی حالت رائے سے تعبیر پاتی ہی۔ ایک رائے یا ایسا خیال قیاس اور خیال کے مابین ایک فاصلہ ہوتا ہی۔ پہلی حد میں پہونچکر وہ ایک خیال یا ایک رائے ہی۔ اور دوسری حد میں منتقل ہوکر ایک قیاس۔

[۱] ہمارے محترم مرسل علیہ السلام حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے ستاروں اور آفتاب اور ماہتاب سے ہی ذات باری پر استدلال کیا۔ اور اُسی استدلال سے بار ثانی دنیا میں خالص توحید کی بنیاد پڑی۔ حضرت ابراہیم کا پہلا نظارہ صرف ایک وہم اور اُسپر نظر ثانی محض ایک خیال ہی خیال تھا۔ اگر قوت خیالیہ میں اس وہم کی پخت وپز نہ ہوتی۔ اور بہتیں چند انقلابات آتے۔ توحضرت ابراہیم کا اخیر بر مراحل توحید پر سے گذرنا اور ان شعاعوں سے اپنے قلب سلیم کو منور کرنا مشکل تھا

مسٹر نیوٹن کا ایک سیب کے گرنے سے مسئلہ کشش ثقل کا نکالنا اور اسپر حاشیہ چڑہانا ایک وہم اور ایک خیال ہی کی بنیاد پر تھا۔ فقدبر ۔ ۱۲۔

دوسری قسم کے وہ خیالات ہیں۔ جو غیر مستقل عارضی یا ہوائی ہوتے ہیں۔ ان کی ہستی بھی کچھ نہ کچھ قیام اور ثبات رکھتی ہے۔ لیکن یہ حالت محض ایک نمایشی حالت ہوتی ہے۔ ایسی حالت کا قیام اور ثبات چند ایسے دلائل پر مبنی ہوتا ہے۔ جو بجائے خود کمزور اور عارضی ہوتے ہیں۔ یہ قسم اگرچہ ہر ایک طبیعت میں کچھ نہ کچھ پائی جاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر اسکا ہجوم انھیں طبائع میں ہوتا ہے۔ جو فطرتاً کچی اور نمایشی ہوتی ہیں۔[1]

ایسے خیالات کا نشو ونما یا حدوث بے مصرف یا فضول نہیں ہے جب تک ایسے خیالات کا نشو ونما یا حدوث نہوگا۔ اُن میں سے اچھے اور برجستہ خیالات کیونکر انتخاب پا سکتے ہیں۔ عام خلقت سے ہی خاص خلقت کے نمونے نکلا کرتے ہیں۔ پہلے ہر ایک خلقت بجائے خود ایک عمومیت ہی رکھتی ہے۔ یا یوں کہو کہ گو کوئی خلقت قدرت کے نزدیک مخصوص ہی کیوں نہو۔ منظر اُسکا عام ہی ہوگا۔ انسانی جماعتوں میں جسقدر حکیم اور فلاسفر یا شہیر زماں گذرے ہیں۔ اُن کی پہلی حالت عامیانہ ہی تھی۔ کوئی بھی ایسا حکیم یا فلاسفر نہوگا۔ جو بادشاہوں اور سلاطین کے گھر میں پیدا ہوا ہو۔ کوئی بھی دینی رہبر یا مذہبی ہادی محلات شاہی کا پروردہ نہیں تھا۔ ہر ممتاز کی ابتدائی حالت عموماً ناقابل خطاب ہوتی ہے۔ وہی لوگ مشاہیر زماں کی مقدس اور محترم سلک میں منسلک ہوتے آئے ہیں۔ جو کسی وقت میں زاویۂ گمنامی اور گوشۂ کس مپرسی کے ممتاز ممبر تھے۔

جو مستقل اور سلیم خیالات ہوتے ہیں۔ اُن میں وقتاً فوقتاً قوتِ متمیزہ دست اندازی کرتی اور

[1] جو لوگ اس بات کے قائل ہیں۔ کہ بعض طبائع دنیا میں ایسی بھی موجود ہیں۔ کہ جنکا کوئی وہم یا کوئی خیال ہی غیر مستقل نہیں ہوتا۔ ایک کمزور رائے کے حامی ہیں۔ ہر طبیعت میں ایک خامی اور ایک کمزوری مودعہ ہے۔ اور یہ خامی یا کمزوری بعض اوقات قدرتی سلسلوں کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات موجودات کے مقابلہ میں۔ کچھ شک نہیں کہ انسانوں میں سے اکثر ہستیاں نسبتاً ارفع اور اعلےٰ ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ اُن میں پوری برجستگی اور استقلال ہے۔ درست نہیں ہے۔ ہاں جو بعض ہستیاں قدرت کے کسی خاص مطلب یا اعلان قدرت کے واسطے موجود کی گئی ہیں۔ ان کی سرشت اور اُن کی حالت تمام مراتب موجودات سے ممتاز ہوتی ہے۔

انہیں پبلک انتخاب میں لاتی جاتی ہے۔ قوت خیالیہ درصل خیالات کیوجہ سے ایک خزینہ ہے۔ اور قوت متمیزہ اسکی نقاد یا صراف جنہیں قوت متمیزہ اپنے مذاق کے مطابق انتخاب میں لاتی ہے۔ ان پر غور کرنے اور انہیں عمل میں لانے کا نام قیاس ہے۔ قیاس کے معنی اندازہ اور اندازہ کرنے یا برابر کرنے دو چیزوں کے ہیں۔ اور منطقی اصطلاح میں قیاس ایک ایسے ذو جملہ قول سے مراد ہے۔ جو مستلزم ایک نتیجہ کا ہو۔ خواہ کوئی سی تعریف اختیار کی جائے۔ قیاس سے مراد وہ حالت ہے۔ جو اپنی ذات میں ایک مستقل جدت یا فیصلہ کُن اصُول رکھتی ہے۔ جب ہم خیالات کے نتیجوں کی بحث پر آجاتے ہیں۔ تو اُسوقت ہم گویا ایک خاص مرکز یا ایک خاص منزل پر پہونچ جاتے ہیں۔ ہمیں اس خیالی سفر کا انجام نظر آنے لگتا ہے۔ جو توسن طبع سے کیا گیا ہے۔ ہم ایک صاف منظر پر فائز ہوتے اور اسکی روشنی دیکھتے ہیں اُن حالات میں ہم یہ کہنے لگتے ہیں۔ کہ اس منظر کی بابت ہماری یہ رائے ہے۔ یا ہمارا یہ قیاس[1] ہے۔
(یہاں رائے سے بھی مراد قیاس ہے)

یہیں سے اُن علوم اور اُن فنون کی بنیاد پڑتی ہے۔ جو دنیا کی ترقی اور فرید روشنی کا باعث

[1] یورپین حکمار کے نزدیک یہی خاص منزل نتیج باخذ النتیجہ کا نام تھیوری یا تھیوری کے قریب قریب ہے۔ تھیوری بھی اُس حالت کا نام ہے۔ جو حالت قیاس سے مستنبط ہوتی ہے۔ بعضوں نے تھیوری[2] کا مفہوم اصُول یا مسئلہ یا قاعدہ سمجھا ہے یہ اُسکا مفہوم نہیں ہے۔ بلکہ اُسکے لغوی معانی ہیں۔ لیکن اُنسے بھی وہی استدلال ہوتا ہے۔ جو قیاس سے ہوتا ہے۔ بعضوں نے تھیوری سے صرف قول مراد لیا ہے۔ اور اگر قول کا اطلاق مسلمہ مفہوم پر کیا جائے تو کوئی قباحت نہیں۔ لیکن قول کے مفہوم اور قیاس کے درمیان فرق ہے۔ قول میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک قائل کی ذاتی رائے۔ اور ایک وہ استدلال جو مختلف ذرائع سے کیا گیا ہے۔ اور اکثر اقوال میں قائل کی ذاتی رائے کا زیادہ تر حصہ ہوتا ہے۔ قیاس میں ذاتی رائیں گو شامل ہوتی ہیں۔ مگر عموماً واقعات بینہ یا واقعات صحیحہ کا زیادہ تر حصہ پایا جاتا ہے۔ گو ذاتی رائے بھی کسی قائل کی کسی واقعہ یا کسی دلیل پر مبنی ہوتی ہے۔ مگر اسمیں اپنی طبیعت کا رجحان اسدرجہ تک ہوتا ہے کہ بعض اوقات واقعات صحیحہ اور مسلمہ سے بعض اوقات محض خالی اور نسبتاً معرا ہوتے ہیں۔ کبھی انہیں صرف اسوجہ سے مانا جاتا ہے۔ کہ وہ ایک خاص شخص کے اقوال ہیں۔ اور کبھی اسوجہ سے کہ اپنی طبیعت اُنسے ایک مناسبت رکھتی ہے۔ خلاف اسکے قیاسات میں عموماً دلائل اور براہین کی بھرتی ہوتی ہے اور معرض تحقیق میں انہیں ایک خاص درجہ حاصل ہوتا ہے۔ انہیں صرف قائل کیوجہ ہی نہیں لیا جاتا۔ بلکہ بوجہ اپنی خوبی اور وسعت کے ۱۲

[2] تھیوری (Theory)

اور جن سے انسانی کمالات وابستہ ہیں۔ یہ علوم اور یہ فنون کیا ہیں۔ ایسے عام خیالات اور تھیوریز کا مجموعہ یا ایک خاص انتخاب کوئی سے علم اور کوئی سے فن لے لو۔ وہ سوائے اسکے کچھ اور نہیں ہوگا۔ کہ اہمیں چند چیدہ قیاسات اور منتخب تھیوریز پائی جاوینگی۔

قیاسات کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (۱) قیاسات خاصہ (۲) قیاسات عامہ

قیاسات عامہ سے وہ قیاسات مراد ہیں۔ جنکی بنیاد عام واقعات یا عام دلائل پر ہوتی ہے۔ اور جنکا مخرج سوائے خاص طبائع کے عام طبائع بھی ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ خاص طبائع کے قیاسات ہمیشہ خاص ہی ہوتے ہیں۔ یا عام طبائع میں کوئی خاص قیاس نشو و نما ہی نہیں پا سکتا۔ بعض اوقات خاص طبائع نے بھی ایسے ایسے قیاسات کا اظہار کیا ہے۔ جو عامیانہ رنگ میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ اور جنمیں کوئی خصوصیت نہیں ہوتی۔ اور بعض عامیانہ قیاسات بھی اپنی ذات میں ایک خصوصیت رکھتے ہیں۔ بعض فنون کی بنیاد عام طبائع سے پڑی ہے۔ ان طبائع نے اخذ او اظہار کیا ہے۔ جو عام اور بلا خصوصیت نہیں۔ اکثر موجد ایسے گذرے ہیں اور ایسے گذرینگے کہ جنمیں سے کوئی بھی کسی کالج یا مدرسۃ العلوم کا تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ یورپ میں جہاں فن ایجاد اور اختراع کی فی زمانہ گرم بازاری ہے۔ بیسوں ایسے موجد موجود ہیں۔ جو کسی کالج کے تعلیم یافتہ اور ڈگری یافتہ نہیں ہیں۔[1] لیکن ان کی ایجادات سے ان کی اپنی مر . . ہوم کیا ساری دنیا اسوقت مستفیض اور مستفید ہو رہی ہے۔ ایسے لوگوں کی دلچسپ سوانح عمریاں پڑھو اور پھر کہو کہ انہیں

[1] ایک حکیم نے اس سوال کی یوں تشریح کی ہے۔ کہ فن ایجاد میں عموماً وہی طبیعتیں کامیاب ہوتی ہیں۔ جو بالخصوص اپنی ذات میں ایک خاص رجحان پاتی ہیں۔ چونکہ اعلیٰ طبیعتیں ہمیشہ اعلیٰ مذاق رکھتی ہیں۔ جیسے فلاسفر اور علم الہیات کے عالم اسواسطے وہ اس طرف بہت کم توجہ کرتی ہیں۔ یا یہ کہ ان کی توجہ اور میلان ہمیشہ اصولی امور کی بابت ہوتا ہے۔ بایں لحاظ وہ اس کوچہ سے جان بوجھکر دور رہتے ہیں۔ اور عام طبائع میں سے چند خاص مذاق کی طبیعتیں ہی ایسے کام اپنے ذمہ لیتی ہیں۔ اکثر فنوں کی شاخیں اور فروعات چونکہ عام طبائع کا کسب ہوتی ہیں۔ اسواسطے ہی اعلیٰ مذاق کے لوگ اُنسے ابتدا ہی میں کنارہ گزین ہونے لگتے ہیں۔ اگر وہ اس طرف رجوع کریں۔ تو اُنکے مذاق اور مساعی یا مشاغل علیا میں فرق آتا ہے۔ فن فوٹوگرافی (Photography) اور فن تصویر کشی یا فن موسیقی ایک اعلیٰ درجہ کے فن ہیں۔ لیکن سوائے اصولی واقفیت کے کوئی فلاسفر بھی ان میں خاص مشق یا توجہ نہیں رکھتا۔ اگر یہ لوگ ایسا کریں بھی تو عام طبائع کے واسطے کوئی خاص شغل باقی نہیں رہتا۔ ۱۲

سے کون کون سے موجد ڈگری یافتہ تھے۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ عامیانہ قیاسات سے خاص طبیعتیں اپنے مذاق اور زور طبیعت کے مطابق نتایج اور حقائق کا استخراج کرتی ہیں۔ اور پھر انھیں بھی قیاسات خاصہ میں جگہ ملجاتی ہے۔

قیاسات خاصہ وہ ہیں۔ جو خاص طبائع ہی کا حصہ بخرہ ہیں۔ یا قیاسات عامہ میں سے منتخب ہو کر اُس سلسلہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ اور اُنکی ذات میں وہ اجزای پائے جاتے ہیں۔ جو حقائق الامور کا اعلیٰ جزو ہیں۔ قیاسات خاصہ سے ایک اُصول اور ایک مسلسلہ قائم ہو کر تشعیب علوم اور تفریع فنون وقتاً فوقتاً عمل میں آتی رہتی ہے۔

فن منطق اور علم فلسفہ کی بنیاد انھیں قیاسات خاصہ سے پڑتی ہے۔ منطق کا وجود عامیانہ خیالات یا قیاسات سے لیا جا کر قیاسات خاصہ میں منتقل ہوا ہے۔ فلسفہ کا وجود بالخصوص قیاسات خاصہ کی بدولت ہے۔ گو کبھی کبھی قیاسات عامہ سے بھی کوئی فلسفی نکلتی ہے۔ مگر یہ شاذ و نادر صورت ہے۔ صوت خیال تک دلائل اور براہین کا دخل بہت کم ہوتا ہے۔ قیاسات کی صوت میں دلائل اور براہین کا ہجوم ہر چہار طرف سے ہونے لگتا ہے۔ ایک خیال کی دوسرے خیال سے تفریق دلائل کے بغیر مشکل ہو سکتی ہے۔ اگرچہ ہر ایک حالت اور ہر ایک صورت میں دلائل کی حکومت[1] ثابت ہے۔ لیکن قیاس کی مشین میں اپنی

[1] دلیل دنیا اور دنیا کے معاملات پر شروع سے حکمراں ہے۔ دنیا کا کونسا ایسا واقعہ یا معاملہ ہے۔ جسپر کوئی دلیل عائد نہیں ہوتی یہانتک کہ بعض حکیموں نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے۔ کہ ہر ایک اچھے برے معاملہ پر دلائل لائی جا سکتی ہیں۔ اور اگر ہم نظر غور سے دیکھیں تو کوئی شخص بھی اس خبط سے خالی نہیں۔ جس سے پوچھو اپنے معلومات یا اپنے اقوال اور اپنے خیالات کے صدہا دلائل رکھنے کا مدعی ہے۔ مذہب اور فرق دینی یا گروہ حکما کی تفریق یا عام لوگوں کی جماعت بندی دلیل بازی کا ہی ظہیر یا صدقہ ہیں۔ اور ہر گروہ بجائے خود اپنے اپنے دعاوی پر دلائل کا طومار لئے بیٹھا ہے۔ جب ایک دہقان بازار میں سودا لیتا اور نرخ پوچھتا ہے۔ تو ساتھ ہی جواب ملنے پر کہہ اُٹھتا ہے۔ کیوں ایسا یا اسقدر نرخ ہے۔ یہ کیا ہے۔ وہی دلیل یا قاعدہ منطق ہے۔ ہر خلقت دلیل بازی کی دیوانہ اور منطقی ہے۔ بازار میں جا کر غور سے لوگوں کی گفتگو سنو اور نتیجہ نکالو کہ کتنے افراد بشر دلیل سے بچ سکتے اور منطق سے دور رہ جاتے ہیں۔ یہ جدا بات ہے کہ وہ علمی قواعد یا اشکال اور قضایا منطق سے نابلد ہیں۔ کیونکہ یہ حصہ علما کا ہے۔ ورنہ دلائل بازی اور منطقی حجج میں وہ بھی حصہ دار اور سہیم ہیں۔ بلکہ بعضوں نے تو یہانتک بھی کہدیا ہے۔ کہ چرند۔ پرند۔ درند بھی دلیل سے کام لیتے ہیں۔ ایک کوا بوجہ پہلے آنے کے

پر زے کثرت سے مستعمل ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے۔ کہ مشین قیاس کی ترکیب یا تالیف سوائے دلائل کے ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر دو خیال کی بابت چھان نہ کیجائے تو سوائے اسکے مشکل ہے۔ کہ ایک کے مقابلہ میں دوسرے کی دلیل فائق ہو۔ جب ہم ایک خیال کی تردید اور دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں تو ایراد براہین کے سوائے اور ہوتا ہی کیا ہے۔

نوٹ بقیہ صفحہ ۲۰۶ - دوسرے کوّے سے اپنا حق فائق سمجھتا ہے۔ ایک گھریلو کتا ایک آوارہ کتے کے مقابلہ میں اپنا حق اول سمجھتا ہے۔ یہ کیا ہے ایک قسم کی دلیل یا دعوی۔ اگر ہم بامعان نظر انسان کے سوائے دوسری خلقت کا نظارا یا مشاہدہ کرینگے تو اس قسم کی بیسیوں مثالیں پیش نظر ہونگی۔ جنسے پتہ لگیگا۔ کہ اعادہ حقوق اور دلیل بازی کا فرض او مخلوق میں بھی ہے جب کوئی خلقت کسی امر یا کسی فعل کا انکار یا اعتراف کرتی ہے۔ تو اسکا ایسا عمل کسی نہ کسی دلیل پر ہی مبنی ہوتا ہے۔ چاہیے وہ دلیل کسی قبیل سے ہو۔ ہم دائرہ دلیل سے اسواسطے بھی کم واقفیت رکھتے ہیں کہ دلائل کے اقسام سے بے بہرہ ہیں۔ منطقیوں نے جو کچھ دائرہ دلائل وضع کیا ہے۔ وہ ان کی اپنی خاص اصطلاحات کے مطابق یا تابع ہے۔ انی۔ لمی وغیرہ وغیرہ کے سوائے اور قسم کے دلائل بھی ہیں۔ خواہ انہیں اُن دونوںکے تابع کہو۔ اور خواہ انکے علاوہ لیکن اُنکے اقسام سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے پہلے ہمیں اقسام دلائل کے متعلق دلیل کی تعریف معلوم کرنی چاہیئے۔

دلالت کے لغوی معنی ارادہ دکھانے کے ہیں۔ اور دلیل وہ جس کے جاننے سے دوسری شے کا علم ہو جائے۔ یہ ایک سادہ تعریف ہے۔ پس جو بات یا قول یا جو حرکت یا جو فعل یا ترک فعل مفہوم رکھتا ہے۔ وہ ایک دلیل ہے۔ جب ایک شخص یہ کہتا ہے۔ میں یہ نہیں مانتا۔ میں نہیں جاتا۔ میں نہیں جانتا۔ میں نہیں سنتا۔ تو وہ ایک دلیل پیش کرتا ہے۔ جو اسکے ذہن میں مشترک ہے۔ اسکے اس عمل سے فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔

کیوں! کونسا ضروری کام ہے۔

کیوں کا جواب دلیل ہے۔ کیوں ضرورت نہیں۔

,, میں اسواسطے نہیں جاتا۔ کہ مجھے ایک ضروری کام ہے۔ کیوں یقین نہیں۔

,, میں اسواسطے نہیں جاتا۔ کہ مجھے ضرورت نہیں۔ کیوں مخالفت ہے

,, میں اسواسطے نہیں مانتا۔ کہ میرا یقین نہیں۔

,, میں اسواسطے نہیں سنتا۔ کہ وہ میرے مخالف ہے۔ پھر پوچھا جائیگا۔

ضرور ہی کہ مکرر سوالات کے جواب میں مخاطب جو وجوہ پیش کرے۔ اور اُن وجوہ سے دوسرا فریق متاثر ہو یا کوئی اور تازہ راہ نکالے۔ آخر تک دیکھتے جاؤ۔ یہ سب مکالمہ۔ دلائل۔ اشکال۔ قضایا سے ہی مرکب ہوگا۔ یہ حالت صاف طور پر شاہد ہے کہ انسان کا کوئی عمل دلائل کے ایراد سے خالی نہیں رہتا۔ یہ جدا بات ہے کہ اُن دلائل سے اظہار صداقت ہو یا نہو۔ ۱۲

بیشک واقعات کا بھی ایراد ہوتا ہے۔ اور واقعات سے بھی ثبوت ملتا ہے۔ مگر کوئی واقعہ بھی برہان یا دلیل سے خالی نہیں ہوتا۔ عام اس سے کہ اُسپر کسی قسم کی دلیل قائم ہوتی ہو۔ جب ایک واقعہ کی بابت عینی شہادت سے ثبوت دیا جائے یا ایک واقعہ سماعی شہادت سے بیان کیا جائے تو وہ بھی ایک قسم کی دلیل سے ہی ثابت کیا جاتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ دیکھا اور یہ واقعہ سنا تو یہ بھی ایک دلیل ہی بیان کیجاتی ہے۔ یا یوں کہو کہ واقعہ بجائے خود ایک دلیل ہے۔ جب قتل کے مقدمہ میں یہ سوال ہوتا ہے کہ زید کس طرح بکر کا قاتل ہے۔ تو امر واقعہ کی دلیل یہ پیش کیجاتی ہے۔ کہ خالد نے اُسے اپنی آنکھ سے قتل کرتے دیکھا۔ اس امر واقعہ کے مقابلہ میں جبتک اور واقعی دلائل نہ پیش کیجاویں عدالت تبدیل رائے پر مجبور نہیں کیجا سکتی۔ جب دلائل بازی ہوچکتی ہے۔ اور ایک قیاس کنندہ کے نزدیک ایک واقعہ دلائل خاصہ سے ثابت ہوجاتا ہے۔ تو مشین یقین میں ڈھلکر سلک یقنیات میں منسلک ہوتا ہے۔ پھر ایسے امور ایسے قیاسات کی نسبت علمی اعتبارات سے کہا جاتا ہے۔ کہ یہ یقینی امور ہیں اور ان پر یقین کرنا یا یقین لانا لازمی ہے۔

دائرہ قیاس سے نکلکر ہم دائرہ یقین میں آتے ہیں۔ یقین کا عام مفہوم وہ حالت ہے۔ جو بے شبہ ہو یعنی جسپر کوئی شبہ عائد نہو سکے۔ یا کم سے کم یقین کنندہ کے خیال میں اسپر کوئی شبہ موجودہ حالات میں عائد نہو سکتا ہو۔ بعضوں نے یقین کی یہ تعریف کی ہے۔ کہ وہ کسی مشکک کی تشکیک سے زائل نہو سکے۔ اور بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ کبھی کبھی یقین سے مراد ظن بھی ہوتا ہے۔ یہ پچھلی رائے پایہ صداقت سے بہت دور جا پڑتی ہے۔ ظن اور شک یا وہم میں نسبت ہے۔ یقین سے کوئی نسبت نہیں دیجا سکتی کیونکہ شک وہ ہے۔ جو وجود اور عدم میں مساوی الطرفین ہو۔ اور جو طرف راجح ہو۔ وہ ایک ظن ہے۔ اور مرجوح وہم

ہماری بحث میں یقین سے وہی حالت مراد ہے۔ جو اپنے دائرہ میں بے شبہ اور بیشک ہو جسپر اپنے ہی دائرہ کے اندر کوئی شبہ ناشی ہے وہ یقین نہیں ہے۔ بلکہ ایک قیاس فائق یا قیاس خاصہ جس یقین میں ظنیات کا شائبہ ہوتا ہے۔ اسے ہمیشہ قیاس کے ماتحت ظنیات سے تعبیر کرتے ہیں

نہ کہ یقینیات سے۔ بہت سے واقعات یا امور قیاسی دائرہ میں متدائر رہکر ماتحت ظنیات ہیں۔ گو اُن ظنیات سے بھی بعض علوم کی بنیاد پڑی ہے۔ مگر انھیں باوجود اسکے بھی یقینیات میں سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور ایسے علوم ہمیشہ دائرہ ظنیات میں بھی نہیں رہتے۔ بلکہ رفتہ رفتہ اُنکی حالت بھی یقینی ہوتی جاتی ہے۔

اگرچہ بعض حکیموں کا یہ قول ہی ہے۔ کہ سوائے ریاضی کے اور سب علوم ظنی ہیں۔ لیکن ہمیں اس امر کا اعتراف بھی ہے کہ بعض اور علوم بھی ظنیات سے گذر کر یقینیات تک جا پہونچتے ہیں۔ اور یوں ریاضی یا ہندسہ کی نسبت بھی یہ کہا جائیگا کہ وہ اعتباری ہیں۔ جو ہندسہ جس نام سے اعتبار کر لیا گیا ہے اسپر ایک اعتباری دلیل کے سوائے اور کیا دلیل قائم ہو سکتی ہے۔ لوگوں نے جو دو اور دو کو چار سمجھ رکھا ہے۔ یہ اعتباری ہے۔ اس طرح دوسرے درجہ پر اوزان بھی اعتباری ہیں۔ ہم نے کہا تھا۔ کہ ظن یقین سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ لیکن بعض حالات میں ظن غالب یا قیاس خاصہ یقین کے درجہ میں آ بھی جاتا ہے۔ پہلے حکماء کے نزدیک زمین ساکن اور آسمان متحرک تھا۔ اس زمانہ کے حکماء زمین کی حرکت کے قائل ہیں پہلے عناصر اربعہ ہی تھے اب زیادہ سمجھے جاتے ہیں پہلے آکسیجن (Oxygen) اور ہیڈروجن (Hydrogen) کی تفریق نہ تھی۔ اب کی جاتی ہے۔ حقائق اگرچہ ظنیات میں داخل نہیں۔ لیکن موجودہ علوم نے ان کی جس عمدگی سے پوست کندہ تشریح کی ہے۔ وہ ظنیات غالب کی صورت میں آکر یقینیات میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ کسی آیندہ زمانہ میں یہ تحقیقاتیں بھی ۲+۲ = ۴ کی طرح یقینی سمجھے جائیں۔

اخلاقی فلسفہ اور خود منطق کی کتبیں شروع شروع میں محض ظنیات میں شامل ہیں۔ اسی طرح مذہبی عقائد بھی ابتک بعض لوگوں کے نزدیک محض ظنی ہیں۔ ایسے سب علوم کا نام خیالی ڈھکوسلے رکھا جاتا ہے اور اب بھی بعض لوگ اسی نام سے انھیں تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن ان علوم کے صدہا مسائل ایسے بھی ہیں کہ جنھیں ایسا ہی ثابت کیا جاتا ہے۔ جیسے مسائل سائینس۔ سائینس کی اصلی بنیاد تجربہ پر ہے۔ اور ان علوم کے اکثر مسائل کا ثبوت بھی تجربات پر موقوف ہے۔ بلکہ ابتو بعض فلاسفران یورپ نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے۔

کہ اخلاقی فلسفہ اور سوشل فلسفہ اور علم الحیات سائنس سے ثابت ہی۔ اور سائنس اُن کی تائید میں ہی۔ اور بعض یہانتک کہتے ہیں کہ دراصل یہ سائنس ہی ہیں۔[1]

قیاس کی طرح یقین کے بھی درجے ہیں۔ عام طور پر تین درجوں میں یقین کی تقسیم کیجاتی ہی۔

،، علم الیقین پہلی شق سے وہ یقین مراد ہی۔ جو اقوال مہرہ یا تصدیق ثقات

،، عین الیقین یا طریق تواتر کے تابع ہوتا ہی۔

،، حق الیقین

دوسری شق سے وہ یقین مراد ہی۔ جو اپنی آنکھ سے دیکھنے یا محسوس کرنے کے متعلق ہی۔

تیسری قسم سے وہ یقین مراد ہی۔ جبکہ کسی شئے کا علم یا احساس من جہت۔ کیفیت و ماہیت کما حقہ بہ جمیع حواس حاصل ہو۔

یہ ایک علمی تفریق ہی نہیں۔ عامیانہ مذاق کے مطابق بھی یقین کی کم سے کم انھیں درجوں میں تقسیم کی جاسکتی ہی۔

ہمارا کوئی علم بھی تین حال سے خالی نہیں ہوتا۔

،، یا تو ہم کسی کے اعتبار پر کوئی علم رکھتے اور یقین کرتے ہیں۔ اور یہ شق کم وسعت نہیں رکھتی ہمارے ذخیرہ تاریخی۔ واقعاتی۔ مذہبی۔ روحانی کی اکثر شاخیں اور قضایا اسی شق سے وابستہ ہیں۔ اگر اس شق پر وثوق نہ ہو۔ تو آج کوئی تاریخ بھی قابل تمسک نہیں رہتی۔ جن امور کا ثبوت اسناد اور روئت پر ہی۔ اُن میں سے کچھ ہی نہیں بچتا۔ تاریخ سے قوموں کے عروج اور تنزل کا ثبوت ملتا ہی

[1] افلاطون کے زمانہ میں تمام قسم کا فلسفہ اور تمام قسم کے سائنس ایک ہی تعریف کے نیچے سمجھے جاتے تھے۔ اور اُنکی اندرونی تقسیم یا تفریق جیسے زمانہ حال کے حکیموں نے (جنکا شروع پندرہویں یا سولھویں صدی سے ہوتا ہی) کی ہی۔ متقدمین یونان کے زمان میں نہیں ہیں۔ پہلی تقسیم کی رو سے روحانیات بھی فلسفہ میں داخل ہیں۔ اور اخلاقی مسائل کا ثبوت بھی سائنس کے زور سے دیا جاتا رہا ہی۔ گو اب جداگانہ شقوں میں ترتیب دی گئی ہی۔ مگر ایک گروہ حکمارحال کا بھی یہ میلان یا یہ عقیدہ ہی۔ کہ اخلاقی مسائل اور روحانی ابحاث سائنس کے زور سے ثابت کیجاسکتی ہیں۔ اور وہ بجائے خود علمی سائنس کا ایک حصہ ہیں۔ ۱۲۔

اگر یہ شق جائز نہ رکھی جائے تو ان معلومات کا کوئی اور ذریعہ ہی نہیں۔

دوسری شق اُن تمام واقعات پر حاوی ہے۔ جو مشاہدات[۱] عینی اور تجربات عامہ وخاصہ سے متعلق ہیں۔ اس شق کے دائرے میں وہ تمام علوم اور فنون آجاتے ہیں۔ جنھیں ظنیات سے بہت فاصلہ پر سمجھا جاتا ہے۔ اور اس شق کا بہت کچھ تعلق سائنس یا تجربی واقعات سے ہے۔

تیسری شق جو سب شقوں سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ انکشاف حقیقت کا نام ہے۔ جب ہو بہو راز کھُلجاتا ہے۔ تو اُسوقت کہا جاتا ہے کہ حق الیقین کا درجہ حاصل ہوگیا۔ اور اُس مرکز تک رسائی ہوگئی۔ جس سے آگے انسانی ادراک فائز نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلا یعنی دوسرا درجہ یقین ہی کے نام سے موسوم ہوتا ہے لیکن یہ تیسرا درجہ پانچویں رکن حقیقت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

---

[۱] اگر ذرا بامعان نظر دیکھا جائے۔ تو دراصل بہت سے یقینیات کی بنیاد بھی دوسری شق ہے۔ بہت قسم کے یقینیات پہلے عینی ہی ہوتے ہیں۔ بعد ازاں انھیں علم الیقین یا حق الیقین کا درجہ ملتا ہے۔ ایک طریق سے تاریخ کا مدار سمعیات اور روئت یا تصدیق ثقات پر ہے۔ اور دوسرے طریق سے ایسے تمام واقعات جنھیں سماعی اور روایتی سمجھا جاتا ہے۔ ایک گروہ سے من جہت روایت وسطہ رکھتے ہیں۔ مثلاً صفحات تاریخ میں بوناپارٹ کا ذکر اس زمانہ کے لوگوں کے واسطے ایک سماعی واقعہ ہے۔ لیکن جو لوگ بوناپارٹ کے ہمعصر تھے۔ اُنکے مقابلہ میں ایک عینی واقعہ ہے۔

اسی طرح جو واقعات حق الیقین کی سلک میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ بھی پہلے گروہ کے مقابلہ میں دوسری شق سے عینی متعلق تھے۔ شق ثانی سے شروع ہوکر وہ شق ثالثہ تک پہونچتے ہیں۔ گویا شق ثانی۔ شق اول اور شق سوم دونوں سے یکساں فاصلہ رکھتی اور ام الشقوق ہے۔ ۱۲۔

[۲] مذہب اور فلسفہ میں ایک نسبت ہے۔ جو لوگ اس لازمی نسبت سے ناواقف رہکر ان دونوں میں ایک وسیع بعد اور مغائرت بتلاتے ہیں۔ وہ ان آنکھوں اُن دونوں کا مطالعہ نہیں کرتے۔ جو انکے مناسب حال اور موزوں ہیں۔ فلسفہ کی اصطلاح میں ایسی حالتوں کا نام یقین اور حقیقت ہے۔ اور روحانیات یا مذہبیات میں انہیں ایمان اور عرفان کے نام سے موسوم اور تعبیر کرتے ہیں۔

جیسے یقین کی تین قسمیں ہیں۔ ایسے ہی ایمان کی بھی تین قسمیں ہیں۔

،، ایمان باللسان

،، ایمان بالعمل۔

،، ایمان بالحقیقت۔

ان ہرسہ میں سے تیسری قسم کا ایمان اعلیٰ ہے۔ اور اُس سے جو اعلیٰ حالت پیدا ہوتی ہے۔ اُسکا نام

پانچواں امر مناسبہ حقیقت ہی - جب ایک انسان یقین کے درجے طے کر چکتا ہی - تو علمی منازل میں اسکے واسطے یہی درجہ باقی رہجاتا ہی - اس منزل میں آکر انسان اُن علمی دقائق اور نکات سے واقف ہوتا ہی - جو پہلی منزلوں میں صرف سماعی اور قیاسی تھے - یہاں پہنچکر اُن راہوں سے گذرتا ہی - جو راہیں پہلے مراتب میں خیالی اور ظنی شمار ہوتی تھیں - نیچر کی اُن باریکیوں اور اُن نسبتوں سے آگاہی حاصل کرتا ہی - جو عام مذاق کے بالکل خلاف ہوتی ہیں - یہاں پہونچکر وہ رموز وا ہوتے ہیں - اور وہ عقیدے کھلتے ہیں - جو مدتوں سے سربستہ اور سربمہر تھے - ان عقدہ کشائیوں سے اپنی حقیقت بھی کھل جاتی ہی - اور اس مقدس قول پر نظر پڑتی ہی - مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ اور پھر زبان حال سے یہ کہنے لگتا ہی ؎

ؔ ز طوفانِ سرِ شکم شور افتادست در عالم ؔ

ؔ بہر سو بنگرم جز ماجرائے خود نمی بینم ؔ

اور اسکے ساتھ ہی یہ عقدہ بھی کھل جاتا ہی - کہ دفتر نیچر اور ذخیرہ قدرت سے جو کچھ دیکھا بھالا او

نوٹ بقیہ صفحہ ۲۱۱ - بمقابلہ حقیقت کے عرفان ہی جو لطف اور جو سرور ایک فلسفی حقیقت کے درجہ پر پہونچکر دیکھتا اور محسوس کرتا ہی - وہی حالت اور وہی سرور ایک مذہبی یا صوفی اس درجہ میں آکر پاتا ہی - اس منزل پر دونوں پلے ترازو کے برابر ہوجاتے ہیں - ایک پلہ دوسرے کے مقابل میں آجاتا ہی - اُسے اپنا وزن معلوم ہوتا ہی اور اُسے اپنا -
جیسے اس درجہ پر پہونچکر ایک روشن خیال منطقی حیران ہوجاتا ہی - ایسے ہی ایک زاہد متقی بھی سرگردانی کے وجد میں آکر اللہ ہو کرنے لگتا ہی - دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں - اور دل کے پرزوں پر ایک روشنی پڑتی ہی - تمام اوہام تمام خیالات اور تمام یقینیات کی یہاں آکر حقیقت کھلجاتی اور پردے اُٹھ جاتے ہیں - روحانیات اور مذہبیات پر جسقدر اعتراض اور نکتہ چینیاں کیجاتی تھیں - انکی تہ نکل آتی ہی - ایک ہی آئینہ میں روحانیات اور فلسفہ کا جلوہ نظر آتا ہی - فلاسفر ([illegible]) روحانی بزرگوں کی تعظیم اور تقدیس میں جھکتے ہیں - اور روحانی بزرگ فرط محبت اور طیبت خاطر سے فلاسفروں کی کمزوریوں اور نکتہ چینیوں پر خط نسخ کھینچتے جاتے اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں - ہفتاد و دو ملت کے جھگڑے اور خرخشے تمام عمر کے لئے ختم ہوکر چشم زدن میں نپٹ جاتے ہیں ؎

دل باختم از خصمے ہفتاد و دو ملت
آں بہ کہ ازیں معرکۂ جنگ برآئیم

لیا تھا۔ وہ بہت ہی کم اور معمولی حصہ تھا۔ اسکے واسطے عمر طبعی کیا عمر زمانہ بھی کافی نہیں۔ مواد قدرت اور ذخائر نیچر کے سامنے ہماری بضاعت اور بساط ہی کچھ نہیں۔ جو جانا کم جانا بلکہ کچھ بھی نہ جانا۔

اس مرحلہ پر پہونچکر انکشاف حقائق سے اُن علوم حقہ کی بنیاد پڑتی ہے۔ جو دنیا میں انسانی نسلوں کیواسطے مایۂ فخر اور موجب غیرت ہیں۔ جیسے انسان کے اخلاق فاضلہ کی بنیاد پڑتی ہے اور تمدنی ضروریات کا سرمایہ ہاتھ لگتا ہے۔ فلسفہ فلسفہ کی حیثیت میں آجاتا ہے۔ اور سائنس سائنس کے رتبہ پر۔ روحانیات پر مزید روشنی پڑتی اور اُن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ انسان یہ سمجھنے لگتا ہے۔ "میں کیا ہوں" - "کیا تھا" - "کیا ہونا چاہیئے"

سلطان احمد - میاں والی پنجاب -

اولڈ بوائز کے متعلق خبریں

ہمکو نہایت خوشی ہے کہ سید عبداللہ شاہ صاحب بی۔ اے سابق طالب علم مدرسۃ العلوم علیگڈہ حال انسپکٹر ڈاکخانجات ضلع انبالہ جو ایام طالب علمی میں نہایت سعید طلبا میں سے تھے اور ایام ملازمت سرکاری میں بھی ہمیشہ نہایت خوش اطوار اور نیکنام رہے۔ اب ریاست مالیر کوٹلہ کے فارن منسٹر مقرر ہوئے ہیں۔ ہم ولیعہد صاحب کو اُنکے عمدہ انتخاب پر اور شاہ صاحب کو اُنکے جدید منصب پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ شاہ صاحب اپنی راست بازی اور اعلیٰ قابلیت سے ریاست کو بہت کچھ فائدہ پہونچائینگے۔

این ماتم سخت ست کہ گویند جوان مُرد

ہمنے اس خبر کو نہایت افسوس کیساتھ سنا کہ ہمارے کالج کے ایک زندہ دل اور ہر دلعزیز سابق طالب علم عبدالحکیم صاحب بی۔ اے ہیڈ کلرک جمی سہارنپور نے چند روز بیمار رہکر اس جہان فانی سے رحلت کی۔ مرحوم اپنے فرائض منصبی کو عمدگی سے انجام دیتے تھے باوجود کثیر الاشغال ہونیکے کالج کے جلسوں سے نہیں دلچسپی تھی اور کالج کو اپنی آمدنی کا ایک فیصدی دیا کرتے تھے اور کالج کے جلسوں میں اکثر شریک ہوتے تھے۔ ہمکو اور نیز اُنکے تمام دوستوں کو اُنکی دائمی جدائی کا سخت رنج ہے خدائے تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے اور اُنکے پس ماندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

[illegible]

ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو ارکیپر صاحب بہادر
ایف - سی - ایس - اے - آر - ایس - ایم - فیلو آف کمسٹری لندن

[illegible]

جس کی نسبت لندن و کلکتہ و پنجاب و آگرہ میڈیکل کالج کے سند یافتہ معزز ڈاکٹروں و نوابوں و راجاؤں کے معزز حکیموں وصاحبان جج بہادر وصاحبان ڈپٹی کلکٹران بہادر معزز یورپین صاحبان انگریز بہادر وغیرہ نے بعد تجربہ و استعمال کے ہمکو لکھا ہی کہ آپ کا ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ آنکھوں کی بیماریوں و ترقی روشنی کیواسطے بہت مفید اور سب سے بہتر و زود اثر دوا ہی کہ جسکے سارٹیفکٹ بوقت فرمایش آپ کی خدمت میں ہم خود بھیجدینگے - ملک روس و غیرہ کے معزز ڈاکٹران و حکماء آنکھوں کی بیماریوں میں اور دوا کو چھوڑ کر ہماری اس دوا کو استعمال کرتے ہیں ہم نے اصلی اور عمدہ ممیرہ بڑی تلاش سے ہندوستان کے باہر سے منگایا ہی -

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اُس میں جلد کامیابی

نگاہ ناپ کر ہمارا سرمہ لگائیے[۱] دو ہفتہ میں روشنی آنکھ کی بہت بڑھجاویگی اور آنکھ کے جملہ نقص دور ہوجاینگے. عینک[۲] کی ضرورت نہیں ہیگی - دھند[۳] - ڈھلکہ[۴] - آنسو بہنا[۵] - سرخی[۶] - سوزش[۷] - کھجلی[۸] - آنکھ کے سامنے کا اندھیرا[۹] - پلکوں[۱۰] کے اندر کے دانے و سرخی - گوہانجی[۱۱] - لکھنے پڑھنے سے آنکھوں کا تکان[۱۲] - درد بہت جلد بشرطیکہ رفع کرتا ہی - کمزور نگاہ سے سوئی میں تاگا بہت جلد چھوڑیے[۱۴] پڑوال[۱۵] سبل[۱۶] - جالا[۱۷] - پھولی[۱۸] - ابتدائی موتیابند[۱۹] - ناخونہ[۲۰] - گلرے[۲۱] (۲۲) آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑجانیکو (۲۳) پلکیں گرجانیوالی بیماری کو مفید ہی (۲۴) کمزور آنکھ کو قوت دیتا ہی (۲۵) آنکھ کا میل اور مواد صاف کرتا ہی (۲۶) اور جملہ امراض سے محفوظ رکھتا ہے قیمت فی تولہ (۳) تین روپیہ محصولڈاک ۴

المشتہر سرن تکم کانپور - اپنا نام ومقام ونام ڈاکخانہ وضلع خوشخط لکھو - ورنہ تعمیل نہو گی -

چند معزز اور قابل قدر ولائق اطمینان شہادتیں

(۱) عالیجناب ڈاکٹر ای - وائی روٹر صاحب بہادر آر - ڈی - ایم - بی - ایل - لندن -
(۲) جناب ڈاکٹر ایچ - بی - بنرجی صاحب ایل - ایم - ایس - وسرجن کلکتہ -
(۳) جناب ڈاکٹر بی این بنرجی صاحب ایل - ایم - ایس - اسسٹنٹ سرجن میرٹھ
(۴) جناب ڈاکٹر الہ یار خانصاحب - ایس جی - سی - ہاسپٹل اسسٹنٹ ضلع بجنور -
(۵) جناب ڈاکٹر عبدالصمد خانصاحب - ہاسپٹل اسسٹنٹ ضلع کانپور -

(۶) عالیجناب شمس العلما خان بہادر مولوی محمد ذکاءاللہ صاحب پروفیسر سابق میور کالج الہ آباد -
(۷) جناب مولوی فصیح الدین احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر اسسٹنٹ مہتمم بندوبست کانپور -
(۸) عالیجناب میر حمزہ حسین صاحب بی اے بی - ال - سب جج بہادر مقام منگلور -
(۹) عالیجناب مولوی سید حامد حسین صاحب منصف درجہ اول ضلع ہمیرپور -
(۱۰) عالیجناب منشی دھنپت لال صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر ضلع بستی -

(۱۱) عالیجناب مسٹر من بہاری صاحب ککڑجی ایم - اے - ایل ایل بی سشن جج بہادر گونڈہ -
(۱۲) عالیجناب مسٹر نیل مادھب رائے صاحب بی اے - بی - ایل جج خفیفہ بہادر کانپور -
(۱۳) عالیجناب مسٹر شب شنکر لال صاحب سٹی مجسٹریٹ بہادر مقام منڈلیسر -
(۱۴) عالیجناب مسٹر جی ڈالی صاحب بہادر اور سیر مارتھہ ویسٹ ٹیزی - کانپور -
(۱۵) عالیجناب جی بھاگ صاحب بہادر انجینیر ریلوے -

ul-lah, Basit and Abdul Aziz. Five players of the First Year are of the College 1st XI and the rest the best of the 2nd XI. Thus the Second Year was no match for the First Year and the First Year well and rightly deserved the position. I finish the description of the League matches with one remark and that a most pleasing one, namely, this year has been marked by the punctuality and the promptness on the part of all the players, taken individually--the one great instruction of games besides the giving of exercise, was fully secured this year. We could not better have taught the players and so, the spectators, this great principle.

After the finish of the Final, medals were distributed to the winning team by Mrs. Archbold. The Morison Medal for the best Football player of the College offered by Abdul-Majid Khan, ex-Football Captain, was given to Iqbal Ali, the captain of First Year. Also one medal from the present captain was given to Masud-ul-Hasan of the Entrance, being the most improved player of the year. Mr. Maharaj Singh, the Deputy Collector, has kindly offered a challenge shield which will be given to the winners of the League matches. I, on behalf of the members of the Football Club, offer him our most hearty thanks not only for his kind contribution but for his taking a lively part in games and for coaching our players.

TASADDUQ AHMAD KHAN,

Football Captain.

League matches of the last year. The IX Class possessed great strength but did not seem to have been acquainted with the tactics of the game. It would have been to the great interest of the spectators if the IX Class had played in the final. After all, its full-back Ali Husain and its captain Abdullah played an excellent game throughout. The Fourth Year fell nearly to the bottom getting only 2 points out of 14, being just above the VII and VIII by one point. But it was very pleasing to notice that they were always found ready to fight the game out however strong their opponents were and they were seen everyday struggling hard with their opposing teams.

The Third Year turned out what is called in Urdu "*chupa Rustam*" (Hercules in oblivion.) This team which had in it quite new players altogether, who knew nothing about the game, occupied a position only next to the best teams. It got 6 points having beaten the Seventh and Eighth, Fourth Year and the Lower classes. One remark about it will suffice *viz* that it contained some promising players who can be brought up to the level of first class players easily with little training and practice.

The Entrance class which used to be the winning team lost its established fame this year though their captain Masud-ul-Hasan who played an excellent game throughout, tried his best to keep it up. It adds much to his credit that it lost only one match against the IX ; in others it either won or drew. The Seventh and Eighth classes seemed almost to have dragged their team in the field. It occupied the last place having drawn with the Fourth Year. The Lower classes got 3 points having beaten the Seventh and Eighth classes and having drawn against the Fourth Year.

The Second Year got 11 points and the First Year 13. The final was played on a fine evening before a large number of spectators including Mrs. Archbold and Mrs. Gardner Brown. The game was very scientific. The Second Year fought well and showed its best form on that day. Certainly it is a very great credit to the Second Year to have fought so hard and to have exhausted all its energies and faculties against a team for which it was no match at all. Among the Second Year's conspicuous players were Muzaffar in goal, Karim Hyder as a back. Samad, the captain, as a forward. The prominent players of the First Year were Aftab Umar Iqbal Ali, the captain, Abdul Wahab, Ali Raza, Moin, Nur-

consistent with good education, with refined tastes to own such low ideals. Such acts not only lower a nation in the estimation of others, but enfeeble the mind so much that all virtues, all noble thoughts, all high ideals are one by one cast off, and this means a retardation rather than a progress. I wish to warn you to-day that you should not reason within yourself that, if honesty is a rare thing even in those to whom you look for guidance why should you be honest? Remember that:

Man is his own Star; and the soul that can
Render an honest and a perfect man
Commands all light, all influence, all fate;
Nothing to him falls early or too late.

The Football League 1906.

The chief feature of Football in the last two months has been the League-matches. The different teams were informed of the approach of League-matches at an earlier date and so players of almost all the teams turned out for practice nearly daily. The League-matches commenced on the 14th of February, an unusually early date on account of the examination in April. The weather had been very fine especially in the evening and therefore the games were interesting. Not so much zeal and interest was shown by the spectators as last year who remained calm and quiet in all the matches except in the IX *vs.* Second Year, and First Year *vs.* Entrance, and thus one of the greatest principles of making, even a bad game of Football, most interesting by shouting and cheering, was lost.

Inspite of this the games were good and scientific. Hard competitions arose among the Second Year *vs.* the First Year and the IX Class. Great dash was shown by the Second Year Class. Inspite of the fact that it contained only some two or three regular players, it fought pluckily up to the last and unfortunately was defeated by the First Year in the final. It was very unlucky in missing some four good opportunities against the First Year, one of which was a penalty kick. The First Year, the winning team, well deserved the position it occupied. It contained almost all the players who won the

exhaust the oil but never get near the knowledge. They try to learn words not ideas and the result is that if, perchance the words are forgotten, as they would be in the course of time there are no ideas left.

Again, our students do not value each other for the qualities which may be found out of the common in any of them, nor do they encourage each other in the further development of such gifts.

Then again, there is little feeling among our students. Their Primary education has been so much at fault and they have been in such bad hands that they have acquired a wrong conception of humanity. A mohammadan, for example, can only think of another mohammadan as a human being the others being next to brutes in his eyes. The same may be said of hindus and christians. In the wrong interpretation of their religious principles they seem to forget that God has made all human beings and therefore no matter what their creed is, they must be the same, hence all of them deserve to receive equal consideration, equal appreciation and equal treatment.

Lastly, I find that some of the students are not honest in their work. This is to be greatly deplored. Let us remember that the key-note of all future success is not so much the manifestation of deep knowledge in professional subjects as the possession of two rare qualities—honesty and sympathy. The first thing, sought after by your patient, would be sympathy. Imagine yourself lying ill in a precarious condition ; if your medical man enters your room gently, asks for you kindly and answers you encouragingly, you feel better and stronger by his presence and will rest confidence in him ; but if he were to enter noisily, ask for you abruptly and answer you tartly you will certainly feel depressed and will begin to have fears about your recovery. As Orientals we are accustomed to receive real sympathy from each other and hence I entreat you that you must take good care to develope this quality ; it will give you an inward satisfaction and an encouragement in your work.

The other quality which you must possess if you wish to succeed in the future is *honesty*. How many of us falsely think that a small wordly gain whether acquired by fair means or foul is not to be despised. There is no doubt that often people do thrive on such false gains. But it is not

Contrast the student life here with that of England and one is at once struck with the vast difference between the two. The very first day that a student enters a class in England his relationship with his professor is established, The professor hardly ever sees us or talks to us in person and yet we are carried away by his devotion, his enthusiasm, his sincerity and his personality. An English student is more independent than an Indian—he can audibly or by signs disapprove of his teachers' statements and yet this independence seldom amounts to rudeness and the youth tries to find favour in the eyes of the old man by his honest work alone. The teacher, on the other hand, addresses his pupils with politeness and treats them as gentlemen ; while those who are fortunate to know him personally outside the class room, always find him affable, encouraging and sympathetic. His personality stands as a guiding star to the pupil.

Another thing that developes the character of a student is the under-current of social life found running in these English institutions. There is a healthy rivalry no doubt, but thanks to the good Primary education of British lads there are no prejudices, no feelings of malice nor of hatred towards each other. The school-life brings together fellows of different aptitudes—not merely book-worms but athletes, artists, musicians, authors, politicians, humorists and others ; by mutual selection certain groups are formed where these elements combine. Each member of the group is valued for certain brilliant qualities, the others encouraging him to shine out in these more and more. One's corners are thus rounded off, a character is fully matured, besides which bonds of friendship are held whose values increase as time passes on.

Now turn to similar institutions of this country. There is not the remotest sign of trust, confidence or sympathy between a student and his teacher here. Both the teacher and the taught have of course to show work but whether that work is done well or not, whether enthusiastically or not, no one cares or appreciates. I doubt very much if the teacher is familiar with the faces of his students much less with the qualities that they possess. To my mind unless these qualities are fathomed out, unless the students are encouraged in the honest discharge of duties and unless moral rectitude is placed before them not in theory but in actual practice, their characters cannot be influenced.

Then again, five per cent of the students after burning the midnight oil may acquire real knowledge, but the rest

If perchance you find in them a few grains of truth and if you try to remember them for the future I shall be satisfied that I have not wasted your time but given you a stimulant to help you to plod through your future difficult task.

Most of you, and I sincerely hope all of you, are about to enter a new phase of life—the life of a student being replaced by that of a public servant. This is a serious change, for though you may acquire good position and good income yet the life that you are leaving cannot be equalled for independent action, for good comradeship, for youthful cheerfulness for vigorous exertion to acquire knowledge. Indeed this is the portion of your life-time which you ought to value most and upon which you should ever look back with pride and pleasure. During this portion of your life you have fully developed your mental faculties, you have learnt to exercise your powers of judgement and as students of medicine you have developed powers of observation, of quick judgement and ready action ; you have also learnt to keep your head cool and to possess a steady hand. Here you have constantly come face to face with the troubles, the miseries, the throes and pangs of mankind: all these must have left a grave impression upon you and must have taught you to be gentle and sympathetic with the afflicted ; for, after all, we are all mortals and one day we are sure to be in similar trouble ; when in trouble, it is human nature to seek sympathy from another fellow-creature. How then can you expect to receive sympathy if you do not know how to be sympathetic?

Each man has certain duties to perform whether he be an independent student or a dependent servant. The fact that I have noticed some of you failing in your duties as students leads me to say one or two things for your future guidance. Do not think that I rest the whole blame of this failure upon your shoulders. If you are not shown the right way or if you are not encouraged to follow the right way how can you be blamed for going astray. Seeing that you have spent four years of the happiest portion of your life when, as I have said, you learn to form ideas, to fathom thoughts, to reason out right or wrong, is it much to expect from you at the end of this time to have got hold of certain moral principles and to have formed a character for yourselves? But I am sorry to find that your teachers have not recognised that they are not merely to teach you the active princples of drugs but also some active principles of morality. This want of recognition has resulted in the production of characterless pupils.

The other use which I think these two books have for Englishmen is that, they challenge comparisons between one nation and another, between the Burmese and the English. I do not mean that they make a man ask : whose life is the better, the Burmese or the English? but the books certainly do keep suggesting comparisons in individual points. In some points the Englishman will think his own way the better, but in many points he is bound to admit that the Burmese way is the better. And so from looking at a different race from an outside point of view we become better able to take a calm and detached view of ourselves—as Burns says "to see ourselves as others see us."

It seems to me that there is a distinct opening for books of this kind about all the peoples within our Empire. The ordinary Englishman has not much knowledge of the inhabitants of India, except of those temporary residents there of whom Mr. Rudyard Kipling writes. Probably also many natives of India and of other parts of the world find it difficult to understand Englishmen. Books like these two by Mr. Fielding Hall would do much to make us all better known to each other—far more than any number of learned historical or ethnological treatises. *Verbum sapienti satis sit* !

I am, Mr. Editor,
Yours etc.,
G. P. GOODALL.

Address to the Final Year Students of the Agra Medical College,

BY

SAHEBZADA SAID-UZ-ZAFAR KHAN, M. B., ETC.,

LECTURER.

STUDENTS OF THE FINAL YEAR

Although I belive I am not following any precedent or custom of this School in addressing you on an unprofessional topic on this, the last day of our meeting here, yet a strong inclination prompts me to say to you a few words of farewell.

much talk in the House of Commons, first, on the address in reply to the King's Speech from the Throne, then, on several resolutions purposely proposed to raise discussion on matters of interest such as the Fiscal Question, Chinese Labour in South Africa, etc., and now the House is engaged on the annual work of going through and approving of Ministers' Estimates of Expenditure in their various departments for the comming year. The important legislative proposals promised in the King's Speech have not yet been reached. When they are discussed in detail there will be much controversy and probably one or two "big fights," but until that time I will leave politics out of my letters.

I read, a few weeks ago, Mr. Fielding Hall's new book "A People at School" It is a sequel or complement to his earlier book "The Soul of a People." Mr. Fielding Hall was originally in the service of a trading firm in Burmah, but since about 1885, I gather from his books that he has been in the Civil Service in that country. The two books should be read together in the order of their publication and they will be found to give a most interesting account of the Burmese, their customs and religion and national and individual characteristics. To an Englishman, I think, these books have a two-fold use. In the first place they enable him better to understand a people, who although subjects of the same Empire as himself, yet differ from him profoundly in custom and traditions and (which makes a deeper difference still) in individual feeling or instincts. And to promote a better understanding between all the many races and religions which come into such close contact with one another in commerce and are united into one vast political organisation is to my mind a great public service. Such an account as Mr. Fielding Hall gives of the Burmese can only be written by one who has wide knowledge of his subject and a deep sympathy or love for the people of whom he tells. A mere summary of a nation's characteristics, and of the qualities and faults of its people, written perhaps by some traveller of only a few year's experience, could never present a living portrait of that nation. If the picture is to strike us as real, it must be painted by an artist who loves his subject. And hence it seems to me to show misunderstanding of the intention of the books to accuse the author (as some people do) of partiality. If Mr. Fielding Hall writes as one who loves his subject that is not a fault, but in an author who does not profess to judge but merely to describe it is a positive virtue, an indispensable qualification for his work.

his faith etc., are apparent throughout these letters. The Emperor was himself a scholar and the letters are important as coming from the pen of one who was such a strange combination of the highest virtues required in a ruler and of the fatal short-sightedness in dealing with his non-Mohamadan subjects that brought about the downfall of his empire.

6. A few words about the respective merits of some of the prose writers mentioned in the course of this lecture will not be out of place. Khund Mir, the author of the Habibus Siyar, was a very learned man and education was almost hereditary in his family. His father was also the author of several works and was the first to begin that grand book of history which was so successfully completed by his learned son Khund Mir and hence it is ascribed to him. The father and son are so very similar in their style that the student is liable to fall into an error about their works.

7. Mulla Husain Wa'iz, as his name shows, was a great learned priest. He was appointed tutor and companion to the Prince Mohsin and one of his books the Akhlak-i-Mohsini is named after that prince. Another and most important work of his is the Tafsir-i-Husaini --a very learned commentary on the Koran, which is regarded as a very authentic work of reference in matters of religion. He is also the author of the Anwar-i-Suheli, a book which has a high place in Persian and its importance can be determined from the fact that it has been translated into five different languages : Arabic, Hindustani, English, French and German while the original work stands in the Sanskrit language.

Abul Fazal has already been mentioned and Sa'di the author of Gulistan will be treated under Sufi poets where we find him at his best.

(*To be continued.*)

Letters from England.
Number III.

28th March, 1906.

DEAR MR. EDITOR,

The political situation here does not just now provoke me to any comments. Since Parliament met there has been

5. Another division that deserves consideration is what is known in Persian as Insha which may be translated as "Letter-writing." The Persian Insha is quite different from what a student of English understands by "letter-writing." It is the Insha which is usually the test of a scholar's abilities and there are many important works written on this subject. It took a long time for the student to learn what different modes or forms of address were to be used in the case of the sovereign, the father, the mother and, the friends of the writer. Every one was to be addressed in the most polite language that could be used for that particular relation, and as a natural consequence, help was sometimes sought from exaggeration. This may be due to the strict instructions of Islam for duly observing respective social positions. Compare the sayings of Mohamad : "Paradise is under the feet of your parents"; "The King is the shadow of God on Earth"; Verily all Moslems are brethren"; etc. Hence we find that a father writes to his son : "Oh light of my eyes, the comfort of my heart, the pride and glory of the family ....may thy life be as long as the Sun revolves round the Earth;" and *vice versa*. The Dastur-ul-Insha, Insha-i-Khalifa Mukatibat-i-Abul Fazal, Ruq'at-i-Alamgiri are some of the chief books and contain many excellent letters. The style employed in important letters is rhythmic and this is really the difficult part of the composition. It is semi-poetic and as "a poet is born and not made" so is it necessary for such a writer to be gifted with some poetic powers. In support of this statement. I have only to say that some of these letters have never been imitated, though attempts were not wanting. The famous Abul Fazal of the court of Akbar, whose letters form the subject of Persian study for the M. A. Examination of the Bombay University is one of the best letter-writers. His letters are in the form of official communications from the Emperor Akbar to his numerous Generals and High Officials of State; and throw a clear light on the Government and Administration of that Great Mogul. You get an insight into the ideas of the author through these letters and the student may judge for himself how far Abul Fazal is responsible for influencing the mind of Akbar in matters of religion.

The comparison between these letters of Abul Fazal and the letters of the Emperor Aurangzeb to his sons will no doubt interest the Indian student. Aurangzeb, as we know, was a strict Mohamadan and instances of his personal piety, fondness for hard work, strict adherence to the principles of

the lives of great religious leaders, the rise and fall of the numerous Mohamadan ruling dynasties etc. The author of this book is Khund Mir a great scholar of his time.

The Tarikh-i-Farishta is a history of India up to the middle of Akbar's reign and is the best book on the five Deccan Mohamadan Kingdoms. It has been translated into English by Colonel Briggs and the translation is worth reading.

4. Having said this much about History, let us see the position of the Novel, the Drama etc. It would appear strange when I say that there are no dramas and almost no novels in Persian. As for the drama the solution is not far to seek. In the first place there was a religious prohibition for amusements of this kind and secondly the prohibition was strictly observed by almost all Moslem rulers, whatever their moral tendencies may have been. We must not forget that, what we call to-day the Liberty of the Press was not known in the time when the current of Persian literature was in its full force.

The explanation for the absence of the novel is that, even among European countries novels, as we understand them, are not of a much older age. It is no wonder then that they did not exist in the period which has produced many eminent historians and poets. We know that in English literature the place of the novel was formerly occupied by Myths, Tales of Adventures, Wonder and Horror etc. Similarly the Persian literature was full of Tales of Imagination, Stories of the Exploits and Deeds of imaginary Kings beginning with the usual words "Once upon a time there was a King" and so on.

There are few who are unacquainted with the name of the Arabian Nights. What is it ? Except the name of the Caliph Haroon-ur-Rashid there is scarcely any person mentioned in the Tales that had human existence.

Two other points deserve notice in connection with the themes that fill the pages of these voluminous writings, *viz* the doctrine of predestination and the infidelity of women. Pages after pages in prose writings, and lines after lines in poetry will be found dealing with these subjects. More will be said of them when I discuss the position of poets.

have a number of works such as Commentaries on the Koran, Exposition of the traditions of the prophet in which the sayings and doings of the prophet have been collected for guidance; Controversies between the various sects of Islam wherein each section maintains that it is on the right path and defends its arguments by quotations from the Koran and the traditions; Books on the instruction of religious ceremonies like the Namaz and Roza etc. It is needless to enter into details on this point. Some of the famous books of this kind are— (صحیح بخاری) Sahihi Bukhari, Sehai Sitta, Tafsir-i-Raufi etc.

2. Writers on moral subjects.—The chief characteristic of books of this kind such as the Gulistan, Anwar-i-Suheli, Akhlak-i-Mohsini etc., is that they are written in the form of stories and parables in which the parties represent the different human feelings and the lessons to be learnt therefrom are not difficult to seek Shaikh Sa'di, Mulla Husain Wa'iz are some of the best moral writers.

3. The next item for consideration is History. Persian histories and biographies have a peculiarity of their own. The hero is generally described as infallible, whatever his qualities and faults may be. It was customary to use flattering language and exaggerated eulogiums for him. The spirit of history is set aside and the writer at times forgets that his task as a historian is to write an account of the facts and the social condition of the times, and not the details of the real or imaginary virtues of his hero. This statement should however be made with moderation, because there are also many important volumes, on historical subjects which have been regarded as authentic books of reference and which no doubt give satisfactory information. But what we have to bear in mind is the fact that, almost all historians have been more or less influenced by the custom mentioned above. Some valuable works on history are—the Habibus Siyar, Tarikh-i-Tabri, Tarikh-i-Farishta, Sair-ul-Mutakherivi etc.

It must be remembered that history in Persian is regarded as an important subject of literature and the pains which the authors have taken in writing such large volumes as the Habib-us-Siyar are indeed worthy of admiration. This famous book is a history of the Universe, if I may use that expression, giving an account of the Beginning of Man, the rise and spread of Islam in various parts of the Globe,

The Dining Hall and the whole of the Kitchen Department was badly hit during the year by the scarcity and consequent dearness of provisions. Flour for several months was 33% dearer than usual ;—a difference in price which produces a great effect when the consumption is about one hundred maunds per month.

Persian Literature.

By the word Persian Literature we are to understand the literature of Persia from the time that the country was conquered by the Arabs in the 7th century. It is important to note this fact in the beginning, as we shall find to what a great extent the literature of Persia has been influenced by Arabian ideas. The Arabs of the time before Mohamad admired nothing more than good poetry and even after the spread of Islamic Civilization in the country, eminent poets had their first place among national heroes. Eloquence was regarded as the best divine gift and the eloquent were revered with all warmth. The words of the Prophet (از افصح العرب) "I am the most eloquent speaker of Arabia" completed the social status of the poet, the eminent writer and the eloquent, speaker. The names of Sahbani Wayal, Farazdaki, the Saba Moollaqat etc., are well-known.

As we proceed however in our subject, we shall have to extend its scope to other countries such as Afghanistan, Turkestan, Egypt, Asia Minor, India etc. All these countries have produced eminent poets. As the greater portion of Persian men of letters consists of poets, it will be necessary to deal with them at some length. Meanwhile a few words about prose writers will not be uninteresting.

1. Writers of religious subjects.—As the natural result of Mohamadan influence it will be seen that religion and religious ideas became the prominent factors of Persian literature which is full of references to religious subjects. In view of the fact that the Shara' or Path of Islam spreads its influence in all walks of Mohamadan life, it is but natural that the very first attempts in the line of prose writing must have been made towards the accomplishment of this end. Hence we

gress has been made with the new Union building since the Prince's visit. The two-storied house in the Kachha Court which was begun almost exactly three years ago is still being built. The work has not even got as far as the roof. The Lytton Library is still without its final flooring.

The various examinations are now over. We wish that they had passed off without any unpleasant incident happening. But unhappily this was not the case. There were several cases of "obtaining aid by unfair means" which were detected and the offenders punished in the only adequate way. There ought to be a stronger feeling in the boarding houses against cheating of this kind; then we should not have such occurrences as those mentioned above.

The Football League competition is concluded and the First Year Class have proved the winners of the Shield and Medals. The hockey and cricket matches have still to finish. A fuller account of the Football League matches is given elsewhere.

Mr. Rees goes on leave at the beginning of this month for the usual period of six months. This year he is the only member of the English Staff to go to England.

The congested state of the Boarding House will be relieved for the time as most of the Intermediate, and Entrance candidates go home after their examination. In a few weeks also the Fourth Year will have left. Then will begin the rush of those wishing to join the College, and it will go hard with us if we cannot speedily find new and improved accommodation.

There was a closed competition in tent-pegging for members of the Riding School on Sunday, April 22nd. Bashir Beg came out first, and Ibn-i-Ahmad, the Captain, was second. The latter, however, was handicapped five points, which proved just too many for him to make up. An open competition is to be held on Sunday, April 29th, and we hear that there will be many competitors.

The College Financial Year closed on March 31st last. The accounts are now being audited by Mr. Hamilton of Messrs. Lovelock and Lewis, Calcutta. It is expected that in spite of heavy losses in some departments—notably the Dining Hall—the balance-sheet will prove fairly satisfactory.

The Aligarh Monthly

May, 1906.

College Notes.

Mr. Archbold did not after all go to the Educational Conference at Dacca, and the College was represented by the Nawab Mohsin-ul-Mulk who has just returned from his tour.

Sir Arundel Arundel paid a visit to the College on Saturday, April 14th. He stayed with Mr. Archbold for the day and visited all parts of the College, shewing a great interest in the working of the different departments.

Mrs. Archbold was 'At Home' to the combined Staff of College and School on Wednesday, April 25th. All who could attend accepted Mrs. Archbold's kind invitation and those who went had a very pleasant time.

There have been some rather lively discussions at the Union lately over private business matters. Both sides would do well to remember that opposition in debates and in discussions is not necessarily personal, neither is it necessary to carry away from any meeting any feeling of anger towards the opposing side.

There seems to be a "depression in the building trade" so far as the College works are concerned. Very little pro-

جلد ۴ | جون ۱۹۰۶ء | نمبر ۶

جمع حدیث

جس طرح قرآن کے جمع کرنے میں اُس کی ایک ایک سورہ ایک ایک آیت مختلف سینوں۔ مختلف مقامات مختلف اشخاص سے تلاش کرنی پڑی اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ حدیث کے جمع کرنے میں دشواریاں پیش آئیں۔

قرآن کو تو آنحضرت کی وفات کے وہی ایک سال بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جمع کرا دیا۔ جس میں کسی کو شک کی گنجایش نہیں ہی کیونکہ اُس زمانہ کے تمام مسلمانوں نے بالاتفاق اُسکو کلام منزل کا پورا مجموعہ تسلیم کر لیا تھا۔ بعد میں اگرچہ ایک آدہ فرقہ نے اُس میں شکوک پیدا کئے لیکن اُنکے رکیک شکوک سے قرآن کے تواتر پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بلکہ جو فرقے قرآن کو نامکمل کہنے میں خاص طور پر ممتاز ہیں اُنکے علما محققین نے خود اس سے اختلاف کیا ہی اور صاف صاف لکھدیا ہی کہ "یہی قرآن جو بین الانام رایج ہی بالکل مکمل ہی" جن لوگوں نے اس میں کمی کا دعویٰ کیا ہی وہ بلکہ میں اُس زیادتی کے پیش کرنے سے عاجز ہیں جسکو وہ مانتے ہیں۔ اسلئے اُن کا قول پایۂ اعتبار کو نہیں پہونچتا۔

بخلاف اسکے علم حدیث کی پوری تدوین دوسری اور تیسری صدی ہجری میں ہوئی - اور ایک یا دو صدی کا زمانہ مخترعان مذہب کے لئے کافی عرصہ تھا جس میں اُنھوں نے حدیثوں میں بہت زیادہ گڑبڑ پیدا کردی -

حدیث کی ضرورت مسلمانوں کو اُسوقت پیش آئی جب قرآن کی تفسیر کے لئے اُنھوں نے اقوال نبی کی تلاش کرنی شروع کی - علاوہ بریں چونکہ فتوحات اسلامی کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا اسلئے مختلف ممالک میں جزیہ اور خراج وغیرہ کی تشخیص کے سلئے بھی اُن کو سابقہ اسلامی فتوحات کے حالات دریافت کرنے کی ضرورت پڑی اس بناپر مغازی وغیرہ کے اخبار اُسکے متعلق احادیث کے جستجو شروع ہوئی -

قرن صحابہ میں احادیث نبوی مختلف لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھیں - اور وہ لوگ اسلامی سلطنت کی وسعت کی وجہ سے مختلف ممالک میں پھیل گئے تھے اور جنکے پاس جو حدیثیں تھیں وہ اُسی مقام پر روایت کرتے تھے جہاں پر وہ ہوتے تھے - اسلئے طالبان حدیث نے مکہ . مدینہ بصرہ - کوفہ - رے - مصر - دمشق اور صنعا، وغیرہ میں سفر کرنا شروع کیا - جسقدر حدیثیں سنتے اُن کو یاد کرتے - اور اپنے شاگردوں سے روایت کرتے - تدوین حدیث کا سلسلہ ۱۴۰ھ ہجری میں شروع ہوا - ابن جریج پہلا شخص ہے جسنے اس فن میں ایک کتاب لکھی لیکن وہ ضائع ہوگئی - اور اسلئے ہمارے لئے اُسکا وجود کالعدم ہے - اُسکے بعد امام مالک نے موطا لکھی - اسکا صحیح سن تالیف کیا تھا - یہ بتانا دشوار ہے - لیکن چونکہ امام مالک کی وفات ۱۷۹ھ ہجری میں ہوئی اسلئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دوسری صدی کے نصف میں ان کی کتاب لکھی گئی -

چونکہ اس زمانہ سے عہد نبوی بہت ہی قریب تھا اور دو تین سلسلہ سے آنحضرت تک اسناد پہونچ جاتا تھا اسلئے کوئی شک نہیں ہے کہ موطا بہت زیادہ قابل وثوق ہے - علاوہ بریں یہ کتاب خاص مدینہ ہی میں امام مالک نے لکھی جہاں کہ نبوت کا مرکز تھا اسلئے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ اُن کو صحیح احادیث جمع کرنے میں نسبتاً زیادہ موقع حاصل تھا -

امام مالک حدیث کے جانچ پرتال میں ایک اعلیٰ ملکہ رکھتے تھے۔ اُن کی تحقیق میں صرف تین سو حدیثیں صحیح اُترتی ہیں[1]۔ امام ابو حنیفہ جو انکے معاصر تھے اُنھوں نے تو صرف ۱۷ حدیثوں کو صحیح کہا ہے[2] لیکن اسکے ساتھ ہی ہم یہ کہنے کی بھی اجازت چاہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کو حدیثیں بہت کم ملیں۔ کیونکہ اُن کو فقہ میں ایسا توغل اور انہماک تھا کہ حدیث کی طرف بہت کم میلان باقی رہا تھا۔ اسلوجہ سے انکا شمار محدثین میں نہیں ہے۔

مؤطا کے بعد دوسری کتاب معتبر علم حدیث میں بخاری ہے۔ جو امام المحدثین محمد ابن اسمٰعیل بخاری کی تصنیف ہے۔ ان کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی اسلئے بخاری تیسری صدی ہجری کی تصنیف ہے۔ اسکے بعد مسلم بن الحجاج نیشاپوری نے جن کی وفات ۲۶۱ ہجری میں ہوئی مسلم کو تصنیف کیا یہ دونوں کتابیں صحت کے اعتبار سے اعلیٰ پایہ کی خیال کیجاتی ہیں۔ ان کی ترتیب ابواب فقہی پر ہے اور اہل سنت والجماعت بلکہ اور اسلامی فرقوں میں بھی اُن کو عام مقبولیت ہے۔ پھر ابو داؤد جس کی وفات بصرہ میں ۲۷۵ھ میں ہوئی۔ ترمذی متوفی ۲۷۹ ہجری نسائی جس کی وفات ۳۰۳ھ میں ہوئی دار قطنی نے جسنے بغداد میں ۳۸۵ ہجری میں وفات پائی اپنی اپنی کتابیں لکھیں۔

الغرض صحاح ستہ یعنی بخاری۔ مسلم۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی اور ابن ماجہ تیسری صدی ہجری میں اور اسکے بعد لکھی گئی ہیں۔ اور علم حدیث پر ۳۵ھ ہی سے آفت آنی شروع ہوگئی تھی یعنی حضرت عثمانؓ کے قتل ہونے کے بعد۔ کیونکہ جبتک وہ زندہ رہے اسوقت تک اسلام ایک مطمئن حالت میں تھا اور تمام مسلمان ایک ہی خیال اور ایک ہی جھنڈے کے نیچے تھے۔ اُنکے قتل ہونے کے بعد ہی حضرت علیؓ اور امیر معاویہ میں لڑائی شروع ہوگئی اور اسلامی طاقت کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ اُسوقت سب سے اہم عنوان جو اسلامی دنیا میں زیر بحث تھا وہ خلافت کا مسئلہ تھا۔ چونکہ اسکے ساتھ بہت سے پولٹیکل مقاصد تھے۔ اسلئے اپنے اپنے گروہ کے حمایت کے لئے کذاب اور وضاع حدیث نے جھوٹ کے میدان میں زبان کے گھوڑے سرپٹ چھوڑ دئے

(۱) تمدن الاسلام ج ۳ (۲) تمدن الاسلام ج ۳

اہل طمع اور صاحب اغراض اپنی ضرورت کے وقت بلاخوف تردید مَن گھڑت حدیثیں پڑھ دیا کرتے تھے جس سے اُنکے دعوی کی تائید ہوجاتی تھی۔ اور جو اُنکا مخالف ہوتا تھا وہ حدیث نبوی سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ مہلب بن ابی صفرہ بہت سی حدیثیں گھڑا کرتا تھا جو مسلمانوں کے موافق اور خوارج کے خلاف ہوتی تھیں [1] لیکن باوجود اسکے وہ نہایت متقی پرہیزگار خیال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اسکو لوگ ایک قسم کا خدعۃ الحرب سمجھتے تھے۔ ایسے ہی اور بہت سے لوگ تھے جنکا کام ہی یہی تھا کہ حدیثیں وضع کیا کرتے تھے اور اُنسے مختلف اغراض پر دسترس حاصل کرتے تھے۔ اسکے ساتھ ہی وہ ناخداترس وہی حدیثیں اپنے شاگردوں سے روایت کرتے تھے اور سلسلہ بسلسلہ اُن کو رواج دیتے تھے۔

بہت سی ایسی باتیں تھیں جنسے حدیث گھڑنے والے اپنے کانشنس کی تسکین ہی کرلیتے تھے۔ مثلاً خلیفہ کی حمایت کو وہ کار ثواب سمجھتے تھے۔ اب حمایت میں اگر وہ جھوٹی حدیثیں بھی بنا لیتے تھے تو اُنکے خیال کو تسکین رہتی تھی کہ یہ بھی کار ثواب ہے۔ کیونکہ اُسکو دروغ مصلحت آمیز سمجھتے تھے۔ جب خلیفہ مامون نے متعہ کو حلال کرنا چاہا تو علماء کے گروہ میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ آخر لوگوں نے اُس کی حرمت میں حدیثیں وضع کرکے اُسکو سنادیں جس سے وہ اپنے ارادہ سے باز رہا [2]۔

اسی طرح ایک عالم نے قرآن کی تلاوت اور اس کی سورتوں کے فضائل میں ہزاروں حدیثیں وضع کر ڈالیں جو کہ اکثر تفسیروں اور خاصکر بیضاوی میں نقل کی گئی ہیں۔ اُس سے جب پوچھا گیا کہ تم نے حدیثوں کے وضع کرنے کی کیسے جرأت کی تو اُسنے کہا کہ میں نے دیکھا کہ لوگ قرآن کی تلاوت سے غافل ہوگئے ہیں اسلئے اُس کی طرف مائل کرنے کے لئے نیک نیتی سے یہ حدیثیں بنائیں۔

جھوٹی حدیثیں اور روایتیں گھڑنے والے یوں تو بہت تھے لیکن چار شخص ان میں سے

(۱) ابن خلکان ج ۲ صفحہ ۱۴۶ (۲) ابن خلکان ج ۲ صفحہ ۲۱۸

خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ ابن ابی یحییٰ مدنی۔ واقدی بغدادی۔ مقاتل ابن سلیمان خراسانی محمد بن سعید شامی[۵]۔ واقدی نے جس کی مشہور کتاب فتوح الشام ہے ۲۰۷ھ ہجری میں وفات پائی۔ اس کی کتاب خرافات سے بھری پڑی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جھوٹے کذاب و اضعان حدیث مرتے وقت اسکا اقرار بھی کر دیا کرتے تھے۔ ابن ابی العوجار کوفہ کا مشہور محدث تھا۔ ۱۹۳ھ میں امیر محمد سلیمان نے اُسکے قتل کا حکم دیا جب اُسکو یقین ہوگیا کہ اب ضرور میری جان جائے گی تو اُسنے کہا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں۔ حرام کو تم پر حلال کر دیا ہے اور حلال کو حرام روزے کے دن افطار کرا دیا ہے۔ اور افطار کے دن روزہ رکھوا دیا ہے[۱]۔ اسی طرح احمد جوئباری ابن عکاشہ کرمانی۔ اور ابن تمیم فاریابی کی نسبت سہل نے لکھا ہے کہ انھوں نے دس ہزار حدیثیں وضع کیں[۲]۔ انھیں وجوہات سے حدیثیں مختلف ہوگئیں۔ صحیح اور غیر صحیح روایت کا تمیز کرنا دشوار ہوگیا۔ اور اسلام کے الگ الگ کئی فرقے ہوگئے۔ سنی اور شیعوں میں بعید تغایر ہوگیا ورنہ اسلام صرف ایک مذہب تھا۔ اُسکے تمام پیرؤں کو مذہبی حیثیت سے ایک ہی خیال کا پابند ہونا چاہیئے تھا۔

جب یہ فتنہ بہت زیادہ بڑھگیا تو محدثین کی ایک تحقیق طلب جماعت نے صحیح موضوع ضعیف اور قوی روایتوں کے دریافت کرنے کے لئے اصول اور قواعد مقرر کئے۔ اور یہ ایک مستقل فن ہوگیا جس کی متعدد شاخیں تھیں۔ اس میں حدیثوں کے درجے مقرر کئے۔ صحیح۔ حسن۔ ضعیف۔ منقطع۔ مرسل۔ شاذ۔ اور غریب وغیرہ وغیرہ کی تفریق کی گئی۔ اور اُنکے درجوں کا تفاوت بیان کیا گیا۔ راویوں اور روایت کی تحقیق کی گئی[۳]۔ اس فن کا نام اصول حدیث ہے۔

چونکہ مسلمانوں کے دین اور دنیا کا مدار حدیثوں کے اوپر تھا اسلیئے اُنھوں نے اسکی چھان بین میں دل سے کوشش کی لیکن اُسوقت اس قسم کی تحقیق میں کامیاب ہونا آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ حدیث کی کتابیں نہیں لکھی گئی تھیں۔ اور نہ راویوں کے حالات مدون کئے گئے

(۱) ابن خلکان ص۱۱۳ ج۲ (۲) ابن اثیر ص۳ (۳) تحذیر المسلمین ص۴ (۴) ابن خلدون ص۳۶۵ ج۱

تھے جس سے اُنکے ضعف اور ثقاہت کا اندازہ ہوسکتا۔

اسکے لئے اس بات کی بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ محدثین اور اُنکے طبقے مقرر کئے جائیں چنانچہ اس طرح پر بھی طبقے مقرر کئے گئے کہ پہلا طبقہ صحابہ کا تھا۔ پھر تابعین اور پھر تبع تابعین کا اسکے بعد وہ علما جو درجہ اجتہاد کو پہونچے ہوئے تھے۔ پھر وہ لوگ جو حدیث میں مشغول تھے۔ پھر اصحاب جرح وتعدیل یعنی روایت اور رواۃ کے پرکھنے والے اور صحیح وضعیف میں تمیز کرنیوالے اُسکے بعد شارحین وغیرہ۔ [1]

ان طبقات کے بیان کرنے کے لئے بہت سی کتابیں بھی لکھی گئیں جو کتب اسمار الرجال کے نام سے مشہور ہیں اور حدیث کے روایت کرنے کے لئے یہ شرط ضروری قرار دیگئی کہ اسناد مسلسل کے ساتھ روایت کی جائے۔ مثلاً زید نے بکر سے سنا۔ بکر نے خالد سے سنا اُس نے فلاں صحابی سے اور اُنھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے۔ اس شرط کے لگانیسے وہ جھوٹ اور کذب کا غبار جو علم حدیث کے مطلع پر چھایا ہوا تھا بالکل صاف ہوگیا۔ کیونکہ روایت بالاسناد میں ہرایک راوی کی جانچ ہوتی۔ اگر کوئی راوی درمیان میں مجہول۔ یا ضعیف یا جھوٹا ہوتا تو وہ روایت قابل اعتبار نہیں مانی جاتی۔

ہرایک مقام کے محدثوں کا طریقہ اسناد بالکل جداگانہ تھا۔ اہل حجاز کا طریقہ بنسبت اور ممالک کے سب سے اچھا اور بہتر خیال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ عدالت اور ضبط کے اصول کے بڑی سختی کے ساتھ پابند تھے۔ علاوہ بریں انکے اسناد میں صحابہ کے بعد امام مالک تھے جو ہر طرح پر معتبر تسلیم کرلئے گئے تھے۔

مسلمانوں نے سلسلہ اسناد کو روایت اور خبر کے لئے اسقدر مفید اور ضروری سمجھا کہ نہ صرف حدیث کے لئے اسکو مخصوص کیا بلکہ تواریخ اسمار رجال اور مغازی میں بھی اُسکو کام میں لاتے تھے۔ کسی عالم کے تذکرہ میں اُسکے علم کا سلسلہ اسناد واضع علم یا کسی مشہو

(۱) ابجد العلوم ص۸۶

محدث تک پہونچنا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ مثلاً ابن خلکان فخر الدین خطیب کے حالات بیان کرتے ہوے لکھتا ہے کہ اُنھوں نے علم اصول اپنے باپ ضیاء الدین اور اپنے دادا علی القاسم انصاری سے پڑھا اُنھوں نے امام الحرمین ابی المعالی سے اُنھوں نے اسحاق اسفرائنی سے اُنھوں نے ابو الحسن باہلی سے اُنھوں نے ابو الحسن الشعری سے اُنھوں نے ابی علی جبائی سے حاصل کیا۔ علیٰ ہذا القیاس غرض اسی سلسلہ اسناد میں تمام حدیثیں جکڑی گئیں۔ اور اسکے بعد راویوں کی ثقاہت او ضعف اور روایت کی کیفیت دیکھکر اُسپر حکم لگایا گیا کہ یہ صحیح ہے یا ضعیف۔ اس تنقید میں یحییٰ بن معین کی کوششیں خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہیں۔ اُنھوں نے اس فن کے متعلق سو کتابیں لکھیں۔ اور تین لاکھ احادیث کی جانچ پڑتال کرکے اُن پر صحت اور ضعف کا حکم لگایا۔ اُسکے بعد امام بخاری نے اُس سے بھی زیادہ سخت شرائط کے ساتھ تنقید کی۔ اور چھ لاکھ حدیثوں میں سے اپنی صحیح بخاری کا مجموعہ منتخب کیا[1]۔ جس میں کل تعداد احادیث کی مع مکررات کے ۹۲۰۰ ہے۔ اگر مکررات چھانٹ دیجائیں تو صرف چھ ہزار حدیثیں رہجاتی ہیں۔ گویا امام بخاری کی تنقید میں سو حدیثوں میں سے صرف ایک حدیث صحیح ثابت ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُنھوں نے ایسے سخت شرائط مقرر کئے ہیں جنکے مطابق وہی حدیثیں صحیح اتریں جو دراصل صحیح ہونے کے قابل تھیں۔ یہی حال مسلم کا بھی ہے اُنھوں نے بھی قدم بقدم اُنھیں شرائط کی پیروی کی ہے جن کی امام بخاری نے کی ہے۔ اُنکا مجموعہ مسلم کی تین لاکھ حدیثوں سے منتخب ہے[2]۔

مسانید میں شرائط میں پوری سختی نہیں برتی گئی۔ اسی وجہ سے اُس میں صحیح وسقیم قوی و ضعیف ہر قسم کی روایتیں بھری ہوئی ہیں۔ مثلاً مسند امام احمد بن حنبل میں پچاس ہزار حدیثیں ہیں جو دس لاکھ سے چھانٹی گئی ہیں[3]۔

صحاح ستہ کے مکمل ہونے کے بعد اور لوگوں نے نہیں کتابوں سے حدیث کی دوسری کتب بہت تصنیف کیں اسلئے اُن کی نسبت تقریباً وہی راے قائم ہوگی جو صحاح ستہ کی نسبت قائم ہوسکتی ہے

(۱) ابن خلکان صفحہ ۴۵۶ ج ۱ (۲) ابن خلکان صفحہ ۹۱ ج ۱ (۳) ابن خلدون صفحہ ۳۹۹ ج ۱

صحاح ستہ کی روایتیں اُن اصول اور شرائط کے مطابق جن کی رو سے وہ صحیح کہی گئی ہیں بالکل قابل تسلیم ہیں اور یہی وجہ ہے جس سے امت نے اُن کو مقبولیت کا درجہ دیا۔ اب کسی محقق کے لئے اگر کوئی بحث کی گنجایش ہوسکتی ہے تو صرف یہی کہ وہ اصول جن کی بنا پر ان کتابوں کی نسبت صحت کا حکم لگایا گیا ہے کہانتک قابل تسلیم ہیں۔ چونکہ یہ بحث خود بہت وسیع ہے اسلئے اسکو دوسرے وقت پر محول کرتے ہیں۔

اسلم جراجپوری

لبرل ترکوں سے اہل ہند کا سلوک

مولوی محمد حسین خاں صاحب کے مضمون "ترکوں کی معاشرت اور اُسکے نقاد" نے میرے پکے پھوڑے کو ٹھیس لگادی۔ مہدی حسن صاحب کا معقول ریویو علی گڈہ منتھلی" میں اور مرزا محمد سعید صاحب کا پر دلائل ریویو مارچ ۱۹۰۶ء کے مخزن میں مینے پڑھا اور پڑھکے انہیں دعاے خیر دی، کیونکہ ریویو کے بہانے اُنھوں نے وہ خیالات ظاہر کئے ہیں جو محمد حسین صاحب کا بس چلے تو تازیانوں کی سزاؤں سے روکے جائیں۔ اس مضمون میں مجھے اُن خیالات کے متعلق عرض کرنا نہیں ہے جو محمد حسن صاحب اور مہدی حسن صاحب اور مرزا محمد سعید صاحب میں مابہ النزاع ہیں۔ میں اُس سلوک کے بارے میں جو "ترکوں کی معاشرت" کے مؤلف نے آزاد خیال ترکوں کے ساتھ کیا ہے۔ یہ چند سطریں لکھتا ہوں۔

ترکوں کی معاشرت جیسا دل آویز مضمون، جسکے لئے ہندوستانی پبلک ہمیشہ پیاسی رہتی ہے، ایسے پاک اور مقدس مضمون میں خیریت طلب، وطن پرست، محب ملت عثمانیوں کا، نوجوان ترکوں کا، (معاف کیجیگا یہ الفاظ میرے قلم سے بیساختہ نکل گئے مجھے کہنا چاہئے دریدہ دہن، کورنمک، دشمن قوم، ینگ ٹرکش پارٹی کا) آہ ونالہ اُن کی فریاد کا ذکر، اگرچہ وہ اس پارٹی کے میمبر کے ایک کتاب کے ہی ترجمہ مین کیوں نہو ضرور نظرانداز کر دینا چاہیئے۔

سلطان المعظم کی نسبت تو انہوں (خلیل خالد) نے خاصکر اسقدر لغو، بے سروپا خامہ فرسائی بعض موقعوں پر کی ہی، کہ میں نے ترجمہ میں اُس عبارت کو بالکل ترک کر دیا ہی، اور محض اسوجہ سے کہ اگر میں اُسے رہنے دیتا تو مجھے اُس کی تردید میں بہت سا عزیز وقت ضائع کرنا پڑتا۔"

"خالد خلیل نے جو دریدہ دہنی سلطان المعظم کے بارے میں کی ہی وہ کسی طرح بعض یوروپین اخبارات کے خلاف واقعات مشہور درشت کلامی سے کم نہیں میرے نزدیک کسی مسلمان کی حمیت گوارا نہ کرے گی کہ اس قسم کے بے اصل، و بے بنیاد خیالات کی اشاعت میں وہ ذرا بھی حصہ لے۔

یہی سبب خالد خلیل کے بعض ریڈیکل پولیٹکل خیالات کے متروک کرنیکا ہی۔ اس لئے اس قسم کی بحث سے میں اپنا بعید سے بعید تعلق بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔"

ان فقروں میں، مولوی محمد حسن صاحب نے اُن بے یار، بے مددگار لوگوں کی نسبت اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہی، جو جلا وطنی کی حالت میں اپنی مصیبت بھری عمریں کاٹ رہے ہیں اور کس لئے، کس جرم میں، اُنھوں نے کسی کو قتل نہیں کیا، کسی کا مال نہیں کھایا، رشوت نہیں لی، بلکہ اس بڑے جرم کے مرتکب ہوئے کہ اپنے وطن سے محبت ظاہر کی، مساوات حقوق چاہی، وہ جرم جسکے گریبالڈی اور مدحت پاشا، وغیرہ مجرم تھے۔

وطن اور وہ بھی ٹرکی جیسا نمونۂ جنت وطن، آسانی سے نہیں چھوڑا جاتا۔ پھر کیا وجہ ہی کہ سلطان المعظم کے داماد اور بھتیجوں سے لیکر، عام آدمی تک قطار در قطار لوگ بھاگے جاتے ہیں۔ بچوں کو چھوڑتے ہیں، مال و املاک چھوڑتے ہیں۔ اور عالم غربت میں زندگی بسر کرتے ہیں، آخر کوئی تو وجہ ہی جو اس خود اختیاری جلا وطنی کی محرک ہی۔

مگر نہ محمد حسن صاحب، نہ اُنکے ہم خیال پبلک اسکا باعث دریافت کرنے کی طرف مائل ہی یہ فرض کر لیا گیا ہی کہ سلطان المعظم کے خلاف جو ذرا سی بھی بات کہے، وہ کشتنی اور گردن زدنی ہی۔ ہائے! محمد حسن صاحب کس شاہانہ نخوت اور دلربایانہ لاپروائی سے کہتے ہیں،

" اس قسم کی بحث سے میں اپنا بعید سے بعید تعلق بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔"

بجا ہے۔

کوئی مرتا ہی کیوں بلا جانے ؏ ؏ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانے ؏ ؏

میں طویل بحث نہیں کرنی چاہتا۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ "ازیں سو راندہ و زاں سو درماندہ نوجوان ترکی پارٹی" جو سلطان المعظم کی معتوب اور یوروپ کی سلطنتوں میں غیر مقبول ہے وہ اگر آپ بنظر غور ملاحظہ کرینگے، تو آپ دیکھیں گے کہ اُن الفاظ کی ہرگز مستوجب نہیں جو اُس کی شان میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

خالد خلیل نے "دریدہ دہنی" نہیں کی۔ بلکہ ایک مظلوم، ایک تنگ آمد بجنگ آمد شخص نے اپنی پرحسرت، پرغصہ اور پررنج کہانی سنائی ہے۔

خالد خلیل، سلطان المعظم کو تعلیم نسواں کا سخت مخالف بتاتا ہے، اور اس سے آپ بہت برافروختہ ہوئے ہیں اور فرماتے ہیں۔

اس کی تردید میں، بجائے کسی طول طویل بحث کے، اسقدر کہنا کافی ہے ۱۹۰۰ء تک لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے سلطان المعظم کے حکم سے پچاس ہزار مدارس قائم ہوچکے تھے، اور اب تو اُن کی تعداد اور بھی زیادہ ہوگی۔"

بیچارہ خلیل! شعر مرا بمدرسہ کہ برد۔ اُسے کیا خبر تھی کہ اس کی کتاب ہندوستان میں ترجمہ ہوگی۔ اور وہاں۔ وہاں جہاں قرآن شریف پڑھ لینا تعلیم نسواں سمجھی جاتی ہے، وہاں جہاں قرآن شریف پڑھنے والیاں بھی ابھی خیر سے کم ہی ہیں، وہاں جہاں اخباروں میں بحث کرنا، تعلیم نسواں کے لئے سب سے بڑی کوشش کرنا ہے، وہاں جہاں ابھی یہی طے نہیں ہوا۔ کہ لڑکیوں کے مدرسے ہونے چاہئیں یا نہیں، اور ہونے چاہئیں تو استانیوں کے لئے یا لڑکیوں کے لئے۔ وہاں اُسے جھوٹا قرار دیا جائیگا۔ بیچارہ، تعلیم نسواں کے وہ معنی لیتا ہے جو ممالک متمدنہ میں لئے جاتے ہیں۔ اُسے اس سے انکار نہیں کہ ٹرکی میں لڑکیوں کے مدارس ہیں، مگر نہ ٹرکی

میں؛ نہ اور جگہ (سوائے ہندوستان کے) ان مدرسوں کی پڑھی لڑکیاں' تعلیم یافتہ لڑکیاں کہی جائینگی۔ ان لڑکیوں کو وہ خطاب ملیگا جو ہماری اُردو میں "خوانده" کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہی۔

محمد حسن صاحب' خالد خلیل کی کتاب کا چاہے پورا ترجمہ کریں' چاہے اُسکے اہم صفحات کو چھوڑ دیں' میں اُنھیں نہیں روکتا' صرف اتنی عرض کرتا ہوں کہ اُسکے خیالات ہندوستانی پبلک پر ظاہر کئے بغیر اُسے گالیاں نہ دیں۔

جب وہ "اڈیٹر وطن" معاملات ٹرکی کے اسپیشلسٹ ہیں، تو از راہ کرم لبرل ترکوں پر یہ الزام تو نہ لگائیں کہ یہ لوگ یورپ کے متعصبین کی طرح ٹرکی سے للّہی بغض رکھتے ہیں۔

خالد خلیل نے تو صرف دس صفحوں میں سلطان کے خلاف (بقول جناب محمد حسن صاحب) لغو اور بے سروپا نامہ فرسائی کی ہے، لیکن علی حیدر مدحت بک نے اپنے مظلوم باپ مرحوم "مدحت پاشا" کے حالات زندگی میں (۳۰۰) صفحوں میں رونا رویا ہی اور سلطان حال سے داد خواہی کی ہی۔ کیا یہ بھی بے سروپا ہی' یہ بھی لغو ہی؟ نہیں یہ بے سروپا نہیں ہی۔ مگر اس فریاد کو ہندوستان میں نہ کوئی سنتا ہی' اور نہ سننے کی خواہش کرتا ہی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے' اہل ہند کو تعلیم یافتہ ترکوں کا بسمل کی طرح تڑپنا سمجھ میں نہیں آتا اور کیسے آسکتا ہی۔ ع

تو اے کبوتر بام حرم چہ میدانی — طپیدن دل مرغان رشتہ بر پا را

میں کیا۔ ساری دنیا سلطان عبدالحمید خاں کی قابلیت کی معترف ہی' وہ اپنے طرز میں ملک کی بھلائی چاہتے ہیں' لیکن اپنی رائے سے جو بھی مختلف رائے سننا گوارا نہیں کر سکتے۔ تاہم جہاں سیکڑوں خود مختارانہ' جابرانہ کاموں کے لئے' اُنسے باز پرس ہوگی' وہاں حجاز ریلوے' جیسے عظیم الشان' مفید اسلام و اسلامیاں کام کے بانی ہونے کے لئے' ایک بہت بڑے دربار سے (جو زمین پر نہیں ہوگا) انہیں انعام ملیگا اور شاید یہی ان کی نجات کا باعث ہو۔ اسلئے میں

چاہتا ہوں کہ اس نیک کام کے اختتام تک بہادر، خوبصورت، مگر بدبخت عثمانیوں کے امور کی باگ انکے ہاتھوں میں رہی۔

اُسکے بعد، اگر خدا نے چاہا تو پھر دوبارہ مجلس مبعوثاں (پارلیمنٹ) کا افتتاح ہو۔ اور حریت پسند، اور مشورت دوست، فخر ملک نوجوان عثمانیوں کا دور دورہ! انشاءاللہ انشاءاللہ۔

سجاد حیدر

عہد قدیم

اور

جغرافیہ

جغرافیہ بھی منجملہ اُنھیں علوم کے ہی جو مسلمانوں نے دوسری قوموں سے لئے ہیں مسلمانوں میں یہ علم نوایجاد ہی۔ انھوں نے عجمیوں سے لیکر اسکو وسعت دی اور بہت خوبی سے اسکو کام میں لائے۔ ہم اسباب میں جامعیت کے طور پر اس بحث کی دو قسمیں کرتے ہیں۔

(۱) پہلی بحث میں جغرافیہ کے وہ حالات بیان کرتے ہیں جو اسلام سے قبل تھی۔

(۲) دوسری بحث میں وہ کیفیت جو اسلام کے عہد میں ہوئی۔

الجغرافیۃ قبل الاسلام

جغرافیہ ایک علم ہی جس میں زمین کی صورت اُس کی سطحوں کے اقسام اُسکے باشندوں کی قسمیں اُس کی پیداوار اور محاصل وغیرہ اشیاء سے بحث کیجاتی ہی۔

یہ ایک یونانی لفظ ہی جسکے معنی ہیں (زمین کی صفت بیان کرنا) اس لفظ کا یونانی ہونا اس کی دلیل ہی کہ یہ یونانیوں کی ایجاد ہی۔ ورنہ درحقیقت یہ انسان کی جستجو کا نتیجہ ہی جو قدیم

زمانہ سے اس کی طبیعت میں ودیعت چلی آئی ہی جب سے روے زمین پر انسان کا وجود ہوا اُس کی یہ عادت رہی کہ زمین کے جس حصہ میں وہ جاکر رہا اُسکے علاقہ قرب و جوار اور آس پاس کے مقامات کی جستجو کرتا رہا اُسکے پہاڑ اُسکے دریا اُسکے جنگل اُس کی نہریں سب کی اُسنے چھان بین کی اور اُسکو اپنی زمین مسکونہ اور اُسکے علاقجات اور ملحقات میں آمد و رفت کی وجہ سے وقتاً فوقتاً ان اشیا کا حال معلوم ہوتا رہا۔ پس انسان اپنی ابتدائی آبادی کے زمانہ میں دور دراز حصوں میں سے صرف انھیں مقامات کو جانتا تھا جو اُسکے شکار کھیلنے کے لئے یا اپنے ہمسایوں پر لوٹ مار کرنے کے لئے مخصوص تھے۔ یا جو اسی طرح سے دوسرے مقاصد کے واسطے اس کی گذرگاہ بنے ہوئے تھے۔ غرضکہ روے زمین کا وہی حصہ اس کی معلومات کے حد فاصل رہا جس میں کہ وہ رہتا تھا یا تھوڑے بہت قرب و جوار کے وہ مقامات جس میں کسی غرض سے اُس کی آمد و شد جاری تھی۔ پھر اُسکی محدود معلومات اُسیقدر وسیع ہوتی گئی جسقدر اُسکے تعلقات اپنے ہمسایوں سے بڑھتے گئے اُس زمانہ میں جیسی جیسی حاجتیں اور تمدنی ضرورتیں پیش آتی گئیں اتنا ہی انسان اپنی معلومات میں ترقی کرتا رہا یہ تو ظاہر ہی کہ سب سے زیادہ کثیر المشاغل اور وسیع التعلق تجار کا گروہ ہی اس فرقہ کو اپنے ہمسایوں سے داد و ستد اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں بلکہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں سامان و اسباب لیجانے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہی۔ جیسے فنیقین وغیرہ جو تمدن میں قدیم مانے جاتے ہیں۔ لیکن یہ کہ زمین کو باقاعدہ مخروطی شکل میں کسنے ظاہر کیا اور اُسکے خطوط کسنے نمایاں کئے اس کی نسبت کہا جاتا ہی کہ یہ باتیں اگلے زمانہ میں ہنود نے ایجاد کیں۔ مگر وہ فقط ممالک ہندوستان۔ فارس تبت اور جزیرہ سیلان ہی کو زمین خیال کرتے تھے اسلئے کہ وہ اپنے ممالک اور آس پاس کے شہروں کے سوا زمین کی دوسری سطحوں اور میدانوں سے محض ناواقف تھے۔ قوم اسرائیلین کا بھی یہی حال تھا کہ وہ بھی اپنی مسکونہ زمین اور اُسکے حوالی ہی کو روے زمین خیال کرتے تھے اسی لئے طوفان کے واقعہ کو اُنھوں نے عالمگیر بیان کیا ہی۔ حالانکہ اس میں بہت بڑا اختلاف ہی کوئی کہتا ہی کہ قاطبۃً ساری زمین پر طوفان محیط تھا کوئی کہتا ہی کہ نہیں زمین

کے ایک حصہ کو وہ سے ڈوباتھا۔ بعض مورخ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ طوفان ساری زمین کو محیط تھا۔ اور وہ توریت کی ایک آیت سے سند لاتے ہیں لیکن وہ اس بات کو نہیں سمجھے کہ طوفان نے جس زمین کو غرق آب کیا وہ صرف ملک شنعار اور اُسکے قرب وجوار ہی کی زمین تھی۔ اس زمانہ کے لوگ صرف اُتنے ہی قطعہ کو روے زمین خیال کرتے تھے۔

بعض مورخین کا خیال ہی کہ حکماے مصر نے پہلے زمین کے اوصاف اُسکے لئے خطوں کا مقرر کرنا۔ نصف النہار کا خط یعنی خط استوا وغیرہ جغرافیہ کی باتیں نکالیں یہ بھی کہا جاتا ہی کہ جس چیز نے مصریوں کو ان باتوں پر آمادہ کیا وہ دریاے نیل کے بہاؤ اور اُسکے منبع کا دریافت کرنا ہے۔ لیکن یہ ایک ظنی اور تخمینی بات ہی کوئی محققانہ امر نہیں ہی۔

حقیقی بات اور جس کی دلیل واضح ہی وہ تو یہ ہی ہی کہ حضرت موسیٰ صاحب شریعت بنی اسرائیل نے پہلے زمین کی صفت بیان کی اُسکا جغرافیہ نکالا اور اپنے پانچ سفروں کی کیفیت بیان کرنے میں بہت سے مقامات کا ذکر کیا اور انسان کی ابتدائی آفرینش سے اپنے زمانہ تک (دس قرن قبل میلاد مسیح) کے حالات متعلق تمدن و تقسیم قبائل اور انسانوں کا شاخ در شاخ ہونا اور اسی طرح دوسری باتیں سب سے پہلے بتائیں۔ پھر اُسی (قرن دہم قبل میلاد مسیح) میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہومیرس یونانی شاعر ہوا اُسنے زمین کے اوصاف بیان کئے اور اُسوقت میں جتنے ملک اور مقامات مشہور تھے سب کے حدود اربعہ بیان کئے۔ لیکن وہی ملک یونان اور اُسکے قرب وجوار کے ممالک۔ اُسکا یہ خیال تھا کہ یونان کے جزیرے تمام روے زمین کے مرکز ہیں۔

حضرت موسیٰ کے جغرافیہ میں زمین کی حدود اربعہ یہ تھیں۔ حد شمالی کوہ قاف۔ حد جنوبی بحر عرب اور بحر احمر۔ حد شرقی ارض شنعار۔ حد غربی بحر روم اور مصر کے غربی حدود۔

ہومیروس کا جغرافیہ یہی یونان کے جزیرے اور بحر روم کے احاطہ کئے ہوئے سواحل تھے اُسکا خیال تھا کہ بحر اسود۔ دریاے نیل اور بحر متوسط نے زمین کے دو حصے کر دئے ہیں۔ شمالی اور جنوبی۔ ان دونوں حصوں کا حکیم انکسیمندرس نے اپنے زمانہ میں یورپ اور ایشیا

نام رکھا تھا۔ اور ہومیروس شاعر اُسوقت مشہور شہروں کا حال لکھتے ہوئے ان دونوں حصوں کو ایشیا اور اوروسا کے نام سے یاد کرتا ہی۔

ہومیروس شاعر کے بعد ایک یونانی مشہور سیاح ہیروڈوٹس پانچویں صدی یایوں کہو کہ پانچسو برس پہلے مسیح کے گذرا ہی اُسنے ممالک یورپ۔ ایشیا۔ اور افریقہ کی سیاحت کی اُس کی تاریخ مشہور ہی۔ ان ممالک کے تمام حالات تم اُس میں دیکھ سکتے ہو۔ انصاف یہ ہی کہ ہیرودوطس اگلے زمانہ کے سب مورخوں کا پیشوا ہی اُس کی راے میں زمین کے جغرافیای حالت یہ تھی۔ حد شمالی ملک روس جیسا اب ہی۔ حد جنوبی بحر الہند اور دریاے اوقیانوس استریلیا والا جسکو بحر محیط بھی کہتے ہیں۔ حد شرقی ممالک ہندوستان اور حد غربی مغربی یورپ اُسکا خیال تھا کہ یورپ ایشیا سے زیادہ وسیع ہی۔

اس سیاحت کے باب میں اُسکی تاریخ قابل ملاحظہ ہی۔ اچھی اچھی باتیں بیان کی ہیں۔ اگر تمہیں دیکھنا ہو تو یہ تاریخ دیکھو اُسی کے نام سے مشہور ہی۔ عربی زبان میں ترجمہ ہو کر چھپ گئی ہی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چوتھی صدی قبل مسیح سکندر اعظم اور ہیرودطس کے جغرافیہ میں زمانہ سابق کی نسبت ایک بہت بڑا انقلاب واقع ہوا یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک امیر سیاح قرطجنیہ کا رئیس جسکا نام حاتون ہی۔ چند دلیر آدمیوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر افریقہ کے گرد پھرا اُسکے پیچھے پیچھے ایک یونانی حکیم بھی تھا جسکا نام اسکیلاس تھا۔ اس واقعہ کے پچاس برس بعد کندیا کے رہنے والے ایک شخص نے اپنا سفرنامہ لکھا جسکا نام اُسنے (رحلتہ حول الدنیا) رکھا یعنی دنیا کے گرد گھومنے کا سفرنامہ۔ یہ کتاب نابود ہو گئی نہیں ملتی۔ اسی طرح اور بھی کئی ایک ایسے لوگ گذرے ہیں لیکن اُن لوگوں میں سب سے افضل حکیم زینیفون تسلیم کیا جاتا ہی۔ جسنے سفرنامہ مذکور کا خلاصہ کیا۔ حکیم ارسطو فیلسوف یونانی اور اُسکے شاگردوں نے بھی اس قسم کی بحثیں کی ہیں۔ غرض یہ سب جغرافیہ ولادت مسیح سے قبل آغاز چوتھی صدی اور اواسط پانچویں صدی میں ایجاد ہوا ہی۔

پھر اسکندر فیلقوس مقدونیہ کا بادشاہ ظاہر ہوا۔ جسنے عالم میں نمایاں فتوحات حاصل کیں۔

اور بہت سے ایسے مقامات کا استکشاف کیا جنکو اسوقت تک کوئی نہیں جانتا تھا خصوص ممالک ہندوستان اور اقلیم فارس میں بلندی کے ملک۔ اُسوقت میں زمین کا جغرافیہ بہت کچھ وسیع پیمانہ پر قائم ہوا۔ پھر اسٹرابون حکیم ظاہر ہوا اُسنے ایک کتاب لکھی جسکی تحقیقات اُس زمانہ میں قدیم رنگ کی نسبت وسیع مانی جاتی ہی۔ غرض یکے بعد دیگرے زمین کی معلومات کا ذخیرہ ہر زمانہ میں وسیع ہوتا گیا اور پچھلوں کا جغرافیہ اگلوں سے بڑھ چڑھکر ہی رہا۔ پھر روما تہہ والوں کی سلطنت کا آغاز ہوا اور انکا عروج موج شروع ہوا۔ بہت سی سلطنتیں اور دور دراز کے ممالک انکے قبضۂ تصرف میں آئے اُسوقت زمین کے اور بھی بہت سے حصے منکشف ہوئے اور جغرافیہ کی تحقیق بخوبی عمل میں لائی گئی۔ رومانیہ میں بڑے بڑے فاضل صاحب کمال گذرے ہیں۔ جن میں بلنیاس۔ اور طاقیس اور ایرتستینس اور مارین صور بہ والایہ سب اعلیٰ درجہ کے جغرافیہ داں اور اس فن کے حکیم تھے۔

ولادت مسیح کے بعد دوسری صدی میں حکیم بطلیموس اسکندری ظاہر ہوا۔ جو بہت سے مفید فنون کا موجد مانا جاتا ہی اُسنے اپنے زمانہ میں اگلے سب جغرافیہ والوں سے بہت زیادہ اس فن کو ترقی دی اور بالآخر وہ اس فن میں افضل المصنفین تسلیم کیا گیا۔ اسکی لکھی ہوئی کتابیں جو ہم تک پہونچیں وہ موجود ہیں۔ ابتدائے اسلام میں اہل عرب نے اپنے وہاں جغرافیہ اسی کی کتابوں سے نقل کیا ہے۔ بطلیموس کا جغرافیہ اگلے تمام حکمار کے جغرافیے سے اپنے باب میں ایک نئی طرز کا ممتاز جغرافیہ ہی۔ اسلئے کہ علم ریاضی۔ فلکی پر اُس کی بنیاد رکھی گئی ہی۔ اور خطوط درجات اور دقیقہ ایجاد کئے گئے ہیں۔ دنیا اسکے نزدیک اپنی کروی صورت میں گھومتی ہی۔ اور زمین اپنی مخروطی شکل میں ان حدود پر ہی۔ یورپ اور ایشیا کے جانب شمال ملک روس اور جنوب کی طرف اوقیانوس بحر ہند اور افریقہ کے وسط میں جبال قمر۔ مشرق کی طرف ہندوستان کی آخری حدود اور مغرب کی طرف بحر خزر یا بحر غربی۔ غرض یہ کہ بطلیموس کو زمین کا تہائی حصہ دریافت ہوا تھا۔ یورپ نصف ایشیا اور نصف افریقہ ان تین حصوں کے سوا اور ممالک مثل امریکہ اور اسٹریلیا اور دیگر جزائر بحر محیط کے اُسکی دریافت سے مخفی رہے اور وہ ان سب سے ناواقف رہا۔ اور یہ جو اوپر کے صفحات پر ایک واقعہ بیان کیا گیا ہی۔ کہ ایک

سیاح افریقہ کے گرد گھوما۔ یہ بات ہمارے خیال میں بے اصل ثابت ہوتی ہے۔ اُسوقت تمام افریقہ دریافت ہی نہیں ہوا تھا۔ بہرحال اسلام سے پہلے جغرافیہ کی حالت موجودہ یہ تھی جو بیان کیگئی۔

(۱) الجغرافیۃ فی الاسلام

اہل عرب جاہلیت کے زمانہ میں اپنی ہمعصر قوموں کا حال (سوائے اُن ممالک کے جہاں وہ تجارت کا سامان لیجایا کرتے تھے مثل ہندوستان۔ فارس۔ مصر شام وغیرہ کے) بہت کم جانتے تھے۔ پس وہ لوگ کسیقدر بلاد ہندوستان۔ فارس۔ شام۔ دیار مصر۔ حبشہ اور تمام سواحل بحر احمر ہی سے واقفیت رکھتے تھے۔ اور جزیرۂ عرب تو اُن کی بود و باش ہی کی جگہ تھی پھر جب اسلام ظاہر ہوا اور ممالک فتح ہوے اور اُن کو فارس۔ روم۔ سریان وغیرہ قوموں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور اُنکے دریاے فتوحات کی موجیں دور دراز مقامات تک لہراتی دکھائی دینے لگیں اُسوقت اُنکے خلفا نے دولت عباسیہ میں اگلی قومونکے علوم برآمد کرنے میں سخت اہتمام کیا جیسا ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ ابتدا ہی سے اُن کا یہ قاعدہ رہا کہ جو گانوں جو شہر جو ملک فتح کرتے تو اُسکی اور اُسکے حوالی کے جغرافیہ علوم و فنون۔ صنعت و حرفت زراعت۔ تجارت اور سب طرح کی معلومات سے واقفیت حاصل کر لیتے تھے۔ خصوصاً دولت عباسیہ نے تو ان باتوں میں ایک طوفانی سیلاب کی طرح فوری ترقی حاصل کی۔ خاصکر جن چیزوں نے اُن کو علم جغرافیہ کی طرف متوجہ کیا وہ یہ ہیں۔

اول۔ خلفاے راشدینؓ کے زمانہ میں فتوحات کی روز افزوں ترقی کے سبب سے ہی اُن کو مختلف بلاد مختلف ممالک آباد اور غیر آباد ممکن الزراعت اور غیر ممکن اور ندی نالہ پہاڑ جنگل وغیرہ اقسام زمین کی تقسیم اور اُسکے بندوبست کی طرف اضطراری طور پر متوجہ ہونا پڑا۔ اسلئے کہ شریعت اسلامیہ میں جو ملک بزور شمشیر فتح ہوں یا جو صلح اور امن کے ذریعہ سے حاصل ہوں اُنپر خراج۔ جزیہ۔ محصول۔ عشر قائم کرنے کے لئے اور نیز جو مال غنیمت ہاتھ آئے اُسکی تقسیم اور

عطاے جاگیر اور کورٹ کرنے کے متعلق جدا جدا انتظامی احکام ہیں۔

دوم۔ اُنکے دائرہ تجارت کا وسیع ہونا۔ ان کی تجارت ہمیشہ اُنکے فتوحات ملکی کے حدود سے گذر کر دور دراز مقامات تک پہونچتی رہی۔ اہل عرب تجارت میں غیر قوموں سے بہت آگے رہے ہیں۔ ان کی برابر کسی نے تجارت میں ترقی نہیں کی۔ قوم عرب دنیا کے تمام اطراف میں تجارت کرتی تھی۔ کوئی معمورہ اُن کی تجارت گاہ سے خالی نہ تھا۔ ان کی تجارت کی متعدد راہیں تھیں جو فاس اور طنجہ سے شروع ہو کر انتہاے ممالک ایشیا تک پوری ہوتی تھیں۔ اُن میں یہ چار راستے مشہور ہیں۔ پہلا راستہ اندلس یعنی اسپین اور یورپ کے ملکوں میں ہوتا ہوا دریاے خزراو بلخ اور بلاد تفرغز تک پہونچتا ہے اور دوسرا خط شمالی کو طے کرتا ہوا۔ افریقہ۔ مصر۔ شام۔ کوفہ بغداد۔ بصرہ۔ اہواز۔ فارس۔ کرمان۔ سند۔ ہند میں گذرتا ہے باقی اور دو راستے بحر روم کو عبور کرتے ہیں۔ ایک تو شام اور خلیج عجم میں ہو کر گذرتا ہے اور دوسرا اسکندریہ اور بحر احمر میں ہو کر اور یہ دونوں راستے بحر ہند میں آکر ملجاتے ہیں۔ بات ایک ہی خواہ یوں کہو کہ عرب کی تجارت جزائر ایشیا میں گذرتی ہوئی مشرق کی جانب چین تک بڑہی اور شمال کی طرف وسط ایشیا میں ہوتی ہوئی اراضی قبائل اور بلاد صقالبہ یعنی روسیا اور بلطین کے کناروں تک پہونچی۔ اور جنوب میں افریقہ شرقی کے کنارے کنارے کسکر تک پھیلی۔ اور مغرب میں سوڈان کے منتشر بیابانوں اور متفرق آبادیوں میں گذرتی ہوئی بحر اوقیانوس اطلانطک کے کنارہ تک گئی۔

سوم۔ اہل عرب کے فروغ تجارت کا ایک بڑا سبب ہر سال حج کے لئے جانا ہے ہمیشہ سے لوگ دنیا کے دور دراز مقامات سے حرمین میں آتے ہیں اور اوقات معینہ میں بغداد قاہرہ اور دمشق میں جمع ہو کر حجاز کو جاتے ہیں (ہندوستان کے لوگ بھی بمبئی میں جمع ہو کر جہاز کی سواری پر عرب کو پہونچتے ہیں۔)

چہارم۔ حصول علم کے لئے اُنکے سفر اور سیاحی کا آغاز عہد خلفاے بنی عباس میں ہوا پھر تو انھوں نے علم کے ذوق میں دنیا کو روند ڈالا۔ یہ چار سبب ایسے ہی ضروری تھے جنھوں نے

اہل عرب کو توسیع علم جغرافیہ پر برانگیختہ کیا اسلئے کہ ان مختلف حالتوں کے پیش آنے سے اُن کو قریوں شہروں - ملکوں اور ہر قسم کے رستوں کے جاننے کی حاجت ہوئی - سیکڑوں سفرنامے لکھے گئے - کسی نے تو فقط آباد شہروں کا حال لکھا کسی نے علماے یونان کی طرح عمدہ طور سے ہر شہر کا جغرافیہ لکھا - اُسکے درجے اور دقیقے مقرر کئے - ایک شہر سے دوسرے شہر تک کی مسافت وغیرہ تحریر کی - اُن لوگوں میں مشاہیر یہ لوگ ہیں -

ابن خردادبہ - احمد بن واضح - جہانی - ابن فقیہ - ابوزید بلخی - ابو اسحق اسطخری - ابن حوقل - ابوعبداللہ بشاری - حسن بن محمد مہلبی - ابن ابی عون بغدادی - ابوعبید البکری - قزوینی - یاقوت رومی حموی - شمس الدین مقدسی - ابوالحسن - علی الہروی - شریف ادریسی ابوالفدا - ابوالعباس - احمد سرخسی - علی بن حسین مسعودی - مراکشی - عبدالرشید ناگوری ابوالقاسم شیرازی - شیخ ازری اسفرائنی - شیخ تقی الدین مقریزی - کچھ ایسے ہوئے جنھوں نے جنگلوں اور چٹیل میدانوں کا حال لکھا - عرب کی عادات اور اُنکے اشعار لکھے - اس قسم کے حالات لکھنے والے عرب کے ادیب لوگ ہیں - جیسے اصمعی اور ابوعبیدہ اور ہمدانی وغیرہ فضلا اور کچھ لوگ سیاح ہیں جنھوں نے عالم کی سیاحت میں دنیا کی جہات ستہ چھان ڈالی ہر ایک جزو کل کو دیکھا نرم زمین ہو یا سخت پہاڑ ہوں یا جنگل دریا ہوں یا ندی نالہ سب کی سیر اور کوہستانی قوموں کا معائنہ کیا ان سب کے حالات مع اُنکے الف اور عادات اور وہاں کی پیداوار اور محاصل وغیرہ قلم بند کئے جیسے ابن بطوطہ اور علامہ ابن خلدون وغیرہ - عنقریب اسکی تفصیل آئے گی -

غرض اس تمام تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ عرب نے علم جغرافیہ کو بڑی وسعت دی اور وہ اس میں بڑے صاحب کمال ہوئے اسکے لئے علاوہ دیگر علوم کے خاص خاص مدارس جاری کئے اور اس فن کو بڑی ترقی پر پہونچایا - اتنا ضرور ہے کہ ان کی تمام ہمت بنوع خاص بلاد اسلامیہ کے جغرافیہ میں ہی مصروف رہی - اسلئے کہ اُن کو یورپ کے ممالک کی سیاحت سے ہمیشہ انکار رہا - اور ان لوگوں کے میل جول کو وہ نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے رہے - اسیواسطے مسلمانوں

نے جب کبھی یورپ کا حال لکھا۔ اُس میں غلطی کی اگر خیال کیا جائے تو اہل اسلام اس باب میں قابل مواخذہ بھی نہیں ٹھہرتے۔ کیونکہ وہ ایک تو یورپ کی زبان نہیں جانتے تھے دوسرے یورپ تک پہونچنے اور اُنکے ساتھہ میل جول کرنے میں اُن کو سیکڑوں دشواریاں حائل تھیں۔ مگر یہ کہ اہل عرب نے زمین کا طول اور عرض کیونکر معلوم کیا اُس کی حقیقت اُسی طرح پر ہی کہ جیسے اور علوم انھوں نے اہل یونان سے لئے تھے اور اُن علموں کو ترقی کے حال تک پہونچایا تھا اسی طرح اسکو بھی یونانیوں سے لیا اور بہت کچھ ترقی دی۔ مشرق سے مغرب تک زمین کی ہفت اقلیم پر تقسیم کی انکے خیال کے مطابق اقالیم سبعہ کی یہ تفصیل ہم علامہ ابن خلدون سے لیکر یہاں بیان کرتے ہیں۔ قاضی ابن خلدون نے زمین کو ہفت اقلیم پر تقسیم کر کے اس طرح بیان کیا ہی۔

اقلیم اول مشرق سے مغرب تک ٹھیک خط استوا کے نیچے واقع ہی جنوبی سمت خط استوا سے محدود اور معین ہوتی ہی۔ خط استوا کے جنوبی سمت اُدہر چٹیل میدانوں اور ریگستانوں کے سوا آبادی کا بہت کم خیال کیا جا سکتا ہی۔ شاید ہو۔ اسی طرح شمالی جانب خط استوا کی اُس سے متصل ہی۔ یکے بعد دیگرے دوسری۔ تیسری۔ چوتھی۔ پانچویں۔ چھٹی یہانتک کہ ساتویں اقلیم ہی۔ پھر ساتویں اقلیم کے اُدہر غیر آباد اور خالی میدانوں پہاڑ جنگلوں کے سوا کچھ نہیں ہی۔ یہانتک کہ یہ خالی میدان پہاڑ اور جنگل بحر محیط تک منتہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ جنوبی سمت میں بھی یہی حال ہی صرف اتنا فرق ہی کہ غیر آباد زمین شمال کی جانب کم ہی اور جنوب کی طرف بہت زیادہ ہی۔ پھر ان اقلیموں میں رات دن کے گھٹنے بڑہنے کا سبب یہی دائرہ معدل النہار سے سورج کا ہٹ جانا اور قطب شمالی کا اپنے افق سے اونچا ہو جانا ہی۔ پس لیل و نہار کا قوس اسی سبب سے متفاوت ہوتا رہتا ہی۔

اور اقلیم اول کے اخیر حصہ میں دن کا اندازہ اُس حالت میں اپنی کمال درازی کو پہنچتا ہے جب سورج برج سرطان کے ٹھیک سر پر آجائے۔ اسی طرح شب کی درازی جب تمام ہوتی ہی

کہ آفتاب جدی کے سر پر پہونچے۔ ان دونوں حالتوں میں رات اور دن دونوں تیرہ تیرہ گھنٹوں کے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی آخر اقلیم ثانی میں جانب شمال جب برج سرطان کے سر پر آئے (یہی گرمی کا موسم ہے) دن ساڑھے تیرہ گھنٹہ کا ہوتا ہے اور ایسے ہی پلٹتے وقت جب برج جدی کے سر پر پہونچے (یہ جاڑوں کی فصل ہے) رات بڑھکر اسی مقدار پر ہوتی ہے۔

اب کم سے کم دن اور کم سے کم رات کے لئے ساڑھے تیرہ گھنٹوں میں سے اتنا ہی بچتا ہے جتنا چوبیس گھنٹوں رومانیہ میں سے مجموع لیل و نہار کے لئے باقی رہتا ہے یہ سال بھر میں آسمان کا پورا ایک دور ہوا۔

اسی طرح آخر اقلیم سوم میں جانب شمال دن اور رات دونوں موسموں میں زیادہ سے زیادہ چودہ گھنٹہ تک بڑھتے ہیں۔ اور آخر اقلیم چہارم میں ۱۴۔ گھنٹہ تک اور آخر اقلیم پنجم میں ۱۵ گھنٹہ تک اور آخر اقلیم ششم میں ۱۵۔ گھنٹہ تک اور آخر اقلیم ہفتم میں ۱۶ گھنٹہ تک بس یہاں آکر آبادی کی انتہا ہے۔ ساتوں اقالیم میں زیادہ سے زیادہ طول رات اور دن کا آدھا گھنٹہ ہے۔ ہر ایک اقلیم میں جنوب کے شروع سے شمال کے آخر تک اس بُعد کے حصوں کے مطابق رات اور دن بڑھتے رہتے ہیں اب ان اقالیم میں کمی کا حساب بھی اسی طرح لگایا جاسکتا ہے۔

یہ تو ہفت اقلیم کے طول کا بیان ہوا اب دیکھنا ہے کہ عرض کن سے عبارت ہے اور وہ کیونکر دریافت کیا جاسکتا ہے۔ یاد رکھو کہ عرض بلد کہتے ہیں اُس بعد کو جو سمت الراس بلد اور دائرہ معدل النہار (جو سمت راس خط استوا سے ہے) کے مابین واقع ہو۔ اس بعد کے ٹھیک ٹھیک ور برابر ہوجانے پر قطب جنوبی اس بلد کے افق سے پست ہوجاتا ہے اور قطب شمالی بلند ہوجاتا ہے اور یہ برابر کے تین ابعاد ہوتے ہیں جو ملکر ایک عرض بلد کہلاتا ہے۔

اہل عرب نے ان ہفتگانہ اقالیم سے ہر ایک اقلیم کے مشرق سے مغرب تک کے طول کو برابر برابر دس حصوں پر تقسیم کیا ہے اور اس اقلیم کے ہر ایک حصہ میں جو جو نامی قصبہ اور شہر پہاڑ ندیاں اور جو مسافت انکے درمیان ہوتی تھیں بیان کیا ہے چنانچہ جب اُنھیں کسی خاص شہر یا پہاڑ یا ندی کا پتہ دینا ہوتا ہے تو

کہتے ہیں کہ فلاں شہر فلاں ندی فلاں پہاڑ فلاں اقلیم کے فلاں حصہ میں واقع ہے۔ پس مصر اُن کی تقسیم کے موافق اقلیم سوم کے چوتھے حصہ میں واقع ہے۔ ملک شام پانچویں حصہ میں اور آستانہ علیہ یعنی قسطنطنیہ اقلیم پنجم کے چوتھے حصہ میں ہے۔ غرض اسی طرح قیاس کر لو۔

حکیم بلطیرن جغرانی کا قول ہے کہ اہل عرب حکیم کلمبس کے زمانہ سے بہت پہلے ملک امریکہ دریافت کرنے کے لئے بحر اوقیانوس میں مدتوں گھومتے رہے ہیں اور جو کمیشن اس کام کے لئے روانہ ہوا تھا مغرورین کے نام سے مشہور ہے (یعنی دہو کہا کہائے ہوئے) غرض اہل عرب نے بحر ہند اور بحر چین میں بہت مفید اور اچھی اچھی معلومات دریافت کئے۔ حکیم بلطیرن جغرانی کی یہی رائے ہے کہ یورپ والوں نے جغرافیہ کے باب میں خطوط مخروطی کی رسم بیشک کتب اہل عرب کی تقلید سے حاصل کی ہے۔ اور وہ لوگ ضرور اسی راہ چلتے ہیں۔ اچھا اب علمائے اسلام کے نام سنو جو علم جغرافیہ میں مشہور اور نامی گذرے ہیں۔

(۱) تیسری صدی ہجری کے اوسط میں ابوزید بلخی نے ایک کتاب لکھی جسکا نام تقویم البلدان ہے۔ اصطخری کا ماخذ یہی کتاب ہے۔ لیکن ہمیں یہ کتاب نہیں ملی۔ البتہ مسعودی نے کچھ اسسے نقل کیا ہے۔

(۲) ابو اسحق اصطخری کتاب المسالک والممالک کا مصنف ہے۔ چوتھی صدی کے آغاز میں کتاب اُسنے تالیف کی۔ لندن میں چھپ چکی ہے۔ خدیوی کتب خانہ میں موجود ہے۔ تیسری صدی کے پچھلے دنوں میں اصطخری شہر اصطخر میں (ملک فارس کا ایک شہر ہے) پیدا ہوا اور طلب علم کے لئے بہت سے ممالک اسلام میں سیاحت کی اور ہر جگہ کے حالات اپنے چشم دید لکھے۔

(۳) محمد الجہانی کتاب المسالک فی معرفت الممالک کا مصنف ہے۔ سنہ ۳۳۱ ہجری میں اُس کی وفات ہوئی۔

(۴) ابو الفرج بغدادی کتاب التذکرہ کا مصنف ہے سنہ ۳۳۷ھ میں اُسکی وفات ہوئی۔

(۵) ابن حوقل کتاب المسالک و الممالک و المفاوز و المہالک کا مصنف ہے اُسنے سنہ ۳۶۶ھ

میں یہ کتاب تالیف کی پھر یہ کتاب فارسی میں ترجمہ کی گئی اور پھر فارسی سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی اس میں تمام بلاد اسلام کے متعلق حالات ہیں۔ دیگر ممالک کا بھی بوجہ الاجمال کچھ مذکور ہے۔

(۶) شریف الادریسی فرانس والے اسکو جغرافی النبوۃ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اسنے بادشاہ روس روجر اول کے واسطے ایک کتاب ۵۴۸ھ میں تیار کی نزہتہ المشتاق اسکا نام رکھا۔ شاہ روجر کے حکم سے ایک چاندی کا کرہ بنایا اور اس کتاب میں اُس کرہ کو زمین فرض کرکے اُس کی شرح لکھی۔ اس کتاب میں شریف مذکور نے زمین کے ہر ایک حصہ کے نباتات کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۷) یاقوت الحموی بن عبداللہ اس شخص کا اصلی وطن روم ہے۔ حموی میں پیدا ہوا۔ بغداد میں عمر بسر کی شہاب الدین کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ بچپن میں روم سے گرفتار ہو کر ایک بغدادی سوداگر کے ہاتھ فروخت ہوا۔ اُسنے اسے لکھنا پڑھنا سکھایا اور یہ بڑا ذی کمال عالم فاضل ہوا۔ جغرافیہ کی طرف زیادہ توجہ کی اور اس فن میں بہ ترتیب حروف تہجی کے ایک کتاب لکھی جسکا نام معجم البلدان ہے۔ ملک البانیا شہر لیپزگ میں طبع ہو چکی ہے۔ چھ جلدوں میں تمام ہوئی ہے۔ ایک اور کتاب لکھی جسکا نام المشترک وضعاً والمتفرق صقعاً ہے یہ کتاب شہر جوتنجن میں ۱۸۴۶ء میں طبع ہوئی کتاب المبدؤ والمآل اور کتاب الدول اور مقتضب فی النسب اور سوانح عمری متنبی شاعر وغیرہ اسنے کتابیں تصنیف کیں۔

(۸) بغوی آٹھویں ہجری کے علما سے ہے جغرافیہ میں ایک کتاب تصنیف کی جسکا نام عجائب المولی فی ضعفہ رکھا۔

(۹) خلیفہ مؤید من اللہ سلطان عماد الدین ابو الفدا۔ مورخ اسنے ۷۳۲ھ میں وفات پائی جغرافیہ میں اسکی تصنیفات سے ایک کتاب ہے جو تقویم البلدان کے نام سے مشہور ہے۔ تمام روے زمین کو پورے طور پر خطوط کھینچکر دکھا دیا ہے۔ باعتبار اقالیم جدولیں کھینچیں اور ہر ایک کے درجے اور دقیقے مقرر کئے۔ ممالک اور بلاد کا طول و عرض وغیرہ قائم کیا۔ معلومات جغرافیہ

ظاہر کیں - ملک شام کو بالتخصیص ایک طرز خاص کیساتھ بیان کیا - کیونکہ یہ ملک اسکا وطن تھا - یہ کتاب شہر پیرس دار السلطنت فرانس میں ۱۸۴۰ء میں طبع ہوئی -

جہاں ہم نے علم تاریخ میں بحث کی ہے ہم لکھ آئے ہیں کہ اہل عرب مورخین اور جغرافین میں خلط ملط کر دیتے ہیں - یا تاریخ اور جغرافیہ اُنکے نزدیک قریب قریب ایک سے ہیں - ایسا بہت کم ہے کہ کسی نے ان دونوں میں سے ایک کا بغیر دوسرے کے التزام کیا ہو - ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مورخ لوگوں نے جنکا ذکر اوپر ہو چکا بشمول تاریخ جغرافیہ کا بھی ذکر کیا اور جو ممالک مسلمانوں نے فتح کئے اُن کی تاریخ لکھتے وقت اُن کا جغرافیہ بھی اُسی میں درج کیا - جیسے مسعودی مروج الذہب کا مصنف اور واقدی - مقریزی - ابن الوردی وغیرہ - ہمنے یہاں ان لوگوں کا ذکر صرف جغرافیہ کے متعلق کیا ہے ورنہ یہ لوگ مورخ بھی ہیں - انھیں میں سے ایک قزوینی ہے جو کتاب آثار البلاد واخبار العباد کا مصنف ہے - اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ شاہی کتب خانہ مصر میں موجود ہے ایک بیرونی ہے جسکی وفات ۴۳۰ ہجری میں ہوئی - کتاب آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ کا یہ مصنف ہے یہ کتاب بمقام لیبزگ ۱۸۷۸ء میں طبع ہوئی - شمس الدین مقدسی احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم کا مصنف ہے یہ کتاب بھی ۱۸۷۷ء میں لندن میں چھپی -

جغرافیہ میں بہت سے سفرنامے بھی داخل ہیں - مسلمانوں میں بہت لوگ ایسے گذرے ہیں جنھوں نے ملکوں اور شہروں کی سیاحت کی اور اپنے چشم دید حالات سے کتابیں تصنیف کیں -

ایک ابن فضلان ہے جسنے تیسری صدی ہجری میں ملک افریقہ کا سفر اختیار کیا اور وہانکے حالات عمدہ طور پر قلم بند کئے - ایک بیرونی منجم ہے جو ہندوستان کا سیاح ہے پانچویں صدی ہجری میں اسنے ہندوستان کی سیاحت میں ایک کتاب مستقل لکھی - ابن بطوطہ سیاح نے ساتویں صدی ہجری میں ممالک افریقہ اور ہندوستان اور چین اور روس وغیرہ کی سیاحت کی ایک حسن بن محمد قرطبی ہے - جو اسد افریقی کے نام سے مشہور ہے -

انکے تمام افریقہ کا اور کسیقدر ایشیا کا سفر کیا یہ فاضل دسویں صدی ہجری میں گذرا ہے۔
انکے سوا اور بھی بہت سے علما ہیں جنکا اکثر ذکر بحث فلک اور علم تاریخ میں گذرچکا ہی۔

ازالہلال۔ ترجمہ

صفی الدولہ حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خانصاحب

لال باغ۔ روڈ مظفر گنج لکھنؤ

الطوتمیہ

کیا گمراہی اور باطل پرستی زمانہ کے اجزا تحلیلی کا جزو عظم نہیں کہی جاسکتی۔ اس سوال کے جواب میں ہمکو صحیح اور درست کہدینے پر جو چیز مجبور کرتی ہے وہ واقعات کی شہادت ہے۔ جو اس سوال پر روشنی ڈالکر یہ جواب دلاتی ہی۔ کیونکہ اگرچہ گذشتہ زمانہ سے قطع نظر کرلیا جائے مگر آج بھی جبکہ زمانہ تقلید سے دور ہی اور ہدایت عقل کے قدم بڑہا رہا ہی۔ ہمکو متمدن ممالک میں وہم اور قدامت پرستی کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں جو سراسر خلاف عقل ہوتی ہیں۔

حقیقت میں جوہر انسانیت جسکی وجہ سے اشرف المخلوقات کا مستحق انسان ہوا اس میں وہ ملکہ تھا جو رطب و یابس کا مدرک اور خذما صفا دع ما کدر کی تعمیل کا محرک ہوا۔ ذیل میں جس مضمون پر ہم قلم اُٹھانیوالے ہیں اُس میں آپ دیکھ لینگے کہ اُس بدنصیب قوم کی تمامتر جہالتوں کا پیش خیمہ یہی خیال ہوا کہ ہم ارذل ترین خلائق ہیں یہانتک کہ گھاس پھوس اور ہم میں وہ نسبت ہی جو معبو و عبد میں ہوتی ہی! اردو خواں جماعت کے لئے یہ میدان بحث بالکل نیا منظر ہوگا گو عربی اور یوروپین زبانیں اس معرکۃ الارا موضوع سے خوب روشناس ہیں کیونکہ یورپ کے مشہور فلاسفر ہربرٹ اسپنسر اور ڈاکٹر مکلنیان سنے اس عجیب و غریب فرقہ کی متعلق جو تحقیقات کی ہیں اُنکو تنقید سے زیادہ مضبوط کر دیا ہی؛ عربی بھی ان کے تراجم سے خالی نہیں۔ وہو ہذا۔
امریکہ اور اسٹریلیا میں طوتمیہ کے نام سے ایک رسم خدا پرستی جاری ہی۔ طوتمیہ اُنکے

یہاں ایک معزز مفہوم کی مجمل تعبیر ہے یعنی وہ نباتات یا حیوانات جنکو انسان اوہا ڈھنڈ اپنی اظہار عبودیت
کے لیئے خاص کرلے، جسکے ساتھ اپنے بنانے اور بگاڑنے کے تمام اعتقادات قائم کردے۔
اور سچے دل سے اُسکو کریم کارساز تسلیم کرلے۔ اور اُسکی تقدیس اور کلمہ گوئی کو اپنی فلاح و بہبود کا
ذریعہ سمجھنے لگے۔

مذکورۂ بالاد و مقامات کے علاوہ دنیا کے ان بڑے حصوں میں بھی یہ جہالت پائی جاتی ہے
افریقہ۔ چین۔ سیبریا خط استواء اور جزائر محیط میں۔ فرق یہ ہے کہ امریکہ میں زور شور ہے اور
ان ممالک میں اتنا تسلط نہیں۔ خود آپ کا بنگال اس سے خالی نہیں مگر چونکہ یہاں والے اپنے
خاندان کو اپنی طوتمیہ کے نام موسوم نہیں کردیتے اسلیئے اُن کی زیادہ شہرت نہیں۔

طوتمیہ کے کئی درجہ ہیں، بعض وہ ہیں جو ایک خاندان کے قبلہ نما ہیں جسپر اُسکے بڑے چھوٹے
سب ایمان رکھتے ہیں۔ اور وہ تمام اعتقادات جسکی مقتضی معبودیت ہے اُس سے متعلق کردیتے
ہیں۔ بعض وہ ہیں جنکی حکمرانی خدا کا جلوہ نہاں مانکر طبقہ ذکور واناث میں سے کسی ایک خاص
جنس پر ہوتی ہے اور بعض وہ ہیں کہ نہ اُنکے زیر فرمان کوئی قبلہ ہے اور نہ کوئی نئی جنس بشر ہے۔ بلکہ
صرف ایک پوجاری اُنکی قدرت اور ربوبیت کا مدعی ہے اور وہی اُنکی کل کائنات ہے۔

مذہبی حیثیت میں اہل طوتمیہ نے اسقدر افراط و تفریط کو دخل دیا ہے کہ اُسکا نباہ ایک عسیر الحصول
امر معلوم ہوتا ہے۔ طوتمیہ کی تعظیم و تکریم کو اُنھوں نے محدود نہیں رکھا یعنی یہ کہ اگر وہ نباتات ہیں
تو اُنکے کاٹنے اور روندنے اور لکڑیوں کے جلانے سے پرہیز کیا جائے۔ اور اُن کی نشو و نما
کی جگہ کو معزز اور واجب التعظیم بنا دیا جائے اور اگر حیوانات ہیں تو اُن کو ایذا نہ پہونچائی جائے۔
طرہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں اپنی طوتمیہ کو چھوو مت، نگاہ اُن پر نہ ڈالو، اور زبان سے نام مت لو
بلکہ علامات خاص خاص متعین کرلو۔ جن سے اُنکے متعلق اگر گفتگو کرنی ہو تو کرسکو۔ چنانچہ امریکہ
میں دولارس کے ہنود کے چند قبیلے جو پلنے کو بھیڑیے اور جنگلی مرغ وغیرہ وغیرہ کیطرف منسوب
کرتے ہیں اپنے ادائے مطلب کیواسطے یہ اشارے مخصوص کرلیئے ہیں کہ جب پہلی کو تبلانا ہو گا

توچکر دیگر زمین پر قدم رکھیں گے اور دوسرے کو بے چبلانے کھانیوالے کے اشارہ سے ذہن نشین کرینگے۔ اور جو قبائل ہرن اور ربط اور سانپ یا بچھو یا اور حشرات الارض کی خدائی کے قائل ہیں اُن کی بھی مفہوم ایسے ہی متعینہ اشاروں سے ادا کرتے ہیں۔

طوتمیہ کی قدرت کے بارہ میں جو عقیدہ انکا ہے اُسکا اندازہ اس امر دان سے ہوسکتا ہے کہ طوتمیہ کے خلاف عظمت کام کرنے کو وہ اپنی تباہیوں کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں، اپنی عورتوں کا بانجھ ہو جانا انکا پاس ادب نہ رکھنے کی ادنی سزا سمجھتے ہیں۔ انکا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی اپنی طوتمیہ کو کھالیتا ہے تو اسکا انجام موت ہے، کیونکہ اس جرم کی پاداش میں طوتمیہ اُسکے جسم کے ساتھ قائم ہو جاتی ہے اور اُسکو مار کر دم لیتی ہے، اُن کو بھوک کی شدت میں مرنا دل سے بھلا معلوم ہوتا ہے بمقابلہ اسکے کہ وہ اپنی طوتمیہ کا لقمہ بنادیں، کیونکہ اُسوقت مرجانا ایک وقتی امر ہوگا مگر یقین کے ساتھ جب اسکا انتظار کرنا پڑیگا تو ایک بڑی مصیبت ہوگی جو انتظار ہی میں قبل از وقت جان لے لیگی۔

باوجود اس غضب اور جبروت کے رحم اور احسان کی صفتوں کے بھی علیٰ وجہ الاتم ان میں پائے جانے کے قائل ہیں۔ جسکا اکثر اپنے عقیدہ کے موافق وہ تجربہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ قبائل جو سانپ بچھو اور بھیڑیے ایسے موذی جانوروں کو اپنا معبود مانتے ہیں اُنکا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا طوتمیہ ہمکو ضرر نہ پہونچائیگا، اس موقع پر عجیب بات وہ یہ دکھلاتے ہیں کہ سانپ بچھو کو اپنے بدن پر ڈال لیتے ہیں مگر اُن کو کوئی ایذا نہیں پہونچاتے۔ چنانچہ اگر کوئی نیا شخص دعویٰ کرتا ہے کہ ہمارا طوتمیہ انھیں میں سے کوئی ہے تو اُسکی آزمایش یہی ہوگی کہ اُسپر اُسی کے طوتمیہ کو بلا روک ٹوک ڈال دینگے اگر بچگیا تو سچا ورنہ جھوٹا سمجھا جائیگا۔ وہ کہتے ہیں کہ طوتمیہ کی بخشش یہی نہیں کہ وہ ہمیں گزند نہیں پہونچاتے۔ بلکہ ہم پر احسان بھی کرتے ہیں، اگر کوئی مصیبت ہم پر آنیوالی ہوتی ہے تو اشاروں کے ذریعہ سے وہ ہم کو پہلے ہی متنبہ کر دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات اُس آفت کو ٹال دیتے ہیں۔ اس عقیدہ سے اُنکے معبودوں کے عالم الغیب ہونے کا عقیدہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

ان عقائد کے علاوہ جو خدا کے شایان شان ہونے چاہئیں" قطع نظر اس سے کہ خدا کون فرض کیا جاتا ہی" اُنکے یہاں بہت سے عقائد تعجب خیز ہیں۔ اس مذہب کا ہر گروہ جو اپنا معبود ایک شی سمجھتا ہی اور اُسی کی طرف وہ منسوب کیا جاتا ہی۔ اس نسبت کا اصلی راز یہ تبلاتا ہی کہ ہماری منتہاے نسل اس حیوان یا نبات پر ہوتی ہی اور اُسکے متعلق اپنے دعوی کے اثبات میں ہر فرقہ باپ دادا سے سُنی ہوئی ایک روایت کی نقل کرتا ہی۔ جس میں اسکا ثبوت ہوتا ہی کہ ہم کیونکر نباتیت یا حیوانیت سے منتقل ہو کر انسانی قالب میں آئے۔ چنانچہ سلحفاۃ کا قبیلہ جو کچھوے کی طرف منسوب کیا جاتا ہی اسکا بیان ہی کہ ایک موٹے کچھوے پر جب اسکی پیٹھ کی ٹھیکری بار گراں ہو گئی تو اُسنے اتار کر پھینک دی۔ رفتہ رفتہ اُسنے تبدیل ہیئت کر کے انسانی جامہ پہن لیا۔ اسی طرح ہر گروہ اصول ارتقا سے اپنا سلسلہ اپنے معبود کی طرف منتہی کر دیتا ہی۔ مذہبی اصول کی صورت میں اُنکا ایک "مضحکہ طلب" ضابطہ یہ بھی ہی کہ اپنی شریک طوتمیہ عورت سے مرد اور مرد سے عورت نکاح نہ کرے کیونکہ یہ مناکحت مضر صحت ہی نیز اسکے ارتکاب سے انسان مستوجب عذاب الیم ہوتا ہی وجہ اسکی یہ تبلاتے ہیں کہ ایک طوتمیہ والے آپس میں بھائی بہن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مذہبی قید کی زنجیر کو توڑنا اُنکے نزدیک چونکہ بڑا جرم ہی اسلئے وہ اس بدویت پر کاربند ہوتے ہیں کہ دوسرے خاندانوں کی لڑکیاں زبردستی یا نیم رضا سے لے لیتے ہیں اور اُنسے نکاح کرتے ہیں۔ اس موقع پر اس خاص مسئلہ ممانعت ازدواج سے انکے مذہب کی حقانیت کا معیار جانچا جا سکتا ہی۔ مذہب کی حقانیت کا عظیم الشان پہلو یہ ہی کہ اگر اُسکے ایک ہاتھ میں دینی پابندی کا تازیانہ ہو تو دوسرے ہاتھ میں عیش دنیا کے جواز کا فتوی بھی ہو۔ اگر مذہب اسوقت ایک جابر کی صورت میں بے نیازی سے حکومت کرے تو دوسرے وقت ہمارے دل لبھانے والے دنیا کے کام دہندوں میں رفاقت کے لہجے سے اُسکو مشورہ دینا چاہیئے۔ دین اور دنیا کے اُمور میں اعتدال سے زائد مقدار کو کام کی بات سے اس طرح ممتاز کر دینا اُسکا فرض ہی کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی نظر آتا ہو

لہذا دنیا کی نعمتوں اور عیشوں کی اگر روح رواں کوئی چیز کہی جاسکتی ہی تو وہ نعمت لائق بیوی ہی
بی بی انسان کی عزت و حرمت والی زندگی کی انگشتری کا وہ خوشنما نگینہ ہی جس میں تمام دنیا وی
خوبیوں اور عزتوں کے نقش کندہ ہیں حتے کہ ناصح با اثر ہی تو بی بی، اور کسی چیز کا پر تو طبیعت انسانی
بلا اقرار اگر ٹھنڈے دل سے قبول کرلیتی ہی تو وہ بیوی ہی کے خیالات اور اعمال کا پر تو ہی۔ جب
یہ کیفیت ٹھہری تو اس معاملہ میں مذہب کی طرف سے سختی بجز چند شرعی رکاوٹوں کے جنسے
خود طبع انسانی محترز رہنا پسند کرتی ہی۔ آزادی اور اختیار کا خون کرنا یہ مفہوم رکھتا ہی کہ مذہب
کی وجہ سے عیش زندگانی منغص کردو جس سے سارا نظام عالم ایک لغو اور ناجائز کارخانہ ٹھہر
جاتا ہی اور خالق کی خلاقیت پر حرف آتا ہی، مذہب حق جسکو عقل کے قدم بقدم ہونا چاہیئے
کبھی یہ نہیں کہہ سکتا۔ اس مذہب کے عجیب و غریب اُصول کا ایک قضیہ یہ بھی ہی کہ اولاد کا نسبی
تعلق ماں سے ہوتا ہی باپ سے نہیں۔ اسی وجہ سے انتقال طوتمیت میں لڑکا ماں کا طوتمیہ اختیار
کرتا ہی۔

انکے یہاں عبادت کے اور کسی طریقہ کا پتہ نہیں چلتا جس سے یہ بھی قیاس ہوتا ہی کہ شاید
یہی ان کی عبادت ہو کہ وہ اپنی طوتمیہ (معبود) سے تشبیہ صوری پیدا کریں خواہ اُسکی کھال پہنکر یا اور
کسی صورت سے کہ دیکھنے والے کا خیال طوتمیہ کیطرف رجوع کرجاے۔ کھال یا کوئی ٹکڑا طوتمیہ
کا پاس رکھنا ہر فرد بشر اپنا فرض اور باعث برکت سمجھتا ہی، چنانچہ کسی شخص کا بازو یا گلا اس تعویذ
سے خالی نہیں ہوتا۔

اسی طرح پیدائش اور شادی کے موقع پر جو رسمیں انکے یہاں تبرکاً جاری ہیں وہ ہر ایک کی
علٰحدہ ہیں۔ قبیلہ غزال احمر کا دستور ہی کہ پیدائش کے وقت مولود کی پیٹھ پر اپنی طوتمیہ کی تصویر
کھینچ دیتے ہیں۔ اسیطرح قبیلہ بنی ذئب میں بلند آواز سے طوتمیہ کا نام لیکر اُس کی طرف لڑکے کا
انتساب کرتے ہیں۔ شادی کے دن قبیلہ کلب احمر والے جو جاوا میں آباد ہیں شیرخ کتی کی
خاک خوشبودار تیل میں تبرکاً ملاکر دولھن کے سر میں لگاتے ہیں۔ یہ استعمال انکے یہاں شب عروسی

میں جوئی اور عطر سہاگ کا حکم رکھتا ہی؛

جب کوئی طوطیہ کسی قبیلہ کا مرجاتا ہی اور کوئی شخص اُسکو کہیں مرا ہوا دیکھتا ہی تو وہ تمام ابنا، قوم کو جمع کرتا ہی سب اکٹھا ہو کر گریہ وزاری کرتے ہیں اور بعد فراغت کے اُسکو انسانی مُردوں کی طرح دفن کرتے ہیں بعض قبیلوں میں یہ بھی رسم ہی کہ اظہار حزن و ملال کی غرض سے اپنی پیشانی کو خون آلود کر لیتے ہیں۔ غرضکہ یہ تمام اصل معتقدات و ارکان ہیں جنپر اس مذہب کی بنا ہی تفصیلی واقفیت پر اُصول العمران اور اُصولِ تمدن مصنفہ ہربرٹ اسپنسر سے روشنی پڑسکتی ہی؛

"قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"

جواد علیخاں۔ محمد پوری۔ طالب علم دار العلوم

"نیچری مذہب"

اودہ

سترہویں صدی میں ملک فرانس میں فسق و فجور اور گناہ کرنے کی مختلف خراب عادتیں اسدرجہ ترقی کر گئی تھیں کہ پاک طینت لوگ یہ اندیشہ کرتے تھے کہ قہرالٓہی منودار ہوگا اور اس ملک کو نیست و نابود کر دیگا اور لوئس چہار دہم کے زمانہ میں تو بدکاریوں نے ایسی ترقی کی تھی کہ خدا کی پناہ۔ اُمرا میں بدکاری۔ عیش پرستی کا مادہ حد سے زیادہ تجاوز کر گیا تھا۔ ہنرمند اور صاحب کمال ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے۔ زناکاری سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی وہ جائز اولاد تصور کیجاتی تھی۔ ملک میں لوٹ مار اور کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ الغرض خدا نے اپنے ایک پیارے بندہ مسٹر روشیو کو پیدا کیا اور اُسکے کلام میں ایسی تاثیر دی کہ حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوگئیں جس طرح کہ سترہویں صدی لوئس چہار دہم کے نام سے موسوم کیجاتی ہی۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی کسی بادشاہ کے نام کے بجائے مسٹر روشیو کے نام سے یاد کیجاتی ہی۔ اُسی کے کلام معجز بیان نے عقائد۔ فرائض اور مقاصد زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا اسکا پہلا اُصول یہ ہی کہ انسان اور نیچر پر بھروسہ کرو۔ تین سو برس قبل اگرچہ یہ خیال اٹلی میں بھی پھیلا تھا لیکن اُس میں کامیابی نہیں

ہوئی کیونکہ اسکے معنی مختصر طور پر سمجھ لیے گئے تھے وہاں پر یہ نتیجہ برآمد ہوا تھا کہ لوگ اپنے جسم کی ظاہری آرایش وزیبایش کرنے میں مشغول ہوگئے۔ برخلاف اسکے فرانس میں اسکے معنی نہایت وسیع لیکر اُنپر عمل کیا گیا۔ اس نئی کوشش کا یہ مقصد تھا کہ روح انسانی کی آزادی اور اُسکا وقار قائم کیا جاے اور دل کو جو سرچشمہ تمام خیالات اور عقائد کا ہی ناپاک کے بجاے پاک اور منزّہ تصور کیا جاے اور فطرۃ انسانی کے قواعد کو متبرک جان کر بھلائی اور بُرائی کا معیار اُنپر قائم کیا جاے۔ انسان کو کسی فوق العادت شے کا ماتحت سمجھ کر اُسکو بالکل مجبور نہ جانا جاوے۔ اس نئے عقیدہ کی اشاعت پر ایک زبردست انقلاب اور تلاطم برپا ہوگیا۔ اُصول اول کو مان کر کہ نیچر اور انسان پر بھروسہ کرو۔ فطرت انسانی اور خیالات وچال چلن کے قوانین منضبط کیے گئے۔ اگرچہ ان قوانین کے منضبط کرنے والوں کی رائے میں کسی کسی مقام پر اختلاف کی جھلک نظر آجاتی ہی لیکن سب کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ صرف ایک ہی مقصد کی تکمیل کے لیے ہر ایک نے اپنی سی کوشش کی ہی اور ہر ایک کی تحریر کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہی۔

مسٹر روشیو سے قبل وونیائر نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہر شخص کو اپنی عقل سے کام لینا چاہیئے اور اپنے ہی فیصلہ کے بموجب کارروائی کرنا چاہیئے۔

اور مسٹر ڈائڈروٹ نے فرمایا تھا کہ سلف کا کلام پڑہنے کے بجائے قوانین فطرت کا مطالعہ کرنا چاہیے کیونکہ یہی حقیقی علم ہی۔ لیکن وونیائر اور ڈائڈروٹ نے جو کچھ عقل اور سمجھ کے بارے میں کہا تھا وہی روشیو نے دل کی قوت اور کانشنس کے لیے فرمایا۔ فہم وفراست تو صرف چیدہ اشخاص میں پائی جاتی ہی لیکن کانشنس اور دل کی قوت ہر شخص میں موجود ہی اُسنے کام کے لیے ایک نیا دروازہ کھولدیا اور علمی تحریک کو جس میں صرف تعلیم یافتہ جماعت داخل تھی اخلاقی اور روحانی تحریک میں تبدیل کردیا جسکے اصولوں کا اثر لوگوں کی روزمرہ زندگی پر پڑنے لگا اور اُنکے دلوں میں نئی نئی آرزوئیں اور اُمیدیں نشوونما پانے لگیں اور اس کی تمام تعلیم صرف اس عقیدہ پر مبنی ہی کہ نیکی اور نیکی کی محبت فطرت انسانی کا ایک حصہ ہی۔ وہ کہتا ہی کہ کوئی فوق العادت قوت بجز دل کے

نہیں ہی جو نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی تعلیم دیتی ہی۔ جس طرح پر کہ جسمانی قویٰ سے رنج و راحت میں تمیز ہوتی ہی اسی طرح اخلاقی قوت ہمکو مجبور کرتی ہی کہ نیکی اور بدی میں امتیاز کریں۔ اس سیدھے سادے عقیدہ نے کہ نیکی کی اُلفت فطرۃ انسانی میں داخل ہی لوگوں کے خیالات میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا اُسکا یہ خیال پادریوں اور اپنے ہمعصر فلسفیوں کے خیالات سے بالکل نیا اور اچھوتا ہی کیونکہ وہ خیال کرتے تھے کہ بُرائی خصلت انسانی میں داخل ہی اور انسان کا طبعی میلان بُرائی کی طرف ہی۔ بعض کا یہ خیال تھا کہ بھلائی اور بُرائی کی طرف انسان کو فطرتاً کوئی لگاؤ نہیں ہی بلکہ اپنے جسمانی قوا کے باعث وہ خوشی کو پسند کرتا ہی اور رنج سے نفرت کرتا ہی۔

روشیو کہتا تھا کہ میں کسی نئے عقیدہ کی تعلیم نہیں دیتا ہوں بلکہ میری تعلیم ہر ایک مذہب میں موجود ہی کہ انسان اپنے نفس پر قابو رکھے۔ فرائض منصبی کے ادا کرنے کا خیال قوی ہو اور خود غرضی سے درگزر کرکے وہ اپنی زندگی کے لیے اعلیٰ خیالات قائم کرے اور میرا یہ کہنا کہ فطرت اور انسان پر بھروسہ کرو ان سب اُمور سے تعلق رکھتا ہی

اب ہم اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں کہ نیچری مذہب میں اچھی خبروں کا وہ پیام کہاں سے آیا ہی جسنے تمام یورپ کو غفلت سے بیدار کیا اور بقول مسٹر مارلے "یورپ کو ایک نئے صحیفہ کا سبق دیا"۔ مسٹر روشیو نے اپنی آنکھوں کے سامنے مظالم اور بدکاری کی کثرت کو ملاحظہ کرکے یہ خیال قائم کیا تھا کہ انصاف اور سچائی فطرت انسانی میں داخل ہیں، اور کوئی مذہب فطرت انسانی کی مخالفت نہیں کرسکتا ہی۔ یہی وہ زبردست خیال تھا جسکے باعث اُسنے قانون اخلاق کو مرتب کیا اور لوگوں میں اپنے پر بھروسہ کرنے اور اپنی نجات کی تدابیر اختیار کرنے کا مادہ پیدا کر دیا۔ اسی خیال نے معجزات کے ذریعہ سے نجات ہو جانے کے غلط خیال کی تردید کی اور لوگوں کے اس خام عقیدہ کو جڑ سے اُکھاڑ ڈالا کہ انسان میں اپنی نجات حاصل کرنے کے لیے کوئی قوت موجود نہیں ہی۔

مسٹر روشیو کی تعلیم کا خلاصہ حسب ذیل ہی۔

(۱) قوائے اخلاقی جس نیکی کی الفت کی تعلیم دیتے ہیں وہ بھی فطرت انسانی کا ایسا ہی خاصہ ہی جیسا کہ قوائے جسمانی کی تعلیم کردہ محبت اور خوشی کی قیمت ہی۔

(۲) اگرچہ محبت بسا اوقات اس قسم کی ہوتی ہی جس سے دوسروں کے مفاد کو ضرر پہنچتا ہی یا اُنکے خلاف ہوتی ہی۔ لیکن نیکی کی اُلفت ایسی اخلاقی خوبیاں پیدا کر دیتی ہی جو ہر شخص کے لیے یکساں مفید ہوتی ہیں۔

(۳) اگرچہ اکثر اشخاص میں نیکی کی الفت کے بجاے خودغرضی کا مادّہ زیادہ ہوتا ہی۔ لیکن ایک کی خودغرضی کو دوسروں کی خودغرضیاں روکتی رہتی ہیں۔ مگر نیکی کی اُلفت انسان کی زندگی کا زبردست قانون ہی کیونکہ اس قانون پر ہر شخص عمل کر سکتا ہی اور ہر شخص اس قانون سے رضامند ہو سکتا ہی۔

پروفیسر ہیکسلے نے اسپر یہ اعتراض کیا ہی کہ "یہ خیالات غلطی پر مبنی ہیں"۔ اب اسکا تصفیہ ہم خود کر سکتے ہیں کہ یہ اعتراض کس حد تک درست ہی حقیقت حال یہ ہی کہ مسٹر راشیو بھی اِنسان تھا اور انسان خطا سے مبرّا نہیں۔ اب ہم اپنے کانشنس سے خود سوال کر سکتے ہیں کہ کیا یہ باتیں ہمارے لیے درست ہیں۔

سخت غلطی ہوگی اگر ہم کسی انسان کے دلی خیالات کی سچائی کے لیے اس قسم کے جوابات کے خواہاں ہوں جو قوانین قدرت کے بالکل درست اور صحیح ہوں۔ مسٹر روشیو کا مقصد یہ ہی کہ خیال قائم کرنے کے اس قسم کے قوانین منضبط کیے جائیں جن کے ذریعہ سے انسان کی زندگی بہتر ہو جاے وہ زیادہ تر خوش رہے اور اُس میں اعلیٰ صفات پیدا ہو جائیں۔ یہ مقصد ہر وقت اُسکے پیش نظر رہتا تھا اُسکا مقولہ تھا کہ انسان کی حالت کا اندازہ کرکے میں اس قسم کے قواعد مرتب کرنیکا خواہشمند ہوں جنپر سوسائٹی کے اُصول قائم کیے جائیں۔ خداوند عالم کے وجود کے بارے میں مسٹر روشیو کہتا ہی کہ نظام فطرت اور انسان کی کانشنس کے ذریعہ سے حقیقت کے قانون کے ظاہر ہونے پر انسان کو خداوند عالم کے وجود کا علم حاصل ہوا ہی۔

اس خیال کی تردید ناممکن ہی کہ خدا کا وجود ہی کیونکہ ہم یہ بات ہرگز نہیں فرض کرسکتے ہیں کہ جملہ موجودات خود بخود پیدا ہوگئی ہیں۔ اور ہماری قوتوں سے بڑھ کر اور کوئی زبردست قوت نہیں ہی۔ اسلیے قواے فطری کو ترقی دینے اور اُنکو کام میں لانے سے ہم اس عقیدہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ خداوند عالم کا وجود ضرور اور یقینی ہی۔

ہم اُسکو اُسکے کاموں میں ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ ہم اُسکو اپنے میں محسوس کرتے ہیں اور اپنی مستعد زندگی میں ہر مقام پر اُسکے جمال کے پرتو کو دیکھا کرتے ہیں لیکن اگر ہم نیچر اور روح انسانی سے علیحدہ ہوکر اُسکو خود اُسی میں تلاش کرنے کا ارادہ کریں تو وہ ہمکو نہ ملیگا۔ اور جسطرح پر کہ ہم نیچر میں خداوند عالم کو دیکھتے ہیں اسی طرح ہم روح کو انسان میں پاسکتے ہیں۔ ہم روح کو اُسکے کام سے دیکھتے ہیں جو وہ ہم میں کرتی رہتی ہی۔ روح ہم میں یہ خواہش پیدا کرتی ہی کہ جسمانی تکالیف دفع ہوجائیں اور آرام و آسائش حاصل ہو اور وہی یہ یقین دلاتی ہی جس کی وجہ سے ہر ایک ذی عقل کو یہ خیال ہوتا ہی کہ مجھ میں روح ضرور موجود ہی۔ روح کے متعلق دیگر حضرات کی طرح میرا بھی یہ خیال ہی کہ روح کا مقصد ہمارے فہم سے بالاتر ہی اور اُسکو ہم پورے طور پر نہیں بیان کرسکتے ہیں اور روح کو جسم سے زیادہ قیام ہی۔ نیچری مذہب میں ان معاملات کے ثبوت کی ضرورت نہیں جو انسان کے تجربہ سے باہر ہیں۔ مذہب کا تو یہ کام ہی کہ وہ انسان میں اخلاقی خوبیاں پیدا کرے نہ کہ اخلاق کو خراب کرنے والی عادتوں کے پیدا کرنے کا باعث ہو یا خداوند عالم کے متعلق ایسی باتیں ظاہر کرے جو فہم اور کانشنس کے خلاف ہوں۔ خداوند عالم کی مرضی انسان کو سمجھانے کے لیے کسی فوق العادت امر کے بیان کرنے کی حاجت نہیں کیونکہ اسکا قانون انسان کی اخلاقی فطرت میں مرقوم ہی۔

فوق العادت اُمور خدا کے متعلق ہمارے علم کو کچھ زیادہ نہیں کرتے ہیں بلکہ یہ اُمور ہمارے فطری خیال کو کمزور کردیتے ہیں اور ہمکو تاریکی اور گمراہی کی طرف پہنچا دیتے ہیں۔ فوق العادت والے مذہب کیا کرسکتے ہیں جو نیچری مذہب نے نہیں کر دکھایا ہی۔ نیچری مذہب لوگوں کو یہ تعلیم دیتا ہے

کہ تمام انسانوں سے محبت کرو۔ اپنے نفسانی جذبات کو قابو میں رکھو اور اعلیٰ صفات حاصل کرنے کی طرف توجہ کرو لیکن جس وقت فوق العادت والا مذہب اس سے باہر قدم رکھتا ہی تو وہ ضرر رسان ہوجاتا ہی اور اُسکے مقلد مغرور، متعصب اور قابل نفرت ہوجاتے ہیں اور دنیا میں امن وامان قائم کرنے کے بجاے وہ خونریزی کا باعث ہوجاتا ہی اور خدا کی محبت وعبادت کرنیکے لیے لوگوں کو مستعد کرنے کے بجاے وہ قوموں میں تفرقہ ڈالدیتا ہی اور اُنکو یہ سکھاتا ہی کہ ایک فرقہ دوسرے سے نفرت اور حقارت کرے۔

مسٹر روشیو کے زمانہ میں ملحد اور متعصب پادری زمین اور آسمان پر اپنا اپنا قبضہ اور ملکیت ثابت کرنے کے لیے لڑے مرتے تھے۔ لیکن مسٹر روشیو نے بغیر کسی خوف اور اندیشہ کے اس نئے عقیدہ کا وعظ کہا جسنے تمام باطل عقائد اور توہمات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ یہ وہ زبردست عقیدہ ہی جسکے روبرو اپنے ہات سے بناے ہوے کل معبد گاہوں کو خاک میں ملجانا چاہیئے۔ خداوند عالم ان لوگوں کو اب بھی اپنا جلوہ دکھاتا ہی جو قدرت کے مناظر میں چشم بصیرت سے اُسکو دیکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اور اُن حضرات سے ہمکلام ہوتا ہی جو اُس کی آواز کو انسان کی پاک خواہشوں اور روحانی صفات میں سُننے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

(شان الٰہی زبیری)

چھاپہ کی ایجاد

ہندوستان میں اب کتابیں اور اخبارات ایسے عام ہوگئے ہیں کہ ہم مشکل خیال کر سکتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی وقت تھا جب چھاپنے والے اور چھاپہ معلوم نہ تھا۔ جو کتابیں علم وہنر کی نسخہ کیمیا کی طرح پوشیدہ رکھی جاتی تھیں اب اس چھاپے کی برکت سے اُنکے سیکڑوں نسخے ہر ایک کتب فروش کی دوکان پر پڑی نظر آتی ہیں سب سے پہلے کتاب جو انگریزی میں چھاپی گئی سنہ ۱۴۷۱ء میں تھی

یہ نہیں معلوم کہ کس نے پہلے پہل اس ہنر کو ایجاد کیا مگر اس میں شک نہیں کہ اول چھاپنے والا انگریز ولیم کیکسٹن تھا اور نیز یہ کہ اُسنے اپنا ہنر فلانڈرس میں سیکھا جو کچھ فرانس اور کچھ ہالنڈ میں واقع ہے اس ملک سے وہ اپنے علم کو انگلستان میں لایا اور چھاپہ کی کل ایجاد کی۔

کیکسٹن ۱۴۱۲ء میں پیدا ہوا تھا اپنے لڑکپن میں وہ لندن کی ایک سوداگر کی دکان میں محرر تھا۔ یہاں وہ ایسا باقاعدہ۔ باخبر اور اپنے فرائض کے ادا کرنے میں ایماندار تھا کہ اُسکا مالک اُسکو بہت چاہتا اور معزز رکھتا تھا اور اپنے مرنے پر اپنی جائداد کا کچھ حصہ اُسے وصیت کر گیا۔

اب وہ فلانڈرس گیا جہاں اُسنے کتابت کرنے میں نوکری کی کیونکہ جب تک چھاپہ ایجاد نہوا تھا کتابوں کے نئے نسخے لینے کی یہی ترکیب تھی کہ نقل کی جائیں۔ چھاپے کی بڑی قدر یہی ہے کہ انھیں حروف سے بے انتہا کتابیں طیار ہو سکتی ہیں۔

کیکسٹن نے بیٹھکر ورق ورق نقل کرنے کو بہت ہی تھکا نیوالا پایا۔ پس اُسنے اس نئے ہنر کی طرف توجہ کی جسکا چرچا اُس زمانہ میں ہو رہا تھا اور جو اگر کامل ہو جاتا تو جیسا کہ اُسے صاف صاف معلوم ہو گیا تھا کتابوں کے بنانے میں بہت وقت اور محنت کی تضیع کو بچاتا اُسوقت سے اُسنے اپنی تمام کوششیں اس ہنر کو حاصل کرنے میں صرف کیں۔ وہ اس کام کے پیچھے پڑا رہا گویا یہ اُسکے لیے واجبات سے تھا اور اُس کی کوششوں کے سر پر کامیابی کا تاج رکھا گیا کیونکہ اُسکے لائق ہونے کے واسطے اُسنے محنت کی تھی۔ ٹائپس پہلے لکڑی کے اور بعد ازاں دہات کے بنائے گئے۔

اُسنے پہلے لڑائی کا قصہ چھاپا اس کتاب کو اُسنے فرانسیسی زبان سے انگریزی میں ترجمہ کیا اور ترجمہ عمدگی سے لکھا اور چھپنے کے لائق ہو گیا۔ کتاب جلد شایع کی گئی۔ دیباچہ میں کیکسٹن نے لکھا ہے "اس قصہ کے کل باب جیسے کہ انکو آپ چھپا ہوا دیکھتے ہیں ایک ہی دن میں شروع اور ختم کیے گئے ہیں"

فلانڈرس میں وہ بیس برس رہا۔ انگلستان میں واپس آنے پر اُسنے ایک چھاپہ کا کارخانہ

کھولا اور ۱۴۷۴ء میں اُسنے شطرنج کے کھیل کی کتاب چھاپی جو انگلستان میں چھپی ہوئی پہلی کتاب تھی اُس کی سب کتابیں اُن حروف میں چھپی تھیں جنکو اب سیاہ گاتھک ٹائپ کہتے ہیں اور ۱۵۱۶ء تک اور سب انگریزی کتابیں بھی انھیں حروف میں چھپی تھیں بعدازاں گاتھک ٹائپ کے عوض میں رومن حروف کا رواج ہوا جو اب ہر جگہ رائج ہی۔

گو وہ بڈھا ہوتا جاتا تھا اور اُسکے جسم کی طاقت زائل ہوتی جاتی تھی مگر وہ چھاپہ خانے کے واسطے کتابیں اپنی بڑی اور مفید زندگی کے آخر تک طیار کرتا رہا اُسنے اپنے بعد ایسے نام نیک کی شہرت یادگار چھوڑی ہی جسنے اپنی تمام عمر استقلال اور سرگرمی کے ساتھ ایک بڑے کام اور ایسے ہنر کو کامل بنانے کی کوشش میں صرف کی جس کی نسبت اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ بنی آدم کی ترقی اور بہبودی میں اسکا بڑا اثر ہوگا تاہم وہ اپنے آپ کو ایک نیکی کا آلہ خدائی ہاتوں میں سمجھتا تھا۔

جتنے حروف چھاپے کے کیکسٹن کے زمانہ میں چھاپنے کے لیے تمام یورپ میں لگائے جاتے تھے اب انگلستان میں ایک ہی شہر اور ایک ہی دن میں اُس سے کتنے ہی زیادہ لگائے جاتے ہیں مگر تاہم اُس نیک پیرمرد کی جسنے پہلی پہل اپنے ہموطنوں کو چھاپنا سکھایا عزت کرنی چاہیے

محمد نبی خاں منشی فاضل تھرڈ ماسٹر مڈل اسکول ریاست رامپور

اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں سوجھتا

اسلم کے ایک دوست کہیں راہ میں ملے — پابندِ وضع تھے جو بہت اور دیندار

داڑھی بہت بڑھی تھی مگر تھی چڑھی ہوئی — بل اُسکا اینٹھتے تھے وہ ہاتوں سے بار بار

اسلم سے باتوں باتوں میں یہ طنز سے کہا — داڑھی منڈا کے ہوتے ہو تم کیوں گنہگار

تم جانتے نہیں کہ ہی داڑھی خدا کا نور — رکھنا ہی اسکا خاص اک اسلام کا شعار

اسلام کے خلاف ہی داڑھی کا مونڈنا — عیسائیوں کا اس میں تشبہ ہی آشکار

"واعفوا اللحی" ہی حکم جناب رسول کا — کرنا روا نہیں ہی خلاف اسکے زینہار

اسلم نے یہ جواب دیا قبلہ سب صحیح! پر اس لیے یہ فعل کیا مینے اختیار
داڑہی چڑہا کے پھر نہ رعونت میں کرسکوں
فرعون تا کہ لوگ نہ مجھ کو کریں شمار

مطبع فیض علی گڑھ میں علی محمد خان کے اہتمام سے چھپا

The Points are as follows :—

First Year	12
Ninth Class	10
Tenth Class	8
Second Year	6
Lower Classes	4
Fourth Year	2
Third Year	0

MOHD. JAMIL-UD-DIN,

12th May, 1906. *Hockey Captain.*

Hockey League Matches.

The system of Hockey League Matches was introduced in the College last year but, owing to the insufficiency of time, we had to combine the League Matches and the Agha Khan Challenge Cup matches together. But now they will be played in separate seasons. The League Matches commenced on the 20th March, 1906, while the cup matches will be played later on. These matches have proved very beneficial to the game as well as to the students in general for a large number of boys come to practise and there is no difficulty in selecting the promising ones and giving them a lift. In the beginning of these matches the Second Year Class took the lead but was closely followed by the Entrance, the Ninth and First Year classes,and their strength was so balanced that it was difficult to say which of them would win the day. Among the matches that of Ninth and Tenth was a bit rash and the Tenth class had to bear the penalty of its rashness. The forwards of the Ninth class played a very dashing game, especially Amir Ahmed Meerza. The latter seems to be promising and will turn out a good forward in due course. The game between Ninth and First Year was well contested and interesting. Ten minutes before time Moin had a pretty shot from a melee and thus won the laurels for his team. In this match the forwards of Ninth class made a good show and the rushes of Abbas were very trying for the backs of the First Year Class.

The winner are as follows :—

1. Nazir Hasan Ansari.
2. Ali Raza Bilgrami.
3. Qaim Ullah Khan.
4. Syed Husan Rizvi.
5. Mohd. Noor Ullah.
6. Ehsanul Haq.
7. Mir Ali Raza.
8. Abdul Jabbar.
9. Moin-ud-din Mirza (Captain)
10. Mohd. Owais.
11. Razi-ud-Din.

and both the teams manifested equal energy and zeal in fielding. The chief credit of the victory, of course, is due to Shafqat who bowled in full spirit in the second innings. Samad's services to his side both in bowling and batting were none the less valuable.

Full scores of the Final are appended below :—

	II Year 1st Innings.		2nd Innings.	
1.	Shafqat, *c*. Alla-ud-din ...	2	*c*. Rahutullah, ...	10
2.	A. Samad, *L B. W*. R. Ullah	42	*Run out* ...	46
3.	Zahur, *b*. Rahut Ullah ...	9	*c*. R. Ullah ...	0
4.	Mazhar, *b*. Alla-ud-din ...	15	*b*. " ...	6
5.	Yaqub, *c*. " ...	1	*c*. Alla-ud-din, ...	0
6.	Mohsin, *b*. " ..	8	*b*. " ...	1
7.	Saif	33	*c*. R. Ullah, ...	11
8.	Hameed, *b*. A. Rahman	1	*c*. " ...	7
9.	Zohid, *Run out* ...	7	*c*. A. Rahman, ...	17
10.	Muzffer, B. Alla-ud-din ...	2	*Not out* ...	0
11.	Mohammad Hosain ...	4	*b*. R. Ullah, ...	0
	Extras	6	*Extras* ...	9
	Total ...	112	Total ...	107

	VII & VIII 1st Innings.		2nd Innings.	
1.	M. Zaki *b*. Samad, ...	5	*c*. Yaqub, ...	6
2.	Mahbub Alam, *c*. ...	2	Slaupted Samad, ...	26
3.	Rahat Ullah, *b*. Shafqat, ...	23	*b*. Samad ...	31
4.	A. Rahman, *b*. Shafqat ...	1	*c*. Yaqub, ...	0
5.	Shabir, *c*. Yaqub, ...	8	*Not out* ...	28
6.	Alla-ud-din *c* Shafqt ...	0	*b*. Shafqat, ...	2
7.	Abdul Salam, *b*. " ...	2	*b*. Shafqat, ...	0
8.	Zra-ud-din, *Run out* ...	4	*c*. Shafqat, ...	10
9.	Shakee *b*. Shafqat, ...	0	*b*. Shafqat, ...	1
10.	Habib Bakhsh, *c*. Yakub,	0	*c*. Samad, ...	1
11.	Md. Abbas, *Not out* ...	1	*b*. Shafqat, ...	1
	Extras	11	*Extras* ...	10
	Total ...	67	Total ...	116

The chief incident of the month was a *century* scored by Abdul Gafur, in one of the "pick-ups". We congratulate him on the marvellous improvement he has made in the game.

K. M. AKRAM.

Cricket Captain.

Cricket

One of the most interesting features of Cricket—the Inter-Class Shield Matches, which had been dropped out of our Annual programme for the last three years—was revived this year. It naturally renewed the old spirit of rivalry among the individual classes and then between the College and School. The greatest pity is that the long chain of this Annual competition should have been broken and disconnected by having lost many links of the past record, of which no trace is found since the year 1899.

These matches began in early April and the final victory, as was expected, fell to the lot of Second Year, which class, though weak in batting and uncertain in fielding, was able to put out the strongest bowling XI. The first round of ties with the results is given below :—

		Score.	Difference.	Winners.
1	III Year	... 88 for wickets	2 runs & 8 wickets	III Year.
	I Year	... 86		
2	VII & VIII Classes	... 105 runs	41 runs	VII & VIII Clases
	Lower Classes	. 61 runs		
3	IV Year	... 73 runs	40 runs	IX Classes.
	IX Classes	... 113 runs		
4	II Year	... 53 runs	5 runs & 7 wkts.	II Year.
	X Classes	... 48 runs		

Semi-finals :—

			Score.	Difference.	Winners.
1	III year	...	39 runs	97 runs	VII & VIII.
	VII—VIII classes	...	58 runs		
2	II Year	...	83 runs	26 runs	II Year.
	IX Classes	...	57 runs		

The "Final" came off on the 23rd April; it seemed doubtful, as appears from the scores of the first Innings, as to which side would win. Either side did their very best to win the championship. Though the game was ultimately lost the VII and VIII classes did creditably well, specially in batting, making short work of their opponents, and first class bowling. Some respectable figures were scored on either side,

Dreams have their influence both over the literate as well as the illiterate with this distinction only that to those who do not read and write much, they are more real than to those who have exercised their imaginations. Some are influenced in a greater degree, others in less.

The common people of India and of other Asiatic countries regard all their dreams as real and, consider them to have some meaning in them, however insignificant and absurd they might be. Not only uncultivated minds but also many cultured men look upon dreams as indications of some future events and attach great importance to their interpretation. This is due, to a large extent to the superstition prevailing among the ignorant people.

While there are others, known as scientific men or philosophers, who think of dreams as nothing but a series of thoughts and fancies in sleep, having no meaning or future indications in them; and when dreams turn out prophetic or prove true in the end, they ascribe it to a mere accidental coincidence.

As no satisfactory psychological explanation has yet been given, mere guesses cannot mend the matter much. For Asiatic Literature abounds in the significance of dreams and many great men of great mind have unanimonsly agreed to say that, some dreams, not all, have some hidden meaning in them which, when correctly interpreted, foretells future events.

Instances of this are found in the Holy Scriptures of the Christians as well as of the Mohammedans. The dreams of Joseph, son of Jacob, and of Pharoah, the king of Egypt, testify to the above statement.

Thus if the opinion of the ignorant about the reality of dreams cannot be supported, those of the scientific men too who regard them as mere sensatious cannot be welcome.

In brief, it may be pointed out that dreams are sometimes real, sometimes unreal. Pious and religious men say that dreams of a liar are almost always false. While those of a truth-telling man are often true. But nothing can be said for certain as to how for this statement is correct.

S. M. HAQ.

we occasionally see and converse with men who have been long dead or we may even meet historical or fictitious characters that we have read about in books.

We often lose our identity and dream that we are some one else and in the course of a single dream may be in turn several different persons. Sometimes the surroundings seem to be changed, that is to say, we dream of being in Benares and seeing the scenes of Delhi or Calcutta. "Space and time to the dreamer lose their reality." It is possible in a dream that lasts a few seconds to appear to have gone through the experience of many years or, to travel to the most distant parts of the world as rapidly as one can imagine.

The origin of dreams may in many cases be traced to internal or exernal causes. Nightmare is frequently due to indigestion or ill-health. When a dream is connected with an external cause, it is often possible to trace some resemblance between the cause and effect. Instances are quoted of a dreamer who dreams that he was wandering through regions of polar ice and woke up to find that he had kicked off his bed clothes and of another, who having heard the sound of a whistle at the moment of sleeping, dreamt of being at a railway station and getting into a railway train on the point of starting.

Sometimes the origin of a dream seems to be what the dreamer saw or was thinking about just before sleep came upon him. Coleridge once fell asleep in his chair after reading how Kubla Khan ordered a palace to be built. The idea worked upon his imagination and the consequence was that he composed a fine poem in his sleep. When he woke up, he remembered perfectly the lines that had presented themselves to his mind in the form of a dream and he immediately began to write them out. Unfortunately he was interrupted in the middle of his task by a visitor after whose departure he could remember no more, so that the poem is only a fragment.

Yet not only the imagination, but also the reason has been known to do good work in dreams. There are instances of mathematicians solving in their sleep problems that they had vainly puzzled over when awake. All that can be inferred from what has been said is, that, no general statement can be made about dreams, that in many cases, dream life is very different from real life and in other cases the mind of a sleeping man works much in the same way as if he were awake.

" It is not proper to carry a drop to an ocean, or to carry the thorns and bushes of the forest to a garden. But what can be done since it is the habit of the ant to carry the leg of the grasshopper to Solomon the Wise."

QAZI SYED BADI-UZ-ZAMAN,

Rajkumar College.

Dreams.

A dream is an involuntary activity of mind when one is asleep. Its psychological origin may be attributed to the thoughts and actions of our daily life. We generally dream of things which we think or do while awake and chiefly those things often present themselves in a dream which have engrossed our attention. For instance, University students, at the close of their examination, often dream of the Government Gazette, containing the result of their labour, chess-players dream of moving the pieces just if they were awake. Dreams are very different from waking life, but it is extremely difficult clearly to define in what the difference consists When we are dreaming, we are nearly always convinced that we are awake and in some cases, real experiences have been mistaken for dreams. The latter mistake forms the subject of a celebrated Spanish play called "Life a Dream" and of an amusing story in the Arabian Nights, in which a poor man is as a jest treated as a mighty monarch, and it is continued that he should afterwards think that all the honourable treatment he had actually received was merely a vivid dream.

Sometimes, even after waking, we may be doubtful whether our dream was a reality or not, especially if we happen to fall asleep in our chair and do not remember the circumstances of having fallen to sleep. But this doubt can only arise when there has been nothing in our dream that seems impossible to our wakened mind. It is, however, rare that " a dream exactly copies the experience of our waking hours."

Sometimes in sleep such events seem to happen as in waking hours will be known to be impossible e. g. in dreams

Ansari :—The moon is not bright like thy cheek.

Asjadi :—There is no flower in the garden like thy face.

Farrukhi :—Thy eyelashes pierce even through armour

Firdausi :—Like the spear of Geo in the battle of Pishan.

There are only three words in Persian ending with the syllable "shun" and it was Firdausi only that could supply the fourth, and that too on the spur of the moment. The extraordinary powers of the poet were at once recognized and the other poets gladly admitted him as their superior. Firdausi was duly introduced to Sultan Mahmood and the Emperor, being pleased with him asked him, to write out the whole account. Firdausi returned to his native city of Toos and wrote the 60,000 lines. The miser Sultan disappointed him and in the end the shock of disappointment brought about his death.

Before concluding this lecture, I wish to bring to the notice of the audience that I have restricted myself to ancient Persian men of letters who are the standard authors in the literature. Of course, a slow but gradual change is coming on in Persian and the modern works in Persian are somewhat different from these old books. The Safar Nama of Nasir-ud-Din Shah, the late Shah of Persia, is a type of Modern Persian. A few dreams and many novels have been written under the influence of modern literature. It will however take time before the literature teems with books on scientific subjects, Biographies, Magazines and Monthlies. The spirit of literary criticism is urgently needed and the language is unavoidably in need of Cyclopaedias, Lives, Men-of-Letters Series, etc. It is for those who take interest in Persian to come forward and undertake the task.

Gentlemen, I have tried my best to sum up in such a short time all the important items of Persian Literature, bearing in mind that I speak before a mixed audience of Englishmen, Parsees, Hindus and Mohammedans. Some of these points may appear trite to a Mohammedan scholar of Persian literature, but I hope they may have interested gentlemen of other communities. For myself, I can only say :—

لایق نبود قطره بعمان بردن   خار و خس صحرا بهٔ گلستان بردن

اما چکنم عادت موران اینست   که پاي ملخ پیش سلیمان بردن

every Couplet, but, who only gave him as many rupees, Firdusi says :—

بسی سال بردم بشاهنامه رنج   که تا شاه بخشد مرا تاج گنج

"I took pains for thirty years for completing the Shah Nama so that the king might grant me a coronet and treasure etc."

The poet Hafiz writes :- -

تخم دانش کاشت فردوسي نظامي آبداد
ثمر آن سعدي گرفت من خوشه چيني ميكنم

"Firdusi sowed the seeds of knowledge, Nizami watered them ; Sa'di reaped the harvest therefrom, while I am gathering husk."

This is a very learned estimate of the four important poets. Nizami is the next epic poet and the *Sikandar Nama* though not as voluminous and animated as the Shah Nama is certainly a very learned epic poem. It is still inimitable and there is a belief among the admirers of the poet, that he was specially gifted for writing this poem, which is not the work of every common Persian scholar.

The way in which Firdausi was introduced to the Emperor is a very strange one. Firdausi with a manuscript of a portion of the Shah Nama came to try his luck in the Gourt of Sultan Mahmood who was distinguished for his patronage of men of letters. When Firdausi entered the gateway of the royal garden he met three personages who were enjoying themselves with poetry. These were the poets Ansari, Asjadi, and Farrukhi. Mistaking Firdusi for some villager, for he looked like one, they asked him the cause of that intrusion. He replied that he was a poet anxious to get admission into the royal presence. Ansari, then, said that he would have to give proofs of his poetic powers. Each of them was to compose *extempore* one hemistich and Ansari started with :—

ANSARI   چون عارض تو ماه نباشد روشن

Asjadi :—   مانند رخت گل نبود در گلشن

Farrukhi :—   مژگانت گذر همي كند از جوشن

Firdausi :—   مانند سان گيو در جنگ پشن

It is concluded from these, that, all these poets had a clear insight into the past and the future.

3. The Ruba'iyyat of Umar Khiyyam are well-known and the Persian student knows that much has been said about its merits by different European scholars. The lofty ideas and spirit of independence that run throughout his writings appeal to the European mind and full justice has been done to his memory by the establishment of an "Umar Khayyam Society" just like the "Shakespeare Society." The best translation of the Ruba'iyyat is by Fitzgerald.

As'adi Tusi—one of the seven poets of the court of Sultan Mahmood of Gazni—has written many splendid discourses. One of these, a discussion between Night and Day for superiority, is very humorous and the arguments advanced by either in support of their claims to superiority are worthy of a learned lawyer.

4. The last subject is Epic poetry—Epic poetry requires no explanation. Homer in the very first lines of the Iliad says "Achille's wrath to Greece the dreadful spring—of woes unnumbered heavenly Goddess sing." An epic poem, then, is an enthusiastic account of some grand achievements of national heroes. The name of Firdausi, the author of the *Shah Nama* holds the same position in Persian as that of Milton in English or Homer in Greek and the Shah Nama is often called the Iliad of the East The Shah Nama is written in heroic couplets, a special meter called بحرتقارب Bahr-i-Taqarub, and contains 60,000 lines. It is a picture of the ancient glory of Persia and the author has done full justice to the memory of the heroes of Persia before the spread of Islam in that country. The description of battles, personal strength and courage of the warrior are done in a masterly hand. It is impossible to read the lines of the Shah Nama without being stirred. Firdausi himself rightly observes in the beginning of the work

هر آنکس که شاهنامه خوانی کند اگر زن بود پهلوانی کند

"Every person that reads the Shah Nama; would be ready for heroism though she were even a *woman*."

The statement is easily justified by a perusal of the book. The merits of Firdausi can never be over-estimated and the unfortunate author deserves admiration for the pains taken in accomplishing his book. Deeply touched by the ingratitude of Sultan Mahmood, who had promised him one guinea for

ceremony of a great man such as a marriage, etc. ; the description of some season of the year and scenes in nature, etc. Anwari, Sa'di, Urfi, Qa'ni, are the best Qasida writers. The Qasaid of Sa'di are very charming, while Anwari excels in the composition of the poem. While describing a garden, Sa'di says about the guava or "jam" fruit

شکل امرود تو گوئي که به شیرینی و لطف
کوزهٔ چند نبات است معلق بر بار

"As for the guavas in point of sweetness and taste you might say they are so many jugs of *sharbat* hanging upon the branches of the tree."

The comparison between the fruit and the jug or سراحي is very beautiful indeed.

One name—that of Syed Jamal-u-din Urfi deserves mention. Urfi was the chief poet of the court of Akbar and his Qasaid contain many beautiful passages in praise of Akbar, Salim, Behram Khan, and other nobles of the court. The language of the book is Persian of a high-flown style and many lines are not clear. It causes a great strain to the student and the figures of speech used throughout the book are very far-fetched. The fate of this young poet was very sad for he was poisoned in his 29th year by some jealous nobles who envied him for the affection that existed between Urfi and Prince Salim. There is a very interesting story about the remains of Urfi. In his life-time he had written

بکاوش مژه از گور تا نجف بروم   اگر بهند هلاکم کني و گربتتار

"I shall go to Najaf from my grave, digging the ground with my eyelashes, whether you would kill me in India or in Tartary."

His prediction proved true to the very letter. He was killed in India and buried in Agra. A few months after his burial a certain gentleman of Najaf hearing of the death of one of his relatives in India came to remove his bones to his native place. Mistaking the grave of Urfi for that of his relative he carried the remains of the poet to Najaf thereby fulfilling the heartfelt desire of the worthy poet.

Similar stories of miracles exist about many other distinguished poets, *viz.*, Sa'di and his quatrain of بلغ العلی بکماله Hafiz and his فال Nizami and the account of the battle between Alexander and Darius, Rumi and his dreams.

dence and that human efforts to the contrary must be futile. He says :—

قضاي كن فيكون است حكم يار خداے
بدين سخن سخني درنمي توان افزود

"The order of "Be : and it was" is the order of God; and not a word can be said more than this fact."

This sort of teaching had a very beneficial effect on the public as it gave them contentment and put a stop to avarice and unnecessary agitation. Much has been said in favour of, and against the doctrine of Fatalism and the truth is, that, even in our enlightened times the doctrine is difficult to be refuted. Questions like "Why should a certain man be a king while another man of the same ability and morality has to work as a carpenter ?" and the usual reply is "the circumstances were such." So we see that, what was then known as Fate is now called by us circumstances, accidents, unforeseen events, all of which are beyond human control. My object in emphasizing this point is simply to show that it would be rather hasty for us to draw general conclusions about these Persian authors and their writings. The same rule applies to the second item mentioned before, *viz.* the infidelity of women. Nizami writes :—

اگر نيك بودے همه خوي زن   زنان را مزن نام بودے نه زن

"If all the actions of a woman were good ; they would have been called "don't beat" rather than "beat." "

Here is a play upon the word (زن) 'zan.' Teachings of this kind were intended to cure the sensitive husband of his defect in particularly watching the conduct of his wife rather than leaving her to her own good sense. In other words the question of "Liberty of women," which has attained so much importance in our days.

The most important work of Nizami is the *Sikandar Nama* or Exploits of Alexander the Great.

2. The second division is of the writers of Qasidas and Gazal. The Qasida is somewhat like an Idyll. It consists of from 14 to 50 lines and contains one idea throughout. The themes in these pieces of poetry are usually praise and eulogiums of great men, the description of some interesting

راز درون پرده ز رندان مست پرس کین حال نیست زاهد عالی مقام را

"Ask the secret of the inside within the curtain from an intoxicated Sufi, because the state is not reached by the pious man of high position."

Rumi says :—

ما برون را ننگریم و قال را ما درون بنگریم و حال را

"We do not look to the external, and the words, but we look to the internal, and the ecstacy."

It was this mode of attacking the pious Musalmans, who performed their religious ceremonies with strict obedience to the instructions of the Shara', that created a feeling of resentment against the Sufis among the Muslim clergy. A separate lecture would be necessary to discuss the arguments of both sides, as the subject takes the form of a religious controversy. It should, however, be remembered that no hasty conclusion should be drawn in this matter. The ceremonies of Namaz, Roza etc., are meant for the Muslim public who require a definite mode of worshipping their Creator and without which it would be difficult to bring home to them the solemnity of spiritual greatness. The advancement on the plane of spirituality, and the grasp of high moral ideals was not to be expected from every person in the street. To attain the stage of Sufism, it was necessary to acquire a high ideal of morality and a clearer insight into the future condition of man. It was after reaching this stage that Hafiz declared:

زهي همت كه حافظ راست از دنيا و از عقبي
نيامد هيچ در چشمش بجز خاك در كويت

"Bravo to Hafiz ! for, his high spirit, because of all the things of this world *versus* of the next, nothing had any value in his eyes, except the dust of thy street."

The writings of Sa'adi are varied and numerous and his chief work in the form of Sufistic odes is the *Teebat.* I quote here a few lines which show Sa'di's belief in (تقدير) or predestination. The idea is that every person does the work which has been ordained for him by Provi-

گشت واصل چون بدریا آب جو   آب جو را باز از دریا مجو

" When the water of the river is united with the water of the sea ; don't expect the water of the river to come back apart from the sea water.

The last line is purely sufistic and compares the union of the human soul with the Great Soul.

Moulvi Shams-ud-din Hafiz ranks second in importance and his *Diwan* or Collection of Odes is full of many sweet and effective couplets. The very first line of the book sums up the path of the Sufi :

الا یا ایها الساقی ادر کاساً و ناولها   که عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلها

"Come here, oh Saqi and bring the cup and its accompaniments ; for love appeared easy in the beginning but difficulties fell in my way afterwards."

Referring to the short duration of human life, he describes it in a beautifully sufistic style writing:

مرا در مجلس جانان چه امن وعیش چو هردم
جرس فریاد می دارد که بربندید محملها

" What a pleasure could I derive in the company of my beloved, when every moment the clock was crying out (ticking) to pack up our portmanteau." *i. e.*

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد به عشق   ثبت است برجریدهٔ عالم دوام ما

"The heart which is enlivened by Love never dies ; our Eternity is printed on the tablet of time."

Another important feature of these pieces which requires mention is the belief of the sufi that sincere love towards the Creater is far better than external ceremonies of piety. This point has been urged by all writers finding fault with the priests and other devotees of Islam. Lines to this effect are very interesting—

زاهد غرور داشت سلامت نبرد راه   انداز ره نیاز بدار السلام رفت

" The pious one was proud of his piety and hence did not reach (paradise) safely ; while the dissolute reached the abode of peace through humility."

Moulvi Syed Jalal-ud-din Rumi deserves mention as the head of this group of poets. His work—the *Masnavi*—is regarded as a treasure of divine knowledge and praises have been lavished upon its merits amounting to exaggeration. Many a student has devoted the best part of his life in mastering its contents and the depth of its meaning. But the mysterious teaching of the different stories has ever presented difficulty to the student world. The language is difficult and learned, and is only meant for advanced readers. To illustrate this by comparison—a world of annotations, criticisms, commentaries have been written upon Shakespeare, Wordsworth, Shelley etc., and yet the attempts are not exhausted. Much more is it true in the case of Rumi, who dwells upon a subject of the highest importance for human study, a subject that has so much to do with his future happiness; for what indeed can be grander than the aim of Union with the Great Soul.

A few instances will show what treasures of knowledge are contained in this valuable book.

کشتگان خنجر تسلیم را   هر زمان از غیب جان دیگر است

"To those, who have been killed by the dagger of Resignation, there is a new life every moment from mysterious sources."

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   اے دواے جملہ علتہائے ما

" Be always happy, oh Love that gives us this pleasant mania ; and that is the cure of all our maladies."

چیست دینا از خدا غافل بودن   نے طلا و نقرہ و فرزند و زن

" What is worldliness ?—It is forgetfulness of God and not gold, silver, wife and children."

بند بگسل باش آزاد اے پسر   چند باشي بند سیم و بند زر

" Break oft the bondage and be free oh son : how long will you be the slave of gold and silver ? "

هم خدا خواهي وهم دنیاے دون   این خیالست و محال است و جنون

" You want God and worldly gains at the same time ; this is an imagination, an impossibility, a mania."

one dose opens the eyes of the lover to Reality and makes him forgetful of things around him is none but the *Murshid* or Religious Guide of the Sufi. A few instances will show this :

علاج ضعف دل ما کرشمهٔ ساقي است بر آر سر که طبیب آمد و دوا آورد

Hafiz says :—"The cure of our weak heart lies in a miracle (dose) of the cup-bearer ; lift up your head, because the doctor is come and he brings medicine."

ساقي بیار باده که ماه صیام رفت درده قدح که موسم ناموس و نام رفت

"Oh Cup-bearer! bring the cup as the month of fasting is over, give me the decanter, for, the season of fame and respect is over."

Thus you will always find Hafiz and others invoking the assistance of the Saqi in guiding them to the "path of Union." The dose, mentioned in these lines, is to be interpreted as a dose of divine knowledge, which the Guide only can give ; and the month of fasting is the time of penitence and ascetism which being over the Sufi Candidate prays for the promised dose. The name and fame are worldly honours which he has already cast away and is now quite ready to be admitted as a worthy lover who cares for nothing else but the object of his divine love.

The pure attachment between the (بلبل و گل) Nightingale and the Rose is always emphasized as the best lesson for a Sufi, who should in no way prove himself inferior to the bird in point of love.

حافظ وصال گل طلبي همچو بلبلان جان کن فدی خاک ره باغبان گل

"Oh Hafiz ! if you desire union with the Rose like the Nightingale, sacrifice your life for the *dust* of the path of the Gardener."

The Rose here is the beloved, or God, and the Gardener is Mohamad, hence it is clear that sincere obedience to the directions of the Prophet will lead you to your goal.

اے مرغ سحر عشق ز پروانه بیاموز کان سوخته راجان شد و آواز نیامد

Sa'di—"Oh Morning Cock take lessons in love from the moth, who was burnt alive and yet did not raise a cry."

Persian Literature.

(Continued)

Turning now to Persian poetry we have to bear in mind that this division of literature is more important than prose for the following reasons :—

As stated before Persian literature has greatly been influenced by Arabic, and the Arabs have a peculiar tendency in this line. The Qasida, Rubai', Munazira, Gazal, Marfiah, Ellegy etc., all fall under this division. Persian poets are numbered by hundreds and every student of Persian is samiliar with the names of the most famous among them, such as Firdausi, Sa'di, Nizami, Jami, Hafiz, Rumi, Attar, Khaqani, Anwari, Khusroo, Urfi, Ka'ani etc.

It is beyond the limit of the present lecture to treat these poets individually ; so I shall divide poetry itself into the following divisions, making as far as possible common remarks which shall be applicable to a group of poets.

1. Sufi poets. 2. Writers of Qasida and Gazals. 3 Writers of Rubai' or quatrains, Munazirat, etc. 4. Epic poets.

It is a pity that the lives of many of these eminent poets are not easily obtainable, as the taste for life-writing was not there so well developed in Persian as in English. The Tazkiratu Sho'ara of Daulatshah Samarqandi, and the Atishkada are the chief Persian works on the lives of Persian poets and the literature is indebted also to Sir Gore Ousley who has written an account of some of the leading poets in English.

1. To begin with Sufism,—Sufism may approximately be defined as "the path of union with God through the medium of Love." It was thus that Love was adopted as the basis in all poems which in other words may be called Odes of Love. The common features of these odes are the extreme love of the lover for his beloved ; the deep agonies of separation from her ; the burning wish of meeting her once more never to be separated again ; the lover's heartfelt hatred towards his rival who interrupts him in his way to union. All these are full of deep meaning and sufistic significance. The beautiful and faultless cup-bearer whose

completion, and work goes steadily on in the case of all the other buildings except the new Union Club House. Here for the present everything is at a stand-still, owing, it is said, to the shortness of the supply of *kunkur*.

All the matches in the Hockey league and for the Cricket Shield are now over. The First Year added another to their little list of triumphs by coming out first in the Hockey league and winning the medals.

The trophy presented to the Football Club by Sardar Maharaj Singh, to be held as a perpetual Challenge Trophy by the winning team in the Football League, has arrived and has been handed over to the First Year team, who were winners of the competition this year. The trophy was designed and made by Messrs. Boseck & Co., Silversmiths of Calcutta, and reflects great credit on their workmanship. In shape it is a shield of dark walnut wood, about 21 inches by 16 inches, In the centre is a large silver medallion on which the College arms are chased. Above the medallion is a silver scroll, inscribed "Maharaj Singh Football Trophy" and round the edges of the shield are silver discs for the names of the winning teams. Altogether the trophy is a very handsome piece of property aad the Football Club should treasure it with great care.

The open Tent-Pegging Competition which was held on Sunday, April 29th, produced eight competitors, and there was quite a keen contest. Abbas Mirza eventually won; Abdus Samad being second and Mohammed-bin-Mahmood third. The last-named had very bad luck as he was really the most consistent performer. Fortnightly competitions for monthly "aggregate" prizes are now being held, and attract very fair entries.

On Thursday, May 3rd, Mrs. Archbold gave away the prizes for the year 1905 to the School and College students. It was announced at the same time that the prizes for 1906 would be given in the autumn probably in November. One of the prizes given was a silver medal of enormous size. It was given to commemorate his marriage by Asaf Zaman through the Football Club to the best Football player in 1906 and was won by Ali Raza Bilgrami.

Mrs. Archbold left Aligarh for Simla on the same evening. Mr. Rees left for England on Friday, May 4th. We wish him a pleasant holiday. During Mr. Rees' absence Mr. Ashcroft officiates as Head Master.

The Aligarh Monthly

June, 1906.

College Notes

Up to the present time no contributions have been received in answer to our offer of a prize of Rs. 10 for the best article suitable for publication in this Magazine. The offer is repeated and it is hoped that aspirants for literary fame will send in their articles in good numbers.

As most people have known for some time, the College and School have been suffering from excessive numbers. The crisis is now upon us, and by various means the number of new entries is to be kept down. The new First Year will have to be about half the size of that of 1905, in which year there were one hundred and fifty admissions.

It may sound well to be able to say "we now have more than eight hundred in the College and School," but for those who have to teach and to arrange for the accomodation of these enormous numbers the question is neither very easy nor very pleasant. The students also are bound to suffer; they are more crowded in their living rooms, and in their classes they cannot get so much individual attention and hence cannot be so well taught.

Since our last issue building and repairing have been progressing quietly. Some little structural alterations, chiefly with regard to means of ventilation, are being completed in the kitchens and the Dinning Hall. The Musjid is nearer

جلد ۴ | جولائی سنہ ۱۹۰۶ع | نمبر ۷

حسان بن ثابت رضہ

جو لوگ صحیح مذاق رکھتے ہیں اور جنہوں نے عربی اور نیز مختلف زبان کی شاعری کو غور سے دیکھا ہی اُنکے نزدیک یہ امر آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہو کہ عربی شاعری دراصل حقیقی شاعری ہو اور دنیا کی کوئی شاعری اُسکا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ جس وجہ سے یہ خصوصیت عربی شاعری کو نصیب ہوئی ہی وہ یہ ہو کہ ہمیشہ حقیقی اور نیچرل جذبات کے اوپر اسکا دارومدار رہا۔ اہل عرب نے کبھی غیر فطرتی خیالات کو اپنی شاعری میں داخل نہیں ہونے دیا۔ جس چیز کا حقیقی احساس نہیں موجود ہوتا تھا اُسی پر شاعری کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اُنکے اشعار اُنکے اندرونی احساس کی اصلی تصویریں ہوتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہو کہ عربی شاعری کے مقاصد نہایت اعلیٰ اور ارفع ہیں۔ مثلاً شجاعت۔ استقلال۔ خودداری وغیرہ۔ جس سے اُنکی شاعری اُنکے لیے بجاے آب حیات کے ہی۔ جسکی بدولت اُنکے یہ بلند اور عمدہ خیالات اور اوصاف زندہ رہتے ہیں۔

ہماری اُردو شاعری میں اصلی اور فطرتی جذبات کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ تصنع کے ساتھہ بعید از عقل اور غیر واقعی خیالات کے موزوں کرلینے کا نام شاعری رکھا گیا ہی اور عام لحاظ سے

اُسکا مقصد مجنون عامری کی سنت کو تازہ کرنا ہے۔ اس مقابلہ کے بعد یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس نسبت سے عربی شاعری نیچرل ہے اور اُسکے مقاصد اعلیٰ و ارفع ہیں اسی نسبت سے ہماری اردو شاعری اَن نیچرل اور اُسکے مقاصد پست اور ذلیل ہیں۔ نئی پودہ نے اُردو شاعری کی اس کمزوری کو محسوس کر کے ایک حد تک اُسکو نیچرل بنانے کی کوشش کی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اصلاح کے دعویدار خود جو نمونہ اُردو شعرا کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ اُن عیوب سے پاک نہیں ہوتا جسکے وہ اصلاح کرنے کے خواہشمند ہیں۔

اسلیے یہ صورت بہت زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے کہ جس شاعری کو ہم پسند کرتے ہیں اور اپنی شاعری کو اُسی کی خوبیوں میں دیکھنا چاہتے ہیں خود اُسی کے نمونے پیش کریں۔

چنانچہ اسی خیال سے عربی شعرا، (جو ابتک ہمارے شعرا سے انٹروڈیوس نہیں کرائے گئے ہیں) اور اُن کی شاعری کو اپنے اہل ملک کے سامنے پیش کرنے کے لیے منتھلی میں سلسلہ جاری کیا جاتا ہے جسکی ابتدا ایتمناً حسان بن ثابت رضی سے کیجاتی ہے۔ اس سلسلہ میں شعرا کے تاریخی حالات سے بہت کم بحث کیجائیگی البتہ اُن کی شاعری کی کیفیت کسیقدر تفصیل کے ساتھ بیان کیجائے گی۔"

حسان بن ثابت رضی اُن شعرا میں سے ہیں جنہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے دیکھے اور جو طبقات شعرا میں مخضرمین کہے جاتے ہیں۔ ساٹھ برس کا زمانہ جاہلیت میں گذارا اور ساٹھ برس اسلام میں۔ ایکسو بیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

یہ عرب کے چوٹی کے شعرا میں سے ہیں یعنی انکا بھی فحول میں شمار ہے۔ ابو عبیدہ کہتا ہے کہ اہل عرب اس بات پر متفق ہیں کہ شہر کے باشندوں میں سب سے اچھی شاعری اہل یثرب کی ہے اور اہل یثرب میں حسان کی شاعری سب سے ممتاز ہے اسلئے حسان بہ نسبت تمام شہری باشندوں کے اچھے شاعر تھے۔ لیکن صرف اپنے زمانہ کے حسان کا ابتدائی زمانہ حیرہ کے بادشاہوں کے دربار میں گذرا تھا جہاں نابغہ ذبیانی وغیرہ بڑے بڑے شاعر تھے اور جو عرب وہاں کی شاعری

کے لیے بہترین سوسائٹی تھی۔ کیونکہ عرب میں شعرار کی قدردانی حیرہ کے حکمرانوں سے زیادہ کسی نے نہیں کی۔ اور اسی وجہ سے اُنکے درباروں میں شعرار کا جم غفیر رہتا تھا۔

کسی شخص اور خاصکر شعرار کے مشہور ہونیکے لیے ایک خاص چانس اور موقع ہوتا ہی جو اکثر ملک اور قوم کے انقلاب کی حالت میں خوش قسمتوں کو نصیب ہوجاتا ہی۔ کیونکہ انقلاب سے طبیعت کا جوش بڑہجاتا ہی اور اُسپر جو اثرات پڑتے ہیں وہ چونکہ نئے ہوتے ہیں اسلئے زیادہ کارگر ہوتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں آپ جس اعلےٰ پایہ کے شاعر کو دیکھینگے وہ ضرور کسی انقلابی زمانہ کا شاعر ہوگا ہومر کو دیکھئے اُسکی الیڈ پڑہنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اُس کی شاعری کی اسٹیم وہی جوش ہی جو ملکی انقلاب نے اُس کی طبیعت کے اندر پیدا کردیا ہی۔ اسی طرح انگریزی کے وہ شعرا جو فرانس اور انگلستان کے جنگ کے زمانہ میں گذرے ہیں مثلاً بائرن۔ شیلی وغیرہ اُنکا ثانی پھر انگلستان پیدا نہیں کرسکا۔ شاہنامہ یا مہابھارت کی شاعری اگرچہ خود اُس زمانہ کی نہیں ہی جس میں انقلاب ہوا لیکن یہ ضرور ہی کہ اُن شعرار کے دلوں میں اس انقلاب کا حقیقی احساس موجود تھا۔ خود ہندوستان میں دیکھو مسلمانوں کے معمولی قومی انقلاب نے مولانا حالی کو اردو شاعری کا آفتاب بنا دیا۔

حقیقت یہ ہی کہ شاعر کی طبیعت جسقدر زیادہ متاثر ہوگی اُسیقدر اعلیٰ پایہ کی اُس کی شاعری ہوگی۔ یہ ناممکن ہی کہ بلا حقیقی احساس کے کوئی شخص محض اپنے کمال شاعری کیوجہ سے اپنے اشعار کو پُراثر بنائے۔

انقلاب کے زمانہ میں طبیعتوں کے سامنے نئے جذبات کا گلزار کھل جاتا ہی۔ اور جو خوش نصیب سب سے پہلے ان باغوں میں سے عمدہ عمدہ پھول چنکر گلدستے سجادیتا ہی وہی نام پاتا ہی اور دنیا اُسی کی قدر کرتی ہی۔

حسان بن ثابت رضہ بھی اُنہیں خوش قسمت شعرار میں سے ہیں جنکی شاعری نے مذہبی ملکی قومی انقلاب کے زمانہ کو پایا اور عروج حاصل کیا۔

شاعری کے اصول و فروع میں انکو اسلام کے پیشتر ہی کمال حاصل ہوچکا تھا۔ لیکن اُن کے سمند شاعری کا بھی جولانگاہ وہی میدان تھا جو اُنکے دوسرے ہمعصروں کا تھا یعنی مفاخرت مدح۔ شجاعت وغیرہ۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ہجرت کرکے تشریف لائے تو یہ بھی مسلمان ہوگئے۔ چونکہ اُنکے دل میں آنحضرت اور اسلام کی سچی محبت تھی۔ اسلیے کفار آنحضرت کی ہجو کرتے تھے وہ اُنکے دل پر بیحد کارگر ہوتی تھی اسلیے اُسکے جواب میں جب یہ اشعار کہتے تھے تو اُن میں حقیقی اثر ہوتا تھا۔ اور وہ تیر اور نشتر سے بھی زیادہ کفار کے دلوں پر کارگر ہوتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرمایا کرتے تھے کہ بہادروں کے نیزے اور خنجر اُسقدر کارگر کفاروں پر نہیں ہوتے جسقدر حسان کے شعر۔

حسان میں وہ ملکہ شاعری کا تمام وکمال موجود تھا جو انکو اس اہم کام یعنی کفار کی ہجو کے جواب کے لیے موزوں ثابت کرتا تھا۔ اسلام میں تین شعرا خصوصیت کے ساتھ اس امر میں ممتاز ہیں۔ کعب۔ عبداللہ بن رواحہ اور حسان۔ پہلے کعب نے آنحضرت سے اجازت چاہی کہ میں کفار کی ہجو کا مقابلہ کرونگا لیکن آپ خاموش رہے پھر عبداللہ بن رواحہ نے عرض کیا اُنکو بھی آپنے کچھ جواب نہ دیا۔ جب حسان نے اجازت مانگی تو نہایت خوشی سے منظور کیا اور فرمایا کہ جاؤ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) سے قدیمی حالات پوچھو اور جواب دو کیونکہ آپ جانتے تھے کہ بلا واقفیت کے اگر ہجو ہوئی تو وہ زیادہ اثر نہ کریگی۔ چنانچہ حسان نے یہی کیا۔ آخر جب حسان کے شعر مکہ میں پہونچے تو لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ کسکے شعر ہیں۔ قریش نے اُنکو سنکر کہا کہ کیا ابوبکرؓ نے یہاں سے جانے کے بعد شاعری شروع کردی ہے؟ اور جب اُنکو معلوم ہوا کہ یہ ابوبکر کے اشعار نہیں ہیں تو یقین نہیں کیا۔ بلکہ وہ کہتے رہے کہ اِنَّ ھذا الشعر ما غاب عنہ ابن ابی قحافہ (یہ ایسی ہجو ہے کہ ابوبکرؓ اسکی شرکت سے بری نہیں ہیں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان کی تعریف میں ایک نہایت ہی بلیغ فقرہ فرمایا تھا کہ "حسان تیرے ساتھ روح القدس ہے"۔ روح القدس عام اصطلاح میں جبریل کو کہتے ہیں۔ لیکن نعوذ باللہ جبریل شاعر نہیں ہے۔ اور نہ انکا یہ فعل ہو سکتا ہے کہ کسی شاعر کی شرکت کریں۔ بلکہ اس سے وہ پاک روح مراد ہے جو حسان کی شاعری میں مضمر تھی۔ اور نیز یہ کہ حسان کے دل میں وہی باتیں القا ہوتی تھیں جو سچی ہوتی تھیں۔ اور اسی وجہ سے وہ کفار کے دلوں پر توپ کے گولہ کا کام کرتی تھیں۔

حسان اور کعب کفار کی ہجو کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ یعنی جس طرح وہ مسلمانوں کے گڑے مردے اکھیڑتے تھے پرانے وقائع۔ ایام اور ماثر کی یاد دلا کر ان کی ہجو اور برائیاں کرتے تھے اور اپنے مفاخر بیان کرتے تھے اسی طرح یہ دونوں بھی انکے وقائع اور ایام بیان کر کے انکو شرم دلاتے تھے۔

ہجو کے لفظ سے ہمارے اردو داں اصحاب شاید یہ خیال کرینگے کہ ان میں فحش کا بھی کچھ حصہ شریک تھا لیکن حاشا وکلا عرب میں ہجو نے وہ صورت اختیار نہیں کی جو اردو کی ہجو نے اختیار کی انکے لئے بڑی ہجو یہی تھی کہ انکے ایسے کام تبلائے جائیں کہ جو انھوں نے ایمانداری یا سوسائٹی کے خلاف کیے ہوں۔ یا بہادری اور مہماں نوازی میں انسے قصور ہوا ہو۔ یا عصمت عفت اور عدۃ کی انھوں نے محافظت نہ کی ہو۔ یہی امور انکے لیے گالیوں سے بڑھکر تھے نہ کہ اردو شعرا اور خاصکر سودا کی طرح وہ ہجو کرتے تھے کہ انکا ایک ایک شعر فحش ہے اور نقل کرتے ہوے ہمارا قلم لرزتا ہے۔

بخلاف انکے عبد اللہ بن رواحہ کفار کو انکے کفر سے عار دلاتے تھے۔ اور انکی بت پرستی اور حماقت پر مضحکہ اڑاتے تھے۔ اسلیے ان کی ہجو کا ان پر زیادہ اثر نہیں پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے دین کو سچا سمجھتے تھے۔ لیکن جب اسلام لاچکے تو انھیں کی ہجوئیں زیادہ گراں گذرتی تھیں۔ حسان نے اسلام لانے سے پیشتر خود آنحضرت کی ہجو کی تھی۔ لیکن بعد میں کفار کی ہجو کا

جواب دیکر اپنے سابقہ جرم کی کافی تلافی کر لی۔ آنحضرت فرمایا کرتے تھے کہ عبد اللہ بن رواحہ نے کفار کی ہجو کی۔ خوب کی۔ کعب نے ہجو کی۔ خوب کی۔ لیکن حسان نے ہجو کر کے میرے دل کو ٹھنڈا اور کفار کے دل کو گرم کر دیا۔

حسان نے خود اسی مضمون کو ایک نعتیہ قصیدہ میں اس طرح پر بیان کیا ہے۔

هجوت محمداً فاجبت عنه	و عند الله فی ذاك الجزاء
تنے محمد کی ہجو کی۔ پھر کفار کی ہجو کا جواب دیا	اللہ اسکا مجکو اجر دے گا

اسی قصیدہ میں کہتے ہیں۔

فان ابی و والدہ و عرضی	لعرض محمد منکم وقاء
میرے باپ دادا اور میری آبرو	تم لوگوں سے محمد کی آبرو کی نگہبان ہیں

آنحضرت کے حسن صورت کی تعریف میں کہتے ہیں۔

کانك قد خلقت کما تشاء

گویا تم اپنے حسب منشا پیدا کیے گئے

کیا اس سے زیادہ موزوں الفاظ حسن صورت کی تعریف میں مل سکتے ہیں؟ بخلاف اسکے ہمارے شعرا کہیں آفتاب کو آسمان سے اُتارینگے کہیں ماہتاب سے سجدہ کرائینگے۔

حسان نے گو قریش اور نیز بنی ہاشم کے بعض بعض افراد کی ہجو کی ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُنکے متعلقین کو اس طرح اُس سے بچایا ہے کہ اُن کی طرف خیال بھی نہیں جاتا چنانچہ ابو سفیان کے ہجو میں جو بنی ہاشم کے بہت بڑے سردار اور آنحضرت کے سخت دشمن تھے۔ کہتے ہیں۔

وانت هجین نیط فی آل هاشم	کما نیط خلف الراکب القدح الفرد
تو ذلیل ہے اور تیرا تعلق بنی ہاشم کے ساتھ ایسا ہی ہے	جس طرح سوار کے پیچھے ادنی شکیزہ لٹکا دیتے ہیں

آنحضرت سے جب اُنھوں نے کفار قریش کی ہجو کی اجازت چاہی تھی اُسوقت آپنے فرمایا تھا

کہ آخر میں بھی تو بنی ہاشم میں سے ہوں۔ حسان نے کہا کہ آپ کو میں اس طرح بچاؤنگا جس طرح خمیر سے بال کو صاف کھینچ لیتے ہیں اور یہ اُن کے شاعری پر کمال قدرت کی دلیل تھی۔ آخر ایسا ہی نباہا۔

آنحضرت اُنکے اشعار نہایت دلچسپی سے سنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کسی سفر میں جا رہے تھے۔ رستہ میں حسان کو حکم دیا کہ تم اپنی سواری میرے قریب لاؤ۔ حسان قریب گئے اور شعر سنانے لگے۔ آنحضرت نہایت غور سے سنتے جاتے تھے۔ یہانتک کہ آپ کی سواری بالکل اُن کی سواری سے ملگئی اور جب حسان سنا کر فارغ ہوئے تو فرمایا کہ واللہ یہ اشعار کفار پر تیر سے بھی زیادہ کارگر ہیں۔

آنحضرت کی وفات کے بعد مسجد نبوی میں حسان ایک مرتبہ اپنا نعتیہ قصیدہ نہایت جوش کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے منع فرمایا اور ڈانٹا اُنھوں نے کہا کہ میں اُس شخص کے زمانہ میں بھی یوں ہی پڑھا کرتا تھا جو آپ سے بہتر تھا۔ یعنی آنحضرت۔ حضرت عمر نے یہ سنکر اجازت دیدی۔

حسان کے اشعار ایک حیثیت سے مذہبی اشعار تھے اسوجہ سے صحابہ بھی اُسکی بڑی عظمت کرتے تھے اور نہایت غور سے سنتے تھے۔ ایک بار ایک مجلس میں وہ اپنے اشعار سنا رہے تھے سننے والے بہت زیادہ ملتفت نہ تھے۔ حضرت زبیرؓ کا اُدہر سے گذر ہوا وہ لوگوں پر خفا ہوے اور کہا کہ واللہ یہ وہ اشعار ہیں جنکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غور سے سنا کرتے تھے۔ حسان نے فی البدیہ کہا۔

اقام علی عهد النبی وهد یه	حواریه والقول بالفعل اعدل
نبی کے پیمان اور ہدایت پر قائم رہا	اُنکا حواری (زبیر) اور اُسکا قول و فعل ایکساں ہے،

آخر میں کہتے ہیں۔

فما مثله فیهم ولا کان قبله	ولیس یکون الدهر مادام یذبل
نہ اُسکا نظیر لوگوں میں ہے اور نہ پہلے تھا	اور نہ آیندہ ہوگا جبتک کہ زمانہ گذرتا جائیگا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں حسان کے قصیدے پڑہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

کسقدر صحیح اور سچی تعریف وہ کرتے ہیں ایک قصیدہ میں کہتے ہیں ۔

شهدت باذن الله ان محمداً — رسول الذی فوق السموات من عل

میں خدا کے حکم سے گواہی دیتا ہوں — کہ محمد اُس خدا کے رسول ہیں جو آسمانوں پر ہے

آگے چلکر کہتے ہیں ۔

وان اخا الاحقاف اذ یعذلونه — یقوم بدین الله فیهم فیعدل

جب اہل بادیہ اُسکو ملامت کرتے ہیں — تو خدا کے سچے مذہب کے روسے عدل کرتا ہے

ایک دوسرے قصیدہ میں لکھتے ہیں ۔

وابیض یستسقی الغمام بوجهه — ثمال الیتامی عصمة للارامل

وہ گورے رنگ کا ہے جسکی برکت سے باران طلب کیجاتی ہے — یتیموں کا ملجا ہے اور بیواؤں کی عصمت ہے

ان اشعار سے کیسی سچی اور حقیقی خوبی آنحضرت کی معلوم ہوتی ہے بخلاف اسکے ہمارے اُردو اور فارسی کے شعرا کے نعتیہ قصیدے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسقدر بعید از عقل اور سراسر فرضی خیالات اور اوصاف آنحضرت کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ جس سے رسالت کی خوبی کا کوئی اثر سامع کے اوپر نہیں پڑ سکتا ۔ بڑا غضب تو یہ ہے کہ آنحضرت کا تو یہ قول ہو کہ مجکو کسی گذشتہ نبی پر فضیلت نہ دو ۔ اور یہ نہ کہو کہ میں ادریس بن متیٰؑ سے بہتر ہوں ۔ اور ہمارے شعرا آپ کی تعریف میں ملائکہ اور الوالعزم رسولوں کی علانیہ تحقیر کریں ۔

شہیدی صاحب فرماتے ہیں ۔

شب و روز اُسکے صاحبزادوں کا گہوارہ جنباں تھا — عجب ڈیوٹی پہ یا رو تھا روح الامیں کو بھی خوشامد کا

اس غلو کی کوئی انتہا ہے کہ جبریلؑ خوشامدی کہے جائیں اور اُن کی وہ ڈیوٹی ہو جو کھلائیو نکی ہوتی ہے ۔ نعوذ باللہ مولانا جامی صاحب کی گہر ریزی ملاحظہ ہو ۔

بہار و نیشِ خضر و موسیٰ دواں — مسیحا چہ گویم بدرکب رواں

خضر اور موسیٰ علیہما السلام چوبدار ہوئے اور حضرت عیسیٰؑ بال گیر ۔ کیا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ

جو اُن انبیا میں سے ہیں جن کی نسبت قرآن میں یہ حکم ہی "فبھدٰھم اقتدہ" (اُنھیں کی ہدایت کی پیروی کرو) اسی عزت کے مستحق ہیں جو مولانا جامی نے اُن کو عطا فرمائی ہی؟ افسوس تو یہ ہی کہ شاعر خود بھی اپنے دل میں انکی رسالت کا اعتقاد رکھتا ہی لیکن مجبور ہی کہ ایشیائی شاعری اسی ڈہب پر واقع ہوئی ہی۔ ادنیٰ رئیس کی تعریف میں دارا اور اسکندر اُسکے غلام بنائے جاتے ہیں۔ ارسطو اور افلاطوں اُسکے سامنے جاہل مطلق کا خطاب پاتے ہیں۔ اسلیے ایک حد تک ایسی باتوں کی ہماری سوسائٹی مجرم ہی نہ کہ جامی اور شہیدی وغیرہ۔

جس طرح حسان مدح میں حقیقت اور واقعیت سے تجاوز نہیں کرتے اُسی طرح ہجو میں بھی وہ جھوٹ۔ مبالغہ اور غلو سے پرہیز کرتے ہیں۔ جنگ بدر میں حارث بن ہشام جو کفار میں سے ایک سردار تھا اپنے بھائی ابو جہل ابن ہشام اور دوسرے قبیلہ والوں کو لڑتا ہوا چھوڑ کر بھاگ گیا عرب کے نزدیک اس سے بڑھکر اور کیا عار اور ننگ ہو سکتی ہی۔ حسان اپنے ایک قصیدہ میں اس طرح پر اُسکو شرم دلاتے ہیں۔

ان کنت کاذبۃ الذی حدثتنی فنجوت منجی الحرث بن ھشام

جو کچھ تو نے مجھسے بیان کیا اگر وہ جھوٹ ہی تو حارث بن ہشام کی طرح تو بھی نجات پائے

یعنی یہ بددعا دیتے ہیں کہ تجکو بھی مقابلہ سے فرار کر جانے کی بیعزتی نصیب ہو جس طرح حارث بن ہشام کو ہوئی۔

ایک مرتبہ حارث بن عوف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ آپ چند مسلمانوں کو میرے ہمراہ کر دیجئے کہ وہ میرے پڑوسی قبائل کو اسلام کی دعوت دیں میں اُنکی مدد کرونگا۔ آنحضرت نے ایک انصاری کو اُنکے ہمراہ کر دیا۔ حارث بن عوف کے قبیلہ نے بیوفائی کی اور اُس انصاری کو قتل کر ڈالا۔ اُسکے بعد حارث آنحضرت کے پاس آئے اور معذرت کرنے لگے۔ حسان بھی پہونچگئے۔ اور اُس کی ہجو میں یہ قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔

یا حار من یغدر بذمۃ جارہ　　منکم فان محمداً لم یغدر

اے حارث جو لوگ بیوفائی کرتے ہیں اپنے پڑوسی سے وہ تم ہو اور محمد صلعم بیوفائی نہیں کرتے

ان تغدروا فالغدر منکم شیمۃ　　والغدر ینبت فی اصول السخبر[1]

اگر تم بیوفائی کرتے ہو تو وہ تمہارا شیوہ ہے　　اور بیوفائی بدگوہری سے پیدا ہوتی ہے

حارث نے یہ سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اللہ مجکو اس ..... سے بچائیے۔ یہ تو اپنے اشعار سے دریا میں طوفان پیدا کر سکتا ہے۔

حسان نابغہ ذبیانی کے پاس گئے۔ خنساء عرب کی مشہور شاعرہ اُسوقت نابغہ کو اپنے اشعار سنا کر اُسکے پاس سے جا رہی تھی۔ حسان نے بھی اپنے کئی قصیدے سنائے۔ نابغہ نے کہا واللہ انک لشاعر وان اخت بنی سلیم لبکاءۃ خدا کی قسم حسان تو شاعر ہے اور بنی سلیم کی بہن (خنساء) حد درجہ رونے والی ہے یعنی مرثیہ گو ہے۔

ایک بار حسان کہیں اپنے اشعار سنا رہے تھے حطیئہ جو عرب میں ایک اعلے پایہ کا شاعر اور مشہور ہجو گو گذرا ہے غور سے کھڑا ہو کر اُنکے اشعار سن رہا تھا۔ حسان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ حطیئہ ہے۔ پوچھا کہ کیوں یہ اشعار کیسے ہیں۔ کہا ایسے بُرے نہیں۔ حسان کو یہ جواب نہایت تلخ معلوم ہوا۔ کہا اس بڈہے کو دیکھتے ہو۔ پھر اُس سے اسکا نام پوچھا اُسنے کہا حطیئہ حسان نے فوراً سلام کیا اور کہا اللہ اکبر یہ فخر مجکو نصیب ہوا کہ حطیئہ میرے اشعار کو سنے اور کہے کہ ایسے بُرے نہیں۔

تمام اہل عرب میں حسان کو ایک خصوصیت ایسی نصیب تھی کہ غالباً کسی کو نصیب نہیں ہوئی ہوگی یعنی وہ حد درجے کے بزدل واقع ہوئے تھے۔ خندق کی لڑائی میں آنحضرت نے مسلمان عورتوں اور بچوں کو ایک اُجاڑ گڈھی میں پیچھے رکھا تھا۔ اُنہیں عورتوں کے ساتھ حسان بھی اپنی بزدلی کے سبب سے رہگئے۔ ایسا اتفاق کہ لڑائی سخت ہوئی۔ مسلمان برابر بڑھتے چلے گئے اور گڈھی سے

[1] سخبر۔ ایک ذلیل گھاس ہے جسکو جانور چرتے ہیں۔

بہت فاصلہ پر نکل گئے۔ اُس گڈھی کے قریب ہی ایک ٹیلہ تھا اُسپر ایک یہودی نظر آیا۔ حضرت صفیہ نے جو آنحضرت کی پھوپھی تھیں حسان سے کہا کہ اس یہودی کو قتل کر ڈالو ورنہ دوسرے یہودیوں کو جاکر خبر کر دیگا کہ یہاں صرف عورتیں و رچے ہیں اور وہ ہمپر ٹوٹ پڑینگے حسان نے کہا کہ اگر میں اسی قابل ہوتا تو آنحضرت کے ساتھ ہی جاتا۔ آخر صفیہ نے خود ہی اُنکی تلوار لیکر یہودی کو پیچھے سے آکر قتل کر دیا۔ وہاں عورتیں اور بچے جمع ہوکر اُسکو دیکھنے لگے۔ حسان دوڑے ہوئے آئے اور گھبراکر کہنے لگے ہٹو ہٹو عورتوں کے دل کمزور ہوتے ہیں۔ لاش دیکھکر تم لوگ ڈر جاؤ گی۔ اسپر عورتیں خوب ہنسیں۔ غالباً یہ فقرہ اُنھوں نے ہنسانے کے لیے ہی کہا تھا۔ کیونکہ اُنکے مزاج میں زندہ دلی بہت تھی۔

بڑہاپے میں ان کی ڈاڑہی برف کی طرح سفید ہو گئی تھی۔ اسلئے وہ مہندی کا سُرخ خضاب ڈاڑہی کی جڑوں اور مونچھوں کی لبوں پر لگایا کرتے تھے اور باقی حصہ سفید چھوڑ دیتے تھے۔ اُنکے بیٹے عبدالرحمٰن نے ایک دن پوچھا کہ آپ پوری ڈاڑہی میں خضاب کیوں نہیں لگاتے کہا میں چاہتا ہوں کہ میرا منہ ایسا معلوم ہو جیسے شیر کا منہ خون میں ڈوبا ہوا۔

آنحضرت کے سامنے ایک مرتبہ اپنا ایک فخریہ قصیدہ سنانا شروع کیا۔ جسکا پہلا شعر یہ ہے۔

لقد غدوت امام القوم منتطقا   بصارم مثل لون الملح قطاع

میں قوم کے سامنے تلوار کھینچے ہوئے گیا   جو چمکدار اور بُرّاں ہے

یہ سنکر آنحضرت مسکرائے۔ حسان کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا تھا جس وجہ سے آپ مسکرائے تھے۔ کیونکہ میری بزدلی سے خوب واقف تھے۔

حسان ۵۴ھ میں مرے۔ ہمنے قصداً اُنکی زندگی کے تمام واقعات چھوڑ دئے اور مختصر طور پر صرف اُنکی شاعری کی کیفیت دکھلائی۔ کیونکہ اس چھوٹے سے مضمون میں اس سے زیادہ گنجائش نہ تھی۔

اسلم جیراجپوری۔

انجام

نقطے دو ہیں۔

ابتدائی نقطہ۔

انتہائی نقطہ۔

پھر وجود اور کیفیت محسوسہ میں بھی دو نقطے پائے جاتے ہیں۔ ابتدائی نقطہ کا دوسرا نام شروع اور انتہائی نقطہ اخیر کے نام سے موسوم ہی جو موقع ایک شے یا ایک وجود کے شروع ہونیکا ہی وہ ایک نقطہ ابتدائی ہی اور جہاں اُسکا خاتمہ ہوتا ہی وہ نقطہ[1] انتہائی ہی۔ شروع اور خاتمہ میں ایک مسلسل نسبت ہوتی ہی۔ جسے یہ دونوں نقطے پورا کرتے ہیں یا یہ کہ ایسی نسبت ان دونوں نقطوں میں متلازم رہتی ہی۔

بعض کے خیال میں نقطہ سے مراد صرف منتہائے خط ہی ہوتا ہی اس تعریف سے نقطہ شروع نکلجاتا ہی اگر ہم منتہائے خط ہی نقطہ قرار دیں تو اس میں بھی قباحت نہیں مگر جہاں سے ایک خط شروع ہوتا ہی درصل وہ بھی ایک نقطہ ہی ہی۔ اگر منتہائے خط سے ہم ایک دوسرا خط

[1] بعضوں کی یہ رائے بھی ہی کہ درصل نقطہ کا کوئی وجود ہی نہیں اس دلیل سے کہ جہاں سے ایک خط شروع ہوتا ہی وہ درحقیقت خط ہی ہوتا ہی اور جہاں پھر ایک خط ختم ہوجاتا ہی وہ بھی خط ہی ہی۔ اگر ہم ایک خط کے اجزائے صغیرہ کرتے جاویں اور اُن کی مقدار کم سے کم رکھیں تو تمام ایسے اجزائے صغیرہ بجائے خود خطوط ہونگے اور جنہیں نقطہ قرار دیا جاتا ہی وہ بھی انہیں خطوط میں شمار ہوجاوینگے۔ فرض کرو ہم نے اس خط کو ۱۲ مساوی حصوں پر تقسیم کیا ۱۲ - ۱۱ - ۱۰ - ۹ - ۸ - ۷ - ۶ - ۵ - ۴ - ۳ - ۲ - ۱ - تو جیسے دو[2] اور گیارہ[11] نمبر کے خطوط صغیرہ ہیں۔ ایسے ہی ایک اور نمبر ۱۲ بھی خطوط ہونگے۔ کیونکہ ان دونوں خطوں کے شروع اور انتہا کے موہومی حد یا موہومی کیفیت بھی انہیں خطوط ایک[1] اور بارہ[12] میں شامل ہی۔ اگر یہ خط محو کر دیا جاوے تو کوئی نقطہ بھی باقی نہیں رہے گا مثلاً

اس سفید جگہ کے ہر ایک حصہ میں انتہائی یا ابتدائی نقطے قائم ہوسکتے ہیں یا یہ کہ پہلے سے ہی موجود ہیں تخطیط یا کشش سے خود بخود اُنکا اظہار یا احساس ہوجاتا ہی۔ ۱۲-

شروع کرینگے تو گویا ہمنے ایک انتہائی نقطہ سے دوسرا خط شروع کیا جو ثبوت اس امر کا ہوگا کہ ہر شروع میں بھی ایک نقطہ ہوتا ہی۔

اگر یہ مان لیا جاوے کہ ہر شروع یا ہر ابتدا بھی بجائے خود ایک منتھی حد ہی تو یوں کیا جاویگا کہ ہر منتھی حد باعتبار منتہائے نقطہ کے ایک ابتدائی نقطہ رکھتی ہی جسکا دوسرا نقطہ دوسری حد منتہائی ہوتی ہی۔ اگر ہم چند خطوط ایک ہی لین میں کھینچیں تو ثابت ہو جاویگا کہ دونوں نقطوں میں کس قسم کا تلازم پایا جاتا ہی۔ مثلاً

۵	۴	۳	۲	۱
ــــــ	ــــــ	ــــــ	ــــــ	ــــــ

پہلے خط کا منتہائی نقطہ دوسرے خط کا شروع ہی علیٰ ہٰذالقیاس دوسرے۔ تیسرے۔ چوتھے اور پانچویں تک یہی سلسلہ برابر چلا جاویگا۔ اگر ہم ان پانچ خطوط کا سلسلہ آپس میں ملا دیں تو تمام درمیانی ابتدائی انتہائی نقطے ایک ہی خط میں شامل ہو کر خط مسلسل بنجاویگا اور اُسوقت یہ نہیں کہہ سکینگے کہ اس خط کے درمیان میں بھی نقطے ہیں۔ سوائے اسکے کہ ہم اس مذہب کے معتقد ہوں کہ۔

" ہر خط چند نقاط سے مولف ہوتا ہی۔

" یا یہ کہ جب چند نقطے ملادے جاتے ہیں تو ایک خط بنجاتا ہی اس مذہب کے قائلین کے خیال میں جس طرح ذرات سے اجسام مرکب ہیں اسی طرح خطوط بھی نقاط سے مولف ہیں اُنکے نزدیک مثلاً جب ان .... نقطوں کو ملادیا جاتا ہی تو ــــــــــ خط بنجاتا ہی چونکہ نقاط مقدم ہیں اور خطوط مابعدی صورت اسواسطے کہا جاویگا کہ ہر خط کی بنیاد یہی نقاط ہیں۔ خواہ کوئی سی صورت ہو یہ مسلمہ ہی کہ ہر وجود یا ہر کیفیت محسوسہ کا ایک شروع اور ایک خاتمہ ہوتا ہی جیسے یہ تسلیم کیا گیا ہی ایسے ہی یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہی کہ۔

" ہر شروع محسوسہ کا حشر خاتمہ ہوتا ہی۔

جو وجود یا جو کیفیت ہمارے احساس میں آتی یا آچکی یا آنے والی ہی اگر اُسکا کوئی

شروع ہی تو خاتمہ بھی ہی عام اس سے کہ ہم اُس شروع یا خاتمہ سے خود واقف ہوں یا نہیں ممکن ہی کہ ہم اشیاء یا کیفیات کے شروع تو جانتے ہوں لیکن اُنکے خاتموں سے ہمیں کوئی آگاہی نہو یا ایک وجود اور ایک کیفیت کا خاتمہ تو ہم جان سکیں لیکن اُسکے شروع[۱] سے ناواقف ہوں۔ اور اکثر ایسے وجود یا ایسی کیفیتیں بھی ہونگی جنکے شروع اور خاتمہ سے ہم ابتک ناواقف ہیں۔ جیسے جیسے وجود اور کیفیتیں ہوتی ہیں ایسے ہی اُنکے شروع اور خاتمے بھی ہوتے ہیں وجود یا اشیاء مرئی کے شروع اور خاتمے بھی مرئی ہوتے ہیں اور اشیاء غیر مرئیہ کے غیر مرئی۔

دنیا کا جو مجموعہ ہی اُسکے درمیان جو کچھہ پایا جاتا ہی وہ اُسکے اجزائے صغیرہ اور کبیرہ ہیں اس حساب سے یوں کہنا پڑیگا کہ

،، دنیا اجزائے صغیرہ اور کبیرہ یا کیفیات صغیرہ اور کبیرہ سے مولف ہی یا انہیں اجزا کا نام دوسرے الفاظ میں دنیا ہی۔ ہم کیفیت کے شروع اور خاتمہ کے مقابلہ میں ایک اور سلسلہ بھی پاتے ہیں جسے جزی اور کلی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں کوئی ایسی کیفیت نہیں کہ جسکا جز یا کل نہو ہر جزو کے واسطے ایک کل ہوتا ہی اور ہر کل میں جزیات ہیں ہر جزی اپنے کل[۲] کا ثبوت ہے

[۱] بچہ ایک شروع رکھتا ہی لیکن وہ نہیں جانتا کہ اُسکا شروع کب ہوا تھا۔ اُسکی زندگی کا نقطہ صفحہ دنیا پر کھینچا جاتا ہے جسے وہ ہوش میں آکر محسوس کرتا ہی لیکن اگر اس سے پوچھا جاوے کہ تمہارا شروع کب اور کس طرح ہوا تو وہ آخر تک جواب نہیں دے سکیگا سوائے اسکے کہ اور بچوں کے شروعات دیکھکر اپنے شروع پر بھی نظیراً استدلال کرے۔ ۱۲۔

[۲] یہ بھی بحث کیجاتی ہی کہ
،، کل مقدم ہی یا
،، جزو مقدم ہی۔
یہ تو بالکل صاف ہی کہ جبتک کل نہو جزیات کا ہونا ناممکن ہی۔ لیکن یہ نہیں کہا جاویگا کہ پہلے کل کا وجود ہوا اور بعد ازاں جزیات کا خلاف اسکے یہ کہا جا سکتا ہی کہ
،، جزیات سے کل بنتا ہی۔
ہم دنیا کی کیفیات محسوسہ میں صریحاً پاتے ہیں کہ ہر وجود اور ہر کیفیت کا شروع جزیات سے ہی ہوتا ہی

اور ہر کل اپنے جزیات پر شہادت ہر جزی اور ہر کلی میں ایک نسبت ہی -

جزیات میں وہ تمام کیفیتیں بغیر کیفیت مقدور کے پائی جاتی ہیں جو اُسکے کل میں ہوتی ہیں کل میں بہیئت مجموعی وہ تمام کیفیتیں موجود ہوتی ہیں جو اُسکے اجزا میں مشاہدہ کیجاتی ہیں - پانی کے ایک قطرہ اور آگ کے ایک خفیف شعلہ اور مٹی کے ایک ذرّہ اور ہوا کے ایک جھونکہ میں وہ تمام کیفیتیں باور کرلی جاوینگی جو اُنکے کل میں موجود ہیں -

ہر کیفیت میں دو قسم کی کششیں پائی جاتی ہیں -

" اثباتی -

" منفی -

اثباتی وہ کششیں ہیں جنسے ایک کیفیت یا ایک وجود ثابت ہوجائے اور منفی وہ جو ایک وجود یا ایک کیفیت کی نفی کرتی ہیں - تمام مادی شیئیں یا مادی کیفیتیں جو ہمارے اِرد گرد پائی جاتی ہیں اور جنہیں ہم محسوس کرتے ہیں وہ اثباتی اور منفی قانون کے تابع ہیں ہر مادی وجود یا محسوسہ کیفیت شروع اور خاتمہ رکھتی ہی - دنیا کے مجموعہ میں جسقدر مختلف قوتیں پائی جاتی ہیں وہ اس مجموعہ عظم کی جزیات صغیرہ اور کبیرہ ہیں - چونکہ ہم بوجہ اجزائے صغیرہ یا کبیرہ ہونے کے اپنے کیفیت تامہ سے پورے طور پر ماہر نہیں ہیں یا نہیں ہوسکتے اسی واسطے مجموعہ عظم کے مقابلہ میں ہمیشہ اپنے اجزائے صغیرہ اور کبیرہ سے استدلال کرنا پڑتا ہی -

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ

" ہر جاندار کے واسطے قوت لازمی ہی -

بقیہ صفحہ ۲ اجسام جو ذرات سے مرکب ہیں تمام کے تمام جزیات ہی ہیں - خیالی اور ذہنی کیفیتیں بھی جزیات سے ہی کیفیت کلی حاصل کرتی ہیں قدرتی سامان بھی اسپر شاہد ہی - گو ہمارے سامنے قدرتی مواد بہ حیثیت کل کے لایا گیا یا آتا ہی لیکن اُنکی تالیف اور ترکیب ہمیں یقین دلاتی ہی کہ وہ چند اجزا کا مجموعہ ہیں یہ منظر ہمیں اس بحث پر لیجاتا ہی کہ جزی کلی سے مقدم ہی - ۱۲ -

" یا ہر کیفیت محسوسہ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

" یا سب کیفیات محسوسہ فانی ہیں۔

تو ہمارا یہ کہنا اس اعتبار سے نہیں کہ ہم نے کل جانداروں کو مرتے دیکھا ہے۔ یا تمام کیفیات محسوسہ کا ہمارے سامنے خاتمہ ہوا ہے۔ یا سب محسوسہ کیفیات کا اخفا ہمارے مشاہدہ میں آچکا ہے بلکہ بایں اعتبار کہ ہم نے اس مجموعہ عظم کے اجزاے کبیرہ میں ہر آن ایسا ہوتے دیکھا اور مشاہدہ کیا ہے اور اس دلیل سے کہ ہم جزی اور کلی میں ایک تلازمہ کے بھی مقر ہیں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ۔

" جب جزیات میں یہ انقلاب لازمی ہے تو

" کلی یا مجموعہ عظم میں بھی لازمی ہوگا۔

ہم اپنی زندگی میں بہت سے کام کرتے ہیں ہمارے ہر کام کا جیسے شروع ہوتا ہے ویسے ہی ایک خاتمہ بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم اور کاموں کی نسبت بھی خیال کر سکتے ہیں ہم جو کام کرتے ہیں وہ ایک صورت میں ہمارے اجزا ہیں جیسے ہمارے اجزا باری باری ختم ہوتے جاتے ہیں ایسے ہی ہم بھی (جو بمقابلہ اُنکے مجموعہ اعظم ہیں) ایک وقت ختم ہوجاوینگے[1] ایک فلاسفر کہتا ہے۔

" ہم پیدا ہونے کے ساتھہ ہی مرتے جاتے ہیں "

بالکل سچ ہے۔

---

[1] ہر وجود اور ہر کیفیت کا خاتمہ یا انجام اپنے شروع کی روش یا طرز کے تابع ہوتا ہے تمام وجودوں اور تمام کیفیات کا شروع بتدریج ہوتا آیا ہے اور بتدریج ہی ہوتا ہے چونکہ ہر شروع اور ہر ابتدا چند اسباب کے تابع ہے اسواسطے اُن اسباب کے مطابق بتدریج اُس میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔ جیسے ایک شروع قانون تدریجی کا پابند ہے ایسے ہی ایک خاتمہ بھی ہے کوئی وجود اور کوئی کیفیت لو اُسکا انحطاط تک بھی دفع نہیں ہوتا رفتہ رفتہ۔

جزیات کا انجام یا خاتمہ بھی رفتہ رفتہ ہوتا رہتا ہے۔ بڑھنے کے ساتھہ ہی گھٹنے کی رفتار بھی جاری ہوجاتی ہے

زندگی یا وقت کا جو عرصہ گذرتا ہے وہ ہمارے مجموعہ زندگی میں سے کم ہو ہو کر ہمیشہ کیواسطے باعتبار اس دنیا کے مرجاتا ہے۔ جب تمام وقت گذرجاتا ہے تو ہم خود بھی اس موجودہ حیثیت میں باقی نہیں رہتے [۱] اسکا نام ہمارے مقابلہ میں موت اور فنا ہے جب ہم بہ تدریج مرتے ہیں تو اسکا نام موت صغرا ہے ۔

اور جب بہیئت مجموعی ہمارا وقت ختم ہوجاتا ہے تو اسکا نام موت کبرا ہے۔

اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ جب ہمارے ہر ایک مجموعہ اعظم کے واسطے بتبعیت اجزاے صغیرہ اور اجزاے کبیرہ کے ایک خاتمہ یا ایک انجام ہے تو پھر کسی نہ کسی دن ایک آخری مجموعہ اعظم کے واسطے بھی کوئی نہ کوئی خاتمہ ہوگا یا ہونا چاہیئے (جسے خاتمہ اکبر کہاجاویگا)

بقیہ صفحہ ۲۷۲ ایک پودہ بڑہتے ہی جیسے ترقی کرتا جاتا ہے ویسے ہی تنزل میں بھی آتا جاتا ہے ایک بچہ پیدا ہونیکے ساتھہ ہی بڑہتا اور نشو و نما پاتا ہے لیکن اُسکے ساتھہ ہی بعض مواد اور کیفیات میں کمی بھی آتی جاتی ہے۔ پھر ترقی اور بیشی کے اسباب یا مواد ایک نمبر خاص پر پہنچکر ٹھہر جاتے ہیں اور انحطاط کا عمل ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ تمام مادی کیفیتیں زائل ہوتے ہوتے ہر وجود فنا ہوجاتا ہے جب کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں خاتمہ یکلخت ہوگیا تو اُسکا یہ مطلب نہیں لیا جاتا ہے کہ تدریجی انحطاط کوئی نہیں ہوا تدریجی انحطاط تو یوم پیدائش سے ہی شروع ہوجاتا ہے جو خاتمہ ہوتا ہے وہ تدریجی انحطاط یا تدریجی خاتمہ ہی کے ماتحت ہوتا ہے۔ اس صورت میں نہیں کہا جاسکتا کہ کون خاتمہ یکلخت ہوا ہے یا کوئی خاتمہ یکلخت بھی ہوسکتا ہے۔ ہر خاتمہ ایک مدت یا ایک عرصہ کا پابند ہے جسکا عمل بتدریج ہوتا رہتا ہے۔ ۱۲ -

[۱] یہ بحث طویل اور دلچسپ ہے کہ قانون فنا سے جو اسوقت اس مجموعہ پر حاوی اور موثر ہے درحقیقت ہم فنا ہوجاتے ہیں یا کسی نہ کسی صورت میں باقی رہتے ہیں بہت سے لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھہ ہم محسوس کرتے یا پاتے ہیں یہ تمام فانی ہے۔ فنا کے عمل میں اسکے خلاف بہت سے لوگونکا یہ عقیدہ ہے کہ کسی وجود اور کسی کیفیت کو فنا حقیقی لازمی نہیں ہے فنا مجازی ہوتی ہے جتنے مادی شیئں ہیں اُن سب کا کسی نہ کسی دیگر حالت میں استحالہ ہوتا رہتا ہے اصلی فنا لازم نہیں آتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم ایسی استحالی کیفیتوں سے کماحقہ واقفیت نہیں رکھتے انسان کا جسم مادی ہے مرنے پر اُسکی شکل تحلیل پاکر بدلجاتی ہے۔

مجموعہ اعظم کا نہ تو ہم نے شروع دیکھا ہی اور نہ ہم اُسکے خاتمہ سے واقف ہیں لیکن جب اُس کی جزیات کا جنسے اور بہی بڑے بڑے اندرونی ضمنی مجموعے کے مرتب ہیں شروع اور خاتمہ ہوتا ہی تو اُس نظیر سے ہم اس نتیجہ پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں کہ اس مجموعہ اعظم کا بھی شروع ہوگا جب شروع ہی تو اُسکا خاتمہ بہی لازمی ہی ایک وجود کے شروع کے نہ جاننے سے ہم اُسکے خاتمہ سے انکار نہیں کر سکتے۔ اگر مجموعہ اعظم کا کوئی خاتمہ نہیں یا نہیں ہونا چاہیے تو ہمیں یہ استحالہ لازم آنے کا اندیشہ ہی کہ دنیا کے موجودہ اجزائے صغیرہ اور کبیرہ اس مجموعہ اعظم کے اجزا نہیں ہیں کیونکہ یہ لازمی ہی کہ جو کل کی کیفیت ہو وہی جزیات میں بہی پائی جائے

بقیہ صفحہ ۲۷۳ اور جسمانی ذرات کسی اور کیفیت کے ساتھ ملکر کوئی اور صورت اختیار کرتے ہیں۔

کوئی سی کیفیت اور کوئی سے وجود دیکہو پایا ایسا ہی جاتا ہی کہ اُنہیں فنا حقیقی نہیں ہی کیونکہ اگر فنا حقیقی ہو تو اور اشکال یا اور مواد میں مستحیل نہو سکیں حالانکہ ایسا ہر وجود کے ساتھ مستلزم ہی اس سے بعض نے نتیجہ بھی نکالا ہی کہ چونکہ فنا حقیقی کسی وجود کا خاصہ لازمی نہیں ہی اسواسطے یہ سلسلہ یوں ہی چلا جاویگا اور یوں ہی چلا آیا ہی۔ ہماری رائے میں تاویل درست نہیں ہی یہ ثابت ہی کہ جب جذبات میں یہی فنا موجود ہی تو اُسکے مجموعہ اعظم کیواسطے بہی لازمی ہی یہ جدا بات ہی کہ اس فنا سے وہ مجموعہ اعظم کسی اور شکل میں تبدیل ہو جاوے لیکن یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس مجموعہ اعظم کا کوئی خاتمہ اور کوئی انجام ہی نہیں۔

افنائے اجزائے عالم سے جو تحلیل اور تبدیل ہوتی ہی وہ معلوم اور لامعلوم کیفیات میں منتقل ہو جاتی ہی ہم اس سے قیاس کر سکتے ہیں کہ جب مجموعہ اعظم کا خاتمہ ہوگا تو اُسکی کیفیت مستحیلہ اور متبدلہ بہی کسی اور ہی طریقہ اور نہج پر ہو جو کیفیت استحالہ اجزائے صغیرہ یا اجزائے کبیرہ مجموعہ اعظم میں پائی جاتی ہے کیونکہ اسکا بہت سا حصہ لامعلوم یا لاادراک ہوتا ہی۔ اسواسطے مجموعہ اعظم کی کیفیت ثانی بہی اگر لامعلوم اور لاادراک خیال کر لی جاوے تو اس میں کوئی قباحت نہیں یہ ممکن ہی کہ جب مجموعہ اعظم کا خاتمہ ہو تو ہم بعض آلات اور بعض ذرائع سے کچھہ نہ کچھہ معلوم اور دریافت کر سکیں لیکن چونکہ اُسوقت ہم بھی بہ جہت اجزائے صغیرہ اُس مجموعہ اعظم کے دائرہ خاتمہ میں ہونگے اسواسطے ہمیں کسی کیفیت عاہدہ جدیدہ کا علم کافی نہیں ہوسکتا ہی۔ بیشک علم کا نہ پانا کافی نہیں ہوسکتا ہی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسی کوئی جدید عاہدہ کیفیت نہو یہ عدم علم تے مستلزم عدم شئے نہیں۔

یہ تو مجموعہ اعظم کی کیفیت عاہدہ جدیدہ ہوگی ہم روز اسی عالم میں ایسے استحالے دیکھتے ہیں کہ اُنکی کیفیات عاہدہ جدیدہ کا علم بہی بعد یونکے تجربے اور مشاہدہ کے بعد ہوا ہی - ۱۲-

جب کل کا کوئی خاتمہ نہیں ہی تو اجزا کا کس طرح ہو سکتا ہی حالانکہ ہم مشاہدہ کے ذریعہ سے یقین کیے ہوئے ہیں کہ اجزائے صغیرہ اور کبیرہ اس مجموعہ اعظم کا خاتمہ لازمی طور پر ہوتا رہتا ہی۔

یہ ثابت ہی کہ

،، جو کام ہم خود شروع کرتے ہیں کبھی نہ کبھی اُنکا خاتمہ ہوتا ہی۔

،، جو قدرتی کام شروع ہیں یا شروع ہوتے ہیں اُن میں سے بھی اکثر کا خاتمہ ہوتا ہے۔

یہ دونوں مشاہدات ہمیں اس طرف جانے کا اشارہ کرتے ہیں کہ جس مجموعہ اعظم میں ہم رہتے ہیں وہ بھی پائدار نہیں ہی اُس میں بھی ایک خامی ہی جس طرح انسانی اجسام رفتہ رفتہ گھٹتے گھٹتے دائرہ موت میں آجاتے ہیں اسی طرح یہ کل مجموعہ اعظم بھی اپنے اجزا کی تدریجی رفتار کا نقش قدم لیکر حیز خاتمہ میں آجاوے گا۔ موت اور خاتمہ صرف جاندار اجسام کے ساتھ ہی مختص نہیں ہی جو اجسام اور جو کیفیتیں بے جان کہی جاتی ہیں اُن میں بھی موت اور خاتمہ کا عمل جاری رہتا ہی اور بصورت خاتمہ کے اُن کی تحلیل اور تبدیل بھی ہوتی رہتی ہی۔ اُنکا بیجان ہونا اُنہیں اس مجموعہ اعظم کے دائرہ سے باہر نہیں نکال سکتا ہی۔

حکمار کے نزدیک اس کلی خاتمہ کا نام خواہ کچھ ہو مذہب کی اصطلاح میں اسے پرلو یا قیامت سے تعبیر کیا گیا ہی۔ ہر مذہب میں یہ کہا گیا ہی کہ ایک نہ ایک وقت میں کسی نہ کسی بہج پر اس دنیا کا خاتمہ ہونے والا ہی۔

مذہبی فلسفہ میں ایسا عقیدہ اس عقدہ پر روشنی ڈالتا ہی کہ حکما اور مذہب میں اصولی اُمور کے متعلق کہانتک اتحاد ہی قیامت کے معنی خاتمہ ہونے کے ہیں جسے دوسرے الفاظ میں ثابت اور روشن ہونے کے معانی میں تاویل کیا جا سکتا ہی چونکہ مجموعہ اعظم کے خاتمہ سے کیفیت عائدہ جدیدہ کا کافی اظہار ہو جاویگا اسواسطے مذہب میں اسے مشاہدہ کامل سے بھی تعبیر کرتے ہیں جب ہم بانیان یا معتقدان مذہب کی زبانی یا الفاظ میں مجموعہ اعظم کے خاتمہ کا ذکر سنتے ہیں تو ہمارے دلوں میں شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں اور ہم بجائے فرید

تحقیق کے جلد بازی سے معترض ہونا زیادہ تر پسند کرتے ہیں یہ جلد بازی درحقیقت اس امر کا نتیجہ ہی کہ ہم نے مذہب کی فلسفی پر غور نہیں کیا اور فلسفہ سے اُسے بہت دور سمجھا ہی

بعض وقت یہ خیال کیا جاتا ہی کہ مذہبی فلسفہ کی بنیاد صرف عقیدہ پر ہی ہی عقیدہ میں کوئی چون وچرا نہیں ہوسکتی بیشک مذہب چند عقائد کا مجموعہ ہیں لیکن یہ کہنا یا یہ مان لینا کہ اُن عقائد کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی ایک وسیع بدظنی کرنا ہی ممکن ہی کہ ہر مذہب میں فلسفہ کی طرح چند عقیدے کمزور دلائل پر بھی مبنی ہوں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مذہب کے سب عقیدے حدود دلائل سے باہر ہوتے ہیں۔

خاتمہ مجموعہ علم کا بھی ایک مذہبی عقیدہ ہی یہ ایسے ہی دلائل کے تابع ہی جیسی کہ اس بارہ میں حکیموں کا عقیدہ ہی بعض ہیئت دانوں نے زمانہ حال کے اس پر روشنی ڈالی ہی کہ آفتابی حدت میں دن بدن کمی آتی جاتی ہی اور کسی روز آفتاب کی حدت اور نوری طاقت بالکل گھٹ جاویگی مذہب پرست اگر یہ مسئلہ بیان کرتے تو اسکے تجربی اور مشاہداتی دلائل کے ساتھ اعمالی[1] اور جبروتی دلائل بھی لاتے۔ ایک یہ بھی فرق ہوتا ہی کہ فلسفہ مذہب میں ہمیشہ عام دلائل سے کام لیا جاتا ہی جن میں بہت کچھ اخلاقی فلسفہ کا مواد بھی ہوتا ہی نہ تو اُن میں منطقی بحث ہوتی ہی اور نہ طبعی استدلال لیکن جب انہیں محک علمی پر پرکھا جاتا ہی تو انکا اکثر حصہ کھرا نکل آتا ہی۔

---

[1] ہر فلسفہ کیواسطے استدلال کے طریقے جداگانہ ہیں اخلاقی فلسفہ میں اُن دلائل سے کام نہیں لیا جاتا جنسے نیچرل فلاسفی میں مذہبی فلسفہ میں عقائد کے جہت سے کل دلائل کا انحصار اور وثوق۔

،، خدا۔ اور

،، بانی مذہب۔

پر ہوتا ہی ہر عقیدہ کے ساتھ یہ شرط ہوتی ہی کہ اسے یوں ماننا چاہیئے یہ عمل قریباً ایسے ہی ہوتا ہی جیسے اخلاقی فلسفہ سکھاتا ہی گو اخلاقی فلسفہ میں یہ دو امتیازی جہتیں نہیں ہوتیں مگر مذہب کی طرح یہ کہا ضرور جاتا ہی کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے یا یہ کہ اس فلسفہ میں بھی دلائل کا ایک خاص مرحلہ پر خاتمہ کردیا جاتا ہی جب کبھی اخلاقی فلاسفر یہ کہتا ہی کہ ،، بُردباری خاصہ انسان کا ہی،، تو وہ درحقیقت ایک مختتم حکم دیتا ہی۔

اگر ہم تمام عقائد مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کا مقابلہ کریں تو ہمیں پتہ لگ جائیگا کہ مذہبی عقائد کا اکثر حصہ اخلاق میں پایا جاتا ہی صرف ایک بانی مذہب یا خدا کے ماننے کا عقیدہ باقی رہجاتا ہے اور اگر بہ نظر امعان دیکھیں تو یہ مشکل بھی حل ہوجاتی ہی۔ اخلاقی فلسفہ اور پولیٹکل سائنس کی بحثوں میں یہ بیان کیا گیا ہی۔ کہ

"دنیا یا سوسائٹی کے انتظام اور اغراض تمدن کیواسطے لازمی ہی کہ من جملہ اجزاء متفرقہ کے کوئی جزو خاص بھی ہو یا کسی جزو یا افراد خاصہ کے ہاتھہ میں کل انسانوں کے امور متمدنہ تفویض رہیں۔

اس طریق عمل یا اس تعلیم سے تخصیص کی ضرورت تو ثابت ہی۔ رہی یہ بحث کہ انسانوں میں سے ہی ایسی تخصیص ہوسکتی ہی یا انسانوں سے کہیں باہر کسی اور اعلیٰ طاقت سے بھی کام لیا جاسکتا ہی۔ ہمیں انسانوں کی تاریخ وضاحت سے بتلاتی ہی کہ انسانی جماعتیں ہمیشہ اس بات کی تلاش میں ہی ہیں کہ کسکو یہ خصوصیت دیجاوے توہم پرستی بت پرستی سب اسی تلاش کے مقدمات تھے اور اگر وحدت کا مسئلہ درست ہی تو بھی اُن تحقیقاتوں کا خاتمہ ہے انسان متمدنی معاملات میں ہمیشہ نیچے سے اوپر جاتا اور اپنے ہی میں سے ایک یا چند افراد کی بعض امور کے واسطے تخصیص کرتا ہی بعض افراد نے کبھی کبھی کوشش اور یہ ہمت بھی کی کہ سب لوگ مطلق العناں ہوجاویں کوئی کسی کا پابند نہ رہے لیکن مابعد کے تجربوں نے ثابت

بقیہ صفحہ ۲۷۶ - مذہب کہتا ہی کہ میں تمہیں خدا کی جانب سے (جو علت العلل ہی) یہ حکم دیتا ہوں۔
اخلاق کہتا ہی کہ میں تمہیں اسواسطے یہ حکم دیتا ہوں کہ میں نے حقائق الاشیاء پر غور اور بحث کرکے تمہارے واسطے اسکی ضرورت ثابت کی ہی۔ مذاہب کی بعض وقت یہ بدقسمتی ہوتی ہی کہ لوگ اخلاقی حیثیت سے تو انہیں امور اور اعمال کی تصدیق کرتے ہیں جو مذہب سکھاتا ہی لیکن جب مذہبی رنگ میں اُنہیں عقیدے کے نام سے پیش کیا جاتا ہی تو لوگ منحرف ہوجاتے ہیں اگر ایک ایسی کتاب بنائی جائے جس میں ایک طرف اخلاقی تعلیمات اور دوسرے کالم میں مذہبی عقائد ہوں تو شاید بہت ہی کم اختلاف باقی رہجاوینگے۔ ہاں صرف ایک بانی مذہب اور خدا کے وجود کی قید انکو کہی ثابت ہوگی۔ اور یہی مرحلہ آزاد آدمیوں کی گھبراہٹ کا باعث بھی ہی۔ ۱۲-

کردیا کہ یہ روش مفید نہیں ہے بعض لوگ حکومتی پابندیوں سے تو گھبراتے ہیں لیکن جب اپنے خاندان کی چار دیواریوں میں جاتے ہیں تو پھر اُسی کے پابند ہو جاتے ہیں۔

لوگ روز دیکھتے اور پاتے ہیں کہ ہر شروع کا ایک خاتمہ بھی ہوتا ہے۔ ہر ہستی کے ساتھ فنا کی بیخ بھی لگی ہوئی ہے لیکن جب مجموعہ عظم کی فنا اور خاتمہ پر آتے ہیں تو ان سب مشاہدات سے الگ ہو جاتے ہیں قانون جزی اور کلی کے ہر موقع پر معترف ہوتے ہیں لیکن جب اس مرحلہ پر آتے ہیں تو اُن تمام پہلے اور قریبی اعترافات سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ ہم جزی انقلابات اور خاتموں سے صرف حسرت ہی کا سبق نہیں لیتے بلکہ ہمارے اخلاق پر بھی انکا بہت کچھ اثر ہوتا ہے۔ جب جزی انقلاب اور خاتمہ ہمارے اخلاق اور عادات پر موثر ہے تو مجموعی خاتمہ کا خیال اور ارادہ اس سے بھی زیادہ موثر ہو سکتا ہے۔

مذہب نہیں بلکہ حکیموں کا گروہ بھی (سوائے چند کے) ہمیں ان حادثات کے متعلق ہمیشہ اس دلیل سے توجہ دلاتا ہے کہ ہم اپنے اخلاق اور عادات کی اصلاح کریں اور سوچیں کہ ہماری ہستی کے جزویات اور اُسکا مجموعہ عظم کیا حقیقت رکھتا ہے اور یہ مادی اجزا کے مقابلہ میں روحانی کیفیتوں کا حشر کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ بحث اور جھگڑا نہ کرو بلکہ ٹھنڈے دل سے دنیا کے دلچسپ منظر کا تماشا کرو۔

سلطان احمد
میاں والی پنجاب

حکیم فیثاغورث کے حالات

فیثاغورث کے باپ کا نام۔ مینارسوس اور اُسکا وطن بلدۂ صور تھا۔ جو دریائے شام کے کنارے پر آباد ہے۔ اُس کی ولادت باسعادت۔ بلدۂ صور ہی کے درمیان پانسو نوّے ۵۹۰

برس قبل مسیح کے واقع ہوئی - بعض مورخین نے حکیم موصوف کی جائے ولادت بلدۂ ساموس کو بیان کیا ہی - لیکن آگے چل کر خود بخود معلوم ہوجائیگا - کہ بلدۂ ساموس اُسکا مامن اور جائے پناہ تھا نہ مولدؔ وجائے ولادت -

اُن دنوں اخشوروس (غالباً خسرو بابل) کے غلبے اور تاخت وتاراج کی وجہ سے اکثر صوبوں اور شہروں کی سرحدیں مخدوش اور خطرناک ہو رہی تھیں اور قریب قریب تمام ملک شام میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی - چنانچہ بلدۂ صور کی غارتگری وتباہی پر - شام کی تمامی صحرائی قومیں (مثلاً - قبیلہاے لیموں - سعرون اور سقورون وغیرہ) اُٹھ کھڑی ہوئیں اور شہروں کو لوٹنا اور باشندوں کو نہایت سفاکی وبیرحمی سے قتل کرنا شروع کیا - سکنا ء شہر نے خوف جان سے جلاوطنی اختیار کی - اور جس سے جس طرف بن پڑا اُسی طرف بھاگ نکلا -

انھیں جلاوطنوں میں فیثاغورث کا باپ بھی تھا - اور اُسکے تینوں بیٹے بھی ساتھ تھے بڑے کا نام سوطوس - منجھلے کا طورسوس - اور فیثاغورث سب سے چھوٹا تھا -

الغرض آفت رسیدہ مینارسوس - بہ مجبوری اپنے وطن سے نکلکر پہلے ارض بحیرہ میں آیا - اور بعد ازاں بلدۂ ساموس کو گیا - اُس شہر کے مسافر نواز باشندوں نے اُن جلاوطنوں کی بڑی خاطر ومدارات کی اور اُنکے ساتھ نہایت تعظیم وتکریم سے پیش آئے - لیکن مینارسوس کو شہر انطاکیہ کی لطافتِ آبؔ ہوا کا حال سنکر وہاں کی سیر کی ہوس دل میں پیدا ہوئی - اس لیے ساموس میں چندے رہکر اُس طرف کا رخ کیا اور منزل مقصود تک پہونچا تو سہی - مگر بیچارے کو اُس شہر مینو سواد کی سیر سے پوری سیری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اُسی بے امنی اور فتنہ وفساد نے (جسکے سبب سے اُسکو اصلی وطن چھوڑنا پڑا تھا) انطاکیہ کی خاطر خواہ قیام کو دشوار کر دیا - اور چار ونا چار غریب کو ساموس کی طرف لوٹ آنا پڑا -

چونکہ صانع باکمال کو - فیثاغورث کی شہرتِ قابلیت اور آوازۂ کمال سے تمام عالم کو معمور کرنا اور اُسکے فیضان تعلیم سے ساری دنیا کو فیضیاب کرنا منظور تھا - اسواسطے اُسکے لیے

حصول کمالات کے عمدہ عمدہ ذریعے اور وسیلے بھی پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ساموس میں واپس آکر۔ مینارسوس نے اُس جوہر قابل کو حکیم اندروماوس کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ دانشمند اُس ہونہار لڑکے کی ذہانت و فطانت پر عاشق زار ہو گیا اور اُسکو اپنا فرزند دلبند بنا لیا۔ اور علوم ادب اور موسیقی میں اُسے پوری پوری تعلیم دی۔ لیکن فیثاغورث کی علمی تشنگی۔ صرف انہیں دو ابتدائی علموں سے کب بجھ سکتی تھی۔ یعنی اندر دماوس سے دیگر علوم کی تحصیل کے لیے۔ سلیطون جانے کی درخوست کی۔ اگرچہ اُستاد کو اپنے پیارے شاگرد کی مفارقت شاق تھی۔ لیکن اُس شفیق نے عاقلانہ محبت سے کام لیا اور فیثاغورث کو سلیطون میں۔ ایسماندروس کے پاس بھیجدیا۔ جہاں اُسنے۔ علوم ہندسہ و نجوم میں مہارت کامل پیدا کی۔ لیکن اُس شیدائے علوم کو اتنے پر بھی قناعت نہ ہوئی۔ وہ سلیطون سے بھی بابل کو روانہ ہو گیا۔ اور حکیم اریاطاے بابلی کی خدمت میں علم الہیات کی تحصیل میں مصروف ہوا۔

اُسوقت طبندانتوں۔ اخشوروس کی طرف سے بابل کا حاکم تھا۔ اُسنے فیثاغورث کے حال پر بڑی عنایت و مہربانی کی۔ اور اُس کی ہر طرح کی مدد و موعونت کرتا رہا۔ فیثاغورث علم الہیات میں کمال حاصل کرکے۔ بلدۂ دیلون میں آیا اور افار خودیس۔ حکیم سریانی کی خدمت میں۔ حقائق حکمت کی تحصیل کرنے لگا۔ حکیم سُریانی کے انتقال کے بعد۔ جزیرہ ساموس میں پھر آیا۔ اس مرتبہ ازموادیقلس اور ازموداانیس۔ ان دونوں حکمار کی خدمت میں۔ علوم مختلفہ اور فنون متنوعہ کی تحصیل میں مستعد و مشغول رہا۔ خصوصاً علوم ہندسہ۔ ریاضی اور ہیئت کی تکمیل کی۔

الغرض جمیع علوم و حکمت حاصل کرنے کے بعد۔ فیثاغورث کو کاہنان مصر کے علم سیکھنے کا شوق دل میں بے حد پیدا ہوا۔ اور چونکہ وہ لوگ اپنا علم۔ غیر شخص کو بتلانے میں۔ کمال اغماض کرتے تھے۔ اسیلیے اُسکو بغرض سعی و سفارش۔ فولوافراطیس سے

التجا کرنی پڑی۔ جو اُن دنوں جزیرہ ساموس کا حاکم تھا۔ حاکم موصوف نے اسمس کے نام ایک خط لکھدیا۔ جو اُس زمانے میں فرعون مصر۔ یعنی مصر کا شاہنشاہ تھا۔ خط میں فیثاغورث کی مناسبانہ الفاظ میں سفارش کی اور لکھا کہ کاہنان مصر کو حکم ہو کہ اس جوہر قابل اور جویائے علم وکمال کو اپنا علم تبلانے میں کسی طرح کا دریغ و اغماض نہ کریں۔

فرعون مصر یعنی اسمس نے۔ فولوافراطیس کے مکتوب کی پوری تعمیل کی۔ فیثاغورث کے ساتھ بمہربانی پیش آیا اور کاہنان مصر کے نام کے سفارشی خطوط اُسکے حوالہ کیے جن میں بڑی تاکید سے لکھا تھا کہ اپنے علم کی تعلیم میں۔ فیثاغورث کے ساتھ۔ ہرگز ہرگز بخالت کا برتاؤ نہ کریں۔ فیثاغورث اُن فرامین شاہی کو لیکر۔ مدینۃ الشمس میں آیا اور کاہنوں کو اُنکے نام کے فرمان دیے۔ وہ لوگ چونکہ حکم شاہی کو ٹال نہ سکتے تھے۔ اسلیے۔ قہراً و جبراً۔ فیثاغورث کو اپنے پاس ٹھہرنے کے لیے جگہ دی۔ اور ایک مدت دراز تک۔ اُسکو کڑی کڑی اذیتیں اور تکلیفیں دیکر امتحان لیتے رہے۔ لیکن مستقل مزاج فیثاغورث نے۔ ساری مصیبتوں کو بڑی کشادہ پیشانی اور فراخ دلی سے جھیل لیا۔ اور اُن عارضی اور سخت امتحانوں میں پکا نکلا جب حیلہ جو کاہنوں کو کوئی عذر باقی نہ رہا۔ تو بیچارہ فیثاغورث کو تحصیل علم کہانت کی غرض سے کاہنان منبق کے پاس جانے کی ہدایت کی اور خود اس علم کا شمۃ تک نہ تبلایا۔

منبق والوں نے بھی اُسکے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جیسا کہ مدینۃ الشمس والوں نے کیا تھا یعنی ایک مدت مدید تک اُسکو کڑے کڑے امتحانات میں ڈالے رکھا۔ اور اُس ایذا رسائی کا بھی کوئی مفید نتیجہ اُسکے حق میں مترتب نہوا۔ یعنی بیچارہ کو خود تو علم مطلوب کا ایک حرف بھی نہ تبلایا اور اُسی طرح کاہنان دیوسیونس کے پاس جانے کی رہنمائی کی۔

علیٰ ہذا القیاس۔ کاہنان دیوسیونس بھی بہت دنوں تک اُسکا سخت سخت کاموں میں امتحان لیتے رہے۔ لیکن جب اس محنت و استقلال کے پتلے۔ یعنی فیثاغورث نے اُن کی سب فرمائشوں کی تعمیل بلا عذر کی۔ تب اُن لوگوں نے یہ مشکل اور سخت بہانہ پیش کیا کہ تیرا دین و مذہب

ہمارے دین و مذہب سے بالکل مغائر اور جدا ہی اس لیے ہمارے علوم سینہ تجکو راس نہ آئینگے
پس اگر تجھ کو ہم سے کچھ حاصل کرنا منظور ہی تو اپنے آبائی مذہب سے باز آ اور ہمارا دین ختیار کر
اگرچہ یہ شرط بڑی کڑی شرط تھی اور فیثاغورث کے لیے (جو اپنے مذہب کا پکا اور نہایت متقی
و پرہیزگار تھا) اس شرط کا پورا کرنا بیشک بڑی مصیبت کا سامنا تھا۔ لیکن اس موقع پر اُسکا
علمی ذوق و شوق۔ اُس کی وضعداری پر غالب آگیا۔ یعنی فیثاغورث ترک ملت پر آمادہ ہوگیا۔
اور کاہنوں کی بات مان کر انھیں بالکل بے عذر کر دیا۔ جب بہانہ طلب کاہنوں کو حیلہ سازی
کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ تو چار و ناچار انہیں جویائے علم۔ فیثاغورث کو اپنے علم کی تعلیم
دینی پڑی۔

ظاہر ہی کہ جس شخص نے۔ کسی علم کی تحصیل کے لیے ایسی ایسی خلاف توقع مصیبتیں جھیلی
ہوں وہ اس علم کے دقائق۔ حقائق۔ نکاتِ باریک۔ معانی بیگانہ وغیرہ وغیرہ کی تلاش و
تجسس میں کیا کچھ نہ کریگا۔ چنانچہ فیثاغورث کو اُسکے شوق مالایطاق۔ اور دلی کاوشوں
جانکاہیوں اور اعلیٰ درجہ کی قابلیتوں نے۔ علم کہانت کا ایسا عالم متبحر اور فاضل بے ہمتا بنا دیا
کہ مصر کے بڑے بڑے کاہن اُس کی فضیلت اور علمیت کے قائل ہوگئے۔

جب یہ خبر اسس۔ فرعون مصر کو پہنچی تو فیثاغورث کو فوراً طلب کرکے۔ سارے
ملک کے کنیساؤں اور مندروں کا انتظام اُسکے سپُرد کر دیا۔ حالانکہ یہ عظیم الشان خدمت
ملکی کاہنوں کے ساتھ مخصوص تھی۔ اور کبھی کوئی غیر ملک والا۔ اس عہدے پر سرفراز نہ کیا
جاتا تھا۔ فیثاغورث کے اس اعلیٰ رتبہ کو دیکھکر۔ مصر کے سارے کاہن مارے حسد کے جلگئے
اور ہمیشہ اُسکی بربادی کی فکر میں رہنے لگے۔

جب اسس مرگیا اور گشتاسپ نے۔ لہراسپ۔ شاہ ایران کی طرف سے لشکرکشی
کرکے۔ مصر کو تباہ اور مسخر کیا۔ اور ملک کے تمامی حصص میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا۔

ل زردشت آتش پرستوں کا پیغمبر انہیں بادشاہوں کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ صوبۂ آذربایجان کے شہر ارمیان کے درمیان۔

تو اُس دار وگیر میں۔ فیثاغورث کے حاسدین کا مطلب آسانی سے بر آیا۔ یعنی وہ جوہرِ قابل مصر سے چل کھڑا ہوا۔ اور عرصہ تک ایشیا کے مختلف ملکوں کی سیر کرتا رہا۔ اثنا ء سیر وسیاحت میں وہ ہندوستان میں بھی آیا تھا۔ اور یہاں کے سادھ۔ سنتوں سے اور اُس سے۔ معاش ومعاد کے معرکۃ الآرا مسائل میں خوب خوب بحثیں ہوئیں۔ منجملہ مسائل مبحوث فیہ کے۔ مسئلہ تناسخ یعنی اواگون بھی تھا۔ جسکا وہ مذہباً معتقد تھا۔ فیثاغورث تارکِ حیوانات بھی تھا۔ یعنی وہ مشرباً۔ گوشت خوری کو حرام سمجھتا تھا۔ میرا گمان ہی کہ شاید یہ دونوں باتیں (یعنی اعتقادِ تناسخ۔ اور تنفر از گوشت) اُنھیں سادھوؤں کی صحبت اور میل جول کے اثر سے۔ اُس میں پیدا ہوگئی ہونگی۔ کیونکہ ہندوستان میں۔ اعتقادِ تناسخ نہایت قدیم زمانے سے چلا آتا ہی۔ اور فیثاغورث کی سیاحت کے زمانے میں۔ شاکیہ منی گوتم بدھ نے۔ دونوں مسائل (یعنی اعتقادِ تناسخ اور امتناع گوشت خوری) کی از سر نو تجدید کی تھی۔ علاوہ اسکے ہندوستان۔ اور یونان کا باہمی تعلق بہت قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہی۔ پس دونوں ملکوں میں۔ مذہب تناسخ کا توارد۔ کچھ تعجب انگیز بات نہیں ہی۔ بلکہ غالب رائے یہی ہی کہ فیثاغورث۔ مذہب تناسخ اور مشرب ترک حیوانات دونوں باتیں۔ ہندوستان ہی سے لے گیا تھا۔

سیاحی کے بعد۔ حکیم۔ اپنے اصلی وطن۔ یعنی بلدۂ صور کو واپس آیا۔ مگر جب اُس ملک کے عنان حکومت کو ایک غاصب سلطنت پالیقراطیس کے دست اقتدار میں پایا۔ تو وطن سے بیزار ہوکر۔ ملک اطالیہ کو چلا گیا۔ اور وہاں سے اپنے مامن قدیم۔ شہر ساموس کا رخ کیا۔ ساموس والوں نے۔ اپنے قدیم مہمان اور قابل احترام تازہ وارد کا استقبال بڑے تپاک اور "آؤ بھگت" کے ساتھ کیا۔ اور نہایت ہی تعظیم وتکریم سے اُس کی میزبانی کی۔ اور چند روز کے بعد۔ شہر کے باہر۔ اُسکے درس وتدریس کے لیے ایک عالیشان مدرسہ بنا دیا۔ حکیم موصوف وہاں مدتوں رہ کر۔ اشاعۂ علوم وفنون میں مصروف رہا۔

اطراف شہر اور نواحی ملک کے اُمرا رجویائے علوم اور طلبائے شیدا رفنون کا اُسکی درسگاہ میں (جو شاہنشاہوں کی بارگاہ فلک پائیگاہ کا رتبہ رکھتی تھی) ہمیشہ ایک دلاویز مجمع اور دلچسپ جمگھٹا رہا کرتا تھا۔

فیثاغورث کے محسن قدیم۔ یعنی فولوافراطیس۔ حاکم موساس (جسنے اُسکو بادشاہ مصر کے نام سفارشی خط مرحمت کیا تھا) سنے اپنے متعلقہ ملکی کاموں کا سارا انتظام و انصرام کلیتاً۔ اُسی دانشمند کی رائے رزیں پر چھوڑ دیا۔

الغرض۔ فیثاغورث۔ بڑی عظمت و جلال کے ساتھ۔ مدت مدید اور زمانۂ دراز تک ساموس میں درس دیتا رہا۔ بعد ازاں والی ساموس کے کام سے مستعفی ہوکر انطاکیہ کو اور وہاں سے فروطولیا کو چلا گیا۔ فروطولیا والوں نے بھی اُس باکمال کا استقبال بڑے جاہ وجلال کے ساتھ کیا۔ اور نہایت اطاعت و فرماں برداری سے پیش آئے۔ حکیم نے یہاں بھی آٹھ برس رہ کر۔ اُس گرد و نواح کے باشندوں کو مالا مال کر دیا۔ اُسکے فیضان تعلیم سے۔ اطراف وجوانب کے باشندوں کی طرز معاشرت میں ایک انقلاب عظیم واقع ہوگیا۔ یعنی سارا اطراف ملک منہیات سے تائب ہوکر مہذب بنگیا۔

اُسوقت اُس یکتائے روزگار کا شُہرہ تمامی ملک یونان میں پھیل گیا تھا۔ اور بڑے بڑے اہل حکومت اور اعیانِ دولت کی گردنیں اُس کی بارگاہ کمال میں تعظیم و تکریم کے لیے جھکتی تھیں۔ چنانچہ ملک بربر کے اُمرا کا ایک گروہ (جنکو سابق میں علمی ذوق و شوق مطلق نہ تھا) تحصیل علوم وفنون کی غرض سے۔ اُس کی خدمت میں برابر حاضر رہنے لگا۔

اسی طرح شہر قانطورنیا کا والی سیما خوش لطروں۔ حکومت سے دستکش ہوکر اُسکے شاگردوں میں داخل ہوا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یونان کے بہت سے دولتمند اور اُمرا اور متعدد جزیروں کے حُکام نے اپنے اپنے کارہائے متعلقہ کو چھوڑ کر۔ اُس دانائے روزگار کی خدمت بابرکت میں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بود وباش اختیار کی۔ اور ہمہ دم

تحصیل علوم - ریاضت نفس - اکتساب اخلاقِ حمیدہ - احتصال اوصافِ پسندیدہ - سلوک طریق - تقویٰ و طریقت اور حصولِ دولت معرفت وحقیقت میں مصروف رہنے لگے -

فیثاغورث کے شاگرد - اُسکا بڑا ادب کرتے تھے - اور اُنھیں اُستاد کے ارشادات پر اسقدر وثوق تھا - کہ اُسکے ہر قول کو گویا - پتھر کی لکیر سمجھتے تھے - اُسکے شاگردوں میں بڑے بڑے مدبّرانِ مُلک - وزراء سلطنة - قُضَّاتِ مملکة - وضعانِ آئین و قوانین - کاملانِ فن - عُلَمائے متبحّر اور فضلاء ماہر - ہو گزرے ہیں - مقننون میں ایک شاگرد اُسکا زلیکس نامی - مشہور روزگار و یکتائے زمانہ تھا -

فیثاغورث کی بہت سی تصنیفات - نظم و نثر - دو نوں قسم کی ہیں - ایک نظم کتاب اُس کی نہایت عمدہ ہے - جس کو " فیثاغورث کی نظم زریں " کہتے ہیں -

فیثاغورث - اپنے مجوزہ امتحانات لیے بغیر - کسی کو اپنا شاگرد نہ بناتا تھا - امتحانات یہ تھے کہ ہر ایک امیدوارِ تلمذ سے اوّل اوّل - پانچ برس تک - علی الاتصال - خاموش رہنے کی فرمایش کی جاتی تھی - اور جب وہ اس کڑی شرط کو پورا کر لیتا تھا - تو اُسکو حکم ہوتا تھا کہ اپنا سارا مال و متاع خزانہ عامرہ میں داخل کردے - یہ خزانہ عامرہ طلباء کے مصارف کے لیے قائم کیا گیا تھا - جو اُمیدوار - ان دونوں سخت امتحانوں میں کامیاب ہو جاتا تھا - وہ فیثاغورث کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہونے پاتا تھا - باوجود ایسے ایسے سخت امتحانات کے - اُسکے شاگردوں کا مجمع - ایک خاصی فوج سے کم نہ تھا - حکیم موصوف کی قوت روحانی کا اندازہ اسی سے کرنا چاہیے کہ کیسی پُر اثر تھی -

فیثاغورث ہی کی یہ اولین تحقیقات تھی کہ آفتاب مرکز عالم ہے اور زمین دیگر سیّارات کی طرح اُسکے گرد دورہ کرتی ہے - جس تحقیقات پر - کوپرنیکس - گلیلیو وغیرہ حکمائے یورپ

کو بڑا فخر و ناز ہی - اُس کی اوّلیت کا سہرہ - فیثاغورث ہی کے منہ پر کھلتا ہی -

فیثاغورث پہلا شخص ہی - جسنے اپنے کو لفظ فیلسوف کے ساتھہ ملقب کیا ہی -

بڑے بڑے لوگوں کی سوانحاتِ عمری پر غور کرنے سے - یہ بات ایک معمولی سی معلوم ہوتی ہی - کہ جہاں - کسی اہل کمال کے سیکڑوں ہزاروں معتقد ہوتے ہیں - دو ایک اُسکے منکر بھی ضرور ہوتے ہیں - اور اُن کو اُسکے ساتھہ صرف انکار ہی نہیں ہوتا بلکہ اُسکے جانی دشمن ہوتے ہیں - منکرین میں اکثر - دنیاوی جاہ و ثروت کے دلدادہ ہی لوگ ہوتے ہیں - جنکو شرافت نفسانی و محامدِ روحانی سے مطلق مَسّ نہیں ہوتا - اور وجہ اُن کی خباثت و نفسانیت کی - صرف بغض و حسد ہوتا ہی - جو اُنکے تنگ اور کم ظرف دلوں میں - اُس صاحب کمال کی عظمت و عزّت کے سبب سے پیدا ہو جاتا ہی - کیونکہ صاحبانِ کمال - اپنی روحانی قوتوں سے - ایک مقناطیسی اثر - جمہور خلائق کی طبیعتوں پر ڈالتے ہیں - جس سے ایک عام رُجحان - خاص و عام کا - اُن کی طرف ہوتا ہی - اور اس قبولیّت عام کو وہ جاہ طلب لوگ - تنگدلی اور کم ظرفی سے اپنی کساد بازاری کا باعث سمجھتے اور اظہار بدکرداری پر کھڑے ہو جاتے ہیں - فیثاغورث بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھا - اُسکے ساتھہ بھی ویسا ہی معاملہ پیش آیا - جیسا اُسکے سابقین معاصرین - اور متاخرین کے ساتھہ پیش آیا تھا - اور ہنوز پیش آیا کرتا ہی -

تفصیل اس اجمال کی یہ ہی کہ ایک روز - فیثاغورث - اپنے دوست - سلون نامی کے مکان پر بیٹھا ہوا - علمی بحثیں کر رہا تھا - کہ ایک شخص قلون نامی - مدد طولیا کا رہنے والا (جو مال و جاہِ دنیوی میں - اپنے ہمعصروں سے بڑہا ہوا تھا اور ساتھہ اسکے ظالم اور مردم آزار بھی پہلے درجہ کا تھا) یکایک مکان کے اندر گھس آیا - اور حکیم سے چھیڑ خانی شروع کی - اور اپنے فخر و مباہات میں طول - فضول اور واہی بکنے لگا - تحمل مجسّم - فیثاغورث نے - کمال نرمی اور ملائمت سے کہا کہ اے عزیز! آدمی کو ہمیشہ اکتساب فضائل نفس میں کوشش کرنی چاہیے - اور اسی بات پر اُسکو فخر کرنا بھی زیب دیتا ہی - ورنہ خالی خولی - دنیا کی فانی

حشمت وجاہ اور آباو اجداد کی پارینہ شرافت پر ناز کرنا پسندیدۂ عقل نہیں۔ قلون بدنفس کے مزاج میں تو شرارت بھری ہوئی تھی۔ اور منشاء بدنفسی کے پورا کرنے کو بھرا ہوا اور مستعد ہو کر آیا تھا ع خوئے بدرا بہانۂ بسیار۔ حکیم کی اتنی سی نصیحت آمیز بات پر بہت بگڑا۔ اور کمینوں اور رذیلوں کی طرح۔ اس فخر بنی آدم کو گالیاں دینے اور کفر و الحاد اور زندقہ کے ساتھہ اُس کو منسوب کرنے لگا۔ فیثاغورث کے شاگردانِ باحمیت و غیرت کو زیادہ تاب کہاں؟ وہ لوگ خبر پاتے ہی فوراً انتقام و مقابلہ کو کھڑے ہوگئے اور بات کی بات میں اس قصہ نے ایسا طول کھینچا کہ ایک خاصی جنگ قائم ہوگئی۔ جس میں فیثاغورث کے چالیس غیرتمند شاگرد کام آے۔ اور بقیّۃ السّیف۔ دانشمند اُستاد کا اشارہ اور مناسب وقت رائے پاکر۔ وہاں سے بھاگ کر کہیں چھپ رہے۔ اور حکیم خود بھی۔ ساموس سے نکلکر مدینۂ لوفاروس کو چل کھڑا ہوا۔

چونکہ قلونِ بدکردار۔ برابر۔ فیثاغورث کی تاک و تلاش میں رہتا تھا۔ اور اہل لوفاروس پر اُس ظالم کا رعب و داب۔ پہلے سے۔ بہت کچھہ بیٹھا ہوا تھا۔ اسلیے وہاں والوں نے فیثاغورث سے۔ شہر سے۔ نکل جانے کی درخواست کی۔ اور وہ چار و ناچار بلدۂ فاروطونیا کو بھاگ گیا۔ وہاں بھی قلون کا جانبدار گروہ۔ اُس کی ایذارسانی اور ہلاکت کے درپے ہوگیا اسلیے مجبوراً۔ حکیم موصوف۔ اطرنوطیوں کو فرار کرگیا۔ وہاں بھی اُسکے دشمن اطراف و جوانب سے۔ پہنچ گئے۔ اور اُسے طرح طرح کی ہیبت دلانے لگے۔ تب وہ شاگردوں ہمیت موسین کو چلا گیا۔ اور جان بچانے کی غرض سے۔ وہاں ایک ہیکل میں چھپ رہا۔ اور چالیس شبانہ روز وہیں پڑا رہا۔ چونکہ مذہباً کسی پناہ گیر مجرم کو مندر میں قتل کرنا جائز نہ تھا۔ اس لیے دشمنوں نے ہیکل کے چاروں طرف آگ روشن کردی۔ جسکی جانگداز حرارت اور گرمی سے۔ حکیم موصوف شاگردوں سمیت گھٹ گھٹ کر مرگیا۔ اور زبان حال سے۔ اُنیس سو ۱۹۰۰ برس پیشتر ہی۔ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ کی یہ لاجواب باعی اپنے اور خبیث النّفس۔ قلون کے حسب حال کہہ گیا۔

دوران بقا چو باد صحرا بگذشت　　تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت

پنداشت ستمگر کہ جفا بر من کرد　　بر گردن او بماند و بر ما بگذشت

یہ دانائے روزگار پانچ سو نوّے (۵۹۰) برس۔ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اور پانچسو چار برس قبل مسیح میں وفات پائی*۔ اس حساب سے چھیاسی برس تک دنیا میں زندہ رہا۔ اس مدت مدید میں۔ انقلاب روزگار کے بڑے بڑے نشیب و فراز۔ اُسے طے کرنے پڑے۔ ناظرین اس بات کا موازنہ اور تصدیق مذکورۃ الصدر بیانات سے کر سکتے ہیں۔

مرنے کے بعد۔ معتقدین کی طرف سے اُسکے وطن میں ایک عظیم الشان ہیکل (مندر) تعمیر کر دیا گیا۔ جس میں۔ اُس باکمال کی دیوتاؤں کی مانند پرستش ہوتی تھی۔

فیثاغورث کے۔ ہمعصران۔ ایران میں۔ زرتشت۔ ہندوستان میں۔ شاکیہ منی گوتم۔ بدّھ۔ اور چین میں۔ حکیم لاؤزی تھے۔

زردشت نے۔ ایران کے صوبۂ آذربایجان میں۔ شہر ارمیاں کے درمیان پیغمبری کا دعوی کیا۔ ایرانی پہلے واحد مطلق کی پرستش کرتے تھے۔ بعد ازاں۔ نور مطلق کا بزرگ مظہر سمجھکر۔ آفتاب کو پوجنے لگے۔ زردشت نے آفتاب کو۔ دور دراز فاصلہ پر دیکھکر

* فیثاغورث کے سنہ ولادت اور سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ ایک مؤرخ نے اُسکی پیدائش کا سنہ۔ پانچسو نوّے (۵۹۰) برس قبل حضرت مسیح کے لکھا ہے۔ اور وفات کا کوئی زمانہ نہیں لکھا۔ دوسرے مؤرخ صاحب۔ پیدائش کا سنہ پانچسو ستر برس (۵۷۰) اور وفات سنہ پانچسو چار (۵۰۴) برس قبل حضرت مسیح کے بتلاتے ہیں۔ اس حساب سے اسکی عمر چھیاسٹھ (۶۶) برس کی ہوتی ہے۔ اور یہی صاحب حکیم موصوف کی مدت قیام۔ ساموس میں ساٹھ برس اور فرو طولیا میں درس دینے کا زمانہ آٹھ برس (یعنی دونوں جگہ کی مدت درس و تدریس اٹھسٹھ (۶۸) برس) تحریر فرماتے ہیں۔ اب اس سے زیادہ حیرت انگیز۔ اور کونسی بات ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کی تمامی عمر چھیاسٹھ برس کی ہو اور صرف اُسکی درس و تدریس کا زمانہ اٹھسٹھ (۶۸) برس قرار پائے۔ خاکسار راقم نے انہیں قباحتوں کا لحاظ کر کے۔ سنہ ولادت میں تو پہلے تذکرہ نویس کی روایت کو اور سنہ وفات میں دوسرے مؤرخ کی روایت کو اختیار کیا ہے۔ اس حساب سے حکیم ممدوح کی عمر چھیاسی برس کی ٹھہرتی ہے۔ اور بشرطیکہ اُسکی قیام ساموس کی مدت۔ پوری ساٹھ برس کی نہ سمجھی جائے۔ تو یہ چھیاسی (۸۶) برس کا زمانہ۔ حکیم کے زمانۂ طفولیت و سن رشد۔ زمانۂ تعلیم و تربیت۔ زمانۂ سیر و سیاحت۔ زمانۂ درس و تدریس اور زمانہ آوارہ گردی کے لیے کافی سمجھا جا سکتا ہے اور۔ درائنا۔ اس میں کوئی استحالۂ عقلی لازم نہیں آتا۔

آتش پرستی ہی کو خدارسی کا وسیلہ قرار دیا۔ بادشاہ وقت شاہ گشتاسپ نے بھی اسی مذہب کو اختیار کیا۔ اور اُسکا بیٹا۔ اسفندیار۔ تو مذہب آتش پرستی کا ایسا حامی اور مددگار ہوا کہ اُسکے وقت میں۔ تقریباً۔ ایران کے سب خطّے۔ آتشکدوں سے۔ معمور ہو گئے الغرض آتش پرستی۔ بارہ۔ تیرہ سو برس تک بڑے زور شور سے۔ ملک ایران میں۔ شعلہ زن رہی۔ لیکن اول صدی ہجری میں۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے۔ اس مذہب کی پوری بیخ کنی ہو گئی۔ جسکو اس انقلاب کی تفصیل دیکھنی ہو تواریخ ایران کی طرف رجوع کرے۔

شاکیہ* مُنی گوتم بدّھ۔ الہ آباد۔ یا بنارس کے قریب۔ کپل وستو میں راجہ شدودہن کے گھر۔ رانی مہامایا کے بطن سے پیدا ہوا۔ اُسکا اصل نام سدھارتھ تھا۔ ماں کے انتقال کے بعد۔ اُس کی خالہ گوتمی نے۔ بدّھ کی پرورش کی۔ شاید اسی مناسبت سے۔ بدھ کے نام کے ساتھہ گوتم کا لفظ لگایا جاتا ہی۔ بیٹے کا رنگ ڈھنگ دیکھکر۔ راجہ نے بدھ کی شادی اوائل شباب ہی میں کر دی۔ اور اُس کی دلچسپی کے لیے۔ عیش و عشرت کے بڑے بڑے سامان مہیا کر دیے۔ مگر یہاں تو دوسری ہی دھن سمائی ہوئی تھی۔ اُس شہباز بلند پرواز (یعنی بدھ) کو یہ مکڑی کی جالیاں نہ پھنسا سکیں۔ اسنے سب عیش و تنعم پر لات ماری۔ اور بیراگ کا تو بنا لے کر فقیر ہو گیا۔ بڑی بڑی ریاضتوں۔ تپشیاؤں اور نفس کشیوں کے بعد (جنکی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں ہی) اُسکے دل کو یقین ہوا کہ اب میں گیانی ہو گیا۔ اور مُکتی۔ یعنی نجات کی راہ پالی۔ ہندوستان میں پہلے بَیدِک مذہب مروج تھا۔ اس مذہب والے علوم دین کو برہمنوں کے واسطے مخصوص سمجھتے تھے۔ اور آتما یعنی روح کے قائل تھے۔ اور ثواب و عقاب کی خوشی و رنج کا محل اُسی روح کو جانتے تھے۔ تناسخ کی نسبت اُنکا

---

* شاکیہ۔ لفظ شک سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہی۔ شک ایک تاتاری قوم کا نام ہی۔ جو تاتار کے صوبہ شک یعنی ستھیا کی رہنے والی تھی قوم شک نے راجہ بکرماجیت کے وقت میں۔ اُجین پر چڑھائی کی تھی جسکو انیس سو ترسٹھ برس ہوئے۔ اگر بدہ کا زمانہ۔ اُس سے قبل نہوتا تو ہم بلا پس و پیش۔ ضرور کہتے۔ کہ بدھ۔ اُسی قوم تاتاری شک کی نسل سے تھا۔ کیونکہ ہمکو بدھ کی آزادمنشی بتلاتی ہی کہ وہ ہندی النسل نہ تھا۔

یہ عقیدہ تھا کہ ایک ہی روح ہمیشہ ایک کالبد انسانی سے۔ دوسرے کالبد میں دورہ کیا کرتی ہے۔ یعنی ایک لاکھ چوراسی ہزار جنم تک چولا بدلا کرتی ہے۔ اور موجودہ کالبد کے افعالِ نیک و بد کا نتیجہ اُسکو اسگلے جنم یعنی کالبد آیندہ میں بھگتنا پڑتا ہے۔ گوتم بدھ نے علم دین کو کسی معزز قوم کے ساتھ مخصوص نہ رکھا۔ بلکہ ہر ایک شریف و رذیل کے واسطے عام کر دیا۔ آتما یعنی روح کے وجود کا قائل نہ تھا۔ کرم ہی کو پردہان مانتا تھا۔ یعنی افعالِ انسانی ہی کو مقدم سمجھتا تھا۔ اور تناسخ کی نسبت اُس کی یہ رائے تھی کہ ایک انسان افعال نیک و بد کے موافق۔ دوسرا انسان کے مجموعۂ افعال نیک و بد کا مالک بنجاتا ہے۔ آواگون کے معنی یہی ہیں[*] یہ مذہب تقریباً۔ سولہ سو برس تک بعض بعض حصص ملک کے سوا۔ سارے ہندوستان میں۔ بڑی کامیابی کے ساتھ جاری رہا لیکن اب سے ہزار برس پیشتر سوامی شنکراچارج نے۔ اس مذہب کا پورے طور پر استیصال کرکے۔ بیدک مت کو نئے سر سے پھر جاری کیا۔ اور برہمنوں کی پوجا تمامی ہندوستان میں ہونے لگی۔

حکیم لاوذی۔ چین کے کسی حصے ملک میں۔ ایک ستّر برس کے بوڑہے کے گھر۔ ایک چالیس برس کی بڑہیا کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کی نسبت۔ عجیب و غریب اور خلاف فطرت معجزے منسوب کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ حکیم لاوذی کی پیدائش عادت فطرت کے موافق۔ مرد و عورت کے اتصال اور اجتماع سے نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک دن سوتے میں۔ اس کی بوڑہی ماں پر۔ شعاع آفتاب کا نزول ہوا اور وہ حاملہ ہوگئی۔ بیالیس[۴۲] برس کے بعد وضع حمل ہوا۔ اور حکیم لاوذی عالم وجود میں آیا۔ ولادت کے وقت اُس کے سر کے بال۔ اور بدن کے رونگٹے سفید تھے۔ اسی لیے چینی زبان میں اسکا نام۔ لاوذی (یعنی پیر نابالغ) رکھا گیا۔ ابتدا میں چینی بھی واحد پرست تھے۔ بت پرستی کی بنا۔ اسکے شاگردوں نے۔ اسکے حکم کا سہارا لے کر۔ ڈالی۔ صورت اُس کی یہ ہوئی کہ حکیم نے اس اعتقاد

[*] اس نازک بحث کو شمس العلما سید علی بلگرامی نے۔ مضمون "کلیلہ و دمنہ" میں خوب وضاحت سے لکھا ہے۔

کی طرف ۔ پبلک کے خیال کی رہنمائی کی کہ انسان کو یہ چند روزہ زندگی ۔ بے فکری اور آسائش سے کاٹ دینی چاہیے ۔ اور بے فکری حاصل نہیں ہوسکتی ۔ جبتک تعلقات سے ۔ کلیتاً روگردانی نہ کی جائے ۔ یہ اعتقاد تو پرانا اور بہت ہی سادہ اور سہل ممتنع تھا ۔ اور کوئی جدت وندرت اس میں نہ تھی ۔ لیکن حکیم کی وفات کے بعد ۔ اُسکے شاگردوں نے ۔ روپیہ کمانے اور خلق خدا کو پھانسنے کے لیے ۔ یہ جال پھیلایا یعنی یہ تازہ فقرا گھڑا کہ پوری بے فکری اُسی وقت حاصل ہوسکتی ہے ۔ جبکہ انسان کے دل سے ۔ موت کا کھٹکا بھی ۔ کلیتاً ۔ جاتا رہے اور اس مقصد کے حاصل ہونے ۔ یعنی حیات جاودانی پانے کے لیے ۔ اُستاد لاوذی نے اپنے خاص خاص شاگردوں کو ۔ اکسیر کا ایک لاثانی نسخہ بتلایا ہے ۔ جسکے استعمال سے ۔ انسان تردد دنیا ۔ اور تفکر عقبیٰ سے ۔ بہ آسانی ۔ رہائی پاسکتا ہے ۔ اس فقرہ نے ۔ خاص و عام کے دلوں کے ساتھ ۔ برقی تیزآب کا کام کیا ۔ اکسیر کی دوائیں تیار ہونے لگیں ۔ اور اُس کے جام حیات بخش ۔ جواہرات کے مولوں پر بادشاہوں اور امیروں کے ہاتھ بکنے اور استعمال کیے جانے لگے ۔

اور حکیم لاوذی (جو یہی بے بہا چیز کا موجد تصور کیا جاتا تھا) اُسکی مورتوں اور تصویروں کی ۔ اہل چین کے ہر ایک گروہ ۔ ہر ایک قبیلے بلکہ ہر ایک گھر میں ۔ دیوتاؤں کی مانند پرستش ہونے لگی ۔ اور اُن عقل کے اندھوں کو یہ نہ سوجھتا تھا کہ جامِ حیات کے طیار کرنے والوں بلکہ خود اُس دوا کے موجد کو ۔ شربت مرگ کیوں نصیب ہوا ۔

خاکسار دیانت حسین پنشنر

موضع سنڈا ۔ ڈاکخانہ عطاسرائے ضلع پٹنہ

توحید کی تاریخ

جس کرۂ خاک پر ہم آباد ہیں اسکے متعلق عقلی اور نقلی دونوں دلیلوں سے ثابت ہے کہ

انسان سے پیشتر بہاں اشیار کا وجود ضرور تھا۔ مادر گیتی نے جسوقت سے اس لعل بے بہا کو اپنی آغوش میں جیتا جاگتا پایا ہوگا پانی اور ہوا کی گھٹی ضرور تیار کر رکھی ہوگی ورنہ ایک دم اس بچے کا جینا محال تھا ساتھہ ہی اسکے بہت سے کھلونے بھی بنا رکھے ہونگے۔ دریا پہاڑ درخت چرند پرند غرضکہ کثرت سے چٹے بٹے اور جھنجنے تیار ہونگے خیر یہ تو مادر مشفقہ کی فطرتی محبت ہی جو کچھہ نہوتا تھوڑا تھا یہ ہمارا پیر فلک ہی جسے عشاق اور انکے صفت کی وکیل شعرا ہمیشہ اپنے خیال کے موافق اسکے جور وجفا سے تنگ آکر برا بھلا کہا کرتے ہیں اسوقت اتنا مہربان تو ضرور ہوگا کہ رات کو اس پیارے بچے کے سلانے کیواسطے چاند کی قندیل لٹکا دیتا ہوگا کہ اشاروں اشاروں میں اس سے باتیں کرتے کرتے سو جائے اور ساتھہ ہی حفاظت کے خیال سے شب بھر ہزاروں چھوٹے چھوٹے چمکتے ہوئے نورانی چراغ جلاتا ہوگا کہ کوئی بلا پاس نہ پھٹکے۔ نور کے تڑکے اس لحاظ سے کہ کہیں اس معصوم کو سردی کا خلل نہو جائے جلدی سے جاکر ایک دہکتا ہوا آتشدان اٹھا لاتا ہوگا جو دن بھر روشن رہکر طرح طرح کے نفع پہونچاتا ہوگا۔ غرضکہ ابتدا میں انسان ان قدرتی واقعات خاصکر آسمان اور اسکے نورانی اجرام کو استعجاب سے دیکھتا ہوگا کبھی ڈرتا ہوگا کبھی خوش ہوتا ہوگا اور رفتہ رفتہ اسکے دل پر ان محسوسات کے سبب سے بیم و امید کی کیفیت پیدا ہوتی ہوگی جسقدر اسکا مشاہدہ ترقی کرتا ہوگا اسیقدر اس کیفیت میں پائداری ہوتی ہوگی یہانتک کہ بعض اشیار کو اپنا خیر خواہ اور مددگار اور بعض کو دشمن اور باعث آزار سمجھنے لگا ہوگا سلسلۂ اسٹوری آف دی نیشنز (افسانہ اقوام) کی کتاب "کالڈیا" (احوال کلدانیاں) کی صفحہ ۱۴۹ میں مذہب کے ابتدائی جذبات کی خوب تشریح کی ہی جسکا ترجمہ ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہی۔

"مادہ مذہب جسے دینداری کہتے ہیں انسان کی طبیعت میں داخل ہی اور گویائی کی قوت کی طرح تمام حیوانات کے مقابلہ میں صرف انسان ہی کو عطا ہوا ہی۔ یہ امر یہانتک مسلمہ ہی کہ موجودہ سائنس بھی تسلیم کرنے لگا ہی کہ انسان انہیں دو قوتوں (دینداری اور گویائی) کیوجہ سے تمام مخلوقات

سے ممیز ہی۔ قدما نے موجودات کی تین قسمیں کی ہیں۔ عالم جمادات۔ عالم نباتات اور عالم حیوانات
آخر الذکر قسم میں انسان بھی داخل ہی مگر اسی سبب سے انسان کا عالم ہی جدا ہونا چاہیے۔ اگرچہ
اس میں تمام قوائے حیوانی موجود ہیں مگر دو چیزیں انکے علاوہ ہیں یعنی گویائی اور دینداری
جسکے معنی یہ ہیں کہ جزئیات سے کلیات کا ادراک کرتا ہی اور نتائج استخراج کرتا ہی۔ یہی دونوں
صفتیں صرف انسان میں خاص طور سے پائی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے مشاہدہ کی روسے
انسان کے قلب پر دو مشترکہ خیالوں یعنی قوت اور کمزوری کا لابدی اثر پیدا ہوا ہوگا۔ وہ
بہت کچھ کر سکتا ہی۔ اگرچہ قد میں چھوٹا جسمانی طاقت کم نہ قدرتی لباس ہی نہ ہتیار ہیں۔
تکلیف اور آب وہوا کی سختی کی مصیبت مثل اور اعلیٰ طبائع کے زیادہ محسوس کرتا ہی مگر
باایں ہمہ وہ گرانڈیل اور طاقت دار جانوروں کو قتل کر سکتا ہی اور رام بھی کر سکتا ہی۔ اگرچہ انکو
مذکورۂ بالا چیزوں میں اسپر فوقیت ہی اور اُنکی کثرت اور خونخواری سے اسکو ہر وقت اپنی جان کا
کھٹکا لگا رہتا ہی جسکے بچاؤ کے واسطے بیچارہ کونے کونے چھپتا پھرتا ہی۔ جانوروں پر قابو
پاکر اب یہ زمین کو بھی مسخر کرتا ہی اور دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں جو قدرتی پیداوار پر بسر کرتے
ہیں یہ عمدہ غذا حاصل کرتا ہی اور آگ ایسی ہولناک شے کو اپنا خادم بنالیتا ہی۔ اس طرح مہمات پر
فتح پاکر اسکا دائرہ حکومت وسیع ہوتا جاتا ہی اور ایجاد و اختراع کے میدان میں قدم رکھتا ہی
"ہمچو من دیگری نیست" پڑھکر خود ہی جھومتا ہی۔ بیشک یہ ناز اُسکا بیجا نہیں ہی۔ یہ سب کچھ ہوا
مگر ساتھ ہی اسکے اُسنے دیکھا کہ مجھے ایسی چیزیں بھی گھیرے ہوئے ہیں جنکو نہ میں سمجھ سکتا ہوں
اور نہ قابو میں لا سکتا ہوں اسپر طرہ یہ ہی کہ انکو میرے نفع اور نقصان پر قدرت حاصل ہی حیران
ہوں کہ کیا کروں یا نہ کروں۔ آفتاب کبھی میرے کھیت کو پکا دیتا ہی اور کبھی جھلسا ڈالتا ہے
بارش سے کبھی میری کھیتی ہری بھری ہوجاتی ہی اور کبھی سڑ جاتی ہی۔ غضب یہ ہی کہ جب گرم ہوا
کے جھونکے چلتے ہیں مجھے اور میری مویشیوں کو لُو لگ جاتی ہی۔ اور دلدلوں میں تو بیماری اور
موت تاک لگائے بیٹھی ہی۔ یہ سب کون چیزیں ہیں۔ یہ تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہاں اب

میں سمجھا یہ حضرات اینجانب سے بھی زبردست ہیں۔خوش ہوئے تو نہال کر دیا بگڑے تو ستیاناس
ہو گیا۔اور میں نہ انکا کچھ بنا سکتا ہوں نہ بگاڑ سکتا ہوں۔بیشک ان زبردستوں کا وجود ثابت ہی
اور چونکہ ہر روز انکے فعل کا ایک نہ ایک اثر ہوتا رہتا ہی۔لہذا میری طرح یہ بھی جاندار ہیں اور اچھائی
اور برائی پر قادر ہیں۔ (باقی آیندہ)

سید نواب علی نوتنوی

اشتہارات

خاتون اسٹور دہلی

کو

جو شریف خاتونوں اور اُن کے پیارے پیارے بچوں کے لیے خوش نما اور
آرام دہ لباس تمام انگریزی وہندوستانی آرایشی سامان۔

جملہ ضروریات خواتین بہم پہنچاتا ہے

حضور عالیہ ہر ہائنس بیگم صاحبہ والی بھوپال نے اس کی مالکہ کا ایجاد کردہ
نو ایجاد برقعہ جس سے زیادہ پردہ دار اور آرام دہ برقعہ ابتک ہندوستان میں نہیں بنا پسند فرمایا
اور ایک معقول انعام عطا فرماکر اعزاز سرپرستی بخشا نیز اس اسٹور کو زنانہ نمایش لکھنؤ
۱۹۰۴ء میں سب سے بڑا انعام ملا اور ۱۹۰۵ء میں زنانہ نمایش علیگڈہ میں اسنے سونے
کا تمغہ حاصل کیا آپ بھی آدہ آنہ کا ٹکٹ روانہ فرماکر فہرست طلب فرمادیں۔

سعید حمید بیگم پروپرائٹرس خاتون اسٹور
دہلی

The above figures very strikingly show that the matches remained mostly drawn. The reason is not far to seek but is manifest and evident. Every one knows, that the two wrestlers, before the combat begins think themselves more than a match for the other. But it is the actual fight which betrays the comparative weakness and superiority. Actually it happened with us. The matches brought our weakness and strength to light. Far from denying the strength of the defence we admit frankly that our attack was not strong and in harmonious combination. There is one point more, a strong one indeed—which proved a great drawback to the success we hoped to achieve, viz, we palyed our matches, all except the first, on undulating and rocky ground of hilly places—to which our team is not altogether accustomed.

In conclusion it will be very unkind of us, if in mentioning these particulars we do not recognise the kind hospitality afforded by some gentlemen at some places—to whom we shall ever remain under obligation.

At Umballa we were hospitably entertained by Mr. Mohd. Faseh whom we found always ready to help the Aligarh student and who deserves our thanks. The other Mr. Mohammad Husain, as a student of our college, is owed due thanks from us. He gave us a cordial reception and kind hospitality at Simla and helped us in every way. The third gentlemen was Mr. Andrews the pricipal of the Military Asylum, to whom we think ourselves in duty bound to offer our thanks for the hearty welcome accorded to us. He helped us in every respect, a fact which will keep his name ever fresh in our memories.

MOHD. JAMIL UDDIN.

With regard to the tour it will suffice to say that it was satisfactory and encouraging and successful. The result is not founded upon the victory achieved but the energy and activity displayed by the team during the matches which have given us substantial material hope for future.

The members forming the team were the following :—

Nazir Hasan,
Masudul Hasan,
Nooruddin,
Jamiluddin,
Nurullah,
Akram Khan,
Ziauddin Hasan,
Abbas Mirza,
Ashhad Hosain,
Moinuddin Mirza,
Masudul Hasan,

The order ot the matches played at the various places is herewith given in a tabular form.

	Versus.	Date.	Place.	Result.
1	32nd Pioneers	26th May	Umballa	Won by three love.
2	Bishop Cotton School.	29th May	Simla	Drawn—one all
3	Gloucester Regiment.	30th May	Jatogh Simla	Pointless draw
4	Military Asylum.	2nd June	Sanawar	„ „
5	Gymkhana Club.	4th June	Kasouli	Drawn—one all here we played 10 minutes each way more as we were tired of draws.

provisos, apologies, confutations and various controversial points, which he has decisively solved, there are gems of the Islamic faith, hidden in its treasures, which only time will enable the Mohommadans to appreciate. Those mysterious and inscrutable problems, that have ever been mortifyiug the human mind, are satisfactorily discussed therein. The existence of one omniscient being ; the nature of the immortal soul, the reality of the life after death, tree from all sensual pleasures ; the true state of Satan, angels and Genii ; the real worth of the so-called miracles and all other vague notions concerning the superhuman, are thorougly investigated. Without going any further it may be openly declared that if Islam is destined to survive the modern materialism, it will survive through Sir Sayed's religious works.

20th May, 1906. MOHAMMAD HOSAIN KHAN.

The Hockey Team on Tour.

It is with the greatest pleasure that I am going to give some account of the Hockey team which started on tour on the 25th May. It will in a few words show the steady improvement our team made in a short space of time.

A few months ago our team started on tour to Lucknow in the winter season. It was a very short tour—which was due to the necessity of the occasion. Our team was weak and inefficient. The want of efficiency was mainly consequent upon the fact that many of the competent members of the 1st eleven of the preceding year—the eleven which in its tour to Calcutta in the winter previous to the one stated above won a reputation becoming the college—left at the close of the season. We were then left to train and coach up the promising members in the second eleven to make up this deficiency—who have not been found wanting, for the students have begun to take great interest in the game. But at the time I am referring to we could not manage to get a good team but soon after we were crowned with success —affording and inspiring a great impetus which resulted in the present tour. It would not be a needless addition if I say that, Nooruddin, Nurullah, Abbas Mirza and Masudul Hasan formed good substitutes for those who left the first eleven.

which crowns all the previous expositions, in being fitted to the age we live in. The limitation of the number of birds to four was in conformity to the Arabic idiom, as in English Coriolanus orders the selection of "four men from each row" and we ourselves use the epithet "four good men." The preposition 'from' before the birds suggested the idea of eggs. Abraham took some eggs and placed them in a warm place. They were hatched after a period and the secret of raising the dead was brought to light. The manifestation of God's omnipotence becomes clear when one thinks over the inert and lifeless state of an egg and how a chicken comes out of it quick and nimble, ready to hurry towards the whistling sound of one who feeds it. The man who hit upon this simple and natural interpretation was Sir Sayed. He tried to prove Islam to be throughly harmonious with reason and commonsense and asserted by means of sound logical arguments that no principal of Mohammadanism conflicted with the most modern postulates established by physical, moral, or social Sciences. *He gave due weight to the spirit and form of religion.* Though his religious admirers are yet a microscopic minority, they are bound to increase rapidly as education spread profusely among the Mohammadans. Islam is interwoven with spiritual and temporal principles, which cannot be disjoined, and an educated man will strive after finding out the real texture concealed by the dust of superstition which has been accummulating on it for centuries. Religious reform can only be effected by one who is thoroughly acquainted with every shade of knowledge, holy and profane. Sir Sayed was the rare combination of those abilities, which enable a man to do great deeds. His political and educational services are unquestionable. He achieved much in the field of social reform : his genius extended so far as to do something for archaeology. When he abtained mastery over every requisite needed for a true reformer, he turned his attention to religion. He seriously studied the old and new Testaments and wrote a commentary on the Bible, an act unique in its nature for he was perhaps the first Mohammadan who wrote an elaborate and impartial exposition of the Christian religion. He pointed out many mistakes, contradictions and irrelevancies and corrected them wisely. He laid down unmistakably the real geographical position of Paran, the place where Paraclete was to appear. He proved unambiguously that Paran was situate in Mecca and Paraclete was literally Ahmad. Finally he wrote a commentry on the Quran by which he put the whole Mohammadan nation under a deep debt of gratitude. Though its volumes abound in

and his devoted followers are no better than paupers and hermits. These men recline a great deal on mythical fiction, which has been incorporated with religion so closely that the kernel is out of sight and therefore out of mind and the shell is ever before the eyes and therefore before the mind's eye.

Another interpretation of the same verse is as follows. Abraham took four birds, properly tamed and trained them, let them loose on a mountain and called them from afar. The birds being domesticated responded to the call and the mystery of raising the dead was revealed. When the dumb creatures recognized their master, why should not the souls, "created by God in his own image" return to their lord on the day of judgement? This ingenious interpretation is believed in by about two hundred thousand men in India and their number is increasing fast. Educated and illiterate alike appear to have been affected by the mediaeval doctrines of the promised Messiah, who struck the above interpretation. According to a tradition he was to descend from the fourth heaven to reclaim the Mohammadans from the clutches of Dajjal, a one-eyed infidel, riding an animal with a hoof covering more than an acre, and carrying Paradise on his right and Hell on his left. It has fallen to the lot of English and American clergy to undergo comparison with this stupendous sort of man. There wordly eye is undoubtedly very keen, but they have lost sight of the world to come. They ride an animal (animated with team) which occupies a large area. Those who come within their enchanted circle roll in luxury and wealth, and their enemies rest on the ends of bayonets. Whatever be the worth of that prophecy and the alleged queer fulfilment, the Mussalmans of this new sect are rendering great services to Islam. They are vehemently defending it against the attacks of many a bigoted Christian, who through ignorance of the fundamental principles of Islam evinces prejudice towards it. They are checking the onward rush of the airy Aryas, who trusting in the antiquity of their religion, which ought to have discouraged them, dare despise the comparatively young faith of the Mohammadans. They have undertaken to remove any objection that may be raised against the purity of Islam in the world. But for their clashing with this verse, "you have nothing to do with those who split up their religion and become a separate sect," they were likely to do immense good to their community.

There is no interpretation more left of the same verse

element results in a morbid state of body and mind, because only a sound body can contain a sound mind. Choler produces anger and animosity, a sanguine temper carries licentiousness and lustfulness, phlegm brings about sluggishness and indolence, and a melancholy disposition is attended with sadness and stinginess. In the moral sense, one governed by these evils is compared with a dead man and when he effaces these defects and frees himself entirely from their influence, he is said to be a living being, all virtues being quickened in him. Those who go to the length of explaining the meanings of this verse so dexterously, form another type of Mohammadans. Besides certain recognized sects, where belief in such interpretations is the chief factor of their faith, a sprinkling of such Mohammadans is found in every fraction of the moslem community. Some high class Maulvis and a few well-read Faqirs hold the same views. They mainly adhere *to the spirit rather than to the form of religion.* In their efforts to remove those specified evils they are prone to deaden those faculties altogether. The extremists turn recluses and sometimes lose their senses, walk naked and talk absurdly. As such insanity is often the consequence or rather the sequel of contemplation and abstinences, they are not uncommonly held as saints by the people, who gather round them in crowds, especially if the devotees have managed to keep their frenzy in control and are not drawn to the verge of madness Multitudes assemble with supplications to secure wealth, health, children and success in court. with the firm conviction that these will be readily accepted through their intercession. Some of them consider music as a great stimulus for the attainment of Divine knowledge. The musicians encircled by a gigantic audience, with certain holy men in their midst, play on guitars, harps, and tambourines. A peculiar tune touches the tender cord of some devotee's mind, who gives vent to bellowings, uttering praises of the Almighty, and violently swinging his head and hands in accompaniment to the music. Sometimes he is fastened to a big tree with face downwards and when the sacred seesaw moves to and fro, the audience rise in reverence. In addition to these people, Kadris, Chishtis, Naqshbandis and Sohrwardis are staunch supporters of the moslem mythology. However lofty the teachings of the original founders may be, their present followers hold low and degenerate views. Abdul Kadir of Gilan was a wealthy Mohammadan reformer, while his immediate followers as distinguished from the Mohamadans in general are mostly beggars and ascetics. Shahab-uddin of Sohrward was a rich moslem Philosopher

against the air in his court. The defendant is summoned but the plaintiff cannot brook its presence. The plaint therefore is dismissed *exparte*. Paradise is represented as teeming with fruits, flowers and streams of milk and honey. Costly radiant clothes, ornaments and jewels are at the disposal of its inmates. Gold and silver utensils are handed round from one to another. The *houries*, pure and chaste virgins with the charm of sublime beauty around them, are seated on embroidered sofas in stately palaces. Handsome boys serve as pages and valets. In fact physical enjoyments at their highest are the pastime of the righteous in Paradise. On the other hand, Hell is the scene of horrible punishments, torturing pains, deadly anguishes, disgusting food, loathsome drinks and incessant burnings. Even Spencer could hardly draw a parallel uglier than this. The Hell officers are most prompt in seeing that condign punishment is awarded to the doomed sinners. The frightful fire of Hell and the terrible torments of the grave are painted in very deep colours in the religious books and the people accept them quietly and resignedly. They believe in all sorts of superstitions that may be alleged to have the slightest touch of religion in them.

There is another interpretation of the same verse and those who have faith in that necessarily act according to the spirit running in that. The four birds are construed into cock, crow, peacock and pigeon, which have some peculiar characterstics of their own. The cock is obviously best personified. In a poultry house you will find one cock only among a dozen hens. The crow is notorious for its excessive greed. It picks up anything it catches sight of ; even soap is not safe left outside. The peacock is too proud of the splendour of its feathers. When its eyes fall on its legs, without feigning to perceive their ugliness, it cuts capers, flutters its tail and cocks its comb. The pigeon is too gregarious. They perch together, feed in flocks and are shot in quarries. Lust, greediness, vanity and excess of sociability are habits reprehensible in man. One possessed by these evils is deemed to be no better than a lifeless object, all the good qualities being dead in him. If he eradicates these four blemishes, new life comes in him, as if he were raised from the dead.

There is another explanation of the same verse. The four great constituents of nature are fire, water, earth and air, and their equivalents in man are choler, sanguine, melancholy and phlegm. Due mixture of these four temperaments is what is termed health, and increase or diminution in any one

too subtle for the drawing of any hard and fast line, resting on distinct constructions put upon a single verse of the Quran.

Abraham said, O Lord, show me how thou dost raise the dead ; God said, Dost thou not yet believe ; he answered, yea, but I ask this that my heart may rest at ease. God said, Take thou four birds and divide them; then lay a part of them on every mountain; then call them and they shall come swiftly unto thee : and know that God is mighty and wise.

That is a literal translation of the verse. Commentators have given it a garb which presents it in quite a different light. It has been a custom with our learned men to borrow copious traditions from the Jewish books and mix them with the original inseparably. This verse has also suffered the same fate. Abraham caught four birds, killed them, mingled their flesh and feathers, roasted them and placed their meat on the tops of a mountain. He held their heads in his hand and stood at the foot of the mountain beckoning to them Instantly each bird flew towards him and stuck to its own head, quick and alive. It was obviously a miracle meant to convince the inquisitive mind of the prophet of God's omnipotence.

A large majority of all classes of the Mohammadan community, without any distiction of Sunnyism Shiaism or Wahabyism implicitly believe in this interpretation. These people include moderately educated, half educated and uneducated numbers, who are guided by the Maulvis, given mostly to *the form rather than to the spirit of religion.*

The sermons delivered by them are always associated with supernatural stories regarding the prophets and the saints. The Heavens are supposed to be seven substantial strata inhabited by prophets, apostles, saints and angels with wings large enough to cover the sun. The Creator is considered to be residing in a place Utopia) above the seven heavens, with angels as attendants and gate-keepers. Solomon's court is a miniature of the Divine abode. Genii are always at his beck and call. They are able to accomplish any object superhuman. They annihilate the distance by "bringing the Sabean queen on her throne in a twinkle." Besides, the elements are under his yoke. The air carries his throne from place to place. He is also the sole monarch of the animal kingdom. Tiny creatures like mosquitos institute a suit

munion with God. Islam assumed a different attitude in these days of decadence, which were followed by the dismemberment of Tamerlane's dynasty and the consequent disintegration of their rule and religion. A period of temporal and spiritual anarchy ensued, which was the beginning of scepticism among the educated classes.

The attacks of the missionaries on the Islamic dogmas, the only vulnerable point in this religion, could hardly alienate the Mohammadans from their faith, because the comparative study of Islam and Christianity brought to light their respective drawbacks. There were mysteries in both the religions, which neither the Maulvis nor the Padres could accurately scrutinize. When the one pointed out the mote in the other's eye, the finger was raised to show him the beam in his own. The great danger which threatened to shake the very foundation of Islam came from another quarter. The new discoveries in physical science apparently did not conform with the established beliefs in the creation of the heavens and the earth and various other supernatural powers attributed to God and His chosen people. Either the one or the other must be wrong. But as science handled things tangibly, so to speak, and put them forward as simple axioms, an educated mind could as well doubt the rendering of two and two into four as find fault with the scientific truths. The introduction of western sciences and arts brought about a revolution in the spiritual current of thought, which was never experienced by the Indians before. In other countries, the parallels may be found in the times of Ghazali and Averoze, but an entirely new phase was disclosed in the history of religion in India. Though an overwhelming majority of the Indian Moslems still clings to the old exploded ideas regarding religion, there has grown up a wing among the cultured people who hesitate to take things as they are. The how and why of every tenet in religion has given rise to free inquiry and liberal research, by means of which knowledge has been disseminated among the wary public.

The Quran being the fountain head of moslem thought, various sects are founded on different interpretations of the same verses. Besides the two main divisions of Islam, Sunnis and Shias, who base their differences on certain outward and visible facts, and the four sub-sects of the Sunnis, who act upon the code dictated by the four famous Imams, there may be made another classification, though

burnt their ornaments, jewels, houses and even themselves to avoid the foreign "pollution;" but the formidable invasions of Mahmood and the mighty victories of Mohammad were too efficacious for the Hindu prestige to last any longer. The alien races began to come in hordes and the scrupulous Hindus finding their territories trampled under "unhallowed feet" ran to arms, killed the offenders, mutilated their bodies and buried them all together. They but slew the dragon and sowed its teeth, because ever armed warriors sprang up, who revenged their martyrs by seizing province after province and annexing state after state of India to their own empire.

The hardy Pathan founded his kingdom in India in a wonderfully short period. He brought about astonishing economic changes, but he "took one leap too many" and the sturdy moghal was over his head. The Moghal Empire become as glorious as that of Rome in her day. Babar and Humayun laid the foundation of that grand edifice which was completed by Akbar's ministers Akbar's mind was blank like a mirror. Mohammadanism, Christianity, Hinduism, sun-worship, fire-worship, were reflected on it in turn and the Emperor was a strong votary of that creed When their reflection was gone, his own image was cast on it. He posed then as a human-god and his creed was the conglomeration of all the heterogeneous sects inhabiting his kingdom. The commingling of all these religions manifested itself in architecture, legislature and scripture. The subsequent kings had to abide by this influence. Even the puritan emperor Alamgir was unable to divorce the foreign element from the faith which he adored with an orthodoxy only expected of an Omar or Othman. The imperial seraglio, where non-moslem queens did not play an unimportant part, exercised its own influence on the rulers and the ruled. The Hindu mythology with myriads of gods and goddesses and their supernatural attributes, lent its colour to Islam and gave it a theosophical aspect which appears in the forms of superstitious beliefs till the present day. The stoical notions of Aurangzeb gave place to the epicurean ideas of his successors, whose luxurious habits hastened the downfall of the Moghal Empire. Effeminating not ennobling poetry and music usurped the esteem formerly enjoyed by solemn subjects. Amorous poems were recited and not only the king and the court patronised them, but also the saints, the pillars of Islam, whose founder is said to have "no ear for music" fell into ecstasy and the tune of the harp and the beating of the drum became the means of their com-

and the enterprising governor of Yemen preferred to return to his native soil, rich in dates and palms Though his rule was of short duration, a considerable number of Indians were converted to Islam. The flood lays bare the tract which it inundates. The trees are uprooted, crops are destroyed and even animal life is not left uninjured. But when the fury of the storm is over and the damp gives place to dryness there springs up a world of "new leaf and new life.' Heavens of verdure burst out from the earth studded with the stars of fruits and flowers. No doubt the Arabs subdued the North-West of India with a high hand. The fertile valleys running along the rivers had invited them and the barren plains stretching across the country repulsed them. They deserted the land but the spirit they left behind gradually enlightened the people and the brave intelligent races of the Frontier became inspired with it.

In the days when the Hindu philosophy, anomalously combined with the vedic mythology, ruled supreme in Hindustan and the spirits of the thirty-three crores of gods moved on the surface of the sacred waters, one of the companions of the Prophet penetrated so far as Lahore and another of his venturous followers pierced the arid hills of Rajputana and settled in Ajmere. Several attempts were made to put out these beacons, but the waters were too disturbed and Providence wanted the storm-tossed people to steer their course by means of these lights. In the early period of Islam religion was considered synonymous with statesmanship and government. A saint was at once a warrior, a scholar, a politician and a ruler. Such luminaries attended with small bands of devoted followers traversed the length and breadth of India and "rode abroad redressing human wrongs," wherever a footing was secured, they dwelt there and exerted themselves to win the people to their side. At Moltan and elsewhere these religious knights established their dominions and held sway over the hearts of the people at least. In some places the antagonistic elements did not allow them to prolong their sojourn. They had to leave them. But as the grip leaves behind the fingers' mark, their hold on the minds survived, to fade and wane until another powerful influence renewed the old impression.

Later on began that series of incursions from the North-West the progress of which was impossible to be impeded by the decaying valour of the chivalrous Rajputs. Stubborn resistance was made, so much so that the Hindu matrons

emulate the other by having its "Punkahs" decorated more tastefully and artistically than the other's. The result of this competition ends in producing "Punkahs" which may be called models of the most exquisite workmanship in flowers. Till the afternoon of Friday the people are engaged wholeheartedly in different amusements and pastimes but by the evening they begin to dwindle in number in the same way as they had gathered together.

The chief characteristic of this floral fair is that it is called the white fair or the "Livla Mela" that is to-day it is the cleanest and the most fashionable fair throughout the length and breadth of India.

SYED BUNYAD HUSSAIN.

Islam in India

"The man Mahomet and that one century!

Is it not as if a spark had fallen on what looked dark unnoticeable sand? But lo! the sand proves explosive powder and blazes heaven high from Delhi to Granada". Thus Carlyle depicts curtly but emphatically the phenomena an aspect of which will be reproduced here.

During the same century, a caravan consisting of some zealous followers of the prophet, started to Cathay and along with "the higgling and bargaining of the market," persevered in preaching the gospel of the new faith, which did not fail to tell upon the philosophy of Confucius, and hundreds of thousands of the inhabitants of the Celestial Empire embraced the doctrines of Islam. When the religious storm, rising in Arabia, was advancing at a pace, which on account of its tremendous velocity is said to have a tinge of aggressive propagation in it, a Maharaja of Southern India spontaneously sent a deputation, with presents of ivory and diamonds, to the "land of the prophets," congratulating the new Apostle on his auspicious advent.

History, with intermittent beams of light, is there an impenetrable mass of darkness. Abul-Qasim invaded India and conquered the wild tribes of Sindh, but its vast sandy plains appeared no better than the deserts of Central Arabia

carts, of the middle class in hackney carriages, the aristocrats and well-to-do merchants in their fashionable carriages.

On Wednesday morning the endless chain of carriages packed with men is seen on the road to the Kutub. Those who cannot afford to pay for the hire of a cart at all, do not remain behind, but on the contrary start on foot and reach the Kutub visiting all the places that they pass on their way. The shopkeepers take their shops to the fair and it will not be an exaggeration if we say that the Owl reigns over the Chandni Chauck for these three days. By Wednesday noon the teeming populace of Delhi and the suburbs arrives at the Kutub and passes the three days of the fair in the ruins of the old buildings more joyfully than in their comfortable homes. The vocations of the people vary according to their interests and society. Some listen to the melodious sound produced by the brass cup of the water-carriers, others are enjoying the marvellous and wonderful diving feats of the swimmers in the famous tank of Altamash But the common motto of the Rich and the Poor alike becomes for these three days "Eat and be merry."

At last in the afternoon on Wednesday the Hindus come out in small processions from a water fall known as the "Phoolon ka Jharna' —the cataract of flowers ; and along with the processions there are musical instruments of various kinds. These processions are well compared with a grand wedding, but the place of the bridegroom is replaced by the "Punkahs" of flowers.

Every "Punkah" has its own procession and with each there is generally an English band and a party of Indian pipes vieing with each other in showing their extraordinary skill. These processions of the Hindu "Punkahs" pass along the "Bazar of the Fall of flowers" reaching at length their destination, the temple of Joga Maya, as if coming to offer their goddess a fan to keep off the intolerable heat of the rainy season.
On both sides of the bazar the people in their holiday dress behold the procession from the roof and galleries of the houses and bestow rewards on the musicians.

On Thursday the Muslims take their "Punkahs' to the tomb of their beloved saint the Khwa-ja Kutub and offer their present to the devotees of the tomb.

Although Hindus and Mussalmans join each other's "Punkahs" with equal enthusiasm, yet the one party wants to

interest to a student of antiquity. The fort of Rai Pithora, the tomb of Alauddin Khilji, the tower of Kutub and the Mausoleum of Altamash are worth visiting.

On the eastern side of the Kutub there is a very famous mosque known as the "Mosque of the Saints." Tradition says that twenty-two Saints have at one time or another said their prayers in this mosque and hence the name. Near the mosque there is a hillock near the base of which water was collected and sent out to various places round about by means of canals and falls. On the banks of the canals royal verandahs were made which still excite the interest of a traveller. The whole of this building goes by the name of "Jharna" Adjoining the Jharna there is a very well-known historical garden called "Amraiyan," *i. e.*, "the garden of the mangoes."

As regards climate the Kutub is considered to be the Sanatorium of Dehli.

The attraction for visitors is not based only on the interesting objects and healthy climate of the Kutub, but is also due to the objects of surpassing interest that are met in our way while covering the distance of eleven miles from Delhi. This long distance abounds with a chain of ancient ruins, the tombs of the once mighty Kings and nobles. These dilapidated buildings and tombs are as interesting to the traveller as they are admonitory. The two sides of the road contain so many interesting objects of antiquity that if we pass by once with the spirit of investigation we are sure to learn more than by reading hundreds of books of antiquity. The famous "Jantar-Mantar"—observatory, and the magnificent tomb of Safdar Jang, Vazir of Shah Alam II, cannot be passed unnoticed.

A little after the setting in of the monsoon, when all the tanks and pools in the Kutub are filled with water and the jungle on the way and around the Kutub becomes fresh and green the lively people of Dehli convene a meeting to raise a subscription and to fix the dates of the fair. Wednesday, Thursday and Friday are the days generally chosen. The success of the fair chiefly depends on the rains. If the rains are abundant and the sky well clouded from the city to the Kutub, the whole of the male population flocks to the Kutub imposing a heavy strain on the police to look after their property. People of the poorer class start for the fair in bullock

I do not propose to enter into details, to describe the anarchy, the revolts, the massacres, the plundering raids that took place in the times of the successors of Aurangzeb. The Mogal Empire was undergoing the same fate which her sisters the mighty Empires of Greece, Rome, Carthage and Babylon had undergone in past ages. But just as the flame of a lamp leaps up brilliantly before it dies out, the dying Mogal Empire revived in the reign of Mahomed Shah "Rangeela" (the Merry), The very word Rangeela indicates that in his time peace, pleasure and wealth were reigning supreme. It is therefore not far from the truth if we hold that the "Floral Fair" had its origin in the reign of this pleasure-loving monarch. The general consensus of the opinion of the old people of Delhi also attributes the origin of this fair to Mahomed Shah Rangeela.

Let us now move to the place where this most charming fair is held. Before giving a brief description of the place I should like to remark that nature has made the temperaments of the people of Delhi jovial and fond of natural beauty and scenery. In the ordinary overcast sky and after the fall of a slight shower of rain they go out directly to one of the many gardens such as the Kudsia and Roshan Ara gardens and other places of natural scenery. We shall soon notice how slight a pretext the people of Delhi seek for going in the rainy season to such a place as the Kutub or Mahroli.

The Kutub or Mahroli is situated at a distance of eleven miles from Delhi and is a very famous village. The reason of its being known as Kutub Sahib despite the tower of Shamsuddin Altamash is due to the tomb of a saint Khwaja Kutbuddin Babhtiar Kabi. Out of reverence for him this place is generally called the "Kutub Sahib." The Kutub should be regarded as the Delhi of Rai Pithora. It is not a place of interest for the Mussalmans alone but, it attracts the Hindus as well. The famous temple of Joga Maya is situated there. The natural scenery of this place is extremely fascinating. The chain of the Aravalli Mountains to the west of the Kutub augments its beauty In the rainy season the water of the pools passes through the Kutub plains to join the Jumna turning the desert into a verdant land.

A very big and grand looking tank was made by Shamsuddin Altamash around which the ruined buildings, the tombs of Saints, of Kings and of men of learning, afford deep

Papers of The Historical Society.

"THE DELHI FLOWER FAIR."

The famous floral fair is one of the surviving institutions of the Mogal Empire that are still celebrated with the zeal and energy of the past.

We are not aware that a fair of a similar sort is held in any other part of India, but Sheikh Abdul Kadir Sahib has compared it a short time ago with the "Battle of Flowers" held at Boulogne in France. The comparison, though far-fetched to a great extent, suggests a good point; and the point is this, that the Delhi Floral Fair must have sprung up at the time of entire peace, enormous wealth, and gross indulgence in pleasure. What France is now, Delhi once was. If the enormous wealth and ease-loving nature of the French gentry has resulted in instituting a fair known as the "Battle of Flowers," to appease their appetite for pleasure, it is not a matter for surprise that the gay dispositions of the Nawabs and Raises who rightly boasted to be the owners of incalculable wealth, should have given rise to a fair which would afford them pleasure to their hearts' content.

Therefore to investigate the approximate date of the fair is to find out the time of entire peace and immeasurable wealth.

But peace and wealth can very easily be found in the times of Shah Jehan and Aurangzeb and we can rightly guess that the fair might have originated in the times of one of those mighty Mogals. But the pages of history are utterly mute concerning the affair. And we know that the historians who then flourished were not bound to write one thing and omit another. If there existed such a fair as the "Floral fair" we should have had it mentioned in one history or another.

At the same time the orthodoxy and austerity of Aurangzeb are manifest to all of us. It was he who banished all dancing girls and musicians from out the boundaries of Delhi and prohibited them from coming in again on pain of death. This clearly indicates that the fair must have originated after the reign of Aurangzeb.

sunshine without excessive heat for several days together and that our nights remind us of Byron's "night of cloudless climes and starry skies," and your readers will understand the difference between early winter and early summer in England.

Thinking thus of the beauty amid which we live and of the glories with which kindly Nature each year afresh surrounds us, I cannot attempt to give you any account of our politics, for we are in the heat of a bitter controversy raised by the Government's Education Bill. I myself cannot understand, nor do I sympathise with either of the two sides to the religious quarrel, for it is not about education but rather about the kind of religious teaching to be given in our State Schools that the dispute really exists. There are so many different religions in this country that one would say the State should not allow any of them to be taught in the Schools. But none of the different religions will accept this solution of the problem. "Then" (the State might say to the religions) "come to some agreement among yourselves and that agreement shall be adopted as the solution of the difficulty." But the religious can't and won't agree among themselves. Hence the difficulty of finding some fair and workable scheme. But Time will tell. Magna est Veritas et praevalebit. I trust your readers will not think that religion in this country consists solely of quarrels. Let them if they have the chance read a book of short essays recently published by Mr. A. C. Benson, under the title "From a College window" and unless I am much mistaken they will agree with me in admiring Mr. Benson's quiet and kindly outlook upon life and they will understand that however much sects and ecclesiastical associations may fight and abuse each other, yet there are many men here to whom religion is a matter far above quarrelling about—to whom it means, in Mr. Benson's words, "the power, whatever it be, which makes a man choose what is hard rather than what is easy, what is lofty and noble rather than what is mean and selfish ; that puts courage into timorous hearts and gladness into clouded spirits ; that consoles men in grief, misfortune and disappointment ; that makes them joyfully accept a heavy burden ; that in a word uplifts men out of the dominion of material things and sets their feet in a purer and simpler region."

I am dear Mr. Editor,

Yours &c.

G. P. GOODALL.

school at Aligarh which is supported and controlled by the private enterprise of Mohamedan gentlemen from all parts of India.................. ... Undoubtly such institutions must materially affect the formation of character in future generations."

I said that in two ways the College had been brought to our notice recently. My other reference is to an article published in the April number of the Quarterly Review and written by the late Head of the College, Mr. Morison. The title of his article is 'an Indian' Renaissance,' and in it Mr. Morison gives an account of the ideals and aims of Sir Syed Ahmad, and of the way in which those aims have been and are being worked out in Aligarh. Of Sir Syed himself Mr. Morison says "neither in England nor in India have I met any man who inspired me with so strong a feeling of reverence." The publication of this article comes at a very opportune moment, when we have all been hearing so much of India because of the Prince's visit, and it is sure to be read by many people. The College is to be congratulated upon having Mr. Morison's pen at its service in England.

When I wrote my first letter to the 'Monthly' last November I remember that I painted a very gloomy picture of our English climate. I must now in fairness, just half a year later, say something on the other side ; for this present week and the next few weeks are the most beautiful part of the year. The trees, after their long winter without leaves, are now, one might almost say, hidden by leaves. The lovely may blossom with the laburnum, lilac, rowan blossom, and here and there a deep-coloured *rhododendron* makes a picture of so many beautiful colours and delicate shapes that one almost enjoys half an hour's walk as much as a week's holiday at any other time of year. Now too cricket, our great national game, is in full swing and it would perhaps be difficult for men of other countries to appreciate the extent to which the game is played and the still greater extent to which it rouses interest even with those who do not themselves play. Most people here follow in the newspapers the doings of the cricket teams representing their own counties. Other outdoor games have also started, tennis and croquet -and this year there seems to be a revival of Badminton. Add to all this that our days are about twice as long as in November, that very often we have bright

thank H. H. the Lieutenant-Governor for Rs. 20,000, half of which is to be devoted to the Library. This most acceptable grant together with the annual allowance in the College Budget should help us to put the Library in a very satisfactory condition indeed.

The Duty Society has arranged for five tours to be undertaken during the coming Vacation. The first deputation will tour in the Northern parts of the Punjab, Tasadduq Ahmad being the Secretary; the second in the Southern Punjab; Md.Jamiluddin being the Secretary for this tour. Sindh is to be visited by a third deputation under Ziaul Islam; while Mohammad Akram Khan is Secretary of the deputation which is to work in the Agra Division. Finally Gwalior and other states are to be visited and for this tour Zahur Ahmad is in charge of the arrangements

---

Letters from England, No. 4.

31st May, 1906.

DEAR MR EDITOR,

Let me first say how glad I am that during the last few weeks the College has in two ways been brought prominently to the notice of English people. Your readers will doubtless have heard through the newspapers of the reference made to the College by His Royal Highness the Prince of Wales in the speech he delivered in London at an entertainment given by the Corporation of that City to welcome the Prince and Princess upon their return to England. In the course of this speech, which was reported in all our newspapers and which would thus be very widely read, the Prince gave a most interesting account of his journeys in India and among other matters, which had attracted his attention, he referred to education. I will quote his words so that they may be preserved in the pages of the 'Monthly.'

> " Having seen several colleges and other educational institutions in different parts of India (said the Prince) I gained some slight idea of the efforts which are being made to place within the reach of all classes a liberal education Let me take as an example the great Mohamedan college and

stand the utter apathy and indifference which the young Mohammadan of to day shows. The absence of competitors for this prize is insignificant in itself, but it shews the prevailing tendency. On almost every hand we hear the same complaint, *viz*, that the students do not show that keenness in their work and in their recreations which those connected with Aligarh have grown accustomed to expect. There is a slackness—not by any means entirely due to the season—both physical and mental. Members of the College are far too fond of loafing idly about in the evening, or even of lying absolutely idle on their beds. A great and serious responsibility rests on the Aligarh student of to-day. On him the reputation of the College lies, and according as he is a credit to the College or the reverse so will the fame of the College wax or wane.

Again we have to record that the month has been very, very quiet so far as building has been concerned. A new temporary bungalow for school classrooms is our most crying need. Some bricks and kunkur have been piled on the site selected, but, although a crisis will occur in October if there is no more room than at present, absolutely nothing else has been done for a fortnight. We hope that the building Committee will not think it impertinent if we suggest that a "building programme" be drawn up, indicating the lines on which the College buildings should be increased and improved, and providing for a definite quantity of work to be taken in hand *and finished* each year. At present the zeal and energy shewn are great, but much effort is wasted because the programme is not definite and clear. There are many buildings which require finishing ; there are others which require repairing, and there is future expansion to be allowed for, *e. g.*, more classrooms for the school, and more bungalows for the staff.

The teaching difficulty, like the poor, is ever with us. Again the numbers of the classes are increasing while the staff remains the same. Among the disadvantages of too large classes is the fact that the pupil cannot get good value for his money. The advantage possessed by the member of a small class is peculiarly noticeable. He makes more rapid progress and at the same time has a better knowledge of what he has been taught than his fellow in the large class.

The generosity of the Government of the United Provinces is again manifest. This time the College has to

The Aligarh Monthly

July, 1906.

College Notes.

The month of June rarely brings anything very exciting. So far dust storms have been the chief class of event, but they have come so often and remained so long that now they are looked upon as a regular event of the day, and are almost as much a part of the programme as the lectures. Luckily no great harm has been done by them, though on the night of June 11th a tree in the kachha court was blown down.

The Monthly 'Aggregate' Prize for Tent-pegging for May was won by Ghulam Akbar who rode well and took his pegs in good style. A distinct improvement in the riding and nerve of the ordinary competitor has been noticed already, and it is to be regretted that more do not take part in this kind of contest. The aggregate prize for this month will be given after three rounds, one of which will take place in July, in order that interest may be maintained to the end of the term.

The Hockey Team went on tour to the Hills at the end of May and seem to have had a very good time. A detailed account of their matches is published in this number.

The offer of a prize of Rs. ten for the best article on a subject of Mohammadan interest has drawn only one article. The author is Mohammad Hosain Khan, B. A. and his article is published in this number. It is hard to under-

نمبر	اگست سنہ ۱۹۰۶ع	جلد

مجنوں کی قبر

ہمارے ایشیائی شاعروں کے فرضی عشق بازی کا سب سے بڑا نمونہ لیلے اور مجنوں کا واقعہ ہے اور نوآموز سے نوآموز شاعر بھی اپنے اشعار میں انکا تذکرہ ضرور کرتا ہے۔ یوسفؑ زلیخا۔ شیریں و فرہاد۔ عذرا، و وامق کے عشق کی داستانیں بھی اگرچہ بہت مشہور ہیں لیکن میاں مجنوں ان سب کے پیر مغاں مانے جاتے ہیں۔

اہل دنیا کا یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی کسی بات میں کمال حاصل کرتا ہے تو اُسکے ثبوت کمال کے لیے اُس کی طرف ایسے قصے اور روایتیں منسوب کرتے ہیں جو بے بنیاد ہوتی ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے جہلا امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ اور بیربل کو ایک اعلیٰ درجہ کا ظریف سمجھکر اُنکی طرف عجیب عجیب روایتیں منسوب کرتے ہیں۔

کچھ ہندوستان ہی کی خصوصیت نہیں ہے۔ بلکہ ہر مقام پر دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ ہومر یونان کے مشہور شاعر نے الیڈ کی جب نظم لکھی تو وہ بیحد مقبول ہوئی۔ اُسکے بعد

لوگوں نے جو نظمیں جنگی جوش و خروش کی لکھیں اُسی کی طرف منسوب کردیں۔ جسکی وجہ سے بعض لوگوں نے بعد میں بالکل انکار کردیا کہ ہومر کوئی شخص ہی نہیں تھا۔ یہی حال عرب میں مجنون عامری کا ہوا۔ چونکہ اُسکے عشق کی عجیب و غریب داستان سے بچہ بچہ آشنا تھا۔ اور سب کو دلچسپی ہوتی تھی اسلیے عشقبازی کا کوئی دلچسپ لطیفہ اگر کسیکو ملجاتا تو مجنون عامری کی طرف منسوب کردیتا۔

یہی وجہ ہو کہ مورخین نے جب اُسکے بعض اخبار اور واقعات کو بالکل بے بنیاد پایا تو انکار کردیا کہ مجنوں کوئی شخص ہی نہ تھا۔ لیکن اسکے سوا مجنوں سے انکار کرنے کی ایک صورت اور بھی تھی۔ مجنوں نے عشقبازی میں چونکہ اپنی عمر بسر کی۔ اور ایک دشمن قبیلہ کی لڑکی پر وہ عاشق ہوا جو دونوں اعتبار سے بنی عامر کے سپاہیانہ قبیلہ کے لیے ایک ننگ و عار کی بات تھی اسلیے اُنھوں نے اپنی ننگ مٹانے کے لیے صاف انکار کردیا کہ ہمارے قبیلہ میں مجنوں کوئی آدمی نہیں ہوا۔ اور "ہم لوگ سخت دل اور جگر رکھتے ہیں جسکے ملائم کرنے کی طاقت نسوانی حسن میں نہیں رکھی گئی ہی" مگر حقیقت اور وقعیت پر کہانتک کوئی پردہ ڈال سکتا ہی اور پھر ایسے واقعہ میں جو کہ عجائبات دُنیا میں سے ہو۔ آخر یہ قصہ مشہور ہوکے رہا۔

میں یہ ضرور کہونگا کہ بعض روایتیں جو مجنوں کی طرف منسوب کی جاتی ہیں وہ لوگونکی من گھڑت ہیں لیکن بیشتر ایسی بھی ہیں جو سچی معلوم ہوتی ہیں۔ میں عربی لٹریچر کی مستند اور تاریخوں سے اُسکے سچے اور واقعی حالات اور اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں۔ جس روایت کی نسبت مجکو ذرا بھی شبہ ہوا ہی میں نے اُسکو چھوڑ دیا ہی۔

اس مضمون میں مجکو مجنوں کے تاریخی حالات سے زیادہ بحث نہیں ہی اور نہ میں اُسکی سوانح عمری لکھنا چاہتا بلکہ صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اُس عاشقوں کے پیر مغان اور شیدائیوں کے گرو گھنٹال نے اپنے سچے اور حقیقی عاشقانہ جذبات اور خیالات کو کس انداز سے ادا کیا ہے۔ اور ہمارے ایشیائی شعرا اپنی فرضی عشقبازی کے خیالات کو کس انداز سے ادا کرتے ہیں

یہ انسوس ہی کہ عربی اشعار کے ترجمے سے اُن کی اصلی کیفیت نہیں معلوم ہو سکتی - اور نہ اُن کی خوبیوں پر کافی روشنی پڑ سکتی ہی - صرف اتنا معلوم ہو جائیگا کہ شعر کا مضمون یا مطلب کیا ہی بہت سی خوبیاں شعر میں ایسی ہوتی ہیں جو خصوصیت کے ساتھہ زبان ہی سے وابستہ ہوتی ہیں - اور جب غیر زبان میں اُسکا ترجمہ کیا جاتا ہی تو اُس کی یہی کیفیت ہو جاتی ہی جیسے کسی حسین عورت کے زیورات اُتار لیے جائیں - خود اُردو میں دیکھئے - داغ کا شعر ہی -

ڈہلا سارا بدن سلچے میں گویا　　　ذرا اُترا نہیں ظالم کہیں سے

اس شعر میں خوبی صرف اُترا کے لفظ میں ہی - اگر اسکا ترجمہ دوسرے لفظوں میں کر دیجئے تو کوئی بات ہی شعر میں نہیں رہجاتی -

لیکن خوش مذاق لوگ صرف مضمون کو دیکھکر اسی طرح اسکا اپنی شاعری سے مقابلہ کر سکتے ہیں - جس طرح کہ اضافی زیب و زینت سے قطع نظر کر کے مختلف مقامات کے حسن کا مقابلہ کیا جا سکتا ہی -

افسوس کہ ہم مجنوں کے واقعات زندگی کو اس مضمون میں پورا نہیں لکھ سکتے - کیونکہ اُسکے لیے ایک طولانی دفتر درکار ہی - صرف چند واقعات کو لکھیں گے جنسے اُس کی شاعری پر روشنی پڑ سکتی ہی -

مجنوں یا قیس کے نام سے ہم میں سے کون شخص ہی جو آشنا نہیں ہی - لیکن غالباً یہ امر بہت کم لوگ جانتے ہونگے کہ وہ بہت بڑا شاعر بھی تھا -

شاعری ایک عمارت ہی جس کی بنیاد انسان کے فطرتی جذبات پر قائم ہی - جس شخص کے جسقدر جذبات قوی ہونگے اُسیقدر اُس کی شاعری کی بنیاد پائدار ہو گی - مجنوں چونکہ عشق کے انتہائے درجہ فنا فی المعشوق تک پہونچگیا تھا - اسلیے اُسکے عاشقانہ جذبات نہایت بلند ہیں - اور اُسکے اشعار اُسکے عشقیہ خیالات کی اصلی تصویر معلوم ہوتے ہیں - بخلاف اسکے ہمارے

یہاں کے فرمائشی غزل گو جو مشاعرہ کے لیے مرے دل سے اشعار کھکر لاتے ہیں چونکہ اُنکے عشق کا جذبہ بالکل مصنوعی ہوتا ہے اسلیے اُنکے اشعار بھی مصنوعی معلوم ہوتے ہیں اور وقعیت کا شائبہ بھی نہیں رکھتے -

مجنوں کا اصلی نام قیس ہے - اسکے باپ کا نام ملوح تھا جو قبیلہ بنی عامر کا ایک معزز سردار تھا قیس کو چونکہ لیلےٰ کے ساتھ بہت ہی گہرا عشق تھا جس میں وہ مستغرق رہتا تھا - اس لیے اُسکو مجنوں کہنے لگے ورنہ درصل وہ مجنوں نہ تھا - بلکہ ایک عقلمند اور بہادر نوجوان تھا -

لیلےٰ بھی اسی کے قبیلہ کی دوسری شاخ کی ایک حسین لڑکی تھی - اُسکے باپ کا نام مہدی تھا جو اپنے کنبہ کا سردار تھا - اور قیس کے باپ ملوح کے ساتھ اسکا مقابلہ رہا کرتا تھا -

لیلےٰ کا حُسن غیر معمولی نہ تھا - لیکن نہیں معلوم قیس کو کیا بات اُس میں نظر آگئی تھی جو اسدرجہ تک اُسکا عشق پہونچا - سچ ہے -

یہ سب بالکل غلط ہے حور اچھی ہے پری اچھی　　　بشر کے دل میں جو صورت سما جاوے ہی اچھی

عرب میں چھوٹے لڑکے لڑکیاں بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے - اور یہ ایسی عام بات تھی کہ امیر غریب کی اس میں امتیاز نہ تھی - چنانچہ بچپن میں قیس اور لیلےٰ بھی ساتھ ہی بکریاں چراتے تھے اُسیوقت سے اُنکے دلوں میں عشق کا بیج پڑا - مجنوں بعد میں اُس زمانہ کی یاد تازہ کرکے اکثر رویا کرتا تھا - اُسکا ایک شعر ہے -

صغیرین نرعی البھم یالیت اننا　　　الی الیوم لو نکبر ولو تکبر البھم

ہم دونوں بچپن میں چوپائے چرایا کرتے تھے کاش　　　ہم ابتک نہ بڑے ہوتے اور نہ چوپائے

ایک بار کا قصہ ہے کہ چند نوجوانوں نے مجنوں کو تنگ کیا کہ وہ اذان کہے - مجبوراً بیچارہ اذان کہنے کھڑا ہوگیا - تو جہاں حی علی الصلوٰۃ (نماز کے لیے آؤ) کہنا چاہیے وہاں حی علی البھم (چوپایوں کے چرانے کے لیے آؤ) کہا - جب لوگوں نے اعتراض کیا تو معذرت کی اور کہا کہ کیا کروں بے اختیار زبان سے نکل گیا -

مجنوں ایک شریف پاکباز اور سچا عاشق تھا۔ عشق نے جہاں انسانی خوبیاں اُس سے چھین لی تھیں وہاں طبعی بُرائیوں کو بھی اُس سے سلب کر لیا تھا۔ اور تمام روحانی اور طبعی جذبات کو مار کر عشق نے خود اپنا تسلط جما لیا تھا۔

عام گفتگو خواہ کسی قسم کی ہو اُسکو بھلی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جس وقت لیلےٰ کا تذکرہ کوئی کرے تو بڑے شوق سے متوجہ ہوتا تھا۔ اور اُس کی عقل بالکل ٹھکانے ہوجاتی تھی۔ چنانچہ بعض لوگ کہتے تھے کہ یہ بنا ہوا ہی مجنوں نہیں ہی۔ ورنہ کیا وجہ ہی کہ ہر حال میں اسکو جنون رہتا ہی اور لیلےٰ کے ذکر میں اچھا خاصا عقلمند ہوجاتا ہی۔ اُسکا جواب مجنوں نے ان شعروں میں دیا ہی۔

وقالوا صحیح مابہ طیف جنۃ   ولا الھم الا بافتراء التکذب

لوگ کہتے ہیں کہ وہ بالکل تندرست ہی اُسکو جنون نہیں ہے   اور نہ رنج ہی بلکہ یہ سب جھوٹا افترا ہے

وشاھد وجدی دمع عینی وحبھا   برای اللحم عن احناء عظمی ومنکبی

میرے عشق کا گواہ میری آنکھوں کا آنسو ہی اور محبت نے میری ہڈیوں اور بازؤنکے گوشت کو گھلا دیا ہے،

مجنوں کے عشق کی ابتدائی حالت میں لوگوں کو یہ گمان تھا کہ کسی سخت اندرونی مرض میں وہ مبتلا ہوگیا ہی۔ جسکی وجہ سے دن بدن اُسکی حالت خراب ہوتی جاتی ہی۔ بہت کچھ علاج معالجہ بھی ہوا۔ لیکن کیا فائدہ ہوا مجنوں نے کہا۔

وقالوا بہ داء عیا عاصا بہ   وقد علمت نفسی مکان دوائیا

لوگ کہتے ہیں کہ اُسکو کوئی سخت بیماری لاحق ہوگئی ہے   آہ۔ اُسکا علاج خود میں ہی جانتا ہوں

مجنوں کے عشق کی حالت دیکھتے ہوئے یہ گمان ہوتا ہی کہ عشق کوئی نفسانی مرض نہیں ہی بلکہ ایک تقدیری امر ہی جو عاشق خدا کے یہاں سے اپنے ساتھ لاتا ہی۔ مجنوں کو بھی طعنہ زنوں نے کہا کہ اسکی عاشقی رگ شہوانی کا جوش ہی۔ جس پر اُسنے ایک قصیدہ کہا جسکا پہلا شعر یہ ہی۔

الا ایھا القلب الذی لج ھائما   ولیدا بلیلی لم تقطع تمائمہ

میں لیلیٰ کے عشق کے بھنور میں اُسوقت پھنس گیا تھا جبکہ بچہ تھا اور میرے گلے کے تعویذ بھی نہیں کٹے تھے

اُسکے سچے عشق نے لیلےٰ کے دل میں بھی پورا اثر پیدا کیا تھا۔ وہ بھی اُسپر اُسیقدر فدا تھی جسقدر وہ لیلےٰ پر تھا۔ لیکن فرق یہ تھا کہ وہ مجبوریوں میں گرفتار تھی اور اپنے عشق کا اظہار نہیں کرسکتی تھی۔ ایک مرتبہ مجنوں کا اُسکے مکان کی طرف سے گذر ہوا۔ لیلےٰ اپنی کئی سہیلیوں کے ہمراہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مجنوں کو اُسنے بلایا یہ جاکر بیٹھ گیا۔ اور باتیں کرتا رہا۔ اتفاقاً ایک شخص آیا لیلےٰ نے الگ اُٹھکر اُس سے کچھ دیر تک بات کی۔ مجنوں کو سخت ناگوار گذرا۔ کیونکہ اُسنے سمجھا کہ لیلےٰ کے دل میں شاید میری محبت کم ہے۔ لیلیٰ نے اُسکے چہرہ سے اُسکی حالت سمجھ لی۔ اور فی البدیہ یہ دو شعر کہے۔

کلانا مظہر للناس بغضا — وکل عند صاحبہ مکین

ہم دونوں لوگوں سے متنفر ہیں — اور ہر ایک کا دل دوسرے کے پاس ہے

تبلغنا العیون بما اردنا — وفی القلبین ثم ہوی دفین

ہماری نگاہیں آپس میں پیغام رسانی کرلیتی ہیں — اور دلوں میں عشق مخفی ہے

مجنوں یہ معلوم کرکے کہ اُسکے معشوق کے دل میں بھی اُسکی محبت ہے بیہوش ہوکے گر پڑا۔
بعض مضامین مجنوں نے ایسے پیدا کیے ہیں جو ہماری شاعری میں بھی بڑی مقبولیت حاصل کیے ہوئے مثلاً اُسکا ایک شعر ہے۔

وانی لینسینی لقاؤک کلما — یقتل یوماً ان ابثک ما بیا

جب میں تجکو دیکھتا ہوں تو اپنے — اظہار حال کو بالکل بھول جاتا ہوں

تم دیکھو گے کہ اُردو شاعروں نے جابجا اس مضمون کو لیا ہے۔

جب مجنوں کی حالت زیادہ ردی ہوگئی تو اُسکے باپ کو لوگوں نے مشورہ دیا کہ تم اپنے بیٹے کو کعبہ میں لیجاؤ وہاں دعا مانگے تو شاید اللہ تعالیٰ رحم کردے۔ وہ مجنوں کو لیکر چلا۔ جب کعبہ میں آئے تو اُسکے ہاتھ میں کعبہ کا پردہ پکڑا دیا اور کہا کہ اللہ سے دعا کرکہ وہ لیلےٰ کی محبت تیرے دل سے دور کردے۔ مجنوں اُس پردے کو پکڑکے خوب رویا اور دعا کی کہ اے لیلےٰ کے

حسن پیدا کرنے والے تو اُس کی محبت کو میرے دل میں بڑہا دے۔ اور دن بدن میرے عشق کو زیادہ کرتا رہ۔ وہاں سے لوگ مایوس ہو کر نکلے رات کو کسی نے منزل پر ایک عورت کو جسکا نام لیلےٰ تھا زور سے پکارا۔ مجنوں یہ نام سنکر چونک اُٹھا۔ اور روتے روتے آنسو کے دریا بہا دیے۔ اسوقت لیلےٰ کی یاد میں اُسنے ایک پوری غزل کہہ ڈالی اُس میں سے ایک شعر یہ ہی۔

دعا باسم لیلےٰ غیرھا فکانما — اطار بلیلےٰ طائرًا کان فی صدری

غیر کو اُس نے لیلےٰ کے نام سے پکارا — گویا میرے سینہ میں ایک چڑیا تھی جسکو اڑا دیا

یہ مضمون دلچسپ اور باریک ہی اور جس موقع پر کہا گیا ہی اُس کی اصلی تصویر سامنے پیش کر دیتا ہی۔

اسکے بعد مکہ کے پہاڑوں میں سرگشتہ اور آوارہ پھرنے لگا۔ اُسکے باپ نے جاکر کہا کہ چلو تم کو مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر لیچلیں شاید وہاں سے مقصد براری ہو۔ مجنوں بہت خوش ہوا اور کہا کہ ہاں چلیے شاید وہاں نجد کی جانب سے نسیم لیلےٰ کی خوشبو لاے۔

ایک مرتبہ آوارہ پھرتا پھرتا ایک پہاڑ پر پہونچا جو طائف کے قریب تھا۔ وہاں چند لوگوں نے اُسکو دیکھا اُن میں سے ایک صاحب نجد سے آے ہوے تھے۔ لوگوں نے مجنوں سے کہا کہ فلاں شخص نجد سے آیا ہی۔ وہ آکر اُس سے لپٹ گیا۔ نجد کے پہاڑوں میدانوں۔ محلوں۔ قبیلوں اور مکانوں کی ایک ایک کر کے کیفیت پوچھتا تھا۔ اور بیقراری سے روتا تھا۔ اُسوقت جو اشعار اُسنے کہے ہیں اُن میں سے چند شعر ہم نقل کرتے ہیں۔

ایا الیمت شعری عن عوارضتی قبا — بطول اللیالی ھل تغیرنا بعدی

کاش مجکو قبا کے دونوں کناروں کی حالت معلوم ہوتی کہ کیا بہت زمانہ گذرنیسے میرے بعد انمیں تغیر آگیا ہی

وھل جار تانا بانشیل الی الحمی — علیٰ عھد نا ام لم تدم علی العھد

کیا ہمارے پڑوسی نیشل سے حمّا تک اپنے عہد پر ہیں یا نہیں

وعن علویات الریاح اذا جرت	بریح الخزامی ھل تھب علی نجد
بنی خزام کی جانب سے پہاڑ کی چوٹیوں پر سے	جو ہوا آتی ہو کیا وہ نجد پر گذرتی ہے؟

اسی طرح ہر ایک چیز کو یاد کرکے وہ روتا ہو۔ یہی وہ اصلی خیالات ہیں جو ایک محبت بھرے دل میں جدائی کی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔

جدائی اور مفارقت کے مضمون کو عربی میں جس خوبی سے ابی قطیفہ نے ادا کیا ہے۔ اس سے بہتر کوئی ادا نہیں کرسکا۔ اسکے اشعار ہیں تو بہت سادے لیکن طبیعت پر اُن کا عجیب برقی اثر پڑتا ہو۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہو کہ بنی زہرہ کی ایک لڑکی بنی عبد شمس کے ایک نوجوان کے ساتھ بیاہی گئی۔ لڑکی کو شوہر نے اپنے وطن یعنی شام میں لیجانا چاہا۔ لڑکی راضی نہ تھی۔ وہ اپنے وطن کو چھوڑنا گوارا نہ کرتی تھی۔ لیکن اُسکے ماں باپ مجبور تھے۔ آخر اُن کو رخصتی کرنی پڑی۔ لڑکی بیچاری درد و غم میں بھری ہوئی اونٹ کے کجاوہ پر طرح طرح کے تفکرات کرتی ہوئی قافلہ کے ساتھ چلی مکہ سے نکلکر پہلی ہی منزل پر کسی نے ابی قطیفہ کے اشعار پڑھنے شروع کیے۔

الا لیت شعری ھل تغیر بعدنا	جنوب المصلی ام کعھد القرائن

کاش میں جانتا کہ میرے بعد مصلے کی سمتیں بدل جائیں گی یا بحال رہیں گی؟

آگے چلکر یہ شعر ہو۔

اذا برقت نحو الحجاز سحابۃ	دعا الشوق منی برقھا المتیامن
جب حجاز کی جانب کوئی بدلی چمکتی ہے	تو میرا شوق اُسکی مبارک بجلی کا آرزومند ہوتا ہے

آخر میں کہتا ہو۔

احن لتلک الوجوہ صبابۃ	کانی اسیر فی السلاسل راھن
میں محبت سے اُنکے چہرہ کی طرف دیکھتا جاتا ہوں +	گویا زنجیروں میں جکڑا ہوا چل رہا ہوں

یہ اشعار دردناک سُنکر اُس لڑکی پر ایسا اثر ہوا کہ بیہوش ہوکر گر پڑی۔ اور تھوڑی دیر

میں جان نکل گئی۔ یہ لڑکی عبد الرحمٰن بن عوف کی پوتی تھی اور اسکا نام حمیدہ تھا۔

اصمعی عربی کا مشہور ادیب بنی عامر کے ایک شخص سے ملا۔ کہا کہ اگر تم کو مجنوں کے کچھ اشعار یاد ہوں تو سناؤ۔ اُسنے دو چار شعر سنائے۔ کہا اور یاد ہوں تو سناؤ۔ اُسنے اور بھی دو چار سنا دئے۔ پھر اصرار کیا۔ اسنے یہ دو شعر سنائے۔

لو ان لك الدنيا وما عدلت بہ | سواها و ليلى حائن عنك بينها
لكنت الى ليلى فقيراً وانما | يقود اليها ود نفسك حينها

یعنی اگر ایک طرف دنیا اور اُس کی تمام دولت رکھی جائے اور ایک طرف لیلےٰ ہو تو میں فقر کو پسند کرونگا اور بڑی خوشی سے لیلیٰ کو اختیار کرونگا۔

اصمعی نے اور بھی فرمایش کی۔ اُسنے کہا کہ بس ہمارے مجنوں کے یہ اشعار بہت کافی ہیں اور تمہارے سو عقلمندوں کے اشعار سے انکا پلہ بھاری ہے۔

ایک مرتبہ مجنوں کا قبیلہ وادی القرے کو جا رہا تھا۔ مجنوں بھی ساتھ تھا۔ اُس زمانہ میں عشق آہستہ آہستہ جنوں کی طرف ترقی کر رہا تھا۔ رستہ میں نعمان کی دونوں پہاڑیاں نظر آئیں۔ لوگوں نے مجنوں سے کہا کہ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں لیلےٰ کبھی کبھی اُترا کرتی تھی۔ اُسنے پوچھا بتاؤ اُسطرف سے کونسی ہوا آتی ہے۔ لوگوں نے کہا بادِ صبا (پچھوا ہوا) مجنوں نے کہا واللہ اب میں یہانسے نہیں جاؤنگا تاوقتیکہ نعمان کے پہاڑیوں کی باد صبا یہانسے نہ گذرے۔ آخر تین دن تک وہیں سارا قافلہ پڑا رہا۔ اور تیسرے دن جب باد صبا چلی تو وہانسے کوچ کیا۔ مجنوں نے اُس موقع پر جو اشعار کہے اُن میں سے دو تین شعر یہ ہیں۔

ایا جبلی نعمان باللہ خلیا | نسیم الصبا یخلص الی نسیمها
اے نعمان کے دونوں پہاڑو | باد صبا کو رستہ دیدو کہ اُسکی نسیم مجھ تک آئے
اجد بردها او تشف منی حرارة | على كبد لم يبق الا صميمها
اُس سے مجکو ٹھنڈک ملے۔ | اور میرے سوز جگر کو تشفی ہو جائے

فان الصبا ریح اذا ما تنسمت　　علی نفس محزون تجلت ھمومھا

کیونکہ صبا وہ ہوا ہی کہ جب غمگین لوگوں پر گذرتی ہے تو غم کو مٹا دیتی ہے۔

معشوق کی بے توجہی کا شکوہ عاشقوں کے لیے ایک لازمی امر ہی۔ خواہ وہ کتنے ہی مدارات کیوں نہ کرے۔ گو لیلٰے اپنے حتی الوسع مجنوں کو فراموش نہیں کرتی تھی اور جب وہ جوش وحشت میں اُسکے قبیلہ کی طرف نکل جاتا تھا تو وہ ضرور بلاتی تھی۔ اور گھنٹوں شکوے شکایت کی باتیں ہوتی تھیں۔ مگر پھر بھی مجنوں نے اُسی کے سامنے ایک دن یہ شعر پڑھا۔

اطعتھا وعصیت الناس کلھم　　فی امرھا وھوا ھا دھی تعصینی

جس کی دوستی اور محبت میں میں نے سب سے دشمنی کی وہی مجھسے نفرت رکھتی ہے

لیلےٰ نے کہا کہ تم نے مجکو بدنام کر دیا ہی۔ تم کہتے پھرتے ہو کہ میں نے اُسکے لیے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ گھر بار کو ترک کر دیا اور مجنوں ہو گیا۔ للہ تم اپنے حال پر نہیں بلکہ میرے حال پر رحم کرو۔ اور استقلال سے کام لو۔ لیلےٰ نے چند اشعار بھی پڑھے۔ آخری شعر یہ ہی۔

فلو کان قول یکلم الجلد قد بدا　　بجلدی من قول الوشاۃ کلوم

اگر کسی بات کا زخم جلد بدن پر ظاہر ہوتا تو　　ملامت کرنیوالوں کی باتوں کے بہت سے زخم میری جلد پر نظر آتے

یعنی تیرے عشق کیوجہ سے لوگوں نے مجھپر بیحد تیر ملامت کی بوچھار کی ہی۔ مجنوں نے کہا

قالت جننت علی ایش فقلت لھا　　الحب اعظم مما بالمجانین

اُسنے کہا تجکو کس بات پر جنوں ہو گیا ہے　　میں نے کہا کہ محبت جنوں سے بڑھکر ہے

الحب لیس یفیق الدھر صاحبہ　　وانما یصرع المجنون بالحین

عاشق کو کبھی افاقہ نہیں ہوتا　　اور مجنوں کا جنوں تو تھوڑی دیر رہتا ہی

شب ہجر عاشقوں کی کالی بلا ہی طرح طرح سے شعرا نے اسکی تکلیف کے مضامین باندھے ہیں۔ مجنوں نے کہا ہی

اقضی نھاری بالحدیث وبالمنی　　ویجمعنی والھم باللیل جامع

دن تو میں امیدوں اور باتوں میں گذار دیتا ہوں　　لیکن رات کو صرف میں ہوتا ہوں اور تیرا غم

شب ہجر کی درازی کی شکایتیں بھی شعراء کے فرائض میں داخل ہیں۔ ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ مجنوں نے اس ضروری امر کو چھوڑ دیا۔ لیکن اُسکے اشعار جو اُسکے دیوان اور مختلف کتابوں کی چھان بین سے مل سکے ہیں اُن میں شب ہجر کی درازی کا مضمون نہیں ملا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ مجنوں کے تمام اشعار واقعات سے متعلق ہیں۔ غالباً اُسکو شب وعدہ کے انتظار کا موقع ہی نہیں ملا۔ ورنہ اُسکا شکوہ ضرور کرتا۔ امراؤ القیس عرب کے ملک الشعراء نے اس مضمون پر کیا اچھا ایک شعر کہا ہے۔

فیالیت من لیل کان نجومه　　　　بامراس کتان الی صنم جندل

مطلب یہ ہے کہ شب ہجر کی یہ کیفیت تھی کہ گویا اُسکے ستارے کتاں کے مضبوط رسونکے ساتھ سخت پتھر سے باندھ دیے گئے ہیں کہ اُن میں حرکت ہی نہیں ہوتی۔ اس شعر میں یہ خوبی ہے کہ اس سے انتظار کی وہ صورت صاف سمجھ میں آتی ہے جو شاعر کو تھی۔ وہ ستاروں کو بار بار دیکھتا تھا کہ اپنی جگہ سے کسقدر آگے بڑھے اور کب صبح ہوگی۔ لیکن جب دیکھا تو اُسی جگہ پر پایا۔ گویا وہ رسونسے بندھے ہوئے ہیں۔

برخلاف اسکے ہمارے شعراء کہیں شب ہجر کا دامن قیامت سے ٹانکتے ہیں۔ کہیں خضر کی عمر سے بڑی بتاتے ہیں۔ کبھی مرتے ہیں کبھی جیتے ہیں۔ شب ہجر کی زلف سیاہ کے ساتھ تشبیہہ بہت اچھی خیال کیجاتی ہے۔ لیکن جو لوگ تشبیہہ کے اصول سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ تشبیہہ کسقدر نامکمل ہے۔ رات زمانہ ہے اور زمانہ ایک تو ذہنی امر ہے۔ دوسرے متحرک۔ اُس کی تشبیہہ غیر متحرک اور حسی شی یعنی زلف کیساتھ کہانتک موزوں ہوسکتی ہے معشوق کی جدائی کی خبر سنکر مجنوں کہتا ہے۔

کان القلب لیلة قیل یغدیٰ　　　　بلیلی العامریة او یراح

قطاة عزها شرک فباتت　　　　تجاذبه وقد علق الجناح

جس رات کو مجھے یہ خبر دی گئی کہ لیلے کل صبح یا شام کو چلی جائیگی تو میرے دل کی یہ

حالت ہوگئی جیسے قطا چڑیا جال میں پھنسکر تڑپتی ہو۔ بھاشا شاعری کا بھی یہ مضمون کتنا پُراثر ہے۔

سجن سکارے جائینگے اور نین مرینگے روئے — بدہنا ایسی رین کر و کہ بھور کبھو نہ ہوئے

اُردو کے شاعر کی گلفشانی سنیے۔

وہ جب جانے لگیں اُٹھکر تو اے دل — تڑپنا لوٹنا فریاد کرنا

فارسی کا مشہور شعر

غرض دو گونہ عذابست جانِ مجنوں را — بلائے صحبت لیلےٰ و فرقتِ لیلےٰ

خود مجنوں کے اس شعر کا صحیح ترجمہ ہے۔

فواللہ مافی القرب لی منک راحۃ — ولا البعد یسلینی ولا انا صابر

مجنوں کا عشق عجیب نتیجہ خیز ہے جس سے وہ لوگ بہت کچھ سچی محبت کا سبق سیکھ سکتے ہیں جو حسن مطلق کی شمع کے پروانے ہیں۔ بنی عقیل کا ایک شخص ہذیل تھا اُسنے مجنوں سے پوچھا کہ دنیا میں تم کو سب سے زیادہ پیاری چیز کیا ہے۔ اُسنے کہا لیلےٰ۔ کہا لیلےٰ کے علاوہ۔ کہا جب کوئی چیز مجکو اچھی معلوم ہوتی ہے اُسی وقت لیلیٰ یاد آجاتی ہے۔ اور فوراً اُس شے کی وقعت دل سے جاتی رہتی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک ہرنی دیکھی اُس کی آنکھیں دیکھکر مجھے لیلےٰ کی آنکھیں یاد آگئیں۔ میں اُس وحشی ہرنی سے بیحد محبت کرنے لگا۔ اتفاقاً اُسکے پیچھے ایک بھیڑیا پڑا ہرنی بھاگتی جاتی تھی اور پیچھے پیچھے بھیڑیا تھا۔ یہ دیکھکر میں بھی دوڑا۔ وہ دونوں میری نظر سے غائب ہوگئے۔ ایک جھاڑی میں پہونچکر میں نے دیکھا کہ بھیڑیے نے ہرن کو مار لیا ہے اور اُسکا گوشت کچھ کھا چکا ہے۔ میں نے فوراً اُسکو تیر سے مارا۔ اور اُسکا شکم چاک کرکے جو کچھ ہرنی کا گوشت کھایا تھا نکال لیا اور پھر اُس ہرنی کو مع اُس گوشت کے دفن کردیا۔ مجنوں نے ایک قصیدہ میں اسکا تذکرہ بھی کیا ہے۔

فاذھب غیظی قتلہ وشفی جوی — بقلبی ان الحر قد یدرک الوترا

اُسکے مار ڈالنے سے میرا غصہ فرو ہوگیا — اور سوزشِ دل رفع ہوگئی بیشک جوانمرد اپنی آرزو پوری کرلیتا ہے

مجنوں بیچارے کو لوگوں نے مجبور کیا کہ وہ نماز پڑھے - وضو کر کے کھڑا ہوا اور نجد کی سمت نماز پڑھنے لگا - لوگوں نے کہا کہ تم اللہ کے ساتھ تمسخر کرتے ہو - کہا کیا میں لیلےٰ کی طرف پشت کروں -

اسکے محبت بھرے دل کو لیلیٰ کی یاد کا اُس سے کم خیال نہیں رہتا تھا جتنا کہ کسی زاہد کو خدا کا رہتا ہے - دن بھر اُسی کی یاد - رات بھر اُسی کی یاد - ایک دفعہ صبح کے وقت نیند آگئی - کبوتروں نے بولنا شروع کیا - اُن کی آواز سے بیدار ہو کر لیلےٰ کی یاد میں کوتاہی کرنے پر بیحد پشیمان ہوا - کہتا ہے -

لقد غردت فی جنح لیل حمامۃ　　علی الفھا تبکی وانی لنائم

صبح سویرے ہی سے کبوتر نے اپنے جوڑے کی محبت کا ترانہ شروع کر دیا اور افسوس میں سویا ہوا ہوں

کذبت و بیت اللہ لو کنت عاشقا　　لما سبقتنی بالبکاء الحمائم

میں جھوٹا ہوں - خانہ کعبہ کی قسم اگر سچا عاشق ہوتا　　تو رونے میں کبوتر مجھ سے سبقت نہ لیجا سکتا

توباد ایک پہاڑی کا نام تھا جہاں بچپن میں مجنوں اور لیلیٰ ساتھ بکریاں چرایا کرتے تھے - جوشِ عشق کے زمانہ میں مجنوں نے اُسی کو اپنا وحشت خانہ بنا رکھا تھا - لیکن کبھی کبھی نکلتا تو جوشِ وحشت میں شام کے ملک میں پہونچ جاتا - وہاں نئی خلقت نئے لوگ دیکھتا تو اُنسے پوچھتا توباد کا رستہ بتادو میں وہاں جاؤنگا - وہ کہتے ہیں ! تم یہاں کہاں آنکلے توباد تو نجد کے قریب ہے - اچھا فلاں ستارے کی سیدہ میں جاؤ - وہانسے بھٹکتا ہوا یمن میں پہونچتا - وہانسے بھی لوگ رستہ بتادیتے - الغرض مدتوں کے بعد جب توباد نظر آتا تو اُسکو سلام کر کے خوب لیلیٰ کی یاد تازہ کرتا اور پھر روں اُسی کی دُھن میں رہتا -

اسکے قبیلہ کے لوگوں نے ہر چند کوشش کی کہ لیلےٰ کے ساتھ اُس کی شادی ہو جائے لیکن لیلےٰ کے قبیلہ نے انکار کر دیا - بعض دوسرے معزز سرداروں نے بھی زور دیا لیکن اُن لوگوں نے کہا کہ مجنوں سے لیلےٰ کو بیاہ دینا ہمارے لیئے ننگ ہے - اور کسی طرح رضی نہوئے

بنی عقیل کے قبیلہ میں سے ایک شخص ورد بن محمد تھا۔ اُسکے ساتھ لیلےٰ کی شادی اُسکے قبیلہ والوں نے جبراً کردی لیلےٰ راضی نہ تھی۔ آہ مجنوں کے لیے یہ خبر کیسی ہوش ربا تھی۔ سننے کے ساتھہ ہی اُسپر غشی طاری ہوگئی۔ اور جب افاقہ ہوا تو ایک آہ سرد کھینچی۔ اور کہا۔

دعوت الٰہی دعوۃً ما جهلتها و ربی بما تخفی الصدور بصیر

میں نے خدا سے ایک دعا مانگی ہے اور میرا خدا خود دلوں کی حالت سے واقف ہے

لقد شاعت الاخبار ان قد تزوجت فهل یاتینی بالطلاق بشیر

یہ خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ اُسنے نکاح کرلیا کیا طلاق کی خوشخبری بھی میرے پاس کوئی لائیگا

رات بھر اسی رشک و سوز میں مبتلا رہا۔ جاڑے کے ایام تھے صبح اُٹھتے ہی لیلےٰ کے قبیلہ میں پہونچا۔ دیکھا تو اُسکا منحوس شوہر آگ جلائے ہوئے تاپ رہا ہے۔ اُس سے یہ سوال کیا۔

بربی هل ضممت الیک لیلےٰ قبیل الصبح او قبلت فاها

تجھے خدا کی قسم ہے کہ کیا صبح کے پہلے تو نے لیلےٰ کو سینے سے لگایا ہے یا اُسکے منہ پر بوسہ دیا ہے

وهل رفت علیك قرون لیلی رفیف الاقحوانة فی نداها

کیا تیرے اوپر لیلےٰ کی زلفیں لہرائی ہیں جس طرح کہ گل بابونہ بہار میں لہراتا ہے

اُسنے کہا کہ تو نے چونکہ قسم دیکر پوچھا ہے اسلیے میں کہتا ہوں کہ ہاں ؟

یہ سنتے ہی مجنوں کے دل پر بجلی کوند گئی۔ دونوں ہاتھ میں اُسکے آگے سے انگارے اُٹھا لیے اور افسوس سے اُنکو زور سے ملنے لگا یہانتک کہ بیہوش ہوکر گر پڑا۔ اور دونوں ہاتھ کا گوشت پوست جلکر خاک سیاہ ہوگیا۔ اُسکے بعد بہت زیادہ عرصہ تک وہ زندہ نہیں رہا۔ اُسکے گھر کے لوگ دوسرے تیسرے اُسکی خبرگیری کرتے رہتے تھے۔ ایک دن جو جاکے دیکھتے ہیں تو پہاڑ کے ایک دامن میں وہ مجسم عشق ایک نعش کی صورت میں پڑا ہوا ہے۔ اُسکا خاکی جسم خاک کے اوپر ہے لیکن اُس کی عشق اور محبت کی پلی ہوئی روح خدا کے عرش کے سائے میں

پہونچ چکی ہی -

اُس بیچے شریف - جانباز عاشق کا زمانہ نے ناکامی کے ساتھ خاتمہ کر دیا ہی - لیکن نہیں

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام شاں

عشق کا یا تو خاصہ ہی ناکامی یا عشق ناکامی ہی تک منحصر ہے - بہرصورت جو کچھہ بھی ہو بیچے عشاق کا خاتمہ ہمیشہ ناکامی ہی کے ساتھ ہوا - اور اُن کی روح کو زمانہ نے ناکامی ہی کے زہر کا گھونٹ پلایا - ہم اب اپنے اس مضمون کو مجنوں کے اس آخری شعر پر ختم کرتے ہیں جسکا مرنے سے کئی دن پہلے سے اُسنے وظیفہ کر رکھا تھا -

قضاها لغیری وابتلانی بحبها فیالیتها من غیر لیلی ابتلانیا

خدا نے لیلیٰ کو دوسرے کے حصہ میں کر دیا اور اُس کی محبت میں مجکو مبتلا کیا کاش میں کسی دوسری شے کی محبت میں مبتلا ہوا ہوتا -

اسلم جیراجپوری
مدرسۃ العلوم - علی گڈہ

کرزن نامہ

نمبر ۶

ریل اور نہر

ریل اور نہر کے فوائد میں باہم ایسی رقابت ہی کہ ایک دوسرے کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتی آپس میں ہمیشہ برابری اور ہمسری کا دم بھرتے ہیں بس نہیں چلتا کہ ایک دوسری سے آگے بڑھ جاوے - ریل کی ماں آگ ہی نہر کا باپ پانی ہی جیسی ان ماں باپ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی حماقت ہی - ایسی ہی انکے بچوں میں ایک کو دوسرے پر فوقیت دینی سفاہت ہی - اس باب میں ہم تین باتیں لکھتے ہیں - اول ریل اور نہر میں باہم مناظرہ اور اُسکا نتیجہ

دوم دونوں کی تاریخ جو ہندوستان سے متعلق ہے۔ سوم لارڈ کرزن نے جو ریل و نہر کے باب
میں دانشمندانہ کام اور انتظام ترقی کیے۔ اُنہوں نے جن بارہ سوالات کے حل کرنیکا بیڑا اُٹھایا تھا
اُن میں سے دو ریل اور نہر بھی تھے۔

ریل اور نہر کا مناظرہ

ریل کہتی ہے کہ میں دل افروز ہوں آشوب گاہ دنیا میں چراغ آسایش روشن کرتی ہوں
کس آسایش و آرام سے ملکوں کی سیر کراتی ہوں اور دنیا کے مناظر فطرت کو دکھلاکے محظوظ
لوگوں کی ارزاں چیزوں کو دور دور لیجاکر گراں فروخت کرکے مالکوں کے دامنوں کو دولت
سے پُر کرکے خوش کرتی ہوں۔ جب لوگ قحط سے بھوکے مرتے ہیں تو جھٹ پٹ دور دراز
فاصلوں سے جاکر اُن کی خوراک لاتی ہوں اور اُن کو کھلاکر زندہ دل بناتی ہوں میں جیسی دوستوں
کی دل افروز ہوں ایسی ہی دشمنوں کی جاں سوز ہوں۔ شوربختوں کے خس و خاشاک کو سوخت
کرتی ہوں۔ ادہر کسی دشمن نے منہ دکھایا نہیں کہ اُدہر میں سپاہ اور اسباب حرب لیکر فوراً
اُسکا منہ جھلسنے کو پہنچی نہیں۔

نہر نے ریل سے کہا کہ تم یہ کام کرتی ہو مگر اسکے ساتھ تم ہندوستانیوں کی جانسوزی
اور خانماں ویرانی بھی کرتی ہو کہ ہندوستانیوں سے اُن کی دولت ناحق کھینچے لیے جاتی ہو
اور ان کو یہ دکھاد کھاکر جلاتی ہو اور مفلس اور قلاش بناتی ہو۔

ریل نے یہ سنکر نہر سے کہا کہ یہ امر اور بہتان مجھپر کیوں باندہتی ہو میں اتنی دولت ہندوستان
سے نہیں جاتی جتنی کہ لے جاتی ہوں۔

نہر نے کہا تم میں میری سی کیا خوبیاں ہیں کہ میں خشک سالی میں سرہستان آفرینش کو اپنی
آبیاری سے طراوت دیتی ہوں۔ زراعت کے لیے امرت بنتی ہوں خراب و یران زمینوں کو
سرسبز و شاداب کرکے ہزاروں آدمیوں کو رزق پہنچاتی ہوں۔

ریل نے نہر سے کہا کہ تم یہ اپنی تو بڑائیاں مارتی ہو مگر یہ نہیں کہتی کہ جب میں اپنی پانی کی

قیمت مانگتی ہوں اور زمین کے مزروعہ کرنے سے سرکاری جمع کو اتنا بڑھاتی ہوں کہ اُسکے سرکاری تقاضہ پر اہل زراعت کہتے ہیں کہ کاش تم عنایت انکے حال پر کرو۔

نہر نے کہا یہ شکایت میری بیجا ہی نہ میں اپنے پانی کی قیمت گراں مانگتی ہوں نہ سرکاری جمع سخت کرتی ہوں میں تو زراعت کو نہال اور اہل زراعت کو مالدار کرتی ہوں وہ سمجھیں تو ان کی کوتاہی فہم ہی۔ بعد اس گفتگو کے دونوں نے سوچکر کے کہا کہ ہماری یہ بحث عبث ہی گو ہم دونوں رقیب ہیں مگر جیسے ایک دوسرے کے یار و مددگار رہا ہے اس باپ آب و آتش ہیں ایسے ہی ہم انکے بچے ہیں یعنی جیسے آگ اور پانی بغیر کوئی دخانی انجن نہیں چل سکتا ایسی ہی ہم دونوں کی باہمی اعانت کے بغیر ہند و بنگالی آسودہ حالی و بہبودی کا انجن نہیں چل سکتا۔ مناظرہ دونوں کا اسپر ختم ہوا کہ دونوں میں کوئی ایک دوسرے پر ترجیح نہیں رکھتا ملک کی نفع رسانی میں دونوں برابر ہیں۔

دوم نہر یعنی آبپاشی کے کاموں کی تاریخ

ہندوستان ایسا ملک ہی کہ اسکے بعض حصوں میں مینہ بہت برستا ہی اور بعض میں تھوڑا برسات کا حال ہمیشہ یکساں نہیں کبھی شدت سے ہوتی ہی کہ بن کال کا اندیشہ ہوتا ہی کبھی قلت سے ہوتی ہی یا نہیں ہوتی کہ خشک سالی ہوتی ہی اور قحط پڑتا ہی۔ اس سبب سے گورنمنٹ کا یہ اول فرض ہی کہ وہ ہندوستان کے ہر حصہ میں اسکے حسب مناسب حال آبپاشی کرے کہ خلقت زندہ رہے۔ ہر حصہ میں آبپاشی کی ضروریات جداگانہ ہوتی ہیں۔ دریاء گنگ و دریاء سندھ کے باسوں میں آبپاشی کے لیے دریاؤں سے نہریں کاٹنے کی ضرورت ہے اور جو زمینیں ان دریاؤں سے دور ہوں اُن میں کنوؤں کے بنانے کی ضرورت ہی۔ بنگال میں مینہ بہت برستا ہے کم عمق تالوں اور کنڈوں کے بنانے کی ضرورت ہی۔ اور وہ پہلے زمانہ کے بہت موجود ہیں اور بعض ان میں سے بہت بڑے ہیں۔ مدراس اور دکن میں زمین بڑی ناہموار اونچی نیچی ہی اور اس میں پہاڑیوں کے سلسلے واقع ہیں وہاں آبپاشی کے لیے بندہ باندھکے کنڈ اور تال بنانے چاہئیں کہ پہاڑوں کے ڈھلانوں پر سے پانی ڈھلکر اُن میں جمع ہو اور پھر اُنسے نالیاں کاٹ کر

زراعت میں پانی پہنچایا جائے - ہر حالت میں آبپاشی کے سرمایہ میں روپئے خرچ کرنے کی ضرورت ہے جسکے سبب سے زراعت میں سرسبزی ہوتی ہو اور اس میں سرمایہ لگانے والے کو اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہو جو اس سرمایہ کے سود سے ہوتا ہو - اس سرمایہ کا لگانا زراعت کا بیمہ کرنا ہو کہ وہ قحط کی آفت سے محفوظ رہے - مگر یہ یاد رہے کہ یہ ضرور نہیں ہو کہ جس جگہ آبپاشی کے کاموں میں سرمایہ خرچ کیا جائے تو وہ قحط سے بالکل محفوظ رہے یہ سمجھنا غلطی ہو مگر اس سرمایہ کا خرچ کرنا عمدہ ترین تدبیر قحط سے بچنے کی ہو -

جب برسات دو تین سال تک متواتر اچھی نہیں ہوتی تو بارانی زمینوں سے کاشتکار کو پیداوار کے ہونے سے بالکل مایوسی ہوتی ہو - مگر جہاں آبپاشی ہوتی ہو وہاں پیداوار کی امید ہوتی ہو - قحط زدہ زمینوں اور بن قحط زدہ زمینوں میں آبپاشی حد فاصل بناتی ہو جو ایک طرف خشک سالی کو اور دوسری طرف خوش حالی کو بتلاتی ہو - یہ یاد رہے کہ ریل کو تو جہاں چاہو بنا لو مگر نہر ہر جگہ نہیں بن سکتی - نہر تو وہاں بن سکتی ہو جہاں انجینرنگ (نہروں کا بنا) کا معاون نیچرل لا یعنی قانون فطرت ہو جس میں کبھی تغیر نہیں ہوتا - انجینرنگ (فن تعمیر عمارت) وہاں کام کر سکتا ہو جہاں زمین کا لیول یعنی ہمواری اُسکی ممد و معاون ہو یعنی صرف زر کچھ کام نہیں کر سکتا جب تک قانون قدرت اُسکے ساتھ معاونت نہ کرے - مرتفع زمین جس میں صرف بارش اعتدال سے ہوتی ہو اور چند برساتی ندی نالوں سے پانی پہنچتا ہو اور جسکے اندر پہاڑیوں کا سلسلہ حائل ہو اور قدرتی باسن بھی اُسکے اندر نہ ہو (باسن ایک انگریزی لفظ ہو جسکے معنی ملک کے اُس حصے کے ہیں جسکا سارا پانی بہ کر ایک دریا میں جاتا ہو) تو وہ موسموں کے انقلابات کی آفتوں سے محفوظ نہیں رہ سکتی -

ہر مقام کی آبپاشی دو باتوں پر موقوف ہوتی ہو ایک پانی کے بہم پہنچنے پر دوسرے زمین کے لیول (ہموار) پر - وہ ریگستان جو راجپوتانہ کے کوہستان سے - سندھ کے باسن کے درمیان واقع ہو وہاں آبپاشی کا رستہ بند اس سبب سے ہو کہ وہاں بارش نہیں ہوتی

اور پہاڑ اور وادیاں گڈبڈ ہیں۔ اور زمین کی ہمواریوں پر کچھ بس نہیں چل سکتا۔ وادی سندھ میں مغرب کی طرف آبپاشی ممکن ہے جہاں نہایت استقلال اور محنت سے کامیابی حاصل کی گئی ہے

کُل ملک سندھ میں اور پنجاب کے بعض اضلاع زیرین میں آبپاشی بالکل دریا سندھ کی طغیانی پر موقوف ہے۔ ملک سندھ کو مصر اور دریا سندھ کو نیل سے تشبیہہ دی جاتی ہے لیکن مصر اور نیل کا حال بہ نسبت ملک سندھ اور دریا سندھ کے اچھا ہے۔ سندھ میں کل سال میں اوسط بارش کا صرف ۱۰ انچ ہے زمین ریتلی خشک ہے جو سب قسم کی زمینوں میں بدتر ہوتی ہے۔ دریا محدود سواحل میں نہیں بہتا۔ بلکہ وہ ایک وسیع وادی میں اپنی مرضی کے موافق ڈانوا ڈول آوارہ گردی کرتا ہے۔ مصر کو جو فائدہ نیل کی طغیانی سے ہوتا ہے وہ ہندستان میں دریا سندھ کی طغیانی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض دفعہ فائدہ کے بجائے نقصان زیادہ ہوتا ہے۔

ملک سندھ کی آبپاشی

بغیر آبپاشی کے ملک سندھ میں کوئی فصل نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس میں بیس لاکھ ایکڑ زمین ایسی ہے کہ وہ مصنوعی آبپاشی کی محتاج ہے۔ دریا کا پانی دو قسم کی نہروں میں جاری کیا جاتا ہے اوّل قسم انہار طغیانی ہیں جن میں دریا سندھ کی طغیانی سے پانی پُر ہوتا ہے۔ یہ نہریں اکثر پہلے فرماں رواؤں اور کاشتکاروں نے بنائی ہیں۔ دوسری قسم کی نہریں سالانہ ہیں جو بند ہوں کے باندھنے سے بنائی جاتی ہیں اور انکا پانی سال بھر کام آتا ہے۔ یہ نہریں جب سے بنی ہیں کہ ملک میں برٹش گورنمنٹ کا تسلط ہوا ہے۔

پنجاب کی آبپاشی

پنجاب کے بعض حصوں میں بہ نسبت سندھ کے کسی قدر آبپاشی کے کاموں کی ضرورت کم ہے۔ اس میں آب رسانی کے مخازن بہت ہیں۔ ہمالیہ پہاڑ کے نیچے جو شمالی حصے ہیں اور پانچوں دریاؤں کی وادیاں بالا ہیں ان کی ۱۰ فیٹ سے لیکر ۳۰ فیٹ تک زمین کھودنے سے کنوؤں میں پانی نکل آتا ہے۔ اور جنوب میں انہار طغیانی بکثرت ہیں۔ انہار طغیانی دریاؤں سے کاٹی

جاتی ہیں وہ جاڑے میں پانی سے اسلیے خالی ہو جاتی ہیں کہ دریاؤں میں اتنا پانی چڑھاؤ پر نہیں ہوتا کہ اُن کو بھرے۔ جب گرمی کی موسم میں پہاڑوں پر برف پگھلتا ہے اور پانی بنکر دریا میں آتا ہے تو وہ اپنی طغیانی سے اُن نہروں کو پُر کرتے ہیں اور جاڑے تک اُن میں پانی رہتا ہے۔ پنجاب کے جنوب مغربی حصہ میں زمین کی سرسبزی اور شادابی اُن ہی انہار پر موقوف ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمانہ میں سب دریاؤں سے انہار طغیانی جاری تھیں۔ دیہات وقصبات وعمارات میں انکے جاری ہونے کی علامات ابتک پائی جاتی ہیں۔ جب پنجاب انگریزی عملداری میں آیا تو جو انہار طغیانی جاری تھیں۔ ان میں سے بعض کی غور پرداخت اور توسیع برٹش گورنمنٹ نے کی اور پانی کے بحال کرنے کے تخمینے اور تجویزیں ہوئیں مگر آبپاشی کی جو فنڈس تھے وہ مستقل نہروں کے بنانے اور بڑہانے میں صرف ہو گئے۔ انہار طغیانی کے لیے نہیں بچا۔

پنجاب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا بڑا کام باری دواب کی مستقل نہر بنانے کا ہے جو تقریباً ۴۵۰ میل طول میں ہے۔

ہندوستان بڑا ممنون احسان جان لارنس اور لارڈ ڈلہوزی کا ہے کہ جنکے حسن سعی سے یہ نہریں جاری ہوئی ہیں۔

جان لارنس ہمیشہ متواتر گورنمنٹ پر متقاضی رہتے تھے کہ سڑکوں اور نہروں کے بنانے کی اشد ضرورت ہے اور اپنا ذمہ لیتے تھے کہ انسے محاصل ملکی میں اسقدر افزائش ہوگی کہ جو روپیہ اس میں خرچ ہوگا اُس سے دس گنا زیادہ محصولوں سے وصول ہو جائیگا۔

لاہور کے بورڈ نے لکھا کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان ہزاروں آدمیوں کی پرورش کریں جنکا بیکار رہنا تبدیلی گورنمنٹ کے لیے لازمی تھا تو کوئی تدبیر انکے جلد پرورش کرنے کی اس سے زیادہ نہیں ہے کہ نئی نہریں بنائیں اور پُرانی نہروں کی مرمت کریں۔

لارڈ ڈلہوزی نے لکھا ہے کہ ہر مقام پر میں بڑے بڑے اراضی کے قطعات دیکھتا ہوں کہ زراعت کی قابلیت رکھتے ہیں مگر وہ ویران پڑے ہیں صرف وہ پانی کے محتاج ہیں

پانی اُن کو پہنچا نہیں کہ وہ زرخیز ہوئے نہیں

کورٹ وانر کورنے بھی باری دوآب کی نہر بنانے کی منظوری بطیب خاطر دی کہ وہ کفایت شعاری کے ساتھ بنائی جائے۔ غرض یہ باری دوآب نہر بہت جلد تیار ہوگئی اس کی لاگت کا تخمینہ ایک کرور روپیہ اسکے منافع کا تخمینہ بارہ فیصدی تھا۔ پنجاب میں تین نہریں گورنمنٹ نے تیار کیں۔ مغربی نہر جمنا۔ نہر باری دوآب۔ نہر سرہند۔

ممالک مغربی کی آبپاشی

شمالی ہند میں نہروں سے آبپاشی کرنے کا موجد سلطان فیروز شاہ تغلق ہوا ہے جسنے پچاس بند دریاؤنکے باندھے تھے۔ جمنا کی نہریں جاری کی تھیں کہ اُنسے آبپاشی زراعت کے لیے کی جائے۔ اٹھارہویں صدی کے لڑائی جھگڑوں نے جہاں کی نہروں کو بند کر دیا گورنمنٹ انگریزی نے ۱۸۲۰ء میں مغربی نہر جمن کی مرمت کر کے ۴۴۵ میل اسکو جاری کیا ۱۸۳۷ء کے قحط عظیم میں اس نہر کے پانی نے ڈیڑہ کروڑ روپیہ کی مالیت کی فصل کو تباہ ہونے سے بچایا۔

پھر مشرقی نہر جمن ۱۵۵ میل درست کی گئی۔ اس نہر پر ایک عجیب دلکش نظارہ قدرتی نظر آتا ہے کہ نہر کے گرد و دورویہ چوڑی سڑکیں ہیں اور اُن پر درخت لگے ہوئے ہیں جو نہر کے آب رواں پر جھوم جھوم کر اپنا سر جھکاتے ہیں۔ نہر کے گرد سبز کھیت لہلہاتے ہیں۔ اور سپُر ٹھہرنے کے مکانات و نیز بنگلے صاف و ستھرے بنے ہوئے ہیں۔ جب جمنا کی نہروں سے گورنمنٹ کی آمدنی بہت بڑہی تو پھر اُسنے گنگا کی نہر بنانے کی تجویز کی اور اُسکو بناکے انگریزوں نے اپنی قوم کا نام دنیا میں روشن کیا یعنی وہ کام کیا کہ دنیا میں ابتک اس توسیع کے ساتھ کسی قوم نے نہیں کیا تھا کہ نہر کا طول ۸۹۰ ½ میل ہے۔ وہ پنتالیس لاکھ ایکڑ زمین پر آبپاشی کرتی ہے اس سے پیداوار سات کروڑ روپیہ کی قیمت کا پیدا ہوتا ہے۔ اس نہر کے عجیب و غریب کام ہردوار اور رڑکی کے درمیان طلسم نما ہیں۔

ممالک مغربی میں بھاری بارش ہوتی ہے لیکن جب تک ان میں مصنوعی نہریں نہیں بنائی گئی تھیں تو خشک سالی میں بڑے ہولناک قحط پڑتے تھے۔ اسی ملک میں قحط کے مصائب کے گھٹانے میں بہ نسبت اور ملکوں کے گورنمنٹ زیادہ کامیاب ہوئی ہے۔ سندھ میں تو آبپاشی کرنی ضرور ہے۔ بنگال زیرین میں آبپاشی کے کام بنانا عیاشی ہے۔ ہندوستان بالا میں جس میں دریا کے بڑے باسن ہیں نہروں کے بنانے سے دو مطلب نکلتے ہیں۔ ایک تو وہ خشکسالی میں قحط کی آفتوں میں کمی کرتی ہیں۔ دوسرے زراعت کی پیداوار کو قیمتی اور عمدہ بناتی ہیں۔ اسی ملک میں جمنا اور گنگا کی نہروں کا بنانا گورنمنٹ کا بڑا کام تھا۔ دوآبہ میں چار نہریں ہیں نہر گنگ۔ شرقی نہر جمن۔ آگرہ کی نہر۔ گنگا کی نہر زیرین۔ اور چھوٹی چھوٹی نہریں دیرہ دون کی نہر۔ رہیلکھنڈ کی نہر بجنور کی نہر۔ بندیل کھنڈ کے آبپاشی کے کام۔ بیتوا کی نہر۔ یہ نہریں اسلیے بنائی گئی ہیں کہ وہ قحط کی مصائب کا بیمہ ہیں۔

اودہ کی آبپاشی

اودہ میں گورنمنٹ نے ابتک کوئی آبپاشی کا کام نہیں شروع کیا۔ بارش اچھی ہوتی ہے۔ دریاؤں کی طغیانی ہوتی ہے۔

بنگال میں آبپاشی

خاص بنگال کے بڑے حصہ میں مصنوعی آبپاشی کی ضرورت نہیں لیکن گورنمنٹ نے اس ملک کے ان مستثنےٰ حصوں میں آبپاشی کا کام شروع کیا ہے جہاں خشک سالی کے ہونے کا اور قحط پڑنے کا خوف رہتا تھا۔ گنگا اور برہمپتر کی وادیوں میں اکثر طوفان کی آفات آتی رہتی ہیں اسیلیے پبلک ورکس نے انکے روکنے کے لیے بندھوں کی پشتہ بندی کا کام دو ہزار میل کا اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

ملک اڑیسہ کی نہریں

بنگال زیرین میں بڑے کام آبپاشی کے دو باتوں کے لیے کیے جاتے ہیں ایک خشک سالی

کی آفات سے بچانے کے لیے دوسرے طوفان کی بلاؤں کی مصائب سے بچنے کے لیے۔

مدراس احاطہ میں آبپاشی

مدراس کے ضلاع میں بہت تھوڑے ایسے قطعات ہیں کہ جن میں نہروں کے ذریعہ سے آبپاشی بڑے پیمانہ کی ممکن ہو یہ قطعات بڑے بڑے دریاؤں گوداوری اور کرشنا و کاویری کے ڈلٹا ہیں۔ ڈلٹا ایک یونانی حرف مثلث ∆ کی شکل کا ہو۔ پس جو قطعہ زمیں دریا کے دہانوں کے درمیان ہوتی ہو اُسے ڈلٹا کہتے ہیں۔ سر آرتھر نوٹن نے اس ملک میں آبپاشی کی نہریں بنا کے اپنا نام ساری دنیا میں روشن کیا۔

بمبئی میں آبپاشی

بمبئی احاطہ میں سوا نربدا اور تاپتی کے بڑے دریا نہیں ہیں انھی سے چند ضلعوں میں آبپاشی ہوتی ہو۔ دکن کی بلند زمینوں میں آبپاشی زیادہ وسعت نہیں پا سکتی۔

ہم نے آبپاشی کا نہایت مختصر حال انڈیا کے ہر حصہ کا بیان کر دیا اب ریلوے کا بیان لکھتے ہیں جسکی تاریخ آبپاشی کی تاریخ سے جدا کیفیت رکھتی ہو۔

ہندوستان کی آمد و رفت چار وسائل سے ہوتی ہو (۱) ریلوے (۲) سڑکیں (۳) دریا (۴) نہریں۔

ریلوے کی تاریخ ۱۸۴۳ء سے ۱۸۷۱ء تک

ہندوستان میں جو ریلوے کا نظام ہو وہ لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہو۔ ۱۸۴۳ء میں سر جیک ڈونلڈ اسٹیفن نے اول ہندوستان میں ریل کی لین بنانے کا منصوبہ کیا۔ بعد ازاں ایسٹ انڈین ریلوے کے بانی وہی ہوئے۔ انگلینڈ میں ریلوں کے واسطے اتنا روپیہ بہم نہ پہونچ سکا کہ وہ تیار ہوتیں۔ بمبئی کا شہر ایسا ہے کہ ریلوں کے بننے سے بہت فائدہ اُٹھا سکتا ہو۔ اس میں ۱۸۵۰ء میں ریل کے لیے پہلا ڈھیلا اُٹھایا گیا۔ اور چند میل ریلوے تھانا تک ۱۸۵۳ء میں جاری ہوئی۔ دوسری سال میں

لارڈ ڈیلھوزی نے اپنی بڑی فصیح یادداشت لکھی جسکے موافق ہندوستان میں ریلیں بنیں اور لارڈ میو نے ۱۸۶۹ء میں بہت سی نئی لینین بناکے اس کی توسیع کی۔

لارڈ ڈیلھوزی کی ٹرنک لین (بڑی لین) اور لارڈ میو کی برنچ لین یعنی (چھوٹی لین)

لارڈ ڈیلھوزی کی مجوزہ ریلیں ملک کے طول و عرض میں گذرتی تھیں اور تمام بڑے بڑے شہروں اور چھاونیوں کو ملاتی تھیں۔ یہ بڑی لینین پرائیویٹ کمپنیوں نے بنائیں جسکو گورنمنٹ نے انکے خرچ شدہ سرمایہ پر کم از کم سود پانچ فیصدی دینے کی گارنٹی یعنی ضمانت دی۔ اور اس سود کے عوض میں انکو گورنمنٹ نے کسیقدر اپنا ماتحت بنایا۔ یہ نقشہ جو ریلوں کا کھینچا گیا تھا اسکے موافق ریلیں جھٹ پٹ تیار ہوگئیں۔ ۱۸۷۱ء میں بمبئی سے سیدھی ریلیں کلکتہ اور مدراس پریسیڈنسی تک تیار ہوگئیں۔ ۱۸۷۰ء میں لارڈ میو کے لیے یہ کام باقی رہا کہ ان اضلاع کے درمیان جن میں پیداوار خوب ہوتا ہے انمیں ریلیں جاری کردیں اور اس طرح سے کل ملک میں ریلوں کی آمدورفت جاری ہوجائے۔ اس کام کا آغاز لارڈ میو نے اس طرح کیا کہ چھوٹی چھوٹی اسٹیٹ ریلوے چھوٹے گیج یعنی پیمانہ کی بنوائیں جو موجودہ ریلوں سے ارزاں بنیں۔

(باقی آیندہ)

ذکاءاللہ

کلیلہ دمنہ

حیوان ناطق اور غیر ناطق میں جو خواص حد فاصل واقع ہوئے ہیں اُن میں سے ان دونوں نوعوں میں آسانی سے امتیاز پیدا کردینے والا اخلاق ہے انسان کو عزیز و اقارب دوست واحباب، اہل وطن، اہل ملک، آقا تابعدار، دشمن سے مختلف درجے کے ملاقے

ہیں عزیز و اقارب میں بھی ماں، باپ، بھائی، بہن، بی بی، بچے، ماموں، چچا سے متفاوت المراتب رشتہ داریاں ہیں کیونکہ انسان فطرتی طور پر مانوس الطبع پیدا کیا گیا نیز کسی متمدن شائستہ انسان کی کوئی حاجت بغیر آپس کی مدد کے پوری نہیں ہو سکتی اسیلیے انسان کو حسن معاشرت کی ضرورت پڑی اور معاشرت نے مختلف تعلقات پیدا کیے ان مختلف مدارج کے تعلقات سمجھنے اور اُنکے حسب مراتب اُن سے سلوک و معاملہ کرنے کا نام اخلاق ہے۔

یا فلسفہ قدیہ کے مذاق کے موافق یہ سمجھو کہ نفس انسانی کے لیے باعث کمال دو چیزیں ہیں (۱) علوم (۲) اعمال۔ ان علوم کا تعلق اگر مادی چیزوں سے ہے تو وہ فلسفہ طبعی ہیں، اور اگر غیر مادی چیزوں سے ہے تو اُنھیں فلسفہ آلہی اور فلسفہ مابعد الطبعی کہتے ہیں۔

اعمال انسانی یا تو پبلک اور عام اہل ملک کو نفع رسانی کی غرض سے ہوتے ہیں یا صرف اہل خاندان و متعلقین کی مصالح پر مبنی ہوتے ہیں یا اُن افعال کے مفید اثرات صرف کرنے والے کی ذات تک محدود رہتے ہیں۔ اول کو سیاست مدنی اور دوسرے کو سیاست منزلی اور موخر الذکر کو تہذیب الاخلاق کہتے ہیں۔

ناظرین کو اوپر کے بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوا ہوگا کہ تہذیب الاخلاق بھی فلسفہ قدیمہ کی ایک شاخ ہے، ابتدائے حیات فلسفہ سے دوسری صدی ہجری تک فلسفہ کے ضروری اجزاء میں تہذیب الاخلاق بھی شامل تھی مگر جب دوسری صدی میں علوم و فنون کے مسلمانوں نے عربی میں ترجمے کیے تو فلسفہ تہذیب الاخلاق کے مباحث کو قلم انداز کر دیا البتہ شیخ بو علی سینا نے جو ارسطو کا قدم بقدم پیرو تھا چوتھی صدی ہجری میں فلسفہ کی تمام شاخوں پر بحث کرتے ہوے اُسنے پھر علم الاخلاق کو فلسفہ میں داخل کر دیا مگر اُسکے بعد کے مسلمان فلسفین مصنفین نے جب فلسفے پر کتابیں لکھیں تو فلسفہ اعمال کے تینوں اجزائے کو اپنے تالیفات و تصنیفات کے موضوع سے خارج کر دیا کیونکہ مذہب اسلام نے جو فلسفۂ تہذیب اخلاق کا دوسرا نام ہے اپنے پیروں کو فلسفہ اعمال کے وہ وہ اُصول بتا دئیے

اور حکمت اخلاق کے ایسے مسائل کی تعلیم دی جنھوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے علم تہذیب الاخلاق کے ضخیم دفاتر سے مستغنی کر دیا۔ اسلام دنیا میں اسلیے آیا تھا کہ عالم کو وہ آپس کے تعلقات اور معاملات و اخلاق کا فلسفہ سکھا دے۔

خدائے پاک جناب رسالت مآب کے سبب بعثت کو بیان کرتے ہوے فرماتا ہے۔

ویعلمھم الکتاب والحکمۃ یہ نبی لوگوں کو قرآن اور فلسفہ اخلاق کی تعلیم کرتا ہے۔

پھر دوسری جگہ آپ کی تعریف کرتے ہوے یوں ارشاد فرماتا ہے۔

انک لعلی خلق عظیم اے نبی تو اخلاق کے بلند ترین مدارج پر ہے۔

مؤطائے امام مالک کی تصنیفات میں ہے کہ جناب رسول اللہؐ اپنے مبعوث ہونے کی وجہ یوں بتاتے ہیں۔

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق میں مکارم اخلاق کی تکمیل کو آیا ہوں۔

حدیث میں ہے

خیرکم خیرکم لاھلہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے متعلقین سے حسن معاملہ سے پیش آتا ہو۔

ایک شخص جناب رسالت مآبؐ سے پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ اسلام کسے کہتے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ حسن اخلاق کو، ہم خوف تطویل سے اُن کثیر التعداد احادیث و آیات کو چھوڑتے ہیں جو ہمارے دعوے کی شاہد ہیں یہ اسباب تھے جن کی بنا پر مسلمان فلسفیوں نے علم حکمت سے علم الاعمال کے تینوں مباحث کو الگ کر دیا گو شرعی حیثیت سے علما نے اس علم پر بڑی بڑی مفید تالیفیں کی ہیں جن میں احیاء العلوم، کیمیاے سعادت اخبار الاخیار مؤلفہ امام غزالی المتوفی ۵۰۵ھ اور اخلاق ناصری مصنفہ علامہ نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ مشہور و مفید ترین تصنیفات ہیں۔ اخلاق جلالی اور کتاب الطہارت علامہ مسکویہ کی بھی اس باب میں عمدہ تصنیف ہے۔

جب سے انسان کو صنعت کتابت کا راز معلوم ہوا اس بحث پر ہزاروں کتابیں

لکھی گئیں مگر جہانتک ہم کو عالم کی تاریخ معلوم ہی اس فن میں سب سے زیادہ قدیم اور مشہور متداول اور دنیا کی اکثر زبانوں میں جلوہ گر ہونے والی کتاب کلیلہ دمنہ ہی۔

کلیلہ دمنہ کے موضوع پر اکثر علمائے مستشرقین نے مفید کتابیں لکھی ہیں خود ہمارے ہندوستان میں بھی لوگوں نے مفصلاً نہیں تو مجمل طور سے اسپر ایک آدھ مضمون لکھا اور لکھ دیا ہی - تمام یوروپین مستشرق علما میں سے اس میدان کے مشہور شہسوار بارون دی ساسی[1] فرانسیسی اور جرمن کے دو نامور پروفیسر بونفی اور نولڈکی اور فولکر نر باشندہ انگلستان ہی۔

کتاب کلیلہ دمنہ ہندوستان کی تصنیف ہی۔ اسی باغ سے اس کی بو تمام دنیا میں پھیلی، بیدپا نامی ایک پنڈت نے سنسکرت زبان میں کچھ اوپر بیس صدیاں گذریں کہ راجہ دابشلیم بادشاہ ہندوستان کے لیے یہ کتاب[2] لکھی تھی - اس کتاب کی وجہ تالیف یہ ہی کہ فتوحات اسکندر کے بعد جب اس بادشاہ نے ہندوستان کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو جور و ستم ظلم و بے انصافی سے تمام ہند کو ماتمکدہ بنا دیا عیش و عشرت سستی و غفلت نے سلطنت کے تمام اجزا مضمحل کر دیے ایسے مشکل وقت میں ہند کے اولوالعزم ریفارمر ملک و قوم کی صلاح کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ٹھیک اُسی طرح جس طرح شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی نے شاہان فارس کی درستی کے لیے گلستاں لکھی ہند کے سعدی نے فرمانروایان ہند کی اصلاح کی غرض سے کتاب کلیلہ دمنہ داستان کی شکل میں جانوروں کی زبانی لکھیں۔

---

[1] ناظرین کو انکے صحیح نام بتلانے سے مجبوری ہی کیونکہ انکے نام اور انکی تحقیقات بابت کلیلہ دمنہ عربی رسالہ الہلال سے ماخوذ ہیں، سید

[2] اسوقت میرے پیش نظر جو نسخہ ہے اُسکے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدپا نے اسکو کتاب کی صورت میں نہیں تصنیف کیا بلکہ یہ بادشاہ کے حضور میں مودب بیٹھا ہی اور وہ بیدپا سے حکمت کی باتیں پوچھتا ہے اور وہ اُسکو جانوروں کی زبانی حکایت میں بیان کرتا ہی، شاید اسکے بعد بھی اسکو تحریری صورت میں لے آیا ہو، سید

مورخین کلیلہ دمنہ کا خیال ہے کہ کلیلہ کی طرز پر جو کہانیاں عام اہل دنیا بیان کرتے ہیں در اصل اُسکا ماخذ ہند ہے۔ کیونکہ جس طرح سے ہر فرد انسان کے ساتھ کچھ نہ کچھ خصوصیتیں ایسی ہیں جو دوسرے فرد انسان میں نہیں پائی جاتیں۔ اسی طور پر فطرتاً ہر ملک و قوم کی بھی الگ الگ خصوصیات ہیں جو دوسرے ملکوں کو نصیب نہیں جیسے ایران کی نفاست پسندی، روما کی قانون دانی، عرب کی فصاحت و بلاغت، یونان کی حکمت، اٹلی کی مصوری ؎

اس بنا پر ہند کو دو ایسی خصوصیتیں نصیب ہیں جس میں قدرت نے اوروں کو شریک نہیں کیا۔ اول ہندوستان کو علم ریاضی (جس میں علم حساب علم موسیقی علم الافلاک اور علم نجوم شامل ہیں) کے ساتھ ایک ایسا تعلق ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کو علم ریاضی کا موجد کہا جائے تو نازیبا نہیں ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ علم ریاضی کا بادل ہمالہ ہی سے اُٹھکر دوسرے ملکوں میں برسا ہے ؎

دوسرے داستان و قصص کے پردے میں نتائج پیدا کرنا بھی ہند کی خصوصیتوں میں سے ہے اسی کا اثر ہے کہ دور از کار داستان سے اُن کی مذہبی کتابیں بھی خالی نہیں ہیں بلکہ اُنکے مذہبی لٹریچر کا عنصر زیادہ تر ایسی ہی کہانیاں ہیں۔

اسی وجہ سے پنڈت بیدپا نے بھی اپنی اس اخلاقی کتاب کے علت مادی قصوں کو بنایا اس کتاب کا اصل نام سنسکرت میں کراٹکا و دمنا کا تھا۔ اس کتاب میں اکثر وہ اصول قصص سے بطور نتائج نکالے گئے ہیں جن کی انسان کو کشاکش ہائے زندگی میں ضرورت پڑتی ہے۔ جیسے چغلخور اور فسادی لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرو، بُرے لوگوں کا سوء خاتمہ، دوستی کا فائدہ، دشمنوں سے بیخوف نہ رہو، غفلت اور سستی کے بُرے نتائج، جلد بازی کی نقصانات تجربہ کاری وغیرہ، ضمنی حکایات، کو چھوڑ کر اصل سنسکرت کلیلہ دمنہ میں بارہ باب تھے اور ہر باب میں ایک حکایت پھر حسب مذاق، مترجمین اس پر اضافہ کرتے گئے ہیں۔

(۱) بیل اور شیر۔	(۷) بادشاہ اور ایک پرند (فترہ نام)
(۲) کبوتر۔	(۸) شیر اور گیدڑ اور زاہد
(۳) اُلو اور کوّئے۔	(۹) شیرنی اور گیدڑ اور سوار
(۴) بندر اور کچھوا۔	(۱۰) ابلاذ و بلاذ و ابرفت[1]
(۵) زاہد اور نیولا۔	(۱۱) سنار
(۶) چوہا اور بلی	(۱۲) شاہزادہ اور اُسکے دوست

زمانہ حال میں علماے یورپ نے جب اصل سنسکرت نسخہ کا سراغ لگانا چاہا تو بجائے اسکے کہ وہ کلیلہ دمنہ کو ایک مستقل کتاب میں پائیں اُنھوں نے کلیلہ کے مختلف قصوں کو ہندو مذہب کی چند مقدس کتابوں میں منتشر پایا، خاصکر زیادہ تر اسکے اجزا رمہابھارت پاشاتنتر، ہلتوپادیس ان تین کتابوں میں ملے اسی لیے پروفیسر بونیفی نے اس کتاب کے متعلق یہ رائے قائم کی ہی کہ کلیلہ دمنہ کوئی مستقل کتاب اصل میں نہیں بلکہ برزویہ نے فارسی میں اسکا ترجمہ کرتے وقت اُنھیں کتابوں سے انتخاب کر کے ایک مستقل کتاب کلیلہ دمنہ نامی بنا لی۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہی کیونکہ فارسی ترجمے سے پہلے یہ کوئی مستقل کتاب نہ ہوتی تو اس کی شہرت ایک خاص نام سے نہ ہوتی اور حالانکہ نوشیرواں نے برزویہ کو اسی خاص کتاب کی نقل کے لیے ہندوستان بھیجا تھا۔ ہاں یہ ممکن ہی کہ کلیلہ دمنہ اپنے بے انتہا افادہ کے باعث مذہبی ہندو کتابوں میں بطور انتخاب شامل کر لیا گیا ہو اور ہندو قوم کی علمی بدمذاقی یا قدامت زمانہ کے سبب اُسکا اصلی نسخہ دنیا سے ناپید ہو گیا ہو۔ اسیلیے پروفیسر بونیفی کو دہوکا ہوا کہ یہ کتاب کوئی مستقل نہیں بلکہ اُنھیں مذہبی کتابوں کا منتخب ہی۔

تبتی[2] زبان میں ترجمہ

ہند سے باہر قدم دہرنے کے لیے سب سے پہلے اس کتاب کی صبائے شہرت ہمالہ کی بلند

[1] ابلاذ نام بادشاہ بلاذ نام وزیر ابرفت نام بادشاہ بیگم۔ سید

چوٹیوں سے ٹکرائی اور سب سے پہلے اس کتاب کا ترجمہ تبتی زبان میں ہوا۔ ظن غالب ہی کہ ہند کے اور ہمسایہ ملکوں میں بھی اسکا ترجمہ ہوا ہو گا۔ مگر اقتضائے مدت مدیدہ نے انھیں برباد کر ڈالا۔

فارسی ترجمہ

مذکورۂ بالا بیان سے اتنا معلوم ہو گیا ہو گا کہ نوشیرواں کو جب اس اہم اور مفید کتاب کا حال معلوم ہوا تو اُسنے اس کی نقل کرنے کے لیے برزویہ نامی ایک شخص کو ہندوستان بھیجا وہ ہندوستان آیا اور بڑی مشقت سے اس دُرِ مکنون کو ایک ہندو راجہ کے علمی خزانہ سے حاصل کرکے اس کی نقل لیکر فارس واپس آیا۔ نوشیرواں نے اس کتاب کو اپنے وزیر حکیم بزرجمہر کے حوالہ کیا تاکہ وہ اسے فارسی مذاق کے موافق ترتیب دے۔ حکیم بزرجمہر نے پسندیدہ طرز پر اس کی ترتیب دی اور اسپر دو باب کا اضافہ کیا۔ ایک میں بزرجمہر نے حکیم برزویہ کی مختصر لائف اُس کی درخواست کے موافق لکھی اور دوسرے میں اپنے حکیمانہ اقوال سے اس شراب کو علم دوست احباب کے لیے دو آتشہ فارسی کلیلہ بنایا[۵]۔

شاہان فارس اس کتاب کی بڑی قدر کرتے تھے اور آئین سلطنت کا سنگ بنیاد اسے سمجھتے تھے۔ فارسی سے اسکا ترجمہ سریانی اور عربی زبان میں کیا گیا۔

ترجمۂ سریانی

لوگوں کا پہلے خیال تھا کہ سریانی کلیلہ عربی سے منقول ہی لیکن تفتیش حال اور تحقیق قرینہ سے یہ امر بدیہی طور پر معلوم ہو گیا کہ سریانی کلیلہ بھی پہلوی (فارسی) ہی کلیلہ سے ماخوذ ہے کیونکہ ان دونوں کے مضامین، نام، ترتیب زیادہ تر آپس میں ملتی جلتی ہی۔ سریانی زبان میں آکر اسکا نام قلیلج و دمنج رکھا گیا۔

عبد یسوع نامی ایک پادری اپنی سریانی کتابوں کی فہرست کرتے ہوئے لکھتا ہی کہ

---

۵ کشف الظنون جلد ثانی۔

بو د نامی ۵۷۰ء میں ایک صاحب علم تھا جسنے جرمن کے خلاف چند کتابیں بھی لکھی تھیں اور فارس و ہند کے نصاریٰ پر اُسے کامل اقتدار بھی حاصل تھا اُسنے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ بھی سریانی زبان میں کیا تھا چنانچہ آجکل اُسکا ایک نسخہ بھی مل گیا ہے جو جرمنی زبان کے ساتھ ساتھ مقام لیپسک سے ۱۸۷۶ء میں شائع کیا گیا۔ اس کتاب میں بارہ باب کی جگہہ صرف دس باب ہیں۔

ترجمہ عربی

اس کتاب کے جسقدر ترجمے ہوئے ہیں اُن سب میں سب سے زیادہ اہم اور تاریخی عربی ترجمہ ہے کیونکہ کتاب کلیلہ دمنہ کے مفید مضامین سے آج دنیا محروم ہوتی اگر یہ کتاب مسلمانوں کے علمی حسن مذاق کے باعث عربی ترجمہ کے قالب میں جنم نہ لیتی۔ آج مہذب اور زندہ زبانوں میں جتنے ترجمے موجود ہیں وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ عربی ہی ترجمہ کے ممنون احسان ہیں۔

فارسی زبان سے عبد اللہ بن مقفع خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی کے میر منشی نے خلیفہ کے حکم سے دوسری صدی میں عربی میں ترجمہ کیا، ابو الحسن عبد اللہ بن مقفع ایک فارسی شخص تھا جو فارسی، یونانی، عربی تینوں زبانوں میں پوری دستگاہ رکھتا تھا اسنے اپنی زندگی کے ابتدائی حصے ۱۵۰ھ سے پہلے تک بصرہ میں بسر کیے تھے جو علم ادب کا دار السلطنت شمار کیا جاتا تھا اسی لیے عبد اللہ بن مقفع کے ترجمہ میں زبان کی چاشنی موجود ہے۔ دوسری صدی کے نصف ثانی میں اسنے وفات پائی۔

ابن المقفع نے اس کتاب کے شروع میں ایک باب اور بڑھا دیا ہے جسکا عنوان عرض الکتاب ہے جس میں اُسنے عقل اور علم کی فضیلت تمثیلات کے ذریعہ سے دکھلائی ہے اور حکایات کے پردے میں حکمت کی باتیں بتائی ہیں اور اس کتاب کے مطالعہ کا شوق دلایا ہے اس کتاب کی اشاعت جب ملک عرب میں ہوئی تو علمائے عرب نے بڑے جوش سے اسکو

خیر مقدم کہا اور بچوں کے کورس میں اسکو داخل کر دیا۔ فارسی زبان سے باخبر علماء نے ابن المقفع کی تالیف کی اس قدر و منزلت کو دیکھکر اُن کو بھی یہ خیال ہوا کہ ہم بھی اسکو پہلے ترجمے سے عمدہ ترجمہ عربی میں کریں ان لوگوں میں سے سب سے زیادہ پیش رو عبداللہ بن ہلال اہوازی تھا جس نے یحییٰ بن خالد برمکی کے لیے اس کتاب کو فارسی سے عربی میں خلیفہ مہدی کے عہد خلافت میں ۱۶۵ھ میں ترجمہ کیا اور حکیم سہل بن نوبخت نے اسکو نظم کیا جسکے صلہ میں یحیی بن خالد نے اپنی خاندانی موروثی فیاضی سے اسکو ہزار روپئے انعام دیئے پھر خلیفہ ماموں کے لیے سہل بن ہارون نے کلیلہ دمنہ کا جواب لکھا ہے مگر ان تمام تالیفات اور تراجم کو عبداللہ ابن المقفع کے ترجمے کے آگے فروغ نہوا اور اُسکے آگے کسی کا چراغ نہ جلا اسوجہ سے بجز ترجمۂ ابن مقفع اور اُسکے عربی تراجم مفقود ہو گئے[۵]۔

کلیلہ دمنہ عربی مترجمہ ابن مقفع کے پہلے نسخے میں ۲۱ باب تھے جس میں سے بعض تو ہندی الاصل تھے اور کچھ فارسی مترجم کے اضافہ کیے ہوئے اور کچھ ابن مقفع کے بڑہائے ہوئے باب تھے اس اجمال کی تفصیل یہ ہی کہ بارہ باب تو ہندی الاصل تھے اور ۳ فارسی مترجم کے بڑہائے ہوئے۔ برزویہ کی لایف، برزویہ کے ہند بھیجنے کی وجہ، چوہوں کے بادشاہ کا بیان، اور چھ باب ایسے تھے جنکا پتہ عربی ترجمے سے پہلے نہ تھا۔ مقدمۃ الکتاب جو بہنود بن سحوان معروف بہ علی بن شاہ فارسی کی زبان میں مرقوم ہی ابن مقفع کی گذارش، کلیلہ دمنہ کی تحقیق، بگلا اور بط، بگلا اور بط اور لومڑی، مہمان اور زاہد۔

اسوقت ہمارے پیش نظر کلیلہ دمنہ کا جو عربی نسخہ ہی اس میں بعض وہ ابواب موجود نہیں ہیں جنکا پتہ ہمیں تاریخ دیتی ہی۔

سب سے پہلے عربی کلیلہ کا پہلا اڈیشن ہولنڈ کے ایک مستشرق شولٹنس نامی نے ۱۷۸۶ء

[۵] کشف الظنون جلد ثانی۔

یں شائع کیا مگر یہ نسخہ بالکل ناکمل تھا صرف اس میں "لومڑی اور شیر" والا باب تھا کامل طور سے اس کتاب کے شائع کرنیکا فخر فرانس کو حاصل ہے، اس علم دوست اور قدر دان عرب ملک کے مشہور مستشرق بارون سیلفسٹر ڈی سوسی نے اسکو پیرس میں چھپوا کر ۱۸۱۶ء میں مع ایک مقدمہ کے جس میں اس کتاب کی سرگذشت بیان کیگئی تھی شائع کیا اسکے بعد عام طور پر مصر کے مختلف مطابع میں چھپکر دست ناظرین تک پہونچی، مصری طبعات میں سب سے پہلے مطبع بولاق سے پہلی بار ۱۲۴۹ھ اور دوسری مرتبہ ۱۲۹۷ھ میں شائع کیا۔ مصری مطابع کی نقل ہندوستان عراق شام ممالک روس وغیرہ میں چھپی، مگران تمام اڈیشنوں میں سے سب سے زیادہ صحیح اور کامل وہ نسخہ ہے جسکو شیخ خلیل بازجی نے ۱۸۱۸ء میں بیروت سے شائع کیا تھا جس میں اُنھوں نے یہ بیان کیا تھا کہ "یہ نسخہ ایک قدیم نسخہ سے جو ۱۵۱۶ء میں لکھا گیا تھا اور پروفیسر ڈی ساسی کے شائع کردہ کلیلہ سے مقابلہ کرنے کے بعد بہ تصحیح تمام شائع کیا جاتا ہے، بازجی کے نسخہ کا چند بار اڈیشن شائع ہوا اور شائقین نے ہاتھوں ہاتھ خریدلیا۔ احمد افندی اڈیٹر رسالہ ثمرات الفنون نے اسکو نئی طرز سے چھاپا ہے اسکے مشکل لغات کا حاشیہ پر حل کردیا ہے اور عام دلچسپی بڑہانے کے لیے موقع مناسب میں۔ جابجا تصویریں دیدی ہیں ان تصویروں کی مجموعی تعداد ۸۶ ہے، مصر نے جو اس کتاب کی قدر دانی کی وہ اسی سے ظاہر ہے کہ بیسیوں بار اسکے اڈیشن شائع ہوے اور فروخت ہو گئے مگر مصر نے مزید براں اسکو علم اخلاق وادب کا اعلیٰ معلم خیال کرکے بچوں کے نصاب تعلیم میں داخل کردیا ہے۔

عربی سے غیر زبانوں میں اسکا ترجمہ ہونا

ابھی ابھی ہم نے یہ ذکر کیا ہے کہ تمام دیگر تراجم اس عربی سے منقول ہیں اسکا فارسی ترجمہ جو عہد نوشیرواں میں ہوا تھا شائع ہوگیا۔ اصل سنسکرت کا پتہ نہیں۔ سریانی ترجمہ برباد ہوگیا۔ تبت کی زبان میں جو اسکا ترجمہ ہوا تھا وہ بھی دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہا۔

کلیلہ ومنہ کا وجود صرف عربی زبان میں رہگیا، تمدن اسلامی کا آفتاب جب پورے اوج پر پہونچا اور آس پاس کی قوموں پر اُس کی کرنیں چمکیں، تو مسلمانوں کے علوم وفنون کا ترجمہ غیر قوموں نے اپنی اپنی زبانوں میں کیا، اور اسلامی خزانہ سے ہر قوم اپنے جیب و دامن میں لعل و یاقوت بھر کرلے گئی۔ اُنھیں بیش بہا جواہر میں کتاب کلیلہ دمنہ بھی تھی۔

اُن تراجم کی تعداد جو بلا واسطہ عربی زبان سے کیے گئے ہیں دس ہیں (۱) سریانی تقریباً دسویں صدی عیسوی میں (۲) یونانی ۱۰۸۰ء میں (۳) فارسی ۱۱۲۰ء میں (۴) عبرانی پہلی مرتبہ (۵) عبرانی دوسری مرتبہ تیرہویں صدی عیسوی میں (۶) لاطینی تیرہویں صدی میں (۷) اسپین کی زبانیں ۱۲۵۱ء میں (۸) ملاکا (۹) انگریزی ۱۸۱۹ء (۱۰) روسی ۱۸۸۹ء پھر ان ترجموں سے دوسری زبانوں میں ترجمے ہوئے جیسے فرنچ، اٹیالین، سلاقونی، ترکی، جرمنی، انگریزی، ڈنمارکی، ہولنڈی وغیرہ۔ وہ تمام تراجم جو عربی سے بلا واسطہ یا بالواسطہ منقول ہیں وہ بیس سے کچھ اوپر ہی ہیں۔ ہم مذکورہ بالا ترجموں کا حال ذیل میں کچھ تفصیل سے لکھتے ہیں۔

(۱) سریانی ترجمہ۔ سریانی میں ایک بار پہلے بھی ترجمہ ہوچکا تھا مگر وہ ضائع ہوگیا یہ دوسرا ترجمہ ہے جو آٹھویں اور تیرہویں صدی کے درمیان عربی سے ہوا ہے اسکا مترجم ایک عیسائی کاہن ہے اسکے سوا اس بار اسکے ترجمہ کے متعلق کوئی بات نہ معلوم ہوسکی اس نسخہ سے کیت فالکونر نے ۱۸۸۵ء میں انگریزی میں اسکا ترجمہ کرکے انگلستان میں شائع کیا۔ اس کی ابتدا میں ایک تمہید بھی لکھی تھی جس میں اس کتاب اور اس کتاب کے تراجم کی تاریخ تھی۔

(۲) یونانی ترجمہ۔ سمعان بن شیث نے عربی سے تقریباً ۱۰۸۰ء میں یونانی میں اسکا ترجمہ کیا یہ نسخہ بھی ضائع ہوچکا تھا مگر بصراس بولینوس نامی ایک عیسائی پیونتیوس کے کتب خانہ میں اتفاقاً یہ کتاب مل گئی اُسنے اسکا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا پھر ایک اور

لاطینی ترجمہ ایک یونانی ترجمہ کے ساتھ ۱۶۹۷ء میں ایک دوسرے نسخہ سے ترجمہ کرکے شائع کیا گیا اس سے ایٹالین اور سلاقونی میں ترجمہ کیا گیا، یہ ایٹالین ترجمہ، ترجمہ قدیمہ کے لفظ سے بولا جاتا ہے تاکہ نئے تراجم سے اُسکو امتیاز ہوجائے' یہ قدیم ایٹالین ترجمہ ۱۵۸۳ء میں اور پھر ۱۶۹۷ء میں مقام پولونیا میں شائع ہوا اور سلاقونی ترجمہ قدیم روسی ترجمہ کہا جاتا ہے تاکہ جدید روسی ترجمہ سے یہہ ممتاز ہوجاوے یہ قدیم ترجمہ ۱۷۶۲ء میں پیٹرسبرگ میں چھاپا گیا۔

(۳) جدید فارسی ترجمہ۔ پچھلی صدیوں میں چونکہ فارسی زبان بھی اسلام کی دوسری زبان تھی اسلیے' فارسی میں پہلے بھی کلیلہ ودمنہ کے متعدد ترجمے ہوئے مگر سب کا ماخذ وہی عربی ترجمہ تھا، مگر قدیم تراجم کو چھوڑکر عہد جدید میں ابوالحسن نصر ابن احمد نے ہجرت کی تیسری صدی میں عربی سے فارسی میں اسکا ترجمہ کیا اور اُسی زمانہ میں ایک شاعر نے اس کتاب کے حسن مضامین کو دیکھکر اسکو نظم کرڈالا۔ بجز اسکے اس ترجمہ کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم ہوئے کہ صاحب کشف الظنون نے اسکا تذکرہ کیا ہے پھر ابوالمظفر بہرام شاہ بن مسعود غزنوی المتوفی ۱۱۵۱ء کے حکم سے ابوالمعان نصر اللہ بن محمد بن عبدالحمید نے اسکا فارسی میں ترجمہ کیا۔ زمانہ حال میں جس شخص نے پہلے یہ دریافت کیا کہ یہ نسخہ ابتک موجود ہے وہ ڈی ساسی ہے۔ اُسنے کوشش بلیغ کے بعد اسکا ایک نسخہ پیرس کے کتب خانہ میں پایا۔

اس کتاب کو حسین بن علی واعظ کاشفی نے پندرہویں صدی عیسوی میں بطرز جدید مرتب کیا اور اُس میں وہ بہت سی حکایتیں بڑہائیں جنکا پتہ اس کتاب کے سوا اور کہیں نہیں ملتا اسکا نام انوار سہیلی ہے جو امیر سہیلی کی طرف معنون ہے۔ سولھویں صدی کے پچھلے حصے میں ابوالفضل ابن مبارک نے جو اکبر بادشاہ کا مشہور میرمنشی تھا اسکو نئی ترتیب اور سہل عبارت میں ترتیب دی اور عیار دانش اسکا نام رکھا۔

۱۵۲۰ء یا ۱۵۶۶ء میں علی بن صالح المعروف بہ علی چلپی اور الملقب بہ عبدالواسع

عیسی مدرسہ آدرنہ کے استاذ الفقہ نے سلطان سلیمان کے عہد میں انوار سہیلی کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔ پھر اسی ترکی سے ۱۷۲۴ء میں فرنچ میں اسکا ترجمہ ہوکر پیرس سے شائع ہوا اور دوسرا ترجمہ ترکی سے اسپین کی زبان میں ہوا جو ۱۶۵۲ یا ۱۶۵۸ء میں شائع ہوا۔

(۴-۵) عربی سے عبرانی میں اسکے دو ترجمے ہوئے پہلا ترجمہ بوئیل نے کیا۔ جس سے جان کپوا نے لاطینی زبان میں ۱۲۷۰ء میں ترجمہ کیا یہ ترجمہ

Dir ctoinum Humane Vitai

کے نام سے مشہور ہے۔ اسی نسخہ سے یورپ کی بڑی بڑی زبانوں میں اسکا ٹرانسلیشن ہوا۔ اسکے متعلق کچھ زیادہ حالات معلوم نہیں ہیں لیکن اتنا یقین ہے کہ ۱۲۵۰ء سے ادہر کا ترجمہ کسی طرح نہیں ہے اسکا ایک نسخہ پیرس کے نسخہ میں دستیاب ہوا ہے جسکا ایک ٹکڑا ایسٹ ویسٹرن ریویو میں چھپا تھا اور پوری کتاب کو فرنچ اور لاٹین کے ساتھ ساتھ ایک شخص یوسف نامی نے ۱۸۸۱ء میں پیرس سے شائع کیا تھا۔

عبرانی کا دوسرا نسخہ جسکو یعقوب ابن العازر نے عربی سے تیرہویں صدی میں ترجمہ کیا تھا اسکو بھی اُسی یوسف کامل نے چھاپ دیا ہے اس نسخہ کا ٹرانسلیٹر عبرانی کا ایک مشہور اہل قلم ہے جسنے "سفر ہشام" کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کا اصلی قلمی نسخہ کتب خانہ کیمبرج میں ابتک محفوظ ہے۔

کلیلہ کا ترجمہ السنہ جدیدہ میں

جان کپوا کا لاطینی ترجمہ اول اول پندرہویں صدی کے آخر میں چھپکر شائع ہوا اور سب سے اخیر اسکا اڈیشن ۱۸۸۴ء میں پبلشڈ ہوا اس لاٹین ٹرانسلیشن سے یورپ کی کلیلہ کا بڑی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوا گراف ڈی ورٹہبرگ نے ۱۴۸۰ء میں جرمنی میں ترجمہ کیا۔ اور ایک دوسرے جرمنی عالم نے ۱۴۹۳ء میں اسپین کی زبان میں اسکا ترجمہ کیا اور ڈونی نے ۱۵۲۲ء میں اٹالین لنگویج میں اس کا ترجمہ کیا اسکا بھی ایک نسخہ کتب خانہ کیمبرج میں موجود ہے۔ جرمنی نسخہ سے ڈنمارک کی

زبان میں ۱۶۱۸ء میں اور ہالنڈ کی زبان میں ۱۶۲۳ء میں یہ کتاب نقل کی گئی اور ڈونی کے ترجمہ سے سر ٹوماس باشندۂ انگلستان نے اسکا ترجمہ انگریزی میں کیا جو ۱۵۷۰ء اور ۱۶۰۱ء میں چھپا بھی تھا۔ اور پھر اسپین کے ترجمہ سے ایٹالین لنگویج میں ۱۵۴۸ء میں اسکا ترجمہ ہوا۔ اور چرائل نامی نے اس نسخہ سے اسکا دوسرا ترجمہ فرنچ زبان میں کیا جو ۱۵۵۶ء میں شہر لیڈن میں مطبوع ہوا۔ ان تراجم سے اور بہت سی زبانوں میں اسکا ترجمہ ہوا جن کی تفصیل مزید فائدہ نہیں بخش سکتی ہے۔

(۶) لوگوں کا خیال ہے کہ عربی سے لاطینی میں اسکو تقریباً تیرہویں صدی میں ایک شخص نے نظم کیا تھا۔ یہ نظم Baldos Alter Aesopus کے نام سے مشہور ہے۔

(۷) اسیان نامی ایک شخص نے اسپین کی قدیم زبان میں اسکو عربی سے ترجمہ کیا تھا۔ جب وہ عربی علوم و فنون کا تیرہویں صدی کے وسط میں ترجمہ کر رہا تھا۔ اس زبان سے بھی لاطینی میں ۱۳۱۳ء میں ترجمہ کیا گیا تھا جو ریمانذہ کے نام سے مشہور ہے۔ کتب خانہ پیرس کی محفوظ کتابوں کا ترجمہ کرتے ہوے ڈی ساسی نے اسکا تذکرہ کیا ہے۔

(۸) مستقل طور سے بھی انگریزی میں عربی سے اسکا ترجمہ کیا گیا ہے اسکے تراجم پادری وینیڈ ہاہیں جنہوں نے ۱۸۹۱ء میں آکسفورڈ سے شائع کیا گیا اور ۱۹۰۵ء میں پروفیسر اڈوار فانڈیل نے اسکو چھپوا کر اپنے شاگردوں میں تقسیم کیا۔

(۹) فرنچ ٹرانسلیشن سے روسی زبان میں سب سے پہلی بار می نائیل نے ترجمہ کیا اور اسکو ۱۸۸۹ء میں طبع ہو کر شائع ہوا اور یہ فرانسیسی ترجمہ پھر اس عربی سے منقول تھا۔

(۱۰) لیڈن کے کالج میں ہندی تلگی زبان میں عربی سے ترجمہ کیا ہوا موجود ہے۔[۱]

[۱] میرے سامنے اسوقت جو کلیلہ کا نسخہ ہے وہ مطبع عثمانیہ مصر ربیع الاول ۱۳۰۵ء کا چھپا ہے۔ مگر فہرست طبع میں اسکا کہیں نام نہیں لیا گیا۔ سید

یہ تاریخ ہی کلیلہ دمنہ کے اُن اہم تراجم کی جنکا ماخذ عربی کلیلہ ہے۔ مذکورۂ بالا تراجم کے سوا اور چھوٹے چھوٹے ترجمے بھی ہیں جنکے متعلق ہمیں بہت کم معلوم ہے مزید تفصیل کے لیے ہم ان ترجموں کا نقشہ بھی کھینچے دیتے ہیں۔

آخر میں ہم اُن ناسپاس ہندو احباب سے یہ پوچھتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت کی اور اسکا خاتمہ بھی ہوگیا مگر ہندو لٹریچر کی طرف اُنہوں نے توجہ بھی نہ کی۔ اگر مسلمان اس جلیل القدر کتاب کلیلہ دمنہ کو عربی زبان کے دامن میں پناہ نہ دیتے تو کیا وہ یہ بھی بتا سکتے کہ اُنکے ایک ناصح قوم پنڈت نے اخلاق کی ایسی بہترین کتاب تصنیف کی تھی؟ ہم اُنکے اُن پنڈتوں کا نام بتا سکتے ہیں جنکے کمال اور وسعت علم سے اُنکے کان بھی آشنا نہیں ہیں۔

اور اگر اس مقدمہ کو ملا کر دیکھو" کہ مسلمانوں کو قرآن کے رہتے کسی اخلاقی کتاب کی حاجت نہیں ہے۔ مسلمان فلاسفر اپنے فلسفہ کی تصنیف میں تہذیب الاخلاق کے مسائل نہ بیان کرینگے عموماً وجہ یہ لکھتے ہیں کہ

ان الشریعۃ المصطفویۃ	اسلام نے فلسفہ تہذیب الاخلاق کو اس خوبی
قد فقت الوطر عن بحثھا بالکمل	اور تفصیل سے بیان کر دیا ہے کہ اس مسئلہ میں
تفصیل واتم تفضیل۔	بحث کرنے کی اب ضرورت بھی نہ رہی۔

تو اچھی طرح ظاہر ہو جائے گا کہ باوجود عدم ضرورت صرف ایک عمدہ تصنیف خیال کرکے مسلمانوں نے اسکو کتنی وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور اسے اپنے علمی خزانہ میں جگہ دیکر اس کی کتنی حفاظت کی۔ ؎

کس ندانست کہ آں یار کجا جلوہ گر است
گر ز فریاد و فغاں شور نہ بر داشتمے

سید سلیمان

از دار العلوم لکھنؤ

معیار تعلیم نسواں

ایک قدیم مثل زبان زد عام ہی کہ "زن - زمین - زر - تینوں لڑائی کا گھر" لیکن اب اس نئی روشنی کے زمانہ میں اس مقولہ کے جزو اول نے کچھ تو پرانی روشنی والوں کی حماقت کی بدولت اور کچھ نئی روشنی والوں کی بلند پروازی کے طفیل میں ایک نئی صورت اختیار کی ہی اور اخباروں اور رسالوں کے صفحات میدان کارزار بنے نظر آتے ہیں۔ قیاس کو جس حد تک دخل ہی اُس سے جو کچھ نتیجہ اس کاغذی جنگ کا عملی صورت میں ظہور پذیر ہونیوالا ہی وہ یہی ہی کہ نئی روشنی کی جماعت اپنی فتحمندی کا جھنڈا گاڑ رہے گی اور پرانی جماعت پھسڈی رہجائیگی۔

نئی روشنی والوں سے جو کچھ شکایت ہی وہ یہ ہی کہ اُنکے خیال کے پردہ زنگاری کی آڑہ میں کوئی ایسا معشوق پوشیدہ ہی جسکے حسن ظاہر فریب کی شیفتگی نے اُنھیں اندھا مقلد بناڈالا ہی یعنی تعلیم نسواں سے ان کی غرض محض تحصیل علوم ہوتی تو وہ لوگ نہایت ہی قابل قدر ہوتے اور اُن کی باتیں موتیوں سے بڑھکر بیش قیمت مگر وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تعلیم کے بہانے عورتوں کو بے پردہ کرکے اُن کی عصمت و عفت کا ستیاناس کریں اور اُنسے وہ کام لیں جنکے لیے خدا نے اُنکو مخلوق ہی نکیا ہی۔ دوسری طرف پرانی روشنی والے یہ چاہتے ہیں کہ یا تو سرے سے عورتیں جاہل ہی رہیں یا محض معمولی ادنیٰ درجہ کی تعلیم پر اُنکے جوہر عقل کا خاتمہ کردیا جاوے۔ دونوں میں افراط و تفریط ہی۔ اسلیے میں چاہتا ہوں کہ اس بارہ میں کچھ اپنی ناقص رائے پیش کروں اور وہ یہ ہی۔

اس میں شک نہیں کہ تعلیم لڑکے اور لڑکیاں دونوںکے لیے مفید چیز ہے کیونکہ علم ہی ایک ایسی صفت ہی جو انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز ہی تو پھر یہ بڑا ظلم ہی کہ مرد تو انسان بنے اور عورت حیوان رہے۔ اسلیے میں تعلیم نسواں کا سچے دل سے موید اور حامی ہوں لیکن مجھے کلام ہی تو اس میں کہ مردوں اور عورتوں کی تعلیم ایک ہی معیار ایک ہی درجہ

ایک ہی قسم - ایک ہی طریقہ سے ہونی چاہیے -

عورتیں چند وجوہات سے - مردوں جیسی اور جتنی تعلیم حاصل کرنے سے مجبور و معذور ہیں ۱؎ حال میں جو مضمون الندوہ میں تحریر المسلمہ کے عنوان سے نکلا ہے وہ کافی طور سے ثابت کرتا ہے کہ مردوں کے قوائے دماغی و عقلی عورتوں کی بہ نسبت زیادہ قوی اور وسیع ہیں - تو بس شملہ بمقدار علم اور علم بمقدار پیمانۂ دماغ ہونا چاہیے - ایسا نہو کہ مقدار سے زیادہ ٹھونسنے سے پیمانہ بھی بیکار ہو جاوے تو کف افسوس ملکر کہنا پڑے کہ ع

این ہم اندر عاشقی بالائے غم ہاے دیگر - ۲؎ عورتوں کے مدارج زندگی پر نظر ڈالنے سے بھی مجکو اس نتیجہ پر پہونچنا پڑتا ہے کہ اُنکے پاس باعتبار مردوں کے تعلیم حاصل کرنیکا زمانہ کم اور محدود ہے - وہ سولہ برس کے سن تک بے روک ٹوک میدان علم میں تحصیل علم کا گھوڑا دوڑا سکتی ہیں اور اس سے آگے بڑھکر بہتیری قسم کے موانعات ان کی تحصیل علم کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکانے کو تیار رہیں اسلیے نہ اُن کو آگے بڑہنے کا موقع ہے اور نہ اسکی کوشش کرنی چاہیے - بلکہ اُن کو اپنی دوسری جائز اور ضروری ذمہ داریونکے انصرام میں مصروف ہوجانا چاہیے - جن کی عدم تعمیل پر وہ دین اور دنیا دونوں میں مورد الزام اور مستوجب سزا ٹھہرینگی ماہرین علم الانسان کی تحریروں سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ لڑکیوں کے قوائے عقلی و دماغی سولہ برس تک روبترقی رہتے ہیں بعدہٗ ایک حالت پر ٹھہر کر روبہ تنزل ہوجاتے ہیں -

سولہواں برس وہ وقت ہے کہ جسوقت وہ کسی صاحب خانہ کی بیوی بنکر تاج عروسی سر پر رکھتی ہیں اور تجرد سے نکلکر تاہل کے خوشنما باغیچہ کی مالن بنتی ہیں اب انکے تعلق اس باغیچے کی درستگی و آرائش ہے - اسکے پھول اور پھل کی نگہداشت - اور اسی میں ان کو اپنا کمال دکھا کر دنیا میں نیک نام بننا ہے - کسی عورت میں امور خانہ داری کے انصرام کی قابلیت سے بڑھکر سچ پوچھیے تو اور کوئی وصف و خوبی قابل جستجو نہیں ہے - دومیسٹک اکانومی کی تعلیم اُن کو اعلیٰ درجہ پر دینی چاہیے - عورت کو مرد جیسی اور جتنی تعلیم دیکر مردوں کا کام لینا گویا گھوڑے کو

ہل میں چلانا ہی ۔ اور قوت سے بڑہکر بوجھ لادنا ہی ۔

عورتوں کو منطقی اور فلسفی تعلیم سے بڑہکر اخلاقی اور مذہبی تعلیم کی ضرورت ہی ۔ کیونکہ انہیں کے گہوارے میں بچوں کا وہ زمانہ کٹتا ہی جس میں اُنھیں ہر قسم کی بات قبول کر لینے کی اعلیٰ درجہ کی قابلیت موجود ہوتی ہی بچوں کی بچپن ہی میں اخلاقی و مذہبی تعلیم نہیں ہوتی اور اُنکے آداب عادات کی درستگی نہیں کیے جانیکا ہی آج یہ نتیجہ ہی کہ دو حرف انگریزی پڑہ لینے پر آسمان کے قلابے ملاے جاتے ہیں اور مذہب سے گھن آنے لگتی ہی۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ میں عورتوں کے لیے صرف اور محض مذہبی تعلیم ہی کو کافی ووافی سمجھتا ہوں۔ نہیں ہرگز نہیں اُن کو کل علوم سکھائے جائیں مگر جس کی جتنی ہی ضرورت ہو ہاں اس سے میں ضرور ڈرتا ہوں کہ ہمارے فلاسفہ دان نوجوان اپنی ہی سی اعلیٰ تعلیم عورتوں کو دیکر کہیں اپنی ہی طرح بلند پرواز اور گمراہ نہ بنادیں ۔

خلاصہ مضمون بالا یہ ہی کہ جبکہ صریحی وبدیہی طور پر بے پردگی کو خلاف عقل و نقل بڑے بڑے علامہ وقت نے ثابت کر دکھایا تو تعلیم نسواں میں بے پردگی کا دُم چھلا لگانا سراسر ہٹ دہرمی حامی تعلیم نسواں کو بھڑکانا ، اور تعلیم نسواں جیسی مفید چیز کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکانا ہی ۔ عورتوں کو کیا بلحاظ وقت اور کیا بلحاظ ضرورت اخلاقی اور مذہبی تعلیم زیادہ و اعلیٰ دینا اور دلانا چاہیے ۔ اور دوسرے علوم کی تعلیم محض رفع ضرورت کے انداز سے اُنکو ایک اعلیٰ درجہ کی خانہ دار بنانا چاہیے ۔ مرد کے برابر نہ اُنکو تعلیم کی ضرورت ہی اور نہ وقت ہی ۔ اعلیٰ وکامل تعلیم کی تو دونوں کو ضرورت ہی ۔ کیونکہ ادنیٰ اور ناقص تعلیم تو بجائے سنوارنے کے بگاڑنے والی ہی ۔ مگر دونوں کی تعلیم کے مدارج میں فرق ہونا ضروری اور لازمی ہے ۔

ابو الکمال ڈیسنوی

اشتہار

کارخانہ عطر مخزن شمیم

بفضلہ تعالیٰ ۴۰ برس سے یہ کارخانہ عطر سازی بہ نیکنامی قائم ہی اور خریداروں سے خوشمعاملگی اسکا فرض منصبی ہی۔ اس کارخانہ میں ہرقسم کے عطریات وروغنیات اور عطردان ساختہ قنوج وکلکتہ وبمبئی ومدراس۔ ہاتھی دانت وغیرہ کے وشیشیاں ہرقسم کی خوبصورت رنگ برنگ کی موجود ہیں۔

التماس۔ ایک مرتبہ امتحاناً تھوڑا مال طلب کرکے دوسرے کارخانوں کے مال سے مقابلہ کیجئے۔ ویلیوپے ایبل یا نقد قیمت آنے پر فوراً تعمیل ہوگی۔ مفصل فہرست طلب کرنے پر روانہ ہوگی۔

نام عطر	قیمت فیتولہ	نام عطر	قیمت فیتولہ	نام عطر	قیمت فیتولہ	نام عطر	قیمت فیتولہ
تنبول بہار	عــہ سے ۃ تک	روح خس	عما سے سے تک	دونہ وگل حنا	۸ر سے عما تک	شمامۃ العنبر	صہ ر
گلاب	۸ر " عــہ "	روح باندری	[illegible]	روح افزا	۸ر " صہر "	گل یعنی مٹی	۸ر سے عما تک
کیوڑہ	۸ر " صہر "	چمیلی	۸ر " صہر "	راحت روح	۸ر " صہر "	زعفران	۸ر " عما "
موتیا	۸ر " عصر "	باندری [illegible]	۸ر " صہر "	مشک عنبر	۸ر " صہر "	مدن مست	۸ر " سے "
حنا	۸ر " صہر "	مولسری	۸ر " سے "	مشک حنا	عہ " صہر "	سہاگ	۸ر " صہر "
روح گلاب	للعہ " ـہ "	خس وچمپا	۸ر " سے "	گیندا	۸ر " عما "	اگر	سے ر " عــہ "
						پان	۶ر " ۸ر "

تنبول بہار۔ پان میں کھانیکا مصالحہ ہی۔ اگر تنبول [illegible] برابر پان میں کھاویں تو پان نہایت لذیذ اور خوشبودار ہوجاتا ہی اور بلاتمبا کو کھانے والے بھی بخوبی کھا سکتے ہیں۔ فیڈبیا ۴ر فیدرجن عہر۔ عطر کی ٹکیاں ۴ر و ۶ر روغن چمیلی عما ر سے عــہ سیر تک روغن بیلہ وحنا وکیوڑہ عما ر سے صہ ر سیر تک۔

المشتہر حاجی محمد حسن [illegible] جنرل مرچنٹ قنوج ضلع فرخ آباد

and truthfulness. He hated flatterers, and as he himself was not versed in the art of plotting and underhand dealings, he despised people of this type and therefore it was impossible for mean and cringing parasites to find any place under him His conversation was easy and sensible. He enjoyed light jokes and humorous sayings, but never indulged in ridicule. He was fond of music, poetry, and the fine arts, and valued much mathematics and history. Had he found time for study no doubt he would have become a profound scholar. All his time was occupied in affairs of State, and centralization was the great feature of his system of government.

There is a large number of politicians at the present day in India, but their reputation is merely Indian. Outside India they are known very little. But Sir Salar Jung's reputation is world-wide. We may have a great admiration for these politicians; but it is by Sir Salar Jung and Sir Saiyed Ahmad Khan that we want "to be represented at the International congress of world-great men—by Sir Salar first and next Sir Syed."

SYED ALI RAZA.

tion *i.e.* the restoration of Berar he had no other ambition. And therefore in the hot weather of 1882 Sir Salar paid a brief visit to the Viceroy at Simla. Though he stayed there only for a short time his charming manners and civilities made him a host of friends. Especially did the Viceroy and Lady Ripon treat him with kindness. Thus he was able to obtain the Viceregal consent to make arrangements for H. H. the Nizam's visit to England in the following year. The objects of this intended visit must have been various, but it is said, that by this Sir Salar hoped to realize the aim which throughout his life seemed to be chimerical and by the warmth of his reception at Simla it was understood that the object of his Mission would have been attained if H. H. the Nizam had laid personally his claim to the districts of Berar before the English Parliament. "If he had been a European Statesman," writes the Times of India, "the only word that can describe his conduct throughout is that of patriotism, and a patriotism as devoted as that of Gambetta or Bismark."

The year 1883 is a memorable year in the history of Hyderabad. Arrangements were being made for H. H. the Nizam's visit to England. The programme was in preparation, according to which the party were to leave Bombay on the 6th April, spending some weeks on the continent and reaching England about the 20th of May; when all of a sudden a terrible calamity befell the dominions. On the 5th of February Duke John of Mecklenburg-Schwerin arrived at Hyderabad on a short visit. Sir Salar who was known for his hospitality and kindness arranged about showing the Duke the principal sights of Hyderabad and a dinner was to be given on the 8th. of the same month. On the evening of 7th February the Duke was invited to a garden party at his palace near the Mir Alam Tank, and they spent a pleasant hour or two on the beautiful lake. The guests as well as the host parted with good hopes for the ensuing entertainment. Sir Salar returning to his palace as was his habit, worked till eleven in the night and then retired to bed. About two o'clock in the morning he was attacked with cholera, the disease to which there is only one end. By 5 o'clock in the evening of February 8th the great minister breathed his last.

Sir Salar Jung was a man of steady habits. No reform, however important, was carried out by him in raw haste. He loved conservatism, but if any good was to be derived from a liberal policy he was ready to modify his own views. He respected time-honoured principles and was always true to his word. His personal qualities consisted of justice, humanity,

their power; and I have full confidence that this alliance, which has existed for more than a century, will not only be maintained in the future as heretofore, but that as you rightly observe, the bond of amicable relationship between the people of England and India will be daily strengthened"

With this the ceremony was brought to a close and Sir Salar Jung, accompanied by the members of his suite, was escorted from the Guildhall by the Lord Mayor to the Mansion House, where a selected company had been invited to meet His Excellency at a dejeuner which was served in the Egyptian hall. The whole way from the Guildhall to the Mansion House was lined by an excited but well behaved crowd, anxious to catch a glimpse of the great Indian, and the reception accorded to Sir Salar Jung must have been extremely gratifying to him. The company invited to the dejeuner numbered about three hundred.

By reading his various replies to the addresses presented and the speeches delivered on these occasions it seems that Salar Jung was always actuated by one motive *i. e.* the welfare of his own master in particular and mankind in general. In whatever he accomplished during the trying days of the Indian Mutiny and after, he was guided by a spirit of patriotism and duty. In the month of August 1876 he left London for India and from his arrival at the capital till his death he was engaged in the performance of his heavy and responsible work.

Until the day of Lord Lytton he was always treated with the greatest confidence and esteem by the Government of India; but during this time he was trying for the restoration of Berar, and at the suggestion of the Secretary of State he made a fresh representation to the Governor-General. This had for a time caused a rupture between Sir Salar and the nobleman at the head of the Government in India. In 1878 when the present Nizam H. H. the Nawab Mir Mahboob Ali Khan Bahadur left Hyderabad for Delhi to attend the Imperial Proclamation Sir Salar was made to feel that he had offended the Viceroy. By this he was deeply hurt. The unpleasant and restrained relations continued till the arrival of Lord Ripon in India; and with the appointment of Sir Stuart Bayley to the Residency of Hyderabad he was restored to the same confidence and favour as of old. It was really the chief aim of Sir Salar that to crown his services he should get back those territories which were assigned to the British Government in Lord Dalhousie's time. His private life was very simple and he had nothing to gain by the change. Apart from this ques-

The Lord Mayor wore his state robes on the occasion, as did also the Sheriff, and the common councilmen appeared in their Mazarine gowns. The ceremony was graced by the presence of the Lady Mayoress, Miss Cotton, and other ladies. Shortly after 10 o'clock Sir Salar Jung, accompanied by the members of his suite, entered the council Chamber, escorted by the mover and seconder of the address conferring the Freedom, and took the place of honour assigned him on the dais as the guest of the day, the members of the court rising in a body to receive His Excellency as he walked up the floor to the place of honour. Mr. Monkton the Town Clerk at the request of the Lord Mayor having read the resolution conferring the Freedom, the Chamberlain of London, Mr. Benjamin Scott, who wore his official costume said, turning to Sir Salar Jung :— "It has not happened heretofore that the minister of an Indian ruler has received the honorary Freedom of this ancient city and its bestowal upon your Excellency, while it is intended as a personal compliment to yourself, is also the expression of a desire on the part of this corporation for a closer intimacy between this country and the independent native Princes of the East who are Her Majesty's valued allies. Among those native sovereigns none have been more faithful to the British Government than H. H. the Nizam of Hyderabad, and his father the late Nizam. H. H. The late Nizam and your Excellency, his enlightened adviser, not only adhered with the utmost strictness to treaty engagements contracted with the Honourable Company of Merchants of this city, who then ruled our Indian possessions, but your conduct inspired the British Resident with such convictions of your ascendency and fidelity that he was encouraged to despatch the Hyderabad contingent to aid the hard-pressed British forces, thus contributing materially in the suppression of a revolt which had it succeeded, might have arrested the progress of civilization and good Government in the East." The speech delivered in answer by His Excellency is long and elaborate, out of which I quote only the following few sentences. After thanking the corporation in the usual manner for the high distinction they had conferred on him, Sir Salar said, "It is a matter of peculiar satisfaction to me to learn the high value you attach to the loyalty of my master, the Nizam, as one of the Independent Native Princes of India who are the allies of Her Majesty, a closer intimacy with whom the city of London expresses a desire to cultivate......................... I am much gratified to have the opportunity of assuring you in this place that since the time when the connexion between the British Government and H. H. the Nizam was first established, the one desire on the part of the rulers of the State and their ministers has been to maintain the alliance in every way in

bad and on his return invited the minister pressingly to pay a visit to England as his guest. Sir Salar proceeded to England in April 1876. On his arrival in Paris on May the 13th he met with an accident by slipping on the stairs of the Grand Hotel. This caused him to break a thighbone. Though the bodily pain must have been terrible Sir Salar was not for a moment out of humour. He was only uneasy for the delay caused by this accident in reaching England. The party landed at Folkestone on the 1st of June. Among those who came to give him an honourable reception the Marquis of Tweeddale was also present. As he was still unable to walk on foot he "was carried ashore in an armchair by a party of English sailors" and replying to the address presented by the Mayor of Folkestone he apologized for not being able to rise. He receiv-ed a most enthusiastic welcome from all classes and was invited to dinner both by the Prince and Her late Majesty the Queen Empress. The University of Oxford conferred upon him the degree of Doctor of Civil Law. He was next invited to dine with the Marquis of Salisbury. And in return he gave enter-tainments to their Royal Highnesses the Prince and Princess of Wales, and a good many noblemen. Then he paid a short visit to the North and saw some chief places of interest, staying as the guest of the Duke of Sutherland at his residence at Trentham and Dunrobin. During his sojourn in Great Britain he received a number of addresses from various institutions and classes, the most prominent of them being the following:— The East India Association, The Scottish Town Councils, The Manchester Corporation and Chamber of Commerce etc. Sir Salar Jung took great interest in Eastern ways and manners. For instance when he had the honour of entertaining the Prince of Wales at his residence in Piccadilly he held previous to the dinner a durbar according to the Eastern custom and offered a present of 101 gold mohurs to the Prince by whom it was touched and returned. Also at the time of his presentation to the Queen he had offered the same amount to her late Majesty. The presentation of the Freedom of the City of London to him is one of the happiest events which he was fortunate enough to enjoy during his visit to England. The manner in which this ceremony was performed is not only a new thing to us but it also throws light on the esteem in which he was held by the English nation.

On July 25th at a special meeting of the Court of Common Council, held at the Guildhall, the Lord Mayor presiding, the honorary Freedom of the city, in a gold box of exquisite work-manship, was presented to His Excellency. The ceremony was conducted in the Council Chamber and excited much interest.

boob Ali Khan Bahadur was a mere child of three years at that time. It was not strange that the regency of Hyderabad should devolve upon Salar Jung. The Nawab Shumsul Umara in whose kind memory the Principal's Hall of the M. A. O. College was erected, was appointed co-regent. Thus Sir Salar was now free to see the important places in the dominions and to adopt wise and useful measures for the welfare of the masses. He did away with the old-fashioned staff and replaced it by better men on large salaries from northern India and other places. The education of the young Nizam, which was an object of solicitude especially to the minister, was conducted on the soundest possible lines by means of tutors.

To improve the sanitation of the city which was a hot-bed of diseases he surveyed every nook and corner of Hyderabad. Old houses were pulled down, streets broadened and water-works were constructed. These reforms were not confined to the capital, but throughout the dominions, roads were made and railways introduced, irrigation works constructed on a large scale and water supplies were provided for the main cities. All these improvements were made in such a manner that the state can be truly said to *vie* with some of the advanced European countries. Among other notable reforms he organised Public Schools. His sole aim was to impart to the people an education and training of a high order so that the rising generation in general and the sons of the nobility and gentry in particular should be able to take an active part in the administration of the country.

In 1875 the minister with a few selected nobles of Hyderabad went to Bombay to represent the young Nizam on the occasion of the reception of H. R. H. the Prince of Wales. The Prince gave some presents both to Salar Jung and the Nizam. Those given to the minister "consisted of a sword with a silver scabbard, the belt studded with jewels, a massive gold ring, a large gold medal with a medallion of the Prince on one side and on the other three ostrich feathers, and the Prince's motto beneath them, and three large books bound in Morocco. The presents given to the minister for H. H. the Nizam were a finely-wrought silver flagon of the time of the Duke of Marlborough, a large gold medal attached to a broad blue ribbon, a massive gold ring, three finely finished rifles, and four books in red morocco with the Prince's monogram on the cover of each."

In January 1876 the Duke of Sutherland, one of the suite of H. R. H. The Prince of Wales, paid a flying visit to Hydera-

country began to improve by leaps and bounds. It was a great thing to re-establish the credit of the Government. He cut down many unnecessary export and import duties and consequently trade began to flourish. This period is also famous for the introduction of the Zillabandi system *i.e.* the division of the dominions into districts, abolition of payment in kind, and sundry other reforms. His earnest and sincere desire for the welfare of the country of which he was Prime Minister and his strict and honest conduct in the way of reform created him enemies. Several attempts were made on his life. Once in 1860 while he was conversing with the Resident in the Nizam's court and all the audience were waiting for His Highness', arrival a mal-content rushed on him with a drawn sword. But fortunately both the dignitaries were saved by the interference of some minister's men and the assassin was cut to pieces.

Previous to his regime the administration of the Nizam's Government was conducted on a different footing. The whole dominions were divided into two parts—Surfi Khas and Dewani. The administration of the former belonged to the Prince himself and the management of the latter corresponded to the modern form of civil administration. But Salar Jung made the distinction of the two divisions clearer and the management of the civil departments was raised on a firmer and sounder basis. In 1868 four ministers were appointed for the Judicial, Revenue, Police, and Miscellaneous departments. By these new regulations not only was the public treasury full but the income of the state exceeded the expenditure, and the credit of the Government was proportionately high. All this was due to the abolition of the old method of raising revenue which was indiscriminately based on the contract system in the following manner. Almost all the districts were assigned to contractors, some of whom held military posts, others did the work of bankers, and others were private persons. The practice was that these officers were made to hand over to the state what remained after the deductions made for their departmental expenses. The vice of this system is obvious. It was Salar Jung who, as I have mentioned above, appointed Government Officers to raise revenue on the same model as is in force in British India. In the same year, for these valuable services rendered to the state and his unswerving loyalty to the supreme Government he was made a K. C. S I. by the British Government.

In 1869 H. H. the Nawab Afzal-ud-Daula died and from that time opens the third chapter of Sir Salar Jung's brilliant career. The present Nizam, His Highness Nawab Mir Mah-

debtor by the law, the powerful creditor could commit any number of atrocities he liked. These unfortunate people were imprisoned in a Jamadar's house. Sometimes they were starved to death and sometimes they were fed on bread and water until they paid all the loans.

He was introducing both his administrative and physical reforms one by one and was contemplating a good many schemes for the regeneration of the most mismanaged Native State in India when all of a sudden the news of the Great Mutiny reached Hyderabad. A telegram was received by the Resident from the Governor of Bombay. He wired. "If the Nizam goes all is lost." Here I quote Mr. Saiyed Husain Bilgrami, "No one knew this better than the Resident and Salar Jung. To the latter the condition of affairs at this time has been well described as a "trial," the tension and force of which can never be understood by a European and a Christian." The position was a trying one. Had it not been for Salar Jung's loyalty to the British Crown and his wise measures which discouraged the unbounded fury of the Rohillas and other hot-headed persons Hyderabad would have taken part in the rebellion, and this undoubtedly would have set all Southern India in open revolt, as the people of Madras and Mysore were waiting for the example of the Deccan people. Major-General Hill who was a commander of the Nizam's troops at the time informed the Home Government in the following words. "These energetic measures saved South India, for had the people of Hyderabad risen against us, the Mohammadan population of Madras would, it was well known at the presidency, have followed their example, and it is but just to this distinguished man—Salar Jung—that the people of England should be informed how entirely the stability of British rule in South India was owing to the wise and energetic measures adopted at the crisis by Salar Jung." In spite of all these measures the Residency was slightly attacked and his own life was held in great danger during the gloomy months of the Mutiny. His noble conduct and faithful services also those of his master H. H. the Nawab Afzal-ud-Daula were rewarded by the British Government. In the beginning of 1859, Lord Canning sent a letter to the Nizam where he expressed on behalf of the Supreme Government his sincere thanks for the latter's unshakers loyalty during the critical period of the Mutiny, and His Highness was created a K. C. S. I.

Now opens the second chapter in the history of Sir Salar's life. The ceded districts, with the exception of Berar, were restored by the British Governm:ent, and the resources of the

been quite content to remain in unmolested possession of my uncle's Jagirs, were it possible, without the cares which such an office would impose upon me, especially in the present critical state of affairs here, but I was advised by my friends, Europeans and Natives, and with too much appearance of truth to reject the advice, that if I declined the office myself and my family would be utterly ruined....................I shall, nevertheless, do my best with God's help to restore some order in the affairs of this country and endeavour to extricate the Government from its embarrassments. I trust you will defer giving effect to the intimation conveyed in Mr. Royson's letter of selling the jewels for a further short time, as you may depend on my using my best efforts to make arrangements for their redemption as early as I can." The jewels referred to in this letter were those that had been mortgaged by H. H. the Nawab Nasir-ud-Daula for raising money to pay the salaries in arrears for months. Anyhow the jewels were redeemed by Salar Jung. The country then stood in need of many administrative reforms. His predecessors were weak Dewans, the subordinate officers were corrupt and undeserving and their pay was in arrears for years. Even the contingent charges used to be left unpaid and to make the situation still worse, the districts of Berar, the Raichur Duab, and other Taluks of Bhom, Alipore etc. were surrendered to the Hon'ble East India Company. Although for a time the Government of the Nizam was relieved of the heavy charges of the contingent forces by the assignment of the above places yet a new difficulty arose from the side of those jagirdars whose lands had fallen in the ceded districts. There were a hundred other similar obstacles in his way when the great minister assumed charge of his exalted office in his 24th year. This paper, I am afraid, will grow tediously long if I go through all of the reforms in detail. Therefore I shall be content with a brief description of the few; but at the same time no interesting incident will be left out.

The most striking difference between the previous ministers and Sir Salar Jung as regards policy was that very shortly after his appointment he applied to H. H. the Nawab Nasir-ud-Doula for the increase in his ministerial powers, which request was however granted after some hesitation, and fortunate it was both for his success and the public good that these prayers were not refused. One of his admirable reforms consisted of putting a check on the power of the Arabs, and the disbandment of the irregular troops maintained by the state. The Arabs and Rohillas lent money to the people at exorbitant rates of interest and as there was no protection given to the

Tasadduq. There is a striking analogy between the well known story of Baber praying for the recovery of his only son and that of Sir Salar's illness. Sir Salar's grandfather prayed that if any evil were to befall the lad it might be sent to himself, and if Turab Ali were really to die he prayed that his own life might be granted to the child. It is wonderful to note that immediately after this prayer the delirious child began to recover and shortly afterwards the old man died. Sir Salar owing to this illness was very delicate for the first 12 or 13 years of his life. From this time up to the age of 19 he was made by his uncle Siraj-ul-mulk to undergo a regular training, both mental and physical, such as was then in vogue. The youth being an orphan, as his father died just a few years after his birth, was held in great affection by all the family. This education consisted of a moderate knowledge of Persian and Arabic, fencing and other physical exercises. Riding which is a fashion at Hyderabad "was a passion with Salar Jung". When he came of age he studied English independently. No doubt the unreserved and mutual intercourse with the Residency may have assisted him much in learning the correct use and idioms of the English language; during his later days he had acquired such a mastery over it that it was as familiar to him as his mother tongue.

His public career begins from 1847. At this time he was appointed by his uncle as a Talukdar of some districts in Telingana. In financial matters and in executive work he was greatly assisted by the hands who had worked under Mr. Dighton. While acting as private secretary to his uncle who was the Prime Minister to H. H. the Nawab Nasir-ud-Daula, he acquired a good deal of experience. His uncle having great belief in his shrewdness used to ask his opinion on points of difficulty and the young man's advice very often proved useful and sound.

On the death of his uncle in 1853 he was appointed by H. H. the Nawab Nasir-ud-Daula to the high position of prime minister. In a letter addressed to the same Mr. Dighton whose name is already mentioned, announcing the news of his being made Dewan he promised to regenerate the corrupt state of the dominions, and truly he fulfilled his promise. He wrote, "On Monday evening, 30th May, I was unexpectedly ordered by H. H. to attend the Durbar the next day, and to bring two sarpainches (head ornaments), and also to write to the Resident and ask him to attend at the same time; and without solicitation on my part or on my grandmother's H. H. was pleased to confer the office of Dewan on me at the Durbar the day before yesterday (31st May). I should have

Hyderabad. The Nizam is said to have sent his own elephant for escorting the victorious general into the capital. Great honours were lavished upon him and his success made him a large number of enemies. For a time he was imprisoned in a fortress near Hyderabad, but after the death of Azam-ul-Umara he was released and made minister in 1804, which post unfortunately he could not live to enjoy for more than four years. He built the *bund* of the tank near Hyderabad which bears his name, and quite close to his palace a quadrangle on the model of the Roman forum still exists. These, it is said, were constructed out of the fortune he had amassed in the Mysore wars. In 1791 when Tippoo Sultan was suing for peace Mir Alam was sent by the Nizam to Lord Cornwallis's camp to discuss the proposals. Below is a quotation taken from a letter despatched by the Governor Generalto the Nizam's Government. In this he expresses his pleasure at receiving Mir Alam as the Nizam's representative. He wrote, " Having had the pleasure of a former acquaintance with Mir Alam, and at that time having been fully convinced of his abilities and good qualities, of his zeal for your Highness's welfare, and his earnest desire to strengthen and increase the intimacy between the Company and your Highness's Government, I was made very happy by the choice of Mir Alam as a person of confidence and authority to join me and to preside on your part at any congress of deputies that might assemble, in order to examine and discuss the claims and pretensions of all parties concerned, and to consult on terms for an honourable and advantageous peace. And since his arrival his conduct has proved the wisdom of your Highness's selection of him, and by confirming the sentiment I had before imbibed of his warm zeal for the prosperity of your Highness's Government, and of his earnest desire to cement the friendship between us and to promote the success of the alliance, has afforded inexpressible satisfaction ".

Salar Jung's early education and training were not such as to befit him for the difficult and responsible task for which his later life is so much distinguished, but signs of genius and ability were not difficult to be traced. The old folk of Hyderabad had hopes of the intelligent lad, and physiognomists of the day expected high deeds of him. There is nothing much worth relating in the early years of this great man's life. An interesting story is still prevalent among the old people of Hyderabad, that once upon a time the youth was attacked with typhoid fever, and the case was getting worse day by day, and his grandfather therefore had become utterly hopeless of his recovery. One day the old man was struck with the idea of performing a peculiar ceremony which is known amongst Musalmans as

only two or three of the most noteworthy. Shaik Mohammad Ali the tenth in the line married into the family of Mulla Ahmad who was a noble at the court of Adil Shah at Bijapur. Through him he tried his luck and was appointed to the post of private secretary to Adil Shah. Mulla Ahmad was sent as a deputy of Adil Shah to arrange peace with Raja Jeysingh who was leading Aurangzeeb's forces in the Deccan. But forgetting his real mission he went over to the emperor's side and was highly rewarded by the latter. A firmán was despatched from the Mogul court conferring on him the rank of six thousand foot and six thousand horse, and Rs. 2,50,000 in cash; and he was further led to hope that after his introduction to the imperial presence he would receive an honourable title, such as Sadulla Khan, and other high distinctions. However he was not destined to derive any material gain from these encouragements as he met with his death at Ahmednagar. But, in return, his son Mohammad Asad was favoured by the Emperor with the command of 1500 foot and 100 horse, and the title of Behram Khan.

The most noteworthy person whose brilliant career was second only to the subject of this paper is Mir Alam, the great-grandfather of Sir Salar Jung. He was descended from Nuria Saiyeds of Shustar in Persia. This dynasty is famous for their scholarly contributions to Islamic literature. His father Saiyed Raza was a most learned scholar and is known for his commentaries on the Quran. After his settlement in Hyderabad he did many an act of generosity. There is a story told of him that he used to pay a weekly visit to H. H. Nizam Ali Khan. He was granted a special favour of recommending one man for the Nizam's patronage on the occasion of his visit. On Tuesday, the day appointed for his interview, his house was besieged by a number of followers who were in need of the Prince's favours. "He is said to have always promised his recommendation to whomsoever came first". After his death his eldest son Saiyed Abul Kasim Mir Alam who was born at Hyderabad in 1752 was employed by Azum-ul-Umara. and during Mr. Johnson's mission in 1784 Mir Alam acted as Secretary of the minister. He received a good education, and the ability and intelligence which distinguished him so much afterwards could be marked in his early life. His Persian letters which are collected in book form give a testimony of his able penmanship. He is also credited with having written the well known history of the Deccan, the Hadikatul Alam, named after him. He commanded the Nizam's troops in the wars waged against Tippoo Sultan, and after the fall of Seringapatam, was received with great distinction on his return to

prayer to Pallas Athene, retracts his first devotion, crying that she is the goddess of *ennui* ; and certainly this calm reasonableness is not for many at the present day, not even for Arnold himself, except at intervals. The world is too complex for that, too bewildered and uncertain. There is, too, in the Greek spirit and in the spirit of Arnold something exclusive and disdainful, a scorn of the common herd, which brings its own punishment in the failure of such a spirit to attract any but the cultured few. Nor does it lead to victory in the battles of life. It is the barbarians, the vulgar, the coarse, the narrow-minded, who carry out great movements and accomplish great advances ; the Arnold avails but to moderate their excesses and repair their errors. But just as, from the fever and unrest of modern days, men look back to the classical calm of Sophocles and the austere purity of Pheidias, and are refreshed, so one cannot but feel, whatever changes in taste the lapse of years may bring about, the poetry of Arnold will always command an audience, to whom it will minister consolation in defeat, and strength for renewed endeavour.

H. I. BELL.

Papers of the Historical History.

SIR SALAR JUNG.

Of all the actors that have played on and retired from the stage of Indian politics the hero of this paper was not the least important. It was in 1829 that the great minister of whom the following pages give a brief account saw the light of day.

His Excellency Nawab Mir Turab Ali Khan Bahadur, Sir Salar Jung, Shuja-ud-doulah, Mukhtar-ul-Mulk, G. C. S. I. and D. C. L. was the only son of Mir Mohammad Ali Khan Bahadur. Salar Jung, Shuja-ud-doulah, and his mother was a lady of great distinction as being the daughter of Saiyed Qazim Ali Khan Bahadur, Mukhtar-ud-doulah, who was descended from Saiyed Jafar Rizni of Naishpur (in Persia).

"The family derives its origin from the famous Shaik Ovais Karani of Medina from whom the present representative Nawab Mir Yusuf Ali Khan Bahadur Salar Jung is the 35th in descent". Since their immigration into India Sir Salar Jung's ancestors have held respectable posts and many of them have left a name behind. But for brevity's sake I shall describe

confidence. Dignity, self-restraint, clear perception of the values of things, endurance—these are the keynotes of his thought, and these qualities of thought are reflected in the verse which embodies them. Unmusical, plain even to boldness, prosaic, it sometimes is; but it is never disfigured by exaggeration or affectation. The faults, when it is faulty, proceed from an absence of poetic fire or a defective ear; its merits from the nobility of the thought. This it is which gives Arnold's finest poems their wonderful dignity. Great thought has melted into poetry, not indeed poetry which sings with careless rapture, but poetry weighty with high meanings; poetry self-restrained, proportioned, where not a word is superfluous, not an image thrust in for ornament; poetry simple with the simplicity of a Doric column or a statue of Pheidias. The "Fragment of an Antigone," though there are touches of flat prose, as in "The fraudulent oath which bound to a much feebler weight the heroic man." is full of the cold, unadorned force of some of the great Greek choruses, and far more in harmony with their spirit than the gorgeous and sensuous romanticism of Swinburne; and in finer poems, like, "The Strayed Reveller and "Dover Beach," we get similar verse where the thought naturally moulds the words into rhythms and harmonies corresponding with its own calm strength, and quickens into phrases of naked grandeur like "down the vast edges drear and naked shingles of the world." In the well-known sonnet, "Austerity of Poetry," Arnold has compared poetry to the bride clothed in bright raiment, but with a garment of sackcloth next to her skin; and this comparison is full of instruction to the critic of his own works.

The Greek quality in Arnold appears conspicuously in the endings of his poems. Nothing is more significant than a comparison between the conclusions of a Greek, and of a modern, speech or tragedy. There all breathes of calm and reconciliation; the chorus passes slowly from the orchestra, the orator's voice sinks gradually away; but we love a peroration and an effective "curtain." Pericles ends his supreme funeral oration with the, alas ! to many moderns, anti-climax: "And now, having mourned each his own dead, depart home;" and in the same spirit Arnold allows the passion and grief of Rustum to die away into the majestic description of the Oxus. Scores of his poems have similarly dignified endings.

This then is Arnold's gift to men; noble dignity and self-restraint, alike in thought and word, "sweet reasonableness,". love of proportion, hatred of the extreme and exaggerated' The spirit has indeed its defects. Renan, at the end of his

of this length even to touch upon all the aspects of his work, I shall devote my attention exclusively to this ; recognizing nevertheless that there are other sides from which he might be viewed with profit.

He is the supreme example in the 19th century of the classic ; and there is no poet in our literature who better expresses the Greek spirit in its more serious manifestations. To define that spirit is not easy. It is the spirit expressed by the untranslatable word *metriotes*, the spirit which appears in the famous the phrase "*meden agan*" ("no excess,") the spirit which, at the very dawn of Greek literature inspired Hesiod to say that "the part is greater than the whole ;" the spirit which abhors extravagance, which has an innate sense of the fitness of things, which loves proportion and balance, and which in all its activities is ruled by law. This spirit Arnold had in the highest degree, and he shows it not less in the matter than in the form of his poetry. His thought is always sane and balanced, his outlook on life like that of the poet he loved, steady and large. No passionate enthusiasms are expressed in his works, but on the other hand there is no unmanly despair, nothing morbid or neurotic. His calmly critical mind sees too much to accept either optimism or pessimism unreservedly ; and a note of sadness, which is never despair of hope, which knows its own limitations, of proud endurance, which never parades its suffering before the world, is heard in all his most characteristic poems. He is, indeed, in many respects quite unlike the Greeks ; he has not the Greek delight in sensuous life, and problems trouble him and bring an unrest into his soul which are wholly modern ; but in his reasonableness, his self-restraint, and his mournful resignation we are continually reminded of some of the greater Greek poets, of Sophocles or Euripides. His creed is in many respects Stoical.

> "The mute turf we tread,
>
> Solemn hills around us spread
>
> This stream which falls incessantly,
>
> The strange-scrawled rocks, the lovely sky,
>
> If I might lend their life a voice,
>
> Seem to bear rather than rejoice."

But it is incorrect to call him a Stoic ; he has not the Stoic dogmatism, nor the Stoic narrowness, nor the Stoic

are in his poems moments of passion, he is as a rule too criticali too rational, to give himself up more than partially to such influences. Again, he has hardly any natural magic, and indeed it is comparatively seldom that he attains the quality of inevitableness, which marks the highest poetry. His verse does not sing ; he is not, in essence, a lyrical poet. But, it will be said, he wrote many lyrics. That is true ; but the form of a poem, especially in modern times, is no guide to its essential quality ; and just as some passages of blank verse are entirely lyrical, so there are many lyrics, whose lyrical character is confined to their form. A lyric is, in fact, properly speaking, a song, crystallised emotion, or, if thought, at least thought so transfused by emotion that it loses its original nature and wells into natural music. It is but rarely, as in the chant of Callicles, that Arnold attains this spontaneous rapture. His ear too is sometimes very faulty ; lines like "Through the loose clouds lifts dimly" are too frequent and many passages, excellent as their thought may be, read more like prose than poetry, because the thought has not been sufficiently mastered by emotion. Nor shall we find in him much dramatic power; he criticises life rather than creates it. Nor yet has he the exuberant optimism of Browning, the Elizabethan delight in life and the glory of life, Byron's energy, or Wordsworth's mystical communion with nature. The mention of this last poet is instructive, for Arnold was one of Wordsworth's most devoted admirers and one might expect him to have shared his point of view. But as a matter of fact, Arnold's relation to Nature is utterly different. He has none of Wordsworth's mystical perception of the divine, which is akin to the human, in all life, he regards Nature as alive indeed, but alive with a life which is not man's, a life strong and calm, but unmoral. In a well-known sonnet he ridicules a preacher who had spoken of being " in harmony with Nature ;" and similarly he cries "In the shadow Wordsworth lies dead..............nature is fresh as of old. Is lovely ; a mortal is dead." There are in his works many exquisite descriptions of natural scenes, written with great vividness, bright and distinct, but in hardly one is to be found any sense of kinship with Nature, any perception of the underlying Spirit of the World. Nature is in fact seen by him from without, she goes on her way, we on ours. Perhaps the only exception is the poem "Parting," in the Marguerite series, where nature is the poet's refuge from sorrow.

If his critical nature was adverse to the development in Arnold of certain qualities of the poet, yet it constituted at the same time his greatest merit ; and it is indeed just this which gives him his title to a permanent place in our poetical literature. Accordingly, as it is obviously impossible in a paper

battle of life. The formula "art for art's sake," in its literal interpretation is at variance with the instinct of mankind. Perhaps the truest method of examining, in a short essay, a poet or any other imaginative artist is then to ask, not indeed what is his "message," what he "teaches" us, but what it is which he, and he alone, gives us and what is the value of that which he gives for human life; the standard of criticism must be, to use a German expression, one of "life-values" (Lebensverthe.) This in not to be understood as meaning that a poet is not a great poet unless he expresses certain moral truths about life, certain exhortations to right living and right thinking; and indeed the greater a poet is in the essentially poetical qualities, the less of such definite "teaching" shall we find in him. What is meant is that poetry, being insight, sets before us the truth of things and so, unconsciously as it were, furnishes us with something of positive value for conduct; and the mere revelation of a poet's personality, or the mere mould which he gives to his matter, may be of immense influence and inestimable worth. It is not enough for a poet to write harmoniously and elegantly; if he but describes experiences which he has not himself in imagination passed through, if he presents us with emotions which he has not himself felt, if he throws his materials into a form which he has not made his own and so, in a sense, unique, he may please for a moment, but he neither will live nor deserves to live, at least as a poet.

Mathew Arnold, the poet of reflexion, is much easier to criticise from this stand-point than a writer whose "life-value" resides entirely in his spirit and style; and he has consequently been a frequent prey of the lesson-hunter. He has himself defined poetry as a criticism of life. Now in a sense, this is a true description, though scarcely a definition, of all poetry; for the mere process of selection, which every poet as artist, must perform, is itself a criticism of the poet's material, and that material is life; but it is a description peculiarly appropriate to the author's own works. He is, in fact, primarily a critic, and it is his critical faculty which constitutes both his merit and his limitation. It will perhaps be well first to consider his limitations; for having discovered what he is not, we shall more easily perceive what he is.

In the first place, then, he has but little passion. In one of the poems to Marguerite he speaks of his "starting feverish heart"; but if he passed in youth through a period of "Sturm und Drang", little trace of it remains in his works; it survives only in a vague melancholy and discontent, which sounds as an under-note of nearly all that he has written; and though there

result of keenness combined with practice. Only ten weeks ago he was so much a beginner that he was given an old polo-stick handle with which to practise. Now he has defeated the best riders in the place.

The improvement of the cricket ground has been mentioned several times in the cricket notes of previous issues. The scheme for this improvement has now been adopted and work has begun. When finished the ground will be considerably longer and slightly broader than at present. Further the levelling of the ground is to be carried out so that the whole area may be watered from a raised channel proceeding from the well at the city end of the ground. The work will take up the whole of the rainy season, but it is expected that play will be possible at the beginning of next term.

The Football Club has sent an "A" team away on tour to Meerut and Delhi. It is not possible to give an account of the tour in this issue, but we hope to be able to describe the fortunes of the team in a succeeding number. A large proportion of the XI is composed of young players. During the whole of the last hot-weather the improvement of the junior players has been steady and it is hoped that they will give a good account of themselves when playing for the college.

The Poetry of Mathew Arnold.

"LIFE IS MORE LIKE WRESTLING THAN DANCING"

Marcus Aurelius.

A common method of criticising a writer at the present day is to enquire what is his "message." Always a perverted stand-point to assume towards an imaginative artist, it is in poetical criticism absolutely fatal; the man who sets out to hunt for a poet's message is in the right way to miss the poet. But there is a true instinct at the bottom of this tendency; the feeling, namely, that poetry, if it is true poetry, is valuable not merely because it beautifully, harmoniously and fittingly "imitates" or recreates certain objects and emotions, whether good or evil, but because by virtue of that re-creation it gives to us something over and above the pleasure we derive from it, something which is of value to us as men and as combatants in the

if they would only put their heart into their work, Doubtless the many-sided life which the Aligarh student leads has something to do with this mediocrity in examinations, but it is not impossible to earn high scholastic honours in spite of taking interest in other matters.

In the same issue of the Gazette appear the names of three 'Old Boys' of the College who have been appointed to the newly created post of deputy superintendent of police. In the Second Grade is Mohammad Amin, who some years ago was Cricket Captain; while in the Fourth Grade are Mohammad Hashim B. A., and Said Mohammad Khan B. A., another ex-Cricket-Captain.

On June 29th the Birthday of the King Emperor was celebrated in the College and School in a variety of ways. A whole holiday was given. In the morning a meeting of the College and School was held in the Strachey Hall at which Mr. Archbold and Aftab Ahmed Khan Esq. spoke. In the afternoon, the President of the Trustees, Nawab Faiyaz Ali Khan, gave a garden party to which all members of the staff and the whole School and College were invited. The garden party was to have been on the cricket field, but owing to the very heavy rain which had fallen, it resolved itself into an 'At Home' in the Lytton Library. There were also present some twelve guests from the city and the civil station.

This year the rains have begun in a very auspicious manner. Nearly two inches fell on Sunday, June 24th, and much more was received during the week. At present we are enjoying a break, which is acceptable to nobody more than to those who live in the Kachha Court, many of whom had occasion to wonder in what lay the advantage of their roof.

Work is being pushed forward rapidly on the new Mumtaz Boarding House, and the new bungalow for the School has made some progress, though a really good monsoon will most probably prevent its being finished by October. Finally operations have been begun afresh on the Union buildings, which for many weeks had not been touched.

There has been a fair amount of Tentpegging lately. The last aggregate monthly competition was concluded on July, 11th when Safdar Hosain won the prize. A special "invitation" competition was held on Tuesday, July 3rd, at which the six best tentpeggers were asked to compete. The prize was won by a boy, Siddiq-uz-Zaman, who rode in really good style, and in fact affords the best possible example of the

The Aligarh Monthly

August, 1906.

College Notes.

It is with the greatest pleasure that we offer our heartiest congratulations to the Nawab Mohsin-ul-Mulk and to Khan Bahadur Qazi Azizuddin Ahmad Sahib on the honours conferred on them in the King Emperor's "Birthday List." As most of our readers will be aware, the Kaisar-i-Hind medal, First class, has been given to the Nawab Sahib, while the title of Khan Bahadur has been conferred on Qazi Azizuddin Ahmad Sahib.

The results of the Intermediate, Entrance, School Final and Special Vernacular Examinations were published in the Government Gazette of June 30th The figures for the College and School are as follows. In the Intermediate fifty-three passed, in the School Final seven; while in the Entrance twelve, and in the Special Vernacular twelve were successful. No student obtained a First class in the Intermediate, but in the School Final Mohammad Haidar Khan, and in the Entrance, Wahid-ullah, were put in the first Division. Twenty three were put in the Second Division, the figures being the following, Intermediate, sixteen, School Final, four, Entrance, three. The general result in not perhaps so good as was expected, there being comparatively few in the Second Division, and far too few in the First. Students in the College do not seem to aim at so high a position, which is a great pity, as there are always some in the College who are capable of getting a First Division

جلد ٦ | ستمبر سنہ ١٩٠٦ء | نمبر ٩

ابو العتاہیہ

خلفاء عباسی کے دور میں عرب کی شاعری نے جسکا زیادہ حصہ مفاخرہ اور بہادری کے لیے وقف تھا ایک دوسرا قالب اختیار کیا۔ عجمی شعراء کی خلط ملط اور خلفاء اور امرا کی قدر دانی نے شاعروں کی ہمت کو زیادہ تر مدح کی طرف مائل کر دیا۔ مسلمانوں میں دولت کی کثرت تھی: جسکا یہ بھی ایک لازمی نتیجہ تھا کہ وہ اپنی مدح شعراء سے سنکر اُنکے مُنہ موتیوں سے بھر دیتے تھے۔ اسیلیے ان درباری شعراء کے اشعار میں فطرتی اور اصلی شاعری کا ذائقہ نہیں ملتا۔ جو عرب اولے کے اشعار میں ملتا ہے بلکہ ایک بناوٹی خوشامد پائی جاتی ہے جو حصول جاہ و مال کی غرض سے تھی۔

شعراء ہمیشہ سے سوسائٹی کا ایک غیر ضروری جزو بنکر رہے ہیں۔ خاصکر خوشامدی شعرا تو ہمارے نزدیک سوسائٹی کے مضرت رساں ممبر ہیں۔ اس لحاظ سے ابو العتاہیہ کا تذکرہ کرنا اور اُسکی شاعری کو اُردو خواں پبلک میں پیش کرنا ہمارے موضوع سے بہت

دور تھا۔ لیکن ابو العتاہیہ میں اور بھی ایک خصوصیت ہے۔ یعنی وہی صرف عربی میں ایک ایسا شاعر ہے کہ جسنے بہت کثرت کے ساتھ مختلف طریقے سے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور اس فلسفہ میں اسکا وہی رتبہ ہے جو فارسی میں عمر خیام کا ہے۔ اسیلیے اُسکا تذکرہ مناسب معلوم ہوا۔

بی ثباتی دنیا۔ یا موت شاعری کے عام موضوع میں داخل نہیں سمجھی جاتیں۔ جیسا کہ اسکو خود ابو العتاہیہ بھی کہا کرتا تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ سخت غلطی ہے۔ شاعری کا کبھی کوئی خاص عنوان مقرر نہیں کیا گیا۔ اور نہ کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ شاعری طبیعت کے حقیقی جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ اور طبیعتیں دنیا میں مختلف ہوتی ہیں۔ ہمارے شعرا گالوں والے اور گیسوؤں والے پر زیادہ لوٹ ہیں۔ اہل عرب اپنی بہادری پر مرتے ہیں۔ کلدانی قومیں رنج وغم پر فدا ہیں۔ اور دردناک اشعار میں اُن کو مزا آتا ہے۔ اہل تصوف اپنے وحدت الوجود کے اعتقاد میں مگن ہیں۔ اسی طرح پر بعض دور اندیش لوگ عالم اور اُسکے آخری انجام فنا کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اُسکا خیال اُن کی طبیعتوں پر ایسا مستولی ہوجاتا ہے کہ اُنکے جذبات اُسی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں اور تمام عنوانات سے زیادہ دلچسپ خیالات اُنکے اسی عنوان پر ہوتے ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ شاعری کے موضوع کا دائرہ محدود کرکے اس قسم کے عنوانات اس سے نکالدیے جائیں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ شاعری کا اگر کوئی حصہ مفید ہے تو اسی قسم کا۔ ورنہ جھوٹی مدح سرائی۔ لغو خیالی عشقبازی۔ فرضی مضامین جو بعید از فطرت ہوں اُنسے کیا حاصل۔ اہل یوروپ نے اسی وجہ سے فارس کے شعرا میں سے صرف عمر خیام کی وقعت کو تسلیم کیا ہے۔ کیونکہ اُسنے شعبہ حیات اور نیز ممات کے متعلق مختلف کارآمد فلسفیانہ خیالات ظاہر کیے ہیں۔

ابو العتاہیہ کا اصلی نام اسمٰعیل ہے۔ لیکن اُس کی کنیت ہی زیادہ مشہور ہے۔ اسکا

باپ قاسم عنزہ کے موالی میں سے تھا۔ اور اس کی ماں اُم زید بنی زہرہ کی لونڈیوں میں سے تھی۔ اسکا خاندان پشتہا پشت سے غلام تھا۔ اسکے باپ کا پیشہ حجامی تھا اسپر بعض لوگ اسکو شرم بھی دلایا کرتے تھے اُسکے جواب میں اسنے دو شعر کہے ہیں۔

الا انما التقوی ھو العز و الکرم	وحبک للدنیا ھو الفقر و العدم
انسان کی عزت اور بزرگی صرف تقوی ہی	اور حب دنیا محتاجگی اور افلاس ہی
ولیس علی عبد تقی۔ نقیصۃ	اذا صحح التقوی وان حاک او حجم
متقی آدمی کے لیے اگر وہ سچا متقی ہی	تو کوئی عیب نہیں ہی خواہ وہ جلاہا ہو یا حجام

ان اشعار میں اُس نے اس آیت (ان اکرمکم عند اللہ اتقکم) کے معنی خوب حل کیے ہیں

ابو العتاہیہ فلسفی خیال کا آدمی تھا۔ ہم اُسکے مذہب پر اچھی طرح بحث کرتے۔ لیکن وہ بیچارہ کیا اور اسکا فلسفہ ہی کیا۔ عمر بھر مذبذب رہا۔ جس فلسفی سے سابقہ پڑا خیالات بدلتے گئے اسلیے ایسے شخص کا مذہب معرض بحث میں لانے سے کوئی فائدہ متصور نہیں۔ البتہ یہ عقیدہ اُسکے دل میں خوب راسخ تھا کہ تمام عالم اور کائنات جواہر متضادہ سے بنی ہوئی ہیں اسلیے وہ بہت جلد فنا ہونیوالی ہیں اور درصل یہی اعتقاد تھا جسکے باعث وہ دنیا کی بے ثباتی پر اعلیٰ درجہ کے اشعار لکھ گیا۔ ابو العتاہیہ عرب کے اُن تین شعرا میں سے ہی جو اعلیٰ درجہ کے طباع تسلیم کیے گئے ہیں۔ یعنی بشار۔ سید اور ابو العتاہیہ۔ اسکے اشعار میں تکلف نام کو نہیں ہی۔ کیونکہ زبان پر بیحد قدرت ہی۔ اسلیے الفاظ نہایت سہل استعمال کرتا ہی اور معانی نہایت لطیف ہوتے ہیں۔ اسکا کلام حشو اور نقصان سے بالکل خالی ہی۔ یعنی نہ تو اُس میں غیر ضروری الفاظ ہیں اور نہ ضروری الفاظ رہگئے ہیں۔

ابن خلدون مورخ نے بھی کلام کی خوبی کا یہی معیار مقرر کیا ہی۔ وہ لکھتا ہی کہ "نثر میں قافیہ یا سجع کی پابندی۔ اُتنی ہی غیر ضروری ہی جسقدر شعر میں قافیہ اور ردیف کی پابندی ضروری ہی۔ الفاظ غریبہ کا استعمال خواہ نثر میں ہو یا نظم میں اُسکے لکھنے والے کی بدلیاقتی کی دلیل ہی

جسقدر الفاظ سہل۔ اور معانی واضح ہونگے اسیقدر مصنف کی قابلیت پر دلالت کرینگے"۔
روح بن الفرج نے بیان کیا ہو کہ میں نے ابو العتاہیہ سے دریافت کیا کہ تم شعر کس طریقہ سے کہتے ہو۔ اُسنے کہا کہ "میرے سامنے مضامین پرا باندھے کھڑے رہتے ہیں جسقدر میں چاہتا ہوں منتخب کرلیتا ہوں اور باقی چھوڑ دیتا ہوں۔ خدا کی قسم اگر میں چاہوں تو بلا تکلف دن رات اشعار ہی میں گفتگو کروں"۔

علم عروض بالکل نہیں جانتا تھا۔ ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت آپ عروض بھی جانتے ہیں کہا کہ میں خود عروض کا باپ ہوں۔ اور یہ ہو بھی ٹھیک۔ کیونکہ عروض شاعری سے نکلا ہو نہ کہ شاعری عروض سے۔ اسیلیے عروض ہی شاعری کا پابند ہو سکتا ہو نہ کہ شاعری عروض کی۔

ابو العتاہیہ کی شاعری کے دو حصے ہیں۔ ایک تو وہ جس میں اُسنے خلفاء اور امراء کی مدح کی ہو۔ ہماری بحث سے وہ حصہ خارج ہو۔ دوسرا وہ کہ جو اُسنے اپنے فطرتی جذبہ سے لکھا ہو۔ یا کسی واقعہ سے اُسکا تعلق ہو۔ اسی حصہ نے درحقیقت ابو العتاہیہ کو عظمت دی۔ ورنہ مدحیہ قصائد میں دوسرے شعراء سے وہ بازی نہ لیجا سکا۔ ابو نواس جو خلفاء عباسیہ کا درباری شاعر اور ابو العتاہیہ کا حریف تھا وہ خود اسکے اسی دوسرے حصہ کی تعریف کرتا ہو۔

یہ عجیب بات ہو کہ ابو العتاہیہ نے دنیا کی بے ثباتی اور اُس کی مذمت میں بہت کچھ کہا لیکن خود حد درجہ طالب دنیا تھا اور مزاج میں خِست اسقدر تھی کہ اُسکا بھی شمار عرب کے اُن سات بخیلوں میں کیا گیا ہو جنکے عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔

ایک شخص نے اس سے کہا ہو کہ تم دنیا سے نفرت دلاتے ہو اور دن رات اسی کا راگ گاتے ہو لیکن خود لاکھوں اشرفیاں تمہارے پاس جمع ہیں انکو خرچ کیوں نہیں کرتے۔ اور کھانے پینے میں کوتاہی کیوں کرتے ہو۔ کہا واہ عید اور عاشورے کے دن تو گوشت خرید اکرتا ہوں یعنی سال بھر میں صرف یہ دو دن تھے جن میں وہ اپنے کھانے کے لیے گوشت خریدتا تھا اور پھر اُسپر بھی فخر کرتا ہو۔ اسی طرح بہت سے قصے اس کی بخالت کے مشہور ہیں جنکا ذکر

ہم فضول سمجھتے ہیں -

پہلے فضل بن ربیع کے دربار میں جایا کرتا تھا وہاں اسکو بہت کچھ انعام ملتا تھا - اسکے بعد معن ایک بہت بڑا رئیس تھا اُسنے اس کی قدردانی شروع کی - معن جب مرگیا تو اُسکے بیٹے عبد اللہ کی اسنے ایک خاص معاملہ میں جو بہت ہی طول طویل ہی ہجو کی - عبد اللہ کے بھائی یزید نے اسکو پکڑوا کر پٹوایا - جب وہاں سے خلاصی ہوئی تو نکلکر اُس کی ہجو کی - آخر کا شعر یہ ہی -

یزید یزید فی منع وبخل | وینقص فی العطاء ولا یزید
یزید بخل میں زیادتی کرتا ہے... | اور دینے میں کمی کرتا ہی - زیادتی نہیں کرتا

اس میں لطف زبان کا یہ ہی کہ یزید جو اُس شخص کا نام ہی اُسکے لفظی معنی (زیادہ کرتا ہی) ہیں عبد اللہ نہایت نازک خوبصورت تھا اُسکے اندر زنانہ پن بھی تھا - اُسکی ہجو میں کہتا ہی -

فصنع ماکنت حلیتہ × سیفک خلخالا × وماتصنع بالسیف اذا لم تک قتالا

جو تلوار تو نے لگا رکھی ہی ؛ اُسکا پازیب بنوا لے ؛ تو تلوار سے کیا کرے گا ؛ جب لڑ ہی نہیں سکتا ؛

عبد اللہ کا خود قول ہی کہ اسکے بعد جب میں شہر میں تلوار لگا کر نکلتا تھا اور کسی شخص کو دیکھتا تھا کہ وہ میری طرف غور سے دیکھ رہا ہی تو فوراً خیال گذرتا تھا کہ ابو العتاہیہ کے یہ دونوں شعر اُسکو ضرور یاد ہیں -

ہارون رشید اسکے اشعار پر فدا تھا - خانہ کعبہ میں ایک مرتبہ ابو العتاہیہ طواف کر رہا تھا اسکے بعد ہی ہارون نے اُس سے کہا کہ مجکو کوئی غزل سناؤ - اُسنے صاف جواب دیا کہ میں نہیں سناؤنگا اللہ کا گھر عبادت کے لیے ہی نہ کہ غزل سُنانے کے لیے - ہارون نے اصرار کیا اور کہا کہ واللہ جبتک تو نہ سنائیگا اسوقت تک قید میں رہے گا اُسنے بھی کہا واللہ میں ایک سال تک سوائے قرآن کے دوسرے الفاظ میں گفتگو نہیں کرونگا - ہارون بغداد میں آکر پشیمان ہوا لیکن ایک سال قسم کی رو سے اُسکا قید رکھنا ضروری تھا - اسلیے ایک بڑے وسیع محل میں برائے نام قید رکھا - ایک سال گذرنی

کے بعد ہارون کو یاد نہیں رہا۔ ابوالعتاہیہ نے فضل بن ربیع کے پاس چند اشعار لکھکر بھیجے کہ وہ سفارش کرے۔

اجفوتنی فیمن جفانی　　　وجعلت شانک غیر شانی

مجھپر ظلم کرنیوالوں کے ساتھ تم بھی ہوگئے　　　اور میری طرف سے خیال بدل گیا

آخری شعر ہے۔

حتی اذا انقلب الزمان　　　علی صرت مع الزمان

مجھسے جب زمانہ بدل گیا　　　تو تم بھی زمانہ کے ساتھ ہوگئے

فضل بن ربیع نے یہ اشعار سُنکر سفارش کی اور ہارون نے فوراً اُسکو بلایا اور ساٹھ ہزار درہم انعام دیا۔

بشار بن برد نے جو ایک نہایت جیّد اور مشہور شاعر تھا اسکا ایک قصیدہ سُنا ابتدائی اشعار سُنکر تو خاموش رہا لیکن جب یہ اشعار سُنے۔

اتتہ الخلافتہ منقادۃ　　　الیہ تجرر اذیالھا

خلافت اُسکے پاس دامن کھینچتی ہوئی　　　فرماں بردار بنکر آئی

ولم تک تصلح الا لہ　　　ولم یک یصلح الا لھا

خلافت سوائے اُسکے اور کیلیے موزوں تھی　　　اور نہ وہ سوا خلافت کے کسی دوسرے کام کو شایاں تھا

ولو رامھا احد غیرہ　　　لزلزلت الارض زلزالھا

اگر دوسرا شخص خلافت کا قصد کرتا　　　تو زمین لرز اُٹھتی ۶ ۶

تو کہا کہ کیا خلیفہ ان اشعار کو سُنکر جھومنے نہیں لگا ؟

حافظ کا یہ مشہور شعر

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و ممبر می کنند　　　چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

ابوالعتاہیہ کے اس شعر کا ہم مضمون ہے۔

یا واعظ الناس قد اصبحت متہما اذ عبت منہم اموراً انت تاتیہا

آگے چلکر کہتا ہی۔

فاعظم الاثم بعد الشرک نعلمہ فی کل نفس عماھا عن مساویہا

شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہمارے خیال میں ہر آدمی کے اندر یہ ہی کہ وہ اپنی برائیوں کو نہیں دیکھتا

اسکو عام طور پر لوگ بددین خیال کیا کرتے تھے۔ ایک مجلس میں لوگوں نے پوچھا کہ تم بتلاؤ تمہارا مذہب کیا ہی۔ اُسنے کہا کہ بڑا تعجب ہے کہ لوگ مجکو زندیق اور رند خیال کرتے ہیں لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ میرا مذہب توحید ہی۔ اور پھر یہ شعر کہا۔

الا اننا کلنا بائد واَیُّ بنی آدم خالد

ہم سب مٹ جانے والے ہیں اور کونسا شخص ہمیشہ رہنے والا ہی

وبدءھم کان من ربہم وکل الی ربہ عائد

اُن کی ابتدا خدا ہی کی طرف سے ہوئی اور اُسی کی طرف سب پلٹ جاوینگے

وفی کل شی لہ آیتہ تدل علی انہ واحد

ہر ایک شے میں اُس کی نشانی ہے جو دلالت کرتی ہی کہ وہ ایک ہے

اس کی ایک کتاب ارجوزۃ المزدوجہ ہی جس میں نہایت سلیس نظم میں نصائح اور امثال جمع کیے ہیں۔ کوئی حکمت کی بات ایسی نہو گی جو اُسنے چھوڑی ہو۔ تقریباً چار ہزار اشعار ہیں۔

ما تطلع الشمس وما تغیب الا لامر شانہ عجیب لکل شیٔ معدن وجوہر

آفتاب کا طلوع و غروب نہیں ہوتا ہی ٭ مگر ایک عظیم الشان امر کے لیے ٭ ہر ایک شے کا ایک معدن و جوہر ہوتا ہے

واوسط واصغر واکبر یا للشباب المرح التصابی روائح الجنۃ فی الشباب

اور چھوٹی بڑی اور درمیانی ہوتی ہیں ٭ آہ جوانی کا ناز۔ اور عشق ٭ جنت کی نسیم ہی شباب ٭

جاحظ مشہور ادیب نے اس آخری مصرع کے متعلق کہا ہی کہ اسکا لطف زبان سے نہیں ادا ہو سکتا ہے صرف طبیعت حظ اُٹھا سکتی ہی۔ یہ شعر جب اُسکے سامنے پڑھا جاتا تھا تو جھومنے لگتا تھا۔

ابو العتاہیہ گوشہ عزلت کو بہت پسند کرتا تھا۔ اہل دنیا کے میل جول سے اُسکو نفرت تھی۔ ایک شخص نے اُس سے پوچھا کہ میں اپنی انگوٹھی پر کیا نقش کھُدواؤں کہا "لعنة اللہ علی الناس" اور پھر یہ شعر پڑھا۔

ملت بالناس واخلاقھم فصرت استانس بالوحدہ

میں لوگوں سے اور اُنکے اخلاق سے تھک گیا اسلیے گوشہ تنہائی کا انیس ہوں

ایک مرتبہ کسی حاسد نے کہا کہ تم آسان قوافی پر شعر کہہ لیتے ہو جب جانیں کہ کسی مشکل قافیہ پر شعر کہو اُسنے کہا تم مشکل سے مشکل قافیہ بتاؤ دیکھو کہتا ہوں یا نہیں۔ کہا اچھا "بلاغ۔ فراغ" کے قافیہ پر کہو۔ کہا سنو

ای عیش یکون ابلغ من عیش کفاف قوت بقدر البلاغ

کونسا عیش اُس زندگانی سے بہتر ہو سکتا ہے جس میں بقدر ضرورت کے روزی ملتی ہو

اسی قافیہ پر ایک قصیدہ کا قصیدہ فی البدیہ سُنا دیا۔

علی بن ثابت ایک بہت ہی بڑا حکیم اور زاہد تھا۔ ابو العتاہیہ اسکا دوست تھا۔ اکثر اُسکے پاس بیٹھتا اور اُس کی صحبت سے فیض حاصل کرتا۔ جب وہ مر گیا تو اُسکا ایک بہت بڑا مرثیہ لکھا ہے۔ آخری دو شعر یہ ہیں۔

بکیتک یا علی بدمع عینی فما اغنی البکاء علیک شیئا

اے علی میں تجھ پر رویا لیکن رونے سے کچھ فائدہ نہوا

وکانت فی حیاتک لی عظات وانت الیوم اوعظ منک حیا

تو زندگی میں میرے لیے ناصح تھا اور آج کے دن اُس سے زیادہ ہے

ان اشعار کا مضمون ابو العتاہیہ نے فلاسفہ کے اُن اقوال سے لیا ہے جو اُنھوں نے سکندر کے تابوت کے دفن کرتے وقت کہے تھے کہ "وہ آج کی بہ نسبت کل بادشاہ زیادہ باعب تھا اور کل کی بہ نسبت آج زیادہ عبرت انگیز ہے"

ایک شخص نے پوچھا کہ تم نے اپنی زندگی میں سب سے اچھے شعر کونسے کہے ہیں۔ کہا۔

لیت شعری فاننی لست ادری ای یوم یکون آخر عمری

کاش مجکو معلوم ہوتا میں مطلق نہیں جانتا کہ کونسا دن میری عمر کا آخری دن ہوگا

وبایّ البلاد یقبض روحی وبایّ البلاد یحفر قبری

کس مقام پر میری روح قبض کیجائے گی اور کس جگہ میری قبر کھودیجائیگی

اُسنے کہا کہ غزل کے اشعار سُناؤ۔ کہا تغزل تو فرضی خیالات ہوتے ہیں خیر سنو۔

کانها من حسنها درة اخرجها الیم الی الساحل

وہ حسینہ ایک موتی ہے جسکو سمندر نے ساحل پر ڈالدیا ہو

کان فی فیها وفی طرفها سواحرا اقبلن من بابل

اُس کی باتیں اُس کی نگاہیں بابل کی جادوگرنیاں ہیں

آخر کا شعر ہو۔

یا من رای قبلی قتیلا بکی من شدة الوجد علی قاتل

کسنے میرے سوائے کسی مقتول کو دیکھا ہو جو اپنے قاتل کی محبت میں رویا ہو

یہ آخری شعر بعینہ جمیل کے شعر کا ہم مضمون ہو۔

خلیلی فی ما عشتما هل رائتما قتیلا بکی من حب قاتله قبلی

اسکے اشعار وہی کام دیتے تھے جو ایک مذہبی عالم کا وعظ۔ ابوعکرمہ کہتا ہو کہ میں ایک مرتبہ بغداد کی جامع مسجد میں گیا۔ دیکھا کہ بہت سے لوگ بیٹھے ہیں اور ایک بزرگ کھڑا ہو کر یہ اشعار سُنا رہا ہو۔

ذهب الشباب وبان عنی غیر منتظر الایاب

شباب گذر گیا اور اُسکے پلٹنے کی اُمید نہیں

انی لآمل ان اخلد والمنیة فی طلابی

مجھے یہ اُمید ہو کہ ہمیشہ رہوں گا اور موت میری تلاش میں ہے

لوگ سُن رہے ہیں اور اُنکے آنسو رخساروں پر بہہ رہے ہیں۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں کہا ابو العتاہیہ۔

ایک مرتبہ شرط باندھکر لوگوں نے ایک طرح مقرر کی۔

ساکنی الاجداث انتم

تم قبر کے رہنے والے ہو

اور کہا سب اسپر مصرع لگائیں۔ کسی سے بھی نہ لگ سکا۔ ابو العتاہیہ نے فی البدیہ اسی طرح پر ایک طولانی قصیدہ پڑھ دیا۔

ساکنی الاجداث انتم	مثلنا بالامس کنتم
تم قبر کے باشندے ہو	کل تک ہماری ہی طرح تھے
لیت شعری ما صنعتم	اربحتم ام خسرتم
نہیں معلوم تم نے کیا کیا	آیا فائدہ اُٹھایا یا نقصان

ابو العتاہیہ اپنے اس شعر کو اکثر پڑھا کرتا تھا۔

الناس فی غفلاتهم	ورحا المنية تطحن
لوگ غفلت میں ہیں	اور موت کی چکی پیس رہی ہے

مامون رشید ابو العتاہیہ کے ان اشعار کو کہا کرتا تھا کہ یہ حکمت کے موتی ہیں۔

انساك محياك المماتا	فطلبت فی الدنيا ثباتا
زندگی نے موت کو بھلا دیا ہے	اور تو دنیا میں ثبات کا خواہاں ہے
اوثقت بالدنيا وانت ترى	جماعتها شتاتا
دنیا پر تو نے وثوق کر لیا حالانکہ تو دیکھتا ہے	کہ اُسکی جماعتیں منتشر ہوتی جاتی ہیں

کیا اچھا شعر ہے۔ ما احسن الدنيا واقبالها اذا اطاع الله من نالها

دنیاوی اقبالمندی اُس شخص کیلئے کیا اچھی ہے + کہ جو اُسکو پا کر خدا کی ہی اطاعت کرے

خلیفہ مہدی کے دربار میں ابو عبید اللہ آیا۔ مہدی نے اُس کی بڑی شکایتیں سُنی تہیں آنے کے ساتھ ہی اُسپر خفگی ہوئی۔ اور حکم دیا کہ اسکا پاؤں پکڑکے کھینچو۔ اور قید خانہ میں لیجاؤ۔ اُسکے بعد تھوڑی دیر تک غصہ میں وہ سر جھکائے رہا۔ جب سر اُٹھایا تو ابو العتاہیہ نے یہ اشعار سُنائے۔

ارى الدنيا لمن هي في يديه | عذابا كلما كثرت لديه
دنیا کو میں جس شخص کے ہات میں دیکھتا ہوں | اُسکے پاس جسقدر زیادہ ہوتی ہی اُسیقدر تکلیف کا باعث ہے

تهين المكرمين لها بصغر | وتكرم كل من هانت عليه
جو لوگ دنیا کی عزت کرتے ہیں اُنہیں کو ذلیل کرتی ہی | اور جو اُسکی ذلت کرتے ہیں اُنہیں کی عزت کرتی ہی

اذا استغنيت عن شئ فدعه | وخذ ما انت محتاج اليه
جس شے کی ضرورت نہو اُسکو چھوڑ دو | البتہ جو ضروری ہو اُسے حاصل کرو

مہدی سُنکر مسکرایا۔ اور ابو العتاہیہ کی تعریف کی۔ اُسنے کہا یا امیر المومنین میں نے کسی شخص کو دنیا پر اسقدر مائل اور فریفتہ نہ پایا جسقدر اس شخص کو جو ابھی یہاں سے کھینچکر نکالا گیا ہی۔ ابھی گھنٹہ بھر بھی نہیں ہوا کہ وہ سلطنت میں سب سے معزز آدمی تھا۔ اور اب وہ سب سے ذلیل ہی۔ اگر قناعت کرتا تو یہ نوبت کیوں پہونچتی۔ مہدی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہا بیشک۔ اسکے بعد ابو عبید اللہ کو بلایا اور اُسکا جرم معاف کر دیا۔ وہ ابو العتاہیہ کے اس احسان کا عمر بھر شکر گذار رہا۔

ہارون کا بیٹا قاسم نہایت مغرور شاہزادہ تھا۔ ایک مرتبہ اُسکی سواری بڑے کر و فر سے نکلی۔ رستہ میں ابو العتاہیہ بھی سامنے آگیا۔ سلام کیا۔ اُسنے کچھ جواب ندیا۔ اور اپنی آن و بان کے ساتھ چلا گیا۔ ابو العتاہیہ نے کہا۔

يتيه ابن ادم من جهله | كان رحا الموت لا تطحنه
آدمی کا غرور جہالت کی وجہ سے ہے | گویا موت کی چکی اُسکو نہ پیسے گی

اُسنے جب خبر پائی تو اس بڈہے شاعر کو بہت پٹوایا اور جیل مین بھجدیا - اُسنے زبیدہ خاتون کے پاس جیل سے یہ اشعار لکھکر بھیجے -

حتی متی ذوالتیہ فی تیھہ　　اصلحہ اللہ وعافاہ

کبتک مغرور اپنے گھمنڈ مین رہے گا　　خدا اُسکو صلاحیت دے اور معاف کرے

یتیہ اہل تیہ من جھلھم　　وھم یموتون وان تاھوا

مغرور اپنی جہالت سے غرور کرتے ہین　　وہ مرینگے اگرچہ غرور کریں

من طلب العز لیبغی بہ　　فان عز المرء تقواہ

جو عزت کا طالب ہے تاکہ بقاء دوام لے　　تو آدمی کی عزت تقوے مین ہے

زبیدہ نے ہارون سے سفارش کر کے جیل سے اُسکو نکلوا دیا -

ابن الابیض نے لکھا ہے کہ مین ابوالعتاہیہ کے پاس گیا اور کہا کہ مجکو شاعری سے شوق ہے اور زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی پر مین لکھتا ہون کیونکہ مین سمجھتا ہون کہ شاعری کے اور کوچے لغو اور لچر ہین - اور مین نے سنا ہے کہ تم بھی اسی عنوان پر اشعار کہتے ہو اسلیے کچھ سناؤ اُسنے کہا کہ سنو - مین نے جو کچھہ کہا بالکل ردی ہے - کم سے کم کوئی شعر کہے تو اُسکی بندش اور الفاظ ابن ہرمہ - بشار - یا شعراء متقدمین ایسے تو ہون - زہد - اور دنیا کی بے ثباتی یہہ شاعری کا موضوع ہی نہیں ہے - لیکن اگر تم خواہشمند ہو تو سنو -

لدوا للموت وابنوا للخراب　　فکلکم یصیر الی التباب

موت کیلیے پیدا کیے گئے ہو اور مٹنے کیلیے بنائے گئے ہو　　تم سب ہلاک ہوجاؤ گے

الا یا ساکن القصر المعلی　　ستدفن عن قریب فی التراب

اے قصر معلے کے رہنے والے　　بہت جلد تو زمین میں دفن کیا جائیگا

یہ پورا قصیدہ سنایا - ابن ابی الابیض نے ابونواس سے بیان کیا - اُسنے کہا کہ پھر اُسکے پاس جاؤ اُسنے اچھا قصیدہ ابھی تم کو نہیں سنایا ہے - پھر وہ آیا - ابوالعتاہیہ نے وہ عبرت انگیز

قصیدہ سنایا جو ابو نواس نے بتایا تھا۔ اُسکا ایک شعر یہ ہے۔

ولیس من موضع یاتیہ ذونفس　　الا وللموت سیف فیہ مسلول

کوئی مقام نہیں جہاں کوئی جاندار جائے　　اور موت شمشیر برہنہ لیے نہ موجود ہو

میر حسن کا یہ شعر

اُسے فضل کرتے نہیں لگتی بار　　نہو اُس سے مایوس اُمیدوار

بہت مشہور ہے اسی مضمون کا ابوالعتاہیہ کا بھی یہ شعر

اتیأس ان تری فرجا　　فاین اللہ والقدر

بہت مشہور ہے۔

صرف دنیا کی بے ثباتی ہی پر اسنے اشعار نہیں لکھے ہیں بلکہ صبر و قناعت پر بھی بعض

بعض لاجواب اشعار ہیں۔

فقصر ما تری بالصبر حقا　　فکل ان صبرت لہ مزیل

جہاں صبر زیبا ہے وہاں صبر کرنا چاہیے　　صبر سے تمام کلفتیں زائل ہوجاتی ہیں

دوسرا شعر ہے۔

تجرد من الدنیا فانک انما　　وقعت الی الدنیا وانت مجرد

دنیا سے تجرد اختیار کر　　کیونکہ جب تو دنیا میں آیا ہے تو مجرد ہی تھا

دو شعر میں زمانہ کی انقلاب کی تصویر کھینچتا ہے۔

ما اختلف اللیل والنہار ولا　　دارت نجوم السماء فی الفلک

الا لنقل السلطان عن ملک　　قد انقضی ملکہ الی ملک

رات اور دن کا اختلاف اور ستاروں کی گردش نہیں ہے مگر اسلیے کہ ایک بادشاہ کی ملک کو

جسکی سلطنت کا زمانہ ختم ہوچکا ہے دوسرے بادشاہ کو دیدے۔

اسکے دو شعر ہیں جو عرب میں گائے جاتے تھے۔

لیس لمن لیست لہ حیلۃ موجودۃ خیر من الصبر

جس شخص کے لیے کوئی حیلہ نہیں ہو اُسکے لیے صبر ہی بہتر ہے

فاخط مع الدھر اذا ما خطا واجر مع الدھر کما یجری

زمانہ کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاؤ اور جس طرح چلتا ہے اُسی طرح چلو

موت کو کہیں نہیں بھولتا۔ کہتا ہی۔

خذ لا اباً لک للمنیۃ عدۃ واحتل لنفسک ان اردت صلاحھا

او کم بخت موت کے لیے سامان تیار کر اور اگر اپنی بھلائی چاہتا ہی تو تدبیر کر رکھ

لا تغترر فکاننی بعقاب ریب الموت قد نشرت علیک جناحھا

دھوکے میں نہ رہ کیونکہ میں موت کے عقاب کو دیکھ رہا ہوں کہ اُسنے اپنے پر تیرے اوپر پھیلا رکھے ہیں

الغرض موت کے خوف نے اسکے دل پر ایسا غلبہ کر لیا تھا کہ اُسکی نصف شاعری اُسی کے متعلق بھری پڑی ہی کہاں تک نقل کروں۔

موت کے وقت اُس کی زبان پر یہ اشعار تھے۔

الھی لا تعذبنی فاننی مقر بالذی قد کان منی

مرے اللہ مجکو عذاب نہ دینا کیونکہ میں اپنے جرموں کا اقرار کرتا ہوں

فما لی حیلۃ الا رجائی لعفوک ان عفوت وحسن ظنی

تیری معافی کا میرے پاس سوائے امید اور حسن ظن کے اور کوئی وسیلہ نہیں

وکم من زلۃ لی فی الخطایا وانت علی ذو فضل ومن

مجھسے بہت سی لغزشیں ہو گئی ہیں اور تو رحم کرنیوالا اور ذو المنن ہی

نوّے ۹۰ برس کی عمر میں اسکی وفات ۲۱۳ھ میں ہوئی۔ اور بغداد کے مغربی جانب قنطرۃ الزیاتین کے قریب اسکا مزار ہی۔

اسلم جیراجپوری
مدرسۃ العلوم علی گڈھ

توحید کی تاریخ

سلسلہ کے لیے جولائی کا "منتھلی" دیکھنا چاہیے

مذکورۂ بالا تحریر سے ثابت ہوتا ہی کہ انسان نے خارجی اشیاء کو کس طرح تصور کیا اور پھر ارواح پرستی کا شیوہ اختیار کیا۔ یہ تو مذاہب کی ابتدائی جذبات کی ایک مجمل کیفیت ہی مگر اس کی تفصیل بیان کرنے کے قبل یہ دیکھنا چاہیے کہ کب سے یہ خیالات پیدا ہوئے یہ امر مسلمہ ہی کہ دنیا میں جس قوم نے پہلے پہل نسل انسانی کے حالات ایک حد تک تاریخی حیثیت سے لکھے وہ یہود ہیں دیگر اقوام مثلاً قدیم مصری۔ چینی اور ہنود ابتدائی حالات کے متعلق کچھ اس طرح فسانوں کا پل باندھتے ہیں کہ عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی اُنکے فسانے اعجوبہ پرستی اور شاعرانہ تخیلات پر مبنی ہیں۔ اگرچہ کتب یہود میں بھی بہت سے بے بنیاد قصص اور روایتوں کی تہیں جم گئی ہیں مگر پھر بھی حقیقت کی جھلک نظر آہی جاتی ہی۔ کیوں نہیں۔ اسی قوم کی شان میں آیہ کریمہ وانی فضلتکم علی العالمین نازل ہوئی ہی۔

منقول ہی کہ قابیل حضرت آدم کے بڑے بیٹے نے رقابت کے جوش میں اپنے بیگناہ بھائی ہابیل کو ایک دن پتھر سے مار ڈالا اور اس طرح یہ پہلا قاتل ہوس بازی کے ہاتھوں خون ناحق کا مرتکب ہوا۔ حضرت آدم کو جب یہ حال معلوم ہوا سخت صدمہ ہوا اور مظلوم بیٹے کے غم میں عالم سیاہ نظر آنے لگا قابیل کی صورت سے نفرت ہوگئی اور بالآخر مردود درگاہ ہوکر نکال دیا گیا۔ ظالم گھر سے کیا نکلا گویا دائرہ ایمان سے خارج ہوگیا۔ خون بیگناہ کا ایسا دھبہ نہ تھا کہ چھوڑ اسے چھوٹتا اسپر باپ کا عاق کردینا قیامت ہوگیا۔ قلب سخت ہوکر سیاہ ہوگیا اور غضب الٰہی میں مبتلا ہوگیا۔ مظلوم بھائی کی خون آلودہ صورت اور اسکے دم توڑنے کی ہولناک حالت آنکھوں میں

پھرنے لگی ۔ جنگل جنگل پھرتا تھا مگر اُسکے گناہ کی کالی بلا سایہ کی طرح ساتھ تھی اور سوتے جاگتے بھوت بنکر سر پر سوار رہتی تھی ۔ انسان کا دل گویا کاغذ کے ایک سفید پرچہ کی طرح ہی جس پر افعال کے نقش کھنچتے جاتے ہیں ۔ نیکی کی گلکاری بھی ہو رہی ہی اور بدی کے دہبتے بھی پڑرہے ہیں ۔ لیکن اگر یہ سیاہ دہبتے ندامت کے تیز چاقو اور استغفار کی ربڑ سے چھیلے نہ جائیں تو سارا کاغذ رفتہ رفتہ کالا ہو جائیگا اور گلکاری پر بھی پانی پھر جائیگا اور آخر سوائے اسکے کہ پارہ پارہ کر کے پھینک دیا جاوے اور کچھ نہیں ہو سکتا ۔ قابیل کا حال بھی اسی طرح ہوا ۔ بھائی کے خون سے ہاتھوں کو رنگ کر بجائے اسکے کہ توبہ اور استغفار کے پانی سے دہوتا اور اشک حسرت بہاتا اور بھی اکڑنے لگا ۔ قلب کی سیاہی بڑہتی گئی ۔ مقدس باپ کے فیض صحبت سے محروم ہو گیا ۔ توفیق کا دروازہ بند ہو گیا ۔ اور گمراہی کے تیرہ و تار جنگل میں بھٹکنے لگا ۔ توریت کی کتاب پیدائش باب چہارم میں درج ہی کہ قابیل مردود درگاہ ہو کر مشرق کی طرف روانہ ہوا ۔ اور وہیں ڈیرے ڈالدیئے اس کی بہت سی اولادیں ہوئیں جن میں سے ایک بیٹے انوخ کے نام سے اسنے پہلے پہل ایک چھوٹے سے شہر کی بنیاد ڈالی اور رفتہ رفتہ اُسکی نسل بڑہتی گئی یہانتک کہ پانچویں پشت میں مسمی ملک ایک خونخوار اور شورہ پشت شخص پیدا ہوا جسکے ایک بیٹے ”توبل کین“ نے پہلے پہل لوہے اور تانبے کے اوزار اور ہتیار ایجاد کیے اور کشت خون کا بازار گرم ہونے لگا ۔ قابیل کا گناہ گویا ایک چنگاری تھی جس سے اُس کی ساری نسل بھڑک اُٹھی ۔ جدہر یہ لوگ گئے دہومیں اڑا دیئے کسی جگہ ان کو قرار نہ تھا ۔ قابیل کو جو بد دعا دی گئی تھی کہ تو عالم میں مارا مارا پھریگا اور کبھی چین سے نہ بیٹھیگا (کتاب پیدائش باب چہارم آیت ۱۲) اُسکا اثر اُس کی نسل میں باقی رہا ۔ یہ خونخوار گروہ دشت قبچاق ۔ میدان گوبی اور کوہستان یورال اور الٹائی میں چھا گیا اور جب کبھی چھوٹ گیا خون کی ندیاں بہادیں اور عالم کو زیر و زبر کر دیا ۔

الغرض قابیل مع اپنی اولاد کے دائرہ ایمان سے خارج ہوگیا۔ شامت اعمال کا بھوت سر پر سوار تھا۔ گناہ کی تاریکی گھیرے ہوئے تھی۔ دنیا کی ہر چیز اُسکو خوفناک نظر آتی تھی اور وحشت بڑہتی جاتی تھی۔ یہ کیا حالت تھی۔ عجائبات قلب کی ایک حیرت انگیز کیفیت تھی جسکے سمجھنے کے واسطے ایک مثال کی ضرورت ہی۔ ایک طالب علم جسنے اسکول کے سب درجوں کو قابل تعریف کامیابی کے ساتھ طے کرلیا ہو اور اب کالج میں ذوق شوق سے تکمیل علم کیواسطے قدم رکھا ہو ذرا اُس کی حالت دیکھنا۔ کلاس میں داخل ہوکر کسقدر مسرور نظر آتا ہی کس محویت سے لکچر سُن رہا ہی اور کس جوش سے نوٹس لکھ رہا ہی۔ گھر آکر رات کے وقت خوشی خوشی کس محنت سے کل کام کر رہا ہی اور مطالعہ میں مشغول ہی۔ سب سو رہے ہیں اور یہ لمپ کے سامنے بیٹھا ہوا مطالب پر غور کر رہا ہی۔ غرضکہ ہر وقت طلب علم کے نشہ میں سرشار ہی۔ جہاں علمی مذاکرہ سُنا دوڑا جا رہا ہی اور بحث مباحثہ سے حظ حاصل کرتا ہی اور اس طرح اپنی معلومات کا دائرہ وسیع کرتا جاتا ہی کہ یکایک ایک دن سیر کرتے کرتے کسی زہرہ جبیں سے آنکھیں چار ہوگئیں نگاہوں کا جادو چل گیا اور دل ہاتھوں سے نکلکر محبت کے چاہ بابل میں قید ہوگیا۔ اب اسکی حالت دیکھنا۔ شام کو گھر آیا ہی مگر دل وہیں چھوڑ آیا ہی۔ کل کا سبق یاد کرنا ہی چند سوالات حل کرنا ہی لمپ لیکر بیٹھا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ دماغ چکر کھا رہا ہی ہوش بجا نہیں درد دل درد سر ہوگیا اور یہ وہیں دراز ہوگیا مگر نیند کہاں آخر خدا خدا کرکے صبح ہوئی یہ کالج چلا مگر بالکل کھویا ہوا۔ نہ لکچر سمجھ میں آتا ہی نہ نوٹس لکھ سکتا ہی۔ چہرہ سے پریشانی اور وحشت برستی ہی یہانتک کہ رفتہ رفتہ پڑہنا لکھنا سب بالائے طاق علمی مذاکروں سے کوسوں دور امتحان کا زمانہ آگیا یہ شریک تو ہوا مگر حضرت کی غیرت "شرکت غم" ہی نہیں چاہتی تھی انجام یہ ہوا کہ گزٹ میں نام ندارد مگر بدنامی کا سرٹیفکٹ مل گیا والدین کی نگاہوں سے گر گیا۔ اور ہر طرف ذلیل و خوار پھرنے لگا۔ ٹھیک ہی معرفت کی راہ میں بھی انسان کے قلب پر ایسی ہی کیفیتیں گذرتی ہیں۔ کبھی طاعات و عبادات کا ذوق و شوق ہوتا ہے۔

ذکر فکر میں مزہ آتا ہے۔ شب بیداری اور سحرخیزی آسان ہوجاتی ہے۔ ایک عجیب سرور ہوتا ہے اور ہر طرف نور ہی نور نظر آتا ہے۔ فیض کا دریا جوش مارتا ہے اور لطیفوں کی نہریں جاری ہوجاتی ہیں لیکن معاذاللہ اگر کسی سخت گناہ میں مبتلا ہوگیا۔ ظلمت چھاجاتی ہے انقباضی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے نہ وہ انبساط ہے نہ وہ سرور نہ وہ ذوق و شوق ہے نہ وہ جوش و خروش اگر اس حالت میں توبہ و استغفار نہ کی اور خشوع و خضوع کے ساتھ متوجہ ہوا تو قلب سخت ہوجاتا ہے۔ لطیفے بند۔ فیض مسدود اور نسبت سلب اللھم احفظنا۔

بیشک قابیل کی وہ حالت ہوگئی تھی جسکو صوفیہ کرام سلب نسبت کہتے ہیں۔ اُسکی اولاد میں بھی وہی فاسد مادہ اُچھلتا رہا اور اُسی کے ایسے حرکات پیدا ہوکر وہم پرست ہوگئے دیو بھوتوں کو ماننے لگے اور باطل معبودوں کی پوجا ہونے لگی مگر اس کریم کارساز نے جسکی رحمت اُسکے غضب پر سبقت لیگئی ہے "ظلوم وجہول" انسان کی نسل کو برباد ہونے نہ دیا حضرت شیثؑ جو اپنے باپ کے سچے جانشین تھے۔ سیدھی سادی خدا پرستی کی جو ایک گلہ بان کی مرنجان مرنج زندگی کا جذبہ تہی لوگوں کو تعلیم دینے لگے۔ خدا نے اُن کی اولاد میں برکت دی۔ رحمت کا دروازہ کُھل گیا اور فیض نازل ہونے لگا۔ اس طرح حضرت آدمؑ کی وفات کے بعد اُنکی اولاد دو مختلف طریقوں کی پابند ہوگئی جو اُنکی جداگانہ طرز معاشرت کے نتیجے تھے ایک سلیم الطبع چوپان دوسرا خونخوار شکاری ایک حریم سینہ میں ذوق شوق کیساتھ یاہو کے نعرے لگاتا تھا اور دوسرا بیابان وحشت میں ہو ہو کرتا پھرتا تھا۔ خوب

دیر و حرم کا جبکہ جہاں میں نشاں نہ تھا عاشق کے دل سوا کوئی اُسکا مکاں نہ تھا

انسان اگر غور سے دیکھے تو معلوم ہوجاوے کہ مقصود اصل میں ایک ہی ہے مگر وہاں تک پہونچنے کے واسطے مختلف راہیں پیدا ہوگئی ہیں اور کچھ ایسی پیچدار ہوگئی ہیں کہ طالب اس بھول بھلیاں میں بھٹکتا پھرتا ہے اور رشتہ مقصود ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن جس طرح تلاش مقصود انسان میں ودیعت ہے اُسی طرح مختلف راہیں پیدا ہونا فطری امر ہے۔

جب اختلاف فطری ٹھہرا تو ہدایت لابدی ہوئی ورنہ یوں بے سر و پا چھوڑ دینا اور پھر اپنی طرف بلانا انصاف نہیں ہے۔ بیشک اسی سبب سے ہادیوں کی سخت ضرورت ہے اور ابتدا ہی سے ایسا انتظام شروع ہوگیا۔

حضرت شیث کی چھٹی پشت میں حضرت ادریسؑ پیدا ہوئے اُس زمانہ میں نسل انسانی کا چشمہ بڑہتے بڑہتے ایک دریائی مواج ہوگیا تھا اور دنیا کے مختلف حصوں میں بہنے لگا تھا۔ قابیل کی اولاد نے ہر جگہ طوفان مچا دیا تھا خود بھی گمراہ تھی اور اور اپنے ساتھ حضرت شیث کی اولاد کو بھی مِل جُل کر خراب کر دیا تھا۔ حضرت ادریسؑ ان گمراہوں کی ہدایت کے واسطے مبعوث ہوئے۔ منقول ہے کہ لکھنا اور سینا پہلے پہل آپ ہی نے لوگوں کو سکھایا آپ کے بعد آپ کے بیٹوں نے خاصکر متوشلح نے آپ کی تعلیم کو زندہ رکھا مگر تھوڑے ہی دنوں میں بت پرستی کا ظہور ہوا جس کی ابتدا حسب ذیل طریقہ سے ہوئی۔

انسانی طبیعت کا خاصّہ ہے کہ اپنے ہمجنسوں میں جنکو خوبیوں سے آراستہ پاتا ہے اُس کی طرف قدرتی میلان پیدا ہو جاتا ہے اور دل میں اُس کی عظمت کا نقش بیٹھ جاتا ہے یہانتک کہ اس کی نہایت تعظیم اور توقیر کرنے لگتا ہے۔ یہ جذبات اسقدر پختہ ہوجاتے ہیں کہ اُس بزرگ کے مرنے کے بعد بھی نہیں مٹتے۔ اُس کی تصویر ہر وقت آنکھوں میں پھرتی ہے اور اُس کی یاد بیچین کرتی رہتی ہے مگر خیالی تصویر کے چھلنے سے آتش فراق نہیں بجھتی آخر شوق نظارہ کے اصرار سے مرحوم کی کوئی نشانی پیش کرنا ہوتی ہے کہ کسیقدر سکون تو ہو۔ یہ نشانی مختلف اقوام کے مذاق کے موافق ہوتی ہے۔ کہیں تماثیل اور تصاویر کے رنگ میں۔ کہیں تبرکات کی طرز میں۔ اور کہیں بتوں کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ یہ نشانیاں بطور خود واجب التعظیم ہو جاتی ہیں۔ انکے متعلق کہانیاں گڑھ لی جاتی ہیں حقیقت پر پردہ پڑ جاتا ہے اور انسان کہیں سے کہیں ہو رہتا ہے اور اپنے ایک قدرتی جذبہ دل کے ہاتھوں

آپ ہی خراب ہوتا ہی۔ حضرت ادریس کے ہونہار بیٹوں نے لوگوں کو بہت سے دینی اور دنیوی نفع پہنچائے تھے۔ ملک میں امن وامان پھیلایا تھا وحشی جانوروں اور خونخوار انسانوں کا شر دفع کیا تھا۔ اور لوگوں کو نیک راہ بتائی تھی۔ انکی وقعت اُن کی عظمت اُن کی محبت لوگوں کے دلوں میں کیونکر ہوتی۔ ان بزرگوں کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کی تصویریں بنائیں اور ایک پاک جگہ میں رکھیں اور چومنے لگے اور رفتہ رفتہ صنم پرستی تک نوبت پہونچ گئی۔ قاعدہ ہی کہ جہاں کوئی دل لگتی بات نکلے سب لوگ گرویدہ ہوجاتے ہیں اور پھر وہی بات رسم ہوجاتی ہی اور ہر جگہ جاری ہوجاتی ہے۔ اس طرح اس طریقہ نے عام قبولیت کا لباس پہنا اور نئے نئے رنگ میں ظاہر ہونے لگا اور عالم میں بتوں کا عمل ہوگیا۔ سچ پوچھیے تو لکڑی تانبے اور پتھر کے بت کوئی چیز نہیں اگر بت ہی تو خود ہمارا نفس ہی جسکو ہمنے حریم سینہ میں چھپا رکھا ہی۔ لاکھوں مورتیں پاش پاش ہوجائیں ہزاروں مندر مسمار کر دیے جائیں کیا ہوتا ہے جب تک کہ یہ بڑا بت نہ ٹوٹے سارا کرشمہ اسی کا ہی اسی کے شعبدے نظر بندی کرتے ہیں۔ ایک چھٹے ہوئے بہروپیے کی طرح ہی بھیس بدل بدل کر آتا ہی اور اچھے اچھوں کو دہوکا دیجاتا ہی۔ آجکل زندقہ اور دہریت کے لباس میں ظاہر ہوکر اسنے بہت سے بندگانِ خدا کی راہ ماری ہے۔

درحقیقت راہ معرفت میں ہمارا نفس ہی سنگِ راہ ہی۔

(باقی آیندہ)

الراقم

سید نواب علی نوتنوی

کرزن نامہ

بقیہ منبلہ

عطیات دینے کا ہے کہ صرف ہندوستانی ادنیٰ درجے کے ملازم ہوتے ہیں - ان خرچوں کے بعد جو
آمدنی بچتی ہے وہ ملک کے لیئے مبارک ہوتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی پیداوار میں سے ہندوستانی
ریلوے کی نذر کرتے ہیں اسکا صرف ایک حصہ انکے پاس واپس آتا ہے کل واپس نہیں ہوتا -
جیساکہ اور ملکوں میں ہوتا ہے کہ صرف قرض کا سود دیا جاتا ہے - یہ کمی ہر سال پیداوار کی قابلیت کو
گھٹاتی ہے - دادا بھائی نوروجی لکھتے ہیں کہ میں نے مسٹر جے ڈین ڈرس صاحب (ڈائرکٹر
ریلوے) سے کہا کہ آپ ریلوے کی سالانہ رپورٹ میں ایک نقشہ ایسا بنائیے کہ جس سے یہ
معلوم ہو کہ ہندوستان وانگلستان میں یورپین کی تنخواہوں اور انکے لیے ہر قسم کے خرچوں کی
کیا مقدار ہے لیکن انھوں نے اسکا وعدہ کیا جسکو ایفا نہیں کیا - اگر اس قسم کی آگاہی ہوتی تو
ہم کو معلوم ہوتا کہ کسواسطے انڈیا کو وہ فوائد حاصل نہیں ہوتے جو ریلوے سے اور ملکوں کو
حاصل ہوتے ہیں - ریلوں پر ۳۶۰۰ انگریز ہندوستان میں ہیں اور باقی انگلینڈ میں ہیں انکے معلوم
ہونے سے یہ دریافت ہوتا کہ جتنے وہ ہیں اتنے پیشہ ور ہندوستانیوں کو انکے قدرتی رزق
سے محروم کرتے ہیں - اور ریلوے کی آمدنی کا کونسا حصہ ایسا ہے جسمیں سے ہندوستانی ایک
پائی نہیں پاتے -

اسوجہ سے یہ امر تحقیق طلب ہے کہ ریلوے کی دولت ہندوستان کی آمدنی یا پیداوار
کو بڑہانے کی بجائے کتنا گھٹاتی ہے اور کتنا ہندوستانیوں کے کام میں لانے کے لیے واقعی
باقی رہتی ہے - ریلوے کی آمدنی ملک کی پیداوار کا ایک حصہ ہے اور اس میں جو یوروپین کھا جاتے
ہیں اور اپنے ملک کو لے جاتے ہیں وہ ہندوستانی ملکوں کی وسائل آمدنی میں سے چھین
لیتے ہیں -

یہ بالکل تعجب کی بات نہیں ہے کہ یونائٹڈ سٹیٹس میں ۷۰۰۰۰ میل یا اس سے زیادہ
ریلوے جاری ہے اور ہندوستان میں اسکا دسواں حصہ ہے جس سے یہ ہندوستانی کچھ فائدہ
نہیں اُٹھاتے باوجودیکہ انڈیا میں عجیب مخازن میں اچھی گورنمنٹ ہے کل برٹش دولت اُسکی

پشت پناہ ہی۔ خلاصہ یہ ہی کہ ہندوستان میں بالفعل جیسی ڈپارٹمنٹ (سرشتے) ترقی اور تہذیب اور پیش قدمی کے نام سے جاری کیے جاتے ہیں وہ زیادہ تر یوروپین کی منفعت کے لیے ہوتے ہیں اور ہندوستان پر بارگراں ہوتے ہیں۔ ہم اپنے برٹش حاکموں سے التجا کرتے ہیں کہ ہمارے لیے ریلوے اور تمام قسم کے مفید پبلک ورکس بنائیں جنکے بنانے کے اسباب وہ رکھتے ہوں مگر ہم کو اُن کی قدرتی فائدے حاصل کرنے دیں۔ بھوکے آدمی کو خالی دعوت کی خوشیاں نہ سنائیں (بھوکوں کا پیٹ خالی دیگوں کی ٹھنا ٹھن سے نہیں بھریگا) ہم یوروپین کی ایسی تدابیر کے خوشی سے شکر گزار ہونگے جو قطعی کامیاب کام کے لیے ضرور ہیں لیکن خدا کیواسطے دیانت کے نام سے ان فائدوں کی باتیں نہ بناؤ جو ہم نے نہیں حاصل کیے بلکہ اسکے برخلاف ہم نے انکے لیے اپنی گرہ کا نقصان اُٹھایا ہی۔ معمولی ریلوے اور پبلک ورکس کے فائدے ایسی گورنمنٹ کے اندر اُٹھاتے جو قانونی منتظم وعادل ہی تو ہم صرف دوسو کرور روپیہ نہیں بلکہ بیس ارب روپیہ قرض لیتے اور اُسکا سود شکریہ کے ساتھ ادا کرتے اور اس سے فائدہ انڈیا کو اور انگلینڈ دونوں کو حاصل ہوتا اور ہم تجارت میں انگلینڈ کے سب سے زیادہ خریدار ہوتے پبلک ورکس کی نسبت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہی کہ انکا موقوف کرنا نہیں چاہیئے بلکہ ان کو بنانا اس طرح چاہیئے کہ دونوں انڈیا اور انگلینڈ کو فائدہ حاصل ہو۔ انگلینڈ کے کارہاے عظیم کے ضروری حصے یہ ہونے چاہیئں کہ پبلک ورکس ہندوستانیوں کے فائدوں کو بردے کا ظاہر کریں نہ ان کی مضرتوں کو۔ وہ غلام ہمکو بنائیں اور کھائیں اور (پسیے کوئی پکائے کوئی آئے لوٹے کھا گئے)، میں نے اعتراضات دادا بھائی نوروجی کی ان برٹش رول آف انڈیا سے ترجمہ کیے ہیں۔

دادا بھائی بڑے نامی گرامی پولیٹکل میں ہندوستان کے بہی خواہ مشہور اور معروف ہیں وہ تاجرانہ زیادہ تر انگلستان میں رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب کا نام ان برٹش رول اوف انڈیا رکھا ہی جسکے معنی یہ ہیں کہ انگلینڈ میں جو برٹش رول ہی وہ انڈیا میں نہیں ہے

اور اسکا ثبوت اُن روشن ضمیر و بلند خیال و عالی دماغ مدبران ملکی کے اقوال سے دیا ہی جو بڑے رحم دل و عادل و ہندوستانیوں کے سچے ہمدرد و دلسوز ہیں ان ہی کے اقوال سے انڈیا کی برٹش گورنمنٹ کا ہندوستان کو مفلس بنانا اور اسکے افلاس کو روز بروز بڑہانا اور انگلینڈ کی برٹش گورنمنٹ کے ان وعدوں کا ایفا نہونے دینا۔ جو اُسنے ہندوستانیوں کے بہبودی اور فلاح کے لیے کیے ہیں بیان کیے ہیں۔ دادابھائی کا اصل اصول یہ ہی کہ وہ انگلینڈ کی گورنمنٹ کو بڑا عادل اور رحمت باز جانتے ہیں۔ اور انڈیا کی گورنمنٹ کو اسکے برخلاف سمجھتے ہیں وہ انگلینڈ کی گورنمنٹ کے ایسے معتقد ہیں کہ اُسکو سلطنت الٰہی سمجھتے ہیں جس سے وہ اُن حقوق کی طلب کرتے ہیں جنکا عطا کرنا کبھی انسان کی خصلت میں داخل نہیں ہوا مگر ہاں خدا اُن کو عطا کرتا ہی۔ واللہ اعلم یہ انکا اعتقاد ہی یا مطلب حاصل کرنے کے لیے چاپلوسی ہی جو مخصوص اہل پارس کے ساتھ ہی کہ وہ اول بادشاہ کی مدح و ثنا مبالغہ کے ساتھ کرتے ہیں پھر اپنے مطلب نکالنے کے لیے التجا کرتے ہیں۔ وہ بھی انگلینڈ کی برٹش گورنمنٹ مدح سرائی کر کے اپنا عرض مطلب کرتے ہیں کہ اسنے جو انڈیا میں اپنی گورنمنٹ مقرر کی ہی وہ ہماری بڑی حق تلفیاں کیا کرتی ہی اور دونوا انگلنڈ اور ہند کو نقصان پہنچاتی ہی اسکی خبرگیری کرنی انگلنڈ کی برٹش گورنمنٹ کا فرض ہی۔ یہ پیر کہن سال مدت سے یہ سعی و کوشش کر رہا ہی مگر اس کی اُمید بر نہیں آئی۔ اسنے جو ریلوے پر اعتراضات کیے ہیں کہ وہ ہمکو مفلس بناتی ہی اور انگلستان کے حصہ دار اسکے ہم سے خراج لیتے ہیں۔ انگلینڈ نے ہندوستان میں کوئی پبلک ورکس اپنے سرمایہ زر سے جس طرح سے اُسکو بنانا چاہیے تھا نہیں بنایا۔

اُنکا جواب یہ ہی کہ کوئی اشراف آدمی اپنی شرافت کے سبب سے اپنے مفلس ہمسایہ سے کہے کہ بھائی تم مجھ سے روپیہ قرض لو اور بنج بیپار کرو اس سے جو فائدہ ہو اُس میں سے تم اپنی محنت اور مزدوری کا لو باقی فائدہ مجھے دو تو اس میں اُسکا کیا گناہ ہی؟۔ انگلستان

امیر تھا ہندوستان مفلس اور غریب تھا اسنے اُسپر رحم اور ترس کھاکر کہا کہ میں تم کو روپیہ دیتا ہوں تم اس روپئے سے اپنے ملک میں ریلوے بناؤ جس سے تم کو اور تمہارے ملک کو بہت فائدہ ہوگا اور اس فائدہ سے تم اپنا حق السعی لو اور باقی مجھے میرا حق دو تو اس میں انگلستان نے ہندوستان کے ساتھ کیا بدسلوکی کی۔ پھر انگلستان نے ہندوستان سے کہا کہ شائد ہی تم نے ریل کا نام سنا ہوگا تم نہیں جانتے کہ اس کی دم کسطرف ہے اور سر اس کا کسطرف اس سے تم بالکل نابلد ہو اسلیے میں تم کو ریلوے بنانے کا مصالحہ دیتا ہوں۔ جس سے وہ بنتی ہے اور تمہارا ملک اسکا بنانا نہیں جانتا۔ میں اپنے ملک سے ریلوے کاموں کے لئے انجنیر اور کاریگر اور منتظم دیتا ہوں جو اس کام کو تمہارے لیے انجام دینگے وہ تمہارے ملک میں میسر نہیں وہ تم کو ریلوے کا کام سکھلائینگے اور جب تم کام سیکھ جاؤگے اور خاطر خواہ کرنے لگوگے تو وہ اپنا کام تم کو سپرد کر دینگے غرض انگلستان نے تو لا دینے والا ساتھ دینے کا کام کیا کہ ہندوستان کو ریلوے بنانے کے لیے روپیہ دیا اور اسکے بنانے کا مصالحہ دیا اسکے بنانے کے لیے ایسے انجنیر دیے اسکے انتظام کیواسطے اپنے ملک میں ڈائرکٹر مقرر کیے۔ جسکے سبب سے ہندوستان میں ریلوں کا کارخانہ عظیم جاری ہوگیا۔ ہندوستان میں ہندوستانی اپنے سرمایہ کو ریلوں میں صرف کرنے کے لیے بڑے تنگ دل اور کم حوصلہ ہیں۔ انگلستان کے صرف ہونے سے ہندوستان میں یہ ریلوں کا جال بچھ گیا جس سے ہندوستان کا پیداوار بڑھنے لگا۔ تجارت کا بازار گرم ہوگیا۔ لاکھوں آدمی اسکی بدولت برسر کار ہوگئے ہندوستان کی قدرتی پیداوار جو کانوں میں مدفون تھی بروے کار ظاہر ہونے لگے۔ اگر انگلستان ریلوے کے بنانے میں ہندوستان کی استعانت نہ کرتا تو ملک ان سب اوپر کے نعمتوں سے محروم رہتا۔

اب دادا بھائی نوروجی جو یہ فرماتے ہیں کہ انگلستان نے ہندوستان کے فائدہ کے لیے یہ کام نہیں کیے بلکہ اپنے فائدہ کے لیے تو اسکے یہ معنی ہیں کہ ہم مفلس تھے اسلیے ہم کو روپیہ

انگلستان کو نہیں دینا چاہیئے تھا۔ ہمارے پاس ریلوے کے بنانے کا مصالحہ نہیں تھا وہ انگلنڈ سے نہیں آنا چاہیئے تھا ہم کو ریل بنانی اور چلانی نہیں آتی تھی اسلیے اسکے واسطے انجنیر اور ڈرائیور نہیں آنے چاہیئے تھے۔ ہم کو انتظام کرنا نہیں آتا تھا اسلیے انگلستان میں اسکے ڈائرکٹر منتظم نہیں مقرر ہونے چاہیے تھے۔ اگر یہ کام اسنے کیے ہوتے تو مفت یا اپنے قلیل فائدہ کے لیے روپیہ قرض بے سود دیا ہوتا تو وہ قرض حسنہ سمجھا جاتا۔ انجنیروں ڈائرکٹروں و ڈرائیوروں کو تنخواہ نہیں لینی چاہیے تھی دادا بھائی کا یہ فلسفہ نرالا ہی کہ ہمارے بچے کی آنکھیں دکھتی ہیں سارے شہر کے چراغ بجھاؤ۔ ہم کو صنعت و حرفت و پبلک ورکس کا کام کرنا نہیں آتا ہمارے پاس اسکے بنانے کے لیے روپیہ نہیں اسلیے کوئی دوسرا اس کام کو نہ کرے۔ ہمارے پاس روپیہ نہ تھا جس سے ریل بناتے نہ ہم کو وہ صنعت و حرفت آتی تھی جس سے وہ بنتی۔ نہ اسکا وہ مصالح ہمارے ملک میں تیار ہو سکتا کہ جس سے وہ تعمیر ہوتی اسلیے انگلستان نے بڑا گناہ کیا جو یہ کام اسکے لیے کیے کہ ریلوے کی آمدنی کا بڑا حصہ وہ کھائے جاتا ہی۔ ہمکو اس میں سے تھوڑی فردوری فردوروں کی سی ملتی ہی۔ دادا بھائی نے ریلوے کی آمدنی میں سے جو ہندوستان کو فائدہ ہوتا ہی اُسکے دیکھنے میں آنکھوں کے اوپر پٹی باندھ لی ہی۔ اسکی وہی مثل ہی کہ گدہے کی آنکھوں میں نمک ڈالا اُسنے کہا کہ میری آنکھیں ہی پھوٹیں۔ ریلوے کی آمدنی مسافروں کی آمد و رفت اور ٹریفک (تجارت) سے ہوتی ہی۔ ریل میں بہ نسبت اور سواریوں کے سفر بہت سستا اور جلد ہوتا ہی جس سے مسافروں کو روپیہ و وقت کی بچت ہوتی ہی جس سے ان کا سرمایہ بڑہتا ہی۔ ٹریفک میں اسباب تجارت کے منتقل کرنے میں باربرداری کے خرچ ریل میں سب سے زیادہ کم ہوتا ہی۔ بھاری اسباب تو کسی طرح بغیر ریل کے ایک جگہ سے دوسری جگہہ منتقل ہو ہی نہیں سکتا۔ بس اس بچت سے بھی سرمایہ ملکی بڑہتا ہی۔ ملک کے جس حصہ میں کوئی پیداوار زیادہ پیدا ہو سکتا ہی وہ اسلیے بڑہایا جاتا ہی کہ دوسرے حصہ میں بذریعہ ریل پہنچکر اچھی قیمت پاتا ہی اسلیے ملک کی پیداوار کو ریل بڑہاتی ہی۔ دادا بھائی لکھتے ہیں کہ ریلوے

سے اور ملکوں کو جو فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ ہندوستان سے مفقود ہیں۔ دادا بھائی کا یہ لکھنا جب سزاوار تھا کہ ہندوستان کی حالت وحیثیت اور لیاقت اور ملکوں سے ہوتی۔ آدمی نظیر وتمثیل دینے میں سب سے زیادہ بھاری غلطی کرتا ہے۔ دادا بھائی نے ہندوستان کی تمثیل یونائٹڈ سٹیٹس سے فقط یہ ادنیٰ مشابہت دیکھکر کہ دی ہے کہ دونوں میں انگلنڈ سے روپیہ قرض لیکر ریلوے بنائی جاتی ہیں۔ پھر انسے نتائج نکالنے شروع کیے جسپر یہ مثل صادق آتی ہے کہ مارا گھونٹا پھوٹی آنکھ۔ یہ اُنھوں نے نہیں لکھا کہ ہندوستان یونائٹڈ سٹیٹس کی حالتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک بالکل خودمختار سلطنت جمہوری ہے۔ دوسری کا حال یہ ہے کہ جیسے کوئی آدمی اپنے مکان میں رہتا ہو وہ اُسکو گروی رکھدے یا بیچڈالے یا کوئی زبردستی اُسپر قبضہ کرلے مگر ہر صورت میں وہ مکان سے نکالا نہ جاے تو وہ شخص اُس مکان کو فقط اس سبب سے اپنا کہہ سکتا ہے کہ اس میں وہ رہتا ہے اگر وہ اپنے تئیں مالک سمجھے تو اُس کی نادانی اور بے حیائی ہے بس اسی طرح ہندوستانیوں کا کہنا کہ ہندوستان ہمارا ملک ہے جو غیروں کے ہاتھ میں ہے اور اس میں ہم اپنی اُنگلی نہیں ہلا سکتے۔ پس جتبک ہندوستانی ہندوستان کو اپنا ملک نہ بنائیں اُنکو یہ کہنا کہ یہ ہمارا ملک ہے بالکل غلط ہے دوسرے کی چیز کو اپنی چیز بنانا ناانصافی ہے۔ یونائٹڈ سٹیٹس کے اندر ریلوے کا مصالحہ موجود ہے۔ وہاں انجینیر ریل کے بنانے کیواسطے اور ڈائرکٹر انتظام کے واسطے موجود ہیں۔ یہاں ہندوستان میں سوا معدودے چند کے علی العموم بھیڑوں کی موافق ہیں جو آسانی سے مغلوب ہوگئی ہیں۔ گڈریوں کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہیں ان کی شبانی کریں۔ یہ خداوند تعالیٰ کی عنایت اُنکے حال پر ہے کہ یہ گڈرےیے اپنی بھیڑوں کی پرورش کرتے ہیں۔

چند آدمی جنھوں نے انگریزی زبان میں لفاظی میں ٹری مہارت حاصل کی ہے مبالغہ سے یادہ گوئی کرتے ہیں کہ ہندوستان کو ان مہذب ملکوں نے جو اپنے اوپر آپ فرماں روائی کرتے ہیں تشبیہہ دیتے ہیں وہ بہت اترا اترا کر کہتے ہیں کہ انگلستان اور اُس کی کولونیز میں

یہ کام ہوتے ہیں یہاں کیوں نہیں ہوتے اگر ہندوستانی ان ملکوں کی سی حیثیت وحالت و لیاقت بہم پہونچائیں تو وہ کام یہاں خود بخود ہونے لگیں - ان یاوہ گوئیوں سے کچھ ہوتا نہیں برات عاشقاں بر شاخ آہو -

اب میں بابو رومیش چندر صاحب کی تاریخ انڈیا ان وکٹوریا ایج میں ریلوے و نہر و آبپاشی کے باب میں جو لکھا ہے نقل کرتا ہوں اور اُنکے اعتراضات کے جوابات جو دیے گئے ہیں انکے بعد لکھتا ہوں -

ریلوے و نہر آبپاشی کے کام

ہندوستان میں ریلوں کے جو کام شروع ہوے انکے انتظام میں بہ نسبت مسافروں کے آسائش و آرام کے فضول خرچی و اسراف کو زیادہ دخل تھا - پرائیویٹ کمپنیاں کام کرتی تھیں جنکو یہ اطمینان تھا کہ ہم اپنا روپیہ خواہ دانائی سے یا نادانی سے جو خرچ کرینگے اُسکے سود دینے کی ذمہ دار گورنمنٹ ہی وہ ہمکو بہر نہج غالباً ملے گا - اگر ٹریفک کی کمیٹی کے سبب سے آمدنی ریل میں گارنٹی سود سے کمی ہوگی تو گورنمنٹ محاصل ملکی انڈیا کی آمدنی سے اس کمی کو پورا کر دے گی - اسوجہ سے جیسی اس ملک میں ریلوے کے بنانے میں فضولخرچیاں اور اسراف ہوے ویسے کسی اور ملک میں نہیں ہوئے - اس کی تصدیق پارلمنٹری کمیٹی منعقدہ ۱۸۵۷ و ۱۸۵۸ کی تحقیقات کرتی ہی جس میں بڑے ذی وجاہت اعلی درجہ کے آدمیوں سے شہادت لی گئی ہی - ہر گواہ کو یہ سمجھو کہ وہ بڑے پایہ کا آدمی تھا ڈین ڈرس گورنمنٹ ڈائرکٹر انڈین ریلوے نے شہادت دی کہ اس گارنٹی کے انتظام کے سبب سے بہت روپیہ رائگاں ہوا مگر اسکے ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر یہ گارنٹی کا انتظام نہوتا تو ہندوستان میں اس زمانہ میں کسی اور انتظام سے ریلوے نہیں بن سکتی تھی - تھورنٹن صاحب نے اسکے خلاف کہا کہ اس گارنٹی انتظام نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جو بغیر اسکے نہوتا اور یہ بھی کہا کہ مجھے یقین ہی کہ اگر گارنٹی نہوتی تو بھی ریلوے بنانے کے لیے انڈیا میں انگلنڈ کا سرمایہ جاتا -

انگلینڈ میں دولت کی روز بروز افزائش ہوتی جاتی ہے کہ اس کی بڑی مقدار کے لگانے کی گنجائش انگلینڈ میں نہیں رہی اسلیے وہ جنوبی امریکہ اور اور ملکوں میں لگانے کے لیے جاتا ہے پس میں یہ خیال کرکے نہیں جاتا کہ انڈیا میں اسکے نہ لگانے کے اندر کیوں اصرار ہوتا اگر سرمایہ خرچ کرنے والے سخت غلطیاں کرتے تو وہ ان غلطیوں کا خمیازہ آپ بھگتتے۔ اسلیے وہ اپنے سرمایہ کو بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے ریلوے بنانے میں کفایت شعاری اختیار کرتے لیکن جب ایک دفعہ کمپنیوں کو گارنٹی دیگئی تو پھر بغیر گارنٹی کے اپنا سرمایہ لوگ نہیں لگاتے یہ ایک شخص کی رائے ہے جسنے ایک فرضی صورت عرض کرکے فرضی نتیجہ نکالا ہے جو کوئی وقعت نہیں رکھتا اور اس بات پر ذرا خیال نہیں کیا۔ اور ملکوں میں سرمایہ کے لگانے میں جو انگلینڈ کے سرمایہ داروں کو اپنے روپیہ کے لگانے میں اطمینان تھا وہ ہندوستان میں سرمایہ کے لگانے میں کبھی نہیں ہوسکتا۔ انگلنڈ کو اپنے کولونیوں پر اور امریکہ واسٹریلیا وغیرہ میں سرمایہ کے صرف کرنے میں اسکے نفع حاصل کرنے کا جو یقینی اطمینان ہے وہ ہندوستان میں کبھی نہیں ہوسکتا۔ وہ گورنمنٹ کی گارنٹی بغیر کبھی انڈیا میں ریلوں کے اندر روپیہ نہیں لگا سکتے۔

صاحب ممدوح نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ ایک لازمی نتیجہ اس طریقہ کا تھا کہ ریلوے کا بنانا اس معاہدہ پر شروع ہوا کہ ریلوے کی لاگت میں خواہ کتنا ہی روپیہ خرچ ہو گورنمنٹ اس روپیہ کے سود دینے کی ذمہ دار ہے کیا ریلوے بنانے والی کمپنی کو کفایت شعاری کیطرف کوئی رغبت کرنے کی وجہ نہیں رہی وہ جانتی تھی کہ ریل کے بنانے میں خواہ ہم کیسی ہی غلطیاں کریں اس سے کچھ ہمارے اس روپیہ کے فائدہ میں فرق نہیں آئیگا جو ہم خرچ کرینگے (مردہ دوزخ میں جاے یا بہشت میں ہم کو اپنے حلوے مانڈے سے کام)

لفٹنٹ کرنیل میسی ای ہن شل جمرا انڈیا نے کہا کہ ۱۸۴۷ء میں انڈیا میں ریلوے بننی شروع ہوئیں اول سٹاف انجینروں کا انگلینڈ سے انڈیا کو بھیجا گیا اس زمانہ میں اُن کی عادت

میں یہ امر داخل نہ تھا کہ وہ ادل اکونومی (اقتصاد) پر خیال کرتے۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بہت زیادہ اگرچہ دوچند نہیں ریلوے بنانے میں بیفائدہ روپیہ خرچ کیا۔ ٹھیکہ داروں کے لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اکونومی (اقتصاد) کی طرف توجہ کرتے انگلنڈ سے سارا سرمایہ آتا تھا اُسپر جب تک گورنمنٹ محاصل ملکی کے آمدنی سے پانچ روپیہ فیصدی سود دینے کی ذمہ دار تھی اسکو پروا نہ تھی کہ یہ روپیہ جو اسے قرض دیا ہے دریا ہیگلی میں پھینکا جاتا ہے یا چونہ اینٹ میں خرچ ہوتا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ تھا کہ بڑی بڑی رقمیں خرچ میں آگئیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فی میل ریل بنانے میں تین لاکھ روپئے خرچ ہوئے۔ میرے نزدیک جیسی اس کام میں فضولخرچیاں واسراف ہوے ایسے کسی اور کام میں نہیں ہوئے۔

سرجان لارنس وائسراے انڈیا نے پارلمنٹری کمیٹی کے روبرو ۱۸۷۳ء میں شہادت میں ریلوے بنانے کی فضول خرچیوں پر بڑی لعنت وملامت کی اُنھوں نے کہا کہ ریلوے میں جتنا روپیہ خرچ ہونا چاہیے تھا اس سے زیادہ خرچ ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پانچ روپیہ سیکڑہ سود جو اچھی شرح سود کی ہے سرمایہ داروں کو ملتی ہے وہ اس کی پروا نہیں کرتے کہ روپیہ کس طرح خرچ ہوا یا ہوتا ہے۔ ہم کامیاب ہونگے یا ناکامیاب۔ ہندوستانیوں کی شکایت چلی جاتی ہے کہ ریلوے پر انکے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا ہے۔ اس باب میں گورنمنٹ بہ نسبت کمپنیوں کے زیادہ موثر ہوسکتی ہے۔ گو کمپنی کے بیجا اختیارات کو حالات موجودہ میں روک نہیں سکتی۔

لارڈ لارنس نے ۱۲۔ اگست ۱۸۶۹ء کو اپنی ایک یادداشت لکھی ہے جس میں ہندوستانیوں کو ریلوے بنانے کے سبب سے جتنا کل نقصان ہوا اسکا حساب یہ لکھا ہے کہ تخمینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ریلویوں کے بنانے میں جو بن رہی ہیں اکیاسی کروڑ روپیہ خرچ ہو چکے گا تو گورنمنٹ کا خرچ بہ تفصیل ذیل ہوگا۔ زمین کے اور ایکسچینج (معاوله) کے نقصانات اور نگرانی کے خرچ کی بابت ساڑھے سات کروڑ روپیہ اور نقد آمدنی کی کمی کے سبب سے گارنٹی سود کے پورا

کرنے کے لیے ساڑھے چودہ کروڑ روپیہ اور گارنٹی سود کے ادا کرنے کے لیے جو روپیہ قرض لیا گیا ہے اُسکے سود کے ساڑھے چار کروڑ روپیہ۔ ان خرابیوں کے سبب سے گارنٹی انتظام آخر کو متروک ہوا۔ جسکا حال ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ ریلیں کس طرح خریدی گئیں۔ یہ اعتراضات تو ریلوے کے بنانے پر کیے گئے ہیں۔ بڑا اعتراض ریلوے بنانے پر یہ کیا جاتا ہے کہ اگر اسکے بدلے میں آبپاشی کے کام بنائے جاتے تو ملک کو بہت کچھ فائدہ ہوتا۔

قحط سالی میں ریلوے خوراک کی بہم رسانی میں مدد معاون ہوتی ہے مگر وہ فی نفسہٖ خوراک کی پیدائش میں اضافہ نہیں کرتی۔ آبپاشی کا کام یہی ہے کہ وہ پیداوار میں اضافہ کرے اور خشکسالی میں فصلیں تیار کرے۔

اسی وجہ سے ہندو مسلمان فرماں رواؤں نے اس کی طرف بڑی توجہ اپنی رکھی۔ ان کی یادگاریں ہندوستان کے شمالی حصے میں نہریں اور جنوبی حصہ میں کنڈ اور تالاب موجود ہیں برٹش گورنمنٹ نے بھی اس کام کو بتامل اختیار کیا اور اس سے جو فوائد حاصل ہوئے وہ پہلے بیان ہوئے۔ اہل انگلنڈ نہروں کی نسبت ریلوے سے زیادہ واقف ہیں اُنکے ملک میں اس قسم کی آبپاشی کی ضرورت نہیں پڑتی جس قسم کی اس ملک میں حاجت ہوتی ہے اس لیے وہ جیسی ریلوں کی توسیع کے شائق ہیں آبپاشی کے شائق نہیں وہ ہندوستان میں آبپاشی کی قدرشناسی نہیں کرتے۔

سر آرتھر کوٹن آبپاشی کے بڑے حامی اور مددگار و خواستگار تھے۔ کاویری اور گوداوری کی نہروں کے بنانے میں کار ہائے نمایاں کرنے سے اُنھوں نے اپنا نام دنیا میں روشن کیا تھا اُنھوں نے پارلیمنٹ کی کمیٹی کے روبرو شہادت دی کہ انڈیا کو پانی کے مرکبوں کی ضرورت ہے اُس میں ریلوے بالکل ناکام رہی ہے نہ وہ چیزوں کی مقدار مطلوبہ کو قیمت معینہ پر نہیں پہنچا سکتی اُنکے واسطے گورنمنٹ کو تین کروڑ روپیہ سالانہ خرچ کرنا پڑتا ہے اور ان کی غور و پرداخت کے لیے خرچ کی زیادہ ضرورت ہوتی جاتی ہے۔ ایسی نہروں کے بنانے میں جس میں دخانی کشتیاں

چلیں ریلوے کی نسبت آٹھویں حصہ کا خرچ ہوگا۔ وہ چیزوں کی مقدار مطلوبہ کو قیمت معینہ پر جسقدر جلد چاہیں لے جائیگی اور خزانہ شاہی سے وہ کچھ نہیں مانگیں گے اور آبپاشی کے صیغہ میں شامل ہو جائینگی۔

سر چارلس ٹریولین نے کہا کہ ہندوستان میں آبپاشی ہمہ چیز ہے۔ پانی بہ نسبت زمین کے زیادہ قیمتی ہے اسلیے کہ زمین میں جب پانی کام میں آتا ہے تو اُسکا پیداوار کم از کم چھ گنا ہو جاتا ہے بلکہ عموماً اس سے بھی زیادہ۔ وہ اس زمینوں کو بارآور اور پھل دائل کرتا ہے جن میں اُسکے بغیر کچھ خاک نہ پیدا ہوتا اور اگر پیدا ہوتا تو کچھ ایسا ہی۔

بیس برس تک آبپاشی کے بڑے حامی و مددگار لارڈ لارنس رہے وہ یقین کرتے تھے کہ ہندوستان کو ریل ویوں کی نسبت آبپاشی کی زیادہ ضرورت ہے۔ وہ کاشتکاروں پر یہ جبر کرنا پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ نہر کے پانی لینے پر مجبور کیے جائیں انکے نزدیک تو نہروں کا نہ بنانا اس جبر کے کرنے سے بہتر تھا۔

انڈیا کے اکونومی (اقتصاد) کے جو معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ انسے انگلنڈ کے تاجروں اور صناعوں کی اغراض متعلق ہوتی ہیں تو اُن پر انگلنڈ کے پبلک کمتر متوجہ ہوتے ہیں سر آرتھر کوٹن نے ہرچند وہاں کی پبلک کو سمجھایا کہ وہ انڈیا کی آبپاشی کے کاموں کی طرف متوجہ ہوں لیکن اس سمجھانے کا اثر کچھ نہیں ہوا۔ جان برائٹ جو پارلیمنٹ کے رکن اعظم تھے سر آرتھر کی اس تجویز کی تائید کی کہ تیس کروڑ پونڈ میں سارے ہندوستان کے اندر ایسی نہریں بنجاویں کہ جن میں جہازرانی ہو سکے۔ مگر انگلشس میں سو کروڑ سے زائد جو ریلوے میں خرچ ہو چکا ہے بجا سمجھتا تھا لیکن آبپاشی کے کاموں کے لیے تیس کروڑ پونڈ کے خرچ ہونے کو وہ یہ جانتا تھا کہ محض بیفائدہ ہے انگلستان میں متوسطین بھی کل ہند کی آبپاشی کو ایسا جانتے تھے کہ اندھیرے میں ذقند مارتی ہے۔

سر چارج ہملٹن تیس برس کے جوان انڈر سکرٹری انڈیا تھے انہوں نے اپنے اسپیچ

یں فرمایا کہ میں یہ دیکھکر کہ آبپاشی کے سارے کاموں میں ڈلٹا کے سوا ناکامیابی ہوئی ہی یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ شخص بڑی غلطی کرتا ہی کہ گورنمنٹ پر زور ڈالکر اس آبپاشی میں خرچ کثیر کی تحریک عظیم کرتا ہی اور ان واقعات کو جو بدنام مشہور ہیں پیٹھ کے پیچھے ڈالتا ہی۔ مجھے افسوس ہی کہ سر آرتھر کوٹن کی پارلمنٹ کے اس بڑے رکن عظم نے حمایت و تائید کی جس کی فصاحت بیان پبلک پر تاثیر کرتی ہی - یہ سنکر جان برائٹ نے کھڑے ہو کر یہ استفسار کیا کہ ایسی کمیٹی کسواسطے نہ مقرر کیجاے کہ جسکا مقصد عظم یہ ہو کہ وہ انگلنڈ میں اور اگر ضرورت ہو تو ہندوستان میں ایسی شہادتیں بہم پہونچاے کہ جس سے معلوم ہو کہ کیا سبب ہی کہ انڈیا پر قبضہ ہوئے برسوں گذرے سو برس سے اس حصہ پر قبضہ ہی پھر بھی ہم اس سے آگے نہیں بڑہے کہ یہاں خشکسالی ہی وہاں قحط ہی - ہم نے سنا ہی کہ انڈیا میں آبپاشی کے اندر نوّے لاکھ یا ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ خرچ ہوئے ہیں بھلا اس روپیے کی ہندوستان میں کیا حقیقت ہی (اونٹ کے منہ میں زیرہ ہی) یہاں میں چسٹر پانچ لاکھ آدمیوں کی آبادی کا قصبہ ہی جس میں پینے کے لیے صاف پانی کے بہم پہنچانے میں ساڑہے پچاس لاکھ پونڈ خرچ ہوئے ہیں۔ انڈیا میں بیس کروڑ آدمی رہتے ہیں - برٹش گورنمنٹ کی مطیع ہیں مینہ کا پانی بافراط برستا ہی اور بڑے بڑے دریا بہتے ہیں میں خیال کرتا ہوں کہ آبپاشی کے وسائل وہاں بافراط موجود ہیں -

ان کل مباحثوں کا ماحصل یہ ہوا کہ ۲۲ - جنوری ۱۸۷۸ء کو سلیکٹ کمیٹی مقرر ہوئی لارڈ جارج ہملٹن اسکے چیرمین مقرر ہوئے - اس کمیٹی کے روبرو بڑے بڑے منتخب دانشمند و تجربہ کار مدبران ملکی نے شہادت دی - سر آرتھر کوٹن نے اپنی آغاز شہادت میں ریلوں کی نسبت چند لفظوں میں بیان کیا -

ریلوں کی کاموں کی لاگت	۱۱۲۰۰۰۰۰ پونڈ
زمین کی قیمت	۸۰۰۰۰۰ پونڈ

بالفعل قرض ۵۰۰۰۰۰۰ پونڈ

میزان کل ۱۷۰۰۰۰۰۰ پونڈ

اس روپئے میں ۷۵۰۰ میل ریل بحساب ۲۳۰۰۰ پونڈ فی میل تیار ہوئی ہیں۔ خزانہ شاہی کو سرمایہ کے حصہ داروں کو ۴۰ ½ لاکھ پونڈ اور زمین قرض پر ۴ فیصدی کے حساب سے ۳۰ لاکھ پونڈ سود دینا پڑتا ہے یعنی کل خرچ ۷۰ ½ لاکھ پونڈ کرنا پڑتا ہے۔ جس میں سے آمدنی ۴۰ ½ لاکھ پونڈ منہا کی جائے تو ۳۰ لاکھ پونڈ کا خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ پھر اُنھوں نے نہروں کا حساب بیان کرکے تلایا کہ گورنمنٹ کو پانچ لاکھ کا سالانہ نقد منافع ہوتا ہے۔

سرآرتھر کوٹن نے بیان کیا کہ ریلوے جو نئی بنائی جاتی ہیں نہ تو وہ آفات قحط سے بچاتی ہیں۔ بمبئی مدراس وحیدر آباد میں چار کرور آدمیوں کی آبادی میں چالیس پچاس لاکھ آدمی قحط سے مر گئے۔ نہ وہ آدمیوں اور جانوروں کے لیے خوراک پیدا کرتی ہیں نہ وہ ٹریفک کے کل کاموں کو انجام دے سکتی ہیں نہ کچھ اُن کو ارزاں کرتی ہیں نہ وہ اپنی لاگت اور قرض کا سود ادا کرتی ہیں نہ وہ ملک کے پانی کا نکاس کرتی ہیں نہ آدمیوں کے واسطے پینے کا پانی مہیا کرتی ہیں۔ یہ سارے کام آبپاشی کے کاموں سے بخوبی ہو سکتے ہیں۔

سرآرتھر کوٹن کے سوال وجواب میں کہ آبپاشی کے کاموں میں گورنمنٹ نے کیوں غفلت کی یہ کہا گیا کہ صرف اس سبب سے کہ اُنکے بنانے میں ریلوں کا بنانا حماقت ثابت کرتا تھا۔

غرض کمیٹی کے روبرو ریلوں اور آبپاشی کے باب میں ایسی شہادتیں مخالف وموافق پیش ہوئیں جسپر کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ آبپاشی کے حق میں جو شہادتیں ہیں وہ تیرہ وتاریک اور بعض خیالی ہیں اسلیے وہ مسترد کیجاتی ہیں۔

بابو رومیش چندر وت آخر میں لکھتے ہیں کہ دونوں ریلوے اور آبپاشی کے کاموں کی لاگت ایک ہی طرح سے ہندوستانی ادا کرتے ہیں اگر انسے اس باب میں صلاح و مشورہ لیا جاتا تو وہ اول سر آرتھر کوٹن کی اس تجویز کو پسند کرتے کہ سٹیٹ ریلوے اور گارنٹی ریلوے بنانی اور بڑہانی موقوف کیجائیں بڑی بڑی لینیں ان کی بن گئی ہیں۔ دوم نہایت احتیاط سے آبپاشی کے کام بنائے جائیں جو زراعت اور انسداد قحط کے لیے مفید اور بکارآمد ہوں۔

بیشک سر آرتھر کوٹن کی تدابیر تیرہ و تاریک اور خیالی اس سبب سے تھیں کہ لنڈن میں یہ تجویزیں جو کیسا ہی کوئی تجربہ کار ذہین طباع بتاتا یا وہ بطبع اذیت رساں اور دق کرنے والی اہل انگلنڈ کی تھیں۔ لیکن جب انکا امتحان نہایت غور کے ساتھ کیا جاتا ہی تو معلوم ہوتا ہی کہ وہ عمل میں آسکتی تھیں اور بہت فائدہ پہنچا سکتی تھیں لیکن لارڈ جارج ہلٹن نے انکے مسترد ہونے کا فتوے دیدیا تھا اسلیے سر آرتھر کوٹن کی پیش بینی اور جان برائٹ کی کشادہ دلی کے ساتھ ہمدردی ہند کا دورہ پھر اس صدی میں نہیں آیا۔

بابو رومیش چندر وت صاحب نے ریلوے پر یہ اعتراضات کیے۔ اول یہ انتظام خراب تھا کہ ریلوں کے بنانے کے لیے پرائیویٹ کمپنیوں کو اس سرمایہ پر جو وہ اسکے بنانے میں صرف کریں پانچ یا ساڑھے چار فیصدی سود دینے کی گورنمنٹ ضامن ہوئی۔ اسکا جواب یہ ہی کہ یہ گارنٹی سود نہ دیا جاتا تو ہندوستان میں ریلوں کا نام بھی نہ ہوتا۔ اسکا ثبوت یہ ہی کہ جب گورنمنٹ نے اس گارنٹی سود کو موقوف کر دیا تو پھر کوئی پرائیویٹ کمپنی ہندوستان میں ریل بنانے کے لیے نہیں کھڑی ہوئی ناچار گورنمنٹ نے پھر اپنا پہلا ہی طریقہ اختیار کیا مگر سود گھٹا کر تین فیصدی کر دیا۔ انگلنڈ کے سرمایہ داروں کو جو امریکہ و اسٹریلیا اور گو کہ تیز میں اس سرمایہ کے لگانے سے نفع اُٹھانے پر اطمینان ہی۔ وہ ہندوستان میں نہیں ہی اسلیے وہ ہرگز بغیر گارنٹی سود کے کہیں ریل نہ بناتے۔ اس گارنٹی ہی نے انڈیا میں ریلوں کو بنایا دوسرا اعتراض یہ ہی کہ اس گارنٹی سود کا نتیجہ یہ تھا کہ ریلوں کے بنانے میں اندہا دُہند

فضول خرچیاں ہوئیں اور اُن فضول خرچیوں کا ثبوت خاطر خواہ لکھا ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ ان فضول خرچیوں کے ہونے میں تو کچھ شک و شبہ نہیں مگر ان فضول خرچیوں میں سے زیادہ تر نفع کا حصہ ہندوستان کے ہاتھ میں آیا۔ کیا بابو صاحب نے دیکھا نہیں کہ جب ریلیں بننی شروع ہوئی ہیں تو صدہا ہندوستانی ٹھیکہ دار لکھپتی بن گئے اور ہزارہا آدمی نہال ہو گئے۔ ریلوں پر کیا موقوف ہے ہر پبلک ورکس میں گورنمنٹ کا روپیہ فضول خرچ ہوتا ہے۔ اس فضول خرچی کے انسداد کا ابتک کوئی علاج نہیں ہوا۔ وہ ایک لازمی برائی پبلک ورکس کی ہے روزمرہ اسکا مشاہدہ ہوتا ہے اس فضول خرچی میں ہندوستانیوں کے نفع کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ انکی اس فضول خرچی کی صرف یہ وجہ ٹھہرانی صحیح نہیں ہے کہ سرمایہ داروں نے اس فضول خرچی کی پروا نہیں کی کہ انکو اپنے سود سے غرض تھی جو انکو ہر نہج ملا جاتا تھا۔ اس کام کی ابتدا تھی جسکا یہاں تجربہ پہلے نہیں ہوا تھا۔ ایسی حالت میں روپیہ کا اکارت جانا لازمی تھا۔ انگریزوں کو ہندوستانیوں نے خوب لوٹا۔ ہندوستان نے جو سود دیا اُسکا ایک حصہ اس طرح واپس لے لیا۔ گو بُری طرح لیا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ انگلنڈ کے آدمی انڈیا کی آبپاشی کی قدر نہیں کرتے تھے وہ ریلوں کو سمجھتے تھے کہ اسکے سبب سے انکا اسباب تجارت و صنعت ہندوستان کے ہر گوشہ و قطعہ میں آسانی سے پہنچنے لگے گا اسلیے وہ ریلوں کا بننا بہ نسبت آبپاشی کے کاموں کے زیادہ چاہتے تھے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ یہ مقصد تو اُن کا ایسی نہروں کے بننے سے بھی حاصل ہوتا تھا جنمیں جہاز رانی ہو اسلیے اُنکے نزدیک یہ دونوں کام برابر تھے۔

اب یہ ایک بحث ہے کہ ہندوستان کو ریلوں سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے یا آبپاشی کے کاموں سے ان دونوں کی فوائد اور نقصانوں کی موازنت مدبران ملکی نے کی ہے مگر اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ ریل سے ہو یا اور آبپاشی کے کاموں سے پیداوار کی افزائش ہو تو اس سے ملک کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ پیداوار کی افزائش سے

توجب ہی فائدہ ہوتا ہی کہ اُسکے منتقل کرنے کے وسائل ہوں۔ ملک اڑیسہ میں قحط پڑا وہانکے اناج کے پہنچانے کے وسائل نہ تھے اسیلیے لاکھوں آدمی مرگئے۔ اگر ریل ہوتی تو لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں۔ گو آبپاشی کی برابر ریلیں پیداوار کو نہیں بڑہاتیں مگر وہ بواسطہ بڑہاتی ہیں۔ لوگ اپنے ملک کی پیداوار کو اسیلیے بڑہاتے ہیں کہ ریلوں کے ذریعہ سے وہاں منتقل کرنا جہاں اس سے فائدہ ہو آسان ہوتا ہی۔ جب سے ریلوں نے بندرگاہوں میں اناج کا پہنچانا شروع کیا ہندوستان سے اناج کی طلب بہت زیادہ ہوگئی ہی اور اسکے ہندوستان کے زمیندار مالامال نہال ہوگئے ہیں۔ اور اُنھوں نے اپنی کئی پیڑہیوں کا قرض چکادیا ہی۔ ریل کے نقصان پہونچانے کی شن کو طول طویل بیان کرنا اور اُسکے فائدونکے بیان کرنے سے قطع نظر کرنا جو بابو صاحب نے اپنی طرز تحریر میں اختیار کیا ہی۔ انصاف سے بعید ہی۔ ریل سے ملک کو جو دولت حاصل ہوئی ہی وہ سٹیشنوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتی ہی۔ کوئی دہلی کو دیکھے کہ ریل سے پہلے اسکا کیا حال تھا اور اب ریلوں نے اسکو دولت سے کیسا نہال کیا ہی۔

بابو صاحب کا یہ لکھنا کہ ریلوں کے نقصانوں کا پلّہ فوائد کے پلہ سے بھاری ہی غلط ہی جیسے آبپاشی کے کاموں میں فوائد کا پلڑا بہ نسبت اُسکے نقصانوں کے وزنی ہی ایسا ہی ریلوں کا حال ہی۔ آبپاشی کے بھی یہ نقصانات بیان کیے جاتے ہیں۔ کہ جمنا کی نہر نے ہزاروں ایکڑ زمین کو کلر بنا دیا۔ گنگا کی نہر بھی سوا ایکڑ زمین میں سے ایک ایکڑ زمین کی پیداوار کو اپنے مکدر پانی سے رتیلا بنا کے گھٹاتی ہی۔ ان نہروں کے سبب سے زمین کو فصلوں سے مہلت نہیں ملتی اسیلیے زمین کا پیداوار گھٹتا ہی۔ جیسے آخر کو انکا وہی حال ہو جائیگا جو سونے کے انڈے دینے والی مرغی کا بیان کیا جاتا ہی۔ نہروں کا پانی کھیتوں میں ایسا بے تمیزی کے ساتھ لیا جاتا ہی کہ ان پر کیچڑ کی پپڑی خشک جم جاتی ہی کہ جس سے زمین کا پیداوار کم ہوتا ہے۔

سر آرتھر کوٹن کی تدابیر آبپاشی کے کاموں کی جو لارڈ ہملٹن کی کمیٹی میں تیرہ وتاریک اور محض خیالی سمجھی گئیں وہ بالکل عقل وتجربہ کے موافق تھیں۔ سر آرتھر کے یہ حسابات ایسے ہی تھے جیسے کہ بعض حساب کی کتابوں میں لکھے جاتے ہیں کہ افریقہ میں اگر ایک حبشی فلاں کیڑے کو اپنے کدال سے نہ مارتا تو ایک مدت کے بعد کل دنیا ساری کیڑوں ہی سے بھر جاتی۔ اگر خرگوشوں کو اور جانور نہ کھاتے اور آدمی نہ شکار کرنے تو وہ ایسے کثیر الاولاد ہوتے ہیں کہ ایک مدت کے بعد ساری دنیا خرگوشوں ہی سے پُر ہوجاتی۔

ہندوستان کی آبپاشی کے حسابوں کے بڑے طومار اخباروں میں لکھے ہوتے ہیں کہ ایک بڑے عالم محاسب نے یہ حساب لگایا کہ ہندوستان میں بارش کا اور دریاؤں کا پانی اتنا اکارت جاتا ہے کہ اگر اسکے کام میں لانے کا انتظام کیا جاے تو ہندوستان کا پیداوار جو وہ گنا بڑھ جاوے جس سے ہندوستان اپنے تئیں اور اپنے مثل اور تیرہ ملکوں کی پرورش کرنے لگے۔ غرض ایسے حسابات جیسے سر آرتھر کوٹن نے کیے پایہ وثاقت سے ساقط ہوتے ہیں۔ انسان کی عادت ہے کہ جب وہ کسی کام میں کامیاب ہوتا تو پھر وہ پھولا نہیں سماتا اپنی حد سے باہر قدم رکھتا ہے یہ سمجھنا غلطی ہے کہ سر آرتھر دکن کی نہروں میں کامیاب ہوے تو وہ سارے ہندوستان میں جہاز رانی کے قابل نہریں بنانے میں کامیاب ہوتے اور چراپونجی کے مینہ کے پانی کو جو نہایت کثرت سے ہوتا ہے۔ دکن کے سیراب کرنے میں کامیاب نہوتے اگر وہ اس کام میں قارون کا خزانہ بھی خرچ کرتے تو انکا مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ۱۸۷۳ء کی رپورٹ میں جو نئی ریلوں کے بنانے میں روپیئے کے بڑے خرچوں کے کرنے کی ممانعت کی گئی وہ فراموش کی گئی۔ سر آرتھر کوٹن کی تجاویز وتدابیر آبپاشی کے کاموں کی خواب پریشاں کی تعبیر سمجھی گئی۔ قحط کی کمیشن کی رپورٹ نے دفتر کی الماریوں میں خواب راحت کیا اسکا سبب بابو صاحب یہ بتاتے ہیں کہ انگلش میں ریلوے کو سمجھتے تھے اور انڈیا میں آبپاشی کی ضرورتوں کو نہیں جانتے تھے۔ انگلش صناع ریلوں

کی توسیع میں سمجھتے تھے کہ انڈیا میں دور دور کے بازاروں میں ہماری مصنوعی چیزیں گراں بہا ہوجائینگی۔ انگلش تجار اپنی تجارت کے لیے نئی آسانیاں چاہتے تھے جو انڈیا میں نئی لین کے کھلنے سے حاصل ہوتی تھیں۔ پارلیمنٹ میں ان تاجروں اور صناعوں کا بڑا اثر تھا اسلیے دونوں ہوس میں انگلنڈ میں آبپاشی کے کاموں کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ۱۸۹۸ء کے کمیٹی نے کہا کہ قحط سے بچانے کیواسطے زیادہ ریلوں کی ضرورت نہیں بلکہ قحط سے بچانے کے لیے آبپاشی کے کاموں کے بڑہانے کی زیادہ ضرورت ہے۔ ۱۹۰۰ء کے قحط کی کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ رولنگ سٹوک بڑہایا جاے مگر ریلوں کے بڑہانے کی استدعا نہ کی ایک خاص کمشنر ولایت سے ہندوستان میں ریلوں کے دیکھنے کے لیے فی الحال آیا تھا اُسنے مان لیا کہ ہندوستان میں فی میل رقبہ میں اتنی ریلیں بن گئی ہیں کہ وہ یورپ سے باہر کے ملکوں کی ریلوں پر سبقت لے گیا ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے ریلوں کا بننا موقوف نہوا اور آبپاشی کے کاموں کو ریلوے پر فوقیت نہیں دی گئی۔

انڈیا میں مارچ ۱۹۰۲ء تک آبپاشی میں ۲۴۰ لاکھ پونڈ خرچ ہوے اور ریلوں میں ۲۲۶۰ لاکھ پونڈ۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ بابو صاحب نے جو یہ وجہ اس کی بیان کی ہے کہ ریلوں کو آبپاشی کے کاموں پر ترجیح اسلیے دی گئی کہ اس میں اہل غرض کی خودغرضی شامل تھی صحیح نہیں ہے اسلیے کہ لارڈ کرزن کے اسپیچوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان ہی کے صدہا آدمیوں نے ہر ہفتہ میں اپنے خطوط میں تقاضا کیا کہ ہندوستان میں دریا بڑے بڑے ہیں انسے نہریں نباکے آبپاشی کے کام نباؤ جس سے قحط سے بچ جاؤ۔ ان میں سے بعض نے اس طرح تحریر کیا ہے کہ گویا وہی موجد انڈیا میں نہروں سے آبپاشی کرنے کے تھے ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ برٹش گورنمنٹ نے کبھی ان کاموں میں توجہ کرنے میں کمی نہیں کی۔ بابو صاحب کی محض بدگمانی اور خیالی پلاؤ ہے کہ انڈیا میں آبپاشی کے کاموں پر ریلوں کو اس سبب سے ترجیح دی گئی کہ انگلستان کے صناعوں اور تاجروں کو اس سے زیادہ فائدہ تھا۔

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ قحط سے بچانے میں آبپاشی کے کام ریلوں سے زیادہ تر مفید ہوتے ہیں اسکا بیان آگے کرونگا۔

سوم لارڈ کرزن نے ریلوں اور نہروں کے باب میں کیا کیا

اب میں لارڈ کرزن کا حال لکھتا ہوں کہ اُنھوں نے ریلوں اور آبپاشی کے باب میں کیا کیا کام کیے۔ انکے عہد ہفت سالہ میں پانچہزار میل ریل کا اضافہ ہوا جس میں گیارہ کروڑ روپیہ کے قریب صرف ہوا۔ یہ لینین بالکل سیٹٹ نے خریدلیں اور ریلوں کی آمدنی تقریباً ایک فیصدی بڑھ گئی۔ یعنی جو سرمایہ ریلوں میں خرچ ہوا تھا اُسپر آخر سال میں ۱۹ر۵ فیصدی نفع ہوا اس آمدنی سے دادا بھائی اور بابو رومیش چندر دت کے یہ اعتراضات اُٹھ گئے کہ ریلوں کا سود ہندوستان کے محاصل ملکی کی آمدنی کو کھائے جاتا ہے۔ اب تو ریلوں سے محاصل ملکی کی آمدنی بڑھنے لگی۔ انڈیا میں کل ریلوں کا طول ۲۷۵۶۳ میل ہے اور اس میں ۳۵ر۳۵۶ کرور روپئے سرمایہ خرچ ہوا ہے۔ لارڈ کرزن کے عہد میں ریلوں کے بننے کا اوسط بڑھگیا۔ تیس برس پہلے کے قحطوں کو دیکھو اور اب کے قحطوں کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ریلوں کے سبب سے کسقدر آدمیوں کی جانیں بچ گئیں ریلوے ہی کام کرتی ہیں کہ اہل زراعت اپنی پیداوار کو دور دور کے بازاروں میں بیچنے کے لیے بھیجدیتے ہیں اور نفع کماتے ہیں جب تک انتقال فصل کے لیے آمد و رفت کے وسائل یا سڑکیں نہوں تو نئی زمینیں اناج کے لیے بوئی نہیں جاتیں۔ انکے دور کے فاصلوں پر لیجانے میں باربرداری میں اسقدر صرف ہوتا ہے کہ اناج کی قیمت ایسی گراں ہوجاتی ہے کہ وہ بک نہیں سکتا۔ اسواسطے ہر ضلع صرف اپنی ضرورت کے موافق اناج پیدا کریگا اور جب مینہ نہیں برسے گا اور کوٹھیاں اور کھتیاں اناج سے خالی ہونگی تو قطعی پھر کھانے کے لیے کچھ نہیں ملے گا۔ معمولی سالوں میں اناج افراط سے ہوگا اور خشکسالی میں فاقہ زدگی ہوگی۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں کل انڈیا میں صرف ۷۰۰۰ میل ریل تھی۔ مدراس اور بمبئی میں ہر ضلع کے حصے ایک سو یا ڈیڑہ سو

میل کے فاصلہ پر ریلوے لین سے تھے۔ شمال میں ہزاروں مربع میل زمین ویران بے زراعت اس سبب سے پڑی تھی کہ وہاں سے اناج کی باربرداری کا خرچ قریب تر ریلوے سٹیشن تک لیجانے میں ایسا گراں تھا کہ وہ اناج فائدہ کے ساتھ نہیں بک سکتا تھا۔ اب ریلوے جاری ہونے کے سبب سے جو زمنیں ویران پڑی رہتی تھیں اُن میں اب ہرے بھرے کھیت لہلہاتے ہیں ان ریلوں ہی کے سبب سے کہتے ہیں کہ اصلی قحط نابود ہوگیا جسکے معنی یہ تھے کہ روپیہ مٹھی میں لیے پھرو اور اناج میسر نہو۔ اب ناممکن ہی کہ وہ اصلی قحط ہندوستان میں پڑے۔ صرف گراں خوراک کی اور اس روپئے کی جس سے وہ خریدا جاے تکلیف ہوگی۔

(باقی آیندہ)　　ذکاء اللہ

مضمون جمع حدیث کے دو جملے

رسالہ علیگڈھ منتھلی مطبوعہ ماہ جون میں ایک مضمون جمع حدیث کے عنوان سے مولوی محمد اسلم صاحب کا شائع ہوا ہی اُس میں ایک جگہ آپ تحریر فرماتے ہیں" جب خلیفہ ماموں نے متعہ حلال کرنا چاہا تو علماء کے گروہ میں ایک کھل بل سی مچگئی آخر لوگوں نے اُس کی حرمت میں حدیثیں وضع کر کے اُسکو سُنائیں جس سے وہ اپنے ارادہ سے باز رہا" فٹ نوٹ میں حوالہ ابن خلکان ج ۲ صفحہ ۲۱۸ کا دیا گیا ہی۔ خوش قسمتی سے کتاب ابن خلکان راقم کے کتابخانہ میں موجود ہی۔ اُسکو میں نے نکالکر دیکھا تو صفحہ ۲۱۸ میں قاضی یحییٰ ابن اکثم کا حال لکھا ہی لیکن یہ کہیں نہیں لکھا ہی کہ حرمت متعہ کے بارہ میں لوگوں نے حدیثیں وضع کیں۔ ہاں قاضی صاحب نے ایک آیت قرآن مجید کی اور ایک حدیث زہری کی روایت سے خلیفہ ماموں کو سُنائی تو حدیث کے بارے میں ماموں نے پوچھا کہ کیا یہ زہری سے محفوظ ہی ؟ قاضی صاحب نے کہا ہاں اسکو ایک جماعت نے روایت کیا ہی جن میں سے ایک امام مالک بھی ہیں۔ ماموں نے یہ سُنکر حرمت متعہ کی منادی کرادی۔ نہیں معلوم مولوی صاحب موصوف نے کونسی

چھاپے کی تاریخ ابن خلکان دیکھی جس میں سے مذکورۂ بالا عبارت کا ترجمہ انہوں نے اپنے مضمون میں نقل کیا۔

مولویصاحب موصوف نے دوسری جگہ حضرت امام ابوحنیفہ کے بارے میں لکھا کہ "حدیث کی طرف بہت کم میلان باقی رہا تھا اسیوجہ سے اُنکا شمار محدثین میں نہیں ہے" فٹ نوٹ میں حوالہ تمدن اسلام کا لکھا ہے۔ معلوم نہیں یہ کونسی کتاب ہے؟ اسکا مصنف کون ہے؟ اور محققین کے نزدیک اسکا کیا رتبہ ہے؟ بہرحال تھوڑے تامل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ تحریر بالکل پایۂ تحقیق سے گری ہوئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہ سے کوئی مجموعہ احادیث کا مثل امام بخاری و امام مسلم وغیرہ کے یادگار نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ محدث نہیں ہیں۔ زمانہ تابعین میں سے کسی کا مجموعہ احادیث اسوقت محفوظ نہیں ہے توکیا اُن میں سے کوئی محدث نہیں تھا۔ حالانکہ کل محدثین انہیں کے خوان فیض سے بہرہ یاب ہوئے ہیں پس یہ خیال کرنا کہ امام اعظم سے کوئی مجموعہ احادیث یادگار باقی نہیں رہا یا اُنسے روایتیں کتب احادیث میں بہت کم ہیں اسلیے وہ محدث نہیں ہیں۔ بڑی غلطی ہے نہایت تعجب ہے کہ امام اعظم کا زمانہ تابعین سے بالکل قریب بلکہ متصل تھا اکثر کے نزدیک خود اُنکا شمار تابعین میں ہے اور اُنکا اجتہاد و تفقہ و انہماک فی استخراج المسائل الشرعیہ بلاخلاف ازروے تواتر کے ثابت ہے وہ محدث شمار نہ کیے جائیں! اور جو لوگ اُنکے زمانہ کے بعد ہوئے ہیں وہ محدث سمجھے جائیں؟

مولویصاحب لکھتے ہیں کہ فقہ کی طرف زیادہ انہماک تھا توکیا بغیر قرآن و حدیث کی واقفیت کامل کے کوئی شخص فقہ کی طرف توجہ کرسکتا ہے؟ اور اگر کرے تو اُسکا کیا نتیجہ ہوگا۔ جس شخص کو احادیث نبوی و آثار صحابہ سے ناواقفیت ہوگی وہ کیونکر مسائل استخراج و استنباط کرسکیگا؟ امام ابوحنیفہ کا بڑا فقیہ اور مجتہد ہونا ہی دلیل اُنکے محدث ہونے کی ہے۔ امام ابوحنیفہ نے چارہزار بزرگوں سے جو ائمہ تابعین اور اُنکے علاوہ اور بزرگ تھے اخذ حدیث کیا ہے اور اسی سبب سے علامہ ذہبی نے اُنکو حفاظ محدثین کے گروہ میں لکھا ہے۔ علامہ ابن حجر مکی جو ایک مشہور مصنف ہیں تحریر فرماتے ہیں۔

انہ اخذ عن اربعۃ الاف شیخ من ائمۃ التابعین وغیرھم ومن ثم ذکرہ الذھبی وغیرہ فی[1] طبقات الحفاظ من المحدثین یہ تعداد امام ابوحنیفہ کے اساتذہ کی ہے۔ اور جن لوگوں نے امام ابوحنیفہ سے اخذ حدیث وفقہ کیا ہے اُنکا تو انحصار ناممکن ہے۔ بعض متاخرین محدثین نے آٹھ سو لوگوں کو مع تفصیل نام ونسب کے لکھا ہے چنانچہ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں۔

قد ذکر منھم بعض متاخرین المحدثین فی ترجمتہ نحو ثمانمائۃ مع ضبط[2] اسمائھم ونسبھم بمایطول ذکرہ ناظرین اگر کسیقدر تفصیل سے دیکھنا چاہیں تو علامہ ابن حجر موصوف کی کتاب الخیرات الحسان ملاحظہ فرمائیں جو علامہ موصوف نے خاص امام ابوحنیفہ کے حال میں تالیف فرمائی ہے اور شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے تو نہایت تفصیل وتحقیق سے امام ابوحنیفہ کے احوال میں کتاب موسومہ سیرۃ النعمان لکھی ہے جو چند بار چھپکر ملک میں شائع ہو چکی ہے۔ درحقیقت یہ کتاب اپنے فن میں لاجواب ہے اسکے ملاحظہ کے بعد پھر دوسری کسی کتاب کی اس بارے میں دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور سب کتابوں سے انسان مستغنی ہوجاتا ہے فجزاہ اللہ خیرالجزا۔

پس اگر مولوی اسلم صاحب یوں لکھتے کہ امام ابوحنیفہ کو بوجہ انہماک استخراج واستنباط مسائل کثرت روائت کا موقع نہیں ملا اور روائت میں ورائت کا اُنکو زیادہ لحاظ رہتا تھا اسلیے اُنسے روائتیں کم ہیں تو صحیح ہوتا۔

راقم

محمد اعجاز حسن خاں

از رسول پور ترہت

[1] الخیرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر صفحہ ۲۶۔

[2] ایضاً صفحہ ۲۶۔

ٹرکش مارٹ

حضرات ملک! حال ہی میں ہم نے یورپ سے ایک بہت بڑا لاٹ ٹرکی ٹوپیوں کا منگایا ہی - جو ہر رنگ، ہر سائز اور ادنیٰ و اعلیٰ ہر قسم کی اپنے اپنے طرز میں ایک دوسری سے بالکل نرالی اپنی نظیر آپ ہی ہیں - ان ٹوپیوں کا فیشن بھی ہم نے بڑے غور و فکر کے بعد تہذیب و ترقی کو مدنظر رکھکر تجویز کیا ہی - جسکا نمونہ غالباً کوئی اور کمپنی پیش نہیں کرسکتی - مزید براں قابل توجہ یہ بات ہی کہ ہمارے مشہور زمانہ یورپین میکر "زوکر" نے حسب فرمایش ان ٹوپیوں میں نفیس ریشمی استر پر ہمارا قابل دید اور بے نظیر اسلامی ٹریڈ مارک اور ہمارے مجوزہ پیٹینٹ نام مثلاً حمیدیہ - حبیبیہ - نظامیہ - عثمانیہ - اسلامیہ - علیگڈھ - حیدرآباد وغیرہ زریں حروف میں کندہ کرکے اپنا کمال دکھلایا ہے -

لہذا مہربان قوم و تاجران ملک سے استدعا ہی کہ اپنی خاص توجہ مبذول کرکے بذریعہ خط کتابت استفسار نرخ کریں یا کچھہ مال نمونتاً روانہ کرنے کی اجازت دیں اور ہماری خوشمعاملگی کو ملاحظہ فرماویں - ہمارے اسٹاک میں ولایتی - اطالین - آسٹرین - اور انڈین ساخت کی ترکی - ہنگیرین - بالدار - کشتی نما - مہاراجہ سائیکل کیپ - چھوٹی بڑی دیوار کی کم و بیش قیمت کی موجود ہیں - علاوہ اسکے چٹائی کے استر کی ٹوپیاں جنکا ملک کو ایک مدت سے انتظار تھا موصول ہوئی ہیں - عمدہ استنبولی پھندنے اور نفیس ولایتی بکس کے ساتھ فی عدد ساڑھے چار روپیہ -

المشتھر

ٹرکش مارٹ نمبر ۱۶۳ بھنڈی بازار بمبئی

اشتہار

کارخانۂ عطر مخزن شمیم

بفضلہ تعالیٰ ۴۰ برس سے یہ کارخانۂ عطرسازی بہ نیکنامی قائم ہے اور خریداروں سے خوش معاملگی اسکا فرض منصبی ہے۔ اس کارخانہ میں ہر قسم کے عطریات و روغنیات اور عطردان ساختۂ قنوج و کلکتہ و بمبئی و مدراس۔ ہاتھی دانت وغیرہ کے شیشیاں ہر قسم کی خوبصورت رنگ برنگ کی موجود ہیں۔

التماس۔ ایک مرتبہ امتحاناً تھوڑا مال طلب کرکے دوسرے کارخانونکے مال سے مقابلہ کیجیے۔ ویلیوپے ایبل یا نقد قیمت آنے پر فوراً تعمیل ہوگی۔ مفصل فہرست طلب کرنے پر روانہ ہوگی۔

نام عطر	قیمت فی تولہ	نام عطر	قیمت فی تولہ	نام عطر	قیمت فی تولہ	نام عطر	قیمت فی تولہ
استنبول بہار	عہ سے سہ تک	روح خس	عہ سے سے تک	دونہ وگل حنا	۸ر سے عہ تک	شمامۃ العنبر	صہ ر
گلاب	۸ر ،، عہ ،،	روح پاندری	عہ ۸ر ،، سے ،،	روح افزا	۸ر ،، صہ ر ،،	گل یعنی مٹی	۸ر سے عہ تک
کیوڑہ	۸ر ،، صہ ر ،،	چمیلی	۸ر ،، صہ ر ،،	رحمت روح	۸ر ،، صہ ،،	زعفران	۸ر ،، عہ ر ،،
موتیا	۸ر ،، عہ ،،	پاندری	۸ ،، صہ ر ،،	مشک عنبر	۸ر ،، صہ ر ،،	مدن مست	۸ر ،، سے ر ،،
حنا	۸ر ،، صہ ر ،،	موسری	۸ر ،، سے ،،	مشک حنا	عہ ر ،، صہ ر ،،	سہاگ	۸ر ،، صہ ر ،،
روح گلاب	للعہ ،، سہ ،،	خس وچمپا	۸ر ،، سے ر ،،	گیسندا	۸ر ،، عہ ر ،،	اگر	سے ر ،، عہ ،،
						پان	۶ر ،، ۸ر ،،

تنبول بہار۔ پان میں کھانیکا مصالحہ ہے۔ اگر چاول برابر پان میں کھاویں تو پان نہایت لذیذ اور خوشبودار ہو جاتا ہے۔ اور بلا تمباکو کھانے والے بھی بخوبی کھا سکتے ہیں۔ فی ڈبیا ۴ر فی درجن عہ ر عطر کی ٹکیاں ۴ر ۶ر روغن چمیلی عہ ر سے سہ سیر تک۔ روغن بیلہ وحنا کیوڑہ عہ ر سے صہ ر سیر تک۔

المشتہر حاجی محمد حسن احمد حسن جنرل مرچنٹ قنوج ضلع فرخ آباد

peaceful channel. It was no longer their ambition to hit on lucky rhymes, but to try their luck in the battlefield. However, even in these days of comparative decay of its poetry, Arabia can boast of at least two Masters,—Hassan and Ali. The collective (vii) writings of these two poets take rank among the classics, and are excellent specimens of that much abused variety of poetry, the didactic poetry.

Before the Arabs settled down again in Bagdad, on the one hand, and in Grenada, on the other, a new element had been introduced into Arabic poetry with the conquest of Persia. It lost much of its native vigour, seriousness and sincerity; and became more clever than true. A new epoch began: the epoch of Mutanabbi and Abu Nuwas, which, though bright in its own way, was lacking in some of the noble qualities of pre-Islamic days. The new poetry was no longer a "criticism of life," but was full of strained hyperboles, and meaningless figures of speech, and was made to administer to the whims and caprices of "Philistine" autocrats. However, we are not concerned with it here, and may safely dismiss the subject.

M. SAID.

(vii.) I deem it necessary to say that the authenticity of the so-called Diwan-i-Ali is questioned by some savants of repute. Of course my remarks apply to the writings which usually pass under his name.

its manifold manifestations. They had no other literature to read but the infinite book of nature, yet being uninitiated into its mysteries, they but opened it at the first page. There are some rude beginnings of a "natural" poetry, which could have heen developed by subsequent writers, had they chosen to do so. The *finale* of Amra-ul-Qais's immortal Qasidah is a brilliant description of lightning and rain. Sir Alfred Lyall has rendered that portion of it into English verse,(v) and I would have quoted it here but for fear of being indiscreet. I have the original before me, and I can assure my readers, that it is twice as beautiful as the translation. Some of the similies are weak, but all are extremely exquisite and truly poetical and the entire subject has been handled with fineness of perception and delicacy of touch.

But above all, the key-note of Arabic Poesy is its manliness. There is nothing effiminate or weak in it. It is the deep, sustained roar of a lion. Every poet was also a warrior and sang the bloody achievements of his clan and himself in his lyric lore.

The most interesting personality among the poets of Arabia is undoubtedly that of 'Amra-ul-Qais, who was not only a poet, but also a soldier, a lover, a prince by birth, and " who wrote for no man's fear and no man's pleasure." (vi)

He was the son of Hajat, a prince of the famous dynasty of Kandah, which ruled the greater part of Arabia for a considerable period of time. Amra-ul-Qais was deprived of his throne by Nauman the son of Munzar, who represented the rival house of Lakhm ; and had to spend the rest of his days in exile. He led a strangely wandering and romantic life, and finally came to a woeful end, as the consequence of an unfortunate love-intrigue with the daughter of the Byzantine emperor. The emperor sent him a poisoned garment, which caused his whole body to ulcerate, and gained him the opprobrious epithet of the " Man with the ulcers." So this soldier-poet perished, like another Hercules, with another " burning Nessus' shirt" for his Dijinera's sake.

With the rise of Islam, the progress of Arabic poetry was checked ; partly, because of the strong denunciation of poets in the Quran, and partly because the energies of the people were directed into another more useful, though less

(v.) In his specimens of Arabic poetry.

(vi.) Caliph Ali used these words in his praise.

It is an interesting study to find out what curious notions those half-savage people, with their minds but little enlightened with the muse's flame, had of feminine beauty and feminine loveliness, and we are astonished to find that those notions are not in the least barbarous, but, on the other hand, betoken some delicacy of perception and taste. Though to them, as to the Sanskrit poets, a certain degree of fatness was a necessary concomitant of beauty, yet they were loud in chanting the praises of delicacy and grace, and loved to liken their beloved to a fragile water-reed. They were fond of white, transparent complexion, with a tinge of yellow in it, "like the colour of the egg of an ostrich". A well-proportioned, dainty hand, with beautiful little, tapering fingers, a particularly short waist, and long unbound hair descending down to the hips and dressed high on the forehead, were things after their own heart. Again and again we find poets harping on these themes, and hence it is apparent that these things were liked not by this or that individual but by the nation as a whole. We can also pick up something, here and there, in these Qasidahs as to how ladies of quality lived and dressed in those days. It seems that they all wore something like the Indian *Pishwaz* which was fastened with a belt at the waist. Married women wore bodices and unmarried loose shirts, which were the only covering for the upper part of the body. Their head-dress was, undoubtedly, similar to that of the Indian ladies, and in some cases seems to have been both costly and gorgeous. It seems that the rich ladies of those days, lived in comparatively luxurious style, for we are told that the bed of one beauty was strewn with particles of odorous musk, while another had a bevy of handmaids to wait upon her. Their life was not trammelled by any purdah-system, and their manners were free and unreserved. They had full liberty to go abroad and used to go to the public baths, like the fashionable ladies of ancient Rome. These are the points of historical interest, on which the poems of those rugged, unlettered poets afford some information.

In addition to what has been said above, there are one or two important characteristics of ancient Arabic poetry, which deserve special mention. Unlike the Persian, the Hindustani, and the later Arabic poets they show some appreciation of natural phenomena, and what is more they try to be "metaphysical" on some occasions in a certain way. It is no wonder that they should do so, for they were there alone with nature, with very little to interest them outside

way, in which they treat of these creatures, the poet may be cited who says in bitter scorn of his enemy.

> "Will he kill me! me, whose bedfellows are a sword, and arrows pointed like unto the fangs of ogres.'

Camels and horses, especially the former, constantly figure in Arabic poetry. No poem is considered complete without some direct or indirect mention of these animals. Besides, they have supplied the poets with a range of metaphors of a distinctive sort. The habits and attributes of man are in more than one place likened of those of the camel. Even the sonorous, mellow tones of some fair one are compared by his enamoured swain to the soft wailings of a she-camel over her dead foal! Such is the respect of the Arab for the camel, that it scarcely holds an inferior place to that of man in his estimation.

In their spirit, the poems of pagan Arabia are very much akin to the chansons of the troubadours and the Provencal poets. This similarity has been noticed by Jean de Sisimondi in his "History of the Literatures of Southern Europe", but the comparison which he has drawn between Persian ghazals and Provencal poetry is, to me, more ingenious than true. All Persian ghazals are wanting in backbone, a taint from which the manly poetry of the troubadours is entirely free. And then to speak of Persian ghazals and Arabic Qasidahs in one and the same breath, as if they were very much akin to one another in spirit, shows a want of discrimination in matters concerning Oriental Literature.

The study of ancient Arabic poetry also possesses a Sociological interest for us; for, by studying some of the poems carefully we can catch a glimpse of the manners and customs of the Arabs in their days of ignorance and darkness. We can see for ourselves how debauched and corrupted they were, and what a deal of trouble the prophet of Islam had to undergo in reforming their moral character. All sorts of hideous vices were the fashion in those days; sin reigned supreme and lawlessness held the day. Their poetry is but a dim mirror in which we see a confused reflection of what they were and what they did, and the reflection is far from complimentary. If we were to sum up in one word all the chief characteristics of Arabic poetry, that word would be license,—unbridled license in thought and language.

merits and honour of his family above all praise, and has tauntingly flaunted the services rendered by him and his family to the forefathers of the King. The poem seems perfect in every respect and is truly a masterpiece in "Almafakhir" or "boastful literature", as the Arabs call it.

A fair was annually held at O Káz, where people gathered from different parts of the country to carry on the work of barter and sale. For the amusement of the public, poems were recited from memory, by different poets, and the poet who wrote the best verses of the year was crowned the laureate of the day. Seven of the "prize poems" have descended to us, and by a careful study of this collection we can have a fair idea of the way in which the art of poetry was carried on by the Arabs of those days. The more we read, the more the fact is borne in upon us that their greatest concern was with the selection of appropriate and choice words. They always aimed at brevity, and the writer who could express a world of thought in the fewest possible words was considered an ornament to his profession. When Antar bin Shadad could sum up all the three qualities of a gentleman(!) (*viz.* extravagance, excess in drinking and skilful gambling) in one couplet, he could exultantly claim to have done something worthy of praise. But besides the choice of words another feature is prominent. These poems are rich in metaphors and similies. The Arabs considered it preeminently poetical to liken one thing to another. This craze for metaphors sometimes makes the verses appear ridiculous in our eyes. The range of metaphors is very limited, and the same metaphors have been employed again and again by different poets. However, sometimes these metaphors and similies are very quaint and not wholly inappropriate, as for instance, when Amra-ul-Qais compares the face of his beloved to the far-off lamp of an anchorite as it glimmers in the twilight.(iv) Some of the similies are characteristic of the Arab people, and throw a vivid light on their notions, beliefs, and superstitions. The Arabs believed in the existence of ghouls and genii ; and whenever the poet wants to mystify or horrify his readers, he drags in these creatures although neither he himself nor his audience can have a clear notion of them. As an example of the

---

(iv.) تضيء الظلام بالعشي كانها منارة ممسى راهب متبتل

aib, we cannot help feeling a thrill of awe run through our bodies.

Though Mohalhil can claim to be the first genuine poet which Arabia produced, it was reserved for Khalil to lay down the rules for the correct use of metre and rhymes, and the rules laid down by him are to this day the only criterion of right and wrong in all matters of prosody. In laying down these rules, he was giving the law not only to the poetry of his own country, but also unconsciously, to two other poetries of totally diverse origin, *viz*, modern Persian poetry and Urdu poetry. Khalil, it seems, was a man eminently fitted by nature and education for the task ; his skill in music must certainly have been of great help to him in the formation of Arabic Prosody.

From what has been said above it will be apparent that Arabic Poetry, from its very nature, was neither refined nor laboured. Everywhere we find flaws in style and thought ; the poet's nature, especially his weaknesses, assert themselves at the end of every two or three lines, and most of the poems are such as can be wholly eliminated without our being in any way worse-off for losing them. Unlike Hebrew poetry it is devoid of all religious sentiment. The pious fervour and intense spiritual anguish of Ezekiel and Isaiah is nowhere to be found in the poetry of Pagan Arabia.

One thing may be said to the credit of those who rocked the Arabic poetry in its cradle, that they used the language in its pearly purity, and none among the moderns can even be compared with them in this respect. This fact has led some Arabic scholars to think, that since the rise of Islam Arabic poetry fell into decay and gradually vanished altogether ; but the present writer can never bring himself to believe that the poets of the Abassides in Bagdad, and of the Omayides in Spain, did not improve upon their predecessors at least in the matter of purity of thought.

Many of the most brilliant pre-Islamic poems are extempore, written by the author under the influence of some strong feeling of love or hatred, such as, for instance, the vigorous Qasidah of Amar ibn Kulsum,in the Sabaa Mualaqqa," (iii) written in a vain-glorious and rebellious vein against the King, Amar ibn Hiad, in which the poet has set forth the

(iii) A collection of seven famous Arabic poems. (see below.)

Besides, we have no evidence of the fact that any of the poets of Pagan Arabic possessed an intimate acquaintance with the works of Greek masters. It appears that, unlike Milton, they cared very little to apply themselves rigorously to the work of writing poetry, or to qualify themselves, by close study, for their vocation as a poet. Most of them were illiterate for aught we know : the use of paper was certainly unknown to them.

There was very little of intercommunication between the Arabs and the Greeks, and they did not think it worth while to visit each other's country. We are told that Amra-ul-Qais, the greatest Arabian poet, paid a visit to the emperor of Constantinople, but that was done in order to solicit the emperor to help the dynasty of Kandah to the throne of Arabia, and not because of any love for Greek learning and scholarship. Their poetry, like the Hebrew Psalms, was only a spontaneous out-flow of their passionate nature, made musical, because of the intense feelings which words were meant to express. In Arabic poetry, we should not look for beauty and grandeur of conception or for nobleness of execution; its only art is a judicious selection of words and a strict regard for the exigencies of metre and of rhyme. As the tradition goes, the first man who wrote verses in Arabic was (i) Yarub ibn Qahtan, who is designated by the title of "Aboul Arab" or the father of the Arabs ; but his poems have not been handed down to posterity. The oldest (ii) poems extant in the Arabic language are those of Mohalhil, whose noble elegy on the death of his brother Kulaib is considered one of the best of its kind up to this day. There is a simple pathos in the poem, which is very touching and quite inimitable. He does not philosophize over the death of his brother ; no hope of future reunion on some happy shore cheers the gloom of his sorrow. He gives full bent to his grief, and "gives sorrow words" in order to lighten the burden of his calamity. But there is nothing ignoble in this abandonment to passion, for with all this there is a manly reserve which saves the poem from the charge of lachrymosity. And when he vows dread vengeance against the murderers of Kul-

---

(i) It may be noted, en passant, that all the tribes, which inhabit Arabia, cannot claim a pure descent from Yarub. His direct descendants are known by the name of Arab-ul-Araba, (Arabs of the Arabs) in contradistinction to other tribes of mixed or totally diverse descent.

(ii) Of course the romance of "Antar" is as old as any poem of Mohalhil, but it is an entirely isolated poem, and occupies no place in the development of Arabic poetry.

work the Association did was to give young students and others fresh from India a warm and sympathetic welcome, and from personal experience he could speak of the great advantage this was.

Professor Syed Ali Bilgrami in proposing the health of the Chairman dwelt on his great services to the cause of Arabic learning.

Sir Charles Lyall briefly replied, humorously remarking that he had taken the chair with the greater pleasure because it had enabled him to play the part of audience. He rejoiced in the endowment of a chair of Arabic at Aligarh, for he felt that that College ought to take the lead in Arabic study.

Ancient Arabic Poetry.

Indians, even Mussalman Indians, seem to pay very little heed to the literature of the Arabs. The practical utility of classical learning may be questioned, but a knowledge of the classics is undoubtedly a necessary element in liberal education and culture. Seeing how little people care to form for themselves a true estimate of Arabic poetry, a brief account of the characteristics and development of the poetry of ancient Arabia, may prove of interest to some lovers of literature.

It is good to note, at the very outset, that the Arabs of the days of ignorance, as the Mussulman historians choose to call the pre-Islamic Arabs, modelled their poetry on that of Hebrew. Greek did not interest them much. Fury of temper, with sun in their veins, passion,—loud boisterous passion —was everything to them. They could not appreciate the calm and majestic ocean-like flow of Greek poetry, and were unable to understand that as great an art, if not greater, lay in the repose and repression of excited feeling as in its forcible expression. The "Aeolian Lyre" of Pindar, and the Ionian harp of Homer, seemed insipid to the ears of these inspired "barbarians," of whom also it may be said, "*que ils se passionent pour la passion meme.*" (Stendhal.) Even when they had assimilated the culture of the Greeks to that remarkable extent, which has raised them so much in the estimation of all students of history, they remained dead to the softer influences of the Doric lay.

Mr. Justice Tyabji first responded to the toast, remarking at the outset that his qualifications to do so were small,as he had never been officially connected with the College.

He quite agreed with Sir Thomas Raleigh that such institutions were required all over India. He felt that to raise Aligarh to the status of a university would be most advantageous as giving an educational centre for Mahomedan schools and colleges, and their pupils, all over India, and also, it might be, from other parts of the Mahomedan world. There was one branch of progress in which he ventured to think the Mussalmans of the north-west were not doing all they might, and that was in respect to female education. He was glad to notice that recently efforts had been made to remedy this state of things.

Major Syed Hasan Bilgrami, who also responded to the toast, referred to Sir Thomas Raleigh's remarks on the question of raising Aligarh to the status of a university. It was important to remember that if Aligarh was granted a charter it would not be a denominational university in the sense in which the word was used in England. The college was open to all, and secular and religious education were kept apart and distinct, attendance at the mosque services being only compulsory in the case of the Mahomedan students. The Arabic faculty had been placed on a sound footing, largely owing to the generosity of the aid afforded by Sir Digges La Touche, the Lieutenant-Governor of the United Provinces—(Cheers)—and the project of a well-endowed science faculty had been greatly advanced, thanks to the generosity of donors who wished in that way to celebrate the visit of the Prince and Princess of Wales.

A remarkable proof of vitality of Aligarh was that the whole Mussalman community was represented in the exertions made to raise funds for its work.

The toast of the M. A.-O. College Association was proposed by Mr. W. Coldstream, who said he was quite sure that its members did not require to be assured of the deep sympathy and admiration with which the English guests present regarded the work of the Association. Mr. Abdul Qadir responded to the toast, in which he pointed out that one good work of the association had been to make the work of the College much more widely known in England than was previously the case. Another good

that in these days scientific training is necessary for those who wish to hold their own. That, no doubt, was part of the idea that was in the mind of Sir Syed when he resolved to found the College. The difficulties in the early history of the College of which I have spoken are now in the past. Aligarh, as we hope, is established on a firm foundation. (Hear, hear.) But there is still a good deal to be done. I am not one of those who would ever identify the welfare of the College exclusively with the material resources which it possesses. The development of Aligarh means money; and the money must come not only from great gifts but also from the combined efforts of generation after generation of loyal graduates. (Hear, hear.) We do not think of a great college like Aligarh as a place which a man can leave when he has taken his degree saying, "Now I have got all I can out of this place, and I don't wish to look back to it any more." There are projects put forward by those who think Aligarh may one day develop into a Mahomedan University; and I have read these projects with great sympathy, because we must all feel who have given close attention to this subject that the type of university with which we have supplied India is not altogether satisfactory, that we cannot be satisfied with universities which simply amount to a loose federation of colleges scattered over a wide area, united only by the inhuman bond of examinations. (Laughter and cheers.) We want something better than that, and where you have a residential college so good as Aligarh, it is not surprising that men should talk and dream of a residential university. But we are a long way from that: it takes a long period to make even a great College; it takes a still longer period to get the resources which would justify the starting of a university. The grant of a Mahomedan university would mean an instant, and of course an irresistible, demand for a Hindu university, and other demands of the same kind. So that when you speak of a Mahomedan university you are not considering one experiment the result of which can be calculated beforehand; you are asking the Government to enter upon a new course of policy. We all heartily wish prosperity to the Aligarh College, and hope that it may continue to draw a succession of able students from all that is best in Mahomedan society in India; we hope that it may continue to draw to its service Englishmen worthy of their trust, such as was my friend Theodore Beck; and out of this co-operation we hope that the greatest benefits will result for all the people of India and for the Mahomedan community in particular. (Cheers.)

The speech of the evening was that of Sir Thomas Raleigh, who gave the toast of the College, and who in the course of his remarks said ;

My interest in the Mahomedan Anglo-Oriental College at Aligarh dates from a day more than twenty years ago when my friend Theodore Beck told me that he was going to India to be its Principal. It was he who first explained to me the great plans which Sir Syed Ahmed had formed for the good of his own community. At the same time he said that although he knew there would be difficulties he was not afraid of them. Theodore Beck's courageous temper made him exactly the man to be Chief of the Staff in the little army of Pioneers. (Cheers.) I came to have great faith in the future of the Mahomedan College. Therefore you will not be surprised to know that when the higher powers told me off for a period of service in India, Aligarh was the first station at which I halted on my way to Simla. In the College itself I found what one could wish to find in every part of India—the operation of that secret of good education and good administration ; a frank union between the East and the West ; friendly co-operation in a society in which men are valued according to their intellect and character, and a society in which intellect is not cultivated at the expense of character, as it is in some Indian Colleges, an educational institution which provides for the whole man, which turns out men and not merely machines for passing examinations. I never met a Mahomedan in India who was not well aware that our rules of open competition, and especially our rules in regard to competitive examinations, have not worked favourably for the community of which he is a member. (Hear, hear.) In the matter of appointments he gets less than his numerical share of the good things that are going. If that result is due in any degree to our own method of training and selection, tell us with the utmost plainness, and I am perfectly sure the Government of India stands ready to do whatever is fair and right. (Hear, hear.) But all your wisest men have told you that the Mahomedans themselves must bear a large share of responsibility for this result. Until Sir Syed Ahmed sounded his note of warning, the Mahomedans of India paid far too little attention to the education of their sons. They clung to the traditions of a fighting and governing race, and in that respect we can entirely sympathise with them. We Englishmen have not always been able to realise that we have been born into a different world to that of our forefathers, and

M. A.-O. College Association.

ANNUAL DINNER.

We are indebted to the "Pioneer" of Saturday, Aug. 4th, for the following account of the dinner; but we regret that we have not been able to publish the account in full.

ALIGARH COLLEGE DINNER.

Interesting Reunion in London.

ON 10th July a dinner was held in London in celebration of the name and fame of the Aligarh College, promoted by trustees, old pupils and friends of the institution, banded together, after the first dinner in 1901, as the M. A.-O. College Association. In the unavoidable absence of Lord Reay, the President, Sir Charles Lyall, the Vice-President, was in the chair. A pleasing feature of the gathering was the presence of the two Hindu gentlemen who distinguished themselves in the Cambridge Mathematical Tripos, Mr. Rajan, the bracketed Senior Wrangler, and Mr. Birendranath De, the 6th Wrangler. The Northbrook Society, which on the 12th instant gave a reception in honour of the Wranglers, was represented by Sir Mancherjee Bhownaggree, a Vice-President, Mr. A. N. Wollaston, the Chairman, and the two Secretaries, Colonel Loch and Dr. Kapadia. The other guests included Sir Curzon Wyllie, Mr. Didabhai Naoroji, Mr. Alan Cadell, Major General Dickson, Colonel Oswald FitzGerald, Dr. John Pollen, Mr. J. Kennedy, Mr. F. H. Skrine, Mr. J. Sime, Professor J. W. Neill, Mr W. Coldstream, Mr. F. W. Thomas (India Office Librarian), Mr. Melville Boardman, Mr. A. Yusuf Ali, Mr. F. H. Brown, and Mr. W. H. Foster; while the hosts included Shaikh Abdul Qadir, Shams-ul-Ulama Syed Ali Bilgrami (the Hon. Secretary), Nawab Bahadur Benazir Jung, etc.

Sir Charles Lyall briefly proposed the loyal toasts, dwelling particularly on the keen interest the Prince and Princess of Wales took in the Aligarh College on the occasion of their visit there, and the substantial financial result of the desire to commemorate the visit by the foundation of a school of science.

Mr. Archbold taking the chair in the absence of the Nawab Mohsin-ul-Mulk, whom illness kept away.

After dinner the loyal toasts were duly honoured and Aftab Ahmed Khan Esquire then proposed the health of the departing members of the College. He particularly emphasised the importance of their being true to the place of their training, and of their showing themselves honourable and true Mussulmans of the type that was the ideal of Sir Syed Ahmed himself. On Ross Masud and his future career the whole of Mussulman India looked with the earnest hope that he would shew himself a true Syed and a worthy successor to his glorious grandsire. Both Ross Masud and Abdul Raschid then replied in very graceful terms, thanking their friends for their good wishes; and the proceedings finished with cheers for those departing.

The Nawab Mohsin-ul-Mulk has not been to Bombay to no purpose. He addressed a large meeting in that city, during the latter half of July, and made some very vigorous remarks in the course of his speech. He took Indian Mussulmans sternly to task for their indifference to their real interests and their extravagance in unnecessary ceremonies and entertainments, saying that while they were ready to spend thousands of rupees on tamashas and ceremonies they fled from him, as if from the plague, when he approached to ask for help for Aligarh, the centre of Mussulman education.

As regards building in the College, Aftab Ahmed Khan Esq., the Honorary Secretary of the building committee, writes to say that building operations are getting along, though perhaps not so fast as he might wish. There has also been a "new departure" in this direction, a steam engine having been bought and set to work to grind lime for the building. This is the first time steam power has been brought directly to work in the College.

The report of the Football (2nd XI) tour has not yet arrived, hence we are compelled to go to press without it. The same remark holds good of the "Letter from England" which should have been published in this number. But as these notes are written five days' journey from a Post Office it is very likely that both the account of the Tour and the Letter may have been waiting at the Post Office. We hope to publish both in the next number.

The Aligarh Monthly

September, 1906.

College Notes.

The School closed for the Summer Vacation on July 13th and the College on the following day. The Nawab Mohsin-ul-Mulk left for Bombay on July 15th, by which date the College compound resembled a deserted city more than anything in the shape of a College.

The only people who had no pleasant thoughts of a holiday before them were the fifty-four candidates for the B. A. examination whose toils and troubles were to reach their climax in the period between July 16th and July 26th.

The great feature of the close of the College term was the dinner given by the trustees to say farewell to Syed Ross Masud, the grandson of the venerable Founder, and to Abdul Raschid, son of Colonel Abdul Majid Khan of Patiala. There was also a third Aligarh boy whose name has unfortunately slipped from the writer's memory, who was going to England about the sametime as Ross Masud, and Abdul Raschid, and for the same purpose, *viz*, to complete his education in that country. The dinner was very well attended considering that we were so near the end of term; about 300 sat down to dinner at 8-15 p. m., on Friday July 13th,

جلد ۵ | جنوری ۱۹۰۷ء | نمبر ۱

الحجاب فی القرآن

(سورۂ نور، تفسیر آیت "غض بصر" مع حواشی از تفسیر کبیر)

تمہید

ہم ناظرین علیگڈہ منتھلی سے اس امر کی معافی چاہتے ہیں کہ آج ہم اُن کی خدمت میں ایک ایسا مضمون پیش کرتے ہیں، جو سراپا ملایانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، اور جس میں سر سے پیر تک تقلید ہی تقلید کی جھلک نظر آتی ہے، اور بجز روایت کشی و نقل آرائی متقدمین کے اور کچھ نظر نہیں آتا لیکن ہم یہ ڈھنگ اختیار کرنے پر مجبور کیے جاتے ہیں، اور ہمارے مدعیان مقتدائیت اسی قسم کے مضمون پیش کر کے ہمارا معیار دماغی گھٹاتے ہیں، اور ہم کو اجتہاد و تنقید کے میدان سے ہٹا کر تقلید و انسان پرستی کی گھاٹیوں میں ڈھکیلتے ہیں کیونکہ جب ہم نے ۱۹۰۳ء میں "علیگڈہ منتھلی" میں "مسلمانوں میں پردہ" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا، اور صرف قرآن سے یہ دکھلایا کہ جن آیتوں کے الفاظ سے "حجاب" پر استدلال کیا جاتا ہے۔ اُنکے

"لغوی" اور تاریخی مفہوم میں اجنبیوں سے منہ کا چھپانا داخل نہیں ہے، اور اس قسم کی سب آیتوں کے ملانے سے، باصول تفسیر القرآن بالقرآن، "حجاب" کے معنی "لباس ساتر" کے قرار پاتے ہیں، اور اباحت کشف وجہ میں اجانب و غیر اجانب دونوں مساوی ہیں، اور آیات شعر "حجاب" کے علاوہ قرآن کی اور آیتوں سے بھی کشف وجہ نساء مسلمین کا تعامل اور جواز ثابت ہوتا ہے" تو اس مضمون کی اشاعت ایک عرصہ کے بعد "الندوہ" میں جسکا مقصد قوم میں دوبارہ "اجتہادی قوت" کا پیدا کرنا ہے، پردے کی حمایت میں ایک بہت پرانا، اور اپنے مقصد اولی کے خلاف ایک مقلدانہ مضمون شائع ہوا جس میں صرف دو ایک تفسیروں سے منہ چھپانے پر استدلال کیا گیا ہے، اور بلا وساطت غیرے قرآن کی تہ تک پہنچنے کی کوشش سے اغماض کیا گیا ہے۔

یہ مضمون اب سے پندرہ برس پہلے، یا اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ ہوا "پردہ کی تاریخ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جس میں صرف چند عربی اشعار سے پردے کے وجود پر استدلال کیا گیا تھا۔ اور اسکے مذہبی پہلو سے بحث نہیں کی گئی تھی۔ ہمنے اس مضمون کی نقل اسی زمانہ میں اخبار "سر مور گزٹ" ناہن میں پڑھی تھی۔ اور چند سال ہوئے کہ یہ مضمون حیدرآباد دکن کے رسالہ "معلم نسواں" میں بھی نقل کیا گیا تھا۔ البتہ اب حال میں جب یہ مضمون دوبارہ علامہ مضمون نگار کے نام سے "الندوہ" میں شائع ہوا۔ تو اسکے اول و آخر میں کچھ ترمیم و ایزادی کی گئی۔ شروع میں سے اسکے وہ فقرے نکال دیے گئے جن میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ مسلمان پردے کے موجد ہیں اور انہیں کو اسکا فخر حاصل ہے۔ اور آخر میں، پہلے اڈیشن کے مقابلہ میں، یہ ایزادی کی گئی کہ دو ایک تفسیروں کی عبارتیں توڑ موڑ کر نقل کی گئیں۔ اور ضمناً علامہ امیر علی کے مبلغ علمی و تاریخی پر بھی حملہ کیا گیا۔ اور اس تردید میں علامہ امیر علی کا وہ اقتباس نقل کیا گیا، جو ہمنے "مسلمانوں میں پردہ" کے عنوان والے مضمون میں نقل کیا تھا۔

جب پُرانی کڑہی میں اُبال ہی آیا، اور پندرہ برس پہلے کا مضمون شائع کیا گیا تو چاہیے یہ تھا کہ اس مدت میں زمانے نے "عالم نسواں" پر جو کچھ روشنی ڈالی تھی۔ اُنکے متعلق جو لٹریچر پیدا کیا تھا، اور اُسکے مختلف پہلوؤں پر جو کچھ تحقیقات کی تھی، اور جو غلط فہمیاں قدیم سے پھیلی ہوئی تھیں اُنکے دور کرنے میں جو کچھ کوشش کی تھی، اور مذہب اسلام نے عورت کو جو کچھ پوزیشن دیا تھا اُس پر سے جہالت و تعصبات کے پردے اُٹھانے میں جو پیشقدمی کی تھی، اُن سب سے اُس مضمون کی دوسری اشاعت میں فائدہ اُٹھایا جاتا، اور بجائے مفسروں کی رائیں نقل کر دینے کے، حسب اقتضاء و مناسبت شان علامیّت، قرآن کے مغز تک پہنچنے کی کوشش کیجاتی، اور لوگوں کو اس جادے پر چلنے کا عادی بنایا جاتا، اور اُسکے الفاظ سے صراحت کے ساتھ پردے کی صورت و نوعیت اور وضع و قطع بتلائی جاتی، لیکن کیا گیا تو یہ کیا گیا، کہ جو دماغ قوم کو سطح اجتہادی پر لانا چاہتا ہی، خود اُسنے لوگوں کی رائے کو مشعل راہ ہدایت بنایا، اور اُن بہت سی نفرتوں کے محو کرنے میں، جو عوام انسان پرست اور قدامت پسند گروہ میں "ندوہ" اور "الندوہ" کی مذبوحی حرکت پیشقدمی پر پھیلی ہوئی ہیں، پردے کی حمایت کے مسئلے کو رِبٹر کی جگہ استعمال کیا گیا، اور اس مسئلے میں عوام جہلا کی ہم زبانی سے کفارۂ معصیت کا کام لیا گیا، اور قوم کے نصف حصے کی خداداد پوزیشن کو دنیا سے نیست کر دیا گیا، یہ اُن دماغوں کی رفتار ہی جو احیاء علوم قدیمہ اور تطبیق فلسفۂ قدیمہ و جدیدہ کے پیرو ہیں، اور خود عوام پرستی کے گرداب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ہم افسوس کرتے ہیں کہ ہم کو بھی اس مضمون میں، جو آج پیش کیا جاتا ہی، وہی ڈہنگ ختیار کرنا پڑا، اور بجائے اجتہادی طریقہ استدلال کے متقدمین علما اور مفسرین کی رائیں مسئلہ "حجاب" کے متعلق ایک جگہ جمع کر کے عام مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا پڑیں، اور یہ دکھلانا پڑا کہ اگر کوئی ایک آدہ مفسر یا عالم عورتوں کے مُنہ چھپانے کا قائل ہی تو دوسری طرف مستند علما اور مفسرین کا ایک جم غفیر ہی، اور انہیں میں فخر الاسلام

امام رازی بھی ہیں، ان سب کی رایوں کے دیکھنے سے بالاتفاق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اجانب سے عورتوں کا منہ چھپانا نہ قرآن کے لفظوں سے مستنبط ہوتا ہی۔ نہ جناب رسالت مآب کے زمانے میں کسی نے یہ سمجھا، نہ قرون اولی کے تعامل سے یہ ثابت ہوتا ہے اور نہ مفسروں نے قرآن کے الفاظ سے یہ مفہوم نکالا ہی۔ ہمنے ان تمام پہلوؤں کو اپنے مضمون "مسلمانوں میں پردہ" میں نہایت وضاحت سے دکھلایا ہی، جو ۱۹۰۳ء میں "علیگڈھ منتھلی" میں شائع ہوچکا ہی۔

جو مضمون آج شائع کیا جاتا ہی، وہ علاوہ طویل ہونے کے، قدیم طرز استدلال کا ایک نمونہ ہی، کیونکہ یہ مضمون امام رازی کا ہی، جو اُن کی تفسیر کبیر سے لفظ بلفظ اور مسلسل ترجمہ کیا گیا ہی، اور ہم نے جہاں کچھ لکھنا ضروری سمجھا ہی، اُسکو بطور حاشیہ کے لکھا ہی، اور متن تفسیر میں بالکل دخل نہیں دیا ہی۔

یہ مضمون صرف سورۂ نور کی تیسویں اور کتیسویں آیت "غض بصر" کی تفسیر ہی، جس میں صرف "غض بصر اور استعمال خمار برجیوب" کی ہدایت کی گئی ہی، امام رازی نے اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں اور بہت سے فقہی مسائل بھی بیان کردیئے ہیں، جن میں سے بعض کو نفس مسئلہ "حجاب" سے کچھ تعلق نہیں ہی، لیکن ہم نے اُن سب کو بجنسہ اُردو میں لکھدیا ہی، تاکہ حذف اور قطع و برید کا خدشہ نہ کیا جاسکے، اگرچہ انکے پڑھنے سے بہت سی طبائع منقبض ہونگی۔

آخر میں بطور ضمیمے کے اور مشہور مفسروں کی رائیں بھی "الا ما ظہر منہا" کے متعلق نقل کردی گئی ہیں، تاکہ اس سبجکٹ پر اکثر مستند رائیں اس مسئلے کے طلبا کو ایک جگہ ملسکیں یہ سب رائیں ملتی جلتی ہیں، بلکہ یہ دعوی کیا جاسکتا ہی کہ اور دوسری تفسیروں میں بھی اس آیت کے تحت میں انہیں کے ہم معنی مضامین ملینگے۔

ہمارا ارادہ ہی کہ قرآن میں جسقدر آیات "حجاب" ہیں اُن کی تفسیر قدیم مستند مفسروں

کی زبان سے کرائی جائے، اور پھر اُن پر محاکمہ کیا جائے تاکہ جو لوگ مذہبی اور منقولی پہلو سے اس مسئلہ کی اسٹڈی کرنا چاہیں، اُنکو اس سے پوری مدد مل سکے، کیونکہ ابھی تک اُن لوگوں کا ایک گروہ کثیر موجود ہے، جو تمام مسائل معاشرت کو بجائے محک اقتضاءات زمانہ کے مذہبی معیار پر پرکھنا چاہتے ہیں، اور صحیح مذہبی معلومات نہونے کی وجہ سے تمام سوشیل اصطلاحات میں سدراہ ہوتے ہیں۔

آیت

قُل لِلمُؤمِنِینَ یَغُضُّوا مِن اَبصَارِھِم وَیَحفَظُوا فُرُوجَھُم، ذٰلِکَ اَزکٰی لَھُم، اِنَّ اللہَ خَبِیرٌ بِمَا یَصنَعُونَ۔ وَقُل لِلمُؤمِنَاتِ یَغضُضنَ مِن اَبصَارِھِنَّ، وَیَحفَظنَ فُرُوجَھُنَّ، وَلَا یُبدِینَ زِینَتَھُنَّ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنھَا، وَلیَضرِبنَ بِخُمُرِھِنَّ عَلٰی جُیُوبِھِنَّ، وَلَا یُبدِینَ زِینَتَھُنَّ اِلَّا لِبُعُولَتِھِنَّ، اَو آبَائِھِنَّ، اَو آبَاءِ بُعُولَتِھِنَّ، اَو اَبنَائِھِنَّ اَو اَبنَاءِ بُعُولَتِھِنَّ، اَو اِخوَانِھِنَّ اَو بَنِی اِخوَانِھِنَّ، اَو بَنِی اَخَوَاتِھِنَّ، اَو نِسَائِھِنَّ، اَو مَا مَلَکَت اَیمَانُھُنَّ اَوِ التَّابِعِینَ غَیرِ اُولِی الاِربَۃِ مِنَ الرِّجَالِ، اَوِ الطِّفلِ الَّذِینَ لَم یَظھَرُوا عَلٰی عَورَاتِ النِّسَاءِ، وَلَا یَضرِبنَ بِاَرجُلِھِنَّ لِیُعلَمَ مَا یُخفِینَ مِن زِینَتِھِنَّ وَتُوبُوا اِلَی اللہِ جَمِیعًا اَیُّہَ المُؤمِنُونَ، لَعَلَّکُم تُفلِحُونَ۔

(سورۂ نور ۲۴، آیت ۳۰ و ۳۱)

ترجمہ (اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اس میں اُنکے لیے زیادہ صفائی (قلب) ہے۔ (لوگ) جو کچھ بھی کیا کرتے ہیں اللہ کو (سب) خبر ہے۔

اور (اے پیغمبر) مسلمان عورتوں سے کہو کہ (وہ بھی) اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں

کی حفاظت کریں، اور اپنے (مواقع) زینت (مطلقہ یعنی ظاہری اور پوشیدہ) کو ظاہر نہونے دیں، مگر جو کچھ اُس میں سے (عادةً) کُھلا رہتا ہو (یعنی مُنہ اور ہاتھ) اور اپنے گریبانوں پر دوپٹے (کے آنچل) ڈالے رہیں، اور اپنی زینت (خفیہ) کو (جو آنچل سے چھپائی جاتی ہی) ظاہر نہونے دیں، مگر اپنے شوہروں پر، یا اپنے باپ پر، یا اپنے خاوند کے باپ پر، یا اپنے بیٹوں پر، یا اپنے شوہروں کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر، یا اپنے بھتیجوں پر، یا اپنے بھانجوں پر، یا اپنی (جیسی تمام[1]) عورتوں پر، یا اپنے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی غلاموں) پر، یا متوسلین[2] مردوں پر کہ جو بلا (نیت) خواہش شہوت (ساتھ رہتے) ہیں، یا لڑکوں پر کہ جو عورتوں کی شرمگاہ[3] (کے افعال) سے (ابھی تک) آگاہ نہیں۔ اور عورتیں (چلنے میں ایسے) دھماکے سے اپنے پیر (زمین پر) نہ رکھیں کہ لوگوں کو اُن کی اندرونی زینت (یعنی زیور) کی خبر ہو۔ اور مسلمانو! تم سب اللہ کی جناب میں (جاہلیت کی رسموں سے) توبہ کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ (سورۂ نور ۲۴ آیت ۳۰ و ۳۱)

تفسیر۔ امام رازی اس آیت کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں کہ

جاننا چاہیے کہ خداوند تعالیٰ نے جس طرح مردوں کو "غض بصر" اور حفظ "فروج" کا حکم دیا ہی اسی طرح عورتوں کو بھی حکم دیا ہی، لیکن اُن کو اتنا حکم اور دیا ہی کہ وہ اپنی زینتیں سب پر ظاہر نہ کیا کریں، مگر خاص خاص مردوں پر۔

قولہ تعالیٰ "یغضوا من ابصارھم" اس جگہ چند مسائل ہیں۔

---

[1] آگے چلکر اسی آیت کی تفسیر میں تفسیر کبیر میں لکھا ہی کہ "المراد نسائھن جمیع النساء وھذا ھو المذھب"۔ یعنی نسائھن سے تمام جنس نساء مراد ہی، اور یہی مذہب ٹھیک ہی۔ اور جو عورتوں سے مسلمان عورتیں مراد لیتے ہیں وہ استحباب اولویت پر مبنی ہی۔ اختر

[2] مولوی نذیر احمد صاحب نے لفظ "تابعین" کا ترجمہ "خدمتیوں" کیا ہی۔ اور شاہ ولی اللہ صاحب نے "طفیلیاں" کیا ہی۔ مگر ہمنے لفظ "متوسلین" اختیار کیا ہی جو اپنی اصلی وسعت پر دلالت کرتا ہے۔ اور دونوں معنیوں پر حاوی ہے۔ خستر۔

[3] شاہ ولی اللہ صاحب نے لفظ "عورات" کا ترجمہ "شرمگاہ" کیا ہی۔ خستر۔

(۱) مسئلہ اول - (امام صاحب نے مسئلہ اول میں لفظ "من" کی نسبت صرف نحوی بحث کی ہے -

(۲) مسئلہ ثانی - چھپانے کی چیزوں میں چار قسم کی نسبتیں ہیں، یعنی،

(۱) مرد کا ستر مرد سے،

(۲) عورت کا ستر عورت سے،

(۳) عورت کا ستر مرد سے، اور

(۴) مرد کا ستر عورت سے،

(۱) مرد کا ستر مرد سے

مرد کو مرد کا تمام بدن دیکھنا جائز ہی، مگر مقام ستر - (مرد کا مقام ستر) ناف اور گھٹنے کے درمیان ہی - لیکن خود ناف اور گھٹنہ داخل ستر نہیں - مگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک گھٹنہ داخل ستر ہی، اور امام مالک کے نزدیک ران بھی ستر میں شامل نہیں - مگر دلائل اس بات کے موجود ہیں کہ ران بھی مقام ستر ہی - چنانچہ حذیفہ سے روایت ہی کہ جناب رسالت مآب مسجد میں اُن کے پاس تشریف لائے اور اُن کی (یعنی حذیفہ) کی ران کھُلی ہوئی تھی - آپنے فرمایا "اپنی ران ڈھک لو، اسلیے کہ یہ مقام ستر ہی" اور نیز آپ نے حضرت علی سے فرمایا کہ "نہ اپنی ران کھولو، اور نہ کسی زندہ اور مُردہ کی کھُلی ہوئی ران کو دیکھو"

اگر مرد مرد کا چہرہ یا تمام بدن کے دیکھنے میں شہوت کے برانگیختہ ہونے کا خوف کرے، مثلاً امرد کو دیکھکر، تو اُسکو بھی اُسکا دیکھنا درست نہیں - مرد کو مرد کے ساتھ ایک بستر میں لیٹنا بھی جائز نہیں - اگرچہ دونوں بستر کے ایک ایک جانب لیٹے ہوئے ہوں - ابو سعید خدری سے روایت ہی کہ جناب رسالت مآب نے فرمایا کہ "نہ مرد مرد کے ساتھ ایک کپڑے میں شب باشی کرے، اور نہ عورت عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں شب باشی کرے" (مواقع ہیجان طبع میں)

معانقہ اور مُنہ پر بوسہ دینا بھی مکروہ ہی، مگر یہ کہ اپنے بچہ کا پیار سے مُنہ چوم لے، یا اُسکو گلے

لگالے۔ لیکن مصافحہ مستحب ہے[1]۔

حضرت انس سے روایت ہی کہ ایک شخص نے جناب رسالت مآب سے دریافت کیا کہ "جب ہم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی یا دوست سے ملے، تو کیا وہ (تواضعاً) اُسکے لیے جھک جایا کرے"؟ آپنے فرمایا "نہیں" پھر اُسنے پوچھا "کیا گلے لگاکر اُسکو بوسہ دیا کرے"؟ آپ نے فرمایا کہ "نہیں" پھر اُسنے دریافت کیا کہ کیا ہاتھ میں ہاتھ لیکر اُس سے مصافحہ کرے؟ آپ نے فرمایا کہ "ہاں"

(۲) عورت کا ستر عورت سے

عورت سے عورت کے ستر کا حکم بھی ایسا ہی ہی جیسا مرد سے مرد کا ستر۔ عورت کو عورت کا تمام بدن دیکھنا جائز ہی، مگر ناف اور گھٹنے کے درمیان کا جسم دیکھنا، اور مضاجعت جائز نہیں ہی۔

کیا عورت ذمیہ مسلمان عورت کا بدن دیکھ سکتی ہی؟ بعض نے کہا ہی کہ مسلمان عورت کی طرح ایک ذمیہ بھی مسلمان عورت کا جسم دیکھ سکتی ہی، مگر صحیح یہ ہی کہ جائز نہیں[2]۔ اسلیے کہ وہ بہ حیثیت مذہب اجنبی عورت ہی۔ کیونکہ خدا نے (اسی آیت میں جہاں عورت کو عورت پر

---

[1] بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بہایم طبع انسانوں کا تو انسانوں کی سوسائٹی تک میں آنا بھی کفر ہے، اسلیے کہ انسانیت کو اُن سے صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہی۔ چہ جائیکہ وہ لوگ جو انسانی ملاقات سے حیوانی ملاقات کے خواہشمند ہو جائیں، اُنسے تو ہاتھ ملانا بھی جائز نہونا چاہیے۔ اختر

[2] عجیب تماشہ کی بات ہی کہ عورت ذمیہ کو جورو بنانا جائز، ماں بہن کے ساتھ گھر میں لاکر رکھنا جائز، مگر بدن کا دیکھنا ناجائز، اس بودے مسئلہ سے منافرت اخلاقی پیدا ہوکر تدبیر منزل میں جو مشکلات پیدا ہوں گی، اُن کا ذمہ دار کون ہوگا؟ اگر یہ باتیں ہوتیں تو اسلام ایک ذمیہ عورت کو خاندان کا رکن بنانے کی کبھی اجازت نہ دیتا۔ اور اگر بدن سے مواقع ستر مراد ہیں، تو اُن کا چھپانا ایک مسلمان عورت سے بھی اُسی طرح فرض ہے کہ جیسا غیر مسلمہ عورت سے۔

اختر

کشف بدن کی اجازت دی ہی، وہاں) نسائهن فرمایا ہی، یعنی "اپنی عورتیں"۔ اور عورت ذمیہ بوجہ اختلاف مذہب ہم میں شمار نہیں ہو سکتی۔

(۳) عورت کا ستر مرد سے

(یعنی مرد کن صورتوں میں عورتوں کے کس حصۂ جسم کو دیکھ سکتا ہے)

(۱) عورت یا تو اجنبی ہوگی۔

(۲) یا محرم۔

(۳) یا مستمتعہ (یعنی جسپر حق تصرف حاصل ہو)

(۱) اجنبی عورت کے احکام | اجنبی عورت یا تو آزاد ہوگی، یا باندی۔ اگر آزاد ہی تو اُسکا تمام جسم داخل ستر ہے اور مرد کو اُسکا مُنہ اور ہاتھ دیکھنے کے سوائے دوسرے حصہ جسم کا (بدون ساتر لباس کے) دیکھنا ناجائز ہی، اسلیے کہ عورت بیع و شری، اور لین دین کے واسطے اپنا مُنہ اور ہاتھ کھولنے کی محتاج ہی ہاتھ سے ہماری مراد، پہنچے تک، کف دست اور پشت دست ہی، اور بعض نے کہا ہی کہ پشت دست بھی ستر میں داخل ہی، جاننا چاہیے کہ ہمارے ان دونوں قولوں میں کہ (۱) حرۂ اجنبیہ کے بدن کا کوئی حصہ (علاوہ مُنہ اور ہاتھ کے) دیکھنا جائز نہیں ہی۔ (۲) مگر اُسکا مُنہ اور ہاتھ دیکھنا جائز ہے، چند مستثنیات بھی ہیں۔

الکلام الاول ۔ عورت کا مُنہ اور ہاتھ دیکھنا جائز ہی، اسکی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) اول یہ کہ اس دیکھنے میں نہ کوئی غرض ہو اور نہ فتنہ۔

له آگے چلکر خود امام صاحب لفظ "نسائهن" کی تفسیر میں "عام عورتیں" مراد لیتے ہیں، اور اسی کو صحیح مذہب قرار دیتے ہیں۔ خیر کوئی معنی ہوں، مگر ان دونوں صورتوں میں امام صاحب نے "حجاب" کے مسائل نہیں بلکہ "ستر" کے مسائل بیان کیے ہیں۔ اور بعض لوگوں نے عورت ذمیہ سے مسلمان عورت کے اُس حصۂ جسم کو چھپانے کی بھی رائے دی ہی جسکو وہ "صور مستثنیات فی القرآن" میں ظاہر کر سکتی ہی۔

پردہ کے مسائل تیسری اور چوتھی صورت سے شروع ہوتے ہیں، جس میں عورت و مرد کے باہم دیکھنے کا ذکر ہے۔ خضر،

(۲) یہ کہ غرض تو ہو مگر فتنہ نہ ہو، اور

(۳) تیسرے یہ کہ غرض اور فتنہ دونوں ہوں۔

(۱) پہلی صورت، یعنی جہاں نہ غرض ہو اور نہ فتنہ۔ اس صورت میں اجنبی عورت کے چہرے کی طرف قصداً بلا کسی غرض کے دیکھنا جائز نہیں، اور اگر دفعتاً نظر پڑ بھی جائے، تو اس الہامی فرمان کے مطابق آنکھیں نیچی کر لینا چاہییں کہ " قل للمومنین یغضوا من ابصارھم "
بعض نے کہا ہی کہ اگر محل خوف نہو تو ایک مرتبہ کا دیکھ لینا جائز ہی، امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے مگر دوبارہ نظر ڈالنا جائز نہیں، اسلیے کہ خدا فرماتا ہی " ان السمع والبصر والفواد کل اولئک عنہ مسئولا "۔ یعنی " کان، آنکھ اور دل، ان سب سے بازپرس ہوگی "۔ اور نیز جناب رسالت مآب نے فرمایا ہی کہ " اے علی! نظر کے بعد نظر مت ڈال، اسلیے کہ پہلی نظر تو تیری ہی، مگر دوسری نظر تیری نہیں "۔ (یعنی دوسری نظر شیطانی ہی) جابر سے روایت ہی کہ میں نے جناب رسالت مآب سے نظر فجاءۃ کا حکم دریافت کیا۔ آپنے فرمایا کہ " میں اپنی نظر پھیر لیا کرو "۔ چونکہ غالباً نظر اولی سے بچنا ناممکن ہے، اسلیے اختیاری اور غیر اختیاری دونوں نظریں معاف کی گئیں۔

(۲) دوسری صورت، یعنی جس جگہ غرض ہو اور فتنہ نہو، اُسکی بھی چند صورتیں ہیں۔

اول یہ کہ اگر کوئی مرد کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے، تو وہ مرد اُس عورت کا مُنہ اور ہاتھ دیکھنے کا مجاز ہی۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہی کہ ایک شخص نے انصار کی عورتوں میں سے ایک عورت کے ساتھ شادی کرنا چاہی، جناب رسالت مآب نے اُس شخص کو حکم دیا کہ اُس عورت کو دیکھ لے، اسلیے کہ انصار کی آنکھوں میں کوئی بات ہوا کرتی ہی "۔ اور نیز آپنے فرمایا کہ " جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت سے منگنی کرے، تو اُس مرد کو اُس عورت کے دیکھ لینے میں کوئی قباحت یا عیب نہیں "، اسلیے کہ وہ صرف منگنی کے لیے اُسکو دیکھتا ہی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک عورت سے منگنی کی، جناب رسالت مآب نے مجھسے دریافت کیا کہ " کیا تو نے اُسکو دیکھ لیا ہی؟ " میں نے عرض کیا کہ " نہیں " آپنے فرمایا کہ " دیکھ لے،

کیونکہ یہ بات تم دونوں میں اُلفت قائم رہنے کیلئے نہایت ضروری ہی"۔

پس یہ تمام دلیلیں ہیں اس بات پر کہ اجنبی عورت کا مُنہ اور ہاتھ، بنظر شہوت، نکاح کی نیت سے دیکھنا جائز ہی، اور خدا کا قول بھی اس بات پر دال ہی، (جہاں اُسنے جناب رسالت مآب کو مخاطب کرکے فرمایا ہی) " لایحل لک النساء من بعد، ولا ان تبدل بھن ولو اعجبک حسنھن"۔ یعنی " (اے پیغمبر! اسوقت کے) بعد سے (دوسری) عورتیں تم کو جائز نہیں، اور نہ یہ (جائز ہے) کہ اُن کو بدل کر دوسری بی بیاں کرلو، گو انکا حُسن (صورت) تم کو (کتنا ہی) اچھا (کیوں نہ) لگے"۔ اور ظاہر ہی کہ عورتوں کا حسن، رسول اللہ کو، اُنکے منہ دیکھنے کے بعد ہی تعجب میں ڈال سکتا تھا۔

دوسرے یہ کہ مرد کو باندی کے خریدنے کے وقت، سوائے ستر کے، اُسکا تمام بدن دیکھنا جائز ہی۔

تیسرے یہ کہ بیع وشری کے وقت مرد آزاد عورت کے چہرے کو بنظر غور وتامل دیکھ سکتا ہے، تاکہ وقت ضرورت اُسکو پہچان سکے۔

چوتھے یہ کہ مرد شہادت کے وقت مرد عورت کا صرف چہرہ دیکھ سکتا ہی، اسلیئے کہ شناخت چہرے ہی سے حاصل ہوتی ہی۔

(۳) تیسری صورت، یعنی مرد شہوت کی نظر سے عورت کی طرف دیکھے۔ یہ ممنوع ہی۔ جناب رسالت مآب نے فرمایا ہی کہ " آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں"۔ جابر سے روایت ہی کہ میں نے جناب رسالت مآب سے نظر فجارۃ کی نسبت دریافت کیا، آپنے فرمایا کہ " میں اپنی نظر پھیر لیا کروں"۔ اور بیان کیا جاتا ہی کہ توراۃ میں یہ لکھا ہی کہ " نظروں میں شہوت بیج بوتی ہی، اور اکثر شہوتوں سے بڑا بھاری صدمہ پہنچتا ہی"۔

الکلام الثانی۔ اجنبی مرد کو اجنبی عورت کا بدن (مُنہ اور ہاتھ کے علاوہ) دیکھنا جائز نہیں، مگر چند صورتوں میں۔

(۱) پہلی صورت، طبیب اس معالجے کی غرض سے اجنبی عورت کا بدن دیکھ سکتا ہی جیسے ختنہ کرنے والوں کو مختونوں کی شرمگاہ کا دیکھنا جائز ہی۔

(۲) دوسری صورت، تحمل شہادت زنا کے لیے، زنا کرنے والوں کی شرمگاہوں کا نظر بالقصد سے دیکھنا جائز ہی۔ اور اسی طرح شہادتِ ولادت اور شہادت رضاعت کے لیے عورت کی شرمگاہ اور پستان کا دیکھنا جائز ہی۔

ابو سعید اصطخری کا قول ہی کہ مرد کو ان مواضع کا دیکھنا جائز نہیں، اسلیے کہ زنا کے صدمات پوشیدہ ہوتے ہیں، اور ولادت و رضاعت میں عورت کی شہادت قبول کیجا سکتی ہی، لہذا مرد کا شہادت کی غرض سے دیکھنا کچھ ضرور نہیں۔

(۳) تیسری صورت، اگر کوئی عورت پانی یا آگ میں گر پڑے، تو اُسکے بچانے کے لیے اُسکا بدن دیکھنا جائز ہی۔ ؎۲

اگر اجنبی عورت باندی ہی، تو بعض کے نزدیک اُسکا ستر ناف اور گھٹنے کے درمیان ہے، سر، پہنچے، پنڈلیاں، گلا اور سینہ ستر سے خارج ہوگیا۔ علیٰ ہذا، اَمَہ کی پشت و شکم اور پہنچوں سے اوپر کے حصہ بدن کے ستر ہونے میں بھی علماء کا اختلاف ہی، مرد کو کسی حال میں باندی کا بدن چھونا جائز نہیں ہے، اور نہ باندی کو مرد کا، یہانتک کہ حجامت و اکتحال وغیرہ کی غرض سے بھی لمس جائز نہیں، اسلیے کہ لمس (ہیجان شہوت میں) نظر سے بہت زیادہ قوی (العمل) ہی، اور اس کی دلیل یہ ہی کہ انزال بالمس روزہ کو توڑ دیتا ہے، اور انزال بالنظر نہیں توڑتا، لیکن امام ابو حنیفہ کا تو یہ قول ہے کہ اَمَہ کا وہ تمام حصہ بدن چھونا بھی جائز ہی، جسکا دیکھنا جائز ہے۔

؎۱ یہ ملحوظ رہے کہ عرب میں عورتوں کی ختنہ کا بھی دستور تھا۔

؎۲ امام صاحب شاید چھونے کا ذکر بھول گئے، اسلیے کہ کسی شخص کو پانی یا آگ سے بچانا بدون ہاتھ کی مدد کے کیونکر ہوسکتا ہے ہاں البتہ اگر مشین سے یہ کام لیا جاسکے تو صرف دیکھنے سے کام چل سکتا ہی۔ اختر۔

(۲) محرم عورت کے احکام | اگر عورت ازروئی نسب، یا رضاعت، یا مصاہرت محرمات میں سے ہے تو اُسکا ستر، (اپنے محارم سے) مرد کے ستر کی طرح، ناف اور گھٹنے کے درمیان ہی۔ اور بعض علما نے کہا ہی کہ اُسکا ستر بدن کا صرف اسقدر حصہ ہی، جو کام کاج میں نہ کھل جایا کرتا ہو، یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہی۔ اور باقی تمام تفصیل آیات ہذا کی تفسیر میں آگے آتی ہی۔

(۳) مستمتعہ کے احکام | اگر عورت مستمتعہ ہی، جیسے بیوی، اور باندی جس سے وطی جائز ہے، تو مرد اُسکا تمام بدن، حتیٰ کہ شرمگاہ بھی، دیکھ سکتا ہی، لیکن اُس کی شرمگاہ کا دیکھنا بھی ویسا ہی مکروہ ہے جیسا مرد کو خود اپنی شرمگاہ کا (بلاضرورت) دیکھنا مکروہ ہی، اس کی وجہ یہ روایت کی گئی ہے کہ شرمگاہوں کے دیکھنے سے بینائی کو نقصان پہنچتا ہی۔ بعض علما کا یہ بھی قول ہی کہ عورت مستمتعہ کی شرمگاہ کا دیکھنا بھی جائز نہیں ہی۔

اس مسئلہ میں قنیہ (خالص لونڈی جس میں سوائے استرقاق کے کوئی اور حیثیت نہ پیدا ہوگئی ہو) اور مدبرہ (جس کی آزادی مالک کے مرنے کے بعد مشروط کردی گئی ہو) سب یکساں ہیں لیکن اگر باندی مجوسیہ، یا مرتد یا بت پرست، یا مشرک، یا شوہر والی، یا مکاتبہ (جو باندی اپنے مالک سے ایک رقم معینہ کماکر دینے کے بعد اپنی آزادی کا معاہدہ کرے) ہی، تو وہ اجنبی عورت کے مانند ہی۔ عمرو بن شعیب سے روایت ہی، جناب رسالت مآب نے فرمایا "اگر کوئی شخص تم میں سے اپنی باندی کا نکاح اپنے غلام یا نوکر سے کردے، تو (نکاح کے بعد باندی کے) ناف اور گھٹنے کے درمیان کے جسم کو نہ دیکھے۔

(۴) مرد کا ستر عورت سے

(یعنی عورت کن صورتوں میں مرد کے کس حصہ جسم کو دیکھ سکتی ہے)

(۱) اجنبی مرد کے احکام | مرد اگر اجنبی ہی، تو اُسکا ستر عورت سے ناف اور گھٹنے کے درمیان ہی۔ اور بعض نے کہا ہی کہ مرد کا تمام بدن، مُنہ اور ہاتھ کے علاوہ، (عورت کے حق میں) ستر ہی، جیسے عورت (کا تمام بدن مُنہ اور ہاتھ کے علاوہ) مرد کے حق میں ستر ہی، پہلا قول

زیادہ صحیح ہی۔

(یہ مسئلہ گذشتہ صوت "عورت کا ستر مرد سے" کے برعکس ہے، اسلیے کہ عورت کا بدن فی ذاتہ (علاوہ منہ اور ہاتھ کے) ستر ہی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر عورت کا بدن کھُلا ہوا ہو، تو اُسکی نماز درست نہیں ہوتی)، اور مرد کے بدن کا حکم اسکے برخلاف ہی۔ خوف فتنہ کے وقت عورت کو قصداً اور مکرر مرد کے چہرے پر نظر ڈالنا جائز نہیں، اسواسطے کہ حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ میں اور میمونہ جناب رسالت مآب کے پاس تھیں کہ ابن ام کلثوم آئے، اور ہمارے پاس تک چلے آئے، آپنے فرمایا کہ "تم اُس سے چھپ کیوں نہیں جاتیں"۔ میں نے کہا کہ "یا رسول اللہ! کیا وہ اندھا نہیں جو ہم کو دیکھتا ہو؟" آپ نے فرمایا کہ "تم تو اندھی نہیں ہو کہ اُسکو نہ دیکھتی ہو"۔

(۲) محرم مرد کے احکام | اگر مرد عورت کا محرم ہی، تو اُس مرد کا ستر عورت سے ناف اور گھٹنے کے درمیان (کا حصہ جسم) ہی، اور اگر مرد عورت کا مالک یا شوہر ہی، جسکے ساتھ وطی کرنا بھی درست ہی، تو یہ عورت اُس مرد کا تمام بدن دیکھ سکتی ہی، بجز اسکے کہ شرمگاہ کی طرف دیکھنا مکروہ ہی، جیسے مرد کو بھی (اپنی مستمتعہ) عورت کی شرمگاہ کا دیکھنا مکروہ ہی، مرد کو خالی مکان میں (خود بھی) ننگا بیٹھنا جائز نہیں، اُسکو چاہیے کہ (ہر حالت میں) اپنا ستر ڈھکا رکھے۔ روایت ہے کہ ننگا ہونے کی نسبت جناب رسالت مآب سے دریافت کیا گیا، آپنے فرمایا کہ "اللہ (اس بات کا) زیادہ مستحق ہی کہ اُس سے حیا کی جائے"۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہی کہ "ننگا ہونے سے بچو، اسلیے کہ تمہارے ساتھ وہ (خدا) رہتا ہی جو تم سے جدا نہیں ہوتا، مگر پاخانے[1] میں جانیکے وقت یا اپنی بیوی سے صحبت کرنیکے وقت"۔ واللہ اعلم۔

(۳) مسئلہ ثالث۔ شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ "یغضوا من ابصارھم" سے کیا مراد ہی؟ انہوں نے کہا کہ "سر کی آنکھیں ممنوع چیزوں کے دیکھنے سے بچی رہنا چاہییں،

[1] اسکا مطلب یہ نہیں کہ ان اوقات میں خدا اپنے بندوں کے پاس سے علیحدہ ہوجاتا ہی بلکہ مطلب یہ ہی کہ ان ضروریات کے اوقات میں شرمگاہ کا ننگا کرنا خدا کے ساتھ بے حیائی کرنے میں داخل نہیں۔ اختر۔

ور دونکی آنکھیں ماسوا ذات باری سے "

قولہ تعالیٰ " ویحفظوا فروجھم " یعنی " مومنین اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں "

حفظ فروج سے یہ مراد ہی کہ جو چیزیں حلال نہیں، اُنسے شرمگاہوں کی حفاظت کیجائے، ابوالعالیہ کا قول ہی کہ خدا نے جہاں جہاں قرآن میں " یحفظوا فروجھم " اور " یحفظن فروجھن " فرمایا ہی، اُن سب آیتوں میں زنا سے محفوظ رہنا مقصود ہے، مگر سورہ نور میں یحفظوا فروجھم " اور یحفظن فروجھن " سے یہ مراد ہی کہ شرمگاہوں کے دیکھنے سے بچنا چاہیے مگر یہ قول ضعیف ہے، اسلیے کہ اس آیت میں اس تخصیص معنی پر کوئی دلالت نہیں پائی جاتی، بلکہ آیت کا اقتضائے ظاہری تو یہ ہی کہ " حفظ فروج " سے وہ تمام چیزیں، مثل زنا، مس، اور نظر، (قصداً بلاضرورت) کے، مراد لی جائیں، جنکو خدا نے حرام کیا ہے۔ اور اگر " حفظ فروج " سے اُنکے دیکھنے ہی کی ممانعت مراد لیجائے تو " وطی اور مس " ہی بوجہ اپنی شدت و غلظت کے (لزوماً) آیت میں داخل ہوجائے گی۔

اگر نظر منصوص بھی کر دی جاتی، تب بھی آیت کے مفہوم میں " وطی اور مس " کے بچنے کا وجوب داخل ہوتا، جیسے " لا تقل لھما اف " میں (یعنی ماں باپ کی شان میں اُف تک نہ کہو) باقتضاء آیت " اُف " سے زیادہ سخت باتوں سب و شتم اور مار پیٹ کی ممانعت بھی داخل ہی۔

قولہ تعالیٰ " ذلک ازکی لھم "[۱] یعنی اس فرمان پر عمل کرنا مسلمانوں کے نفسوں کو بہت

---

[۱] افسوس ہی ہندوستان کے مسلمانوں پر کہ انکا خدا تو صرف آنکھیں نیچی کرنے کو تزکیہ نفوس اور اعلیٰ درجہ شرافت انسانی پر پہنچنے کے لیے تجویز کرے، اور صیغہ تفضیل کے ساتھ " ذلک ازکی لھم " فرمائے جسکا مطلب ہی کہ " غض بصر " تمہارے حق میں بدرجہ اتم مزکی نفوس اور زینتہ ہی " حفظ فروج " کا۔ مگر وہ خود پرست اور ناخدا پرست اس حکم کو ناکافی خیال کریں، اور جس دوا کو خدا نے اُنکے امراض قلوب کے لیے تشخیص کیا ہی اُسکو غیر کافی خیال کرکے، اپنی طرف سے اُس میں ناپاک ایزاد کریں، پھر کیا حال ہوتا ہی ان ناخدا ترس مسلمانوں کا جو عورتوں کو اسلیے قید رکھتے ہیں کہ اُن پر جیسے ہی چاہیں جسمانی اور روحانی عذاب توڑیں اور اس پردہ کی بدولت اُن کی بازپرس نہ کیجا سکے، لہذا اُنکو کوئی ایسی شریعت بنانا چاہیے جو انکی من مانی ظالمانہ خواہشات کی حمایت کرتی ہو، اور جسکو وہ " اکملت لکم دینکم " کا مصداق ٹھہرا سکیں۔ اسلیے کہ وہ موجودہ شریعت اس ظالمانہ پردہ کی حمایت کرتی نہیں جسکی وجہ سے وہ اُسکو مکمل شریعت کہہ سکیں، اور جسپر انکو فخر و ناز ہو سکے، اور جس میں خود اُن کو اپنے ہاتھوں سے اپنی شریعت میں، اصلاح کرنے کی ضرورت نہ پڑا کرے۔　　　ختم

پاک وصاف کرنے والا ہی"۔ اسلیے کہ یہ ایسی بات ہی جس سے اُنکے نفوس فرکی ہونگے، اور وہ ثنا و مدح کے مستحق ٹھہرینگے۔ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ خدا نے اس خطاب میں صرف مسلمانوں ہی کو مخصوص کیا ہی، اور یہ آیت اُن ہی کے تزکیۂ نفوس کے لیے ہی، اور کفار کے واسطے نہیں[1]۔

قولہ تعالےٰ" وقل للموءمنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن"۔ یعنی "مسلمان عورتوں سے کہدو کہ وہ (بھی مردوں کی طرح) اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں"، اس جگہ بھی وہی مسائل و مباحث ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس آیت میں "غض بصر" کو "حفظ فرج" پر کیوں مقدم رکھا گیا ہی؟ تو اسکا جواب یہ ہی کہ نظر زنا اور فسق و فجور کی قاصد ہی، جس میں لوگ شدّت اور کثرت سے مبتلا ہو جایا کرتے ہیں، اور مشکل سے بچ سکتے ہیں، (اسلیے آنکھ نیچی کرنے کو مقدم رکھا، تاکہ راستہ ہی مفقود ہو جائے)

قولہ تعالےٰ" ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا"۔ یعنی "عورتیں اپنی زینت کے مقامات کو ظاہر نہ کیا کریں، مگر جو کچھ (عادۃً) اُس میں سے کھلا رہتا ہو"۔ یہ حکم علی الاغلبیت اسلیے کہا گیا کہ مردوں کو اجنبی عورتوں پر اپنے زیور اور لباس وغیرہ کی زینت کا اظہار ممنوع ہی، کیونکہ یہ بھی فتنہ سے خالی نہیں۔ اس جگہ چند مسائل ہیں۔

(۱) **پہلا مسئلہ**۔ زینت نسار میں علمار نے اختلاف کیا ہی۔ جاننا چاہیے کہ "زینت" ایک اسم ہی، جسکا اطلاق اُن دونوں زینتوں پر ہوتا ہے جو خلقۃً (انسان کے بدن میں) پیدا کی گئی ہیں، اور یا جنکو انسان خود از قبیل لباس و زیور وغیرہ بغرض زیبائش اختیار کرتا ہی، لیکن بعض لوگ اسکو تسلیم نہیں کرتے کہ "لفظ زینت" کا اطلاق

[1] اسلیے کہ تزکیہ نفوس اول اسلام سے ہونا چاہیے، اور پھر اُسکے بعد فروعات و جزئیات سے۔　　　اختر

محاسن خلقی پر کیا جائے، اسلیے کہ خلقی زینت پر یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ عورت کی زینت ہی بلکہ زینت سرمہ اور خضاب جیسی اکتسابی چیزیں کہلائی جاتی ہیں، مگر قریب الفہم یہ ہے کہ "زینت" میں خلقی زینت بھی داخل ہی۔ اسکی دو دلیلیں ہیں۔

(۱) **پہلی دلیل**۔ اکثر عورتیں صرف محاسن خلقی ہی کی مالک ہوتی ہیں، اور وہ اُن تمام چیزوں سے محروم ہوتی ہیں، جن کو زینت خیال کیا جاتا ہے (جیسے زیور اور عمدہ لباس وغیرہ) پس جب ہم اس زینت کو خلقی زینت پر محمول کرتے ہیں، تو اس سے پورا حق عموم ادا ہوتا ہے (جیسا کہ قرآن کے ظاہر الفاظ سے نکلتا ہی) خلقی زینت کے علاوہ اس میں دوسری زینت کا دخل ہونا بھی کچھ ممنوع نہیں۔

(۲) **دوسری دلیل**۔ خداوند کا یہ قول "ولیضربن بخمرھن علے جیوبھن" اس بات پر دلالت کرتا ہی کہ "زینت" عام ہے، اور اس سے خلقی و اکتسابی دونوں زینتیں مراد ہیں۔ گویا خداوند نے دوپٹوں سے چھپانے کا حکم دیکر، عورتوں کو زینت خلقی کے اظہار سے منع کیا ہی۔ اور جن لوگوں نے "زینت" سے زینت غیر خلقی مراد لی ہے، اُنہوں نے اسکو تین چیزوں میں منحصر کیا ہی۔

اول۔ صباغ، جیسے سرمہ لگانا، یا نیل سے بھوؤں پر خضاب لگانا، یا رخساروں پر کوئی رنگ لگانا یا ہاتھوں پیروں میں مہندی لگانا۔

دوم زیور۔ مثل انگوٹھی، کنگن، پازیب، بازوبند، ہار، تاج، بدھی اور بالی وغیرہ۔

سوم لباس۔ خدا فرماتا ہی "خذو زینتکم عند کل مسجد" یہاں زینت سے لباس مراد ہی۔

(۲) **دوسرا مسئلہ**۔ علماء نے اختلاف کیا ہی کہ "الا ما ظھر منھا"[۱] سے کیا مراد ہی

---

[۱] اکثر مفسرین اور فقہاء کاملین نے "الا ما ظھر منھا" سے عورت کا منہ اور ہاتھ مراد لیا ہے، اور صاف لفظوں میں یہ لکھا ہی کہ عورت کو اجنبی مرد کے سامنے بلاضرورت منہ کھولنا جائز ہی۔ احادیث صحیحہ اور تعامل زمانہ نبوی اور صلحاء سلف سے بھی اسکی تائید ہوتی ہی اور انسانی حریت اور اسکا اشرف المخلوقات ہونا بھی اسی بات کا مقتضی ہی کہ اسکو مقید و محبوس کرکے اُسکی حریت کو صدمہ نہ پہنچایا جائے، اور ایک شریف الخلقت دوسرے شریف الخلقت سے باطمینان و امانت کام لے۔ چنانچہ ہم چند مستند تفسیروں کی عبارتیں "الا ما ظھر منھا" کے متعلق، ناظرین کے اطمینان کے لیے درج کرتے ہیں۔

اور (کرتوں) کے گریبان سامنے ہونے کی وجہ سے اُن کی گردنیں اور ہار کھُلے رہتے تھے۔
لہذا اُنکو حکم دیا گیا کہ اپنے دوپٹوں کے آنچل گریبانوں پر ڈال لیا کریں، تاکہ گردن، سینہ، اور اُنکے آس پاس کی چیزیں، یعنی، بال، اور گلے اور کانوں کے زیور، اور گھنڈی لگانے کی جگہ چھپ جایا کرے۔ لفظ "ضرب" سے آنچلوں کے ڈالے رہنے میں مبالغہ مقصود ہے، اور بخمرہن میں بار الصاق ہی (یعنی دوپٹے ہروقت گریبانوں سے ملے رہیں)

حضرت عائشہ سے روایت ہی کہ میں نے نساء انصار سے زیادہ نیک کوئی عورت نہیں دیکھی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی، تو اُن میں کی ہرایک عورت اپنی چادر کی طرف لپکی، اور اُسکو پھاڑ کر (فوراً) اوڑھ لیا، اور وہ ایسی ہوگئیں کہ گویا اُنکے سروں پر کوّے بیٹھے ہیں[۱]۔

قولہ تعالےٰ "لا یبدین زینتھن" یعنی "عورتیں اپنی زینت ظاہر نکریں"

جاننا چاہیے کہ خدا "زینت مطلقہ" کے احکام (پہلے "لا یبدین زینتھن میں) بیان فرماچکا، تو (اس دوسری "لا یبدین زینتھن" میں) "زینت خفیہ[۲]" (یعنی جو چیزیں آنچل سے چھپانا فرض ہیں) کے متعلق احکام بیان فرمائے، جسکا اجانب کے سامنے کھولنا ممنوع ہی۔ اور بیان فرمایا کہ اس "زینت خفیہ کا چھپانا سب سے واجب ہی، مگر بارہ[۱۲] صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

---

[۱] اصل عربی محاورہ "فاصبحن علیٰ رؤسھن الغربان" ہی۔ اہل عرب اس ضرب المثل کو اس موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ جب کسی کی حد درجہ کی اطاعت کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہی، یعنی: اُنکا سر تسلیم اسدرجہ جھکا ہوا ہے کہ گویا اُنکے سر پر کوئی جانور بیٹھا ہوا ہی، اور وہ اپنی ذرا سی حرکت سے بھی اُس جانور کے اُڑجانیکا خوف کرتے ہیں۔ اختر۔

[۲] زینت خفیہ سے وہ حصہ بدن اور وہ چیزیں مراد ہیں، جن پر دوپٹے ڈالے رہنے کا حکم دیا گیا ہے، مثلاً سینہ، گردن، اور زیور وغیرہ۔ اور صرف یہی وہ زینت ہے جسکا اجنبیوں پر ظاہر کرنا منع کیا گیا ہے، اور ماں باپ، خاوند اور قریبی رشتہ دار اس سے بھی مستثنیٰ ہیں، اسلیے کہ مواقع ستر کا پوشیدہ رکھنا تو انسان کو اپنی ذات سے بھی فرض ہی اس میں اجانب اور محارم کی کوئی خصوصیت نہیں اور منہ اور ہاتھ کا اجنبیوں کے سامنے کھولنا قرآن سے ثابت ہی۔ اب صرف ایک چیز "زینت خفیہ" باقی رہگئی ہی جس کی اجانب کے سامنے

(۱) پہلی صورت ۔ عورتوں کے خاوند ۔

(۲) دوسری صورت ۔ عورتوں کے باپ ، اس میں باپوں کے باپ اور ماؤں کے باپ اور پھر اُنکے باپ سب شامل ہیں ۔

(۳) تیسری صورت ۔ شوہروں کے باپ ۔

(۴ و ۵) چوتھی اور پانچویں صورت ۔ عورتوں کے خود اپنے بیٹے ، اور خاوندوں کے بیٹے ، اس میں اولاد کی اولاد بھی داخل ہے ، خواہ وہ بیٹوں سے ہو ، یا بیٹیوں سے جیسے پوتے اور نواسے ۔

(۶) چھٹی صورت ۔ خواہ وہ باپ کی طرف سے بھائی ہوتے ہوں ، یا ماں کی طرف سے ، یا دونوں طرف سے ۔

(۷) ساتویں صورت ۔ عورتوں کے بھتیجے ۔

(۸) آٹھویں صورت ۔ عورتوں کے بھانجے ۔

بقیہ نوٹ صفحہ (۲۰) کھولنے کی ممانعت کی گئی ہے ، اور صرف یہی وہ حکم حجاب ہے جسکے سمجھنے میں ہندوستان کے مسلمان مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں ، اور افسوس ہے کہ بعض عالی دماغ اشخاص اپنی اس غلط فہمی کو فطرت اور سائنس نیچر سے ثابت کرنیکی کوشش کرتے ہیں ۔ اول وہ یہ تو ثابت کریں کہ یہ موجودہ پردہ اصول اسلام میں سے ہے بھی ، پھر شیریں مقالی اور شاعرانہ خیالات سے کام لیں ۔ ہم تو جب قانون ابداع خلق پر نظر ڈالتے ہیں ، تو ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ خدا نے ہر چیز کو خود پردہ سے باہر کیا ہے ، اور بس ایک اُس کی ذات حقیقی پردہ میں رہی ہے ، اور وہ بھی پردوں میں سے جھلک رہی ہے ، اُس حقیقی بے پردگی پر ، جو لفظ "کن" سے ہوئی ہے ، کسی کو پردہ ڈالنے کا اختیار نہیں ہے ، اسلیے کہ اشیا میں اباحت اصلی ہے ، اور قیودات اجتماعی مصلحتی و صحی عارضی ہیں ، افعال کے حسن و قبح کو ، جہانتک نیچر سے تعلق ہے ، اُسکو کوئی نہیں جان سکتا ، بجز اُسکے کہ اضافی حُسن و قبح کو جان سکیں ۔ اگر ایسا نہوتا تو آج تمام دنیا کی عورتیں .... اس پردہ کے صدقہ میں زندہ درگور ہوتیں ، اور دنیا کی تمام قومیں اس حبس دوام کا گیت گایا کرتیں حالانکہ ایسا نہیں ہے ، اور دوسری اقوام کی عورتیں اپنی فطرتی آزادی پر ہیں ۔ اور اسلام نے بھی اُتنی ہی روک تھام کی اجازت دی ہے ، جتنی اضافی تہذیب سے تعلق رکھتی ہے ، اور وہ یہ ہے کہ عورتیں مہذب (ساتر) لباس میں دنیا کی ہوا کھایا کریں ، اور اُن کی اس فطری آزادی پر کوئی تعرض نہو ۔ خضر

وہ سب مرد جو ان آٹھوں صورتوں میں بیان ہوئے ہیں محارم ہیں۔ یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) پہلا سوال۔ کیا محرم مردوں کو مملوکہ اور غیر مؤمنہ کا وہ حصۂ بدن دیکھنا بھی جائز ہی جو مؤمنہ کا نہیں دیکھا جا سکتا؟

جواب۔ اگر کوئی شخص کسی ایسی عورت کا مالک ہوجائے، جو اُس کی محرم ہی، تو اُسکا شکم و پشت دیکھ سکتا ہے، بنظر شہوت نہیں، بلکہ احتیاط ملک کی غرض سے، جو مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔

(۲) دوسرا سوال۔ چچا اور ماموں کا کیا حکم ہی؟ (کیونکہ بظاہر وہ ان مستثنیات میں بیان نہیں کیئے گئے)

جواب۔ حسن بصری کہتے ہیں کہ بظاہر "چچا اور ماموں" سے بھی "زینت خفیہ" کے نہ چھپائے جانے میں تمام محارم کا سا حکم ہے۔ وہ اس کی دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ اس آیت میں "رضاعت" کا حکم بھی تو نہیں بیان کیا گیا، حالانکہ وہ بھی نسبت کا حکم رکھتا ہے۔ اور نیز سورۂ احزاب میں (جہاں خدا نے محارم کو گنایا ہی) وہاں لاجناح علیھن فی اٰباءھن، ولا ابناءھن، ولا اخوانھن، ولا ابناء اخوانھن، ولا ابناء اخواتھن، ولا نساءھن، ولا ماملکت ایمانھن" کے ساتھ "شوہروں" اور "شوہروں کے بیٹے" کا ذکر نہیں کیا ہی، بلکہ اُن کا ذکر سورۂ نور میں کیا ہی۔ اور کبھی بعض کے ذکر سے تمام کا حکم معلوم ہوجایا کرتا ہی۔

شعبی کہتے ہیں کہ خدا نے "چچا اور ماموں" کا ذکر اس لیے نہیں کیا ہے کہ کہیں یہ "چچا اور ماموں" اپنی "بھتیجی" اور "بھانجی" کے حسن و جمال کی تعریف اپنے بیٹوں سے نکردیں!! اور اسکے معنی یہ ہیں کہ تمام (مذکورۂ بالا) رشتوں میں باپ اور بیٹے محرمیت میں یکساں شریک ہیں، مگر "ماموں" اور "چچا" اور "اُنکے بیٹے" محرمیت میں برابر نہیں، باپ کے دیکھنے کے بعد یہ بات ممکن ہی کہ وہ اپنے بیٹے سے، کہ جو اُس عورت کا محرم نہیں ہی، اُسکی تعریف کردے،

اور بیٹے کے دل میں اُسکا ایسا تصور بندھ ہے کہ وہ اُسکے دیکھنے کا مشتاق ہوجاوے[۵] - یہ بھی پردہ میں وجوب احتیاط کی ایک بڑی دلیل ہے -

[۵] امام رازی نے سورۂ احزاب کی تفسیر میں "چچا اور ماموں" کو محارم میں اس طرح شمار کیا ہے کہ "آیت میں "چچا" اور "ماموں" کے مذکور نہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا حکم "بھتیجوں" اور "بھانجوں" پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اسلیے کہ بھتیجوں" کے پھوپیوں کے حق میں محرم ہونیسے خود بخود یہ سمجھا جاتا ہے کہ "بھتیجیاں" بھی چچا کے حق میں محرم ہیں، اور علیٰ ہذا ماموں کا حکم ہے"

لیکن اگر شعبی کی رائے کو کچھ وقعت دیجائے، تو معلوم نہیں کہ "بھتیجے" اور "بھانجے" جو اپنی پھوپیوں اور خالاؤں کے مسلم محرم ہیں، اُنکی نسبت اس امر کا کیا قطعی یقین ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں سے، جو اُنکی پھوپیوں اور خالاؤں کے محرم نہیں ہیں، اُنکے حسن و جمال کو بیان نہیں کرینگے - علاوہ ازیں، عورتیں بھی تو حسن و جمال کا ادراک اسی طرح کرتی ہیں جیسے مرد - پھر پھوپی اور خالہ سے کیا اطمینان ہوگیا ہے کہ وہ اپنے بیٹوں سے اپنی بھانجی اور بھتیجی کے حسن و جمال کا ذکر نہیں کرینگی؟ اور نیز "باپ اور بھائی" کی نسبت کیا اطمینان ہوگیا ہے کہ اگر وہ خود بھی اپنی بیٹی یا بہن" کو کسی لائق و شریف اور دولتمند شخص کی بی بی بنانے کی غرض سے اُسکی لیاقت اور حسن و جمال کا تذکرہ کسی اجنبی سے کردیں؟ اگر یہی احتمال پرستی ہے، تو آج شریعت اسلامی کے تمام اصول "ہباءً منثوراً" ہوئے جاتے ہیں، اور تمام انسانی تمدن و تہذیب کی بنیاد اس احتمالی شریعت کے ہاتھوں برباد ہوئی جاتی ہے -

لیکن علامہ ابوالسعود نے اپنی تفسیر میں "چچا اور ماموں" کے عدم ذکر کی ایک نہایت عمدہ وجہ لکھی ہے - وہ سورۂ احزاب کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "چچا، اور ماموں، کا ذکر اسلیے نہیں کیا گیا کہ وہ دونوں تو مثل باپ کے ہیں، اور خدا نے خود چچا کو باپ کا نام دیا ہے، جہاں اُسنے (جناب رسالت مآب کو خطاب کرکے فرمایا ہے والٰہ ابائك ابراہیم و اسمٰعیل اسحٰق یعنی - تمہارے باپ ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق کا خدا" اور یہ ظاہر ہے کہ جناب رسالت مآب حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں ہیں، اور حضرت اسحاق اُنکے سوتیلے بھائی ہیں، جو اس رشتہ سے آنحضرت کے چچا ہوتے ہیں، اور خدا نے اُن کی نسبت "باپ" کا لفظ استعمال کیا، حیرت کی جگہ ہے کہ کہیں باپ بھی اپنی بیٹیوں کے حسن و جمال کے قصے گاتے پھرا کرتے ہیں -

ان سب باتوں کو جانے دو، اور ذرا قرآن میں غور کرو، تو وہاں "چچا اور ماموں" کی محرمیت کا ذکر صاف صاف لفظوں میں ملتا ہے، جہاں خدا فرماتا ہے حرمت علیکم امھتکم، وبنٰتکم واخوٰتکم، وعمّٰتکم وخٰلٰتکم، وبنٰت الاخ وبنٰت الاخت الخ (سورۂ نساء، آیت ۲۳) یعنی (مسلمانو) تمہاری مائیں، اور تمہاری بیٹیاں، اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپیاں، اور تمہاری خالائیں، اور بھتیجیاں، اور بھانجیاں (یہ سب، تم پر حرام ہیں -

خداوند تعالیٰ نے صاف طور سے "بھتیجیوں اور بھانجیوں" کو "ماموں اور چچا" پر حرام کیا ہے، اور یہ اصول فقہ کا مسئلہ ہے کہ جن عورتوں سے کسی صورت میں نکاح جائز نہیں، وہ مردوں کی محرم ہیں، اور محرموں سے پردہ نہیں، (ختم)

(۳) تیسرا سوال - اُن مردوں کو (جو اس آیت میں مستثنےٰ کیے گئے ہیں) عورت کے مواقع زینت کا دیکھنا کیوں جائز ہے؟

جواب - اس جواز کی وجہ یہ ہی کہ اُن مردوں کو خصوصیت کے ساتھ، عورتوں کے پاس آنے جانے اور ملنے جلنے[1] کی ضرورت پڑتی ہی، اور نیز اسوجہ سے کہ اُن مردوں کی طرف سے فتنہ کا اندیشہ بھی کم ہے اور نیز اسوجہ سے کہ جنبیوں سے خلا ملا کرنے میں ایک منافرت ہوا کرتی ہی، اور نیز عورت سفر میں، سوار کرانے اور اُتارنے کے لیے، ان مردوں کی معیت کی محتاج ہے۔

(۹) نویں صورت، "نسائہن" ہے۔ یعنی "اپنی جیسی عورتیں"۔ اسمیں دو قول ہیں۔

پہلا قول۔ "نسائہن" سے وہ عورتیں مراد ہیں جو اُن کی ہم مذہب ہوں، اکثر سلف کا یہی

---

[1] اگر ان مستثنےٰ صورتوں میں، عورت مرد کی بے تکلفی سے آمنے سامنے ہونیکی یہی وجوہ ہیں، جو امام رازی نے لکھی ہیں (اور فی الاصل یہی ہیں بھی) تو جہاں کہیں اُنکے بیان کردہ وجودی اور سلبی وجوہ پائی جائیں وہاں حکم بھی یہی ہونا چاہیے لہذا اگر استنباطاً یہ کہا جائے کہ امام رازی کی یہ رائے ہی کہ اگر باقتضائے ضروریات جنبیوں سے ملنا پڑے، یا جنبیوں کی دیانت و تہذیب نفوس سے کسی شر کا اندیشہ نہو۔ طبیعتوں میں منافرت نہو، یا سفر کی ضرورتیں مجبور کرتی ہوں۔ تو جنبیوں کے سامنے بھی اُسی بے تکلفی سے آنا جائز ہی۔ تعجب ہے اس آزاد مرد کی رائے پر!! بلکہ قرآن سے بھی صراحتہ یہی ثابت ہوتا ہی کہ ضرورت کے وقت اجانب کے ساتھ اسقدر آزادی سے ملنے کی اجازت دی گئی ہے، جیسے محارم سے۔ خدا نے ایسے اجانب کو، جنکو اپنی ضرورت سے عورتوں سے ملنا پڑے، یا جنسے عورتونکو اپنی ضرورت سے ملنا پڑے، سلسلہ بیان میں محارم کے ساتھ ذکر کیا ہی۔ اور "اوالتابعین غیر اولی الاربتہ" کو ذکر سلسلۂ محارم میں بیان کرنے سے صاف یہ مطلب ہے کہ جو اجانب "اربت فی النساء" کی نیت سے خلا ملا نہ رکھتے ہوں، اُنکے سامنے "زینت خفیہ" کے بے پردہ ہوجانے میں بھی کچھ حرج نہیں، جیسے باپ بھائی، بھتیجے بھانجے وغیرہ کے سامنے، کہ اُنسے بے تکلف ہوئے بغیر چارہ نہیں "تابعین غیر اولی الاربتہ" کو اصلی حق عموم تو یہ حاصل ہی جو ہم نے بیان کیا، اور خدمتگار یا طفیلی وغیرہ بھی اُس کی شاخیں ہیں، اسلیے کہ اگر کسی عورت کا لاکھ دو لاکھ کا تجارتی کاروبار ہو، اور سو دو سو روپیہ ماہوار کے اُسکے ملازم اور ایجنٹ ہوں، تو ظاہر ہی کہ وہ اُسکے طفیلی یا دریوزہ گر تو ہیں نہیں، بلکہ اُسکے "تابعین غیر اولی الاربتہ" ہیں، جو "اربت فی النساء" کی غرض سے اُس سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ ایک کسب حلال کی غرض سے اُس سے تعلق رکھتے، اور حساب کتاب سمجھانے کی غرض سے اُس سے مواجہہ اور مکالمہ کی ضرورت رکھتے ہیں، تو اس قسم کی صورتوں میں عورتیں بے تکلفی کے ساتھ اجانب دوں سے مل سکتی ہیں۔ اور "اوالتابعین غیر اولی الاربتہ" کا یہی مفہوم ہی۔ (ختمر)

قول ہے - ابن عباس کہتے ہیں کہ مسلمان عورتوں کو ذمی عورتوں میں کپڑوں سے کھلی نہیں رہنا چاہیے، اور غیر مسلم عورتوں کے سامنے اُتنا ہی حصۂ جسم (یعنی مُنہ اور ہاتھ) ظاہر کرے جتنا اجنبی مردوں کے سامنے ظاہر کرسکتی ہے، مگر یہ کہ وہ غیر مسلم عورت اُس کی باندی ہو، اسلیے کہ خدا نے (مستثنیٰ صورتوں میں) فرمایا ہے کہ "او ما ملکت ایمانھن" یعنی - عورت کو اپنے باندی غلام پر زینت خفیہ کا ظاہر کرنا جائز ہے -

حضرت عمر نے ابو عبیدہ کو لکھا تھا کہ وہ اہل کتاب کی عورتوں کو مسلمان عورتوں کے ساتھ حمام میں داخل ہونے سے منع کریں -

دوسرا قول "نسائھن" سے تمام (مسلمہ وغیر مسلمہ) عورتیں مراد ہیں، یہی ٹھیک مذہب ہے، اور سلف کی رائے استحباب و اولویت پر محمول ہے -

(۱۰) دسویں صورت - "ما ملکت ایمانھن" ہے - یعنی - عورتیں اپنے باندی و غلام پر زینت خفیہ ظاہر کرسکتی ہیں - ظاہر کلام باندی اور غلام دونوں کو شامل ہے، لیکن اس میں اختلاف ہے - بعض آیت کو اُسکے ظاہر الفاظ پر محمول کرتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ عورتوں کو اس بارے میں کوئی ممانعت نہیں ہے کہ وہ اپنے غلاموں پر اپنی اُس زینت کو ظاہر کریں جو محارم پر ظاہر کرسکتی ہیں، یہ قول حضرت عائشہ اور ام سلمہ سے مروی ہے، اور ظاہر آیت سے بھی اسی پر دلیل لاتے ہیں - اور نیز حضرت انس سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآب حضرت فاطمہ کے پاس ایک غلام کو ساتھ لیے ہوئے، جو اُنکو ہبہ کردیا تھا، تشریف لائے - حضرت فاطمہ (اسوقت) ایسی چادر اوڑھے ہوئے تھیں کہ اگر اُس سے سر ڈھکتی تھیں تو پیروں تک نہیں پہنچتی تھی، اور اگر پیر ڈھکتی تھیں تو وہ سر تک نہیں پہنچتی تھی، جب آپ نے یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا کہ "اس (چادر سے بدن نہ چھپا سکنے) میں کوئی قباحت نہیں، اسلیے کہ ایک تمہارا باپ ہے، اور دوسرا تمہارا غلام ہے" مجاہد سے روایت ہے کہ امہات المومنین اپنے مکاتب سے جسپر ایک درہم بھی باقی رہجاتا تھا، پردہ نہیں کرتی تھیں - حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ

انہوں نے (اپنے غلام) ذکوان سے کہا کہ "جب تو مجھے قبر میں رکھکر باہر نکلے تو تو آزاد ہے"
اور نیز مروی ہے کہ حضرت عائشہ کنگھی کرتی رہتی تھیں، اور غلام اُن کو دیکھتا رہتا تھا۔ ابن
مسعود، مجاہد، حسن، ابن سیرین، اور سعید ابن مسیب کہتے ہیں کہ غلام اپنی سیدہ کے
بال نہ دیکھے، امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔ ان لوگوں نے کئی باتوں سے (اپنے قول پر)
استدلال کیا ہے۔

اول۔ جناب رسالت مآب کا ارشاد ہے کہ "جو عورت خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتی
ہے، اُسکو سوائے محرم کے دوسرے (مرد) کے ساتھ تین دن سے زیادہ سفر کرنا جائز
نہیں" اور ظاہر ہے کہ غلام اپنی سیدہ کا ذی محرم نہیں ہے، لہذا غلام کو اُسکے ساتھ سفر کرنا
بھی جائز نہیں، اور جب غلام کو اپنی سیدہ کے ساتھ سفر کرنا جائز نہوا تو اجنبی آزاد مرد کی طرح
اُسکے بالوں کا دیکھنا بھی درست نہوا۔

دوم۔ کسی غلام پر ملکیت ہوجانے سے عورت کو وہ باتیں اُسکے ساتھ جائز نہیں
ہوجاتیں جو قبل ملکیت حرام تھیں۔ پس اگر عورتیں مردوں کی مالک ہوں تو یہ ملکیت مردوں کی
ملکیت للنساء کے ہم مثل نہوگی۔ تمام علماء اسپر متفق ہیں کہ عورت کو حق ملکیت سے اپنے غلام
کے ساتھ تمتع جائز نہیں، جیسے مرد کو حق ملکیت سے اپنی باندی کے ساتھ تمتع جائز ہوجاتا ہے۔

سوم۔ اگرچہ غلام کو اپنی سیدہ سے نکاح کرنا جائز نہیں، مگر یہ حرمت نکاح ایسی ہی عارضی ہے،
جیسے کسی مرد کے نکاح میں چار عورتیں ہوں، اور اُنکی موجودگی میں پانچویں سے نکاح ناجائز ہو
پس جب یہ حرمت نکاح دوامی نہیں تو غلام بھی (اپنی سیدہ کے حق میں) بمنزلہ دوسرے اجانب کے ہوا
جب یہ ثابت ہوگیا تو صاف طور سے معلوم ہوگیا کہ "وما ملکت ایمانھن" سے صرف باندیاں مقصود ہیں۔

(۱۱) گیارہویں صورت "او التابعین غیر اولی الاربۃ[۱] من الرجال" ہے۔ یعنی۔

---

[۱] الارب: الحاجۃ، والولوع بالشئی، والشھوۃ لہ، الاربۃ الحاجۃ فی النساء۔ الاربۃ العقل، ومنہ الاریب۔
"ارب" کسی شئے کی حاجت، خواہش۔ "اربۃ" حاجت فی النساء۔ "اربۃ" عقل، اسی سے "اریب" بمعنی عقلمند ہے۔ د اختر

(عورتیں اپنی زینت خفیہ کو ایسے اجنبی) متوسلین مردوں پر (ظاہر کر سکتی ہیں) جو بلا (نیت) خواہش شہوت (ساتھ رہتے) ہیں"۔ اس صورت میں بھی چند مسائل ہیں۔

پہلا مسئلہ۔ بعض علماء کا قول ہے کہ "التابعین غیر اولی الاربۃ من الرجال" سے وہ مراد ہیں جو تمہارے فضل وجود کے امیدوار بنکر تم سے وابستہ رہتے ہوں، اور اُن کو عورتوں سے کچھ غرض واسطہ نہو۔ یا تو اسوجہ سے کہ وہ اپنی بلاہت اور سادگی سے عورتوں کی کسی بات کو جانتے نہوں، یا ایسے نیک مزاج پیر مرد ہوں کہ جب عورتوں کے ساتھ رہیں تو اپنی آنکھیں نیچی کر لیتے ہوں، اس بات کو سب جانتے ہیں کہ خصی، عنین (جو مرد وجوہ خارجی سے جماع پر قادر نہو) اور اُن جیسے مردوں کو نفس جماع کی طرف تو خواہش اور توجہ نہیں ہوتی لیکن اسکے علاوہ (دیکھ بھال اور تلذذ عیش کے) انتفاع کی قوی خواہش ہوتی ہے، (لہذا) اس قوت خواہش کی موجودگی کی وجہ سے ایسے مرد تو اس آیت میں مراد نہیں ہو سکتے، پس ضرور ہوا کہ آیت میں ایسے مرد مراد لیے جائیں، جن کی نسبت یہ معلوم ہو کہ وہ بجمیع وجوہ عورتوں سے تمتع کی خواہش نہیں رکھتے، یہ عدم خواہش فقدان شہوت کی وجہ سے ہو، یا سرے سے اس فعل سے وقفیت ہی نہو، یا فقر و مسکنت اسکا باعث ہو۔ ان تینوں وجوہ کو پیش نظر رکھکر علماء اس مسئلے میں باہم مختلف الرائے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ "عورتوں سے خواہش نہ رکھنے والے مرد" فقراء اور محتاج لوگ ہیں، جنکو فاقہ نے ستا رکھا ہو، اور بعض کا قول ہے کہ وہ مفقود العقل اور مختل الحواس اور ابلہ اور لڑکے ہیں۔ اور بعض کی یہ رائے ہے کہ (غیر اولی الاربۃ) میں بوڑھے اور تمام وہ لوگ داخل ہیں، جو شہوت سے محروم ہوں (علاوہ ازیں) اس میں اس قسم کی اور تمام صورتیں داخل ہوسکتی ہیں۔[۱]

---

[۱] اُو التابعین غیر اولی الاربۃ من الرجال" کے الفاظ پر غور کرنیسے، اور اس نظم کلام اور سلسلہ بیان پر غور کرنے سے کہ اُنکو محارم کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ "غیر اولی الاربۃ" کے معنی شیخ فانی یا مفقود الشہوت کے نہیں ہیں، اسلیے کہ محارم مذکورہ فی الآیت اور تابعین غیر اولی الاربۃ پر کشف زینت خفیہ کی علت ایک ہے،

ہشام بن عروہ نے زینب بنت ام سلمہ سے، اور انھوں نے ام سلمہ سے روایت کی ہے کہ جناب رسالت مآب ام سلمہ کے ہاں تشریف لائے، ام سلمہ کے پاس (ہیئت نامی) مخنث بھی موجود تھا۔ اُس مخنث نے ام سلمہ کے بھائی (عبداللہ بن امیہ) کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ "عبداللہ! اگر خدا نے تم مسلمانوں کو کل طائف کی فتح نصیب کی، تو میں تمکو بنت غیلان دکھلاؤں گا، (وہ بنت غیلان جسکی صفت یہ ہے) کہ اگر سامنے پھر کر کسی کو دیکھتی ہے تو چار بل اسکے پیٹ میں پڑ جاتے ہیں، اور جب پیچھے پھر کر دیکھتی ہے تو پٹڑوا اور کولے میں آٹھ بل پڑجاتے ہیں۔ آپ نے اس مخنث کے یہ الفاظ سنکر فرمایا کہ "(اب سے) یہ مخنث تمہارے پاس کبھی نہ آیا جایا کرے"۔

نوٹ بقیہ صفحہ (۲۷) اور وہ علت اقتضائے ضرورت وحاجت ہے، اسلیے کہ اُن تمام افراد میں، جو بذریعہ حرف "او" بیان کیے گئے ہیں، ایک ہی علت مشترک نکل سکتی ہے۔ ورنہ جو بات خاوند کے ساتھ جائز ہوسکتی ہے، وہ باپ بھائی کے ساتھ جائز نہیں ہوسکتی۔ لہذا "تابعین" پر کشف زینت خفیہ کی علت "عدم اربت فی النساء" نہیں ہوسکتی، اسلیے کہ

(۱) یقیناً یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ان تابعین کے دلوں میں چور نہیں، اور یہ عورتونکو بنظر شہوت نہیں دیکھتے؟

(۲) اور اگر "غیر اولی الاربۃ" کے معنی مفقود الشہوت کے لیے جائیں، توکیا اسپر طبی صداقت وشہادت کے بعد عمل کیا جائیگا؟ جو قریباً ناممکن ہے۔

(۳) اور یا جو "عدم اربت" فقر ومسکنت کیوجہ سے ہوگی، وہ ہمیشہ بحالہ قائم رہیگی؟ کہ پیٹ بھرنے کے بعد بھی اُن کو عورتوں سے غرض نہوگی۔

(۴) اور یا فقدان عقل واختلال حواس کے بعد "اربت فی النساء" نہیں رہتی؟ حالانکہ ہزارہا مفقود العقل اور مختل الحواس لوگ صاحب اہل وعیال دیکھے جاتے ہیں۔

(۵) اور کیا محارم میں "اربت فی النساء" نہیں ہوتی، بلکہ اُن کی "اربت فی النساء" تو محرمات تک پہنچ جاتی ہے۔ اور ہزارہا واقعات محارم کے محرمات کے ساتھ ملوث ہونے کے سُننے گئے ہیں، جسکا نتیجہ لزوماً یہ ہونا چاہیے تھا کہ "عدم اربت" کی وجہ سے جو بات اجازت سے رکھی گئی تھی، "وجود اربت" کی وجہ سے، اسکے خراب نتائج دیکھنے کے بعد، محارم سے وہ بات ناجائز کردی جاتی، حالانکہ اس تلوث بمحرمات کے بعد کسی مفتی نے محارم پر عدم کشف زینت خفیہ کا فتویٰ نہیں دیا۔

یہی وہ تمام صورتیں "عدم اربت فی النساء" کی ہیں، جو امام صاحب نے بیان کی ہیں، اُن مذکورہ بالا

جناب رسالت مآب نے عورتوں کے پاس اُس مخنث کا آنا جانا اُسوقت تک جائز رکھا، جب تک یہ خیال رہا کہ وہ از قبیل "غیر اولی الاربتہ" ہی، یعنی اسکو عورتوں کی طرف میلان نہیں، مگر جب آپ کو اُس کی باتوں سے یہ مفہوم ہوا کہ وہ عورتوں کے اوصاف و احوال کو پہچانتا ہے، اور از قبیل "اولی الاربتہ" ہے تو اُسکو عورتوں کے پاس آنے جانے سے منع کر دیا۔

خصی اور مجبوب (مقطوع الذکر) کے بارہ میں بھی تین مختلف رائیں ہیں،

(۱) بعض کہتے ہیں کہ خصی اور مجبوب دونوں کے سامنے زینت باطنہ (یعنی وہ مواقع زینت جن پر آنچل ڈالے رہنے کا حکم ہی) ظاہر کرنا جائز ہی۔

بقیہ نوٹ صفحہ (۲۷) جرح ہوسکتی ہی اسلیے ہم کو لازم ہوا کہ اس آیت کے الفاظ پر غور کریں، اور دیکھیں کہ یہ تمام صورتیں۔ فقدان شہوت، فقر و مسکنت، اور اختلال و فقدان عقل وغیرہ "غیر اولی الاربتہ" سے ہی نکلتی ہیں یا نہیں، تمام بحث لفظ "غیر اولی الاربتہ" پر ہے اور اسی پر غور کرنا چاہیے۔ لفظ "غیر" کے دو اعراب ہیں۔ (۱) مجرور بربنائے صفیت (۲) یا منصوب بربنائے حال۔

(۱) مجرور ہونے کی حالت میں "تابعین" موصوف ہوگا۔ اور "غیر اولی الاربتہ" اُسکی صفت۔ لیکن یہ قید واقعی ہوگی نہ کہ احترازی جس سے "تابعین اولی الاربتہ" کا علیحدہ کرنا مقصود ہو، اسلیے کہ "تابعین" کہتے ہی اُنکو ہیں، جو "اربت فی النساء" کی غرض سے ساتھہ نہ رہتے ہوں، بلکہ دوسرے کار بار اور ضروریات کی انجام دہی کے لیے اُنسے سابقہ ہو۔

(۲) اور منصوب علی الحال ہونیکی صورت میں یہ معنی ہونگے کہ جنکی معیت و تبعیت اس حیثیت اور غرض سے نہ ہو، کہ اُنکے دل نظر بازی اور تلذذ فی النساء اور شہوت رانی کے خیالات سے مملو ہوں، بلکہ اُن اجنبیوں کا ملنا جلنا انجام مرام دنیاوی کے لیے ہو، اسلیے کہ شریعت اسلامی معاشرت دنیاوی کو تنگ کرنے والی نہیں ہے، اور نہ اُسمیں عورتونکو دنیاوی کاروبار کرنے کی ممانعت ہی، اور نہ حفظ ناموس کا کہیں یہ طریقہ تبلایا گیا ہے کہ عورتوں کو محبوس رکھا جائے، بلکہ صرف تہذیب نفوس اور آنکھوں کی حیا کی تعلیم دی گئی ہی، اور اسی کو تزکیہ بخشش نفوس کہا گیا ہی، جہاں خدا نے فرمایا ہی کہ "ذٰلک ازکیٰ لھم"، ورنہ محبوس و مقید رکھنے کے بعد جو حفاظت ناموس کرائی جائے وہ شرافت انسانی کی معیار نہیں کہی جاسکتی، اسلیے کہ نہ اُسمیں اطاعت حکم خدا ہوگی، نہ خاوند کے حقوق کی نگہداشت اُسکی علت ہوگی، اور نہ فی نفسہ اُسکی اخلاقی جرأت ہوگی، بلکہ نری بے بسی ہوگی، جسکی شرع میں کچھ عزت نہیں، اسلیے کہ اس سے اسلام کی تہذیب نفوس پر کچھ حکومت نہیں معلوم ہوتی، بلکہ اُس کی یہی مثال ہی جیسی غیر قومیں مسلمانونکی بہت سی بے عنوانیوں اور درشتیوں کو دیکھکر یہ الزام لگاتی ہیں کہ مذہب اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا ہے، اسلیے کہ اگر اس میں کوئی خوبی ہوتی، تو وہ خود بخود لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیتا۔ مسلمانوں نے اسلام کو بہت بدنام کر لیا ہی، لہذا اب اُن کو چاہیے کہ اس حبس نسوان کو دور کرکے اسلام کے چہرے سے خونخواری کا دھبہ دور کرنے کی کوشش کریں۔ "ختم"

(۲) بعض کے نزدیک دونوں (خصی اور مجبوب) پر ظاہر کرنا ناجائز ہے۔

(۳) بعض کا قول ہے کہ خصی کے سامنے ظاہر کرنا تو ناجائز ہے، مگر مجبوب کے سامنے ظاہر کرنا جائز ہے۔

(۱۲) بارہویں صورت۔ قولہ تعالےٰ "او الطفل الذین لم یظہروا علیٰ عورات النساء"
یعنی (عورتوں کو اپنی زینت باطنہ کے مواقع ایسے) لڑکوں کے سامنے (کھولنا جائز ہیں) جو عورتوں کی شرمگاہ (کے افعال) سے (ابھی تک) آگاہ نہیں۔ اس صورت میں بھی چند مسائل ہیں۔

پہلا مسئلہ (آیت میں لڑکوں کی نسبت جو "لم یظہروا" استعمال کیا گیا، سو یہ "ظہور علی الشیے" دو قسم پر ہوتا ہے۔

(الف) "ظہور" کے معنی صرف کسی شئے پر واقف ہونا ہیں، جیسے خدا کے اس (دوسرے) قول میں مراد ہیں "انھم ان یظہروا علیکم یرجموکم" یعنی "اگر وہ تمہیں جان لیتے، تو تم پر رجم کرتے" یہاں "یظہروالکم" بمعنی "یشعروالکم" ہے۔

نوٹ متعلق صفحہ (۲۹) اہل عرب گداز عورت کو پسند کرتے ہیں، اور انکے ہاں یہ خوبی شمار ہوتی ہے، اس مخنث نے بنت غیلان کے گداز ہونیکو ایک استعارہ میں بیان کیا ہے کہ جب وہ ادہر ادہر مڑتی ہے، تو اسکے پیٹ میں شکن پڑ جاتے ہیں۔ بنت غیلان کی شان میں یہ تعریفی الفاظ استعمال کرنیسے ہیت مخنث کی نسبت قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ "اولی الاربۃ" میں داخل تھا، اسلیے کہ اپنے قومی اور ملکی مذاق سے پورہا، بچہ، اور مرد و نامرد ہر ایک شخص واقف ہوا کرتا ہے۔ علیٰ ہذا عورتونکے حسن و جمال کی نسبت بھی اگر کسی قوم میں کوئی خاص مذاق قرار پا گیا ہو تو اسکو روزمرہ کی تحریر و تقریر میں استعمال کرنیسے اسی قوم کے کسی فرد کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسنے عورتوں کے ان خاص اوصاف کو تلذذ شہوانی کی غرض سے استعمال کیا ہے۔ پس عورتوں کی نفس خوبی و حسن کے ذکر سے کسی مخنث کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسکو عورتونکی خواہش بھی ہے، بلکہ ہیت مخنث کو عورتوں میں آنے سے منع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ زمانہ پر آشوب تھا، ہر طرف سے لڑائی جھگڑے درپیش تھے۔ اور اسکا یہ حال تھا کہ وہ عورتونکے حسن و جمال کے تذکرے کرتا پھرتا تھا، جو ایک حد درجہ کی بدتہذیبی تھی، اور جس سے بڑے فتنہ و فساد کا اندیشہ تھا لہذا اسکی طبیعت کے جادہ کو مضر خیال کر کے جناب رسالت مآب نے اسکے ساتھ زیادہ خلا ملا کرنے سے منع کیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں یہی وجہ لکھی ہے۔　"اختر"

(ب) "ظہور علی الشئی" کے دوسرے معنی ہیں کسی چیز پر غلبہ اور صولت حاصل کرنا جیسے خدا کے قول "فاصبحوا ظاھرین" میں "ظاہرین" بمعنی "غالبین" ہے۔ یعنی وہ غالب ہو گئے"۔

پس بربناے وجہ اول "عدم ظہور" کے یہ معنی ہونگے کہ ایسے لڑکے جو عورتوں کی شرمگاہوں کے تصور سے خالی الذہن ہوں، اور بچپن کی وجہ سے یہ نہ جانتے ہوں کہ وہ ہیں کیا چیز۔ ابن قتیبہ کا یہی قول ہے۔

اور بربناے وجہ ثانی یہ معنی ہونگے کہ ایسے لڑکے جو مجامعت کی طاقت و قوت نہ رکھتے ہوں یہ فرا اور زجاج کا قول ہے۔

دوسرا مسئلہ۔ جو لڑکا اپنے صغر کی وجہ سے عورتوں کی شرمگاہ کی باتوں سے واقف نہو تو عورتوں کو ایسے لڑکے سے ستر کے چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر لڑکا مراہق (قریب البلوغ) ہے، اور عورتوں کی باتوں کو جانتا ہے، تو عورت کو ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصۂ بدن اُس سے چھپانا ضرور ہے۔ (مراہق سے) باقی حصۂ بدن کے چھپانے میں دو قول ہیں۔

(۱) عورت کو مراہق سے زانو اور ناف کے درمیانی حصۂ بدن کے علاوہ چھپانا غیر ضروری ہے اسلیے کہ وہ غیر مکلف ہے۔

(۲) پورے مرد کی طرح مراہق سے چھپانا بھی ضروری ہے، اسلیے کہ اُسکو شہوت ہوتی ہے اور عورت بھی اُسکو دیکھکر مشتہات ہو سکتی ہے۔ اور یہی معنی ہیں "اوالطفل الذین لم یظھروا علی عورات النساء" کے۔

لفظ "طفل" کا اطلاق محتلم ہونے تک ہوتا ہے۔ اور بوڑھے مرد میں اگر ابھی شہوت باقی ہے تو اُسکا حکم بھی جوانوں کے مثل ہے، اور اگر شہوت باقی نہیں رہی تو اُس میں بھی دو قول ہیں۔

(۱) ایسے بوڑھے مرد کے سامنے زینت باطنہ کا اظہار جائز ہی، اور (اس بوڑھے سے) مقام ستر صرف مابین زانو و ناف ہے۔

(۲) عورت کا تمام بدن علاوہ زینت ظاہرہ، یعنی منہ اور ہاتھ کے ایسے بوڑھے سے چھپانا چاہیے۔

خدا نے جن جن مردوں پر اظہار زینت باطنہ کو جائز فرمایا ہے، اُن میں سے یہہ آخری صورت ہے۔

حسن بصری کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ تمام مستثنےٰ صورتیں جواز اظہار زینت باطنہ میں مشترک ہیں مگر تاہم اُن میں تین مدارج ہیں۔

(۱) خاوند، جسکو عورت کے ساتھ وہ امور بھی جائز ہیں، جو دوسروں کو اُسکے ساتھ جائز نہیں۔

(۲) بیٹا، باپ، بھائی، دادا، نانا، خسر، اور تمام محرم اور رضاعی رشتہ دار، جو بمنزلہ نسبی رشتہ داروں کے ہیں، ان سب کو عورت کے بال، صدر، ساقیں، باہیں اور انکے ہم مثل دوسرے اعضاء کا دیکھنا جائز ہے۔

(۳) متوسلین مرد، جو عورتوں سے غرض نہیں رکھتے، اور علیٰ ہذا عورتوں کے غلام۔

جوان عورت کو، صرف قمیص اور باریک دوپٹہ سے بدون بالائی چادر کے، ان مردوں کے سامنے آنے میں کچھ قباحت نہیں، مگر ان مردوں کو یہ جائز نہیں کہ اُنکے بال اور بشرہ کو بلا ضرورت گھورا کریں، بہر حال ان سب سے (زینت باطنہ کا) چھپانا افضل ہی۔

جوان عورت کو، بڑی چادر اوڑھے بغیر (اُس اجنبی مرد کے سامنے آنا (جو ان مستثنےٰ صورتوں میں داخل نہو) جائز نہیں۔

یہ ہیں وہ مختلف مدارج جو آیت میں مشترک البیان ہیں۔

قولہ تعالیٰ "ولا یضربن بارجلہن لیعلم ما یخفین من زینتھن"، یعنی "عورتیں (چلنے میں ایسے

ایسے دھماکے سے اپنے پیر (زمین پر) نہ رکھیں کہ لوگوں کو اُن کی اندرونی زینت (یعنی زیور) کی خبر ہو۔

ابن عباس اور قتادہ کہتے ہیں کہ نساء (جاہلیت) مردوں کے سامنے ایسے زور سے زمین پر پیر مار کر چلتی تھیں کہ اُن کی پازیبوں کی جھنکار سُنی جاتی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ پازیبوں کی جھنکار ایک مغلوب الشہوت مرد کے حق میں ایک ایسے پکارنے والے کا کام دے گی جو عورتوں کے نظارہ کے لیے بلاتا ہو۔ خدا نے "زور سے زمین پر پیر نہ مارنے" کی علت "لیعلم ما یخفین" بیان فرما کر اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ عورتوں کے دھمک کر چلنے سے اُنکے زیور وغیرہ کی زینت مردوں پر ظاہر نہ ہو جایا کرے۔

قولہ تعالیٰ "وتوبوا الی اللہ جمیعا ایھا المومنون لعلکم تفلحون" یعنی اے مسلمانو! تم سب خدا کی درگاہ میں (جاہلیت کی اُن تمام رسموں سے جنکی اصلاح اس آیت میں بیان کی گئی ہے) توبہ کرو، تاکہ تم کو فلاح و بہبود نصیب ہو۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ "اُن باتوں سے توبہ کرو، جنکو تم زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے، تاکہ دنیا و آخرت میں سعادت حاصل ہو۔" (تفسیر کبیر جلد ششم مطبوعہ مصر۔ از صفحہ ۳۷۴ تا صفحہ ۳۸۲)

اصل عربی	ترجمہ
(۱) فان قلت لم سولح مطلقاً فی الزینۃ الظاھرۃ؟ قلت لان سترھا فیہ حرج۔ فان المرأۃ لاتجد بداً من مزاولۃ الاشیاء بیدھا۔ ومن الحاجۃ الی کشف وجھھا فی الشھادۃ والمحاکمۃ والنکاح	(۱) اگر تم یہ سوال کرو کہ زینت ظاہری کے اظہار میں کیوں آسانی رکھی گئی ہے؟ تو ہم اسکا یہ جواب دینگے کہ اُسکے چھپانے میں حرج ہے اسلیے کہ عورت اپنے ہاتھوں سے چیزوں کے لین دین پر مجبور رہتی ہے، اور شہادت و محاکمہ اور نکاح کے وقت منہ کھولنے کی محتاج

وتضطر الی المشیٔ فی الطرقات
وظهور قدمیها وخاصة الفقیرات
منهن - وهذا معنی قوله تعالی
"الا ما ظهر منها" یعنی الا ما جرت
العادة والجبلة علی ظهوره والاصل
فیه الظهور - تفسیر کشاف صفحہ ۹۴۷
(۲) وقیل الزینة زینتان: ظاهرة
وباطنة - فالظاهر لا یجب سترها
ولا یحرم النظر الیها، لقوله تعالی
"الا ما ظهر منها" وفیها ثلاثة
اقاویل: احدها ان الظاهرة الثیاب
والباطنة الخلخالان والقرطان
والسواران (عن ابن مسعود) وثانیها
ان الظاهرة الکحل والخاتم والخدان
والخضاب فی الکف (عن ابن عباس)
والکحل والسوار والخاتم (عن قتادہ)
وثالثها ان الوجه والکفان (عن الضحاک
وعطا) والوجه والبنان (عن الحسن)
وفی تفسیر علی بن ابراهیم الکفان -
والاصابع (تفسیر مجمع البیان جلد
ثانی، صفحہ ۱۲۱ مطبوعہ طہران)

اور راستے میں چلنے کیوقت پیر
کھولنے پر مجبور ہی اور خصوصاً محتاج عورتیں اور
یہی معنی "الا ما ظهر منها" کے ہیں یعنی جس چیز
کے کھلے رہنے پر عادت اور جبلت جاری ہو
اور اُس کا ظاہر رہنا اصل فطرت ہو اسکا مصداق
سوائے ہاتھ اور منھ کے اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی)
(۲) زینت دو قسم کی ہے ظاہری اور
باطنی، زینت ظاہری کا چھپانا واجب نہیں
اور نہ اُسکی طرف دیکھنا حرام ہی اس میں تین
قول ہیں -
اول ابن مسعود سے روایت ہی کہ زینت ظاہری
لباس ہی، اور زینت باطنی پازیب، بالیاں،
اور کنگن ہیں - دوم ابن عباس سے روایت
ہی کہ زینت ظاہری سرمہ، انگوٹھی، رخسارے
اور ہاتوں کی سندی ہی - اور قتادہ سے روایت
ہی کہ وہ سرمہ، کنگن اور انگوٹھی ہی - سوم -
ضحاک اور عطا سے روایت ہی کہ زینت
ظاہری مونھ اور ہات ہیں - اور حسن سے
روایت ہی کہ وہ مونھ اور انگلیاں ہیں - اور
تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی ہات اور انگلیاں
اُسکے مفہوم میں داخل کی گئی ہیں -

(۳) "الاما ظهر منها" اراد به الزينة الظاهرة - واختلف اهل العلم في هذه الزينة الظاهرة التي استثناها الله تعالى قال سعيد بن جبير والضحاك والاوزاعي هو الوجه والكفان - وقال ابن مسعود هي الثياب بدليل قوله تعالى "خذوا زينتكم عند كل مسجد" - واراد به الثياب وقال الحسن الوجه والثياب قال ابن عباس الكحل والخاتم والخضاب في الكف فان من الزينة الظاهرة جاز للرجل الاجنبي النظر اليها اذا لم يخف فتنة وشهوة - فان خاف سيئاً منها غض البصر وانما رخص في هذا القدر ان تبدیه المرأة من بدنها لانه ليس بعورة - (تفسير معالم التنزيل جلد ثالث صفحہ ۳ مطبوعہ بمبئی)

(۳) خدا نے "الاما ظهر منها" سے زینت ظاہری مُرادلی ہی - علما نے اس زینت ظاہری کی تعین میں جسکو خدا نے مستثنیٰ فرمایا ہی اختلاف کیا ہی - سعید بن جبیر، ضحاک، اور اوزاعی کہتے ہیں کہ اس سے مونھ اور ہات مُرادہیں - ابن مسعود بدلیل آیت "خذوا زینتکم عند کل مسجد"، زینت ظاہری سے کپڑے مراد لیتے ہیں حسن مونھ اور ہات مُراد لیتے ہیں - ابن عباس کہتے ہیں کہ زینت ظاہری سے سرمہ، انگوٹھی اور ہاتوں کی مہندی مراد ہی اجنبی مرد کو زینت ظاہری کا دیکھنا جائز ہی، بشرطیکہ شہوت اور فتنہ کا خوف نہو اور اگر کسی بات کا اندیشہ ہو (تو زیادہ سے زیادہ) آنکھیں نیچی کرلے - عورت کو اپنا بدن کھولنے کی اس لیے اجازت دی گئی ہی کہ مونھ اور ہات داخل حجاب نہیں -

(۴) "لايبدين زينتهن الاما ظهر منها" وهو الوجه والكفان فيجوز نظره لاجنبي ان لم يخف فتنة (تفسير جلالين)

(۴) "الاما ظهر منها" سے مونھ اور ہات مراد ہیں اگر اندیشہ فساد نہو تو اجنبی مرد کو اجنبی عورت کا مونھ اور ہات دیکھنا جائز ہی -

(۵) "الاما ظهر منها" عند مزاولة الامور التي

(۵) "الاما ظهر منها"، یعنی چیزوں کے لے نے دینے کے وقت، عادۃً جو کچھ کھلا رہتا ہو،

لابد منها عادۃ۔ کالخاتم والکحل والخضاب ونحوہ فان فی سترها حرجا بینا وقیل المراد بالزینۃ مواضعها علی حذف المضاف او ما یعم المحاسن الخلقیۃ والتزیینیۃ والمستثنیٰ هو الوجه والکفان لانها لیست بعورۃ (تفسیر علامہ ابو المسعود برحاشیہ تفسیر کبیر جلد ششم صفحہ ۳۵۹)

جیسے انگوٹھی، سرمہ، خضاب، اور اور اسی قبیل کی چیزیں، اسلیے کہ اُنکے چھپانے میں صریح تکلیف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بحذف مضاف مواقع زینت مراد ہیں، یا زینت خلقی اور اکتسابی دونوں مراد لیجائیں۔ اور مستثنیٰ منہ اور ہاتھ ہیں، اسلیے کہ یہ داخل حجاب نہیں۔

(۶) فان کانت اجنبیۃ حرۃ فجمیع بدنها عورۃ ولا یجوز له ان ینظر الی شئ منها الا الوجه والکفین لانها محتاج الی ابراز الوجه للبیع والشراء والی اظهار الکف للاخذ والعطاء۔ قال القفال ومعنی قوله "الا ما ظهر منها" الا ما یظهرہ الانسان علی عادۃ الجاریۃ وذلك فی النساء الحرائر الوجه والکفان۔ (غرائب القرآن مشهور بہ تفسیر نیشاپوری)

(۶) حرۂ اجنبیہ کا تمام بدن داخل ستر ہے اجنبی مرد کو اُس میں سے کچھ بھی دیکھنا جائز نہیں، مگر مُنہ اور ہاتھوں کا دیکھنا جائز ہے، اسلیے کہ عورت بیع و شریٰ کے وقت مُنہ کھولنے کی محتاج ہے، اور لین دین کے وقت ہاتھ کھولنے پر مجبور ہے (اسی تفسیر میں دوسری جگہ، قفّال کا قول منقول ہے کہ "الا ما ظہر منہا" سے وہ حصہ بدن مراد ہے، جو عادت انسانی میں کھُلا رہتا ہو، اور حرہ عورتوں کی عادت میں منہ اور ہاتھ کھُلا رکھنا داخل ہے۔

(۷) قال ابن عباس وسعید ابن جبیر وابراهیم النخعی ونحوهم "الا ما ظهر منها" الوجه والکفان (تفسیر زاهدی)

(۷) یعنی ابن عباس، سعید ابن جبیر، اور ابراہیم النخعی کہتے ہیں کہ "الا ما ظہر منہا" سے مُنہ اور ہاتھ مراد ہیں۔

علامہ سیوطی نے، جو ایک بہت بڑے مفسر اور نامور محدث ہیں، اور جنہوں نے اپنی

تفسیر میں از سر تا پا یہ التزام رکھا ہی کہ قرآن کی تفسیر احادیث اور آثار و فقہاء صحابہ کی راسے کی جائے، جو کچھ اپنی تفسیر میں "الا ما ظہر منہا" کے بحث میں لکھا ہی ہم اُس میں سے بھی یہاں نقل کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے ناظرین کو یہ معلوم ہوگا کہ "الا ما ظہر منہا" سے مُنہ اور ہاتھ مراد لینا تفسیر بالراے نہیں ہی، بلکہ احادیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہی۔ اور اُس تمام قوم نے، جس کی زبان میں قرآن نازل ہوا، یہی معنی سمجھے ہیں، اور اُن کا تعامل بھی اسی پر رہا ہے، اور اب تک ہے۔

(۸) (الف) اخرج ابن المنذر عن انس فی قولہ تعالیٰ "لا یبدین زینتھن الا ما ظہر منہا" قال الکحل والخاتم۔

(۸) (الف) ابن منذر نے انس سے بیان کیا ہی کہ "لا یبدین زینتھن الا ما ظہر منہا" سے سرمہ اور انگوٹھی مراد ہی۔

(ب) واخرج سعید بن منصور و ابن جریر و عبد بن حمید و ابن المنذر و البیہقی عن ابن عباس "ولا یبدین زینتھن الا ما ظہر منہا" قال الکحل الخاتم والقرط والقلادۃ۔

(ب) سعید ابن منصور، ابن جریر، عبد بن حمید، ابن المنذر اور بیہقی، انس سے بیان کرتے ہیں کہ "لا یبدین زینتھن الا ما ظہر منہا" سے سرمہ، انگوٹھی، اور بالیاں مراد ہیں۔

(ج) واخرج عبد الرزاق و عبد بن حمید عن ابن عباس فی قولہ تعالیٰ "الا ما ظہر منہا" قال ھو الخضاب الکف والخاتم

(ج) عبد الرزاق اور عبد بن حمید، ابن عباس سے بیان کرتے ہیں کہ "الا ما ظہر منہا" سے ہاتھوں کی مہندی اور انگوٹھی مراد ہے۔

(د) واخرج ابن ابی شیبۃ و عبد بن حمید و ابن ابی حاتم عن ابن عباس فی قولہ "الا ما ظہر منہا" قال وجھہا وکفاھا و

(د) ابن ابی شیبۃ، عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم ابن عباس سے بیان کرتے ہیں کہ "الا ما ظہر منہا" سے عورت کا مُنہ اور ہاتھ اور

الخاتم

(ﮦ) واخرج ابن ابی شیبة وعبد بن حمید
وابن ابی حاتم عن ابن عباس فی قوله "الا ما
ظھر منھا" قال رقعة الوجه وباطن الکف

(و) واخرج ابن ابی شیبة وعبد بن
حمید وابن المنذر والبیھقی فی
سننه عن عائشة انھا سئلت عن
الزینة الظاھرة. فقالت القلب
الفتخ وضمت طرف کمھا۔

(ز) واخرج ابن ابی شیبة عن
عکرمه فی قوله "الا ما ظھر منھا" قال
الوجه وثغرة النحر۔

(ح) واخرج ابن جریر عن سعید بن
جبیر فی قوله "الا ما ظھر منھا" قال
الوجه والکف۔

(ط) واخرج ابن جریر عن عطا فی قوله "الا
ما ظھر منھا" وقال الکفان والوجه

(ی) واخرج عبد الرزاق وابن جریر
عن قتادة "ولا یبدین زینتھن الا
ما ظھر منھا" قال المسکتان والکحل
والخاتم. قال قتادة وبلغنی ان النبی صلعم

اور انگوٹھی مراد ہے

(ﮦ) ابن ابی شیبة، عبد بن حمید اور ابن
ابی حاتم ابن عباس سے بیان کرتے ہیں کہ
"الا ما ظھر منھا" سے مونھ کی ٹکیا اور ہتیلی مراد ہے

(و) ابن ابی شیبة، عبد بن حمید، ابن المنذر
اور بیہقی اپنے سنن میں حضرت عائشہ رض سے
بیان کرتے ہیں کہ اُن سے زینت ظاہرہ کی
نسبت دریافت کیا گیا اُنھوں نے جواب دیا کہ
کنگن اور انگوٹھی زینت ظاہرہ ہیں، اور ساتھ ہی
اپنی آستینوں کے کنارہ کو بھی شامل کر دیا۔

(ز) ابن ابی شیبة، عکرمہ سے بیان کرتے
ہیں کہ "الا ما ظھر منھا" سے مونھ اور گردن مراد ہے۔

(ح) ابن جریر، سعید ابن جبیر بیان کرتے ہیں
کہ "الا ما ظھر منھا" سے مونھ اور ہات مراد ہے۔

(ط) ابن جریر عطا سے بیان کرتے ہیں کہ "الا
ما ظھر منھا" سے دونوں ہات اور مونھ مراد ہے۔

(ی) عبد الرزاق اور ابن جریر، قتادہ سے
بیان کرتے ہیں کہ "لا یبدین زینتھن الا ما
ظھر منھا" سے پازیب اور انگوٹھی مراد ہے۔ قتادہ کہتے
ہیں کہ مجھے آنحضرت کے اس ارشاد کی خبر پہونچی
ہے کہ "جو عورت خدا اور روز آخرت پر ایمان

قال لایحل لامراۃ تؤمن باللہ والیوم
الآخران تخرج یدیھا الاھھنا وقبض
نصف الذراع۔

(ک) واخرج عبدالرزاق وابن جریر
عن المسور بن مخرمۃ فی قولہ "الا
ما ظھر منھا" قال القلبین یعنی السوار
والخاتم والکحل۔

(ل) واخرج سنید وابن جریر عن
ابن جریج قال قال ابن عباس فی
قولہ "ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر
منھا" قال الخاتم والمسکۃ۔ قال ابن
جریج وقالت عائشۃ القلب والفتخۃ
قالت عائشۃ دخلت علی ابنۃ
اخی لامی عبداللہ بن الطفیل مزینۃ
فدخلت علی النبی صلعم واعرض
فقالت عائشۃ انھا ابنۃ اخی وجاریۃ
فقال اذا عرکت المرأۃ لم یحل لھا
ان تظھر الا وجھھا والا ما دون ھذا
وقبض علی ذراع نفسہ۔ فترک بین
قبضۃ وبین الکف مثل قبضۃ
اخری۔

رکھتی ہی، اُسکو اپنے ہات کھولنے جائز نہیں،
مگر یہاں تک" اور اُس کی تشریح آپنے اپنے
نصف ذراع تک کی۔

(ک) عبدالرزاق اور ابن جریر، مسوَر بن مخرمہ
سے بیان کرتے ہیں کہ "الا ما ظھر منھا" سے کنگن
اور انگوٹھی اور سرمہ مُراد ہی

(ل) سنید اور ابن جریر، ابن جریج سے بیان
کرتے ہیں کہ اُنھوں نے "ولا یبدین زینتھن
الا ما ظھر منھا" کی تفسیر میں ابن عباس کا یہ قول
بیان کیا ہی کہ اُس سے انگوٹھی اور پازیب مراد
ہے ابن جریج یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ
نے کنگن اور انگوٹھی بیان کی ہی۔
حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میرے برادر مادری
عبداللہ ابن طفیل کی بیٹی مزینہ میرے پاس
آئی، اور پھر آنحضرت کے پاس گئی، تو آپنے
مونھ پھیر لیا۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ "یہ تو میری
بھتیجی ہی" اور ابھی لڑکی ہی۔ آنحضرت نے فرمایا کہ جب عورت
جوان ہو جائے تو اُسکو اپنا مونھ اور اُسکے سوا کھولنا
جائز نہیں" اسکے بعد آپنے اپنی بانھ پکڑی اور ہات
اور گرفت کے درمیان ایک مٹھی کی جگھ چھوڑ دی (یعنی
پہنچوں سے وپر تک ہاتوں کا کھولنا بھی جائز فرمایا)

(م) واخرج ابن داؤد وابن مرویہ والبیہقی عن عائشۃ ان اسما بنت ابی بکر دخلت علی النبی صلعم وعلیہا ثیاب رقاق فاعرض عنہا وقال یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت المحیض لم یصلح الا ان یری منہا الاھذا۔ واشار الی وجہہ وکفہ	(م) ابوداؤد، ابن مرویہ اور بیہقی حضرت عائشہ سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کی بیٹی اسماء آنحضرت کے پاس باریک لباس پہنے ہوئے آئیں آپنے اُنکی طرف سے مُنہ پھیرلیا، کہ اے اسماء! جب عورت جوان ہوجائے تو سوا اسکے، اُسکے بدن میں سے کچھ دیکھا جانا جائز نہیں" آپنے اس اشارہ کی تشریح اپنے منہ اور ہاتھ کی طرف اشارہ کرکے فرمائی
(ن) واخرج ابوداود فی مراسیلہ عن قتادۃ ان النبی صلعم قال ان الجاریۃ اذا حاضت لم یصلح ان یری منہا الا وجہہا و یداھا الی المفصل" (تفسیر درالمنثور للسیوطی جلد پنجم صفحہ ۳۹ و ۴۰، مطبوعہ مصر)	(ن) ابوداؤد نے اپنے مراسیل میں قتادہ سے جناب رسالت مآب کا یہ ارشاد نقل کیا ہو کہ لڑکی جب حائض ہوجائے تو اُسکا مُنہ اور پہونچوں تک ہاتھوں کے سوائے، اور کچھ دیکھا جانا جائز نہیں"

ان شواہد پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہی کہ بعض نے "زینت ظاہری" سے موضع زینت مراد لیے ہیں، اور بعض نے زینت اکتسابی مراد لی ہی جیسے سرمہ، مہندی، انگوٹھی اور لباس وغیرہ، مگر بادنی تامل معلوم ہوسکتا ہی کہ اشیاء زینت داخل حجاب نہیں ہوسکتیں، اسلیے کہ اگر وہ داخل حجاب ہوتیں تو اُنکا بدن سے علیحدہ دیکھنا بھی ناجائز ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

اشیاء زینت کا خارج از حجاب ہونا، اسکے صاف یہ معنی ہیں کہ اُنکے استعمال کی جگہ داخل حجاب نہیں، گو بادی النظر میں "نفس زینت" اور "موضع زینت" دو چیزیں نظر آتی ہیں، مگر حجاب کا حکم اُنکے محل استعمال ہی سے متعلق ہی، اور انگوٹھی یا سرمہ کاجل وغیرہ زینتوں کا دیکھنا، بدون چہرہ اور ہاتھ دیکھنے کے محال ہی۔ اگرچہ ان چیزوں کی خیالی تصویر کا ذہنوں میں آنا ممکن ہو، اور شاعرانہ چابکدستی سے معشوق کے خیالی اسٹیچو پر سجادی گئی ہوں۔ اور یار لوگ اس سے مزے لے رہے ہوں۔

راقم محمد اختر۔ حیدرآباد دکن۔

The College.

Ali Raza, l. b. w. *b.* Andrews	0	st. Gen. Spens, *b.* Andrews	6
A. Ali, *c.* Andrew, *b.* Cookson	31	*c.* Patterson *b.* Cookson	0
Salam, *b.* Andrews,	9	not out	83
Amir Ahmad, st. Gen. Spens, *b.* Andrews,	0	*c.* Turner, *b.* Patterson	20
Rahatullah ,,	5	*c.* Nairne, *b.* Patterson	6
Samad, *b.* Patterson,	6	did not bat	
Syed, not out	64	not out	20
Halim, *c.* Cookson, *b.* Hurt,	0	did not bat	
Ally Hasan, l. b. w. *b.* Nairne,	26	,,	
Shafqat, *b.* Cookson,	21	st. Gen. Spens, *b.* Turner	33
Razi, *c.* Andrew *b.* Cookson	0	did not bat	
Extras	16	Extras	12
Total ...	178	Total ...	180

BOWLING ANALYSIS.

	1st. Innings.				2nd. Innings.			
	W.	M.	R.	O.	W.	M.	O.	R.
Samad	3	3	75	16	nil	nil	2	10
Salam	4	2	88	23	4	3	11	30
Shafqat	...	...	...	...	6	2	12	61
Raza	nil	nil	51	10	...	...	...	...
Rahatullah	0	nil	29	4	...	...	...	...
Razi	1	nil	4	2	...	...	...	...

SALAMUDDIN,

Cricket Captain.

1906. The Home Team under the Captaincy of General Spens showed admirable combination, and did credit to the game. Turner and Cookson by their respective 63 and 48 pulled the score to 118 within nearly an hour and a half. General Spens followed and added 59 in his free, fine and faultless style. Captain Andrews also made 59 with his easy pulling. The innings closed for 260 runs. Our fielding was shocking altogether. All of us took share in leaving eleven chances, but it was rather owing to the cloudy weather and the nervousness of raw recruits. Though we were not so successful in our first innings, Shafqat, who could not bowl in the first innings, being away at Meerut because of his sister's illness, reached Bareilly in time for batting and changed the face of the play in combination with Syed who played a simply splendid and flawless game for 64 not out ; while Shafqat got 21. But more credit is due to Ahmad Ali who went in first and braved the opening attack for 31.

In the 2nd innings, however, we began more hopefully and Shafqat's bowling played havoc among the Home Team. General Spens making the highest score 30. Salam was most successful in his batting and bowling this time. He piled up 83 and was not out. Shafqat made the game spirited with his easy 33. Amir Ahmad and Syed got 20 each while the latter again retired not out. Our fielding was much better this time, Syed specially securing some fine chance at the wicket. As it was growing dark we had to retire with our five wickets not batting though we wanted only five runs to win.

The account of the runs of the two innings is given below.

Bareilly.

1st Innings.		2nd Innings.	
G. Cookson, *b.* Salam,	48	*b.* Shafqat	9
G. Hewett, *c.* Salam, *b.* Samad,	0	*b.* "	1
E. N. Turner, run out	63	*c.* Raza, *b.* Salam	4
R. G. Nairne, *c.* Syed, *b.* Salam,	1	*c.* Razi, *b.* Shafqat	13
Capt. Barlow, *c.* Salam, *b.* Samad,	13	*c.* Shafqat, *b.* Salam	0
Gen. Spens, *c.* A. Ali, *b.* Razi,	59	*b.* Shafqat	30
T. Hurt, *c.* Samad, *b.* Salam,	0	*c.* Syed, *b.* Shafqat	14
Capt. Andrew, *c.* A. Ali, *b.* Samad,	59	*b.* Salam	6
Capt. Patterson, run out,	2	*c.* A. Ali, *b.* Salam	8
N. F. Addes, not out,	0	*c.* Halim *b.* Shafqat	8
D. B. Grey, *b.* Salam,	0	not out	
Extras	13	Extras	8
Total ...	260	Total ...	101

Among the discoveries, made in the moghal period, one may mention the watermill invented by a Mohammadan in the reign of Jahangir. Noor Jahan's mother invented the distillation of rose-water. And Noorjahan herself showed remarkable originality in designing artistic and beautiful feminine ornaments and dresses. In short there was much that could be called original in India before the commencement of British rule in India.

But since the commencement of the westernization and Europeanization of the country, she has been rapidly losing her individuality ; and originality in the people is fast being killed. Europemania is the order of the day. We are imitating Europeans in every way. We like to dress like Europeans, walk like Europeans, talk like Europeans, shave like Europeans, eat like Europeans, and gesticulate like Europeans. Our arts are being coldly neglected. The noisy piano has taken the place of the sweet sitar. English games are rapidly bringing into disuse our Indian games. Western civilization has invaded our hearths and homes. The institution of *purdah* which contributes so much to the sweetnees and womanliness of woman has been shaken to its foundations. And the Indian ideal of womanhood is in great danger of deterioration by the influence of European civilization. Our interesting nursery tales, songs and folk-lore are fast being forgotten, while English Society novels are read with great avidity. We know little about the Mohammadan heroes of antiquity, but can talk a good deal about Cromwell and Napolean.

This slavish imitation of Europe has resulted in our intellectual sterility. The popularity of European literature has stopped the growth of Indian thought. There has not been written a single work of genius for the last hundred years. It is said that India is getting poorer. The statement is truer in the intellectual than in the material sense. If the poor are suffering from material poverty, the rich are suffering from intellectual poverty. The poor are poor in bread, but the rich are poor in ideas. In short India's intellectual mendicancy is appalling, and all this is due to the influence of European civilization. "SARA."

Cricket 1st XI at Bareilly.

The 1st XI played its first match of the season against the Bareilly Gymkhana on the 12th and 13th December,

came into contact, a new language, namely, Hindi came into existence. But Hindi was the language of the masses, and the Hindoo upper classes spoke and wrote Persian the language of their rulers. Thus the days of Hindoo greatness were practically over. And though under Mohammadan rule, they produced some books, they were written in Persian and there was very little original about them.

In spite of all this, India under Mohammadan rule could boast of originality in a number of things. The process of the Indianization of the Mohammadans was extremely rapid and they not only encouraged some of the Hindoo arts which suited their tastes but also displayed great originality particularly in literature and architecture. People who designed the Taj and the Peacock throne, laid out artistic gardens, build magnificient forts, palaces and mosques and excavated lovely canals must have had an element of greatness in them. Indian music was the delight of the mussalmans who patronised it most liberally. Tausain, perhaps the greatest musician that India has ever produced lived with a large staff of musicians at Akbar's Court. The Moghals encouraged also painting and there are many references in Aeeni Akbari and Jahangir's memoirs to the painters who lived at the Moghal Court. Khusrau's Hindi songs are extremely sweet and are sung even to the present day. Barbahadur, the famous King of Malwa, was a great musician and Rupmati, his Queen, the sweetest singer of her time. As regards poetry, the Mohammadan nation may be aptly said to be a nation of minor poets In the Moghal period there were countless poets The famous Fairi towers above them all. He was a great genius and is said to have been the author of more than a hundred works. His master piece is the *Nal daman* which is an exquisite work of art. His brother Abdul Fazal was an equally great genius in prose. He is the author of the well-known *Aeeni Akbari*. The book is an encylopedia of the times of Akbar, and has an immense statistical value. Another great work written in the moghal period is the *Waqaya Alamgiri* by Nemat Khan Ali. The book is a clever satire on Aurangzeb and his grand army which perished in the Deccan, and is a master piece of oriental humour. Among the minor arts, cultivated by the Mohammadans caligraphy and engraving deserve notice. Cookery also is the art in which they excelled most and being epicureans in the matter of food, they bestowed much thought and attention upon it.

codes in the world, and the institution of caste inaugurated by that code has nothing like it in the world. The Hindoos were great mathematicians. They surpassed the Greeks and Arabs in developing the science of mathematics. The Hindoo scale of notation is considered a model of perfection and excellence. And it has been fully ascertained that Arithmatic, Algebra and the differential calculus are of Hindoo origin. Among the scientists and men of learning who adorned the court of the caliphs at Bagdad, there was a number of Hindoo Mathematicians whose original and valuable contributions to Mathematics were highly appreciated by the Saracens. The latter improved upon what they learnt in mathematics from the Hindoos and then imparted it to Europe. Sanskrit literature is of a very high order. And the Ramayana and the Mahabharta are classed among the great epic poems of the world. Hindi songs are matchless in sweetness. In Persian and English songs man plays the lover and woman is the object of love. He is the pursuer and she the pursued. He makes love to her and weeps and vows and pours forth his heart to her. But in Hindi songs it is just the other way. Therein man is the John Tanner and woman the Anne of Bernard Shaw. Woman is the lover, and man the object of love. She is the pursuer and he the pursued. It is she who weeps and is sad and disconsolate in her lord and lover's absence. Thus the charm of the song is immeasurably enhanced. As regards music the Hindoos developed this art to perfection. And the elaborate tunes and airs of their music are proof of the constructive and artchitectural nature of their genius. Their statues though not beautiful are found in large numbers and are easily distinguishable from those of other nations. In short originality abounded in India in the days of the Hindoos. India was then an isolated and self-sufficient country. And the Hindoos were a home-loving and stationary people. They considered it an enormity to cross the seas. Consequently being thrown upon their own resources, they had to be original and could not help being so.

The Mohammadan occupation of the country put a stop to the indigenous growth of some of the sciences and arts in India. Indian sculpture received a rude and crushing blow from the Vandalism and iconoclasm of the conqueror who destroyed, disfigured and mutilated the idols and statues of the Hindoos most wantonly. The great Sanskrit language fell into disuse and the production of Sanskrit language literature absolutely ceased. When Persian and Sanskrit

India, amounting to an expectation of our downfall ! "The compiler of 'Lord Combermere's Despatches' puts in, 'It is not, therefore, unlikely, that our success at Bharatpur had a favourable influence in bringing the negotiations with the Burmese to a satisfactory issue !

Thus fell Bharatpur, the capture of which, besides being an exploit of more than ordinary brilliancy, exercised over the politics and the fate of the English rule in this country, an influence which can be scarcely exaggerated, but is now almost forgotten. Its importance was, however, recognized at the time.

HIDAYETULLA.

1st November, 1906.

(Western Civilization has Crushed Originality in India.)

In ancient times, the Indians were one of the most original people in the world. Their religion, their laws, their sciences and their arts, in short everything belonging to them bore the stamp of originality. Hindoo mythlogy does not contain a single foreign idea. Hindoo gods and godesses though not so handsome and beautiful as those of ancient Greece, possess an individuality of their own. Bhuddism is distinguished from all other religions for originality. Judaism, Christianity and Mohmmadanism may be said to be sister religions, because they all contain the same central idea and because there are so many points of resemblance among them. But the religion of Prince Gotama offers a boldly original explanation of the mystery of existence. Some of the doctrines of that religion have appealed very strongly to the westerns. Hindoo spiritualism is the marvel of the western world. It was one of the easiest feats for a Hindoo spiritualist to stand suspended in the air when the rest of the world knew absolutely nothing about spiritualism. Hindoo philosoply has given to Europeans much food for thought. Alexander during his stay in India had an interesting talk with some Hindoo philosophers and was much struck with the originality of their thought and the profundity of their wisdom. The famous code of Manu, though not perfect, is one of the most original and comprehensive

The mines were fired and there was a tremendous noise mingled with the agonising shrieks and cries of the dying. There was darkness : long wreaths of smoke, rising in curls, overhung the sky. The column marched and in ten minutes more the 'Union Jack' was seen flying on one of the bastions, amidst the rapturous cries of 'long live the king'! The fight continued for three hours more. Lord Combermere with a division was at once on the gates of the citadel, demanding surrender. There was some hesitation. Doorjan Lal, with his wife, his two sons and a band of forty picked horsemen, made escape. He was successful till he was out of the town but was captured by a reconnoitering party after a slight skirmish. The young Raja was then reinstated on the 'Masnud' by Lord Combermere and Sir Charles Metcalfe on the 5th of February 1826.

The men of Bharatpur fought with the fury of desperation. The north-east bastion was entrusted to a corps of 800 Pathans, of whom only 75 were alive at the close of the action. Two great guns and 133 other pieces of ordnance fell in the hands of the victors. The total treasure captured amounted to 480,000 £ besides the two thousand gold mohurs which were found sewn in the saddle of the flying Raja. The total Bharatpur loss, in killed and wounded, was 13,000 during the seige and 4,000 were slain during the assault. A few escaped, one officer alone captured 6,000 to 7,000 persons.

Lord Combermere, it is said, used shells. But he can scarcely be blamed for that, as the capture of Bharatpur was regarded as a test of the English power. All the native states of Rajputana were looking for the issue with a keen eye and a slightest rumour to the contrary would have set them all against the English. Besides Ranjit Singh was solicited to attack the English from the rear. But the 'Lion of the Punjab' acted with prudence and wisdom and remained a firm friend of the English. Secondly there was a shortage of ammunition, guns and stores. A failure in this attempt would have seriously jeopardised the English tenure of India. The political importance of the seige cannot be fully described. Sir John Malcomb remarked, 'If the seige had failed, it would, in all human probability, have added to the embarrasements of the Burmese War that of hostilities with almost every state of India !" Lord Metcalfe, member of the supreme council of India, said, 'The Burmese war produced an extraordinary sensation all over

It is beyond the scope of this paper to enter into a scientific and technical narrative of the seige but certain points will be dealt with in order to clear the position. Lord Combermere intended to take the fort by assault. This necessitated a breach to be made in the wall. For this purpose mines were placed. This took about a fortnight during which time some bullets were exchanged and the reconaisance party of both the sides also met but the actual assault was made on the 16th December. The British Army numbered 27,000 men, in addition to Artillery, native troops and a battering train of 102 guns and 52 field pieces. The strength of the other side is not known but it must have been great since the casualties alone amounted to 20, 000. It would be an injustice to Lord Combermere if one of his acts during the siege were not to be mentioned. Out of humanity he wrote a letter to Doorjan Lal, promising safe-conduct to women, children and aged men because it was against his wish to punish the innocent. The reply was an ambiguous one, but certain people did come out and were allowed to go, where they pleased, unmolested.

The part to be attacked was the north-east angle of the town and a bastion near the Jagina Gate. The assault was ordered to be made in two columns which were further subdivided into six lesser bodies. The first column was entrusted to Major General Reynell, the second one was under General Nicholas. The field-marshal with his aides-de-camp and secretaries was on an eminence. The right column was was not as successful as that of Reynell. The order to fire the mines was given and "a few minutes passed", say Lord Combermere's Despatches, "every pulse beat quick, every eye was fixed on the fortress and earnestly did all watch the slight wreaths of smoke which curling slowly upwards marked the progress of the fatal spark towards the death-laden mines." The Raja was under a delusion. He made, of course, great preparations, but he was sure he could not be defeated. The Barahmins and the astrologers of the court made a prophecy which was not unlike in the issue which seemed to ensure the safety of Dunsinave. The prophecy was that Bharatpur could only be taken by an alligator which should drink up the water of the ditch. Now, the Sanskrit word for alligator is 'Ghambeer' which is near enough to Combermere for ex post facto interpretors of prophecy. Let it be known that the first thing which Lord Combermere did before he came there was to cut the water of the 'Jhils' from the city ditches.

the revenue which formerly amounted to some Rs. 30,00,000 rose by leaps and bounds in a comparatively short time, it now stands at 36,00,000.

The importance of Bharatpur in Indian history is only on account of its two seiges. The first seige took place in 1805 under Lord Lake but it was a failure. In memory of this victory, the then Raja of Bharatpur ordered a bastion to be erected in addition to many others and was named 'Fateh Burj' or the Victory tower, which was vauntingly declared to have been built with the blood and bones of those who fell in the last seige. The second seige, most important in its results, was undertaken in 1825 by Lord Combermere. The cause which led to the seige was that Raja Baldeo Singh, was succeeded by his son, Balwant Singh, a boy nearly five years old. This boy was in alliance with the Hon'ble East Indian Company. His throne was usurped by Doorjan Lal, a member of the same house, who was not recognised as Baldeo's lawful successor. Before describing the military preperations for the assault, it would not be improper to describe the construction of the fort itself.

The whole of the city is surrounded by a strong and thick mud wall, round which is a ditch 35 to 30 *ft* wide, originally a 'Nalla.' It is filled up with water from the surrounding lakes and bunds. This wall is surmounted with 12 strongly made bastions. There is, however, one weakness, which arises from the various water courses leading into the ditch, affording in many places an easy descent. This was of great help to the beseigers. In the centre of the town is the citadel, exclusively meant for the Raja, his family and a band of picked horsemen and loyal supporters. It had very many fine and richly decorated buildings, but for want of proper care they are fast mouldering away. The citadel rises, to a height, above the level of the ground, of nearly 114 feet. It has a ditch 150 *ft* wide and 59 *ft* deep. The inner side of the ditch is faced by a perpendicular revetment of stones. The strength of the ditch is increased by 'Moti Jhil' and 'Atal Bund,' two large lakes in the vicinity of the town. There are only two gates to the citadel, one to the North and the other to the South. They have huge brass spiked doors which are said to be looted from Agra Fort. But this statement does not seem to be right, because both the gates of the Agra fort are smaller than those of Bharatpur.

nilitary service, have chosen this occupation and are now nvariably found in state troops. They say they are descendants of Rajputs and are called "Jats." In social position, however, they are not considered by the other families of Rajputana as their equal but considerably below them and are not mixed with, especially they do not intermarry. Neither are they so chivalrous and soldier-like as the Rajputs nor so robust in body. They may perform wonders if properly backed. Some of their Rajas were wise and they led them to victory during the latter period of the Moghals and thus acquired so much of territory: there would never have been the impenetrable fortress of Bharatpur and the English Government would not have taken so much pains to punish them.

These people were poor and lived in the Eastern part of Rajputana. Before the commencement of the reign of their own Raja, they were either under the influence of Jaipur or the Moghals. But the dream of territorial possession inspired their chiefs and they severed their connection with each and all and began to make themselves important in the history of those times. The chief town where the Raja resided at first was 'Owe'——a village still possesed by the Raj. Hard pressed by the constant attempts of the Moghal Army to subjugate them, the Raja transferred his seat to 'Dig' in 1715, which is still known as a place of severe encounter between the English and Bharatpur and Holker. From this date begins its political importance. The Raja very wisely entered into a treaty with Holker, the principal term being mutual help, and now began his depredations far and wide. The Moghals thinking their attempts to subjugate these people fruitless, treated them with kindness. The Moghal Emperor gave their chief the title of a Raja and made him one of his grandees. Later on, in due course of time, and specially for a proper and strong site, the Raja transferred his seat to Bharatpur—a hollow or depressed tract of land—in order that they might let sufficient water to get in their ditch. The Raja came into contact with the then paramount power, *viz*, the English in the Marahta wars. The result is too clearly known to beg description. The Raja was made to govern his state through a Political Agent appointed by the Government. The present administration is carried on by a council, with the Political Agent as its president. The more important works, *e. g*; foreign matters, are solely in the hands of the Political Agent. Since then the general prosperity is increased and

This year also we shall have the University Examinations all in April ; thus the pressure of work will come almost entirely in the first quarter. One good result of this will be that the hot weather will be more comfortable for students, as the College will not be so crowded.

The vacation is to be put later. It will be from August 1st to November 1st. The reason for the experiment is twofold; firstly we shall thus avoid the greater part of Ramzan ; and secondly we shall miss the latter half of October, which is perhaps the worst period of the year for fever. This year we had more than sixty cases of illness at once.

Papers of the Historical Society.

" BHARATPUR :—ITS SEIGE BY LORD COMBERMERE."

Bharatpur is a city situated at a distance of nearly 34 miles to the South-east of Agra. It is the chief town of a native state of the same name, which covers an area of 1691 square miles with a population of more than 1,00,000 souls. The city proper has a circuit of nearly 8 miles, having for its latitude 27°-33′ North and longitude 77°-31′ east. This state is traversed by 40 miles of Rajputana Malwa Railway which has been built at the cost of the state but was afterwards sold to the above company. The principal crops are grain, cotton and sugar. There are various native manufactures but the special one is "Chowry" or flappers. The country suffers for want of water. The prosperity of the crops depends upon rain, the annual rain fall being only 24." Three streams pass through the territory of which only one flows constantly, the other two dying in sand. To meet this difficulty a great amount of money is yearly spent on irrigation and bunds and embankments have been constructed. After the rain-water is collected and the soil is sufficiently wet to grow wheat, water is then let loose in different parts of the country. Further the climate is dry and hot. In the height of summer it has been compared to the extreme glow of an iron-foundry, thermometer having been known to stand at 130° F. The whole of the territory is populated by agriculturists, some of whom induced by the emoluments of

we can only say that His Highness is to visit the College on January 16th. He is to arrive about 11 a.m. and will stay in Aligarh about twelve hours, though he will probably leave the College itself at 8 o'clock in the evening.

Preparations are being made to accomodate not only the Amir and his suite, but a large number of Trustees, Old Boys and visitors. This is no easy matter as the living accomodation both in the College and the School is strained to its utmost capacity already. One of the School buildings is to be turned into temporary quarters for visitors, while the College lecture rooms are to be furnished for His Highness and some of his suite. The details of the programme of events during the day are not yet completely settled. Hence it would be useless to publish them.

On the whole the month of December has been uneventful. There have been two cricket matches, one of which is described elsewhere; but apart from these the life of the College and School has "pursued the even tenour of its way," without disturbance or distraction.

The Cricket and Hockey Teams are both going on tour in the Panjab during the Xmas holidays. It was found impossible for all three elevens to go touring at the same time, as there are several who play for two teams. The Football Club therefore gave up the idea of a Xmas Tour and is intending to send out an eleven later.

The various speaking competitions of the Union Club have taken place. There were not very many speakers among the senior classes. Mohammad Chaudri of Assam was the winner of the prize for the 4th year and Karim Haidar carried off that for the 3rd year. The second and first year classes showed much more interest in the affair, as about eighteen candidates competed for the two prizes. The quality of the speeches was very fair in each division.

There are many events to take place in the next month or two. After the visit of the Amir of Afghanistan the Annual sports are to be held. Then there is to be a Tournament for the Schools of this circle. Almost immediately after the School Tournament, the College Tournament for the western parts of the United Provinces is to take place here. And of course there is the Annual District Fair which will begin on February 4th.

The
Aligarh Monthly

January, 1907.

College Notes

There has been no response to the offer of a prize of fifteen rupees for the best essay on a special subject. We regret very much the continued apathy shown towards any schemes of this kind. But a second prize is offered, of which the conditions are as follows :—

The value of the prize will be fifteen rupees. It will be given for the best essay on "Practical Swadeshism.". All essays to be sent in to the Editor, not later than February 11th, 1907. As before, the right to publish the best or any essay rests with the Editor.

Dr. Ziauddin Ahmad has returned to Aligarh. He arrived on Tuesday, December 11th, in the afternoon ; and was met at the Railway Station by Mr. Archbold, the Nawab Sahib, and an enthusiastic crowd of undergraduate members of the College, who insisted on drawing the carriage part of the way to the College.

It is not easy at the time of writing to say anything definite about the arrangements for the Amir's visit. So far

جلد (۵) | فروری ۱۹۰۷ء | نمبر (۲)

مسئلہ ارتقا اور مسئلہ کون

چند سال ہوئے ہمارے کالج کے طلبا نے زبانِ اُردو کو ترقی دینے کے خیال سے ایک انجمن الموسوم بہ اُردوی معلّٰی قائم کی تھی اور کچھ عرصے تک وہ اپنا کام کرتی رہی مگر آخر میں اُسکے جلسوں نے قدیم مشاعروں کی صورت اختیار کرلی اسلئے منتظمین کالج نے اُسکو بند کردیا تھا۔ اب پھر چند طلبا نے اُسکو زندہ کیا ہے اور اس بار بجائے محض شاعری کے اسمیں علمی مضامین پڑھے جاتے ہیں چنانچہ ذیل کا مضمون اُسی انجمن میں عبدالرحمن سہوار ی بی۔ اے طالب علم مدرستہ العلوم علیگڈھ نے پڑھا۔

زدم از کتم عدم خیمہ بہ صحرای وجود		وز جمادی بہ نباتی سفرے کردم و رفت
بعد از انم گشتش نفس بہ حیوانی بود		چون رسیدم بوی از وی گذرے کردم و رفت
بعد از ان در صدف سینۂ انسان بہ صفا		قطرۂ ہستی خود را گہرے کردم و رفت
با ملائک پس از ان صومعہ قدسی را		گرد برگشتم و نیکو نظرے کردم و رفت
بعد از ان رہ سوی او بردم و چون ابن یمین		ہمہ او گشتم و ترکِ دگرے کردم و رفت

میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جا رہا ہوں؟ ایسے سوالات ہیں جو ہمیشہ ہر انسان کے سامنے کسی نہ کسی صورت میں پیش رہتے ہیں۔ بعض نے تو اپنے دل کو یوں سمجھا لیا ہے کہ کہاں میں انسان ضعیف البنیان اور کہاں یہ اسرار۔ مجھے اپنے درجے سے نہ بڑھنا چاہیئے۔

اگر یک سرِ موے برتر پرم		فروغِ تجلّی بسوزد پرم

مگر بعض نے یوں خیال کیا ہے کہ میں ہی تو وہ اشرف المخلوق ہوں جس کے لیئے یہ اسرارِ عالم ظاہر ہوئے ہیں اور اگر میں نے ہی اس راز کے سمجھنے کی کوشش نہ کی صانع کی صنعت اور مالک کی قدرت کیسے ظاہر ہو گی۔

مؤخر الذکر گروہ میں فلسفی اور اہلِ مذہب شامل ہیں۔ اہلِ مذہب کہتے ہیں کاش ہم دیکھ لیں اس پردے میں کیا راز نہاں ہے، فلسفی کہتے ہیں کاش ہم جان لیں اس پردے میں کیا راز نہاں ہے۔ مگر دیکھنا یا جاننا آسان نہیں۔ چنانچہ اب تک جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ بہت ہی کم ہے۔

اِس لاینحل مسئلے کی گتھیاں سلجھانے میں سب سے بڑا حصّہ اُن فلسفیوں کا ہے جنھوں نے مسئلۂ ارتقا کو دریافت کیا ہے۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں حکیم ڈارون نے علم الحیوانات، علمِ نباتات، علم طبقات الارض وغیرہ کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ تمام موجودات اور بالخصوص ہمارے مخصوص ستارے کی ہستی جو مختلف فیہ مدارج طے

جمادات و نباتات و حیوانات اور نوعِ انسان کی شکل میں ہے چند عملہاے طبعی کا نتیجہ ہے جنھوں نے مادہ کے ہیولیٰ اور ترتیب میں یہ اختلافات پیدا کیے ہیں، فلسفیوں نے بھی جن میں ہربرٹ اسپنسر سب سے ممتاز ہے علم تمدّن اور فلسفے میں ارتقاسے عالم کا اقرار کیا ہے چنانچہ اب یہ مسئلہ اسقدر عام ہوگیا ہے کہ کسی جسم مرئی یا غیر مرئی کا وجود بغیر ارتقا کے خیال نہیں کیا جاتا یہانتک کہ حسّیات اور جذبات اور تخیّل کو بھی اسکا ہی پابند سمجھتے ہیں جیساکہ اجسام کو۔

پس یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے مگر اسکی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جبکہ ہم خیال کرتے ہیں کہ باوجود اسقدر جدید ہونے کے اسکو فی الحقیقت جدید نہیں کہہ سکتے سائنس اور فلسفہ کے جدید مسائل کی مثال نئے چاند کی سی ہے جو گو نیا کہلاتا ہے مگر در اصل وہی پرانا چاند ہوتا ہے جسے ہم بارہا دیکھ چکے ہیں۔ علامۂ ہکسلی لکھتے ہیں کہ مسئلۂ آفرینش جسمیں مسئلۂ ارتقا کو اسقدر دخل ہے قدیم الایام میں معلوم نہ تھا گو کچھ کچھ پتا چلتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں دریاے گنگا اور بحیرۂ الجزائر کے کناروں پر اسکا چرچا ہو۔ مگر چونکہ اُسوقت کے بعض مشہور مسائل سے جنمیں کرم کا مسئلہ سب سے ممتاز ہے اسکا مخالف ہے اس بات کے تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ اسکے بعد جب ہم ایشیاے کوچک یونان اور اطالیہ کے زمانۂ قدیم کے فلسفہ کی ترقی پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گو وہ بذاتہٖ مسئلۂ ارتقا سے آزاد ہے لیکن اُس کے اثر سے محفوظ نہیں۔ مگر جب یونان کی علمی ترقیات کا مرکز مدینۃ الحکما ایتھنز میں تبدیل ہوگیا تو علما کی توجہ بجاے فلسفہ کے الٰہیات کی طرف رجوع ہوگئی اور اسکا خیال رفتہ رفتہ کم ہوکر بالکل جاتا رہا۔ پس کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے مسئلۂ ارتقا قدیم ہندوستان اور یونان کے علما کے علم میں ہو ممکن ہے کہ نہ ہو مگر چونکہ کوئی کتاب اسوقت ایسی موجود نہیں جو اس استدلال پر گواہ ہو سکے اسلیے اسکے متعلق زیادہ بحث نہیں ہوسکتی۔ البتہ مسلمانوں کی نسبت یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے

کہ انھوں نے اِس مسئلے کی پوری تشریح اور تصریح کی اور اُن کے علما نے اِسکو تمام مسائل فلسفہ کی بنیاد خیال کیا اور کون کے نام سے موسوم کیا۔

جیسا کہ ہم آجکل دیکھتے ہیں کہ اِس مسئلے نے مذہب پر ایک خاص اثر پیدا کیا ہے اور لوگوں کو لا مذہب یا گمراہ کرنے میں فلسفہ کے تمام مسائل کی پیشقدمی کی ہے یہاں تک کہ یقین اور ایمان کی زنجیر کو مضبوط ترین کڑیوں پر سے توڑ ڈالا ہے ایسے ہی مسلمانوں کے زمانے میں بھی اُس نے عقل و دین کی جنگ کو ترقی دینے میں خاص مدد دی تھی اور جیسے کہ اِس زمانے کے بعض مذہبی عالموں نے اِس کی زد سے بچنے کے لئے اِسکی کسیقدر رفاقت اختیار کی ہے ویسے ہی اُس زمانے میں بھی ہوا تھا۔ چنانچہ مغربی عالموں نے اسکو مذہب کی پناہ میں لے لیا تھا اور مذہب کو اِسکی حفاظت میں دیا تھا۔ یہاں تک کہ اِس مسئلے کی قبولیت اِسقدر عام ہوئی کہ مُلّائے رومی بھی وجد میں کہہ اُٹھے۔

از جمادی مُردم و نامی شدم — وز نما مُردم بہ حیوان سر زدم
مُردم از حیوانی و آدم شدم — پس چہ ترسم کے ز مُردن کم شوم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر — تا بر آرم از ملائک بال و پر
بار دیگر از ملک پرّان شوم — آنچہ اندر وہم نہ آید آن شوم
پس عدم گردم عدم چون ارغنون — گویدم کانا الیہ راجعون

اور حکیم سنائی نے جنکی نسبت خود مولنا فرماتے ہیں۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او — ما از پیِ سنائی و عطار آمدیم

دعا مانگی۔

نخواہم لاجرم نعمت نہ در دنیا نہ در جنت — ہمیں گویم بہ ہر ساعت چہ در سرّا چہ در ضرّا
کہ یارب مر سنائی را اصناعی دہ تو در حکمت — توان کز وی بہ رشک آید روان بو علی سینا

مگر یہ حالت تادیر قائم نہ رہ سکی۔ الحسن۔ الفارابی۔ اور بو علی سینا اور اُن کے

مؤیدین فلسفیوں اور عالموں کی کوششیں ابھی پورے طور پر بار آور بھی نہ ہوئی تھیں کہ خزان آگئی۔ ہم اُس طویل جنگ کو بیان کرنا نہیں چاہتے جو خلفاے عباسیہ کے زمانہ میں نئے اور پرانے خیالات کے درمیان جاری رہی اور جسمیں بالآخر قدیم محض بوجہ قدامت جدید پر غالب آیا۔ یہ شکست اسلام کے لئے نہایت مضر اور معتزلہ کے حق میں مہلک ثابت ہوئی۔ چنانچہ معتزلہ کے صفحہ ہستی سے ہٹتے ہی اسلام کی علمی عظمت کی حقیقت نقش و نگار قرطاس نسیاں سے زیادہ نہ رہی۔ معتزلہ اسلام کی رُوح تھے اب کے لوگ ایک قالب بے رُوح سے زیادہ نہیں۔ مگر سچائی کی آگ کو اگر اُسکی ایک چنگاری بھی خاکستر میں باقی ہو بجھا نہ سمجھو۔ وہی ایک چنگاری اگر روشن ہو جائے تمام خس و خاشاک کو دم زدن میں جلا سکتی ہے۔ گو اُمید نہیں مگر اُمید کی ایک جھلک ضرور ہے، سر سید مرحوم نے جو کوششیں کی ہیں اُنکو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کر سکتے ہیں۔

دیرست کہ آوازہ منصور کہن شد	من بار دگر تازہ کنم دار و رسن را

سید امیر علی نے معتزلی ہونیکا اقرار کیا ہے اور مصر میں مولوی عبدہٗ کی آواز سر سید کی آواز کی بازگشت ہے، یہانتک کہ ہمارے نواب صاحب بھی اُسکو سُنکر تعجب سے پکار اُٹھے ہیں کیا سر سید نے مصر میں جنم لیا ہے۔ بحث کہاں سے کہاں چلی گئی کہاں فلسفے کا ایک مسئلہ، کہاں مذہبی بحث۔ کہاں مسئلہ ارتقا کے فلسفی، کہاں مذہب معتزلہ کے عالم، پس مناسب ہے کہ بغیر کسی اور تمہید کے نفس مضمون کی طرف رجوع کیا جائے ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ڈارون کے مسئلہ ارتقا اور ابن الحسن کی نظریہ کون کو علیحدہ علیحدہ پیش کیا جائے۔ تاکہ خیالات جدید اور قدیم کا تفاوت ظاہر ہو اور دونو کا پورا موازنہ ہو سکے۔

عالم موجودات جو مشاہدہ انسانی میں ہے مجملاً نظام شمسی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اسمیں لاتعداد ستارے اور سیارے شامل ہیں اور ہر ایک ستارہ

بذاتِ خود ایک سفید گرم آفتاب ہے جسکا تعلق اُس کی مخصوص زمین کے ساتھ ہے
چنانچہ ہمارے اپنے آفتاب کے ہمراہ کئی سرد اور تاریک کُرے ہیں جو کششِ ثقل کے
اثر سے اپنے اپنے محور کے گرد گھومتے ہیں۔ آفتاب اور اُسکے متعلق سب سے دُور
اُفتادہ کُرے کا فاصلہ اِس سے متصور ہو سکتا ہے کہ اگر ایک شہسوار حضرت موسیٰ
کے وقت سے سرپٹ ایک سے دوسرے کیطرف بغیر ایک ثانیہ بھی کہیں
توقف کرنے کے آج تک برابر دوڑتا تو ہرگز نصف سے زیادہ فاصلہ طے نہ کر پاتا
مگر یہ مختلف نظامِ شمسی بھی خود ایک دوسرے سے علحدہ نہیں ہیں بلکہ نظام جمیع عالم
کے مختلف اجزا ہیں جنسے موجوداتِ عالم نے ترتیب پائی ہے۔

مگر یہ نظامِ شمسی ہمیشہ سے یونہی نہیں چلے آتے اور نہ کسی خاص وقت میں خلق
ہوئے ہیں بلکہ اِن کے اجسام بجنسہٖ نباتی اور حیوانی اجسام کیطرح باوجود اسقدر
مرتب نظر آنے کے روئیدگی سے پیدا ہوئے ہیں جسکی اصلیت قدیم میں ایک
ایسے غبار سے زیادہ نہ تھی جسکے ذرّوں میں بوجہ حرارت اتصال نہ ہوسکتا تھا چنانچہ
مسلمان فلسفیوں کا قول ہے کہ تمام عالم جو پہلے اجزاے لایتجزّے کی شکل میں تھا،
اِن ہی ذرّات سے سالمات میں تبدیل ہوا ہے، یہ ذرّات قدیم الایام سے
یونہی چلے آتے ہیں اور اگر قدامت کے لفظ سے اِن کے مخلوق ہونیکا خیال پیدا ہو
یا تعدّدِ قدما لازم آوے تو کہا جائیگا کہ ازلی ہیں۔

مگر ذرّوں کی یہ حالت انفصال وقت کیساتھ تبدیل ہوگئی چنانچہ حرارت گھٹنے
لگی اور گھٹتے گھٹتے اسقدر کم ہوگئی کہ کششِ اتصال نے زور کیا۔ ذرّات ہم آغوش
ہونے لگے ایک نے دوسرے کو اپنی طرف کھینچا اور رفتہ رفتہ یہانتک پیوست
ہوگئے کہ ہمارے آفتاب کے ہیولیٰ کو ترتیب دیا۔

یہ انجمادی کیفیت بڑھتی رہی یہاں تک کہ آفتاب میں اسقدر برودت

پیدا ہو گئی کہ اُس نے ایک خاص شکل اختیار کی اور اپنے محور کے گرد گھومنا شروع کیا۔ اِس گردش کے اثر سے آفتاب نے ایک کرہ کی شکل اختیار کی اور اُن تمام کونوں اور اُبھرے ہوئے مقامات کو جو اِسکی کرویت میں مانع تھے اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ یہ بہت بڑے بڑے ٹکڑے تھے۔ چنانچہ دو بڑے ٹکڑوں نے زمین اور چاند کی صورت اختیار کی، بعض ستاروں اور سیاروں کی شکل میں تبدیل ہو گئے اور چند نے اور چھوٹے اجسام سماوی کی صورت اختیار کی۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری زمین سورج کی بیٹی ہے۔

جب ہماری زمین پہلے پہل آفتاب سے جُدا ہوئی تو شل اور اجرام فلکی کے ایتھر کے بحر نا پیدا کنار میں قیام کیا۔ ایتھر ایک ایسا جسم ہے کہ بہ لحاظ برودت برف کو اُسکے مقابل آگ کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ آفتاب ہر لحظہ اُس کے اثر سے سرد ہو رہا ہے۔ مگر چونکہ اُسکی جسامت اِتنی ہے کہ تا ابدالآباد سرد نہو سکیگا یہ کیفیت ہم پر منکشف نہیں ہوتی۔ خلاف اِسکے ہماری زمین کہ مقابلتاً بے بساط تھی تھوڑے ہی عرصے میں سرد ہو گئی یہاں تک کہ اُسکے تمام شرارے بجھ گئے۔ اور جسامت بھی جو بوجہ حرارت پہلے چاند تک پھیلی ہوئی تھی سُکڑ کر ہر طرف سے قریب تین سو میل کے گھٹ گئی۔ سال بر سال۔ صدیوں پر صدیاں اور قرنوں پر قرن گزرتے گئے اور یہ عمل جاری رہا یہاں تک کہ عمل کیمیاوی نے اِسکے ابتدائی جسم کو جو گاس تھا رقیق بنا دیا۔

اِسکے بعد اِس سیال زمین سے وہ زمین نکلی جسکو اب ہم خشکی سے تعبیر کرتے ہیں یعنی بقول شیخ سعدیؒ گستر و گیتی بر آب کا مضمون صادق آیا۔ یہ بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہو گا کہ یہ سمندر ابتدا میں سیاہ گرم اور شور تھے۔ بالآخر خشکی اور تری کے حصے کامل طور پر نمودار ہوئے اور ایک خاص نسبت دونوں میں قائم ہوئی چنانچہ گو جیسا کہ ہم روز دیکھتے ہیں خشکی تری کو اور تری خشکی کو نگل جانے کی کوشش کرتی ہے

مگر دونوں کی نسبت میں فرق نہیں آیا۔ جب زمین نے یہ صورت اختیار کی تو آفتاب کی روشنی جو بوجہ مزاحمت کہر اور غبار وغیرہ کے ابتک کامل طور پر اُس تک نہ پہونچ سکتی تھی اب پورے طور پر پرتو افگن ہوئی۔ اور اُس سے ایک عجیب نتیجہ ظہور میں آیا یعنی زمین میں اور ہستیوں کے پیدا کرنے کی قابلیت ظاہر ہوئی۔

سطح آب پر ہمیشہ ترمرے تیرتے ہوئے نظر آیا کرتے ہیں جو عموماً خاک کے ذرے یا کسی اور چیز کے اجزاے لاتیجزّے ہوتے ہیں۔ ابتداے آفرنیش میں بھی سطح آب پر ویسے ہی ترمرے پیدا ہوئے تھے گو اُن کے اجزا مختلف تھے یہی ترمرے ہستی کی ابتدا ہیں۔ اِن ہی سے بعض میں جب قوّت نامیہ نے زور کیا تو اُنھوں نے اپنے ہی سے اور ترمرے پیدا کئے۔ اور علاوہ ازین اپنی ہیئت کو بھی تبدیل کیا۔ یہ ترمرے نباتات کی ابتدا ہیں۔

یہانتک ہم نے آفرنیش کا حال ذرّات سے سالمات، سالمات سے جمادات، اور جمادات سے نباتات تک بیان کیا ہے اور یہان تک "مسئلہ کون" کے فلسفی مسئلہ ارتقا کے ماننے والوں سے اصولاً متفق ہیں مگر اب اختلاف پیدا ہوتا ہے چنانچہ اوّل مسئلہ ارتقا کو بیان کیا جائیگا اور اُس کے بعد کون کی نظریہ کو علیحدہ پیش کیا جائیگا۔

"ارتقا" جیسے نباتات کی ابتدا ترمروں سے ہوئی تھی ویسے ہی حیوانات کی بھی ہوئی۔ خاص امتیاز دونوں میں یہ رہا کہ نباتی ترمروں کی خوراک پانی اور ہوا تھی اور حیوانی ترمروں کو علاوہ ازین روشنی کی بھی ضرورت تھی۔ اِن تینوں قوتوں کے اثر سے بعض ترمروں نے بذریعہ نمو اسقدر قابلیت حاصل کی کہ اپنے سے چھوٹے ترمروں کو جذب کر لیا اور بجاے سادہ جسم کے ایک مرکب جسم بن گئی یہ ترمرے مجموعہ ہو گئے تھے اور خانوں کی صورت اختیار کی اور اِن کی غذا انباتی اجزا

تھے اور انھیں سے یہ بڑھتے تھے۔ بعض خانوں نے قوتِ نامیہ کے اثر سے اپنے اندر ایک اور خانہ بنایا یہ نشو ونما اور ارتقار حیوانی کی ابتدا ہے۔ بعض نے ایسا ہی خانہ تیار کیا مگر اسکو اپنے جسم سے متصل نہ رکھ سکے اور وہ علٰحدہ ہوگیا یہ تناسل کی ابتدا ہے چنانچہ رفتار وقت کیساتھ نباتی اجزائے کائی سمندری بیلوں گھاس وغیرہ کی شکل سے گذر کر جن میں کوئی تخفیص جنسیت کی نہ تھی اور کوئی پھول پھل نہ پیدا ہوتے تھے بالآخر اِن تمام اشجار کی صورتیں اختیار کیں جو اِسوقت موجود ہیں۔ حیوانات کا ارتقا بھی ایسے ہی ہوا۔ چونکہ اوّل اوّل کرۂ زمین کی آب وہوا کاربن کے اثر سے نہایت زہریلی ہورہی تھی سوائے حشرات الارض کے خود بہ تقاضائے فطرت اور حیوانات پیدا نہ ہوئے مگر رفتہ رفتہ جب یہ اثر معدوم ہوگیا تو اُن میں سے بعض نے پرندوں کی صورت اختیار کی پرندے حیوانات میں تبدیل ہوگئے۔ یہاں تک کہ ارتقا کا ظہور بندر کے کالبد میں ہوا اور آخری تبدیلی کا وقت آگیا یعنی خود خلیفۂ روئے زمین حضرت انسان تنگنائے عدم سے فراخنائے ہستی میں داخل ہوئے۔ اور جسمانی ارتقا کے دروازے بند کردیے گئے۔

اب اِن کی حکایت سُنئے۔ اوّل اوّل انسان کی حالت کسیطرح بھی بندروں اور گلہریوں سے بہتر نہ تھی۔ اُسکی خوراک یا تو خودرو پھول پھل تھے یا اپنے سے کمزور جانور جنکے گوشت کو وہ اُسی مزے سے کھاتا تھا جیسے خود اُسکا گوشت قوی تر جانور کھاتے تھے۔ تمدّن کا بالکل پتہ نہ تھا۔ چنانچہ عریانی اُسکا بہترین جامہ تھی۔ اِس کے بعد اُسنے شبانی کی حالت میں قدم رکھا۔ اب اُس کی ملکیت میں بہت سے پالتو جانور تھے۔ چنانچہ اُس کی معاشرتی اور اقتصادی حالت قائم ہوچلی تھی۔ مگر اُسنے یہیں قیام نہیں کیا بلکہ بامِ ترقی پر برابر چڑھتا گیا۔ اور زراعتی حالت میں قدم رکھا اور اُن مخفی طاقتوں کو جو زیرِ زمین پوشیدہ تھیں دریافت کرلیا یہاں تک کہ بالآخر تمدّن کے لحاظ سے اعلیٰ درجے کا تہذیب یافتہ کہلانے لگا۔ سیاست کے اعتبار سے شخصی، دستوری

اور جمہوری حکومتوں کا مالک بنا- اقتصادی اعتبار سے محنت، سرمایہ- اور زمین کا بہترین استعمال کرنے لگا- علمی ترقی کی حیثیت سے سائینس میں مشاہدہ اور تجربہ کے میدان کو فتح کرلیا- اور فلسفے میں تخیل کے بہت سے نئے عالم پیدا کئے- یہان تک کہ قانونِ عالم سے تابع رہکر عالم کے ہیوسلے کو تبدیل کردیا-

مگر ابھی تک ہمت بڑھی ہوئی ہے ارادے بلند ہیں- یہ تمام ترقی تو آیندہ کی محض ایک دلیل ہے- اِسوقت انسان نہیں بتا سکتا کہ کس خاص صورت میں وہ ترقی ہوگی- مگر کبھی کبھی یوں سوچتا ہے کہ میں عنقریب (گو بلحاظِ اصول ارتقا اِسکے معنی ہزاروں برس کی ہی ہوں) ایک ایسی طاقت دریافت کرونگا جو بخار اور بجلی کی جگہ لیگی- اور جسکے ذریعے سے وہ تمام کام جنکے پورا کرنے سے جرِ ثقیل عاری ہے- دم زدن میں تکمیل پا سکینگے میں ہوائی اور راور ذرائع آمد و رفت کی امداد سے وقت اور فاصلہ پر غالب آجاؤنگا اور تمام جغرافیہ اور قومیت کے اختلافات کو آناً فاناً مٹا دونگا- خوراک اور گوشت کی پیداوار کو ایسے عمل کیمیاوی کے ذریعے سے جو اُس عمل کے مشابہ ہوگا جو نباتات اور حیوانات کی پیدایش اور نمو میں قدرتاً ظہور پزیر ہوتا ہے اور جسکا راز اب تک مخفی ہے عمل میں لاؤنگا- اُسوقت خوراک لاتعداد مقدار میں بغیر کسی صرف کے پیدا ہوسکیگی اور فاقہ اور قحط کو ہمیشہ کے لئے روی زمین سے رخصت کردیا جاویگا- آبادی روزافزون ترقی پر ہوگی- مگر بقول حکیم مالتھس قحط کے ہاتھوں تباہ نہ ہوگی- بلکہ خلاف اِسکے ہماری زمین باغِ عدن کا نقشہ ہوگی جسکا ہر شخص خوشوقت اور خوشحال ہوگا-

حکومتوں اور سلطنتوں کا کام مجالسِ تفریح کیطرح نہایت آسانی سے سرانجام پائیگا اور جو دلچسپی اب سیاسی امور میں لی جاتی ہے وہ علمی شعبوں میں تبدیل ہوجائیگی غربت اور امارت ماضی اور زمانۂ جہالت کے امتیازات رہ جاوینگے یہان تک کہ یہ اجسام جنھیں ہم زیب رُوح سمجھے ہوئے ہیں حقارت سے دیکھے جاوینگے- اور بندۂ بعد

کسی عملِ طبعی یا کیمیاوی کے جوہر سے اِسوقت ایسا ہی مخفی ہے جیسے کسی وحشی سے برق کی کیفیات، بہتر لباس سے مبدّل ہو جائینگے۔

بیماری کا قلع قمع ہو جائیگا۔ انحطاط کے اسباب کا دفعیہ ہو جائیگا۔ اور بالآخر بقا ایجاد ہو جائیگی۔ اُسوقت انسان کامل ہوگا۔ وہ خود خالق ہوگا، اور عوام کے خیالات کے مطابق خدا ہوگا۔ مگر نہیں۔ کہاں؟ حقیقتاً علۃ العلل سے جو حقیقی راز اور خدا ہے اتنا ہی دُور ہوگا جتنا اب ہے۔

کُون مگر یہ حکماے یورپ کا مسئلہ تھا، حکماے اسلام کا اس سے اختلاف ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ذرّات سے سالمات۔ سالمات سے جمادات اور جمادات سے نباتات تک وہ متفق علیہ ہیں۔ مگر اس سے آگے الحسن اور اُس کے ہمخیال یوں کہتے ہیں پہلے پہل نباتات کی ادنےٰ صورتوں کا ظہور ہوا اور کائی بیلوں اور گھاس وغیرہ کی قسم کے درخت پیدا ہوئے۔ اِنکے جسم مفرد تھے۔ اِن میں بیج پیدا کرنے کی قابلیت نہ تھی اِن میں پتّے نہ تھے اور نہ پھل پھول آتے تھے۔ عمر اِن کی بہت کم اور عموماً چند روزہ تھی۔ اکثر اُن میں سے خشکی پر نشو ونما نہ پاسکتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ سب نقائص دُور ہونے لگے اوّل درختوں نے زمین پر اُگنا شروع کیا اور عام گھاس اِس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اِس کے بعد اِن درختوں میں پتّے آنے لگے۔ تاکہ درخت کے خاص حصّے کو تپش سے بچائیں۔ اور نیز آفتاب ہی کے ذریعے سے اُس غذا کے انہضام کا جو درخت نے بذریعہ کشش انابیب شعری پانی سے حاصل کی تھی انتظام کریں۔ اِسکے بعد اِن میں پھول آنے لگے جو درختوں کا ایک ضروری جُز ہیں۔ پھول کے بعد درخت بار دار ہونے لگے۔ اور طرح طرح کے اثمار شیریں سے رونق پائی۔ اِس سے آگے بڑھ کر جنسیت کا امتیاز پیدا ہوا اور حیوانی زندگی کے ایک خاص وصف نے پہلے پہل نباتات میں ظہور پایا۔ درختوں میں نر اور مادہ ہونے لگے اور پولن ایک نر پھول سے خود یا ہوا میں اُڑکر یا شہد کی مکھی یا بھونرے کے طفیل دوسرے

اور وہ پھول تک پہنچنے لگا۔ خواص الاشیاء ان کہتے ہیں کہ یہ تمام اوصاف مجموعی طور پر کھجور میں نہایت اعلےٰ درجے تک موجود ہیں اور یہی نہیں بلکہ مثل حیوانات کے اس میں خاص خاص کاموں کے لئے قدرت نے اعضا مہیا کئے ہیں ہر درخت میں ایک دل ہی جو ان تمام اعضا کا مالک ہے اور اُس درخت کی حرارت کا منبع ہے۔ کھجور کی نباتی اعلےٰ شکل ہی پہنچکر نباتات نے ادنےٰ حیوانات کی حالت کی طرف رجوع کیا اور سب سے پہلے ایسے حیوانات کی صورت اختیار کی جو نصف نباتات اور نصف جاندار تھے۔ چنانچہ ایسے حیوانات کی سب سے عمدہ مثال وہ پھول ہیں جنکو یورپ کی شوقین خواتین اپنے لباس کی آرایش کے لئے استعمال کرتی ہیں اور جنہیں گو نقل مکان کی طاقت نہیں حرکت کی طاقت ضرور ہے۔ ان پھولوں کا اُگانا نہایت مشکل ہے اور مسٹر چیمبرلین کو ان کی داخت میں یدطولیٰ حاصل ہے ایسی حالت سے بڑھتے ہوئے ہم اُن حیوانات کی طرف آتے ہیں جو ابر مردہ موتی اور سیپ وغیرہ کے اقسام میں ہیں۔ ان میں گو سب صفات حیوانی موجود ہیں مگر اپنے مخصوص گھروں سے علٰحدہ ہونے کی طاقت نہیں۔ ان کے بعد اور پانی کے مختلف جانور اور حشرات الارض ہیں جو رفتہ رفتہ اور بہتر شکلوں میں تبدیل ہوتے گئے ہیں یہاں تک کہ پرند اور پرندوں سے چوپائے اور چوپائوں سے دو ہتے جانوروں تک پہنچے ہیں اور بالآخر بندر کی صورت میں آئے ہیں اور بندر کا ارتقا انسان ہے، جو اس زمین کا بادشاہ اور اُس سرزمین کی بادشاہت کا امیدوار ہے۔

مگر مسئلۂ کون کے مطابق ارتقا یہاں ختم نہیں ہو جاتا۔ انسان کو اس زمین کو باغ عدن بنانا منظور نہیں ہے بلکہ ایک اور ہستی کی صورت میں بدلنا ہے جسمیں کہ تمام خواص حیوانی حصے کہ جسم کو ایسے ہی ترک کر دینا لازم ہے جیسے کہ پہلی ہستیوں نے اپنے سے پہلی ہستیوں کے اجسام اور خواص کو بوقت ارتقا ترک کر دیا تھا جسم مرئی سے قطع تعلق کرنا مقصود ہے اور روح کو جو نور ہے اور جسم محصور نہیں

اِسقدر جلا دینا منظور ہے کہ عکسِ الٰہی اُس میں پرتو افگن ہو سکے۔

یہاں پر یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ روح اُسوقت بھی موجود تھی جب دریای ناپیدا کنار جوش مار رہا تھا اور ہستی کے ابتدائی خانے تیار ہو رہے تھے۔ اُس وقت بھی تھی جب سبزہ کائی کی صورت میں لبِ آب اُگا تھا اور اُسوقت بھی جب کھجور پر نباتی ارتقا ختم ہو اتھا۔ اُسوقت بھی جب ابرِ مُردہ تہِ آب بڑہ رہا تھا اور اُس وقت بھی جب بندر ارتقا جسمانی کے قریب الاختتام ہونے کی خبر دے رہا تھا۔ اور اب وہی رُوح حضرتِ انسان کے کالبدِ خاکی میں مستور ہے۔

مگر چونکہ رُوح اُسوقت کثیف اجسام میں تھی۔ ناقابل اجسام میں تھی اور ادنے اجسام میں تھی۔ اُسکی کیفیات مُنکشف نہ ہو سکتی تھیں، جب انسان کے قالب میں آئی تو کسیقدر ظہور پایا مگر نہ اِسقدر کہ اِسکا وجود یقین کو پہنچ جاوے۔ بعض نے اقرار کیا، بعض نے انکار کیا، بعض نے شک ظاہر کیا اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے تھا۔ ابھی ارتقا باقی ہے۔ جیسے انسان کے دنیا میں آنے سے پیشتر کوئی شخص بندر کو دیکھ کر نہ بتا سکتا تھا کہ اسکے بعد انسان کی آمد ہے ویسے ہی کوئی شخص روح کی نسبت جو ارتقا کا آیندہ قدم ہے تمام باتیں نہیں جان سکتا۔

جب انسان کی یہ حالت پیدا ہو جائیگی اور جسم سے قطع تعلق کر کے عالمِ قدسی میں قدم رکھیگا اُسوقت اُسکو مکمل کہہ سکینگے۔ اور اُسیوقت وہ امانتِ ربّانی کے اُٹھانے کے قابل ہو گا۔ اُسوقت اُسکے اور اُسکے خدا کے درمیان کوئی حجاب نہ ہو گا۔ اور ہر دم بے خود ہو کر یہی سوچیگا، یہی کہیگا، یہی دیکھیگا، اور یہی سُنیگا ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تا کس نگوید بعد ازین من دیگرم تو دیگری

عبدالرحمن بھواری۔

خواب میں ایک عدالت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیکھا ہے یہ میں نے رات کو خواب	اک جا ہیں بہت سے جمع احباب	ایسا جمِ غفیر ہے وہ	اک عرصۂ دار و گیر ہے وہ
کہتا ہے ہر ایک اپنی اپنی	کوئی سُنتا نہیں کسی کی	سوچا میں نے کہ بات کیا ہے	مجمع کیسا یہ ہو رہا ہے
بے وجہ نہیں یہ گڑبڑی ہے	شاید کوئی بحث آپڑی ہے	یہ سوچ کے میں بھی جلد پہنچا	دیکھوں پیش آیا ماجرا کیا؟
جاکر جو ہوا میں اُنمیں داخل	دیکھا تو سب اہلِ فن ہیں کامل	مجمع اہلِ سخن کا ہے وہ	جلسہ اربابِ فن کا ہے وہ
فرداً فرداً ہر اک کو دیکھا	نکلیں سب صورتیں شناسا	جتنے مشہور اہلِ فن ہیں	وہ سارے شریکِ انجمن ہیں
ہیں بزم میں صدرِ انجمن میر	ہے سب سے زیادہ اُنکی توقیر	دائیں جانب ہیں اُنکی سودا	بایاں پہلو ہے مصحفی کا
حاتم بیٹھے ہیں پاس ہی وہ	اور اُنکے قریب ہے ولی وہ	وہ مُنہ جو چڑا کے ہیں ہنساتے	انشاء اللہ خاں ہونگے
تلوار لیے کھڑے ہیں آتش	سب سے قد میں بڑے ہیں آتش	ناسخ وہ قریب ہی ہیں اُنکے	ہیں سب میں جسیم اور موٹے
غالب بیٹھے ہیں ننگے سر وہ	مومن کی ہیں پاس ہاتھ سر پر وہ	وہ دیکھیے ذوق مُسکرائے	بیٹھے ہیں قلق وہ سر جھکائے
وہ رند و وزیر بھی ہیں بیٹھے	آباد و نظیر بھی ہیں بیٹھے	وہ دیکھو اسیر نکتہ داں ہیں	وہ دیکھو امیر خوش بیاں ہیں
چپکے ہیں کھڑے ہوئے ادب سے	مہتر کے ہیں پاس دور سب سے	عزت سے کھڑے ہیں جان صاحب	یہ بھی ہیں خدا کی شان صاحب
پیچھے کو جو دیکھتا ہوں مُڑ کر	اِس سمت بھی ہیں بہت سخنور	کچھ لوگ تو صورت آشنا ہیں	باقی جو ہیں سب وہ بے پتا ہیں
حالی بیٹھے ہیں صدر بنکر	کالی ٹوپی ہے اُن کے سر پر	وہ باندھے ہیں جو کہ سبز پگڑی	آزاد اُردو کی ہیں مُربّی
سید اکبر حسن وہ آئے	ارشد وہ دیکھو مُسکرائے	جاکٹ پتلون کوٹ پہنے	یاں اور بھی ہیں بہت سے بیٹھے
	لیکن پہچانتا نہیں میں	اِن لوگوں کو جانتا نہیں میں	
پھر میں نے اُدھر جو مُڑ کے دیکھا	طُرفہ نظر آیا اِک تماشا	پریاں بیٹھی ہیں دو بصد ساز	مصروفِ ادا و غمزہ و ناز
ہر ایک کا حُسن مایۂ ناز	ہر ایک کا ہے جُدا جُدا انداز	اِن دو نو میں ایک جو بڑی ہے	پوشاک سب اُسکی ریشمی ہے
اُسپر بالکل لدا ہے زیور	بالی کانوں میں سر پہ جھومر	گردن میں پڑی ہے اُسکے حمائل	بیٹھی ہے وہ میر کے مقابل

دلکش ہی جمال اُس پری کا آنکھیں ہیں کہ جو ہیں وہ دونوں دلچسپ ہے گفتگو کا انداز	گویا ہی وہ سحر سامری کا تصویر یہ سرور ہیں وہ دو لب ہر ایک فقرہ ہی اُسکا اعجاز	ہر عضو مناسب اور دلچسپ پیوستہ ہیں دونوں اُسکی ابرو سانچے میں ڈھلا ہوا ہر اک لفظ	ہی اُسکا ہر ایک طور دلچسپ کالے کالے سیاہ گیسو کانٹے میں تلا ہوا ہر اک لفظ
وہ اور جو دوسری پری ہی ململ کی سفید ایک چادر گو ہی وہ حسین و خوبصورت آنکھوں کی بھی ساخت ہی نرالی یورپ سے ہی یہ ضرور آئی	اُس میں بھی عجیب دلبری ہے ڈالی ہوئی ہی وہ اپنے سر پہ چہرے پہ مگر نہیں ملاحت بھوری ہی ہیں پتلیاں نہ کالی صورت نہیں اسکی ایشیائی حالی کے قریب تھی یہ بیٹھی	سادہ پوشاک اُسکی ساری زیور سے ہر ایک عضو خالی گورے گورے ہیں گال اُسکے پہلے جب میں نے اُسکو دیکھا یہ حسن نہیں ہی ایشیا کا جنٹلمینوں کو دیکھتی تھی	بوٹا ہی نہ گل نہ مینا کاری کانوں میں نہ بجلیاں نہ بالی بھورے بھورے ہیں بال اُسکے دل میں یہ مرے خیال گذرا بگڑا ہوا میم کا ہی خاکا
میں نے اِک شخص سے یہ پوچھا کس واسطے یہ ٹھنی ہی رن کی آراستہ وہ جو اِک پری ہی جتنے ہیں غرض کہ یہ سخنور وہ دوسری جو پری ہی بیٹھی کہتے ہیں یہ شاعری ہی اچھی جتنے ہیں یہ نوجوان ہمارے ہوتا نہیں فیصلہ کچھ اِسکا	کس واسطے یہ ہوا ہی جلسا دو صف ہوئی کیوں اِس انجمن کی اُردو کی قدیم شاعری ہی آئے ہیں اُسکی ابتدا سے یہ صورت ہے جدید شاعری کی اُس سے یہ سخنوری ہی اچھی سفتوں ہیں اسی پری پہ سارے دعویٰ کِسکا ہی اِنمیں سچا	پریاں یہ کِسلئے ہیں آئی اُسنے کہا یہ جو دو پری ہیں یہ میر یہ مصحفی یہ سودا کہتے ہیں یہ جان ہے سخن کی موجودہ سخنوران عالی انداز نئے تمام اِسکے عرصے سے چھڑی ہی درمیاں میں دونوں میں ہی ٹھیک بات کسکی	ہی کون سی بات پر لڑائی اُردو کی یہ دونوں شاعری ہیں ناسخ۔ آتش۔ اسیر۔ انشا ہی روح یہ شاعری کی فن کی ارشد، اکبر، نظیر، حالی شیدا ہیں خاص و عام اُسکے یہ بحث پڑی ہی درمیاں میں اب کونسی شاعری ہی اچھی
میں نے یہ کہا کہ بات کیا ہے	آسان اِسکا تو فیصلہ ہی دونوں کی بیان جب سنونگا	اپنا دعویٰ ہر اک سنائے قطعی میں فیصلہ کرونگا	جو جو ہوں ثبوت اُنکو لائے
آراستہ وہ جو اِک پری تھی سنئے صاحب بیان میرا	یعنی جو قدیم شاعری تھی ہی آج ہی امتحان میرا	یہ سُنکے کھڑی ہوئی ادب سے جو اہل سخن ہیں خوب ماہر	بولی وہ خطاب کر کے سب سے اُنپر حالت ہے میری ظاہر

دہلی ہی میرا مسکنِ خاص دہلی کی چمن کی ہوں میں بلبل	رکھتی ہوں میں لکھنؤ سے اخلاص ہو مست مری صدا سے اہرِ گل کچھ ایسی ویسی میں نہیں ہوں	اربابِ سخن کا نور ہوں میں زندہ کُنِ نامِ لکھنؤ ہوں شاہانِ اودھ کی ہمنشیں ہوں	اُن کے دل کا سرور ہوں میں میں اہلِ سخن کی آبرو ہوں
جتنے ہیں یہ بزرگ صورت غالب کو ہی شوق میرا غالب ہی آبرو مجھ سے آبرو کی جتنے ہیں غرض سخن کی استاد آراستہ مجکو کرتی ہیں یہ	رکھتے ہیں مجھسے خاص الفت رہتا ہی وہ جان و دل سے طالب عین آرزو ہوں میں آرزو کی رہتا ہی ہر ایک مجھ سے دلشاد میری صورت پہ مرتے ہیں آ	ہی میر مری ادا پہ شیدا اعجاز جو میرا دیکھ پایا گویا کی میں نفسِ ناطقہ ہوں لکھوں جو میں نام اُنکی اکسیر بیحد چاہتے ہے اِنکو میری	سودا کو ہی سر میں میرا سودا مومن ایمان مجھپہ لایا سالک کے لیے میں رہنما ہوں بھر جائینگے بیسیوں ہی دفتر میں عین خوشی ہوں انکے دل کی
ایسا تر و تازہ ہی مرا باغ ہر پھول کا ہی جدا جدا رنگ گر پھول کسی غریب کا ہے موزوں ہی ہر ایک میرا شیوہ	رضواں کی بھی دل میں جس سے ہیں داغ ملتا نہیں اک سے ایک کا رنگ مرثیہ وہاں پہ ہو رہا ہی ملحوظ لحاظ ہر کسیکا	کلیاں سب دل لبھانے والی شادی کا جو ہو کہیں پہ جلسا دیتی ہوں کسیکو تہنیت میں ہر انجمنوں میں ہوں میں داخل	ہر پھول کی ہی ادا نرالی لیجاتی ہوں میں بنا کے سہرا کرتی ہوں کسیکی تعزیت میں ہر بزم میں مجکو بار حاصل
سودا نے لکھا ہی جو قصیدا لکھی ہی حسن نے مثنوی خوب	ایسا اب کیا کوئی لکھیگا سارے عالم کو ہی وہ مرغوب ہوں بزمِ مشاعرہ کی بنیاد	لکھی جو میر نے غزل ہی گلزار نسیم بھی ہے دیکھی ہر اہلِ سخن سے پاتی ہوں داد	سبحان اللہ بے بدل ہی اُس سے کھلتی ہی شان میری
پرواز مری بلند تر ہے کرتی ہوں بیاں میں عرش کے راز جتنے اسرار ہیں نہانی ناکامی و یاس و رنج و حسرت	جب دیکھیے آسمان پر ہی ہوں طائرِ قدس کی ہم آواز سُن لیجیے سب کی زبانی بیتابی و سوز و دردِ فرقت	بڑھتی ہوں کبھی کبھی یہاں تک ہی حُسن کا امتیاز مجھ سے فریاد و فغان و آہ و زاری اِس طرح سے کرتی ہوں بیاں میں	جاتی ہوں مکاں سے لامکاں تک ہی عشق کا سوز و ساز مجھ سے اُمیدِ وصال و کامگاری ہو جاتی ہوں محوِ داستاں میں
ہوں شرم کی اور حیا کی تصویر ہی باغ و بہار کا کہیں ذکر	انداز کی اور ادا کی تصویر رخ کا رخسار کا کہیں ذکر	ہی جوشِ شباب کا کہیں ذکر بارش کا کبھی بیان سُنیے	مے اور کباب کا کہیں ذکر رحمت کی داستان سُنیے

	جتنے ہیں لطف زندگی کی	عنوان بنے ہوئے ہیں میرے	
ہی دافعِ غم مرا ترانہ جتنے ہیں رموزِ آشنائی کرتی ہوں جو حال اُسکا تحریر	میں عیش و خوشی کا ہوں خزانہ سب ہیں حاصل مجھی رسائی میں بزم کی کھینچتی ہوں تصویر ہر بات ہی اُسکی خنجر و تیر	ہو لبس میں غمِ فراق میں ہو دلچسپ ہیں سیر سارے حالات لکھتی ہوں جو حال رزم کا میں ہر لفظ ہی نیزہ اور شمشیر	ہمدم تپِ اشتیاق میں ہو دلکش ہیں سب مگر خیالات بن جاتی ہوں خود ہی معرکا میں
کرتی ہوں میں جب مذاق کی چوٹ	ہو جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب لوٹ عالم میں ظریف کوئی مجھسا	سن لے جو ظرافتوں کو میری پیدا ہوا آجتک نہ ہوگا	ہلسندی مردہ ہے مردہ دل بھی
دنیا میں وہ بات کونسی ہے علمِ تشبیہ و استعارات پیدا انہیں سے تو ہی نزاکت	جو مجکو نہیں خدا نے دی ہے ہی اسکی تو مشق مجکو ونزاکت گر ہو نہ رعایتِ بلاغت	جتنے فن ہیں وہ مجکو حاصل یہ علم بدیع اور بیاں کا ہو لطف کلام میں حاصل	ہر علم میں ہر ہنر میں کامل آغاز ہی میری داستاں کا گر ہو نہ فصاحت اسمیں شامل
زندہ دل مردہ دل جوان پیر	کرتی ہوں ہر اک کے دل میں تاثیر اسرارِ نہانکی ہوں میں تصویر	نیرنگ اثر کھپا ہی مجھمیں جادو کا اثر بلا کی تاثیر	اعجاز بھرا ہوا ہے مجھمیں
جو بات ہے مجھمیں شاعری کی ترکیبیں تمام سیدھی سادی گلشن کا نہ لالہ زار کا ذکر کچھ راز و نیاز کا نہ جھگڑا کچھ ذکر نہ عاشقی کا اسمیں الفت کا بیاں نہیں ہی اسمیں اشعار نہ اسکے نزہت آگیں	اعجاز کی سحرِ سامری کی چستی نہیں نام کو ذرا بھی گل کا ہی نہ ہی بہار کا ذکر کچھ سوز و گداز کا نہ جھگڑا کچھ رنگ دل لگی کا اسمیں توصیفِ بتاں نہیں ہی اسمیں کچھ اسمیں چٹپٹے مضامیں	وہ طرزِ جدید میں کہاں ہے مضموں نہیں کچھ اسکی شوخی اسمیں تو نہ حسن کا فسانہ سودا کا نہ کچھ جنوں کا چرچا اسرار نہاں نہیں ہیں اسمیں اسمیں کسی کا ہی سراپا دلچسپی کے ہیں جتنے ساماں	پھیکا پھیکا بیاں ہی بالکل ہی یہ شاعری ہے روکھی مضمون نہ اسکا عاشقانہ غم کا نہ تپِ دروں کا چرچا فریاد و فغاں نہیں ہیں اسمیں کچھ ذکر نہ حسنِ جانفزا کا اسمیں سے نہیں ہے ایک بھی یاں
اسمیں کمبخت کیا دھرا ہی کوہ کا جھیل کا ہی قصہ	جو ہے بلی کا تذکرا ہے دریا کا جھیل کا ہی قصہ	صحرا کا کبھی بیان سنئے سنئے تو عجیب داستاں ہی	جنگل کی داستان سنئے چوٹی کا پہاڑ کی بیاں ہی

الّو یہ کبھی یہ مبتلا ہے عنوان سب اسکے نفرت انگیز	بندر کبھی اسکا آشنا ہے پھر کہتی ہے خود کو یہ دلاویز	کتے کا کبھی ہے ذکر کرتی کس چیز پہ ہے یہ ناز کرتی	ایسی چیزوں پہ ہے یہ مرتی ہے کونسی بات اسمیں اچھی!!
یہ سنکے وہ شوخ مسکرائی بیجا ہے ترا یہ سارا دعوے عنوان ہے تیرا بیحیائی جھوٹا نہیں کوئی تجھ سے بڑھکر	بولی اب میری باری آئی جھوٹا اور کسقدر ہے جھوٹا ہر وقت ہے ذکر آشنائی طوفاں ہے تو جھوٹ کا سراپا	تو قصہ بیان کر چکی سب لعنت ہے ترے چپیٹے بیاں پر ہر لحظہ ہے عشق ہی کا چرچا جتنے یہ قدرداں ہیں تیرے	میں بھی کہتی ہوں سن اب اپنی لعنت تری حسن داستاں پر دلمیں الفت ہے سر میں سودا لاغی ہیں دروغگو ہیں جھوٹے
الفت میں بنا ہے کوئی مجنوں ٹوٹا کوئی آبلہ جو اسکا	ہے رہ نورد دشت و ہاموں پھر دشت میں آ رہا ہے دریا	ننگا جنگل میں پھر رہا ہے برسائے جو اشک دیدۂ تر	غول دشتی میں ملگیا ہے جاری ہو جائے اک سمندر
پوچھو نہ شب فراق ان کی سرگرم فغاں ہیں اسطرح سے یہ حال ہے سوزش دروں کا	ہے بخت سیاہ سے بھی کالی نالے گئے لامکاں سے آگے کی آہ تو گھر عدد کا پھونکا	آ جائی اگرچہ حشر پھر بھی توڑا کبھی اسنے آسماں کو فریاد میں انکی یہ رسائی	اس رات کی انتہا نہ ہوگی خود پھونکدیا کبھی مکاں کو تاثیر فلک سے کھینچ لائی
گیسو میں کسیکو پھنس گیا دل زلفوں میں کسیکی گم ہوا اب	ہے چھوٹنا اسکا سخت مشکل کچھ بھی لگتا نہیں پتا اب	مٹھی میں ہے وہ کبھی کسیکی ہے اسمیں تڑپ بھی اس بلا کی	دل ہے یا کھیل ہے یہ کوئی جسطرح سے کوندتی ہو بجلی
دیکھا جب یار نے نظر سے تصویر کیطرح سے ہیں خاموش	اک تیر نکلگیا جگر سے آتا ہی نہیں ہے اب انھیں ہوش	بیہوش ہیں جلوے کی چمک سے ہر لحظہ اسکی فکر میں ہیں	جاتی رہی عقل اک جھلک سے ہر وقت اسیکے ذکر میں ہیں
معشوق کی کوچہ میں پڑے ہیں ہیں مار بھی گالیاں بھی کھاتے	دربان اسیجگہ اڑے ہیں لیکن نہیں پھر بھی واں سے آتے	اٹھنا ہے محال واں سے انکا غیروں نے پڑا کہیں جو پالا	جنت سے بھی بڑھکے ہے وہ کوچا پھر اچھی طرح وہیں سنبھالا
لگتا ہی نہیں پتہ دہن کا لاکھوں اسمیں پھنسے ہوئے دل	معشوق بھی ہے عجب ہیولا تڑپا کرتے ہیں مثل بسمل ہر بار رفتار سے قیامت	پتلی کمر اسکی بال سے بھی گر چھوٹ گئے زلف سے اگر دل ہر ایک ادا ہے اسکی آفت	بڑھکر زلف اسکی جال سے بھی پھر پانو نکلے نیچے پسگیا دل
مرنا تو ہوا انکو ایسا آسان	دیتے ہیں بات بات پر جان	مرتے ہیں شرم اور حیا پر	جان دیتی ہیں ناز اور ادا پر

گفتار پہ یار کی ہیں مرتے جلوہ دیکھا تو مر گئے ہیں	رفتار پہ یار کی ہیں مرتے دنیا سے کوچ کر گئے ہیں تلوار ہے ان کو تیغ مژگاں	کرتے ہیں خوشی سے خودکشی یہ ہیں قتل کی آرزو میں مرتے پلکیں ہیں ان کے حق میں پیکاں	کھوتے ہیں بہار زندگی یہ قاتل کی ہیں جستجو میں مرتے
لاغر یہ ہوئے گل کے غم میں پنہاں ہیں برنگ آہِ بلبل	گو زندہ ہیں رہتے ہیں عدم میں مخفی ہیں مثالِ نکہتِ گل ہوتے ہیں کبھی نحیف ایسے	اڑتے ہیں ہوا کے دوش پر یہ آتے ہیں کبھی خیال بنکر غائب ہیں خود اپنی ہی نظر سے	آتے نہیں موت کو نظر یہ چھپتے ہیں کبھی ہلال بنکر
ہے موت میں بھی بہار ان کی جب لوگ وہاں سے ہیں گزرتے ہے قبر میں بھی یہ بیقراری	حسرت ہوئی سوگوار انکی اندر سے ہیں خود کلام کرتے لرزاں ہے زمیں ہائی سارا	ارمان ہے نوحہ گر لحد پر کہتے ہیں اثر تھا جذبِ دل کا اڑتے ہیں کبھی غبار بنکر	اور اس پہ ہے بیکسی کی چادر وہ فاتحہ کو یہاں جو آیا چڑھ جاتے ہیں یار کے یہ سر پر
کیسے بیڈھب ہیں یہ خیالات ہجویں سودا کی فحش ساری پھر رنگین کی شاعری کو دیکھو ہے بس انھیں لوگو پہ تجھے ناز	کیا مضحکہ خیز ہیں یہ حالات بالکل تہذیب سے ہیں عاری اس فحش سخنوری کو دیکھو ایسے ہی ہیں تیرے محرم راز	دیوانوں سے ہیں یہ لوگ بڑھکر تھے بھانڈ سے کم نہ میر انشا گر جان کی ریختی کو دیکھے جتنے یہ قدرداں ہیں تیرے	عقلوں پہ پڑے ہیں انکے پتھر ہر روز ہی سوانگ اک نیا تھا تہذیب - تو آنکھ بند کر لے محفوظ خدا بس ان سے رکھے
کچھ انکو نہ واعظوں کی حرمت لمبی داڑھی پہ اسکے طعنے	کچھ انکو نہ زاہدوں کی حرمت اونچی پگڑی پہ اسکے طعنے قربان تری ظرافتوں کے	گو شیخ سے کچھ نہیں سروکار کیا خوب مذاق یہ نکالا انداز ہیں تیرے سب انوکھے	اسیر پہ ملامتوں کی بوچھار دستار کو شیخ کی اچھالا
تہذیب نہیں ہے تجھمیں اصلا اخلاق بگاڑے سینکڑوں کے	اخلاق پہ بد اثر ہے تیرا گھر بار اجاڑے سینکڑوں کے دہلی کو کیا تباہ تو نے	اوباش بنا دیے ہزاروں شاہانِ اودہ کو تو نے کھویا کھو دی یہ تختگاہ تو نے	عیاش بنا دیے ہزاروں یہ ملک کا ملک ہی ڈبویا
اخلاقِ حسن کی میں ہوں بانی ہر شے کی جو فطرتی ہوں حالات	دنیا میں نہیں ہے میرا ثانی ہوتے ہیں وہی مرے خیالات	کہدیتی ہوں بات سچی سچی بالکل سادہ مری زباں ہے	میں تیری طرح نہیں ہوں جھوٹی تہذیب کے ساتھ ہر بیاں ہے

سنجیدہ متین میری تحریر لکھتی ہوں میں اچھے اچھے مضموں	مضموں کئی ہیں کھینچتی ہوں تصویر سائنس کے فلسفے کے مضموں	مخصوص صرف عشق پر ہوں میرا تیرا مقابلہ کیا	تو تنگ ہے میں وسیع تر ہوں ہے نور کہاں کہاں اندھیرا
دونوں کا بیان سن چکا جب بے فائدہ ہے باہم لڑائی دونوں میں نہیں ہے فرق کوئی تہذیب کا آگیا زمانہ پھر کیوں نہ ہو شاعری میں وسعت مضموں ہیں تمام اسکے پامال فطرت کے اثر بیاں کیے جائیں	یہ فیصلہ میں نے پھر کیا تب کچھ ہے نہیں یہ باہم لڑائی مفہوم ہے ایک شعر گوئی بدلا عالم کا کارخانہ پیدا کریں کیوں نہ اسمیں جدت ہر دم وہی حسن و عشق کا حال اسرار نہاں عیاں کیے جائیں	ناحق یہ باہم جدال ہے سب لفظی ہے باہم نزاع تم میں لیکن ہے زمانہ کا نیا دور جدت ہے عیاں اک اک ہنر میں کیوں عام کریں نہ اسکے عنوان پاکیزہ کوئی خیال تو ہو ہر بات میں شاعری کا ہو رنگ	بے وجہ یہ قیل و قال ہے سب سوچو تو ہے کم نزاع تم میں ہر شے کا بدل گیا نیا طور نکلی نئی شاخ ہر شجر میں کیوں حسن و عشق ہی ہو دین جاں کچھ جذبۂ دل کا حال تو ہو مضموں ہو ہر اک طلسم نیرنگ
یونان کی شاعری کی وسعت منطق کی غوامضات اسمیں	دیکھو تو ہو تمکو سخت حیرت اور فلسفہ کی نکات اسمیں	ہیئت کی بھر کمال اسمیں اسرار آتا ہے اثر جو ان کی دل پر	لکھتے ہیں نجوم کی وہ آثار کر دیتے ہیں نظم اسکو لیکر
پھر دیکھو عرب کی شعر گوئی آبا پہ کبھی مفاخرہ ہے سر سبز پہاڑ کا بیاں ہے	ہے یہ بھی وسیع کس بلا کی یاروں کا کبھی مذاکرہ ہے گلشن کبھی زیب داستاں ہے	ہیں اسمیں بہادری کے اسرار جوش فطرت کا ہے کہیں ذکر چرچا کبھی حسن و عشق کا بھی	ہیں اسمیں سپہ گری کے اذکار حق کی قدرت کا ہے کہیں ذکر بارش کا کبھی تذکرہ بھی
پھر سنسکرت کا پوچھنا کیا اصلاح مدن کا حال اس میں لکھتے ہیں جو نثر میں بیاں وہ	وہ تو گویا ہے ایک دریا اسلاف کہن کا حال اسمیں کر دیتے ہیں نظم میں عیاں وہ	ہے جوگ بھی فلسفہ بھی اسمیں موضوع نہیں ہے خاص کوئی منظوم ہیں علم انکے اکثر	اخلاق کا تذکرہ بھی اسمیں ہر شے پہ ہے عام شعر گوئی کچھ ختم نہیں ہے عشق ہی پر
پھر ہمکو وہ کیا ہے عشق کا پاس کیوں ذکر کریں ہم تو نکاح ہر دم یہ فحش نہیں تو اور کیا ہے کبتک خط و خال کا ذکر	اس فن کا کریں جو ستیاناس کیوں ان کے فراق میں رہیں ہم انصاف سے سوچیے روا ہے کبتک گیسو گال کا ذکر	کیوں عشق مذاق ہو ہمارا کیوں شیوہ ہو اپنا آشنائی دنداں و ذقن کا ذکر کبتک کبتک سوز فراق کا ذکر	کیوں کیجیے یہ جنوں گوارا کیوں لادیں سر یہ بیحیائی معدوم دہن کا ذکر کبتک کبتک تب اشتیاق کا ذکر

کیسی ہی لطیف داستاں ہو	کیا لطف جو رات دن بیاں ہو	دوہرانے میں بات کے مزہ کیا	کھاتے نہیں بار بار حلوا
چھوڑ دیہ قدیم داستاں آج	قصہ کوئی اور ہو بیاں آج	جبتک تھے قدرداں سب اسکے	تب تک تھے جہاں میں اسکے چرچے
اب رنگ نہیں وہ انجمن کا	کیا کام فسانۂ کہن کا	وسعت طرز سخن کو دیجے	محدود نہ عشق ہی پہ کیجے
	یہ فیصلہ سن کے بیگم و کات	سارا جلسہ ہوا وہ برخاست	

اسلم جیراج پوری۔
مدرسۃ العلوم علیگڈھ۔

"آہِ مظلوماں"

"بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید"

—— ※ ——
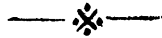
اسے خدا اسے پاک! آج ہم تیری درگاہ میں اپنی فطرت کے بالکل خلاف مردوں کے مظالم کی فریاد کرتی ہیں۔ الٰہی! ہماری فطرت ایسی نہیں ہے کہ ہم اپنی تکالیف و مصائب کی جو مردوں کے ہاتھوں ہمکو پہونچ رہی ہیں تیری درگاہ میں شکایت کریں۔ تونے ہم میں صبر و تحمل اور استقلال کا ایسا بیش بہا مادّہ ودیعت کیا ہے اور مہر و محبت اور وفا کا ایسا اعلےٰ جوہر عنایت فرمایا ہے کہ سخت سے سخت تکلیف بھی ہمکو حرف شکایت زبان پر لانے کے لئے آمادہ نہیں کرسکتی۔ لیکن خداوندا! اب حالت دگرگون ہوگئی ہے مردوں نے اپنی نادانی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے ہمپر جو مظالم آئے دن روا رکھے ہیں اگر انکا اثر صرف ہم ہی تک محدود رہتا تو ہمیں ذرا بھی رنج نہ ہوتا اور نہ ہمکو تیری درگاہ میں دست بدعا ہونے کی ضرورت ہوتی۔ لیکن افسوس ان کی ناعاقبت اندیشی کے ظالمانہ افعال کا خطرناک اثر خود ان تک پہونچ رہا ہے اور یہ برباد ہورہے

ہیں۔ اِن کی تباہی حد سے بڑھگئی ہے۔ دوسری ہم عصر اقوام کی نظروں میں اِن کی کچھ بھی وقعت نہیں رہی۔ اِنکو سوائے اِسکے کہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو یاد کرکے بیجا فخر و ناز کیا کریں اور کچھ نہیں آتا۔ اصلی تعلیم عنقا ہو گئی ہے۔ شایستگی و تہذیب کا اِنمیں پتہ نہیں۔ نہ تو کوئی دینی کام انجام دے سکتے ہیں اور نہ کسی دنیوی کام کے کرنے کی اِن میں قابلیت اور صلاحیت رہی ہے۔ بربادی کے سارے آثار اِنمیں پیدا ہو گئے ہیں۔ غرض ان کی ایسی بُری اور قابلِ افسوس حالت ہو گئی ہے کہ ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔

خداوندا! ہم کو اس بات کی شکایت نہیں ہے کہ یہ ہمپر سختیاں کر رہے ہیں اور ہمکو تباہ کر رہے ہیں۔ ہمیں منظور ہے کہ یہ ہمیں خوب جی بھر کر ستائیں اور ہمارا دل دُکھائیں لیکن انکی بُری حالت ہم سے نہیں دیکھی جاتی۔ یہ اگر ہمکو اپنے ظلم و تشدّد کے سبب صفحۂ ہستی سے یکقلم مٹا دینا بھی چاہیں تو ہمیں کوئی شکایت نہیں کیونکہ ہمیں ہر طرح انکی رضامندی اور خوشنودی منظور ہے۔ اگر انکی خوشی اِسمیں ہے کہ ہم یکدم فنا کردی جائیں تو ہمیں یہ بھی بسر و چشم منظور لیکن ہم سے اِنکی ردی حالت نہیں دیکھی جاتی۔ الٰہی! اِنکی حالتِ زار کو یاد کرنے سے ہمارا پُر درد دل بھر آتا ہے۔ اِن کی درد بھری کہانی بیان کرنیکے لئے ہماری کج مج زبان یاری نہیں دیتی۔ اے خداوند کریم! اِن کی یہی افسوسناک حالت ہے جو ہمیں اسبات پر مجبور کرتی ہے کہ اپنے خلاف فطرت تیری درگاہ میں فریاد کریں۔ خداوندا! مردوں ہی کی قابلِ افسوس اور واجب الرحم حالت ہمیں تجھسے دادخواہ ہونے پر مجبور کر رہی ہے۔ ہمیں اپنی مُصیبتوں کی کچھ بھی پرواہ نہیں۔ ہمیں اپنی ذلتوں کا ذرا بھی خیال نہیں۔ لیکن قلق ہے تو یہ ہے کہ ہمارے مردوں کی حالت اچھی نہیں۔ اے غریبوں کے دادرس! بکیسوں کے فریادرس ہم تیرے پاس مردوں کے مظالم کی فریاد اور اُن کی بیدادیوں کی شکایت کسی اور وجہ سے نہیں لائی ہیں بلکہ محض انہی کو خوابِ غفلت سے چونکانے اور اپنے ہاتھوں اپنی

بربادی کرنے سے باز رکھنے کی غرض سے۔ اے خداوند عزّوجل! مرد ہمارے ذلیل اور تباہ کرنے کے خیال میں اسقدر اندھے ہوگئے ہیں کہ اُن کی وہ تمام کوششیں جو ہماری بربادی کے لئے ہوتی ہیں خود اُن پر بھی پورا پورا اثر کر رہی ہیں۔ الٰہی! وہ اپنے جوش میں یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ اب تیری قدرت میں دخیل ہونا چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے نظامِ عالم کے شیرازے کو اپنی اِس خود پسندی، مطلب پرستی، خود غرضی، اور ظلم کی بدولت منتشر کر دیا ہے۔ ان کا ہر کام منشار تخلیق اور قانونِ قدرت کے خلاف ہوتا ہے اور اسکی وجہ سے ساری قوم پر تباہی برس رہی ہے۔ الٰہی! یہ لوگ تیرے مقرر کردہ قوانین کو درہم برہم کر رہے ہیں۔ ہر کام کو منشار قدرت کے خلاف نہایت بے اعتدالیوں سے پورا کرکے نظامِ عالم میں فرق ڈال رہے ہیں۔ اے خالقِ عالم! تو نے نوعِ انسان کے دو قدرتی حصّے مرد اور عورت پیدا کیئے اور دونوں کو ملاکر فردِ کامل بنایا۔ تیرے پیدا کئے ہوئے اِن دونوں جُدا جُدا پارٹ لینے والے کاریگروں کا ہاتھ جبتک دنیا کے کسی کام میں نہ لگے وہ کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ لوگ اسکے سراسر خلاف عمل کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے ہمیں بالکل بیکار کرکے گھر میں بٹھا دیا ہے اور غیر مکمل انسان رہکر قدرت کے اغراض پورے کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی بے سود کوششوں میں ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ناکامیاں ہوتی ہیں۔ نظامِ عالم کے چلنے میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں لیکن یہ اپنی چال سے باز نہیں آتے۔ صنعت و حرفت اِن سے چھن گئی ہے۔ زراعت و کاشتکاری میں ہر جگہ ناکام ہیں۔ افلاس و ناداری کی کوئی حد نہیں رہی ہے۔ انکی اخلاقی حالت نہایت نازک اور خراب ہوگئی ہے۔ یہ بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں۔ ایم۔ اے۔ بی۔ اے بنجاتے ہیں لیکن ان کی تعلیم ادھوری رہجاتی ہے۔ اِن کے دل و دماغ علم کی روشنی سے جیساکہ چاہیئے منوّر نہیں ہوتے۔ "چارپائے بر او کتابی چند"

کے پورے مصداق ہوتے ہیں اور کیوں نہوں جبکہ ان کا سب سے پہلا اسکول یعنی آغوشِ مادر نہایت ہی ابتر اور ذلیل حالت میں رہتا ہے۔ غرض انہیں دنیا کی تمام خرابیاں اور برائیاں پیدا ہوگئی ہیں اور ان کی بربادی وتباہی میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔ خدایا! ان میں یہ سب باتیں محض تیری نافرمانی کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہیں اور تیری کفرانِ نعمت کرنے سے یہ لوگ گرفتارِ نکبت وبلا ہوگئے ہیں۔ الٰہی! ان کو اتنی توفیق دے کہ یہ اپنی حالتِ زار پر رحم کریں اور تیری عدول حکمی سے باز آئیں۔ کیونکہ یہ تیرے منشاء کے خلاف ہکو ستا رہے ہیں اور اسکے زہریلے اثر سے خود برباد ہو رہے ہیں اسلئے ہماری طرف سے ان کے دل میں رحم ڈال کہ یہ اپنے مظالم سے باز آئیں۔ اے خداوندکریم! ہم اپنی حالت کی درستی کسی اور وجہ سے نہیں چاہتیں بلکہ محض اپنے مردوں کی بھلائی کے لئے۔ اور کیونکہ مردوں کی ردی حالت جب ہی سُدھر سکتی ہے جبکہ وہ اپنے ظلم وستم سے باز آکر ہم سے تیرے فرمان کے مطابق سلوک کریں۔ اسلئے اے خدائے پاک! ہم مجبوراً ان کے مظالم کی فریاد کرتی ہیں۔ اور تجھ سے دادخواہ ہوتی ہیں۔ اے بیکسوں کے حامی اور شکستہ حالوں کے والی! ہماری مصیبتوں اور صعوبتوں کی کوئی حد نہیں رہی۔ ہماری حالتِ زار پر رحم فرما۔ اے خداوندکریم! ان لوگوں نے ہمیں طرح طرح کی خرابیوں میں مبتلا اور انواع واقسام کی ذلتوں میں گرفتار کر رکھا ہے۔ ان ناقابل برداشت تکلیفوں سے نجات دلا۔ ہمارے آلام ومصائب کی کہانی اسقدر دردانگیز ہے کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ الٰہی! جسطرح تو نے کشتیِ نوحؑ کو طوفان سے نکالا تھا۔ ہمیں بھی گردابِ بلا سے نجات دے تاکہ مردوں کا ڈوبتا ہوا بیڑا ابھی سنبھل جائے۔ یا ارحم الراحمین! اپنے اُس محبوبِ پاک کا واسطہ جسکو تو نے رحمۃ للعٰلمین کا خطاب عطا فرمایا ہے، ہماری بیکسی وشکستہ حالی پر ترس کھا۔ اے غفور رحیم! تیرے محبوب خاص نے مردوں کو اس فریقِ انسانی پر سب سے زیادہ شفقت اور مہربانی اور کل دُنیا کے تمام دوسرے

اقوام و مذاہب سے زیادہ عورتوں کے حقوق کی طرفداری کی ہدایت فرمائی تھی۔ لیکن افسوس اپنے ہادی برحق کی ہدایت کے بالکل برخلاف اب یہ لوگ عورتوں کو انسان نہیں سمجھتے اور اُن پر ہر طرح کے جور و ستم کرتے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دنیا کے مہذب، شائستہ اور ترقی یافتہ اقوام انکو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انھیں اپنا ہمسر نہیں خیال کرتے۔ اے خداوند بے نیاز! و ذات بے ہمتا! تو نے ہمکو بھی مردوں کیطرح حواس و عقل و روح عنایت فرماکر اشرف المخلوقات کے معزز خطاب میں انکا شریک بنایا ہے لیکن یہ لوگ ہمکو تیری اس عنایت اور احسان سے یکلخت محروم رکھنا چاہتے ہیں اور افسوس اسلئے یہ خود ان نعمتوں سے پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اے وہ منتقم حقیقی! جسکی شان قہاری سے بڑے بڑے بادشاہ اور شاہنشاہ بھی کانپتے ہیں۔ اے وہ خداوند عادل! جسنے حضرت سلیمانؑ جیسے رفیع الشان و جلیل القدر پیغمبر کے مقابلے میں ایک ادنےٰ چیونٹی کی فریاد سُنی۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ تیری نافرمانی کرنیکا نہایت ہی بُرا انجام ہوتا ہے۔ اور انھیں معلوم ہے کہ فرعون، نمرود، شدّاد، ہامان اور قارون جیسے مقتدر جب تجھسے باغی ہوئے اور سرکشی کی۔ کِس ذلت سے ان کا خاتمہ ہوا۔ لیکن افسوس اتنا جانکر بھی یہ لوگ تیری مخالفت اور عدول حکمی اور نافرمانی سے باز نہیں آتے۔ اسی میں زندگی بسر کررہے ہیں۔ گناہ و خطاکاری کی مذموم عادتیں ان کے دلوں میں اسقدر راسخ ہوگئی ہیں کہ وہ ان کاموں کو عین ثواب سمجھنے لگے ہیں۔ الٰہی! تو نے ہماری اور مردوں کی تخلیق یکساں فرمائی۔ مردوں کی طرح ہمیں بھی ہاتھ پانوٗں۔ آنکھ۔ ناک۔ کان۔ منہ سب کچھ دیئے ہمیں بھی زیور عقل سے آراستہ فرمایا۔ اور تمام انسانی لوازمات و خصوصیات مردوں کیطرح ہمکو بھی دیں۔ لیکن ان خدائی فوجداروں نے ہم سے سب تیری عنایت فرمائی ہوئی نعمتیں چھین لی ہیں اور خود فرعونی بنکر ہمیں بنی اسرائیل کیطرح مصیبتوں اور

ذلتوں میں گرفتار کر ڈالا ہے۔ اور اسی لئے یہ خود اپنی دوسری ہمعصر، شایستہ اقوام کی نظروں میں حقیر و ذلیل ہو گئے ہیں۔ آہ! اے خدا اے پاک! تو نے ہمیں کیوں پیدا کیا۔؟ صرف رنج و غم کھانے، ذلتیں اٹھانے کے لئے۔ خداوندا! ہم نے اب تک کبھی حرفِ شکایت تک زبان پر نہ لا کر ان آلام کو بہ کشادہ پیشانی جھیلا ہے اور جسطرح ان لوگوں نے تیرے حکم کی خلاف ورزی کی ہے ہم بہ مقابل اسکے ان کے احکام کو نہایت تن دہی و مستعدی سے بجا لائی ہیں۔ لیکن ہائے یہ اسپر بھی ہمارے ستانے سے باز نہیں آتے۔

خداوندا! تو نے اور تیرے پیارے حبیب شفیع المذنبین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہماری نسبت جو جو احکام جاری کئے تھے اُن میں سے کونسا حکم ہی جسکی ان لوگوں نے توہین نہیں کی اور پس پُشت نہ ڈالا۔ اوّلاً تو یہ ہمارے دنیا میں قدم رکھتے ہی اسقدر کشیدہ خاطر اور رنجیدہ ہوتے ہیں کہ دو چار الفاظ ضرور ان کے مُنہ سے انکے دلی جذبات کا پتہ دینے کیلئے نکل ہی جاتے ہیں۔ ایک لاولد شخص بھی جسکو اولاد کی خواہش اعتدال سے ہزاروں لاکھوں درجے بڑھکر ہوتی ہے لڑکی کے پیدا ہونے پر ضرور ناخوش ہو جاتا ہی جسکی سزا ان کو یہ ملی کہ آج دنیا کے اکثر حصوں میں خود ان کے بھی قدم رکھتے ہی نفرت ظاہر کیجاتی ہے اور ان کے آنیکو طاعون کے آنیسے کم نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ بعض جگہ تو یہ فوراً ہی نکال باہر کئے جاتے ہیں۔ خداوندا! کیا تو نے انھیں یہ حکم دیا ہے کہ جب تیری رحمت لڑکے کی صورت میں ان کے گھر میں جائے تو خوشی کریں اور وہی رحمت لڑکی کی صورت میں نزولِ اجلال فرمائے تو رنج کریں۔

نہیں اے خدا! یہ بات تیری شانِ عدالت سے بعید اور نصفت پسندی سے دُور ہے۔ ہمیں اب معلوم ہو گیا ہے، اگرچہ ہمیں اسکے خلاف یقین دلایا جاتا ہے کہ یہ سب انھیں حضرات کے کرتوت ہیں۔ ہمارے پیدا ہونے ہی کے زمانے سے ہماری تمامی خوبیوں اور

او صاف کو ملیامیٹ کرنیکی کوشش جاری ہوجاتی ہے اور اُن تمام نیک و کار آمد قوتوں وجذبات کو جو تو ہمیں ودیعت فرماتا ہے برباد کرنے لگتے ہیں اُن قوتوں اور جذبات سے کام نہ لینے دینا عین ثواب سمجھا جاتا ہے - اور تیری قدرت کے مشاہدوں سے محروم اور تیری پیدا کی ہوئی نعمتوں سے دُور کردی جاتی ہیں - افسوس یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ اسی کی بدولت خود اِن سب کے اعلےٰ اعلےٰ جذبات اور قوتیں بیکار ہوجاتی ہیں - اور اِن کو حقیقی خوشی کی ہوا تک نہیں لگنے پاتی -

اے خدا اے پاک ! مردوں کو ہماری صورتیں اسقدر بُری معلوم ہونے لگتی ہیں کہ وہ ہمیں اپنے پاس زیادہ رکھنا بھی گوارا نہیں کرتے - ہمارے پیدا ہونیکے ساتھ ہی وہ اِس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ کسی نہ کسیطرح ہمیں نکال باہر کریں - جہاں کوئی ایسا شخص ملا جو ہمیں اپنی غلامی میں رکھنا منظور کرلے اُنھوں نے فوراً بلا تامل اُسکے حوالہ کردیا - الٰہی ! تیرے حبیب پاک نے جس رشتے اور معاہدے کو نہایت ہی اہم، مضبوط اور قابلِ ادب قرار دیا تھا اُن لوگوں نے اُسے بالکل بچوّں کا کھیل بنادیا - یہ ہمکو اپنے جائز اور ضروری حقوق کے مالک بھی نہیں سمجھتے - ہمیں اتنی بھی اجازت نہیں کہ تمام عمر کے لئے جسکے سپرد کیجاتی ہیں اُسکو پہلے ایک آنکھ دیکھ تو لیں - اور اتنا تو معلوم کرلیں کہ اسکے حرکات وعادات کو ہمارا ستم رسیدہ دل برداشت کرسکیگا ؟ خداوندا ! ہم اسیطرح اپنے نئے مالکوں کے حوالے کیجاتی ہیں جسطرح ایک زنجیر میں بندھا ہوا بیکس بیزبان جانور قیمت لینے کے بعد خریدار کے حوالہ کردیا جاتا ہے - مالک نے قیمت لی اور جانور کی زنجیر خریدار کو تھمادی - اور چلتا ہوا - بیچارا جانور پلٹ پلٹ کر اپنے پُرانے مالک کو حسرت واندوہ کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور کشاں کشاں نئے خریدار کے ساتھ چلنے لگتا ہے - اگر اُسنے چلنے میں ذرا بھی تامل کیا پھر تو اُسکی پیٹھ کی خیر نہیں - اے سمیع وبصیر ! بالکل یہی حالت ہماری بھی ہے - بلکہ اس سے بھی زبوں تر - کیونکہ بعض اوقات جانوروں کی اُن حرکات

پر رحم بھی آجاتا ہے۔ لیکن ہمارے بلک بلک کر رونے، آہ و بکا کرنے اور تڑپ تڑپ کر مر بھی جانے سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ خداوندا! اسکا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ شادی کے بعد ہی باہمی انس و محبت کی عوض جنگ و جدال شروع ہوجاتا ہے۔ اور خود مردوں کو بھی گھر قید خانے سے بدتر معلوم ہونے لگتا ہے۔ دونوں کی حالت نہایت افسوسناک ہوجاتی ہے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ اسی وجہ سے ہمارے مردوں کا اعتبار بحیثیت قوم دنیا سے اُٹھ گیا ہے شادی کے بعد اگر ہمارا اپنا مالک ہمکو ستا ستا کر اور ہمارے ستم رسیدہ دل کو اور بھی دُکھا دُکھا کر عین عالمِ شباب میں نشانۂ اجل بنگیا اور اپنے عزیز و اقارب کو اپنی جوانامرگی سے داغِ مفارقت دے گیا تو پھر ہم پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ نہ میکے میں آرام، نہ سسرال میں چین ملتا ہے۔ ہر دم اپنے پرایوں کی جھڑکیاں اور گالیاں سُنتے سُنتے ناک میں دم آجاتا ہے۔ دنیا کی تمام لذتیں اور نعمتیں جنکا ایک معتدبہ حصہ پہلے ہی سے ہم پر حرام رہتا ہے اب یکدم سب سے محروم کردی جاتی ہیں۔ لوگوں کی آنکھوں میں ایسی بدقسمت عورت منحوس اور نامبارک ہوتی ہے۔ اور ہر شخص حقارت کرنے لگتا ہے۔ اے خدا! ہمارے ہاں کی بیوہ عورتیں اگرچہ اپنے خاوند کی وفات کے بعد جلا نہیں دی جاتیں جسطرح کہ ہندؤوں میں ستی کی رسم ہوتی تھی لیکن ہماری مصیبتوں اور انواع و اقسام کی ذلتوں کے سامنے ستی کی کوئی حقیقت نہیں۔ موت کا ایک فوری رنج و تکلیف ہماری بیواؤں کی زندگی کے دائمی صدموں اور تکلیفوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ اے معبودِ حقیقی! کیا تیرا عدل و انصاف ہمپر ایسا ظلم روا رکھ سکتا ہے۔ اور تو نے مردوں کو ہم سے اِسی سلوک کا حکم فرمایا ہے؟ نہیں اے کریم! ہماری ناقص عقل بھی اِس بات کو نہیں مانتی۔ یہ بات تیرے عدل و انصاف سے سراسر بعید ہے۔ یہ بھی ضرور مردوں ہی کی عنایت ہے۔ افسوس ہمیں تیرے احکامات اور تیرے پیارے رسول کی ہدایات تک سے ذرا بھی واقفیت نہیں۔ ہم نہیں جانتیں کہ تیرے کیا احکام ہیں اور تو نے کون کون سے فرائض ہمارے

ذمے کئے ہیں۔ مردوں نے تو ہمکو یہی یقین دلایا ہے کہ ہم محض ان لوگوں کی خود پسندی و خود غرضی اور مطلب پرستی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ اور ہم بیوقوف، بے تمیز، ناقص العقل، پھوہڑ، بد سلیقہ، بیرحم، دیوانی، مجنوں، مختل الحواس، باولی، سڑن، پاگل، نالائق، نابکار، ناہنجار، گشتنی، گردن زدنی اور ننگِ خاندان ہوتی ہیں۔ اب تو ہمکو بھی اسپر کامل یقین ہوگیا تھا کہ ہم محض اسلئے پیدا کی گئی ہیں کہ مرد اپنے مظالم اور مکائد اور نفس پرستی کی مشق آزادی سے ہم پر کرسکیں۔ لیکن بعض منادی غیب ملک میں یہ صدا دے رہے ہیں کہ تو نے عورت و مرد کو برابر برابر حقوق دیے ہیں۔ اور ہم بھی اشرف المخلوقات ہیں۔ تو نے ہمکو مردوں کی ہر بات میں برابر کا شریک کیا ہے۔ اور تیری پیدا کی ہوئی تمام نعمتیں ہم دونوں کیلئے مشترک ہیں۔ مرد ہمارے بغیر اور ہم مرد کے بغیر انسانِ کامل نہیں کہلاسکتے۔ مردوں کا ہمارے ساتھ مروجہ سلوک تیرے فرمان کے بالکل خلاف ہے۔ تو نے اُن سے نہیں کہا ہے کہ ہمیں خانوں میں بند کر رکھو اور آفتاب چاند ستاروں تک سے چھپاؤ۔ ہم تک علم کی روشنی نہ پہونچنے دو۔ سوسائٹی سے الگ کردو۔ ہم سے انسانی فضیلتیں چھین لو۔ اور ہمکو زمرۂ انسانی سے خارج کرکے بہائم میں شامل کردو۔ اے قادرِ مطلق! کیا اِن غیب کے فرشتوں کی آواز صحیح ہے اور اِن لوگوں کا خیال درست ہے۔ ہمکو تو یقین نہیں آتا تھا کہ ہمارا اتنا بڑا مرتبہ ہو کہ ہم مردوں سے برابری و ہمسری کا دعوےٰ کرسکیں۔ اور ہم ہرگز اتنی بڑی گستاخی نہیں کرسکتے کہ مردوں کو اپنے برابر والا سمجھیں۔ خداوندا! ہم میں اتنی قوت ہی نہیں رہی کہ اُسکے جھوٹ یا سچ ہونے پر غور کرسکیں لیکن تو نے جن لوگوں کے دل میں ہماری بیکسی و شکستہ حالی کا درد دیا ہے اُن کی دلیلیں معقول معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کی دلیلیں اِسقدر یقینی اور واضح ہوتی ہیں کہ ہماری ناقص عقلوں اور ناکارہ دماغوں کو بھی وہ سچی ہی معلوم ہوتی ہیں۔ اُن سے بُوئی صداقت آتی ہے

وہ سچ کہتے ہیں کہ تونے جو چیزیں مردوں کو دی ہیں وہی ہمکو بھی بخشی ہیں۔ بلکہ تونے تو انھیں
ہمارا محتاج بنایا ہے اور ہمکو اُنپر شرف بخشا ہے۔ تونے ہمارے دلوں میں اُن کی محبت
ودیعت فرماکر اُن کی پرورش ایسی حالت میں جبکہ وہ ایک مضغۂ گوشت، ضعیف، نادان
لایعقل اور جاہل ہوتے ہیں ہمارے سپرد کی۔ ہم ہی اُن کو پالتے پوستے ہیں۔ اور تونے
اُن کے اخلاق کی تہذیب، اُن کے خیالات و اعتقادات کی تصحیح، اُن کے مزاج کی
اصلاح، اُن کے عادات کی درستی ہمارے ہی ذمہ فرمائی ہے۔ لیکن افسوس جب
وہ بڈ شعور کو پہونچتے ہیں اور ہماری استعانت سے کسیقدر مستغنی ہوجاتے ہیں تو
ہمارے احسانات کو ذرا بھی یاد نہیں رکھتے۔ اور اُلٹے ہمپر ظلم و تعدّی کرنے لگتے
ہیں۔ کیا ہم انھیں نو مہینے اِسی دن کے لئے پیٹ میں رکھتے ہیں اور اِسی لئے اِن کے
پالنے کی مصیبتیں اُٹھاتے ہیں کہ جب بڑے ہوں تو خود ہماری ہی خرابی، رُسوائی اور
فضیحت کے درپے ہوں۔ آہ! کیا خوب ہوتا اگر صرف اِتنی ہی بات ہوتی لیکن ہائے
یہ خود اپنے مظالم کے زہریلے اثر سے سخت متاثر ہورہے ہیں اور ان کی حالت ناگفتہ
بہ ہورہی ہے۔ ڈارون کی تھیوری ہے کہ انسان بندر سے بنتا ہے لیکن یہ لوگ
ہمکو انسانی حیثیت سے نیچے گراکر ہمیں آدمی سے بندر بنانا چاہتے ہیں اور افسوس تو
اِس بات کا ہے کہ یہ خود دوسری ترقی یافتہ مہذّب اقوام کی نظروں میں وہی ہوگئے
ہیں جو یہ ہمکو بنانا چاہتے ہیں۔ اے سمیع و بصیر! تو حاضر و غائب سب کچھ جانتا ہے
کوئی بات تجھسے پوشیدہ نہیں اسلئے ہماری مصیبتوں کی دردبھری کہانی کو تیری
درگاہ میں بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اے خدا اے پاک! شکستہ حالوں کے
حامی! بیکسوں کے یاور! ہمارا سوا اے تیرے کون ہے جسکے سامنے اپنے غم کا دکھڑا
روئیں اور اپنی ناگفتہ بہ حالت پر آنسو بہائیں۔ ہم نے اب تک نہایت ہی صبر و استقلال
سے کام لیا ہے اور اپنے عزیز مردوں کی جو باوجود ان مظالم کے بھی ہمیں جان سے

پیارے ہیں کبھی شکایت نہیں کی لیکن بیخودی میں کبھی کبھی جو آہیں نکلگئی ہیں انکا دھواں آب
ہماری قوم پر چھاگیا ہے اور وہ دن کوئی دور نہیں جبکہ یہ دھواں وہی بدلی بن جائیگا جو قوم
عاد کے سر و نپر چھائی تھی اور جسنے آن واحد میں اُس ناخدا شناس قوم کو فنا کردیا تھا۔
اگرچہ مردوں نے ہماری تکلیفوں اور مصیبتوں میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہی
اور ہم جسقدر نیکی سے اُنکے ساتھ پیش آتی ہیں وہ اُسیقدر ہماری بُرائی کے درپے رہتے
ہیں۔ لیکن اسے خدائے پاک! تونے ہمیں وفاداری و محبت کے وہ جوہر عنایت
فرمائے ہیں جو ہمکو کبھی مردونکی بُرائی چاہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ خداوندا! اسمیں
شک نہیں کہ ہم مردونکے مظالم سے سخت تنگ آگئی ہیں لیکن ہماری یہ التجا ہے
کہ تو اپنی شانِ قہاری سے اُن کے اعمال کا بدلہ نہ لے اور اُنکو اُنکی سیہ کاریونکی سزا
نہ دے۔ اے خدا! ہماری حالتِ زار، ہماری شکستہ حالی، ہماری بیکسی پر رحم فرما
لیکن مردونکے ساتھ وہ معاملہ نہ کر جو عادل ظالم کیساتھ کرتا ہے بلکہ وہ معاملہ کر
جو آمرزگار گنہگار کیساتھ سزاوار ہے۔ خداوندا! ہم تیری درگاہ میں فریادرس
اور دادخواہ ہیں نہ اِس خیال سے کہ مردوں سے اسکا جواب لے۔ عفو و کرم کو چھوڑ
کر انصاف و عدل سے کام فرما بلکہ اس خیال سے کہ ہماری مصیبتوں اور کلفتوں کو دفع فرما
اور ہمکو مردوں کے بیشمار مظالم سے بچا۔ الٰہی! ہم مردوں سے اِنکی زیادتی اور ظلم و ستم کا
بدلہ نہیں چاہتیں۔ اے الہ العٰلمین! ہماری زبان سے بیخودی اور وارفتگی میں بہت
سے جملے مردونکی شکایت میں نکلگئے ہیں اُنپر خیال نہ فرما۔ اے مجیب الدعوات! اور
اے قاضی الحاجات! ہماری یہ التجا ہی کہ مردونکے دلمیں رحم ڈال اور انھیں اس بات
کی توفیق دے کہ وہ اپنے حرکاتِ ناشایستہ سے تائب ہوکر آیندہ ہم سے تیرے
احکام کے موافق سلوک کریں اور خود اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کرنے سے
باز آئیں۔ ظالمانہ اور جابرانہ کارروائیوں کو چھوڑیں۔ ہمارے جو حقوق چھین لیے

ہیں واپس کردیں۔ ہمکو مقید و مجبور رکھنے سے باز آئیں۔ ہمیں آزادی دیں۔ اپنے ساتھ ہمکو بھی علم و فضل سے آراستہ و پیراستہ کریں۔ اپنے تمامی کاروبار میں ہمکو اپنا شریک بنائے رہیں۔ غرض ہماری تخلیق سے تیرا جو منشا رہا تھا اُس کے موافق عمل کریں۔ اور اب تک جو تیری نافرمانی کی ہے اُس سے توبہ کریں۔ اے خداوند کریم! اور اے غفور رحیم! ہماری اِس ناچیز دعا کو قبولیت کی خلعت سے مفتخر فرما۔ اور جلدی اسکی قبولیت کا اثر دکھلا۔

اِسکے ساتھ ہی اے اِلٰہ العٰلمین! ہماری مظلومیت پر رحم فرمانیوالوں اور ہماری بیکسی و شکستہ حالی پر ترس کھاکر ہمکو اِس سے نجات دلانیکی کوشش کرنیوالونکے اِرادوں میں اُنکی مدد فرما۔ جو مشکل پیش آئے آسان ہوجائے۔ اُن کی تحریر و تقریر میں اثر دے اور اُنکے عزم میں استحکام عنایت کر۔ الٰہی! جو لوگ تیری مظلوم اور بیزبان مخلوق پر ترس کھاکر اُسے آلام و مصائب سے نکالنا اور ورطۂ ہلاکت سے بچانا چاہتے ہیں اُنکی ہمت و استقلال میں دِن دونی رات چوگنی ترقی دے۔ اور بہت جلد اِنکی نیک اور با اثر کوششوں کا قابل تعریف نتیجہ پیدا کر۔ وہ دن بہت جلد لا کہ ہماری قوم کی عورتیں بھی اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو پھر حاصل کریں۔ علم و فضل میں شہرۂ آفاق ہوں۔ اور اپنی دوسری ہمعصر بہنوں سے کسی بات میں پیچھے نہ رہیں اور یوں ہمارے مردونکی حالت درست ہو اور وہ انسان کامل بنجائیں، گرداب بلا سے نجات پائیں۔ اور میدان ترقی میں چلنے کے قابل ہوجائیں۔

اے قادرِ مطلق! و اے ذات مستجمع الصفات! اے خالق برحق! و اے خدائے واحد و لاشریک! ہماری اِس عاجزانہ دعا کو جلد شرفِ اجابت بخش اور بہت جلد اپنی شان رحمت کے کرشمے دِکھلا۔ اور وہ دن بہت جلد لا جسکا ہمکو نہایت بے چینی اور اضطراب سے انتظار ہے۔ آمین یارب العٰلمین۔

"خورشید کاٹیج"، حیدرآباد دکن۔ } راقمہ سیدہ خورشید علی۔

suffer from illness, and with a view to escape from affliction, bodily and mental, we must devote a certain portion of our time to exercise.

To repeat the trite proverb, "a healthy mind in a healthy body" is only possible when we learn to take part in amusements, as comfort and pleasure, peace and happiness are, in no small degree, the outcome of physical training. It strengthens our nerves and hardens our bodies. We should therefore take ample exercise, to enable us to work properly. Exercise produces a healthy effect on our imaginations. But how sad it is, that due regard is not paid to games in schools, and many of the 'soi-disant' reformers of India take but a very light view of Exercise.

In short, our education should be liberal, and the ideal of education should be to create good members of society, who fear God and honor mankind. We should also cultivate a loving heart, so that we may be able to help to unite the whole human race. Education should root in us the feeling of unity and sympathy with our fellow brethren and all the arts and sciences should be taught so as to produce sages, patriots and men, who work for the amelioration of humanity.

M. SAHIB-UD-DIN B. A., (*Alig*).

sions carried on by people devoted to different branches of science and approaching the avenues of the temple of knowledge with solemn zeal and earnestness.

So much for the intellectual side of the question ; now to consider the importance of moral education. No education can be a source of happiness the, 'summum bonum' on this globe, as also in the life to come, without the virtue of high morality. The end of every religion is to teach morality, and preach the gospel of truth and love. And, athough it is perhaps too strong to say that a man without religion is a body without soul, yet there is a spark of truth in it. For, religion, pursued in a higher spirit is divine, and makes a man almost God-like. It inculcates large-hearted toleration and imparts breadth to our views. We are led on to think of this world, and of the world in store for us. Religion presents before us the holy idea of God, which is the fountain of all wisdom, and the source of all knowledge. A man without a good moral character, despite his much vaunted ambition and learning cannot be said to have acquired education, in the true sense of the word. For morality is a great accomplishment and the chief part of education. Good breeding is praised in all literatures, in every country, at all times, and amongst all people whether high or low. Gentlemanly bearing and steady habits have always been the grace of society, and the ornaments of individuals. Bacon, that great luminary of the human race, the 'wisest of mankind' with all his Titanic store of sagacity and huge stock of learning, cannot fairly be entitled to the excellent name of "ideally educated man," simply because his moral side was dark and uncultivated. History furnished innumerable examples of great and renowned philosophers and historians men of letters and orators, statemen and lawgivers, who merely on account of this taint in their character are not allowed the privilege of being admitted to the rank of properly cultured personages. It is very unfortunate, but it is all due to lack of education. To tell the simple truth, education begins at home, where the presiding spirit is woman, and if education is at all to be ideal, we should educate side by side with man,in all departments of science and literature, the better half of our society.

Now we come to the topic of Physical education. There is a wise saying " Those, who do not find time for exercise, will have to find time for illness." But, human nature is such, that no body, unless out of his mind, likes to

life, we should acquire a taste for learning, which is never satisfied in this world. Our studies however, should not be a source of selfish enjoyment though enjoyment is worth ambition, but 'a golden treasury for the glory of God and the ennoblement of life.' The aim of education is not to produce mean sophisters, vain philosophers and sordid economists but a race of good citizens, who know their duties to the creator and to man, who know how to abide by truth, and make the best use of their times, calm thinkers and peaceful workers, neither Utopians nor the inhabitants of Laputa. But mere academical training falls short of this lofty ideal. For, 'school,' says Locke, 'fits us for the University rather than for the world.' All that we desire is that students must learn to criticise and frame their own independent judgment. Schools should not be turned into mints turning out pupils by the thousands, but without a knowledge of their natural propensities. The aim of every academy should be to train the mind, and furnish it with a reasonable amount of information as a ground-work on which to build the superstructure in after life.

'With all thy getting get understanding'; says a wiseman of old, and certainly an education without the power of perception and clear understanding is a room without furniture. People, however, in the majority of cases, hardly know the value of thoughtful attention and prudent opinion. Their watch-word is book-learning. And they therefore proceed on a slippery ground. They strain the memory to the detriment of the finer faculties of the brain. Consequently they become rather mechanics, than students. They acquire what is of practical use to them in life, and they cannot assimilate the colossal store of knowledge, they have ravenously swallowed without due regard to their intellectual requirements, while they do not seem to have any interest in and love for their studies, after they have completed the regular course of instruction. They most of them, feel with Byron 'Then farewell Horace, whom I hated so.'

We should try to learn something of everything, but it is every thing of something which is fruitful of useful results. We should, as well, live in an intellectual atmosphere, if we at all earnestly want to aim at success in Education. There we shall be able to observe the pleasure which interchange of ideas bestows on humanity, and reap the benefit of thoughtful and scholarly discussions—discus-

(" Some thoughts on Education.")

Of all the privileges we enjoy in the twentieth century, perhaps the most useful is the blessing of facilities for education. We live in an age of cheap books, free libraries, numberless schools and delightful journalism. To many it seems untrue that education affords pleasure, but in fact it is a paradox, and there is truth in it. For education is not simply instruction, which is apt to become tiresome. It is something nobler, something higher, which purifies the human soul, and exalts mankind : knowledge is power, and not only power but sovereign power. Now, the question remains, how is it to be attained, and Tennyson apears to say in reply :—

" Self reverence, self knowledge, self control
These three alone lead life to sovereign power."

Nevertheless, it is idle to attempt at perfectibility in education. By education is meant the development of all the various faculties of man, and knowledge of mankind. And, in order that our education should be complete, we should divide it into three distinct heads :—(*a*) Intellectual (*b*) Moral (*c*) Physical.

Unless all these sides are carefully attended to, Education will be only in its elementary form, and the ideal of education will be difficult to acheive.

Education is culture, culture of head and heart, body and soul. With a view to cultivate our brains, we should begin to observe things, as they present themselves around us, and should take an intelligent survey of the general movement of the age Mere knowledge is not education neither is cramming cultivation of the brain. For 'a learned man without thought' says a Persian proverb, 'is a beast with a load of books.' We must form a habit of thinking for ourselves, and, when we have learnt to think, it might safely be said, that half of our education is finished.

Education is erroneously supposed to cease with school, while in fact it ceases with our breath. For, what is life but an accumulation of days, and each day but a store house of knowledge. But, in order that studies may last through

The following table gives the result of the matches etc :—

MOHD. AKRAM KHAN,

Hockey Captain.

Date.	Opposing Team.	Place.	Result.
22nd Dec. 1906 ...	Royal Irish Regiment. ...	Meerut	Drawn one all
24th Dec. 1906	The Camaronians.	,,	Lost — 2 by 4
26th Dec. 1906 ...	The Telegraph Club	Lahore	Drawn one all
28th Dec. 1906 ...	28th Dogras	,,	Lost — love one
29th Dec. 1906 ...	Govt. College ...	,,	Won — 3 love
30th Dec. 1906	Medical, Law and Govt. College combined	,,	Won — 3 by 1
31st Dec. 1906 ..	The Volunteers ...	,,	Lost — 3 by 8
1st Jan. 1907	28th Dogras ...	,,	Won — 1 love
4th Jan. 1907 .	Imperial Service Troop	Kapurthala	Lost — love 2
5th Jan. 1907 ..	Royal Sussex Regiment. ...	Umballa	Lost — 1 by 3

were yet beginners. However the ready acceptance of Master Kaim Husain Sahib to go with us contributed a splendid addition to the defence which was just as good as before.

At Meerut we were hospitably entertained by Shiekh Waheeduddin Sahib. Our warmest thanks are due to him for his generous reception. On alighting at Lahore Station we were received by our College fellow Sikandar Hayat Khan Sahib, who had taken great pains in arranging for our accomodation at his own house, the place being the residence of Nawab Aslam Hayat Khan Sahib. We shall always remember with the keenest appreciation the pleasant time which we passed with the Nawab, not only his beautiful house and its surroundings, but the kind welcome and generous hospitablity extended to us.

On our way back to Aligarh we halted at Kapurthala. Here we have to thank heartly Colonel Asghar Ali Khan for the kindness he showed us in making us comfortable during our short stay of a day. We really much appreciate the kindness of H. H. the Maharaja of Kapurthala for his kindly condescending to show us his beautifully decorated palace. Starting from here we stopped at Umballa. Here we were able to play a very good team of the Royal Sussex Regiment. Mushtaque Husain Sahib and Zahur-uddin Sahib, who were so keen to accomodate us, again command our sincere thanks.

BOWLING ANALYSIS.

	1st. Innings.				2nd Innings.			
	O	M	R	W	O	M	R	W
Morphet	11	*nil*	21	1	3	*nil*	14	*nil*
Lee	12	3	26	5	5	1	46	*nil*
Conningham	3	*nil*	12	1				
Redford	4	1	4	3	8	4	22	*nil*
Sharp		...		...	10	*nil*	46	*nil*
Tibbles		...		...	5	*nil*	22	*nil*
Wilberforce		...		.	7	*nil*	45	*nil*
Berkett		...		...	8	*nil*	34	*nil*
Bond		...		...	4	*nil*	10	*nil*

Hockey Tour.

There was an idea of taking the Hockey Team to Calcutta during and Christmas week; but the question of getting matches there, at that time of the year was a great impediment in our way, as the Hockey Season begins and ends in the Spring. However challenges were sent, but as we had thought, we were obliged to postpone our tour till the season has commenced. After mature consideration the Punjab was thought to be the best alternative, both because since the existence of the Hockey Team the province has not been visited by us and because of the great popularity of the game among the hardy people of the Punjab. Meerut also was visited there being so many good regimental teams there.

The team consisted of 14 players. It started on the 21st December 1906. Regarding the team our attack was not good last year. The proof was the great difficulty in scoring goals against the teams we played at Simla and other stations last summer. But this deficiency has been made up since then, as greater attention was paid to this part of the game with the result that we had a strong combination of good forward players. But I much regret to say that no less than 4 of them, the best members of the team, were under unavoidable circumstances prevented from accompanying the team. Some how their places were filled, but the loss was not made up, as those taken for them

Umballa Gymkhana.

1st Innings.		2nd Innings.	
Mr. Bond, *c*. Shafqat *b* Salam	0	*b*. Shafqat	0
Capt. Tibbles, *c*. Rahatullah *b*. Shafqat	0	*b*. Shafqat	15
Capt. Toley, l. b. w. Shafqat	4	*b*. Salam	2
Mr. Wilberforce, *c*. Shafqat *b*. Salam	5	*b*. Shafqat	15
Mr. Morphett, *b*. Salam	20	*b*. Salam	10
Mr. Redford, *b*. Shafqat	8	*b*. Shafqat	0
Mr. Berkett, *b*. Shafqat	1	*b*. Shafqat	13
Mr. Conningham, *c*. Taqi *b*. Shafqat	6	not out	14
Mr. Sharp, Run out	8	l. b. w. Salam	1
Mr. Oldworth, *b*. Shafqat	2	*b*. Salam *c*. Taqi	0
Pr. Lee not out	0	*b*. Shafqat	2
Extras ...	20	Extras	5
Total ...	74	Total ...	77

BOWLING ANALYSIS.

	1st Innings. O	M	R	W	2nd Innings. O	M	R	W
Salam	11	3	14	3	12	*nil*	31	4
Shafqat	11	*nil*	40	6	12	1	31	6

M, A. O. College Aligarh

1st Innings.		2nd Innings.	
Ali Raza, *b*. Pr. Lee	4	*c*. Tibbles *b*. Wilberforce	132
Syed Hasan, *c*. Conningham *b*. Pr. Lee	14	not out	7
Salam, *b*. Morphet	3	not out	44
Shafqat, *b*. Pr. Lee	0	*c*. Sharp *b*. Berkett	51
Amir Ahmad, *c*. Oldworth *b*. Lee	10	Did not bat.	
Halim, *c*. & *b*. Lee	3		
Samad, *b*. Conningham	16		
Rahabullah, *b*. Redford	12		
Mubarik, l. b. w. Redford	0		
Alaq Md. Taqi, *b*. Redford	1		
A. Rahman not out	0		
Extras	5	Extras	20
Total	68	Total	452

BOWLING ANALYSIS.

	1ST INNINGS.					2ND INNINNS.			
		O.	M	R.	W.	O.	M.	R.	W.
1. Salam	...	12	1	25	6	... 15	5	25	2
2. Shafqat	...	11	4	24	4	... 15	2	48	9

M. A. O. College.

1ST INNINGS.		2ND INNINGS.	
Shafqat, *c.* & *b.* A. Hasan	16	*b.* Gulam Mustafa	21
Ali Raza, *c.* Fazl Husain *b.* A. Husain	5	*c.* Fazal *b.* Gulam Mustafa	24
Salam, *c.* Gulam Mustafa *b.* A Hasan	7	*c.* Azizuddin *b.* G. Mustafa	0
S. Hasan, l. b. w. A. Hasan	0	*c.* Fazal *b.* Gulam Mustafa	16
Ishaque, *c.* Azizuddin *b.* A. Hasan	5	*c.* Fazal *b.* G. Mustafa	5
Halim, *c.* Gopal Dass *b.* A. Ghani	6	*b.* A. Hasan	20
Samad, *b.* A. Hasan	6	*b.* Gulam Mustafa	8
Amir Ahmad *b.* A. Ghani	35	*c.* Fazal *b.* G. Mustafa	14
Rahatullah, *c.* Majid *b.* A. Hasan	0	Run out	4
Taqi, *b.* A. Hasan	1	*c.* Tek Chand *b.* G. Mustafa	2
Ali Husain, not out	0	not out	4
Extras.	3	Extras.	9
Total	84	Total	129

BOWLING ANALYSIS.

	1ST INNINGS.				2ND INNINGS.			
	O.	M.	R.	W.	O.	M.	R.	W.
1. A. Hasan	15	3	24	8	11	1	57	1
2. A. Majid	4	nill	8	nill	...	...	...	...
3. G. Mustafa	11	3	36	nill	17	3	47	8
4. A. Ghani	8	1	11	2	6	1	16	nill

M. A. O. College.

1st Innings.		2nd Innings.
Shafqat, *b.* Moti Ram... ...	8	Not played.
Raza, *b.* Goff	42	
Salam, *c.* & *b.* Moti Ram ...	13	
Syed Hasan, *c.* Buta Ram *b.* Goff	6	
Amir Ahmad, *c.* Gopal Das *b.* Goff	7	
Ishaque, not out	37	
Halim *c.* Jose *b.* Condon ...	23	
Samad, *c.* Goff *b.* M. Ram ...	15	
Rahatullah, *st.* Buta Ram *b.* Goff	27	
Alaq Hasan, *c.* Condon *b.* Goff ...	0	
Mubarik, *lbw.* *b.* Moti Ram ...	11	
Extras	19	
Total ...	209	

BOWLING ANALYSIS.

1st Innings.

	O.	M.	R.	W.
Plumer ...	5	nil	35	nil
Moti Ram	22	1	60	4
Goff ...	19	4	95	5
Condon ...	5	nil	21	1
Rawlins ...	4	nil	19	nil

The Punjab University

SELECTED TEAM.

1st Innings.		2nd Innings	
Azizuddin, *b.* Salam,	0	*b.* Shafqat ...	6
Gulam Rasool l. b. w. Shafqat	1	*b.* Shafqat ...	21
Fazl-i-Husain *b.* Salam	1	*c.* Ishaque *b.* Shafqat	23
Hasan Shah, *c.* Syed *b.* Salam	12	*c.* Amir Ahd. *b.* Shafqat	2
Ahd. Hasan, *c.* Raza *b.* Shafqat	4	*c.* Salam *b.* Shafqat	1
Gopal Dass, not out	19	l. b. w. Shafqat	15
Abdul Ghani, *b.* Shafqat	0	*c.* Shafqat *b.* Salam	0
Tek Chand, *c.* Rahat *b.* Shafqat	0	*c.* Taqi *b.* Shafqat	2
Abdul Majid, *b.* Salam	4	*b.* Shafqat	0
Hari Har Nath, *b.* Salam	0	*b.* Shafqat	1
Gulam Mustafa, *c.* & *b.* Salam	8	not out	2
Extras	0	Extras. ...	8
Total	49	Total	81

BOWLING ANALYSIS.

	1st Innings.				2nd Innings.			
	O.	M.	R.	W.	O.	M.	R.	W.
Robinson ...	12	2	24	3	8	1	31	nil
Hawley ...	13	1	39	1	5	nil	24	nil
Kilgour ...	15	5	34	2	3	1	10	nil
Kirke ...	13	1	42	3	5	nil	20	1
Ricketts ...	6	1	20	nil	...	...	...	..
Wilson ...	4	nil	23	nil	...	..	..	...
Skipworth ...	5	nil	18	nil	..	...	...	...

N. W. R. Club.

1st Innings.		2nd Innings.	
Jose, *b.* Shafqat	2	*b.* A. Raza	5
Goff, *c.* & *b.* Shafqat	0	*b.* Salam	15
Moti Ram, *b.* Shafqat	3	*b.* Salam	0
Rawlins, *b.* Salam	23	Salamat Rai *c.* Syed *b.* Salam ...	8
Condon, *c.* Syed, *b.* Shafqat ...	4	*b.* Shafqat	0
Hollis, run out	9	*c.* Ishaque, *b.* Salam	14
Pushong, *st.* Syed, *b.* Samad ...	0	not out	4
Plumer, *b.* Salam	15	Absent	
Buta Ram, *b.* Salam	3	Shiv Diyal *b.* Shafqat	2
Salig Ram, *b.* Salam	0	*c.* Ishaque *b.* Salam...	15
Hodgkins, not out	0	Run out	8
Extras	7	Extras	8
Total ...	66	Total .	97

BOWLING ANALYSIS.

	1st. Innings.				2nd. Innings.			
	O.	M.	R.	W.	O.	M.	R.	W.
Salam ...	6	1	11	4	1	7	18	5
Shafqat	9	nill	32	4	6	nill	15	2
Samad ...	5	nill	13	1	7	1	11	nill
A. Raza ...	...	...	...	...	8	2	10	2
Halim ...	...	...	..	...	4	nill	18	nill

Lahore Gymkhana.

1st Innings.			2nd Innings.		
V. H. Wilson, *b.* Shafqat	...	36	*b.* Salam	...	0
C. E. Colbeck, *b.* Shafqat	..	16	*b.* Shafqat	...	28
H. F. Kilgour, *b.* Shafqat		0	*b.* Salam	...	8
E. St G. Kirke, *b.* Salam	...	2	Run out	...	44
E. W. C. Ricketts, *c.* Syed, *b.* Salam	..	5	*c.* Ishaque, *b.* Shafqat	...	45
Capt. Bedwell, *b.* Salam	...	8	*b.* Salam	...	1
F. H Hawley, *b.* Shafqat	...	13	*b.* Salam	...	16
F. Skipworth, *b.* Shafqat	..	4	*c.* Raza, *b.* Shafqat		17
S. G. Stubbs, *b.* Salam	.	0	*b.* Shafqat	...	0
S. M. Robinson, not out	...	11	*b* Shafqat	...	18
T. Ram Singh, *b.* Salam	...	0	not out	..	3
Extras ...	.	8	Extras		14
Total	...	103	Total	...	194

BOWLING ANALYSIS.

	1st Innings.				2nd Innings.			
	O.	M.	R.	W.	O.	M.	R.	W.
Shafqat ...	16	2	55	5	20	nil	83	5
Salam ...	15	2	40	5	18	3	46	4
Ali Raza ...	...	...	..	...	3	nil	24	nil
Samad ...	.	...	..	..	4	nil	26	nil

M. A. O. College.

1st Innings.				2nd Innings.		
Shafqat, *c.* Stubbs, *b.* Kirke ...	...	...	37	*b.* Kirke	...	24
A. Raza, *lbw.* Hawley	..	...	8	not out	...	38
Salam, *c.* Ram Singh, *b.* Robinson		..	100	not out	..	24
Amir Ahmad, *b.* Kilgour	..		0	Did not bat.		
Syed Hasan, *lbw.* Kilgour ...		...	4			
Ishaque, run out		..	23			
Haleem, *st.* *b.* Kirke	...	...	24			
Rahatullah, *c.* Skipworth *b.* Kirke ...			1			
Samad, *b.* Robinson ...	...		0			
Ali Hasan, *b.* Robinson	...	...	3			
Taqi, not out ...	...	...	0			
Extras ..	...	.. ...	9	Extras	...	4
Total		...	209	Total	...	90

St. Stephen's College.

1st Innings.			2nd Innings.	
Mr. Devi Singh, Run out	...	0	c. Salam b. Shafqat	1
E. Mark, b. Shafqat	...	6	b. Salam	1
S. S. Singer, b. Shafqat	...	1	b. Salam	29
D. John, lbw. Shafqat	...	22	b. Salam	0
Radha Bihari, b. Shafqat	.	0	b. Salam	0
Piran Kishan, b. Salam	..	20	b. Salam	0
Siri Ram, b. Syed b. Samad	...	3	b. Shafqat	3
Farhatullah, not out .	...	6	H. Mirza b. Salam	1
Piyare Lal, b. Salam ...	..	0	b. Shafqat	0
Sarh Kishen, b. Salam	...	0	not out	3
Mohd. Shah, b. Salam...	...	0	c. & b. Salam	0
Extras ...	...	4	Extras	2
Total	...	62	Total ...	40

BOWLING ANALYSIS.

	1st Innings.				2nd Innings.			
	O.	M.	R.	W.	O.	M.	R.	W.
D. John	18	3	38	3	16	2	50	2
Farhatullah	15	2	34	4	6	1	26	1
Siri Ram	4	nil	13	nil	6	nil	28	nil
Piyare Lal	4	1	11	3	7	nil	25	3
Devi Singh		.		...	2	nil	9	nil

	1st Inning				2nd Inning.			
	O.	M.	R.	W.	O.	M.	R.	W.
Shafqat ...	8	2	26	4	6	nil	11	3
Salam ...	6	1	16	4	7	2	27	7
Samad ...	3	nil	13	1	..	...	...	..

Messrs Aslam Beg and Ahsanul Haq, Barristers, made us feel quite at home in the tour We deem it our duty to thank M. Bashir Ali Khan, son of the late lamented Khan Bahadur Barkat Ali Khan who looked after our accomodation and rest at Lahore. Special mention ought to be made of our winning the Sir Syed Belt. This much coveted belt was brought into existence by the Tinda dilar-i-Punjab to commemorate the sad death of the Great Leader, so as to give vent to their feelings of appreciation and recognition of his national services. It has been offered every year for competition since 1898, and taken off yearly by the winning team. This year Shaikh Mohamad Ali Sahib has very greatly obliged and honoured us by giving it over to us permanently. It is our duty to thank the trustees of the belt sincerely. And I think we will be right in voicing the grateful feelings of all the College students.

Before I conclude I must most heartily and cordially thank Haji Mohd. Amin Sahib, of Peshawar for his very kindly presenting me with a beautiful gold watch for the century I made against the Lahore Gymkhana.

SALAM-UD-DIN,
Cricket Captain.

The following were the scores and analyses.

M. A. O. College.

1st Innings.		2nd Innings.	
Shafqat, *b.* D. John ...	14	*b.* D. John ...	31
Ally Hasan, *c.* Piran Kishen *b.* Farhatullah ..	4		
Salam, *c.* Siri Ram, *b.* Farhatullah	7	Retired ...	75
Amir Ahmad, *b.* Farhatullah	6	*lbw.* D. John	1
Syed, *c.* Piran Kishen *b.* D. John	28	*lbw.* Piyare Lal ...	10
A. Samad, *b.* Farhatullah	0	*b.* Piyare Lal ...	13
Rahatullah, *b.* D. John	18	*c.* E. Mark *b.* P. Lal	1
Ishaque, *b.* Piyare Lal	2	*lbw.* Farhatullah	4
Haleem, *c.* Siri Ram *b.* P. Lal	20	Did not bat.	
Ali Husain, *b.* Piyare Lal	13		
Taqi, not out	1		
Byes	4	Byes ...	2
Leg byes	5		
Total ...	120	Total ...	137

University selected team. Owing to the bumpy wickets our bats were largely annoyed and we could not show a good game. Our new men had begun to grow diffident, but the bowling, notwithstanding the bad fielding, kept the day to us, and we defeated them by 83 runs. We had to play Jullundur next; but on account of successive rains the boggy grounds did not allow us to carry out our intentions.

But we succeeded in having a game with the Umballa Gymkhana, which brought us another glory in the valuable 132 runs of Raza in the 2nd innings. We won by 171 runs and 9 wickets.

As regards our fielding. On the the whole it was not satisfactory. Still it would be unjust if I were to forget Syed Hasan Rizvi's name who showed great skill and agility in keeping wicket.

As for the batting. Shafqat batted unusually finely throughout. The experience of our old bats, after all, always pioneered the success of our following wickets. Raza, Ishaque, Halim and Amir Ahmad gave us their valuable contributions in batting and fielding both in all the matches. I do not mean at all to neglect the services of our so called 'Freshers.' As we had to give chance to all by turns it can not be safely laid down who or who not is promising. But a line can be dropped in favour of Rahatullah and Taqi.

Lastly I am bound by sense of gratitude to close this agreeable account with paying our hearty thanks to the following gentlemen,—the sincere lovers of the Central Moslim Institution and its movements :—

Nawab Md. Aslam Hayat Khan Sahib, a trustee of the College, and Nawab Zoolfiqar Ali Khan Sahib of Malerkotla who very kindly invited us to splendid dinners and parties and spoke very encouraging words.

Malik Zaman Mehdi Khan Sahib B. A., (Alig) Personal Assistant to the Director of Land Records expressed by his brotherly and affectionate treatment how the Great Syed's Institution infuses a spirit of love, affection and fraternity in its alumni. We cannot forget the smiling faces, affable words and brilliant entertainments of the Mohamedan Boarders of the Mission College, and some of the Mohamedan students of the Government College, Shaikh Mohamad Ali Sahib,

His Majesty then left the Hall and the meeting broke up. The Garden Party naturally suffered as the Amir through weariness did not attend, but there were enormous numbers of guests, including Sir Henry MacMahon and the other British Officers with the Amir, the Commissioner, the Deputy Inspector General of Police, the Collector, and many others. The band of the XIXth Panjabis played a selection of music, and as " side shows " there were hockey and football matches and cricket practice. Mrs. Archbold acted as hostess. In the evening the line of buildings facing the Main Gateway was illuminated. All the length of awning also was hung with Chinese lanterns, while the Amir's room, his Dining Room and the space outside the Gateway were lighted with powerful Kitson lamps.

His Majesty left the College shortly after nine p. m. having, entertained, as he promised, the Trustees to dinner. The departure was absolutely private.

The visit may be pronounced a great success. Intense satisfaction is felt at the " certificate of orthodoxy " which the Amir conferred on the College. In conclusion—the College owes a great debt of gratitude to the Collector of Aligarh, Mr. Ingram, and to the D. S. P., Mr. Fox, for the generous assistance which they gave.

Cricket Tour.

Our tour this year commenced on the 23rd of December 1906. As a majority of our batsmen were quite inexperienced and untried we did not expect them to withstand the trying fields of Lahore. However our first match with the St. Stephen's College, Past and Present, gave us heart and held out some hope to pose more favourably before the public of Lahore. This match was won by 145 runs and 5 wickets.

The first and most formidable fixture was with the Lahore Gymkhana of the Xmas season. But the experience of some old players and the bowling of Shafqat worked wonders, and we won the day by 9 wickets. Then we had to play the N.W.R. Europeans who were easily beaten by 45 runs and one innings. Our last fixture at Lahore was with the

The rain of the previous week laid the dust and freshened up all the foliage, so that the College and its surroundings were at their best.

His Majesty's special train reached Aligarh at about 10-30. At the station the Amir was received by the Commissioner, the Collector, the Principal, the President, the Honorary Secretary and several leading Trustees. The guard of honour was furnished by the XIXth Panjabis, and the escort by the VIIIth Bengal Lancers together with a detachment from the College Riding School.

At the Main Gate the remaining Trustees, with the College and School Staff were in attendance, and were presented to the Amir who conversed affably with many before proceeding towards the Strachey Hall between the lines of students and boys, who were drawn up on both sides of the road. The Old Boys were on the Strachey Hall steps and the College Guests in front of the Amir's room. On reaching the retiring room His Majesty gave an audience of one hour to Nawab Mohsin-ul-Mulk after which he breakfasted along with his chief Sirdars. Shortly before one o'clock the Amir began his inspection of the College, passing along the verandah of the Pakka Court to the Main Gate, whence he drove to the English House. On returning to the College he attended prayers and spent the rest of the afternoon till 4 o'clock in listening to one or two classes and particularly in examining several bodies of students on theology. At 4 o'clock His Majesty went to the Strachey Hall where on behalf of the Trustees Khan Bahadur Moazzamilullah Khan read an address. In his reply the Amir said that he had heard much against the College with regard to its slackness in religious matters, but now that he had heard and seen for himself, he would be able to silence such false allegations. (cheers) He was a strong advocate of western learning, always provided that due attention was paid to Mussulman learning also. In Kabul he had founded a College for the advancement of education in his country. It had given him great pleasure to inspect the College and as a sign of his satisfaction he would make a yearly grant in perpetuity to the College of six thousand rupees. Further he would make a donation of twenty thousand rupees at once. (Prolonged cheers). In conclusion His Majesty desired the audience to go to the Garden Party and to enjoy themselves, and invited about twenty five of the Trustees to to dine with him.

(The Amir's Visit.)

His Majesty, the Amir of Afghanistan, visited the College on January 16th last. Great preparations had necessarily to be made as the number of Sirdars and officials in the Amir's suite was very large. The whole line of buildings, between the Mosque and the Principal's Hall was, with one or two exceptions, given over to the Amir and his followers. His Majesty breakfasted and dined in the Lytton Library, and the Beck Manzil was his retiring room. The Chief Sirdars had the Asman Manzil and the Nizam Museum was also furnished for attachès. The Principal's Hall itself was used for the body guard and minor officials and a large number of tents were provided in the Kachha Court for Sirdars, officials and soldiers. The British Officers, including Sir Henry McMahon and Mr. Dobbs, the officer in charge of the tour, had other arrangements made for them.

In addition to the Afghan visitors there were also more than five hundred guests and Old Boys. Thirty-two Trustees were present—a record number. The majority of these guests were put up in the School buildings, the Arnold House, and in various students' rooms The College guests and Old Boys took their meals in the College Dining Hall, which was set apart for their exclusive use.

All food for His Majesty, his Sirdars and followers was prepared in a temporary kitchen, close to the Lytton Library. The Mohammadan Entertainment Committee had charge of these arrangements and one of the School Staff, Master Saadat Ali Khan, and two Old Boys, Syed Ain-ud-din B. A., and Mozaffar Mohammad Khan B. A., were deputed by the College and the Committee to superintend all preparations for food. The decorations for the Garden Party were undertaken by Mr. Beck and a committee of boys; Mr. Harrison managed the lighting and the illumination of the buildings, and Mr. Gardner Brown was for the last week in general charge of the preparations. Mrs. Archbold arranged for the breakfast for the British Officers and Mrs. Gardner Brown supervised the Garden Party. The building committee, headed by Sahibzada Aftab Ahmad Khan did excellent work; and Mir Wilayat Hosain Sahib was busy with work of every kind as usual.

that for some time to come the Education Question will continue to be the cause of considerable political controversy. I ought perhaps to repeat what I have already explained in a previous letter, that the phrase "Education Question" in England really means at the present time the question of how to arrange the religious teaching in the public elementary schools in such a way as to suit the numerous different religious sects into which Englishmen are divided.

Another political question, which so far is chiefly regarded as affording light amusement for newspaper readers has been much heard of lately. I refer to the Women's Suffrage Movement, the demand that women should be granted the vote for parliamentary elections on the same conditions as men. Certain women who support this proposal seem to have come to the conclusion that the best way for them to advance their cause is to advertise it largely. Now to pay for extensive advertisements would require much money, therefore these women adopt means by which they may obtain free advertisements. Their procedure is to obtain entrance to the Lobby of the House of Commons and there contrary to the rules, to make speeches. They are then at once requested to depart whereupon their speeches become disturbances and, as the policemen have to remove them, their gesticulations and resistance become assaults—with the result that they have to be brought up and charged in the Police Courts. They are convicted and fined a small sum of money, and as they generally refuse to pay the fines they have to go to prison instead. This is exactly what they want for the whole proceedings are reported in every newspaper and so the free advertisement is obtained and the imprisoned ladies pose as martyrs for their cause. But while we ridicule the methods which some of these women adopt we mu t remember that there are many people (both men and women) who quite seriously advocate the extension of the suffrage to women, and I believe that no inconsiderable number of Members of Parliament are in favour of the proposal. It may I think safely be said at present that the proposal is not yet supported by a majority of the women of this country, for most women consider themselves better employed in looking after their homes and nursing and educating their children than in devoting their attention to political questions. But the movement will probably grow and its early stages should not be regarded solely as matters for amusement,

I am, &c.,

G. P. GOODALL.

relations and functions of the two Houses of Parliament as illustrated by the course of the Bill. We find a Government supported by an immense majority in the elected Chamber, yet defeated by a very large majority in the other (non-elected) Chamber ; and as all legislation must receive the approval of both Chambers the Government is consequently unable to carry its proposals into effect. And yet there is no suggestion even on the part of the most bitter opponent of the Government that it is their duty to resign. This shows that the position of a Government (or Administrations in this country depends upon the support only of one Chamber—the elected House of Commons—which is the same thing as to say that it depends in the end upon the support of the electorate. So that it is quite possible that there might be an instance of a Government remaining in office and conducting all the administrative affairs of the country both Home and Foreign, and yet being quite unable to carry out any reforms or alterations in legislation. This would of course be a deadlock and some of our readers may wonder whether such a deadlock would have to continue indefinitely or whether there is any way out of the difficulty. In actual practice the difficulty is generally overcome after the Government have appealed to the country *i.e.* after a General Election If the two Chambers take different views and the Government after a General Election, come back to the House of Commons with a majority large enough, or under other circumstances clear enough to show that they are supported by the electorate in the particular matter which is the ground of conflict between the two Chambers then the House of Lords will generally withdraw its opposition, though there is no written rule on the point. But it may further be asked whether that does not exactly fit the position of the present Government which has so recently been victorious at a General Election. The answer of the House of Lords is that the Government's majority does not show that the Education Bill had the approval of the country, inasmuch as the actual proposals embodied in the measure were not before the country at the time of the Election, and the Education question (though admittedly it did contribute to the defeat of the late Government) yet was only one out of many contributing causes, and so (say the House of Lords) the Government cannot claim that they have the electorate behind them on this particular question. So stands the matter now and what the outcome will be I shall not attempt to prophesy, but there can be no doubt

In another direction too we have entered on a different course. Syed Wahid-ud-din Sahib, of Sasaram, Behar, retired Hospital Assistant, has taken over the duties of Dining-Hall Superintendent. He has had much experience of this kind of work, and we have every reason to hope that he will introduce many beneficial methods of management here.

Letters from England—Number 7.

December 1906.

DEAR MR. EDITOR,

The end of the year still finds us with the main political interest centered upon the same subject which has engrossed the energies and attention of politicians during the greater part of the year, namely, the Education Bill. After being passed by a large majority in the House of Commons the Bill was introduced into the House of Lords where it was altered considerably by numerous amendments. Then, following the ordinary procedure the Bill came back to the House of Commons for consideration of the Lords' amendments. The Government in the House of Commons adopted the unusual, but perfectly legitimate, course of asking the House to consider the amendments as a whole instead of one by one. This proposal was agreed to and the amendments were then rejected by a majority of over 300. Then back went the Bill to the House of Lords accompanied however by an intimation from the Government that they were willing to agree to some of the Lords' amendments and to make certain concessions with regard to others. There then followed two days of anxious waiting during which it was understood that the leaders of the Government and of the Opposition were negotiating privately in the hope of arriving at some mutual compromise, but this unfortunately could not be arranged and so the Bill was once more rejected by the House of Lords and there the matter ended. The Bill is dead and the law as to public elementary schools remains as it was.

The history of this unfortunate measure makes an interesting lesson in Parliamentary procedure and in the unwritten principles of the British Constitution. As to procedure I have perhaps said enough. As to the constitutional aspect of the matter it is of interest to observe the mutual

In addition to all these fixtures the Hockey Team played and defeated the IV Rajputs by 1-0, after an excellent game. The College Football XI for the Tournament played the 2nd Gurkhas on the 21st with an indecisive result; and were beaten by the 7th Gurkhas on the 23rd after a really good game by 3 to 1. The College Team has itself to blame for losing this match, as the forwards failed to use their opportunities and wasted time in pretty but ineffective passing instead of attacking with real vigour.

The Annual Sports for College and School are to take place about the middle of this month. It is to be hoped that more will enter even than last year, and—more important—will do some training for the various races. There are many good runners in the College and very many promising athletes in the School too, but it is rarely that we see them do a really good performance; and the reason is simply that they have not troubled to train themselves to produce that last great effort which distinguishes a good from an ordinary result.

Building was greatly interrupted in January, but the record of the month is that the Lytton Library and the adjacent room have been completely finished, as the stone flooring has been laid down and the Library adorned with the College crest. The Mumtaz House additions have been carried nearer a finish and the School House after many vicissitudes is beginning to show its final shape and to give an idea what it will be like.

On January 14th Dr. Horowitz, of Berlin University, the newly appointed Professor of Arabic in the College, arrived from Europe. He has had some Eastern experience before, having lived for a year or two in Syria and Egypt. The new Arnold House is to be Dr. Horowitz's residence for some time, at any rate. We wish the new Professor all success in his work here.

The "Prince of Wales Science School" in its temporary quarters (the Principal's Hall and adjacent rooms) is flourishing. A large consignment of scientific instruments and apparatus has lately arrived and Dr Harrison now has at any rate the beginnings of a good laboratory, together with a well-fitted workshop. For the latter the services of a trained mechanic have been secured. The future of the Science School seems distinctly rosy at present.

The Aligarh Monthly

February, 1907.

College Notes

The ordinary work of the College was very much upset by the preparations for the Amir's Visit. This of course was inevitable; but the loss of practically a fortnight is a serious matter for all those whose examinations are near. Then the Eid-uz-zuha holidays, and in this month the closing of the College for Moharram make another gap in our working time. The curious thing to notice is that from March 1st to July 31st, *i.e.* for five months, there are very few holidays indeed. At no time of the year is a holiday a greater relief to the teacher and the taught than in the hot-weather. But for some years to come the lunar calendar will not be favourable to us in this respect; and we shall continue to have the first half of the cold weather cut up by an endless series of short holidays, while the hot weather will be, as it were, a dreary desert of work.

The various clubs are having a busy time this season. The Cricket and Hockey Tours were a great success and all three clubs are engaged in the Western Circle of the University Tournament. The School teams went to Agra for the School Tournament on January 21st and following days.

جلد (۵) | - مارچ ۱۹۰۷ء - | نمبر (۳)

آریہ و اَن آریہ قومیں اور سنسکرت و پراکرت زبانیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

پہلا حصہ آریہ اور اَن آریہ قومیں

آریہ قومیں

آریوں کی اصلیت اب سے بہت پیشتر (جس کی ابتدا کی کچھ خبر نہیں) وسط ایشیا کے غربی حصے میں (جو اب ترکستان کہلاتا ہے) بنی نوع انسان کے متعدد خاندان اور گروہ رہتے تھے جو اپنے کو آریہ کہتے تھے - اور کھیتی باڑی اور چوپانی سے بسر اوقات کرتے تھے -

یہ لوگ - خوبصورت - خوش قیافہ - متناسب الاعضا - فراخ پیشانی - تنومند - اور قوی الجثہ ہوتے تھے - اور قد و قامت - رنگ روپ اور دیگر اوصاف جسمانی و روحانی

میں دوسری قوموں سے نمایاں طور پر فائق و ممتاز تھے۔ خصوصاً اپنی ہمسایہ۔ مشرقی قوموں سے جن کے چہرے چپٹے، رنگ زرد اور پیشانیاں تنگ اور پیچھے کو اُلٹی ہوئی ہوتی تھیں۔

آریوں کا اطرافِ عالم میں پھیلنا جیسے جیسے زمانہ زیادہ گزرتا گیا۔ اُن کی نسلوں میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ اور آخر کو وہ اتنے زیادہ ہوگئے کہ پرانی آبادیوں میں اُن کے لئے جگہ باقی نہ رہی اور ضرورتاً انھیں اپنے مرکز سے ہلنا۔ اِدھر اُدھر پھیلنا اور اطرافِ عالم میں نقلِ مکان کرنا پڑا۔ چنانچہ مختلف گروہوں نے مختلف اوقات میں۔ دنیا کے مختلف قطعاتِ زمین میں جلاوطنی اختیار کی۔

ایرانی آریہ اُن میں سے کچھ لوگ تو پچھم کو چلے گئے۔ اور ممالکِ یورپ کو آباد کیا۔ کچھ دکن کی جانب بڑھ گئے۔ اور جنوبی ایشیا میں سکونت پذیر ہوئے۔ اور کچھ اپنے زاد بوم سے ہٹ کر فارس ہی میں ٹھیر گئے، جو انھیں کی بود و باش کے سبب سے آخر کو ایران بولا جانے لگا۔ وہاں ملک کی سرسبزی۔ شادابی۔ آب و ہوا کی لطافت اور خوشگواری نے اُن کو تمدن کے اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا۔

ہندوستانی آریہ ایرانی آریہ میں سے۔ اب سے ہزاروں برس پہلے (جسکا ٹھیک زمانہ معلوم نہیں) ایک قوم۔ افغانستان کی طرف نکل آئی۔ اور پھر وہاں سے۔ درۂ خیبر اور دوسری گزرگاہوں سے (جو اُتر پچھم کی جانب۔ ہمالیہ پہاڑوں میں واقع ہیں) ہندوستان کو بڑھ آئی مہماں نواز سرزمینِ ہند نے۔ زبانِ حال سے۔ معزز مہمان کے خیر مقدم میں یہ شعر پڑھا

اے آمدنت باعثِ آبادیِ ما ذکرِ تو بود زمزمۂ شادیِ ما

اور بطور پیشین گوئی یہ کہا۔

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود سالہا سجدۂ صاحب نظران خواہد بود

یہ تازہ واردین۔ ملتان پنجاب میں۔ سرسوتی ندی کے ساحلی ملکوں میں (جو اُن دنوں۔ بنار سوتی دیش۔ کہلاتا تھا) بڑے سکھ چین سے زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن جب اُن کی اولاد کی تعداد۔ زیادہ ہوئی۔ تو پیشقدمی شروع کی۔ اور پیش پا اُفتادہ صوبوں پر فتحیاب

میں ہوتے ہوئے برابر شمال مشرق کیطرف بڑھتے چلے گئے [۱]*

سورج بنس اور کوشل راج یہاں تک کہ ایک کافی زمانے کے بعد ملک کے ایک بڑے حصے میں۔ (جو اُترہیں۔ گنگا سے بہت دُور تک۔ اور پورب میں دریاے گنڈک تک پھیلا ہوا تھا۔) ایک زبردست سلطنت قائم کرلی۔ جسکا نام کوشل راج تھا۔ اور اُسکی راجدھانی اَجُدھیا تھی۔ بانیِ سلطنت کا نام اِکشواکوُ تھا۔ اور اُسکا شاہی خاندان تواریخ میں۔ سورج بنس کے لقب سے مشہور ہے۔

ہندو مورّخوں کے قول کے مطابق۔ اِکشواکو کا زمانہ ست جگ میں تھا۔ جسکو کم و بیش چالیس لاکھ برس ہوتے ہیں۔

بانیِ سلطنت سے ستّاون پشت کے بعد۔ اِس عالی دُودمان میں۔ مہاراجہ رام چندر ہوئے، جو جملہ اوصافِ حمیدہ کے بلا شبہ ایک اعلےٰ نمونہ تھے [۲]

مہاراجہ رام چندر کے بعد۔ راجہ سُمترؔ تک۔ چھپّن [۵۶] راجے اور اَجُدھیا کے تخت

---

[۱] * بعض یورپین مؤرّخوں کا خیال ہے کہ آریوں کی پہلی جلاوطنی یورپ کی طرف تھی۔ وہاں سے ایک جماعت اُن کی ایران میں آئی۔ پھر آپس میں۔ خانہ جنگی اور مذہبی جھگڑا پھیل جانے کے سبب سے۔ اُس جماعت کے ایک گروہ نے روٹھکر ہندوستان کا رُخ کیا۔ اِس خیال کی صحت و غلطی کا قطعی فیصلہ تو اِسوقت غیر ممکن ہے۔ لیکن ظاہرا طوفانِ نوح کا پانچ ہزار برس کا مختصر زمانہ (جس پر اہلِ یورپ۔ تمامی واقعاتِ عالم کا دار و مدار رکھتے ہیں) آریوں کی اِس ہیر پھیر کی جلاوطنی اور بعد ازاں ہندوستانی آریوں کی گذشتہ۔ اعلیٰ درجہ کی ترقیِ تمدّن کے لئے کافی نہیں معلوم ہوتا۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

[۲] راماین کی لاثانی اور دلاویز نظم۔ سراسر انھیں کے کارناموں اور انھیں کی سوانح عمری میں لکھی گئی ہے۔ اوّل اوّل اِس کتاب کو۔ شری بالمیک نے نہایت شستہ اور فصیح و بلیغ سنسکرت میں وقوعِ واقعہ کے قریب ترہی زمانے میں تصنیف کیا تھا۔ بعد ازاں آج سے تقریباً تین سو [۳۰۰] برس پہلے گسائیں تلسی داس نے زبانِ بھاشا میں۔ اس کا نظم ترجمہ کیا۔ اِن دونوں کے علاوہ اور

پریکے بعد دیگرے رونق افروز ہوتے گئے۔[۵] اور مہا بھارتھ کی خونریز لڑائی تک (جس کے مزید حالات آگے بیان کئے جائینگے) سورج بنسی راجاؤں کی تعداد۔ نوے سے سو تک مختلف بیان کی گئی ہے۔ راجہ سُمِتْر۔ اجُدّھیا کا آخری راجہ ہوا۔

اُجین کا راجہ۔ بکرماجیت (جسکا سمت ۱۹۶۳۔ آج تک ہندوستان میں جاری ہی) راجہ سُمِتْر اُس سے کچھ روز پیشتر دنیا سے کوچ کر گیا۔

راجہ سُمِتْر پر۔ سورج بنسیوں کے کوشل راج کا خاتمہ ہوگیا۔ اور وہ سلطنت چندر بنسیوں کے قبض و دخل میں آگئی۔ اِسوقت سے دو سو برس، بلکہ زیادہ تک سورج بنس کے راجاؤں کے حالات نہایت تاریکی میں ہیں۔ اِس مدتِ مدید میں صرف نام چار راجاؤں کے بتلائے گئے ہیں اور اُنکا کچھ حال نہیں لکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انقلابِ زمانہ نے انتزاع سلطنت کے بعد۔ گمنامی کی حالت میں اُنھیں اِدھر اُدھر پریشان رکھا۔

سمت ۲۰۱ میں سورج بنس کے ایک راجہ نے (جسکا نام کنک سین تھا) بلبھی پور واقع گجرات میں ایک زبردست سلطنت قائم کی۔ اور تین سو اَسّی برس، یعنی سمت ۵۸۱ تک اُس کی اولاد کے بائیس راجے وہاں برسرِ حکومت رہے۔

اس کے بعد سمت ۵۸۲ میں ایک قومی دشمن[۶] نے۔ بلبھی پور پر چڑھائی کی۔ جس نے

شاعروں نے بھی ان کے پاکیزہ حالات اور دلچسپ واقعات کے بیان میں طبع آزمائیاں کی ہیں۔ حتّیٰ کہ عوام الناس کی زبانوں پر بھی اِن کا ذکرِ خیر۔ گیتوں، راگوں اور ضرب المثلوں کے پیرایہ میں ہمیشہ جاری ہی۔

[۵] اِس حساب سے اجُدّھیا کے کل تخت نشینوں کی تعداد۔ ایک سو تیرہ (۱۱۳) ہوتی ہے۔ لیکن راج پرسستی کے مصنف رگھبر بھٹ نے۔ سورج بنسی راجاؤں کی تعداد۔ اِکشواکو سے لیکر مہاراجہ رام چندر تک باسٹھ (۶۲) اور اُن سے لیکر راجہ سُمِتْر تک ساٹھ (۶۰) لکھی ہے۔ اِس حساب سے کُل فرمانروا۔ ایک سو بائیس (۱۲۲) ہوتے ہیں۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب ؂

[۶] وہ قومی دشمن کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ اِس بات میں بڑا اختلاف ہے۔ جس کی تفصیل کی

اُس سلطنت کو نیست و نابود ہی کر دیا۔

اُس وقت راج گدی پر۔ راجہ کال بھوجا دِت تھا۔ وہ ملک و مال کی حفاظت کے لیے آمادۂ پیکار تو ہوا، مگر آخر کو وہ اور اُسکا سارا خاندان مارا گیا۔ حُسنِ اتفاق سے ایک حاملہ رانی بچ رہی۔ جسکا نام پُشپاوتی تھا۔ اُس نے ملیاگر کی کھو میں پناہ لی، اور مدتِ معہودہ کے بعد ایک لڑکا جنی۔ جسکا نام پہاڑ کی کھوہ کی مناسبت سے گہا پڑا۔ لیکن جب سنِ تمیز کو ہونچکر اِیدر میں ایک سلطنت قائم کرلی۔ تو گِرہادِت کے نام سے موسوم ہوا۔ اُدی پور کے رانا اسی گہا یا گرہادِت کی نسل میں ہیں۔

بدہیہ راج اُسی زمانے کے قریب قریب۔ (جبکہ کوشل راج قائم ہوا) راجہ بدہیہ نے بدہیہ راج کی بنیاد ڈالی۔ یہ سلطنت بھی اُسوقت کے لحاظ سے ایک قوی سلطنت تھی جس کی وسعت دریاے گنڈک سے کوسی ندی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور مہاراجہ رام چندر کے وقت میں اُسکا تختگاہ جنک پور تھا۔

بدہیہ یا میتھل راج کو تواریخ میں اسوجہ سے شہرت ہے کہ راجہ جنک (جو بدہیہ

یہاں گنجایش نہیں۔ ہند و مورخین۔ کرنل ٹاڈ صاحب۔ کرنل واتھن صاحب۔ الفنسٹن صاحب مالکم صاحب وغیرہ۔ سب کے سب اِس بارہ میں مختلف الآرا ہیں۔ اور کسی کی بات دل کو چُبھتی نظر نہیں آتی۔ ہم۔ مالکم صاحب کے قول کو مان لیتے۔ جنھوں نے ایرانی مؤرخوں کے حوالہ سے نوشیروانِ عادل کی فوجکشیِ ہند کا حال لکھا ہے۔ مگر بلبھی پور کی تباہی۔ نوشیرواں کی تخت نشینی سے چند برس پہلے وقوع میں آچکی تھی۔ یعنی بلبھی پور سمت ۵۸۲ میں برباد کیا گیا تھا اور نوشیرواں سمت ۵۸۸ میں تخت نشین ہوا۔ پھر کس دلیل سے۔ بلبھی پور کی ویرانی کو اُس شاہ عالیجاہ سے منسوب کیا جائے۔ فرشتہ وغیرہ اکثر مؤرخوں نے ذکر کیا ہے۔ کہ میواڑ کے راجے نوشیرواں کی اولاد میں ہیں۔ لیکن وہ واقعہ کوئی اور ہوگا۔ اُس سے اِس سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔

خاندان کے چشم و چراغ اور یہ کوشل راج کے لائق و فائق فرمانروا تھے) وہ مہاراجہ رام چندر کے سسُر تھے۔

کاشی راج اسی زمانہ کے کچھ آگے پیچھے۔ ایک اور سلطنت کے قائم ہونے کا پتہ چلتا ہے، جسکا نام کاشی راج تھا، جو کوشل راج سے دکھن طرف واقع تھی۔ اور اسکا دارالحکومت بلدۂ کاشی تھا۔ جو اب تک بڑے اوج و موج اور رونق کے ساتھ قائم ہے۔

زمانۂ حال میں کوشل راج کو اودھ، بدیہہ راج کو ترہت۔ اور کاشی راج کو ضلع بنارس کہتے ہیں۔

ایرانی آریوں کے اصول ملک گیری آریہ مہاجرین یا تارک الوطنوں کی یہ پہلی کھیپ تھی۔ جنھوں نے جنگی فتوحات کی نسبت۔ زیادہ تر اخلاقی فتحیں حاصل کیں۔ یعنی اپنی دلکش عادتوں۔ دلفریب چال چلن۔ دل آویز حسنِ اخلاق۔ اور دلپذیر حسن برتاؤ سے تسخیر عام کا ایک پُر تاثیر جادو پھیلاکر خاص و عام کے دلوں کو مسخر کرلیا۔

آبادیوں کا کچھ ذکر (ضمناً) گمان غالب ہے کہ مہاجرین کی یہ جماعت۔ اُن ایرانی آریوں کی ایک بارور اور سایہ دار شاخ تھی۔ جن کو ایران کی تواریخ میں آبادیاں لکھا ہے۔

یہ مقدس گروہ۔ ملکِ ایران میں۔ دینی رسالت اور دُنیاوی حکومت۔ دونوں منصبوں سے ممتاز و سرفراز تھا۔ مورثِ اعلیٰ اُنکا مہ آباد تھا، جس پر آسمانی کتاب دساتیر نازل ہوئی تھی۔

اِس کتاب میں۔ پندرہ ابواب ہیں۔ جن کو پیغمبروں کے پندرہ صحیفے کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ آبادیوں کا گروہ بھی پندرہ متبرک اشخاص سے مرکب ہے۔ جن میں کا ہر ایک دینی حیثیت سے پیغمبر اور دنیاوی حیثیت سے بادشاہ تھا۔ اور پندرھوں دین مہ آباد کے پیرو تھے۔ آخری پیغمبر و بادشاہ کا نام آباد آزاد تھا۔ اور مدتِ سلطنت آبادیوں کی ۱
سنوز آد سال کیوانی لکھی ہے۔ جس کے دس نیل برس ہوتے ہیں

آباد آزاد کے بعد کیومرث تک (جس سے ایرانی سلطنتوں کا تاریخی زمانہ

شروع ہوتا ہے حکمرانوں کے تین خانوادے اور تختِ ایران پر ہو گزرے ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔ یہ لوگ بھی دینِ مہ آباد کے پیرو تھے۔

نامِ خاندان	مورثِ اعلیٰ کا نام	آخری حکمراں کا نام	مدتِ سلطنت ہر خاندان*
۱۔ جیّان۔	جی افرام آزاد۔	جےٓ آلاد۔	ایک اِسپار سال کیوانی۔
۲۔ شائیان۔	شائی کلیو	شائی مہبول۔	ایک شمار سال کیوانی۔
۳۔ یاسائیان۔	یاسان۔	یاسان آجام۔	نو سلام سال کیوانی۔

آریا ورت جسطرح آریوں کی مناسبت اسی سے ملکِ فارس کا نام ایران پڑگیا تھا اُسی مناسبت سے ہندوستان کے مفتوحہ حصّوں کا نام بھی آریا ورت ہوگیا۔ اور اُسکی حدیں یہ تھیں:۔

اُتر۔ ہمالیہ پہاڑ۔ دکھن۔ بندھیاچل۔ پچھم۔ سندھ۔ پورب۔ بنگال۔

ایرانی اور ہندوستانی آریوں کا اتحاد اگرچہ۔ تقریباً۔ یہ سب باتیں قیاسی ہیں۔ لیکن ایرانی آریوں اور ہندوستانی آریوں کا۔ کسی زمانے میں ایک اور متحد ہونا صرف قیاسی ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس قیاس کی تائید میں بڑی بڑی دلیلیں پائی گئی ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً ہنوز پائی جاتی ہیں۔

ژند اور بید کی زبانیں۔ منجملہ اور اور دلیلوں کے ایک قوی دلیل زبان ہے۔ علماء علم اللسان نے دونوں ملکوں کی مذہبی زبانوں (یعنی ژند اور بید) کی مختلف خصوصیاتِ لسانی پر کامل غور و خوض کرنے کے بعد بالآخر یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ کسی زمانے میں دونوں زبانیں۔ ایک تھیں۔ اگر وہ خود ایک نہ تھیں۔ تو دونوں کا مخرج ضرور ایک تھا۔

---

* اہلِ ایران۔ زمانہ کو اجرامِ سماوی کے بے حساب دوروں پر تقسیم کرتے ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:۔ دس لاکھ برس کا ایک سلام۔ سَو سلام کا ایک شمار۔ سَو شمار کا ایک اسپار۔ سَو اسپار کا ایک زاد۔ سَو زاد کا ایک آزادہ۔ سو آزادہ کا ایک زار۔ سَو زار کا ایک آزار۔ سَو آزار کا ایک بے آزار۔

ہندوستانی آریہ بلاشبہ ایران سے آئے | یہ بات بھی قابلِ لحاظ، بلکہ قابلِ غور ہے کہ سنسکرت کسی زمانہ میں ہندوستان کی عام زبان نہیں ہوئی* بلکہ ہمیشہ اسکو مقدس درجہ حاصل رہا اور اسکا رواج برابر اعلیٰ طبقوں ہی میں رہا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ضرور یہ زبان اور اس کے بولنے والے غیر ملکی تھے اور جب یہ بات ہے، تو ان کا آنا۔ اسی ملک سے زیادہ ترقرینِ قیاس ہوسکتا ہے، جسکا ایک اور متحد ہونا۔ مضبوط مضبوط دلیلوں سے ثابت ہے۔

اتحاد کی مزید دلیلیں | زبان کے علاوہ دونوں قوموں کے عقائد، مذہب۔ علوم وفنون، قوموں اور برنوں کی تقسیم، دوروں اور جگہوں کی تطویل۔ رسم ورواج۔ الغرض بہت سی باتوں میں (جن کی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں) ایسی مطابقت پائی جاتی ہے۔ کہ خواہ مخواہ۔ قیاس ہی نہیں۔ بلکہ یقین ہوتا ہے کہ دونوں قومیں ایک ہی باغ کے دو درخت، بلکہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔

ترکستانی آریوں کا حملہ ہندوستان پر | ہندوستان کا تعلق وسط ایشیا کے ساتھ یوماً فیوماً بڑھتا گیا۔ اور مہاجرین آریوں کے لئے یہاں کی آمد ورفت کا رستہ زیادہ تر وسیع اور صاف ہوتا گیا یہاں تک کہ ایرانی آریوں یا سورج بنسیوں کے بعد آریوں کی ایک اور شجاع و دلیر (مگر جنگجو اور خونخوار) جماعت نے غالباً خاص ترکستان کی جانب سے اس ملک پر حملہ کیا۔

پنجابی وسیوں کے ساتھ لڑائی | ایرانی آریوں کیطرح۔ یہ لوگ بھی۔ اوّل اوّل۔ پنجاب میں

*گو اُجین کے راجہ بکرماجیت۔ اور دھارانگر کے راجہ بھوج کے وقتوں میں (جن میں سے پہلے کا زمانہ سنہ عیسوی سے ۵۷ برس قبل۔ اور دوسرے کا۔ گیارہ سو برس بعد تھا) اُن کی قلمرو وں کے اندر سنسکرت کو اعلیٰ درجے کی ترقی حاصل تھی۔ لیکن وہ ترقی مختص الافراد، مختص المقام اور مختص الوقت ترقی تھی۔ جسکا اثر خاص لوگوں کے درمیان، خاص جگہوں میں، اوقاتِ معین تک محدود تھا۔ عام زبان وہی ہوسکتی ہے جو ملک کے ہر گروہ کی روزمرّہ کی گفتگو۔ اور عام کاروبار میں۔ بے تکلف مستعمل ہوتی ہے۔

داخل ہوئے۔ مگر برخلاف اُن کے اُنھیں اُس مُلک میں سخت دِقتوں کا سامنا ہوا۔ یعنی وہاں کے باشندے (جو اور دیسیوں کیطرح کالے، مگر نسبتًا جری اور بہادر تھے) اِن کی پیشقدمی میں سخت مزاحم ہوئے۔ اور نہایت جُرأت و دلاوری کیساتھ مقابلے کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جان توڑ کوششوں اور جانفشانیوں کے بعد۔ جب اپنے کو کھُلے میدانوں میں مقابلہ کرنے کے ناقابل پایا۔ تو ناچار جنگلوں اور دریا کی کھوہوں اور دوسرے دوسرے محفوظ مقاموں میں پناہ گیر ہوگئے اور اُنھیں پوشیدہ جگہوں سے نَوواردوں کی۔ نَو آبادیوں کو تاخت و تاراج کرتے رہے۔

موقع پاکر اُن کی مویشیوں کو چُرا لے جاتے، راہ باٹ میں اُنھیں لُوٹ لیتے۔ اُن کے گانوؤں کو ویران اور برباد کرڈالتے، اُن کے مرتاض اور تپسوی رشیوں و مُنیوں کو (جو جنگلوں اور ویرانوں میں۔ عزلت نشین ہوکر۔ یادِ خالق میں خوش گزرانی کرتے تھے) طرح بہ طرح کے نقصان اور انواع و اقسام کے آزار پہنچاتے تھے۔ الغرض۔ اُنکو ہر طرح سے تنگ و دق کرتے تھے

اِس کے جواب میں۔ گورے، خوبصورت اور مہذّب آریہ بھی اُن کالے، بدہیئت اور وحشی دیسیوں سے دلی نفرت رکھتے تھے۔ اور ہر موقع پر بڑی بیرحمی سے اُن کو قتل کرتے اور ہمیشہ اُن کی جمعیت کو کم، بلکہ نیست و نابود کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

وحشیوں میں گیاوَ اور کرِشنَ* دو مشہور ڈاکو تھے۔ جو نورسیدہ آریوں کو بہت ایذائیں دیا کرتے تھے۔ کرِشن بڑی بڑی کوششوں سے آخرش پکڑا اور مارا گیا۔ لیکن گیاوَ ہاتھ نہ لگا۔ اور ہر موقع پر اُنھیں بہت تنگ کرتا رہا۔

آریوں کی طرف بھی دو بہادروں کے نام لئے گئے ہیں۔ جو بڑے شجاع اور پہلوان تھے۔ اُن میں سے ایک کا نام کُتسَ اور دوسرے کا سُدَاس تھا۔ کُتسَ۔ ایک زبردست دلیر۔ اور صاحبِ قوت پہلوان تھا۔ جس کی نسبت مبالغے کی زبان میں بیان کیا گیا ہے کہ

* آر۔ سی۔ دَتّ۔ کی۔ اینشنٹ اینڈ ماڈرن ہسٹری آف انڈیا۔

اُسنے اکیلے پچاس ہزار کالے دُشمنوں کو قتل کیا۔ سُدَاس بھی ایک مدبّر، بہادر اور فہمند سپہ سالار تھا۔ اور باشندہ اور بشوامتر رشیوں کا مشہور حامی و مددگار تھا۔ یعنی کالے وحشیوں کے مقابلے میں اُن کی کما حقہٗ حمایت کرتا تھا۔ جو اُن مرتاض مہاتماؤں کو اکثر دُکھ دیا کرتے تھے۔

دیسیوں کا زیر ہونا — صدیوں کی حاسدانہ اور رقیبانہ دشمنی کے بعد آخر کار اصلی باشندے پورے طور پر مطیع ہو گئے۔ یا ملک سے نکال باہر کر دیے گئے۔ اور سارا پنجاب بلا خرشتے ترکستانی آریوں کی اطاعت و حکومت میں آگیا۔ لیکن یہ فتحیں ہنوز سندھ ستلج۔ اور سرسوتی ندیوں کے اُسی پار تک محدود تھیں۔ اور صرف اِنھیں دریاؤں کے درمیانی ملکوں پر فاتحین کا قبضہ ہوا تھا۔

چندر بنس اور پریاگ راج — جس اُلوالعزم اور ذی حوصلہ قوم نے پنجاب کو اس محنت و جانفشانی سے فتح کیا تھا، وہ صرف ستلج اور سرسوتی کے ساحلی ملکوں ہی پر کب قانع رہ سکتی تھی جلد ہی اُس نے اُن ندیوں سے پار ہو کر گنگا اور جمنا کے سرسبز و شاداب دوآبہ کو۔ اپنی کثیر التعداد اور قوت ور جماعتوں کی نوآبادیوں سے بھر دیا۔ اور ایک زمانے کے بعد وہاں اُن کی ایک نہایت زبردست سلطنت قائم ہو گئی۔ جس کی راجدھانی۔ گنگا اور جمنا کے اتصال پر۔ پریاگ یا پرتشٹھان پُری میں قائم ہوئی۔ جسکو اب الہ آباد کہتے ہیں۔

بانیِ سلطنت کا نام بُدھ تھا۔ جسکو۔ کوشل راج کے بانی۔ اِکشواکو کا داماد بتلایا گیا ہے۔ مگر واقعات پر غور کرنے سے حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بُدھ۔ اِکشواکو کا اپنا داماد نہ تھا۔ بلکہ مدتوں بعد اُسکی شادی۔ سورج بنس کی کسی لڑکی سے ہوئی تھی۔ نہ کہ خود اِکشواکو کی لڑکی سے*۔

* کیونکہ۔ اِکشواکو سے۔ مہاراجہ رام چندر تک۔ سورج بنسی راجاؤں کی تعداد ۶۳ بیان کیگئی ہے۔ اور بُدھ سے راجہ جدمشٹر تک۔ چندر بنس کے کُل چھیالیس ہی راجہ بیان کیے گئے ہیں۔ اور جب بُدھ کو۔ اِکشواکو کا داماد بیان کیا جاتا ہے تو لامحالہ دونوں کا زمانہ۔ ایک ہی یا کچھ آگے پیچھے ہوگا۔ پس اِس

تواریخ میں - یہ شاہی خاندان - چندر بنس کے خطاب سے مخاطب ہے اور مورث اعلیٰ اِس کا وہی بُدّھ تھا - مہابھارتھ کی جنگِ عظیم تک - اِس خاندان کے نامی گرامی راجاؤں کی تعداد چالیس سے پچاس تک - مختلف بیان کی گئی ہے -

کُرو اور پنچال راج پھر اسی ایک سلطنت سے دو اور پادشاہتیں قائم ہو گئیں - ایک کا نام کُرو راج تھا - اور دار السلطنۃ اُسکا ہستناپور - جو موجودہ دہلی سے پورب طرف واقع تھا - اِس شہر کو - راجہ ہستی نے واقعۂ مہابھارتھ سے پانچسو برس پہلے بسایا تھا -

دوسری سلطنت - پنچال کے نام سے موسوم تھی - اور اُسکا دار الحکومت کمپلیہ میں تھا - جو موجودہ قصبۂ قنوج سے زیادہ دُور نہ تھا -

بعد ازیں - ہزار برس کے اندر ہی اندر - چند صدیوں کے عرصے میں چندر بنسیوں کی قوی قوی سلطنتیں - قریب قریب - تمام شمالی ہند میں قائم ہو گئیں - مثلاً :- بنگال - اڑیسہ - مگدھ دیش - متھرا - مالوہ - گجرات - اُجّین - وغیرہ وغیرہ -

حتیٰ کہ مہابھارتھ کے زمانے تک (جسکا ذکر ابھی آتا ہے -) سورج بنسیوں کے تحت میں - صرف تھوڑا سا ملک - گنگا سے اُترا اور ہمالیہ سے دکھن باقی رہ گیا تھا - باقی تمامی شمالی ہند میں چندر بنسی ہی چندر بنسی - بر سرِ حکومت نظر آتے تھے -

مہابھارتھ کا محاربۂ عظیم مدّتوں - چندر بنسیوں کا ستارۂ اقبال - ہمہ دم - معراجِ کمال کی جانب ترقی کرتا ہی گیا - اور فتح - نصرت - دولت - اقبال - زر خریدہ لونڈیوں اور غلاموں کیطرح ہر موقع پر - اُن کے سامنے دست بستہ حاضر رہتے تھے - لیکن " ہر کمالے را زوالے " آخر کار خود اُن کے گھر ہی میں - حسد ، بغض ، کینہ ، رشک ، خود غرضی - خود بینی - اور نفس پرستی کی چنگاریاں - دِلوں کے اندر ہی اندر سلگنا شروع ہوئیں - اور تھوڑے ہی زمانے میں ایک

حساب سے مہاراجہ بُدھ مشٹر کا زمانہ مہاراجہ رام چندر سے بہت پہلے قرار پاتا ہے - اور یہ بالکل غلط ہے کیونکہ رام چندر - ست جگ میں اور بُدھ مشٹر دوا پر میں تھے - اور دونوں میں لاکھوں برس کا تفاوت ہے -

ایسی عالمگیر آتش فشانی کی صورت اختیار کی جس کے شرر فشاں شعلوں نے سارے ہندوستان کے افق امن و امان کو غبار آلود کر دیا۔

تفصیل اس اجمال کی مختصراً یہ ہے:۔ راجہ* بیاتی۔ (جو چندر بنسیوں کے مورث اعلیٰ۔ بدھ کا پرپوتا تھا)۔ اُس کے تین بیٹے تھے۔ اُدرو۔[1] پورو۔[2] اور جادو۔[3] پہلا بیٹا کچھ مشہور نہیں ہوا۔ باقی۔ پورو[2] اور جادو[3] کی نسلیں بہت پھولی پھلیں۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ ایک سلطنت پریاگ سے۔ ہستناپور اور کمپلیہ کی۔ دو زبردست سلطنتیں۔ اور قائم ہوگئیں۔ اس پر۔ اتنا اور اضافہ سمجھ لینا چاہیے کہ جادو کی زبردست اور طاقتور اولاد نے مہابھارتھ کے واقعہ تک ان دونوں سلطنتوں کے سوا۔ چھوٹی بڑی۔ چھپّن[56]۔ پادشاہتیں اور قائم کرلی تھیں۔

سری کرشن اور بلرام۔ دو بھائی۔ جادو خاندان میں نہایت ہی نامی گرامی اور صاحبانِ سطوت و جلال ہو گزرے ہیں۔

محاربۂ مہابھارتھ کے متعلق۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوپر کے تفصیلی قصوں سے قطع نظر کرکے صرف نہایت ہی ضروری واقعات بیان کئے جائیں کیونکہ تفصیل کی اس مختصر میں گنجایش نہیں ہے۔

ہستناپور کا راجہ۔ وچتر۔ کوئی لڑکا نہ رکھتا تھا۔ مگر تین لڑکیاں۔ ان میں سے۔ پنڈیا اور انبکا۔ دو مشہور ہوئیں۔ اور دونوں کے ایک ایک لڑکا ہوا۔ پنڈیا کے بیٹے کا نام پانڈو۔ اور انبکا کے لڑکے کا نام۔ دھرتراشٹر تھا، جو نابینا تھا۔

پانڈو کی شادی۔ راج کنیا۔ کنتی سے ہوئی جو باسدیو کی بہن اور سری کرشن کی پھوپھی تھیں۔ اور اُن کے پانچ بیٹے ہوئے۔ جو پانچ پانڈو کے نام سے مشہور ہیں اور اُن کے نام یہ ہیں:۔ جدھشٹر۔[1] بھیم۔[2] ارجن۔[3] نکل۔ اور سہدیو[5]۔

* ترجمہ مارشمین ہسٹری آف انڈیا۔

دھترا شٹر کے سَو لڑکے تھے، جو کَورَو کہلاتے تھے۔ اور سب سے بڑا لڑکا دُریودھن تھا جو پانڈوں کا حریف، بلکہ حاسد تھا۔

پانڈو کے مرنے کے بعد حسب دستور خاندان۔ چھوٹے بھائی دھترا شٹر کو۔ راج گدّی ملنی چاہیے تھی۔ مگر نابینائی کی وجہ سے اُس نے انکار کیا اور بے نفسی اور ریاست کا برتاؤ یہاں تک کیا کہ اپنے بیٹے دُریودھن کو چھوڑکر اپنے بھتیجے جدھشٹر کو تخت پر بٹھلا دیا۔

یہ بات۔ جوان طبع۔ پُرحوصلہ اور نفس پرست دُریودھن کو سخت ناگوار گذری۔ اور اُس نے۔ بہ زبردستی راج گدّی پر قبضہ کرکے پانچوں بھائی پانڈوں کو نکال دیا۔ جو کچھ وزوں تک۔ ملکِ سندھ میں آوارہ پھرا کئے۔

اُن دنوں کَمپِل نگر کے راجہ نے (جو جادو کی نسل میں تھا) اپنی حسینہ لڑکی درَوپدی کی تقریب شادی میں اپنے یہاں سُیمبر جگ۔ رچا تھا۔ جہاں دیش دیش کے نریش اُس مہ جبین کے اشتیاقِ ازدواج میں ڈیرے ڈالے ہوئے بصد تمنائے دلی اُمیدوار تھے

تا دوست کرا خواہد و میلش بہ کہ باشد۔

پانچوں بھائی پانڈو بھی۔ اِسی غرض سے۔ پھرتے پھراتے وہاں جا پہنچے۔ ارجن کے بختِ سعید نے یاوری کی۔ اور اُس نے اِمتحانِ تیراندازی میں پورے طور سے کامیابی حاصل کرکے اُس مہ لقا کو جیت لیا۔ اِس فتحمندی سے پانڈوں کی شہرت و ناموری ہر خاص و عام میں بہت ہوگئی۔

صلح پسند اور دردمند دھترا شٹر نے۔ پانچوں بھتیجوں کو بُلاکر رفع فساد کیلئے کُل راج کو بیٹوں اور بھتیجوں کے درمیان تقسیم کردیا۔

ہستناپور تو بدستور۔ دُریودھن کے قبضے میں رہا۔ اور پانڈوں نے اپنا دارالحکومتہ اِندرپرست کو مقرر کیا۔ جو ہستناپور سے زیادہ دُور نہ تھا۔ اِس شہر نے پانڈوں

کے زیر سایہ بڑی رونق اور آبادانی حاصل کی - اور ہستناپور سے ہمسری کا دعوی کرنے لگا۔
پانڈوں کی روزافزوں ترقی - حاسد دُریودھن کے دل میں کانٹے کیطرح کھٹکنے لگی۔
اور جب زور و قوت سے اُن کی عزت و اقتدار میں - مزاحمت رسانی اور رخنہ اندازی
سے اُسکو یقینی مایوسی ہوئی تو بزدلانہ چال بازی اور فریب کے حملے شروع کیے - یعنی قمار بازی
اور جوئے کا ڈھنگ ڈالا - چنانچہ چند عشرے سے اُسکا سارا راج تخت و تاج، مال و اسباب
پیاری اور حسین رانی، دُرُوپدی - الغرض سب کے سب کو - ایک ہی داؤں میں جیت لیا - اور
پانچوں بھائیوں کو، بارہ برس کی جلا وطنی پر مجبور کیا - جو زمانۂ سوعود تک - تقریباً تمامی ہند
میں سرگردان رہے - اور ہر جگہ اپنی - شجاعت، عظمت و جلالت کے آثارات قائم
کرتے گئے۔

بارہ برس ختم ہوجانے پر - پانڈوں نے جمنا کے کنارے کسی مقام پر آکر اپنے ملک کا
دعوے کیا - جسکا جواب اُن کو نہایت مایوسی بخش اور حقارت آمیز ملا - یعنی دُرُیودھن
نے کہلا بھیجا کہ اب اُنکو - سُوئی کی نوک کی برابر بھی - زمین نہیں ملسکتی۔
اب جلا وطن و بے خان و مان - پانڈوں کو بجز اسکے اور کوئی تدبیر نہ سوجھی کہ بزور
شمشیر اپنا حق حاصل کریں - چنانچہ اسی آخری بند و بست میں وہ مصروف ہوئے - اثنائ
سیاحت اور آوارہ گردی میں اُن کے بڑے بڑے صاحبانِ جاہ و حشمت - زور و قوت
اور مالکانِ غیرت و حمیت دوست پیدا ہو گئے تھے، جن کو اُن کی بے بسی اور رحم آور
حالت کیساتھ دلی ہمدردی تھی - اشارہ پاتے ہی سب کے سب جان نثاری اور جان سپاری
کو اُٹھ کھڑے ہوئے - اِدھر دُرُیودھن کو بھی رشتہ داروں کی اِمداد و معاونت کے علاوہ
اسپنے زر و زور پر کم بھروسہ نہ تھا۔
الغرض - جانبین سے رزم آرائی اور معرکہ پیرائی کی ٹھن گئی - جادو کی چھپّن[56] نسلوں کے
سوا (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) ہمالیہ سے راس کماری تک اور سرحد بنگال سے

بحیرۂ ہند اور بحیرۂ عرب تک کے کُل راجے، مہاراجے۔ پہلوان۔ نبرد آزما، سُورما، بیرِ شجاع اور بہادر، دو میں سے کسی ایک حریف کا ہاتھ بٹانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔*

کُرو کشیتر کا میدان، اِس خونخوار اور خونریز لڑائی کے لئے بدا گیا۔ اور دونوں طرف کی فوجیں وہاں اکٹھی ہوئیں۔ طرفین کے سُورموں اور بیروں نے طرح طرح کی ہنر آزمائیاں اور جوہر نمائیاں شروع کیں۔ حتّٰی کہ مروّجہ آلاتِ جنگ کے سوا۔ (جن کا استعمال اُس زمانے میں عموماً ہوا کرتا تھا) اِس لڑائی میں۔ لاٹھی۔ سوٹا۔ ڈھیلا۔ پتھر۔ لات، گھونسا۔ دانت، ناخن۔ اِن سب چیزوں سے بھی۔ بے تکلف۔ بڑی ہنرمندی کیساتھ کام لیا گیا۔

یہ نمونۂ رستخیز۔ معرکہ۔ اور خونریز محاربہ۔ اٹھارہ روز تک۔ بڑی جلادی و بیدادی کے ساتھ برپا رہا۔ طرفین کے بیشمار آدمی مارے گئے۔ خون کی ندیاں بہ گئیں کُشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ آخر کو دُریودھن مارا گیا۔ اور مہاراجہ جُدھشٹر کی جیت ہوئی۔

لیکن جب اُنھوں نے، دوستوں اور دشمنوں کی لاشیں۔ (جو ایک ہی خون اور نسل سے تھے) خاک و خون میں، غلطان و پیچاں پائیں۔ تو اِس عبرت انگیز نظارہ نے۔ اُس نرم، رقیق اور پُر درد دِل پر حسرت و مایوسی کا گہرا اثر ڈالا۔

فتحمند راجہ کو اِس تمنّا اور آرزو کی نصرت و ظفر کی مطلق خوشی نہ ہوئی۔ بلکہ مفتوحہ شہر ہستناپور میں داخل ہو کر، دوستوں، دشمنوں خصوصاً دُریودھن کی لاشوں پر اُنھوں نے نہایت رقّت اور درد و حسرت کیساتھ نوحہ و ماتم کیا۔ اور دنیاے ناپائدار

* - یہ وُہی میدانِ رزم ہے۔ جہاں۔ پرتھی راج کو۔ شہاب الدین غوری نے۔ ابراہیم لودی کو بابر بادشاہ نے۔ اور مرہٹوں کو۔ احمد شاہ دُرّانی نے۔ ہزیمت دی تھی۔

اِن واقعات سے۔ ایک ضعیف الاعتقاد اور کمزور دل میں۔ یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ یہ میدان۔ ہندوستان کے صاحبانِ تاج و تخت کے حق میں نامبارک ہے۔ اگرچہ اِس خیال کو واقعیت اور حقیقت سے کچھ واسطہ نہ ہو۔

سے متنفر و دل برداشتہ ہو کر۔ تخت و تاج ارجن کے پوتے پرکھیت کو سپرد کیا۔ اور خود ہمالیہ کے برفستانی پہاڑوں میں ریاضت و تپسیا کی غرض سے چلے گئے۔ (باقی آئندہ)

۱۵- فروری سنہ ۱۹۰۸ء۔ خاکسار دیانت حسین عفی عنہ
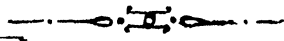
انضباطِ تعلیم

حضرات۔! ایسوسی ایشن کی جانب سے جس مضمون پر قلم اُٹھانے کا مجکو حکم دیا گیا ہے غالب گمان یہ ہے کہ میں اُس سے عمدہ طور پر عہدہ برا نہو سکونگا۔ ایک تو اسلئے کہ میں پُرانی طرز کا تعلیم یافتہ اور دقیانوسی خیالات کا بندہ ہوں۔ جس طریق تعلیم و تربیت سے اس آخری زمانے میں مجھے فیضیاب ہونے کا موقع ملا ہے اُس میں جہاں تک میں نے دیکھا ہے اُستاد کی طرف سے کسی قاعدہ اور روش کی پابندی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ وہ لوگ مختلف اطوار اور مختلف مزاج کے بزرگ ہوتے تھے۔ اور کسی خاص کمال کے سبب سے جسکو عوام الناس پسند کرتے تھے مرجعِ خلائق ہو جاتے تھے، اور طلبا نہ کسی جبر و تشدّد یا کسی لالچ اور طمع سے بلکہ محض اپنے دلی شوق سے جس قسم کے کمال کو حاصل کرنا چاہتے تھے اُسی قسم کے صاحب کمال کیطرف سر کے بل دوڑتے تھے اور بصد آرزو اُستاد کی آستاں بوسی کو اپنی سعادت سمجھکر اُسکے آگے زانوئے تلمّذ تہ کرتے تھے، اور اُستادوں کا یہ عالم ہوتا تھا کہ وہ اکثر اوقات شاگردوں کے ہجوم سے گھبراتے تھے، اور کبھی کج خلقی سے اور کبھی کسی حیلہ بہانہ سے اُس بھیڑ کو اپنے پاس سے ہٹانا چاہتے تھے۔ مگر طلبا جو طلب صادق رکھتے تھے، اُن کی کج خلقی کو دلرُبا یانہ ادا سمجھتے تھے، اور اُنکی ناز برداری کرتے تھے، اور تمام تمام دن کی خدمتگزاری کے بعد اُستاد سے ایک نکتے کا حاصل کرنا اپنی عرق ریزی کا کافی معاوضہ سمجھتے تھے۔ اُس مجلس میں ضرورت ہی نہوتی تھی، کہ اُستاد

علاوہ علمی نکات بیان کرنے کے طلبا کے اطوار کو بھی دیکھتا رہے۔ اور اُن کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کے لئے اور کھیل و تماشا یا غفلت سے باز رکھنے کے لئے نظر کو ہر طرف دوڑائے اور مختلف سوالوں سے، فضول تکرار سے، یا چشم نمائی سے طلبا کو سبق کیطرف متوجہ کرے۔ وہاں تو ہمنے اکثر بلکہ ہمیشہ وہی نقشہ دیکھا ہے، جسے عربی ضرب المثل میں کانما علی رؤسھم الطیر سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی سب اِس انداز سے بیٹھے ہوتے ہیں کہ وہ بالکل جسم بے جان ہیں اور اُن کو بُت سمجھکر وحشی پرندے اُنکے سر پر آ بیٹھتے ہیں۔ اُستاد کی تقریر کا ایک لفظ بھی اُن کے کان تک نہ پہونچے تو اُسے ماں باپ کے ماتم سے زیادہ حسرت ناک سمجھتے ہیں اور اُسکا ایک فقرہ بھی اگر نہ سمجھیں تو اُسے اپنی موت سے زیادہ ناگوار جانتے ہیں۔ اُستاد گھبراکر اُن کو دفع کرنا چاہتا ہے اور وہ اُسوقت بھی ہمہ تن گوش ہیں کہ خفگی میں جو الفاظ اُستاد کی زبان سے نکل رہے ہیں شاید اُن میں بھی کوئی علمی نکتہ ہو جو ہم حاصل کر سکیں۔ اُستاد کسی مشکل مسئلے کے حل کرنے میں محو ہو رہا ہے اور وہ لوگ اُستاد کے سوالوں کا انتظار کرنیکے بغیر خود ہی مختلف اعتراض اور ہر پہلو پر سوال کر کے اُس مسئلے کو ذہن نشین کر رہے ہیں۔ اُستاد وقتِ مقررہ پر اپنی مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز نہیں ہوا۔ مگر شاگرد وقت سے بہت پہلے موقعہ مناسب اور مسند کے قریب جگہ لینے کیلئے ایکدوسرے پر پیشدستی کر رہے ہیں۔ اُستاد کسی دن سبق ملتوی کرنے کے لئے حکم دیتا ہے اور وہ اُس خبرِ بد کو اِس حسرت سے سُنتے ہیں گویا اُن کی خانمان بربادی کی اطلاع ہے۔

صاحبان! وہ لوگ اکثر یہ قاعدہ مقرر کر لیا کرتے تھے۔ کہ جو شاگرد سب سے پہلے حاضر ہو جماعت میں سبق پڑھنے کا فخر وہ پائے۔ اور باقی طلبا سُنتے رہیں۔ اِسپر اکثر پیش آیا ہے کہ کوئی شوقین طالب علم رات ہی کو اُستاد کے دروازے پر آ بیٹھا ہے کہ دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہو اور سب سے پیشتر آنے کی عزت پائے۔ اُن کے ہاں رجسٹروں میں نام لکھنے اور وقت پر پکارنے اور غیر حاضری پر جرمانہ کرنے کا دستور ہی نہ تھا۔ مگر

طالب علم ہو، اور وقت پر نہ آئے۔ اِس مضمون کے لئے اُن کے دماغ میں جگہ ہی نہ تھی۔ اُس زمانے میں یہ سخت احتیاط اور نہایت پابندی کیساتھ امتحان لینے اور سارٹیفکٹ دینے کا رواج نہ تھا۔ مگر پڑھنے والا اُستاد سے پڑھے اور نالائق رہے، ایسے جانور کا وجود ہی عنقا تھا۔ حضرات! آپکو اپنے علوم جدیدہ، تحقیقات بدیہہ مبارک ہوں۔ اُس زمانے والے اُنسے نا آشنا تھے۔ اور اِس زمانے کی برکتوں سے بلاشُبہہ محروم تھے۔ مگر اُس طرزِ تعلیم اور اُس طلبِ صادق کا یہ اثر یقیناً قابلِ رشک ہے، کہ وہ لوگ جو کچھ بھی سیکھتے تھے اُسکے سیکھنے والوں میں فیصدی ایک سچے معنوں میں عالم و فاضل کہلانیکا مستحق نہو تو نہ ہو مگر آپکے گریجوایٹوں میں معاف کیجیگا اگر کہوں کہ اسکے برعکس فیصدی ایک بیچلر آف آرٹس یا ماسٹر آف آرٹس کا خطاب پانیکا حقدار ثابت ہوگا۔ اُس زمانے میں اگرچہ کم مگر پھر بھی ہر دَور میں ایک یا چند علاّمہ محقق کا درجہ حاصل کر لیتے تھے۔ مگر آپکی تعلیم میں اپنے فن کا ڈاکٹر کم از کم اِس انڈیا میں تو آجتک غالباً کوئی نہیں نکلا۔

حاصل کلام اِس طرزِ تعلیم کا زمانۂ کمال تو میں نے دیکھا نہیں مگر جو کچھ بھی میں نے دیکھا ہے اُسکا مقابلہ اپنی حالت سے کرتے ہوئے میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اپنی حالت پر بیحد افسوس ہوا کرتا ہے کہ واے قسمت ہماری عمر ہمیشہ ناز برداری ہی میں گذری۔ طالبِ علمی کے زمانے میں اُستاد ملے تو پُرانے زمانے کے ملے اور جب خود اُس درجے پر پہونچے جسپر اُن لوگوں کو دیکھکر عزت و توقیر کا خیال دل میں جاگزین ہوتا تھا یعنے اُستاد بنے تو شاگرد اِس بیسویں صدی کے ملے جو ناز اٹھانے کی بجائے ہم کو ہی ناز برداری پر مجبور کرتے ہیں۔ وہاں وقت پر اُستاد کا شوق سے انتظار کیا جاتا تھا اور اُن کے برآمد ہونیکو عید کا چاند سمجھا جاتا تھا، اور یہاں ہم کو وقت سے پہلے حاضر ہونا ہوتا ہے کہ گھنٹہ بجتے ہی کمرے میں حاضر ہوں ورنہ شاگرد ہماری غیر حاضری کو عید نوروز سمجھ کر اپنی آوارہ گردی کے لئے ایک معقول بہانہ پیدا کر لینگے۔ وہاں علم کو علم کے لئے پڑھتے تھے اور اُستاد کی

ہر ایک آواز کو ندائے ہاتف سمجھکر ہمہ تن گوش رہتے تھے۔ اور یہاں مدرسے کی حاضری کو قید بے زنجیر جانکر طلبار کی یہ خواہش رہتی ہے کہ ہماری نظر خطا کرے اور وہ باہم ہنسی مذاق اور دنگا فساد شروع کریں۔ وہاں سبکی نظر اُستاد کے چہرے پر رہتی تھی اور وہ خود سوال کرکے اُن کو مسئلے کے حل کرنے میں مدد دیتے تھے اور یہاں ہمکو تقریر کرتے ہوئے سب کی طرف نظر رکھنی پڑتی ہے، اُن کو دنگا اور فساد سے روکنا پڑتا ہے۔ وہ چاہتے نہیں مگر جبرًا اُن کے کانوں تک آواز کو پہونچانا پڑتا ہے اور اُنکی توجہ اپنی جانب پھیرنے کے لئے طرح طرح کے سوال کرنے پڑتے ہیں۔ قسم قسم کے رُوپ بھرنے پڑتے ہیں۔ ابھی کُرسی پر بیٹھے ہیں ابھی شرارہ کیطرح اُچھل کر کمرے کے دوسری طرف جا کھڑے ہوئے۔ کبھی سیڑھی پر ٹک گئے ہیں اور کبھی بورڈ سے لٹک گئے۔ غرض اس زمانے میں ایک لائق اُستاد کو بلا شُبہہ وہی کام کرنا پڑتا ہے جو تھیٹر میں ایک ایکٹر کرتا ہے۔ اور ان سب باتوں سے غرض یہ ہوتی ہے کہ یہ چند آوارہ مزاج جنکو غلطی سے طالب علم جیسے معزز خطاب سے پکارا جاتا ہے اور کسیطرح نہیں تو اُستاد کی حرکات ہی کو دیکھنے کے لئے اسطرف نظر کریں۔ اور اُستاد اُن کی اس نظر عنایت سے فائدہ اُٹھاکر کسی دلکش طرز بیان سے جو جادو بھرے نغمہ و سرود سے مشابہ ہو یا خوش نما تحریر سے جو بورڈ پر ایک خوبصورت گلدستہ کا شبہہ ڈالے سبق کو دلچسپ بنائے جو طلبا کے نزدیک اپنی خشکی اور ناگواری میں جیل کی مشقت سے کم نہیں۔ یہ میں مانتا ہوں کہ تعلیم کو عام کرنا اور ہر کس و ناکس کو علم و ہنر کی چاشنی چکھانا جسکی آجکل ہرطرف چیخ پکار ہو رہی ہے وہ غرض موجودہ حالت میں اسیطرح حاصل ہو سکتی ہے کہ مان نہ مان میں تیرا مہمان بنکر یہ امرت پھل سب لوگوں کے حلق میں ٹھونسا جائے۔ مگر حضرات! سچ پوچھئے تو یہ لوگ جو کسی نہ کسیطرح محض رجسٹرار کا دستخطی بالشت بھر کا کاغذ لینے کے لئے بادل ناخواستہ مدرسے میں آتے ہیں انکو پڑھاکر آپ نے علم کا دعوےٰ کرنے والے بیشک بہت بنا دیے لیکن جسکا نام علم ہے اُسکو جاننے والوں کی تعداد اب بھی اگر ہوگی تو سو سو سے اُسی قدر ہوگی جتنی اس

اشاعتِ علم کا ڈھول بجانے سے پہلے تھی ۔
خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو بات میں پہلے کہہ رہا تھا وہ یہ تھی کہ جہاں گذشتہ زمانے میں صرف مسئلے کو واضح تقریر سے بیان کردینا ڈیوٹی ادا کردینے کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا وہاں اب علاوہ اس کام کے اُستاد ہی کو یہ سب جھگڑے مول لینے پڑتے ہیں اور اُس محدود وقت کا جو ایک مضمون کے لئے معیّن ہوتا ہے، بہت بڑا حصّہ اِن فضول حرکات و افعال میں ضائع کرنا پڑتا ہے ۔قصّہ کوتاہ آج کل کی تعلیمی دنیا بلکہ اسکا نظامِ شمسی اُس دنیا سے بالکل نرالا ہے، جبمیں پرورش پانے کا مجھے موقع ملا ہے ۔اِس لئے میں بجا عرض کرتا ہوں کہ اِس مضمون کو موجودہ ضرورت کے مطابق بیان کرنیکی قابلیت مجھ میں ہرگز نہیں ۔
اور دوسرے عجیب اتفاق کہئے یا میری نادانی کہ غور کرنے کے وقت میں وہ لفظ ہی بھول گیا جو ہمارے اِس لکچر کا ہیڈنگ مقرر کیا گیا تھا خدا جانے وہ لفظ ڈسپلن تھا یا کچھ اور ۔مگر ہمارے پریسیڈنٹ نے وہ لفظ بولنے کے بعد لفظ نظام سے اُسکا ترجمہ کیا تھا اور نظام کا لفظ آفتاب اور اُسکے متعلقہ سیّاروں کی ترتیب پر بھی بولا جاتا ہے ۔اسلئے میری دوڑ دیکھئے کہ نظام سے نظامِ شمسی کا خیال آیا ۔تھا تو یہ دماغی نقص کا اثر جو قوتِ متخیلہ پہ قابو نہ رکھنے والوں کو اکثر حیران کیا کرتا ہے ۔مگر غور کیا تو مجھے بہت سی باتیں نظامِ شمسی اور نظامِ مدرسہ میں مشترک نظر آئیں ۔نظامِ شمسی میں ہزاروں سیّارے ایک خاص ترتیب اور پابندی کے ساتھ اپنے مرکز یعنی آفتاب کے اِرد گِرد جمع رہتے ہیں تو نظامِ مدرسہ میں بھی طلبا کی ایک تعداد کو اُستاد کے آس پاس خاص انتظام اور ترتیب سے بیٹھنا ہوتا ہے ۔نظامِ شمسی کا ہر ایک سیّارہ اپنی قوتِ نافرہ سے آفتاب سے دور جانا چاہتا ہے اور آفتاب اپنی قوتِ جاذبہ سے اُن کو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے ۔اور اسطرح دونوں کی بالمقابل طاقتوں کا اثر اُن کو دوری بیضوی

حرکت بخشتا ہے جس سے کبھی وہ آفتاب کے قریب آجاتے ہیں اور کبھی نسبتاً دور چلے جاتے ہیں تو یہاں بھی طلبا کی خواہشِ آزادی اور اُستاد کی طرف سے ضابطہ کی پابندی دائمی آمد و رفت کو مسلسل قائم رکھتی ہے۔ نظامِ شمسی میں آفتاب کی قوت یوماً فیوماً غالب آتی جاتی ہے اور سیاروں کو بتدریج اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے اور نیز لارڈ کیلون کی تھیوری کے مطابق آفتاب کی حرارت خرچ ہوتی جانے کے سبب وہ خود بھی سکڑتا جاتا ہے تو یہاں بھی ضابطے کی پابندی دن بدن سخت ہو رہی ہے اور طلبا اور خصوصاً کالجیٹ طلبا کی بود و باش اور پرائیویٹ اسٹڈی کی آزادی کو بتدریج کم کیا جاتا ہے۔ اور نیز دوسری طرف بھی ضابطہ کی پابندی اُستاد کی ذمہ داریوں کو بڑھا کر اُن کی دماغی طاقتوں کو حرارتِ آفتاب کیطرح زیادہ خرچ کرتی جاتی ہے۔ وہاں آفتاب اپنے سیاروں میں حرارت اور حرارت کے وسیلے سے روشنی تقسیم کرتا ہے۔ جسپر اُن کے تمام مظاہر خلق و ایجاد منحصر ہیں۔ تو یہاں اُستاد اپنے طلبا میں علم اور علم کی وساطت سے عقل پیدا کرتا ہے جسپر اُن کی ہر طرح کی ترقی موقوف ہے۔ وہاں کبھی آفتاب میں داغ پیدا ہو جانے سے سیاروں کے موسمی آثار میں بہت کچھ اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور آفتاب کے داغوں کا سبب سیاروں اور سیارے کے رہنے والوں کے اختیار سے باہر ہے۔ کیونکہ وہ بہت کچھ آفتاب سے پرے کے دیگر نظام ہائے شمسی اور دوسرے عوامل کے اثر پر موقوف ہے تو یہاں بھی بعض اوقات اُستاد کے دماغ میں ناگوار خلقی اور غیر معمولی ضعف پیدا ہو جانے سے طلبا کی علمی رفتار میں بہت بڑا تفاوت آجاتا ہے اور اِس نقص کو دور کرنا اس نظام میں رہنے والوں یعنی طلبا کے اختیار سے باہر ہوتا ہے کیونکہ یہ بھی بیشتر نظام مدرسہ سے بالاتر طاقتوں اور دیگر تعلقات بیرونی کا اثر ہوتا ہے۔ غرض جسطرح آفتاب اور اُسکے متعلق سیاروں کا باہمی انتظام خوبی کیساتھ جبھی تک قائم رہ سکتا ہے کہ اُس نظام کا ہر ایک جزو اپنے موقع مناسب پر کام کرے اسیطرح

نظام مدرسہ کی عمدگی بھی ارکان اور ارکان ئی ہر ایک طاقت کے مناسب محل پر موقوف ہے۔ مگر حضرات! نظام شمسی اور نظام مدرسہ کی مشابہت ناقص رہجائیگی اگر میں ایک خاص فنامنن کا ذکر نہ کروں جو دونوں میں مشترک اور نظام پر بہت بڑا اثر کرنیوالا ہے۔ آپنے نظام شمسی کے ایک بڑے رکن یعنی دُم دار ستاروں کو دیکھا اور اُن کے حالات کو پڑھا ہوگا کہ اُن کی حرکت دوسرے سیّاروں سے بالکل جُداگانہ ہے اور اُن کا مدار حرکت اگرچہ بیرابولا یا شکل تسبیحی ہوتی ہے، یعنی اُن کے خطِ رفتار کو اُس تسبیح یا مالا سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے جو لوگ وظیفے کیوقت ایک ہاتھ میں لٹکا لیتے ہیں۔ مگر ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی نہایت ہی دُور و دراز فاصلے سے دیگر تمام سیاروں کے دائروں کو نیچے اوپر سے قطع کرتے ہوئے بہ خطِ مستقیم آفتاب کی جانب آتے ہیں اور جب آفتاب کے قریب پہونچتے ہیں یا اُسکی سطح سے ٹکراتے ہیں تو پھر یہ حرکت بازگشت فوراً واپس ہوتے ہیں اور دوڑتے ہوئے فضا میں غائب ہو جاتے ہیں اور سالہا سال کے بعد پھر اُسی حرکت سے آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور نیز ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جب وہ اپنی رفتار میں کسی سیارے کی فضا میں داخل ہو جاتے ہیں تو اُسکی کشش ثقل کے سبب اپنے اصلی خطِ رفتار کو چھوڑکر اُسکی طرف جُھک جاتے ہیں۔ غرض ان کی رفتار دیگر سیّاروں کی باقاعدہ گردش کے مقابل میں نہایت ہی بے ڈھنگی اور بدنما ہے۔ اگر کوئی شخص نظام شمسی کے پرے کسی ایسے مقام پر کھڑا ہو جہاں سے وہ تمام نظام کو دیکھ سکے تو وہ بیساختہ کہہ اُٹھیگا کہ جب تک یہ دُمدار ستارے اِس نظام میں داخل ہیں، اِس انتظام میں ہمیشہ ابتری رہیگی۔ اور اُسکو عمدہ اور قابلِ تعریف کہنا بیجا ہوگا۔

صاحبان! یہی منظر ہم کو نظامِ مدرسہ میں نظر آجایا کرتا ہے جب اتفاق سے کوئی ایسا شخص جماعت میں داخل کر لیا جاوے جو اس جماعت کیساتھ چلنے کے قابل نہو وہ لوگ دیگر طلبا کی طرح اُستاد کی قابلیت اور ضابطہ کے زیر اثر ہو کر ہرگز باقاعدہ گردش

یا آمد و رفت قائم نہیں رکھ سکتے - بلکہ کبھی حد سے زیادہ جوش کیساتھ غیر معمولی تیزی سے اُستاد کی طرف آتے ہیں اور پھر اُسکی حرارتِ علم اور نورِ عقل کو اپنی برداشت سے باہر دیکھکر ضابطے کے خطوں کو توڑتے ہوئے واپس بھاگ جاتے ہیں - اور طویل غیر حاضری کے بعد پھر اُسی تیزی سے اُستاد کی جانب آتے ہوئے نظر پڑتے ہیں اور جو نور کتابوں کی شکل میں دوسرے طلبا کے لئے ہالہ جیسا خوشنما نظر آتا ہے اُسکا پُشتارہ اُن کی پشت پر ایک فضول دُم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا - اور جسطرح دُمدار ستارہ دوسرے سیّاروں کے محور میں اگر اور اُن کی طرف متوجہ ہوکر نظام میں ابتری ڈالنے کا باعث ہوتا ہے - اسیطرح یہ لوگ شوقین طلبا کی طرف مائل ہوکر اکثر اپنی فضول حرکات اور آوارہ عادتوں سے اُنکے نظام میں خلل ڈالنے کا باعث ہوتے ہیں اور اِن دونوں کی تشبیہ ایک اور وجہ سے بھی قوی ہوتی ہے کہ سابقہ ہیئت دانوں کے نزدیک دُمدار ستارے سیّاروں کی قسم میں شمار نہیں ہوتے تھے - بلکہ اُن کو زمین کا بخار سمجھا جاتا تھا اور نظر سے غائب ہو جانے پر خیال کیا جاتا تھا کہ وہ بخار تحلیل ہوگیا - جسکے برخلاف موجودہ اسٹرانومی نے انکو بھی سیّارہ مانا ہے اور اُن کی رفتار کا ضابطہ ثابت کیا ہے، اسیطرح سابقہ طرزِ تعلیم میں بھی ایسے بے شوق اور نالائق لڑکوں کو طلبا کی فہرست سے خارج سمجھکر طلبا کی جماعت کو اُن کی آمیزش سے پاک رکھا جاتا تھا - اور آجکل فیس دینا اور رجسٹر میں نام لکھوانا طالب علم بننے کے لئے کافی سمجھکر ایسے لوگوں کو اِس معزز گروہ میں شامل کرلیا ہے - بلکہ عام تعلیم کے غدر نے انکو اِس گروہ کا ایک ممتاز رُکن بنادیا ہے - مگر حضرات! آگے چلکر تشبیہ میں نقص پیدا ہوتا ہے کیونکہ دُمدار ستاروں کی نسبت خیال ہے کہ یہ کسی دُور کی فضا اور کسی اور یونیورس میں سے حرارت اور قوت لاکر اس نظام میں داخل کرتے ہیں حالانکہ یہ وصف نالائق طلبا میں ہرگز نہیں اور اُن کیوجہ سے بہتری مدرسے کی حالت میں پیدا نہیں ہوتی اور اگر کھینچ تان کر اُن کی فیس کی آمد اور اُن کے سرپرستوں کی خوشنودی کو مدرسے کے لئے ایک غیبی امداد سمجھا جائے جیسی دُمدار سیّاروں کی حرارت اور قوت سے

پہونچتی ہے، تب بھی یہ ایسی ناخوش گوار امداد ہے جو کسیطرح نظام کے خلل اور نقص کا کفارہ نہیں ہو سکتی، اور جبتک ایسے طلبا اور ایسی اِمداد کا وجود اِس نظام میں رہیگا، نظامِ مدرسہ ہرگز عمدہ اور قابلِ تعریف نہیں ہو سکتا۔ عزیز بخش۔ عفی عنہ۔

مصریوں کی ایجادیں

مصر ایک نہایت شاداب اور زرخیز ملک ہے، اِسمیں پیداوار بہت کثرت سے ہوتی ہے۔ اِسکی خوشگواری آب وہوا اور شادابی کا یہ اثر ہے کہ اِسکے باشندونکی طبیعتیں بہت ذکی اور ایجاد پسند ہیں۔ قدیم باشندگانِ مصر نے جو ایجادیں کی تھیں اُن سے اب تک ایک عالم حیرت میں ہے۔

اوّل اوّل وہ ستاروں کے حالات کیطرف متوجہ ہوئے۔ اور اُس میں اُن کو کھلی ہوا ہموار زمین اور صاف مطلع سے بہت مدد ملی اور اُنھوں نے ستاروں کی حرکات وسکنات کی بڑی تحقیقات کی اور بہت کچھ چھان بین کے بعد اپنے سال کو آفتاب کی گردش کے مطابق کرکے ۳۶۵ دن اور چھ گھنٹے کا سال مقرر کیا۔

دریاے نیل جو ایک عظیم الشان دریا ہے جب کبھی طغیانی پر آتا تھا تو سیکڑوں ایکڑ زمین غرق ہوجاتی تھی اور اِس سے مالکانِ آراضی میں بہت جھگڑا ہوتا تھا، اِس فساد کے رفع کرنے کے لئے اُن کو علمِ پیمایش کیطرف توجہ کرنی پڑی چنانچہ اُنھوں نے علم ہندسہ ایجاد کیا

مصریوں کی ایک ایجاد جو نہایت حیرت انگیز اور عجیب وغریب ہے، یہ تھی کہ اُنھوں نے ایک ایسا خوشبودار مصالحہ بنایا تھا کہ اُسکو مُردے کے جسم پر ملنے اور اندرونی اعضاے جسمانی میں پہونچانے سے لاش برسوں اصلی حالت میں رہ سکتی تھی

جب کسی کا کوئی نہایت عزیز دوست یا رشتہ دار مرجاتا تھا تو وہ اُسکی لاش اُن عطریات اور خوشبودار مصالحوں کے ذریعے سے محفوظ رکھتے تھے، مگر اِس ایجاد سے

سہر کہ وہ مستفیض نہیں ہو سکتا تھا اِسلئے کہ اُسمیں روپیہ بہت خرچ ہوتا تھا - ایک لاش پر اول درجے کے مسالحے کے واسطے تیرہ سو پچھتر [۱۳۷۵] روپئے صرف ہوتے تھے -

قدیم باشندگانِ مصر چیزوں کے خواص اور تاثیرات معلوم کرنے میں بہت مصروف رہتے تھے اور اِسمیں اُنھوں نے کچھ اپنی ذکاوتِ طبع اور کچھ ہوا اور دھوپ کے صاف ہونے کیوجہ سے بہت کمال حاصل کیا - اور فنِ طبابت کو ایجاد کیا - مگر بعض مورّخ کہتے ہیں کہ فنِ طبابت کے موجد مصری نہیں ہیں بلکہ اُنھوں نے اُسکو ترقی دی ہے - جو کچھ ہو لیکن اسمیں شک نہیں کہ اُنھوں نے اِس فن کو اِسقدر چمکایا اور اسمیں ایسی ایسی ایجادیں کیں کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس سے پہلے اِس فن کا نام تک بھی نہ تھا - وہ بیمار کی اِسقدر حفاظت کرتے تھے کہ اُسکو صرف طبیب ہی کی مرضی پر نہ چھوڑ دیتے تھے کہ جسطرح چاہے علاج کرے بلکہ طبیب کو بھی اُنھیں قاعدوں کی پابندی کرنی پڑتی تھی جو تجربہ کار حکیموں نے مقرر کردیے تھے، اگر طبیب اُن قواعد کی خلاف ورزی کرتا تھا تو اُسے مریض کے شفایاب نہونیکی جوابدہی کرنی پڑتی تھی اور اُسکے اچھے نہونے کی عوض میں طبیب کی جان لی جاتی تھی - اِس قانون سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ مریض نیم حکیم کے زیرِ مشق رہنے سے بچ جاتے تھے اسواسطے کہ اُن کو جان کے خوف سے اسمیں دست اندازی کرنے کی جُرأت ہی نہوتی تھی - لیکن یہ بہت بڑا نقصان ہوا کہ یہ نفیس فن درجۂ کمال کو نہ پہونچ سکا - مگر پھر بھی مصریوں نے پہلے کی نسبت اُسے بہت ترقی دی -

ایک مورّخ کا بیان ہے کہ مصری حکیموں نے جو فنِ طبابت کو ترقی دی اُس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایک حکیم ایک ہی بیماری کا علاج کیا کرتا تھا اور اُسکی ہی ترقی میں ہمہ تن مصروف رہتا تھا - مثلاً ایک حکیم آنکھ کا علاج کرتا تھا، دوسرا دانت کا - قِس علیٰ ہذا -

اسکے علاوہ مصریوں نے فنِ عمارت، نقشہ کشی، سنگتراشی اور رنگ آمیزی میں بھی بڑا کمال حاصل کیا تھا - مصر میں ابتک ایسی ایسی عمارتیں موجود ہیں، جنکو دیکھکر عقل دنگ

رہجاتی ہے کہ وہ کیسے ہاتھ ہونگے جنھوں نے انکو تعمیر کیا تھا اور وہ کیسے دماغ ہونگے جنھوں نے اُن کیواسطے ایسے عجیب و غریب نقشے تجویز کئے ہونگے۔ اہرام مصری بھول بھلیاں سندر وغیرہ اعلےٰ درجے کی صنعت کا نمونہ ہیں، جو اسقدر زمانہ گذرنے کے بعد بھی اپنی خوبصورتی اور چمک دمک سے دنیا کو حیران کئے ہوئے ہیں۔

اہل مصر کی جدت پسند طبیعتیں اُنھیں اشغال کو پسند کرتی تھیں جنمیں دماغ سے کام لینا پڑے، یا جسمانی صحت کے مفید ہوں۔ رقص و سرود اور کھیل تماشوں کو وہ بالکل لغو سمجھتے تھے۔

راقم

حامد حسین قادری۔ از بھیراؤں

فن موسیقی اور اُسکے بعض حالات

حکماء قدیم نے فلسفہ کی تعریف کرتے ہوئے حکمۃ کی دو قسمیں کی ہیں، حکمۃ نظری، حکمۃ عملی، پھر حکمۃ نظری کو جو علم حکمۃ کا ایک مہتم بالشان علم ہے، تین قسموں پر منقسم کیا ہے۔ الٰہیات طبعیات، ریاضیات، فن ریاضی کی بھی چار قسمیں کی ہیں، حساب، ہندسہ، ہیئت، موسیقی حکماے قدیم کا جب تک دَور دَورہ رہا، اُسوقت تک ان سب علوم سے بحث ہوتی رہی اور حساب و ہندسہ اور ہیئت و موسیقی کے متعلق بیشمار تصنیفیں کیگئیں اور ہر ایک کے اُصول و ضوابط نہایت بسط کیساتھ جُدا جُدا قائم کئے گئے، لیکن دفعتہً حکماے قدیم کا دَور ختم ہوتے ہی چند بے سروپا باتوں کی بنیاد پر بڑے بڑے مفید علوم نظرانداز ہوگئے، چنانچہ انھیں بیش بہا علوم میں سے ایک فن موسیقی بھی ہے۔ اِسیوجہ سے مسلمانوں میں اب تک اِس فن کا کوئی ماہر نظر نہیں آتا، مگر خدا کا شکر ہے کہ یورپ نے عین اُسوقت جبکہ اس فن کا نام و نشان صفحۂ دُنیا سے مٹ رہا تھا، بڑے زور کے ساتھ اسکی دستگیری کی، اور

اُسکے متعلق مختلف درسگاہیں کھولیں، جہاں بڑے اہتمام سے یہ فنِ لطیف سکھایا جاتا تھا، اور بڑے بڑے ماہرِ فن اُسکی تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے، موسیقی سُریانی زبان کا لفظ ہے۔ اِسکی تحلیل دو جزو کی طرف ہوتی ہے موٗ بمعنی ہوا سیقی بمعنی گرہ، چونکہ اس فن میں آواز کے مدّ و جزر سے بحث ہوتی ہے اور آواز کو ہوا سے بہت بڑا تعلق ہے، اس مناسبت سے اِسکا نام موسیقی رکھا گیا۔ علم موسیقی اُس علم کا نام ہے جسمیں آواز کی جوڑ توڑ اور اُسکے مدّ و جزر سے بحث کیجائے اور اُسکا اصلی مقصد یہ ہے کہ تالیف لحان کی کیفیت معلوم ہو جائے، مختلف راگوں کے مجموعے کا نام اِس اصطلاح میں لحن ہے، اِس بنا پر قاریوں کی خوش لحانی بھی داخلِ لحن ہے۔ مگر بعض لوگوں نے اِسکی تعریف میں منظومیت اور موازنت کی بھی قید لگادی ہے، اِس لحاظ سے قاریوں کی خوش خوانی داخلِ لحن نہیں۔

اِس فن کے ایجاد کا سلسلہ حکیم فیثا غورس سے شروع ہوا، اور درحقیقت اُس کی شہرت کا سب سے بڑا ذریعہ یہی علم ہوا۔ حکیم مذکور کے اِس فن کے ایجاد کرنے کے متعلق ایک صحیح واقعہ یوں لکھا ہے کہ حکیم موصوف نے تین ۳ شب متواتر خواب دیکھا کہ کوئی شخص کہ رہا ہے کہ تو فلاں دریا کے کنارے پر جا، اور وہاں ایک علم سیکھ، حکیم مذکور روز صبح کو حسبِ ہدایتِ غیبی دریا کے کنارے جاتا تھا، لیکن بدقسمتی سے ناکامیاب واپس آتا، حکیم موصوف سخت متعجب تھا کہ کونسا علم ودیعت کیا جائیگا، چوتھی بار پھر اُسنے خواب دیکھا، اور صبح ہوتے ہی دریا کے کنارے پر پہونچکر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر گذری تھی، کہ اُسنے سُنا کہ لوہار اپنے ہتھوڑے کو سندان پر مارتے ہیں اور اُس سے مختلف رنگ کی دلکش آوازیں پیدا ہوتی ہیں، اُسنے اُسکے گھٹاؤ بڑھاؤ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا، اور اُسکے گرنے اور اُٹھنے کی دفعات کو اچھی طرح سمجھ لیا اور وہاں سے واپس چلا آیا، اور ایک آلہ نہایت دلکش و دلفریب ایجاد کیا، جسکی آوازیں لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیتی تھیں، یہانتک کہ یہ حکیم اس ایجاد کی بدولت اِسقدر مشہور ہوگیا کہ دُنیا کے گوشہ گوشہ سے جوق جوق لوگ اسکے پاس آتے تھے، اور

سارے عالم میں اسکی دھوم مچی ہوئی تھی، اب کیا پوچھنا تھا، اس آلہ کی اسقدر قدر ہونے لگی کہ خود حکماے اُسکو ایسی عجیب و غریب چیز سمجھا، کہ اُسپر فخر کرنے لگے اور حکیم فیثاغورس ایک لائق حکیم اور کامل الفن مشہور ہوگیا، کبھی کبھی یہ حکیم خود اپنے احباب سے بیان کرتا کہ میں آسمان کی حرکت سے دلفریب آواز سُنا کرتا ہوں - اور ان نغمات نے میرے دل میں جگہ کرلی ہے - اسکے بعد اس حکیم نے اِس فن کے قواعد و اصول قائم کئے - اور کچھ مفید اضافہ بھی کیا - اسکے بعد نوبت بہ نوبت یہ فن ارسطاطالیس تک پہونچا، اُسنے اسمیں غور کرنے کے بعد اپنی عقل و درایت سے ایک آلہ جسکا نام ارغنوں[1] ہے، ایجاد کیا، اور بعض حکما کا یہ بھی بیان ہے کہ بعد فیثاغورس کے چند حکماے نے غور کرنے کے بعد دریافت کیا کہ جسوقت آفتاب ایک برج سے دوسرے برج کیطرف تحویل کرتا ہے تو اُس سے چند قسم کی آوازیں مرغوب و دلکش نکلتی ہیں، اور بعضوں نے لکھا ہے کہ حکیم فیثاغورس نے اِس فن کو اصواتِ فلکیہ سے استنباط اور اخذ کیا ہے، اور بعضوں نے لکھا ہے کہ اِس فنِ موسیقی کا ماخذ ایک مُرغ ہے جسکا نام ققنس و موسیقار ہے - جسکی چونچ میں صد ہا سوراخ ہیں، اور اُن سب سوراخوں سے رنگ برنگ کی آوازیں نکلتی ہیں، حکماے نے اِس مُرغ سے فنِ موسیقی کو اقتباس و استنباط کیا، شیخ فریدالدین صاحب عطار اِس واقعہ کو یوں بصورتِ نظم لاتے ہیں -

ہست ققنس طرفہ مرغی دلستان	موضعِ این مُرغ در ہندوستان
سخت منقارے عجب دارد دراز	ہمچو نے در وے بسے سوراخ باز
قرب صد سوراخ در منقارِ اوست	نیست جُفتش طاق بودن کارِ اوست
ہست در ہر ثقبہ[2] آوازِ دگر	زیر ہر آوازِ او رازِ دگر
چوں بہر ثقبہ بنالد زار زار	مُرغ و ماہی گردد ازوی بیقرار

[1] ارغنوں ایک یونانی ستار ہے ۱۲ - [2] ثقبہ بمعنی سوراخ ۱۲ -

جملۂ درّندگان خامُش شوند / در خوشیِ بانگِ او بیہُش شوند
فیلسوفی بود دمسازش گرفت / علمِ موسیقی ز آوازش گرفت
سالِ عمرِ او بود قُربِ ہزار / وقتِ مرگِ خود بنالد آشکار
چون ببرّد وقتِ مرگش دل ز خویش / ہیزم آرد او خود از صد خرمہ بیش
در میانِ ہیزم آید بیقرار / در دہد صد نالۂ خود زار زار
پس بدان ہر ثقبۂ از جانِ پاک / نوحۂ دیگر برآرد دردناک
چون بدان ہر ثقبہ ہمچون نوحہ گر / نوحۂ دیگر کند نوعِ دگر
در میانِ نوحہ از اندوہِ مرگ / ہر زمان بر خود بلرزد ہمچو برگ
از نفیرِ[لہ] او ہمہ پرّندگان / وز خروشِ او ہمہ درّندگان
سُوی او آیند چون نظّارگی / دل ببرّند از جہان یکبارگی
از غمش آن روز در خونِ جگر / پیشِ او بسیار میرد جانور
جملہ از زاریِ او حیران شوند / بعض از بےقوّتی بیجان شوند
پس عجب روزی شود آن روزِ او / خون چکد از نالۂ جانسوزِ او
باز چون عمرش رسد بر یک نفس / بال و پر برہم زند از پیش و پس
آتشے بیرون جہد از بالِ او / بعد از ان آتش بگردد حالِ او
زود در ہیزم فتد آتش ہمے / پس بسوزد ہیزمش خوش خوش ہمے
مُرغ و ہیزم ہر دو چون اخگر شوند / بعد اخگر نیز خاکستر شوند
چون نماند ذرّۂ اخگر پدید / ققنسے آید ز خاکستر پدید
آتش آن ہیزم چو خاکستر کند / از میان ققنس بچہ سر برکند
ہیچکس را در جہان این اوفتاد / کو پس از مردن بزاید یا بزاد

لہ - یعنی آواز۔

مگر افسوس کہ فنِ موسیقی کو اِس زمانے کے لوگوں نے بُرا فن سمجھ لیا ہے حالانکہ اِس فن کو حکمائے یونان نے تمام علوم و فنون پر ترجیح دی، اور اُسکے عمدہ نتائج اور نادر فوائد کو کتابوں میں قلمبند کیا ہے، افلاطون نے کہا ہے کہ علمِ موسیقی میں فتور و خلل ڈالنا سلطنت کے نقصان و فتور کا باعث ہے، اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ فنِ موسیقی انسان کی عفت و بدکاری اور اُسکی نکوہیدہ شعاری کو ظاہر کرتا ہے، ارسطو نے اگرچہ افلاطون کی اکثر باتوں میں اختلاف کیا ہے، لیکن وہ افلاطون کا اِس قول میں کہ (فنِ موسیقی میں خلل ڈالنا سلطنت میں خلل ڈالنا ہے) ہمزبان ہے، پولی بئیوس ایک نامور یونانی حکیم کہتا ہے کہ جبتک کہ انسان فنِ موسیقی سے واقف نہو کسی زبان کے ادب میں کامل مہارت پیدا نہیں کر سکتا۔ حکیم مذکور خود تمام فنون پر خصوصًا فنِ ادب پر فنِ موسیقی کو ترجیح دیتا، اور جب فنِ ادب کی تعلیم دیتا تو پہلے پہلے موسیقی کچھ نہ کچھ ضرور سکھا لیتا۔ و نیز حکیم فیثاغورس نے خود اِس فن کو تمام فنون پر ترجیح دی ہے۔ بعض حکما اِس فن کو دوائے صحتِ جسمانی و روحانی قرار دیتے ہیں، کتاب خلاصۃ الانبیا میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اُن کے تمام معجزات میں ایک معجزہ خوشخوانی و خوش الحانی کا بھی دیا گیا تھا جسوقت آپ توریت یا زبور پڑھا کرتے تھے، جملہ وحوش و طیور، چرند و پرند، جن و انس، آپکے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے۔ درخت کی پتیاں زرد ہو جاتی تھیں۔ پانی جاری ٹھہر جاتا تھا، پتھر مثل موم کے ہو جاتا تھا۔ کوہ ہاد جنبش میں آجاتا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام توریت کو بہتر عنوان سے پڑھا کرتے تھے۔

امام غزالیؒ اپنی کتاب احیاء العلوم الدین میں لکھتے ہیں کہ سماع کی تاثیر قلب میں محسوس ہوتی ہے، جس شخص کو سماع سے حرکت نہو تو اعتدال سے مائل ناقص اور روحانیت سے دُور ہے اور اُس سے بڑھکر کوئی غلیظ الطبع و کثیف الطبع نہیں ہو سکتا۔ امام غزالی صاحب دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ بعض وقت سماع کشف کا سبب ہو جاتا ہے اسلئے کہ وہ

نفس میں اُتر جاتا ہے۔

و نیز دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ انسان کا حُسنِ صوت سے متاثر ہوجانا یہ بھی ایک دقائق علوم مکاشفات سے ہے، اور جو شخص کہ بلید الطبع اور قسی القلب ہے وہ سماع کی لذت سے محروم رہتا ہے اور وجد و اضطراب والتذاذ مستمع کی حالت سے تعجب کرتا ہے (اُسکی مثال امام غزالی رح صاحب نے کیا عمدہ دی ہے) کہ جسطرح بہیمہ تعجب کرتا ہے لذتِ بادام سے، و عنین تعجب کرتا ہے لذتِ مباشرت سے، صبی تعجب کرتا ہے لذتِ حکومت سے، اور جاہل تعجب کرتا ہے لذتِ معرفتِ الٰہی سے۔

و نیز امام غزالی صاحب دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ کیفیات کا قلب میں حاصل ہونا اسرارِ الٰہی میں سے ایک سِر ہے، خصوصاً کیفیاتِ نغمہ۔

و نیز دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو سماع کی کیفیت سے کچھ حرکت نہو تو وہ جمیع بہائم و طیور سے بھی بدتر ہے اسلیئے کہ عالمِ وجود میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو نغماتِ موزوں کو سُنکر وجد میں نہ آجائے، حتیٰ کہ بہائم اور طیور یہ بہت ہی ارذل عالمِ وجود کی اشیاء سے گنے جاتے ہیں، وہ بھی جسوقت آوازِ خوش سُنتے ہیں، وجد و اضطراب میں آجاتے ہیں۔ امام صاحب کا یہ فرمانا ایک حد تک درست بھی معلوم ہوتا ہے، اسلیئے کہ ہم لوگ سانپ کو اچھی طرح مشاہدہ کر چکے ہیں، اور اُس سے بڑھکر موذی اور زہریلا جانور کوئی نہیں، لیکن جسوقت کہ مداری اپنی پونگی کو سانپ کے سامنے عمدہ طور پر بجاتا ہے۔ تو اُس وقت سانپ وجد و اضطراب میں آجاتا ہے اور جھومنے لگتا ہے۔

رسالہ ترجمۃ العوارف میں لکھا ہے کہ فنِ موسیقی کا اہلِ تحقیق کے نزدیک بہت بڑا اعتبار ہے اور جو شخص اچھی اور بھلی آواز سے لذت نہیں اُٹھاتا ہے، تو اُسکا دل مُردہ ہے، اور اُسکی سمعِ باطن خراب ہوگئی ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ سے لوگوں نے سوال کیا کہ کیوں جناب؟ جب انسان

اچھی اور بھلی آواز سنتا ہے تو کیوں وجد میں آجاتا ہے، آپ نے فرمایا کہ جس وقت ذریات بنی آدم کو اللہ تعالےٰ نے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ سے خطاب کیا، تو یہ آواز اُن کو بہت ہی بھلی معلوم ہوئی، اور اُس آواز نے اُس کے دل میں جگہ کرلی، اور اب جب انسان اچھی اور بھلی آواز سنتا ہے تو اُس کے دل میں وہی تاثیر اور وہی لذت معلوم ہوتی ہے جو کہ خطاب اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ سے حاصل ہوئی تھی، اور وجد و اضطراب میں آجاتا ہے۔

اور بعض روایت میں مذکور ہے کہ جب رُوح کو اللہ پاک نے قالب آدم میں جانے کا حکم کیا، تو رُوح نے اِنکار کیا۔ اور قالبِ انسانی میں جانا قبول نکیا، تب باری تعالیٰ نے ملائکہ کرام کو خوش الحانی سے پڑھنے کیواسطے کہا، ملائکہ کرام نے بموجب حکم باری تعالےٰ کے بڑی خوش الحانی سے پڑھنا شروع کیا، اور رُوح سُننے لگی، اور جب رُوح وجد میں آگئی تو ملائکہ کرام نے اُسکو قالبِ انسانی میں بند کردیا۔

اِس مضمون کو ایک شاعر نے یوں لکھا ہے ؎

آنروز کہ روحِ پاکِ آدم بہ بدن
گفتند در آ نمی آمد در تن
خواندند فرشتگان بہ لحنِ داؤد
در تن در تن در آی در تن در تن

محمد سعید دسنوی۔ بہاری
از لکھنؤ۔ دار العلوم۔

سیرت نبوی پر ایک نئی کتاب

انگلستان کے مشہور مستشرق ڈاکٹر مرجلیوث* نے انگریزی زبان میں ایک کتاب آنحضرت صلعم کی سوانح عمری پر تحریر کی ہے، چنانچہ اُسی کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "میں محمد (صلعم) کو دنیا کے بہت بڑے لوگوں میں شمار کرتا ہوں - اُنھوں نے قبائل عرب سے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر کے بہت بڑی پولٹیکل گتھی کو سُلجھایا - اور میں اُن کی کماحقہٗ تعظیم و تکریم کرتا ہوں - لیکن میرا مقصد اِس کتاب کی تالیف سے مسلمانوں یا بعض عیسائیوں کی طرح اُن کی حمایت یا جانب داری نہیں ہے - نہ میری یہ غرض ہے کہ دین اسلام کی دوسرے دینوں پر فضیلت ثابت کروں - اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ اُسکے عیوب گناؤں - اور اُسپر اعتراضات کی بوچھار ڈالوں"۔

بعض لوگوں کو شاید یہ گمان ہو گا کہ یہ مصنّف اتنی عربی جانتا ہو گا کہ یورپ بھر میں کوئی اُس سے لگّا نہ کھاتا ہو گا - اور مسلمانوں کی بہت سی کتابیں اُس نے پڑھی ہونگی - اور نکات و تاریخ اسلام پر بہت کچھ عبور حاصل کیا ہو گا - لیکن اُس کی کتاب کے بعض مطالب پڑھنے سے حقیقت کھل جائیگی، اور یہ گمان دُور ہو جائیگا -

اِسلام اور اُس کی تاریخ کے سمجھنے اور اہل یورپ کے مابین چند امور حائل ہیں - اوّل یہ کہ یورپ والے اسلام سے نفرت کرتے اور مسلمانوں کو حقیر جانتے ہیں - اور یہ باتیں روز پیدایش ہی سے اُن کے دل پر ایسی نقش ہو جاتی ہیں کہ انکا اثر مدت العمر زائل نہیں ہوتا - دوسرے اُن کے مسلمانوں کے ساتھ مصالح ملکی وابستہ ہیں - اور وہ از راہ حرص مسلمانوں کا ملک اُن سے چھیننا چاہتے ہیں - اِسلئے اپنے مسلمان پڑوسیوں کی جانب سے اُن کے سینوں میں آتش حسد بھڑکتی رہتی ہے - غرض یہ سب باتیں ملکر محاسن اسلام کیطرف سے

* یہ معرب نام ہے اصلی نام معلوم نہیں ۱۲ مترجم -

اُن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہیں۔ باین ہمہ اُن میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تقلید کی بندشوں کو توڑ ڈالتے ہیں۔ مذہبی یا سیاسی تعصب سے متأثر نہیں ہوتے اور تحقیق کے رستے پر چلتے ہیں لیکن ایسے بہت ہی تھوڑے ہیں۔ تیسرے مسلمان اِس زمانے میں بدحال ہو رہے ہیں۔ اور اہلِ یورپ اُن سے دولت میں، علم میں اور آبادی میں بڑھ گئے ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ خود مسلمان اپنی ذات اور اپنے مذہب کے خلاف گویا ایک حجت بنے ہوئے ہیں۔ چوتھے علمائے یورپ ایک امرِ جزئی سے کلیات کو مستنبط کرنے۔ غیر محسوس قرائنِ ضعیفہ سے بڑے بڑے مسائل حل کرنے، اور مجرد عقل و فہم کے زور سے واقعات کے اسباب و علل کا کھوج لگانے میں بڑے دلیر ہوتے ہیں۔ پانچویں وہ عربی زبان اور فنونِ شرعیۃ کی تعلیم کسی ماہر اُستاد سے حاصل نہیں کرتے بلکہ اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی ایسی غلطیاں کرتے ہیں کہ اُستاد سے پڑھا ہوا کودن سے کودن شخص بھی نہیں کرسکتا۔

ایک بار ایک یورپین مستشرق نے جو بہت بڑا عربی دان اور مسائلِ اسلام سے واقف سمجھا جاتا تھا، میرے سامنے بیان کیا کہ "مسلمان حدیث کو قرآن پر فوقیت دیتے ہیں"۔ مجھے یہ سُنکر سخت حیرت ہوئی اور اُس سے اِس خیال کی تائید چاہی۔ جس کے جواب میں اُس نے حضرت علی رضہ کا قول نقل کیا، جو اُنھوں نے حضرت ابنِ عباسؓ سے اُنھیں خوارج کے مقابلے میں بھیجتے وقت فرمایا تھا۔ اور وہ یہ ہے :-

لا تخاصمهم بالقرآن فان القرآن حمال ذو وجوه تقول و يقولون ولكن حاجهم بالسنة فانهم لن يجدوا عنها محيصًا الخ ؎	اُن کے مقابلے میں قرآن سے استدلال نکرنا کیونکہ تم قرآن کے کچھ اور معنی لگاتے ہو اور وہ کچھ اور سمجھتے ہیں۔ بلکہ سُنّت کو حجت قرار دینا کیونکہ اُس سے وہ ہرگز گریز نہیں کرسکینگے۔

میں نے کہا کہ یہاں "سُنّت" سے مراد فقط اور محدثین کی اصطلاحی "سُنّت" نہیں ہے بلکہ نبی صلعم اور صحابہ رضہ کا فعل مقصود ہے۔ اور یہی ایسی چیز ہے جس سے مفر نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ اُس میں تاویل کا مطلق احتمال نہیں ہے۔ بخلاف حدیث قولیہ کے کہ اُس میں قرآن کی طرح بلکہ اُس سے زیادہ قیل و قال کی گنجایش ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ یورپ کے مصنف کے لئے یہ امر سخت دُشوار ہے کہ وہ فنونِ عربیہ اور اُن کے متعلق کتابوں سے محض مطلع ہو کر اسلام کو حق فہمہ سمجھ سکے۔ اور خصوصًا ایسی حالت میں جبکہ وہ مصنّف منصف بھی نہ ہو۔ اور جیساکہ آپ ہماری تنقید میں دیکھینگے، ڈاکٹر مرجلیوث کی اکثر غلطیوں کا سبب بھی یہی ہے کہ جسطرح کھنڈروں اور مُردہ الفاظ سے وہ ظن و تخمین کو کام میں لاکر متقدمین کی تاریخ کا پتہ لگاتے ہیں، اسیطرح اِس کتاب میں مصنف نے قیاسات کو بہت دخل دیا ہے۔ ورنہ یوں وہ بہت بڑا عالم اور اعتدال پسند ہے۔ اور زبان کے نہ سمجھنے سے جو غلطیاں ہوئی ہیں وہ بہت تھوڑی ہیں۔ اب ہم اُس کے اُن اقوال کو لیتے ہیں جو اقرب من الصواب ہیں۔

یہ تو ہم کہہ ہی چکے ہیں کہ اُس نے دیباچے میں آن حضرت صلعم کو دنیا کے برگزیدہ ترین لوگوں میں شمار کیا ہے۔ اور قبائلِ عرب میں ایسی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالنے پر حیرت ظاہر کی ہے۔ لیکن اسکے علاوہ دو اور بہت بڑے کاموں کو حضرت رسالت پناہ سے منسوب کیا ہے۔ اوّل تو یہ کہ لڑائی کے بغیر بھی عربوں میں جو کشت و خون ہوا کرتا تھا اُسے یک قلم موقوف کر دیا۔ دوسرے یہ کہ جب اُن میں جنگ چھڑ جاتی تھی تو اُس کا سلسلہ سالہا سال جاری رہتا تھا۔ آپنے اُسکی بھی بندش کر دی اور اگر جنگ کی ضرورت پڑی تو اُس کا نتیجہ جلد سے جلد حاصل کر لیا۔ اور بے فائدہ اس کا کبھی اعادہ نہیں کیا۔ (ص ۵۵)

اُس نے اعتراف کیا ہے کہ "نبی (صلعم) شعر اور سجع سے دلی کراہت رکھتے تھے اور شاید اسکا سبب یہ تھا کہ اُنھوں نے اِن فنون کی تعلیم نہیں پائی تھی اور عربوں میں سوائے ان کے انشا کا اور کوئی اسلوب موجود نہ تھا" (ص ۶۰)۔ لیکن اُس نے (سر ولیم) میور کا یہ قول بھی نقل کیا ہے (ص ۵۵) کہ "عرب کے بادیہ نشین فنِ بلاغت کے سیکھنے میں بڑا اہتمام

کرتے اور بات چیت میں طلاقتِ لسان کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ اِس لئے کچھ بعید از قیاس نہیں ہے اگر پیغمبر (صلعم) نے بھی اِس فن میں کمال حاصل کیا ہو"۔ میں کہتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلعم نے اِس جانب توجہ یا اِس فن کی ممارست کی ہوتی تو لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا۔ اور سنِ شباب میں اُن کی زبان پر اِس کا اثر ہوتا۔ لیکن نبوت سے پہلے کی اُن کی کوئی ایسی بات منقول نہیں ہے، اور نہ فصاحت و بلاغت میں اُن کی تعریف کی جاتی تھی۔ البتہ سچائی، امانت اور محاسن اخلاق سے وہ بدرجۂ اتم متصف سمجھے جاتے تھے۔ اِس لئے (بخلاف سر ولیم میور کے) مصنف کا قول بالکل درست ہے۔

ایک جگہ (ص ۶۳) تعریف اور نکتہ چینی کو خلط ملط کر دیا ہے اور لکھا ہے کہ "نبی (صلعم) نے اپنی قوم سے نہایت تاکید کے ساتھ فرمایا کہ کسوف و خسوف کسی فردِ خاص کے لئے واقع نہیں ہوتے، خواہ وہ کتنا ہی عالی منزلت ہو لیکن پھر بھی اِن دونوں واقعات کو نہایت مہتم بالشان امر سمجھکر اُن کے لئے نماز مخصوص کی ہے"۔

مصنف کے اِس قول میں نہ صرف ایک امرِ واقعی کا بیان ہے بلکہ اُس میں خوبی کا بھی ایک بہت بڑا پہلو نکلتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے لوگوں کی عقلوں کو وہموں سے پاک کرنے کی کوشش کی اور یہ پسند نہیں کیا کہ اشاعتِ باطل کے ذریعے سے اپنی شان بڑھائیں چنانچہ جس روز آپ کے فرزند ابراہیم علیہ السلام نے رحلت فرمائی اُس روز سورج گرہن پڑا تھا۔ پس لوگوں کو شبہہ ہوا کہ سورج اِسی حادثہ کیوجہ سے گہنایا ہے لیکن آپنے صاف فرما دیا۔

ان الشمس والقمر اٰیتان من اٰیٰت اللہ وانھما لا یکسفان لموت احد ولا لحیوتہٖ	چاند سورج خدا کی (بے شمار) نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ اور کسی کے مرنے جینے سے نہیں گہنا سکتے۔

کسوف و خسوف کیوقت نماز کا حکم اِس وجہ سے دیا ہے کہ دینِ اسلام کی سب سے

بڑی غرض یہ ہے کہ خدا کی قدرت و حکمت کا ذکر کیا جائے۔ اور شکر و دعا کے ذریعہ سے دل کو اُسکی طرف متوجہ کیا جائے۔ اور یہ غرض مظاہر قدرت کے واقع ہونیکے وقت بوجہ احسن حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی بات پنجگانہ نماز میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔ کیونکہ آفتاب کا طلوع ہونا پھر ڈھلنا پھر قریب بہ غروب ہو کر غائب ہو جانا یہاں تک کہ اُسکی روشنی کا ذرا بھی باقی نرہنا خدا کی قدرت کے قوی اور کامل ترین نمونے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نزول باران کے وقت ذکر الٰہی کی تعلیم فرمائی ہے۔ اسلام لوگوں کو ہدایت کرتا ہے کہ اُسکی قدرت و حکمت کے ہر نئے کرشمے کے ظاہر ہونے کے وقت اُسے یاد کیا جائے۔ تاکہ بندے اُسے بھول نہ جائیں اور اسکا نتیجہ یہ ہو کہ اُن پر حیوانیت غالب ہو جائے اور وہ ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے لگیں۔

ڈاکٹر جلبوٹ نے نبی صلعم کے خصائص کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن اپنی طرف سے بہت کچھ زور لگانے پر بھی اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ چنانچہ ص ۶۳ میں کہتا ہے کہ "اسرار کے معلوم کرنے کے اُن (صلعم) کے پاس ایسے وسائل موجود تھے، جن کی حقیقت دریافت کرنے سے ہم عاجز ہیں۔ یہ بات تجربہ سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اُنھیں طبیعت ہی ایسی ودیعت کی گئی تھی، جس پر رشک کیا جا سکتا ہے۔ اور جس کے ذریعے سے وہ لوگوں کی طبیعتوں کو جانچنے میں بہت کم بلکہ کبھی غلطی نہیں کرتے تھے" ہم کہتے ہیں کہ خدا نے اُنھیں ایسی طبیعت اس لئے بخشی تھی تاکہ لوگوں کی ہدایت میں وہ اُس سے مدد لیں۔ اور نبوت کیا ہے؟ نبوت بھی ایک تخصیص الٰہی ہے۔ جس کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو سیدھے رستے پر اور تاریکی سے روشنی میں لایا جائے۔ پس اس میں تعجب اور حیرت کی کون سی بات ہے۔

اسی قبیل سے ایک اور عقدہ ہے جس کے حل کرنے سے ڈاکٹر جلبوٹ بااین علم و فضل سخت عاری ہے۔ یعنی یہ کہ آن حضرت صلعم کے دعوی نبوت کے آغاز کا سبب کیا ہے؟ خود مصنف کے الفاظ یہ ہیں "مشہور ترین لوگوں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے

کارہائے عظیمہ کے آغاز کے ضرور ایسے اسباب تھے جو اُس کے محرک ہوئے۔ لیکن اس پیغمبر (صلعم) کی نسبت مطلق معلوم نہیں کہ اُن کے دعویِ نبوت کی شروعات کا سبب کیا تھا" (ص ۷۲) اس کا جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ اگر یہ کام ایسا ہوتا جیسا ملکوں کے فتح کرنے یا سلطنتوں کے قائم کرنیکا ہوتا ہی تو یہ بات غیر ممکن تھی کہ کوئی عقلمند آدمی بغیر قدرتی اسباب کے مہیا ہوئے جن سے کامیابی کا یقین یا گمان ہو سکے، اُسکا اقدام کرے لیکن نبی صلعم اگر ایک ایسے عظیم الشان کام کیلئے (جو ملک گیری اور ملک داری سے کہیں بڑا ہی) بغیر کسی سامانِ قوت اور قدرتی اسباب کے (جیسے دولت وجمعیت، یار ومددگار) جن سے کامیابی کی امید بندھ سکے کھڑے ہو گئے۔ تو اس میں ذرا بھی تعجب کا موقع نہیں۔ کیونکہ آپ کو اُس ذات پر بھروسا تھا جو سبب اور مسبب کا مہیا اور آسمان وزمین کا پیدا کرنیوالا ہی۔ جس نے اُنھیں دعوتِ اسلام کا حکم دیا، اور اُن کی مدد کی۔ بلکہ یہی آپ کی سچائی اور من جانب اللہ ہونے کی بہت بڑی اور کافی دلیل ہے۔ مصنف کہتا ہی (ص ۷۸) کہ "پیغمبر (صلعم) کی عظمت کے دو سبب ہوئے۔ اوّل تو وہ تاڑ گئے۔ کہ قوم عرب کو ایک پیغمبر کی ضرورت ہی۔ دوسرے یہ کہ اس ادراک کو اُنھوں نے پُر اثر بنایا" لیکن نبوت کے معاملے میں اس قسم کے کسی سوچ بچار اور عمل وتدبیر سے کام نہیں لیا گیا۔ کیونکہ ایسا ہوتا تو اِس سے یہ بات لازم آتی تھی کہ قدرتی اسباب سے فائدہ اُٹھایا گیا۔ مگر اسکا ابھی ذکر ہو چکا ہے کہ یہ صورت ہرگز پیش نہیں آئی۔

مصنف لکھتا ہے (ص ۸۰) کہ "دو سوال ایسے ہیں جنکا جواب دیا جانا ممکن نہیں۔ اوّل یہ کہ اِس عربی نژاد شخص محمد (صلعم) کو نبوت کا خیال کیسے پیدا ہوا۔ اُن کے سوا اور لوگوں کو کیوں پیدا نہ ہوا؟ دوسرے یہ امر متحقق ہے کہ اُن کے اندر صبر، عزم اور قوتِ ارادی اعلیٰ ترین درجے کی تھی۔ پس یہ اوصاف اُنھیں کیسے حاصل ہوئے؟ اور یہ ویسی ہی بات ہے جیسی کارلایل نے ٹوبل کین کی نسبت کہا کرتا تھا کہ پانی پہلے بھی کھولتا تھا اور لوہا قدیم سے موجود تھا۔ مگر ایسا کوئی نہ ہوا جو بھاپ کی کلیں ایجاد کرتا" بھاپ کی کلیں ایجاد کرنے اور نبوت میں بہت

بڑا بل ہی جسے مصنّف معلوم نہیں کر سکا۔ مثلاً جس شخص نے اوّل یہ خیال کیا کہ بھاپ ایک ایسی قوت ہے جسے چیزوں کے اُٹھانے اور پھینکنے کے کام میں لایا جا سکتا ہے، یہ بات اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی کہ آیندہ اس کے ذریعے سے انسان خشکی و تری پر سفر کرنے لگینگے۔ البتہ اگلوں کی ایجادوں پر اضافہ کرتے کرتے پچھلے اِس نتیجے پر پہونچ گئے۔ لیکن نبوت کی حالت پر غور کیجیے۔ ایک ہی شخص (صلعم) نے دعوے کیا۔ اُسی نے شریعت بنائی پھر اُسی نے اُس شریعت کو کتاب اور عمل کے ساتھ مستحکم کیا۔ اور لوگوں کو ایک غیر معمولی اور دُور از فہم کشش کے ساتھ اپنی طرف کھینچا۔ یہاں تک کہ اُس کا دین مکمل ہو گیا۔ اور ایک قوم پیدا ہو گئی۔ جس نے اُس کی ہدایتوں پر چلکر عظیم الشان سلطنت کی بُنیاد ڈالی اور بڑے بڑے شہر بنا کر کھڑے کر دیئے۔

ایک جگہ اُس نے لکھا ہے کہ "وہ اس حملہ کے لئے بہت سی فکر و تدبیر کے بعد آمادہ ہوئے تھے۔ اور لوگوں سے تعلیم حاصل کرتے اور اُن کے علم سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ اور جو کچھ اسطرح سیکھ لیتے تھے۔ اُس کی نسبت دعوے کرتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے وحی ہے۔" لیکن دوسری جگہ (ص ۱۴۴) لکھا ہے۔ کہ "نبی (صلعم) دل سے اِس بات پر یقین رکھتے تھے کہ انبیاے بنی اسرائیل کی طرح میں بھی ایک نبی ہوں۔" (سچ ہے حق بر زباں جاری)۔

ایک اور بات ہے جس کے سمجھنے سے وہ قاصر رہا ہے اور لکھا ہے (ص ۲۴۸) کہ "نبی (صلعم) کے پاس کچھ ایسے مخفی وسائل تھے، جن کے ذریعے سے وہ چیزیں عجیب و غریب سُرعت کے ساتھ حاصل کر لیا کرتے تھے۔" اِس سے مصنّف کی مُراد سرورِ کائنات (صلعم) کے وہ اقوالِ شریفہ ہیں جو آپ وحی و الہام کے ذریعے سے فرماتے تھے۔ اگر آپ کے پاس ایسے پوشیدہ ذرائع ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ اُن کثیر التعداد ذکی و ذہین لوگوں سے چھپے رہتے جو ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے

اور اگر یہ لوگ اِس قسم کی کسی بات کی بھنک بھی پا لیتے تو یہی ایک سبب اُن کی کنارہ کشی کے لئے کافی ہو جاتا اور وہ آپ کی دعوت پر یوں ٹوٹ کر نہ گرتے۔

صفحہ ۵۸ میں اس پر بے حد مدح وثنا کی ہے کہ "نبی (صلعم) نے ظلم وستم اور تمثیل (ناک کان کاٹنا) سے پہلے ہی منع کر دیا تھا۔ حالانکہ یورپ نے اِن باتوں کو حال ہی میں ناجائز قرار دیا ہے" یورپ نے اپنے ہاں اِسے اسوجہ سے ممنوع ٹھیرا دیا کہ قوم قوی ہو جائے لیکن کبھی کبھی غیر ملکوں میں تو اب بھی اِسے مباح سمجھا جاتا ہے اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو جو عظمت اُنھیں اِس وقت حاصل ہے وہ سب خاک میں ملجائے (ترجمۂ المنار)

محمد مقتدی خان شروانی بلولوی۔

معروضات

۱۔ چونکہ خریدانِ منتھلی میں سے بیشتر اصحاب اپنے تبدیلِ مقام سے مطلع نہیں فرماتے اور دو چار اشاعتوں کے بعد رسالہ کی عدم یا دیر رسی کی شکایت کرتے ہیں، حالانکہ یہ غلطی کارکنانِ دفتر کی نہیں بلکہ اُن حضرات کی عدم توجہی کا نتیجہ ہے، جنھوں نے رسالے کے ٹھیک وقت پر پہنچنے کا خیال مدِّ نظر نہیں رکھا لہذا جملہ قدردانانِ منتھلی کی خدمات میں التماس ہے کہ آیندہ سے اِس امر کا خاص طور پر لحاظ فرمائیں تاکہ عین وقت پر تبدیلی ایڈریس کی اطلاع دفتر میں پہنچ جانے سے رسالہ کے بدیر وصول ہونے کی شکایت کا موقعہ نہ آئے۔ ۲۔ رسالۂ علی گڈھ منتھلی کے رجسٹر روانگی کا سال ماہ مارچ میں ختم ہوتا ہے اور ماہ اپریل سے تمام رجسٹر صاف کر کے نئے سرے سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ لہذا تمام معزز معاونین اپنے اپنے اسمائے گرامی اور پتے وغیرہ ملاحظہ فرمالیں۔ اگر نام یا ایڈریس میں کچھ غلطی ہو تو اُسکی تصحیح کیلئے بہت جلد دفتر کو ہدایت کریں۔ نیز اپنی خریداری کا تبدیل شدہ نمبر ملاحظہ فرما کر آیندہ خط وکتابت (بالخصوص تبدیلی پتہ کے موقعہ پر) میں اسکا حوالہ دینا نہایت ضروری سمجھیں۔ واضح ہو کہ پیشانی ایڈریس پر جو رجسٹر نمبر 23/ درج ہے وہ ڈاکخانہ کا نمبر ہے اُس سے حضرات خریداران کو کچھ واسطہ نہیں۔ خریداروں کا

AN UNPRECEDENTED SUCCESS
IN THE
HOCKEY TRADE.

HOCKEY STICKS

Has this year gone up to 576 as against 469 last year.

They Consist of

45 BRITISH INFANTRIES.
6 BRITISH CAVALRIES.
114 NATIVE INFANTRIES.
17 NATIVE CAVALRIES.
72 BATTERIES OF ARTILLERY.

And Numerous

Station Clubs, Native States, Hill Depots, Police Clubs, Railway Clubs, Volunteer Clubs, Frontier Clubs, and European Schools.

BESIDES HUNDREDS OF

Individual European Civil and Military Officers and Private Gentlemen.

Hundreds of Highest Testimonials

RECEIVED FROM ALL PARTS OF INDIA.

PRICES

The **Oriental,** solid all cane handle, with leather sewn on, each **Rs. 5.**

The **Rustum,** solid all cane handle, with black twine binding, each Rs. 4

The **Khalsa,** Regulation size, shaped and polished, tape bound handles, each Rs. 2-8.

Balls : The **Oriental,** gut sewn, painted white, each **Re. 1-8.**

Illustrated Sports Catalogue Post Free.

GANDA SINGH UBEROI & CO.

Largest Manufacturers of Sports in the East.

PUNJAB SPORTS WORKS, SIALKOT CITY.

When ordering please mention this paper.
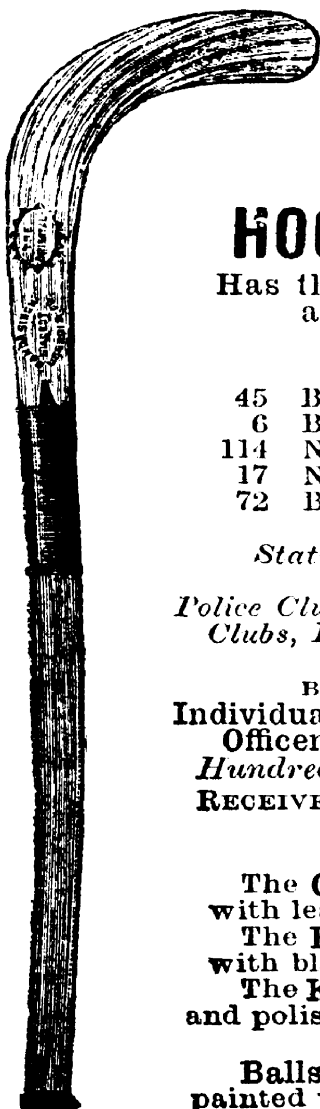
Such terrible disasters however only form an occasional blot on what every climber will unhesitatingly desciibe as the "finest sport in the world" !

The joys of the Alps, or indeed of any mountain, are quite peculiar, and the remembrance of blizzards, and frozen feet, of ropes stiff with ice, or of anxious moments at nasty corners, is quite swallowed up by the many happy memories which crowd the mind of any lover of the Eternal Hills.

ascending that treacherous peak the Dent Blanche, from a side which up to that time had hardly ever been attempted—and the technical difficulties were particularly great, even for such a well-found party. An hour or so below the summit, they were all bunched together on a small rock slab with a big drop on one side, and a rock buttress about 10 feet high in front. Jones was standing on the leading guide's back, trying to reach the top of the buttress, while the guide himself was bent double, and leaned on his axe. Apparently the supporting axe slipped—and with it the guide. Jones was shot out into space. The rope instantly jerked the 3rd man from his narrow ledge, and in an instant was taut between him and the last man as the rope—a Mr. Hill of London. By extraordinary good fortune for him, Hill had previously taken a turn of the rope round a projecting mass of rock, and thus when the jerk came it fell entirely on the rock, and not at all on Hill. With 3 bodies falling free, and perhaps 20 feet between each, the strain was terriffic ; the rope instantly parted, and left Hill *alone* on the Dent Blanche, three quarters of the way up a new and dangerous route with not the vaguest possibility of descent. His only chance was to try to reach the summit and come down by the ordinary way. After hours of incredible toil, and shaken by the tragedy he had witnessed, Hill succeeded in finishing the ascent—and immediately began to descend. Comparatively speaking things were easy now, although he had to move with excessive caution, and very very slowly indeed. But to add to the horror of the situation bad weather came on, and he was enveloped in a blinding blizzard of snow and ice spicules. He sheltered in a small ice covered cave, and as it was now too dark to continue the descent he was forced to spend the whole night crouching in this rocky hollow, at the mercy of the snow and wind.

At dawn, the snow stopped, and the frozen man began to descend again. His difficulties were almost insuperable, as now all tracks of parties who had ascended the mountain on the previous day were obliterated and he had practically to evolve a route for himself. On one occasion he lost his axe, and had to spend an hour or more descending from the arête to recover it. As dusk came on he reached safe ground, and staggered along over the many weary miles of moraine and grass descent, to Zermatt. During the whole of the time since the accident Hill had had nothing to eat except 5 or 6 raisins and a thimbleful of whisky. No wonder he sank down utterly exhausted on the grass 500 yards in front of the hotel door. I believe he was only found by some chance-passer by.

and Mr. Hadow flying downwards; in another moment Hudson was dragged from his steps, and Lord F. Douglas immediately after him. All this was the work of a moment. Immediately we heard Croz's exclamation, old Peter and I planted ourselves as firmly as the rocks would permit; the rope was taut between us and the jerk came on us both as one man. We held; but the rope broke midway between Tangwalder and Lord Francis Douglas. For a few seconds we saw our unfortunate companions sliding downward on their backs and spreading out their hands, endeavouring to save themselves. They passed from our sight uninjured, disappeared one by one and then fell from precipice to precipice on to the Matterhorngletscher below, a distance of nearly 4,000 feet in height....So perished our comrades !......For the space of half an hour we remained on the spot without moving a single step.........at last old Peter summoned up courage and changed his position to a rock to which he could fix the rope .... For more than two hours afterwards I thought almost every moment would be my last; for the Tangwalders, utterly unnerved were.........in such a state that a slip might have been expected from them at any moment :..... several times old Peter turned with ashy face and faltering limbs and said with terrible emphasis '*I cannot*'! About 6 p. m. we arrived at the snow upon the ridge descending towards Zermatt, and all peril was over."

"We frequently looked.........for traces of our unfortunate companions, but in vain ....and too cast down for speech, silently gathered up our things preparatory to continuing the descent. When lo! a mighty arch appeared rising above the Lyskamm, high into the sky. Pale, colourless and noiseless, but perfectly sharp and defined except where it was lost in the clouds, this unearthly apparition seemed like a vision of another world; and, almost appalled we watched with amazement the gradual developement of two vast crosses one on either side......... Our movements had no effect on it. The spectral forms remained motionless. It was a fearful and wounderful sight; unique in my experience and impressive beyond description, coming at such a moment."

Of more recent accidents, I think that which involved the death of Mr. Jones and two others on the Dent Blanche is most worthy of record. Mr. O. G. Jones, a master at the city of London School was perhaps the most brilliant amateur rock climber there has ever been. He and his party were

are sometimes troublesome but real mountain sickness, apart from the sickness caused by exhaustion is probably never experienced in the alps. They are not high enough.

It may not be without interest to give an account of one or two of the more sensational ascents in the alps. The Alpine disaster always has a peculiar fascination for the climber as well as for those who have not experienced the joy of attaining their first first-class summit. This is by no means meant to imply that climbing as a sport is dangerous; hardly an accident is recorded in which some one of the fundamental precautions of mountaineering was not neglected. Parties have been lost in bad weather, it is true; but so have ships on the sea—and the man who ventures guideless on the high alps is simply courting disaster. The Swiss guide is a man apart. His peculiar instinct of direction, knowledge of weather signs, and intuition as to what will prove a feasable route under bad conditions raise him to a stage above that to which any amateur can hope to attain,—while constant practice and observation all the year round in his mountain home give the best guides a knowledge of snow and ice craft which has hardly ever been equalled by the non-professional.

There are very few tragedies which have surpassed the celebrated Matterhorn disaster of July 1865. This mountain rises magnificently 14,700 feet high and towers alone above the glaciers which flow away from iton all sides. It is the most imposing and impressive peak in the alps and for years defied every attempt to scale it.

Mr. Whymper with Lord Francis Douglas, Mr. Hadow, Mr. Hudson and two guides of repute, Croz and Peter Tagwalder together with a son of the latter guide after great difficulty had succeeded for the first time in reaching the summit. Whymper had been trying the peak for four years, and the exultation of the party can well be imagined. The horrible smash came during the first part of descent, and I cannot do better than quote from Mr. Whymper's own account of the affair.

"...........Michel Croz had laid aside his axe and in order to give Mr. Hadow greater security; was absolutely taking hold of his legs, and putting his feet one by one, into their proper positions...........Croz was in the act of turning round to go down a step or two himself; at this moment Mr. Hadow slipped, fell against him, and knocked him over. I heard one startled exclamation from Croz, then saw him

is reached the lantern is left concealed under some boulder, and then still rising slowly, you strike the moraine and feel the first peculiar chill of the glacier wind. Soon afterwards comes the first halt and some welcome breakfast—meat and country wine. A person new to the mountains will often have absolutely no desire for food at this stage, particularly if there has been fresh snow on the peaks and the wind is cold. It is then that a good guide will first exert his authority—by insisting on that person taking some food. If he did not there would be difficulties later on when the cold became more intense and the hard work began. Exhaustion resulting from a refusal of food at the beginning of a climb is one of the chief causes of the sickness which almost inevitably follows. After breakfast on goes the rope with first guide leading and second guide or best amateur bringing up the rear, and you step out on to the crisp snow which covers blue ice beneath, threading a winding path between enormous crevasses, gingerly crossing snow bridges and always mounting steadily—while the sun just tips the surrounding peaks with rose, and all below is still in shadow, and icy after the night. In general the party would not consist of more than four and the rope is kept tant between each man so that in the event of anyone disappearing into a crevasse he does not fall far, but is hauled safe but undignified out of the crack.

When the rocks begin it is sometimes wise for only one man to move at a time, the others "making fast" and bracing themselves against a possible slip—but as often as not the little party progresses slowly but continuously unless "blue ice" is met with when the leader cuts steps with his axe and the ascent goes on more slowly still. Each individual has his own particular difficulties on the mountains. Some hate descending steep ice slopes and do slowly and clumsily what another man who perhaps might be an indifferent rock climber would come down with easy and security. Others hate knife-edge arêtes, and can hardly obey the unwritten climber's law of "always upright," but pine to clasp the icy ridge with legs and arms. Difficulties of this kind usually vanish however with practice and experience, and are as nothing compared with the real difficulties which may arise in bad weather, or in the case of accident. As to the constant remark of the non-climber about giddiness, this is probably never felt when he is once well on the peak. He may feel very nervous at the beginning but directly the work begins he has far too much to think about, to spare any time to feeling giddy. Nose bleeding and bad headache

general level of mental ability. For such an immeasurable blessing a slight loss of skill is but a small price to pay.

Printing then took away some good from us, but in return it has given us far more than we lost. A change from the old conditions was both necessary and inevitable ; and it is idle to regret that which could not be avoided, especially when the advantages more than counterbalance the evils gained thereby.

A plea for the Mountaineer.

The pleasures of peak-scaling are almost always called in question by those who have confined their ascents to the Monument or to Primrose Hill and in point of fact it is by no means an easy task to convince the biassed inhabitants of the second dimension of the joys of an excursion into the third. To such critics we can only reply, 'Try it, and find out.' Probably however a clue to the well known mountain mania is found in the continuous excitement of an ascent, and the extraordinary sense of physical fitness which is felt by all who climb when their bodies are in reasonable training and their lungs are acclimatised to the rarefied Air. Besides this there is always the View for the Aesthetic, and continual difficulties and checks for the Obstinate or Impatient. Whatever may be true in the saying that a man is himself in his cups, he is certainly always himself on the mountains. And that alone should be sufficient excuse for the egoist.

The progress of a typical ascent in the alps may be divided into three parts. The tramp in the dark and the dawn through pine woods and over grass boulders and moraine to the glacier snout; the passage up the glacier to the bergschrund or huge crevasse which marks where the ice has broken away from the main rocky buttress of the mountain ; finally, ascent over bare or ice-covered rock, varied by the traverse of an ice-conloir or a snowy arête to the summit. The first portion is often fatiguing but is always beautiful since the wonderful effects of dawn on the mountains then become evident. You mount the steep turf steadily tramping upwards behind the stalwart guide with a flickering candle-lantern as your only light, marvelling at the stillness and speculating on the weather and the chances of success. Gradually as the east grows bright, and the flat grassy plain (locally called an alp)

patience and pride in work which was then so wonderfully shewn.

Moreover man's best life is not the conglomeration of artificial falsehoods, which go to make up our life now, but a simple "country" life. The peasant-farmer, working under fair conditions, represents the happy man. His life is purer, healthier and more peaceful than that of the dweller in towns, to whom printing is an absolute necessity. To pore over books is unnatural; it is "a weariness of the flesh," for "of the making of books there is no end."

Lastly, granted that education is necessary to the full development of our many-sided nature, the ancient world shewed that this could be attained quite well. Yet there was no printing then. Printing has simply multiplied books; it has brought into light much that is useless. The very ease with we can "rush into print" is demoralising; if every word had to be copied carefully, more thought would be spent on literary efforts.

On the other hand it may be questioned whether printing has not really assisted to preserve eyesight in good condition; because when printing was still unknown reading was constantly becoming more necessary through the changes which inevitably came over the mode of living. Even poor printing is preferable to good writing. Also long sight is not necessarily strong sight. It must be allowed, however, that the memory is not so good now as it must have been of old. It may also be granted that the old artistic taste, skill and patience have been lost. Yet the invention of printing has led to the discovery of many other arts and has opened up the road to learning to many who would otherwise wallow in the mud of ignorance.

The idyllic state of the peasant-farmer, who tills a little plot of fertile land, is impossible. Such a life is out of the question altogether, when a country becomes at all congested. There is no room for the "self-sufficing man"—the man who can supply his own wants. Men are interdependent, and this utopian country life is altogether incompatible with solidarity.

Further we may fairly infer that such an existence is not warranted to bring out the best points in either the mental or the moral character of man. Printing, by bringing near to all the means of acquiring knowledge, has raised the

The men of to-day are just as prone to these regrets as were their predecessors in the world of letters. It may be a feeling of genuine regret with some; with most, however, it is more probably mere affectation. Such people have perhaps been reading of "merrie England" in the time of "good queen Bess"; they promptly and unthinkingly assume that because England and the English have changed they have therefore deteriorated.

Again the more contemplative of men, who, had they lived six hundred years ago, would have made excellent monks, find themselves somewhat out of place amid the bustle and the turmoil of modern times. They are disturbed by the march of invention and by man's restless energy; and they think it were better had such things never been. Unpractical, vain dreamers as they seem, there is nevertheless something to be said for their view.

Men now a days live at very high pressure. Life is more wearing than formerly and sometimes under all this stress and strain men are inclined to neglect some of the better part of their nature. It was possibly some reflection of this kind that prompted Disraeli to say "the greatest misfortune that ever befel man was the invention of printing." At first this sounds absurd, but when it is more closely examined it will be seen that there is much truth in the words.

In the first place there is not the slightest doubt that the faculty of memory has deteriorated very considerably since printing relieved men of the necessity of remembering. It may further be said that eyesight among book reading peoples has become poor, and is likely to become still worse, owing to the weary work which a multiplication of books has brought on us. The untaught villager can see miles further than the reader of books. The latter's eyes have grown weak by constant strain,—often indeed by heredity,—and he can see neither far nor clearly.

When we inspect the old manuscripts in libraries and museums or the old firmans in private houses, we are forced into admiration for the skill and patience with which the writing and the illumination have been carried out. There is on those pages something more than clever work; they have the love of work and the pride of doing it well, as it were, imprinted on them. There is great reason to fear that now this skill is lost; and certainly it is very hard to find the

your affairs, but will be directed to ascertain whether there are any causes beneath the surface which have led the students to take up an attitude wholly inconsistent with the relations which should exist between them and their teachers. It is not necessary for me to impress on you the need for dealing firmly with the question. You have already told me of your intentions to do so, and for removing root and branch any defect that you find to exist in the present organisation of the College. If your Committee conducts its enquiry faithfully, and without fear of consequences, as I have no doubt it will, and if you will take action to remove any defects which the Committee's enquiry discovers, I hope that out of evil good may come, and that your College may emerge from the trouble that has recently occurred into an era of even greater prosperity than it has hitherto enjoyed."

He was pleased with the new developments—the Schools of Science and Arabic—and he would be glad to give what help he could to further sound education. With regard to the Library he agreed with what the Trustees had said as to its importance and he hoped to be able to help the College in this respect also. In conclusion His Honour expressed his general willingness to aid the Trustees whenever they asked for his advice and counsel.

After replying to the address Sir John Hewett saw the Trustees and Staff privately and had some discussion with them.

In the afternoon a garden party was given at the English House, on the cricket ground of which a match was played between the Tenth and Ninth Classes and the Rest of the School, the latter winning easily. Both His Honour and Lady Hewett were present.

The Nawab Faiyaz Ali Khan gave a large dinner party in honour of the Lieutenant Governor's visit and shortly after ten the guest of the evening and his party left *en route* for Meerut.

Printing an Evil to Men.

Since the world has had a history, men have been fond of sighing for the "good old days." Homer himself speaks of stones which bygone heroes could throw about with one hand whereas in his time five men could barely lift them.

In the address respectful congratulations were offered to Sir John Hewett on the assumption of the post of Lieutenant Governor. Then the recent troubles were mentioned "while safeguarding the religious, moral, intellectual and physical needs of our students, we regard the maintenance of discipline as absolutely necessary in the interests of the students themselves, and nothing can make us depart from this time honoured and sound principle."...... . ..." We are going to institute a searching enquiry into the cause and circumstances of the late troubles and will deal with the situation as the interests of the College will require."

The address then touched on the new Science and Arabic Schools and expressed a hope that His Honour's sympathy would be given to these new undertakings.

After mention had also been made of the new School buildings and Houses the Trustees drew attention to the weakness of the College with regard to the Library, emphasising the need for creating a "learned society" in India and the impossibility of attaining this result without a good library. The address concluded with the assertion that the aims of the Trustees were simply to carry out the noble design of the Founder and to fit the students "to play their part manfully in the India of the future, so full of difficult and perplexing problems."

In reply His Honour thanked the Trustees for their congratulations, and said that when in 1879 he visited Aligarh at the invitation of Sir Syed Ahmad he little thought that one day it would be his lot to visit the College again as its patron. He then referred to the recent Royal visits to the College and to the interest taken in the institution and its aims.

With regard to recent events His Honour said "I am glad to learn that you are undertaking a searching enquiry into the causes of the trouble that has recently occurred here. Having been educated at the oldest of the English public schools, and at the University of Oxford, it is only natural that I should attach the highest value to the maintenance of discipline in a College like this. You cannot do better than follow in your management of the College, the principles laid down by Sir Saiyed Ahmed, which you have referred to in your address. Your enquiry no doubt will extend not only to the actual occurences, which to the outward eye may seem to have led to the crisis that has recently occurred in

pal's orders was disobeyed by this student who naturally had to be sent away from the College in the interests of discipline. He thus brought his final punishment on his own head.

Much excitement had existed all through the week with regard to this affair and the sending away of this student was the signal for an extraordinary outbreak on the part of all others. Meetings were held, morning, noon and night, and the general ground of complaint alleged as the cause of the unpleasantness was that the members of the Staff did not now show the same kindliness towards the students as in the days of old. On Friday night February 15th there was a good deal of noise and disturbance of so grave a character that the College authorities, both Trustees and Staff, were inevitably bound to take serious notice of the whole affair.

The impasse lasted until Saturday, February 23rd, in spite of the efforts of Trustees, Old Boys and others to bring about a conciliatory settlement. On that day the Trustees ordered the closing of the College till further notice, and this took effect from Sunday evening, February 24th.

The School was very little affected by all this and re-opened on March 2nd after the ordinary Moharram and Holi holidays.

The affair, though serious enough, has perhaps been magnified in the Press, which has treated it at some length. As has been said above we make no comments now, save to express our regret at the whole business. The College and the students have both suffered. May the damage done be small!

The Visit of the Lieutenant Governor.

On Thursday, March 7th, His Honour Sir John Prescott Hewett, the newly appointed Lieutenant Governor of these provinces visited the College. He was entertained by the Nawab Faiyaz Ali Khan during his stay in Aligarh.

His Honour arrived at the College at about 11-30 and was received by the Trustees and Staff at the Main Gate. He went round the College buildings and saw the new Mumtaz Boarding House, after which he came to the Strachey Hall where an address was read on behalf of the Trustees by Aftab Ahmad Khan Esq.

of the game was fairly even, as our team could not show their real form on grass. In the second half, however, they adapted themselves to their conditions and eventually won by six goals to one. H. H. the Lieutenant Governor, watched the game.

We also won the Hockey, defeating Muir Central College by two to one. In this match, according to the account of the Hockey Captain, we were favourd by furtune, as Muir Central College were unlucky enough to lose one of their best players through an accident.

Thus the teams returned to Aligarh after a triple triumph, bringing with them the Cricket Shield, the Hockey Cup and the Football Trophy.

Unhappily the memory of these successes seems only too likely to be lost in the sullen gloom of the trouble that followed, a trouble which has resulted in the closing of the College from February 16th to March 20th, a period far longer than the ten days holiday, given for Moharram and Holi.

It would be inadvisable as well as improper at this stage to pass any comments on the affair; for "lis sub judice est,"— a commission of Trustees is to sit in the middle of this month to enquire into the matter. Hence a brief statement of what happened will have to suffice for the present. Before beginning the account it should be mentioned that by a most unfortunate coincidence the Hon. Mr Gokhale gave a lecture in the College the very day previous to the disturbance. His lecture was on "Education" and from its very title it will be perfectly clear that nothing in that lecture must be connected with this most unfortunate business.

We should not mention this coincidence at all, were it not for the fact that newspaper readers, not knowing all the facts, would naturally be inclined to connect the two events together. Instead of being connected they should be kept distinct and separate.

On Saturday, February 9th, at the District Fair there was a collision between the Police and some students. This matter could not be allowed to remain without enquiry. The District Superintendent of Police asked that one student should be punished severely or that he should stand his trial in the usual way. The Principal inflicted a punishment and the student wrote an apology. One of the Princi-

In Tennis the Agra pair were the winners. They were quite well together and outplayed their opponents in every match. Aligarh did not do well. But one good effect of their defeat will be that more serious attention will in future be paid to the encouragement of this game. The College pair was selected or rather was the result of a competition held on the previous day. A pair, produced under such conditions, could scarcely be called the best representative pair from the College. The two players did their best and did very well indeed under the circumstances to get as far as the semi-finals ; but there is no doubt that they would have done better with practice.

As for Cricket there is very little to be said. The College was far too strong for any opponents that it met and had a very easy time.

In Football there were two good games, both between St. John's Agra and Aligarh. The former possessed a pair of good backs and an excellent goal keeper. The other games were of a quiet and less exciting kind, though mention should be made of the very creditable show made by Bareilly College. St. John's Agra drew with Aligarh on Wednesday, January 30th, the score being love all, even after playing extra time. This was a very good match to watch though the College forwards should have done better than they did.

The Agra goal-keeper gave a wonderful exhibition and saved several times in a marvellous way. His backs also were fired by his example and showed a very sound defence. On the following day the game was replayed and the result was this time absolutely decisive. The Agra defence was bustled throughout the game and the final score was 3 to love in favour of Aligarh.

The Hockey matches were not very good. Meerut played Aligarh and gave a very useful object lesson in the way to play a losing game. Nobody, watching them towards the end of the match, would have thought that they were six goals behind. They played a good hard game to the very end. Bareilly after beating Agra College in the first round scratched to Aligarh in the semi-final.

The Finals also were all won by our teams. The cricket was won quite as easily as in the earlier round. The football was played against Canning College, Lucknow. The first half

The Aligarh Monthly

March, 1907.

College Notes.

Before beginning any account of the recent trouble in the College, it will perhaps be best to deal with the usual items of College news.

The School Teams did not fare very well in their Tournament at Agra. They put up a good fight but obviously "it was not their day." They lost both in Cricket and Football to the ultimate winners of the Tournament.

The College Teams, on the other hand, had an easier task in their Tournament. The preliminary rounds were played in Aligarh, while the Finals for both the Eastern and Western Tournaments were held at Lucknow.

The Tournament began here on Monday, January 28th and was finished by Thursday January 31st. Mr. Gardner Brown was Local Secretary. The visiting teams were provided with lodging by the College. The entries were as follows; for Cricket; Meerut, Agra and Agra St. John's together with Aligarh; for Football; Agra, Bareilly, Agra St. John's and Aligarh; for Hockey, Bareilly, Agra, Meerut and Aligarh, while for Tennis there were five entries, all the competing Colleges, above named, sending in a pair.

جلد (۵)	اپریل ۱۹۰۷ء	نمبر (۴)

تجرّد اور ازدواج

آج کل اکثر نئی روشنی کے نوجوانوں میں مجرّد رہنے کی خواہش زیادہ پائی جاتی ہے۔ اِس سے ایک تو لڑکیاں کنواری بیٹھی رہتی ہیں۔ دوسرے خود اُن نوجوانوں کو اِس تجرّد سے نقصان پہونچتا ہے۔ جب کوئی اِن سے اِس تجرّد کا سبب دریافت کرتا ہے، تو بعض یہ کہتے ہیں کہ ابھی ہماری آمدنی میں اتنی گنجایش نہیں، جس سے بیوی بچّوں کی پرورش کر سکیں۔ اور اکثر نوجوان یہ عُذر پیش کرتے ہیں کہ تعلیم یافتہ اور ہم مذاق بیوی کا مِلنا دشوار ہے اور جاہل عورت کے ساتھ ہم اپنی زندگی عمدگی سے بسر نہیں کر سکتے، اِسلئے ہم تجرّد کو ایسے ازدواج سے اچھا جانتے ہیں۔

بجز نقصان شادی سے نہیں کچھ ہند میں حد آ

مزا کیا گھر میں رہنے کا جو ہمصحبت نہو عورت

سُنا کرتے تھے گھر میں دُور ہو جاتی ہے سب کلفت
ہوا معلوم اب تو یہ کہ گھر ہے خانۂ وحشت

پہلا عذر شادی نہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ البتہ دوسرا قابلِ لحاظ ہے اور اُسکے پورا کرنے کی ہر طرح کوشش کیجا رہی ہے۔ لیکن یہ مسئلہ آجکل میں طے ہونیوالا نہیں اسکو ابھی کئی سال چاہئیں۔ پس ایسی صورت میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا تجرّد کو ازدواج پر ترجیح دینا ملک اور قوم کے لئے نہایت ہی خطرناک ہے۔

اِس چھوٹے سے مضمون میں مختصراً تجرّد کے نقصانات اور شادی کے فوائد بیان کئے گئے ہیں اور یہ بتلایا گیا ہے کہ ہم کو کسطرح اور کس عمر تک شادی کر لینی چاہئے۔ اور بعد میں کن امور کا لحاظ رکھنے سے زندگی خوشی اور خرّمی سے بسر ہو سکتی ہے۔

تجرّد کے نقصانات

مردم شماری کی رپورٹ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مجرّد آدمی بہ نسبت متاہل کے زیادہ بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں اور نیز اِن کی اموات بھی بہ نسبت متاہلوں کی اموات کے زیادہ ہیں۔ چنانچہ پچیس ۲۵ اور پینتالیس ۴۵ برس کی عمر میں فیصدی ۴۸ مجرّد مرتے ہیں، ۱۸ متاہل۔ اگر ۷۸ متاہل ۴۸ برس کی عمر تک پہونچیں تو صرف چالیس ۴۰ مجرّد اِس عمر تک پہونچتے ہیں۔ اگر ہم اور آگے جائیں تو نتیجہ اس سے بھی زیادہ حیرت ناک نظر آتا ہے۔ مثلاً فیصدی اگر ۴۸ متاہل ساٹھ ۶۰ برس کی عمر تک پہونچیں تو صرف ۲۲ مجرّد اُس عمر تک پہونچتے ہیں۔ علیٰ ہذا اَسّی ۸۰ برس کی عمر تک فی صدی ۹ متاہل اور صرف ۳ مجرد پائے جاتے ہیں۔ عورتوں کے حق میں شادی مردوں سے زیادہ مفید ہے۔ اگرچہ زچگی خطرناک سمجھی جاتی ہے۔ تاہم بہ نسبت مجرّد عورتوں کے بیاہی عورتیں بہت کم بیماریوں میں مبتلا رہتی ہیں، یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ سَو ۱۰۰ خودکشی کرنیوالوں میں سے ۶۷ مجرّد ہونگے اور ۳۳ متاہل۔ اور ۱۷۲۶ پاگلوں میں سے ۹۸۰ مجرد ہیں اور

۶ ۴ ۷ متأہل۔

یہ سچ ہی کہ بہت سے آدمی باوجود شادی نہ کرنے کے مجرد نہیں رہتے، لیکن ایسے لوگ یا تو عیاشی میں پڑجاتے ہیں یا افعال خلاف وضع فطری اِن سے سرزد ہوتے ہیں اور یہ دونوں سخت مضرت رسان ہیں۔

تجرد اور ازدواج کے متعلق بعض لوگوں کی رایوں میں اختلاف ہے۔ قدیم زمانے سے آجتک جن لوگوں نے انسان کی زندگی کے مختلف حالات پر غور کیا ہے، اُن کی یہ راے ہے کہ شادی خود اُس شخص کے لئے جو کرتا ہے اور اُس انسانی سوسائٹی کے لئے جس کے ساتھ اِس شخص کا تعلق ہے بہ نسبت تجرد کے نہایت مفید ہے۔

بعض حضرات جو انسان کے انجام کو سوچا کرتے ہیں وہ اگرچہ ازدواج کو بُرا نہیں جانتے لیکن تجرد کو پاک، شریف، اور اعلیٰ ترین زندگی خیال کرتے ہیں۔ مگر عموماً مقنن، سوشیالوجسٹ مدبر، فلاسفر۔ اور فزیالوجسٹ، پہلی راے سے اتفاق کرتے ہیں اور سنیاسی، زاہد و عابد وغیرہ دوسری راے سے۔

مختلف ممالک کے مقننوں نے اپنے وقت میں تجرد کو بذریعۂ قانون روکا ہے۔ چنانچہ آج کل بھی بعض مہذب ممالک میں جہاں تجرد کی طرف لوگ زیادہ مائل ہیں۔ وہاں اُسکے روکنے اور ازدواج کے ترغیب دلانے میں ہر طرح کی کوشش کی جارہی ہے۔

حال کی علم الاعداد کی رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے۔ کہ متأہل اپنی زندگی کا حصہ بہ نسبت مجرد کے زیادہ مسرت سے بسر کرتے ہیں۔

تجرد کے نقصانات کی تاریخی مثالیں بوسوبر (Beausobre) اپنی تاریخ کرٹیک ڈی میانی کزم (Histoire critique de manichéism) کے تیسرے باب میں ایک عجیب بات بیان کرتا ہے کہ۔

"قدیم عیسائیوں کا یہ عام خیال تھا کہ اگر حضرت آدمؑ خدا کی نافرمانی کیوجہ سے زمین پر

نہ پھینکے جاتے تو وہ ہمیشہ تجرد کی پاک زندگی بہشت میں بسر کرتے اور جنت معصوموں سے بھرا رہتا۔ اُن عیسائیوں کے خیال میں ازدواج حضرت آدمؑ کی نافرمانی کا نتیجہ تھا اور اُس عتابِ الٰہی کا داغ ازدواج کی صورت میں آدم کی اولاد میں آجتک نمایاں ہے۔ جس ناپاک اور پُراز گُناہ کام کو انسان استقلال کے ساتھ روا رکھتا ہے، اِس سے باز رہنا اُن عیسائیوں کے خیال میں بہت بڑا تقدّس اور رضاے الٰہی کا عین منشا سمجھا جاتا تھا۔"

یورپ میں جہاں مذہباً "تجرّد" اچھا سمجھا جاتا ہے، اور جہاں قدیم زمانے میں امیر وغریب کی شادیوں کے رسومات گرجا کے دروازے پر ادا کئے جاتے تھے، اور اُسوقت جن کا خیال تھا کہ گرجا جیسے مقدّس مقام کو ایسے بُرے اور شرمناک کام میں استعمال نہ کرنا چاہئے، جس کیوجہ سے مرد اور عورت آزادی کیساتھ ہم بستر ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۵۵۰ء میں اسی اصول کے موافق ہنری دوم شاہ فرانس کی بیٹی ایلزبتھ کی شادی۔ فلپ دُوم شاہ اسپین سے ہوئی۔ جس کے رسوماتِ عقد کو پیرس کے بشپ نے نوٹرڈیم کے گرجا کے دروازے پر ادا کیا تھا۔ مگر وہی لوگ تجربے سے اب تجرد کو بُرا اور ازدواج کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ تاریخ کے دیکھنے سے ہمکو تجرد کے نقصانات اور ازدواج کے متعلق عجیب وغریب قوانین معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ یونان کے مشہور مقنن لی کرگس (Lycurgus) نے تمام مجرد اشخاص کو سیول اور فوجی خدمات سے محروم کر دیا تھا اور اُنکا شمار بداطوار آدمیوں میں کیا جاتا تھا۔ بعض مقدّس تیوہاروں میں عوام سے اُنکی تحقیر کرائی جاتی تھی، شاہراہوں پر اُن کی ہنسی اُڑائی جاتی تھی۔ اور عورتیں اُن کے چہرے نوچتی اور ایک چھوٹے چابک سے اُنھیں مارتی تھیں۔

بُقراط نے ایک نوجوان شاہزادے کی زندگی صرف شادی کرانے سے بچائی تھی۔ اِس شادی کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ یہ شاہزادہ ایک لڑکی پر عاشق تھا اور سوائے اُسکے دوسری عورت سے شادی نہ کرنے کا مصمّم ارادہ کرلیا تھا۔ اِسوجہ

سے اُسکی صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ آخرکار لوگوں کو اُسکی زندگی سے مایوسی ہوگئی تھی، مگر شادی ہوجانے سے وہ اچھا ہوگیا۔

اِسیطرح جالینوس نے بھی ایک لڑکی کو سوت کے پنجے سے شادی ہی کرا کے چھوڑا دیا تھا۔

تاریخ اِسپارٹا میں ایک بوڑھے مجرّد آدمی کا یہ عجیب واقعہ درج ہے کہ ایک مرتبہ ایک لڑکے نے کسی بُوڑھے آدمی کو سلام نہ کیا۔ لڑکے کی اِس حرکت سے اُس بُوڑھے نے طیش میں آکر مجسٹریٹ کے سامنے اُسکی شکایت کی۔ کیونکہ اُن دنوں اُس ملک کی یہ تہذیب تھی کہ ہر شخص اپنے سے زیادہ عمر کے آدمی کی پُوری تعظیم کرے اُسکے خلاف کرنے پر اُسکو سزا ملتی تھی۔ اِسی بنیاد پر اُس بوڑھے نے شکایت کی تھی۔ جب مجسٹریٹ نے لڑکے کو طلب کرکے پُوچھا کہ تم نے کیوں سلام نہیں کیا؟ تو لڑکے نے جواب دیا کہ "میرے سلام نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بُوڑھا اب تک مجرّد ہے۔ اور جب یہ مرجائیگا تو اُسکی کوئی اولاد نہ ہوگی جو میری ضعیفی میں مجکو تعظیم دے"۔ لڑکے کا جواب معقول تھا اِسلئے وہ بُوڑھا عدالت سے نہایت ذلّت کے ساتھ نکالدیا گیا۔

روماۃ الکبرےٰ کے باشندوں سے کسی معاملے میں رائے لینے سے قبل یہ سوال کیا جاتا تھا کہ کیا تم متاہل ہو۔ اگر اِسکا جواب نفی میں ملتا تو اُسکی رائے نہیں سُنی جاتی تھی۔

جولیس سیزر (Caesar Julius) اور دوسرے شاہانِ روم کے عہد میں مجرّد آدمی کو سزا ملتی تھی۔ اور متاہل کو جزا۔ روماۃ الکبرےٰ اور یونان میں تجرّد کے خلاف نہایت سخت قوانین رائج تھے اور جو مجرّد رہتے تھے اُن کو بے حد تکلیفیں پہونچائی جاتی تھیں تاکہ دوسرے اِن سے عبرت حاصل کریں۔

حقیقت میں تجرد جیسا ایک شخص کے لئے مضر ہے اسیطرح ایک سوسائٹی کے واسطے بھی سخت نقصان رساں ہے۔ کیونکہ اس سے ہر طرح کے خراب

امراض ملک میں پھیلتے ہیں۔ اور عیاشی کا بازار ہمیشہ گرم رہتا ہے۔ اور یہی اسباب ملک کی تباہی کے پیش خیمہ ہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جو قوم عیاشی اور بدکاری میں مبتلا رہتی ہے اُس میں ضرور ازدواج سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ علامات اُس قوم کی تباہی اور زوال کے ہیں۔ چنانچہ سلطنت روما کے زوال اور یونانی خاندانوں کی تباہی کے بھی یہی اسباب بیان کئے گئے ہیں۔

مسلمانوں۔ ایرانیوں۔ ہندوؤں۔ جینیوں۔ اور یہودیوں کی مقدس کتابوں میں تجرد کے بے حد نقصانات بیان کئے گئے ہیں۔ ہندوؤں کے مذہب کا تو یہ اصول ہے کہ جو شخص مجرد مرجاتا ہے اُسکی روح جنت میں نہیں داخل ہوتی۔ اور ہمیشہ دنیا میں بھٹکتی رہتی ہے۔ اِسی لئے اکثر ہندوؤں میں مُردے کی شادی قبل جلانے کے کیجاتی ہے تاکہ اُس کی روح بہشت میں داخل ہو سکے۔

ڈاکٹر ٹرال کا بیان ہے کہ امریکہ کی اکثر نوجوان لڑکیاں اور لڑکے شادی کے نام سے نفرت کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم اسیطرح مجرد رہینگے۔ ڈاکٹر صاحب کی راے ہے کہ ایسے خیالات سے سوسائٹی ضرور بداخلاق ہو جائیگی۔ اور امریکہ کے مردوں اور عورتوں کی سوشل حالت نہایت خراب اور شرمناک ہو جائیگی۔

شادی

شادی کی عمر۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ نوجوان کے لئے شادی ایک ضروری امر ہے اور قانونِ قدرت کا خاص منشا بھی یہی ہے۔ یعنی بغیر شادی کے انسان کی زندگی عیش و آرام کے ساتھ ہرگز بسر نہیں ہو سکتی۔

شادی کی عمر ہر قطعۂ دنیا کے لئے ایک ہی قرار نہیں دیجا سکتی کیونکہ ہر ملک کی آب و ہوا مختلف ہوتی ہے۔ اور اُس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اگرچہ بعض قوموں نے شادی کی عمریں معین کی تھیں لیکن آخر میں وہ سب بے اصول اور خلافِ فطرت ثابت ہوئیں

مثلاً۔ یونانیوں نے ازدواج کی عمر عورت کیلئے ۳۰ اور مرد کیلئے ۳۵ سے ۴۰ سال قرار دی تھی افلاطون کے قانون سے مرد ۳۵ اور عورت ۲۵ سے ۳۰ سال تک مجرد رہ سکتی تھی۔

قدیم اہل جرمنی کے ہاں مرد کو ۲۵ اور عورت کو ۲۱ سال سے قبل شادی کرنے کی قطعی ممانعت تھی۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ ایسے قوانین سے بچے قوی اور زبردست پیدا ہونگے۔ اور بڑی عمر تک زندہ رہ سکینگے۔ شاید اُس زمانے کے لحاظ سے یہ خیالات درست ہوں۔ کیونکہ اُسوقت ماں کی گود ہی سے جسمانی ورزش شروع ہو جاتی تھی۔ اور سوا اسکے دوسری طرف بہت کم توجہ کی جاتی تھی۔ غذائیں معمولی تھیں اور لباس سادہ تھا۔ اور موجودہ زمانے کی تہذیب کے موجبات ترغیب نہ تھے۔ اس وجہ سے اُن قواعد پر عمل کرنا ممکن ہوگا۔ لیکن آجکل اُن کی پیروی ہر حصۂ دنیا میں بہت مشکل ہے

ڈبلیو۔ ایچ۔ ڈیون پورٹ آڈمس (W. H. Devonport Adams) اپنی کتاب سیکرٹ آف سکسس (Secret of success) میں سن بلوغ کی شادی کے فوائد میں بیان کرتے ہیں کہ:—

" ہم اس امر کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر نوجوان خواہ وہ آیندہ تجارت کرنا چاہے یا مذہبی خدمت انجام دینے کی تمنا رکھتا ہو، یا انجنیر، یا وکیل، یا مصور، یا منشی غرضکہ جو کچھ بھی بننے کی خواہش رکھتا ہو اُسکو چاہیئے کہ کسی اچھے گھرانے میں اوائل عمر میں شادی کرلے۔

اوائل عمر کی شادی کے خلاف جو زور دیا جاتا ہے وہ ہمارے خیال میں ضرور کسی بدنیتی یا خود غرضی۔ ظاہرداری اور عیاشی پر مبنی ہے، جس نے ہمارے تمدن کو تباہ کر دیا ہے۔ ہم اپنے برسوں کے تجربے اور زمانۂ دراز کے مشاہدے سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اوائل عمر کی شادی نوجوانوں کی سچی خوشی کا بیمہ ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ ایسی شادی حیوانی خواہشات کو اعتدال پر لاتی اور نہایت دیانتداری اور ایمانداری

سے حصولِ معاش کیطرف نوجوانوں کو حرکت دیتی ہے۔ حسین اور نیک لڑکی سے شادی کرنا اور اُس سے محبت کرنا خود ایک عمدہ تعلیم اور اصلی خوشی کا ذریعہ ہے۔

اوائل عمر کی بعض شادیوں کے نتیجے بُرے بھی نکلتے ہیں لیکن اکثر بڑی عمر کی شادیوں کے نتیجے بھی اچھے نہیں نکلتے۔ اور اسی طرح ہر شادی کے نتیجے جو محض دنیوی اغراض کے لئے کی گئی ہوں یا جن میں جوڑے غیر موزوں ہوں کبھی اچھے نظر نہیں آتے جو حقیقت میں شادی نہیں، بلکہ ایک تجارتی معاہدہ ہے"۔

ایشیائی ممالک، جہاں کے عادات اور تمدنی حالات مغربی ممالک سے بالکل جُدا ہیں اس لئے یہاں کے ازدواجی قوانین میں بھی بہ نسبت اُن ممالک کے اختلاف ہے۔ وہاں ازدواج میں تاخیر نقصان کے حد تک پہونچی ہوئی تھی۔ تو یہاں ضرورت سے زیادہ جلدی مضرت پہونچا رہی تھی۔ اور اب تک یہ نقص زیادہ تر اہل ہند میں پایا جاتا ہے۔ جو اکثر چھوٹے چھوٹے اور کم عمر بچّوں کی شادیاں کر دیتے ہیں۔

امریکہ کے ایک مشہور ڈاکٹر کا بیان ہے کہ جس عورت کی شادی ۲۸ سال تک نہیں ہوتی وہ اکثر خطرناک امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور جب وہ اُس مدّت کے آخری حصّے میں بیاہی جاتی ہے تو زچگی کے وقت نہایت خطرہ میں ہوتی ہے۔ اکثر محقّقین اور ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ہندوستان میں لڑکی کی شادی ۱۵ سال سے ۱۲ سال تک ہو جانی چاہیئے۔ اور سب سے بہتر عمر ۱۸ سال ہے مگر علاوہ عمر کے لڑکی کی صحت اور قوائے جسمانی وغیرہ کا بھی خیال ضرور رکھنا چاہیئے۔ مرد کے لئے ۲۰ سے ۲۵ سال تک شادی کی عمر معیّن کیگئی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ممکن ہے مگر اولاد کے حق میں مضر ہے

امریکہ کے مشہور ڈاکٹر ہالک اپنی ایک کتاب میں ایک شخص کا واقعہ اِس طرح لکھتے ہیں کہ۔

"ایک وکیل جس کی عمر ۳۵ سال کی تھی اور جسکے قُوےٰ اور عام صحت ظاہر میں اچھی

نظر آتی تھی، اتنے میں دفعتاً چند غیر معمولی علامات دیکھکر گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ مجھکو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک مجرد ہے اور اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ جب تک ایک معقول رقم جمع نہ ہوجائے جس سے بیوی بچوں کی آسانی سے پرورش ہوسکے، شادی نہ کریگا۔ اور اُس نے اپنی حیوانی خواہشات کو ابتک پوری کوشش سے روک رکھا تھا۔ اُسوقت اُسکے دماغ کی حالت خراب ہورہی تھی۔ خاصکر اُسکے حافظے نے جواب دیدیا تھا اور اُسکا دل کسی کام میں نہیں لگتا تھا حالانکہ پہلے اُسکو کام کرنے میں لطف آتا تھا۔ بلکہ وہ ہمیشہ کسی سوچ میں لگا رہتا تھا۔ اور کبھی کبھی اختلاجِ قلب کا بھی دورہ ہوجاتا تھا۔ ان علامات سے خائف ہوکر وہ میرے پاس آیا تھا۔ اُسکا پورا حال دریافت کرنے کے بعد میں نے کہا کہ اصولِ فطرت پر عمل نہ کرنے سے ایسا ہی ہوتا ہے۔ میری راے میں تم فوراً شادی کرلو، سواے اسکے تمھارے لئے کوئی دوسرا علاج نہیں ہے، لیکن اُس نے میرا کہنا نہ مانا اور مجھ سے رخصت ہوکر چلا گیا۔ نو مہینے بعد وہی وکیل پھر میرے پاس آیا اور اُس نے بیان کیا کہ میری حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے اور میری آمدنی میں بجاے اضافے کے کمی شروع ہوگئی ہے۔ کوئی کام مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ خیالات بالکل پراگندہ رہتے ہیں۔ حافظہ بھی خراب ہوگیا ہے۔ اب آپ جیسا مناسب سمجھیں میرا علاج کریں۔ میں نے کہا کہ اب بھی تمھاری حالت صحت پذیر ہوسکنے کے قابل ہے۔ تم فوراً شادی کرلو۔ چنانچہ اُس نے میرے کہنے پر عمل کیا۔ اب وہ بالکل تندرست اور صاحب اولاد ہے، اور اُسکی وکالت بھی اچھی چلتی ہے۔

بے جوڑ شادی یہ کسقدر نامناسب بات ہے کہ ایک آدمی جس نے اپنا عالمِ شباب عیاشی اور بُرے حرکات سے خراب اور پژمردہ کردیا ہو، وہ ایک نوجوان لڑکی سے بیاہا جاے جو ابھی موسمِ شباب کی بہار دکھارہی ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ جو لوگ اوائل عمر کی شادی کے خلاف ہیں وہ اپنی

عمر کے مقابلے میں عورت کی عمر کا کچھ لحاظ نہیں کرتے اور کبھی اس پر راضی نہیں ہوتے کہ ایک چالیس سالہ مرد کو اپنی ہم عمر یا اپنے سے کچھ کم عمر کی عورت سے شادی کرنی چاہیے، اُن کے خیال میں مرد کو پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ دولت کے زور پر خواہ اُسکا دل دنیوی بُرائیوں میں کتنا ہی ڈوبا ہوا ہو، اور اُسکا عالم شباب عیش و عشرت میں برباد ہو چکا ہو، کسی بیچاری کم سن کنواری لڑکی سے شادی کرے، جس نے ابھی اپنی عمر کے خوش گوار حصے میں قدم رکھا ہی ایسی شادیوں میں سچی ہمدردی اور دلی محبت میاں بیوی میں بہت ہی شاذ پائی جاتی ہی۔ اور یہ بات بھی صرف عمر کے تفاوت ہی کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف تو اُسکے شوہر کا دل ہر طرح کی خواہشات جوانی سے سیر ہو چکا ہے اور دوسری طرف اُسکی نوجوان بیوی میں شباب کی اُمنگیں اور جذبات موجزن ہیں مگر ایک کی دوسرے کو خبر نہیں۔

بیوی کا انتخاب

یہ بات ضروری ہے کہ انسان کو اپنی آیندہ رنج و راحت کی شریک اور ساتھی بیوی کے انتخاب کرنے میں کم از کم اتنا خیال رکھنے کی ضرورت ہے جتنا کہ ایک دوست کے انتخاب کرنے میں۔ مزاج اور چال چلن کے دریافت کرنے میں کوشش کرے اور اس امر کے معلوم کرنے میں سعی کرے کہ اس لڑکی کی طبیعت اُس سے ملتی ہے یا نہیں۔ اگر اپنے رُتبے سے کم درجے کے آدمی سے دوستی رکھنا بُرا اور معیوب ہے تو اپنے رُتبے سے کم درجے کی لڑکی سے شادی کرنا نہایت ہی معیوب اور خلاف عقل فعل ہے۔ کیونکہ شریف کا ساتھ شریف ہی دیسکتا ہے۔ ہمارا مطلب یہاں امیر غریب سے نہیں، بلکہ شریف اور رذیل سے ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے خیالات جذبات اور خواہشات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

مسئلہ انتخاب زوجین جو آجکل نئی روشنی کے نوجوانوں میں بڑے زور سے چھڑا ہے اور جسپر خوب بحثیں ہو رہی ہیں حقیقت میں غور طلب ہے۔ جیسی جیسی مغربی تعلیم

اور تہذیب میں زیادہ ہوتی جائیگی۔ یہ مسئلہ بھی زیادہ نازک ہوتا جائیگا۔ فی الحال اگرچہ اُن نوجوانوں کی تعداد بہت ہی قلیل ہے جو آزادیٔ نسوان کے حامی اور انتخاب زوجین کے مؤید ہیں۔ لیکن زمانہ پکار کر کہہ رہا ہے کہ وہ دن قریب ہے جبکہ ہندوستان کے تمدن کی بالکل کایا پلٹ ہو جائیگی۔

پس بزرگانِ قوم کو اِن نوجوانوں کے خیالات اور مطالبوں کیطرف توجہ کرنی چاہئے حتّی الامکان شرعی اور جائز آزادی خصوصًا شادی بیاہ کے معاملے میں انھیں ضرور دینی چاہئے

اکثر نوجوانوں کا خیال ہے کہ دوسرے مہذب اقوام کیطرح ہم بھی کورٹ شپ کے بعد شادی کریں، یا اپنی آیندہ رنج و راحت کی شریک کو قبل شادی دیکھ لیں۔ اور اُس کے مزاج اور چال چلن وغیرہ سے پوری واقفیت حاصل کرلیں۔ یا کم از کم تصویر ہی کے ذریعے سے ایکدوسرے سے تعارُف پیدا ہو جائے۔ وہ اپنے اِن خیالات کی تائید میں اسلامی احکام پیش کرتے ہیں۔ گو یہ خیالات آج کل ایک محدود گروہ کے ہیں۔ لیکن رفتار زمانہ کے ساتھ یہی خیالات عالمگیر ہو جائینگے۔ اِن نوجوانوں کی یہ خواہش جس حد تک بجا یا بیجا ہے اُس کو ناظرین خوب سمجھ سکتے ہیں۔ اور خود زمانہ اُسکا فیصلہ کردیگا۔ مگر ہم نے مروجہ مغربی کورٹ شپ کی نسبت جہاں تک غور اور تحقیق کی ہے، تو ہمکو اس طریقے میں نقصان زیادہ اور فائدے کم نظر آئے۔ کیونکہ جب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آپس میں ملتی ہیں خصوصًا ایسی ملاقاتوں سے اگر کوئی خاص غرض متعلق ہو تو اُن میں سے ہر ایک اپنے مطلوب سے اپنی بُرائیوں کے چھپانے اور بھلائیوں کے ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جوانی دیوانی تو مشہور ہی ہے۔ اِس عمر میں نظر زیادہ تر حُسنِ صورت پر پڑتی ہے۔ اور حُسنِ سیرت کیطرف بہت کم خیال جاتا ہے۔ لیکن شادی کے بعد ایکدوسرے کے اصلی چال چلن اور مزاج سے واقف ہوتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے دونوں کے مزاج ایک سے ہیں تو خیر ورنہ آئے دن کی نا اتفاقی اور لڑائی کا سامنا رہتا ہے۔ علاوہ اِسکے خود مہذب اقوام کی اکثر

کتابوں میں اسکی بُرائی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر جے بلفور اپنی کتاب میرج اینڈ پیرن ٹیج (Marriage & Parentage) میں کورٹ شپ کی نسبت بیان کرتے ہیں کہ۔

"نوجوان اچھے لباس پہنکر خوبصورت لڑکیوں کی تلاش میں پھرا کرتے ہیں۔ اور لڑکیاں بھی اپنے حُسنِ ظاہری اور میٹھی میٹھی باتوں سے اُن کو اپنا گرویدہ کر لیتی ہیں۔ مگر ایک کو دوسرے کے اصلی خیالات کا پتہ نہیں لگتا۔ چند دنوں اس بناوٹی ملاقات کے بعد مرد اپنے تئیں شادی کا اُمیدوار ظاہر کرتا ہے اور عورت کو اکثر مجبوراً قبول کرنا پڑتا ہے۔ ہندوستانی شادیوں میں اس سے بھی بڑھکر نقص ہیں، جہاں والدین ہی اُن امور کا فیصلہ کر دیتے ہیں جو لڑکا اور لڑکی کو خود طے کرنے چاہیئے تھے۔ اس قسم کی شادیوں سے کیا فائدہ متصوّر ہو سکتا ہے جو نتیجے کے لحاظ سے دونوں ایک سی ہیں"۔

ایک لیڈی لکھتی ہے کہ۔

"میں کبھی شادی نہ کرونگی۔ میں نے بہت تجربہ کیا ہے۔ مجھے ایک جوڑا تو ایسا دکھا دو جسمیں میاں بیوی کے درمیان سچّی محبت ہو۔ میں سینکڑوں ایسی مثالیں پیش کر سکتی ہوں۔ جہاں میاں بیوی میں درپردہ سخت نفاق ہے۔ گو وہ اپنے آپ کو لوگوں میں خوش و خرّم ظاہر کرتے ہیں"۔

پس ہم اپنی قوم میں ایسا طریقہ کیوں رائج کریں، جس سے خود وہ لوگ جن کے ہاں کورٹ شپ کی رسم جاری ہے، خوش نہیں ہیں۔ لیکن ہندوستان کی شادی بیاہ میں بھی اسی کے ہم پلہ خراب نتائج نکلتے ہیں جہاں عموماً شادی کا دارومدار روپئے پر ہے لڑکے والے ہمیشہ زیادہ جہیز لانے والی لڑکی کی فکر میں رہتے ہیں۔ اور لڑکی والوں کی نظر لڑکے کی آمدنی پر رہتی ہے۔ اور جب ان دونوں کی یہ آرزوئیں پوری ہو جاتی ہیں تو وہ اُس شادی کو نہایت ہی عمدہ خیال کرتے ہیں لڑکے اور لڑکی کے مزاج اور عادات سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ان باتوں کے دریافت کرنے میں کوئی زحمت گوارا

کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً ایسی شادیوں کے نتیجے کبھی نیک نہیں دیکھے جاتے۔ میاں بیوی میں محبت روپے پیسے سے نہیں ہوتی۔ بلکہ مزاج اور عادات کے ایک ہونے سے محبت قائم رہ سکتی ہے ؎

میرا جُدا مزاج ہے اُنکا جُدا مزاج
پھر کسطرح سے ایک ہو اچھا بُرا مزاج

عشق و محبّت بعض اوقات باوجود سخت پردے کے بھی لڑکے اور لڑکیوں میں عشق و محبّت پیدا ہو جاتی ہے، اور جب لڑکی یا لڑکے کے ماں باپ پر اُن کی محبت کا راز کھُلتا ہے تو وہ اِس جرم کی سزا میں اکثر اُن دونوں کی شادی آپس میں نہیں کرتے۔ ایسا کرنا نہایت معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ جب لڑکی یا لڑکے کے ماں باپ کو اسکی اطلاع ملے تو وہ نہایت ہی تامّل سے کام لیں۔ اِسکے متعلق اور حالات دریافت کریں اگر درحقیقت اُن دونوں میں سچّی محبت پائیں تو سوا اسے کسی خاص سبب کے اُنکی شادی آپسمیں کر دیں

ناظرین! ہم عشق و محبت کو طوالت کے ساتھ بیان کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ یہ وہ جذبہ ہے جو ہر انسان میں موجود ہے۔ یہ وہ رحمتِ آلٰہی ہے، جس کا اگر اچھا برتاؤ کیا جائے تو انسان کو شریف، بہادر، رحمدل، سنجیدہ، خوش خُلق اور عالی ہمت بنا دیتا ہے۔ لیکن ہماری سوسائٹی میں اوّل تو اسکا وجود ہی نہیں۔ اور اگر کہیں اتفاق سے ہو بھی جاتا ہے تو اُسکا اِستعمال بوجہ جہالت کے نہایت ہی مذموم اور شرمناک طریقہ پر کیا جاتا ہے۔ جو صرف عیاشی یا حظِ نفس سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اِس بُرائی کے متعلق لڑکے اور لڑکیوں کو چند باتیں بتلا دینا ضروری ہیں جو شاید کسی وقت مفید ثابت ہوں۔

سب سے پہلے آجکل کے عاشق مزاج نوجوانوں کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ یہ دنیا دار المکافات ہے۔ یہیں ہر انسان کو اُسکی بُرائیوں کی سزا اور بھلائیوں کی جزا ملجاتی ہے۔ اور یہ خوب یاد رکھو جو جیسا کریگا ویسا بھریگا۔

اگر کوئی شخص کسی کی لڑکی یا بہن یا بیوی وغیرہ پر بدنظر ڈالے اور چالاکی یا دولت کیوجہ سے اپنے اُس بُرے منصوبے میں کامیاب بھی ہو جائے۔ اور یہ راز کسی پر فاش بھی نہ ہو تب بھی اُس شخص کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ دیر سویر ضرور اپنی زندگی میں اپنے بوئے ہوئے بیج کا پھل پائیگا۔ یعنی منتقمِ حقیقی اُسکو بغیر سزا دیے اس دنیا سے نہ اُٹھائیگا۔ پس ایسے بُرے کام سے بچو۔ اور اِس سچے "قانونِ قدرت" سے ڈرو ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو۔
از مکافاتِ عمل غافل مشو۔

اِس سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ دُنیا سے عشق و محبت بالکل اُٹھ جائے یا یہ بدترین فعل ہے، اِس رائے کو کوئی عقلِ سلیم رکھنے والا شخص ہرگز پسند نہ کریگا۔ کیوں کہ جب تک انسانی سوسائٹی دنیا میں قائم ہے عشق و محبت کا وجود بھی لازمی ہے ؎

فروغِ عشق سے ہی روشنی جہاں کیلیے
یہی چراغ ہی اِس تیرہ خاکداں کیلیے

مگر اسکی خوبی اور بُرائی اور فائدہ یا نقصان اسکے استعمال پر منحصر ہے۔

اگر کسی لڑکے کو کوئی لڑکی اچھی معلوم ہو اور رفتہ رفتہ اُن دونوں میں محبت بھی ہو جائے تو لڑکے کو اِن تین ۳ باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ پہلے اُس لڑکی کے چال چلن کو مختلف ذریعوں سے دریافت کرے۔ دوسرے خود اُس سے پاک محبّت رکھے اور تیسرے اپنی سوشیل حالت پر غور کرے کہ اُس کی شادی اُس لڑکی سے ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ اگر یہ تینوں باتیں پوری نہ ہو سکتی ہوں تو بہتر یہی ہے کہ اُس لڑکی کو بھُلا دے۔ اور یہ باتیں سب سے پہلے سوچ لے۔ تاکہ بعد میں رنج و ندامت نہ اُٹھانا پڑے۔ لڑکی کو چاہیے کہ اگر کسی پر اتفاق سے اُسکا دل آ جائے یا کوئی شخص اُسکو محبت کی نظر سے دیکھتا ہو تو پہلے یہ سوچے کہ اُس شخص میں کونسی خوبی ہے جس پر

اس کا دل آیا ہے۔ یا وہ شخص کس نیت سے عشق ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ بہت سے مرد اکثر ناسمجھ اور بھولی لڑکیوں پر جھوٹی محبت جتا کر اُن کے دل اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ اور اپنا مطلب حاصل کرنے کے بعد اُنکو اُنکی قسمت پر چھوڑ دیتے ہیں۔

اے لڑکیو! تم یہ خوب یاد رکھو کہ تم اپنی عصمت کی آپ ہی پاسبان ہو، اس کی حفاظت نہ تمھارے ماں باپ کر سکتے ہیں اور نہ تمھارے شوہر۔ اسی سے تمھاری عزت ہے اور اسی کی بدولت تمھاری قدر و قیمت ہے یہ ایک ایسا انمول موتی ہے جسکی دیکھ بھال تمھارے ہی قبضے اور اختیار میں ہے۔ اور اسکے بغیر تم میں کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ ہوں اور تمھارے پاس ساری دنیا کی دولت ہی کیوں نہ ہو لیکن تم اچھی نظر سے سوسائٹی میں نہیں دیکھی جاؤگی، اور نہ کوئی شریف تمھیں اپنی بیوی بنائیگا۔

دنیا میں ہر شخص کی طبیعت ایک سی نہیں ہوتی۔ بہت سے مرد محض آزمانے کی غرض سے تم سے بُرے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جب تمھاری اخلاقی کمزوری اُن پر ظاہر ہو جاتی ہے تو وہ تم سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ لہذا ان دھوکوں سے بچنا تمھارا پہلا فرض ہے۔

مرد سے زیادہ تمکو اس عشق و محبت کے معاملے میں احتیاط رکھنا چاہیے۔ کیونکہ وہ تمھاری ہر بات کی خبر رکھ سکتے ہیں۔ لیکن تمکو بوجہ پردے اور دوسرے موانعات کے اُن کے حالات کی بہت کم اطلاع ملسکتی ہے، اگر تم واقعی کسی شریف اور نیک مرد سے دلی محبت رکھتی ہو اور اگر وہ بھی تمھارا شیدا ہے تو کسی ذریعے سے اپنے ماں باپ کو اس امر کی اطلاع کر دو کہ وہ بھی اُس شخص کے مزید حالات دریافت کرنے کے بعد تمھاری شادی اُس سے کر دیں۔

مشاطہ ہندوستان میں عموماً لڑکے اور لڑکی کی نسبت مشاطہ کے ذریعے سے ہوتی ہے، جو ایک خطرناک اور مذموم طریقہ ہے۔ کیونکہ اس قسم کا پیشہ نہایت

ہی ادنے طبقے کے لوگ کرتے ہیں، جن کو سوائے اپنے فائدے کے دوسرے سے مطلق ہمدردی نہیں ہوتی اور نہ بوجہ جہالت کے اِس اہم کام کو عمدہ طور پر انجام دینے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ پہلے تو مشّاطہ کے ذریعے سے نسبت ٹھہرانا اور اُس کے ہر بیان کا یقین کر لینا ہی بڑی غلطی ہے۔ اگر فی الحال اُن کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، تو کم از کم اُنکی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ اکثر اِن میں خود غرضی، مکّاری، دہوکا۔ فریب۔ اور جھوٹ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ کیسا ہی چالاک مرد ہو اُسکو اپنا مُرید بنا لینا اِن کا معمولی کمال ہے۔ اور اُن کا دعوےٰ ہے کہ جس نسبت میں یہ حصّہ لینگی اُس میں ضرور کامیاب ہو جائیگی چنانچہ اگر لڑکے کی طرف سے کوشش کرتی ہیں تو بدصورت کو یوسفِ ثانی، مفلس کو شہنشاہ ہفت اقلیم، ضعیف و ناتوان کو رستمِ دوران، رند کو پارسا، جاہل کو عالم، حتیٰ کہ بُوڑھے کو جوان تک بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور اگر لڑکی کی جانب سے ساعی ہوں تو کالی کو مہ پارہ۔ بوڑھی کو جوان، بلکہ کم سن، مفلس کو امیر، اور اَن پڑھ کو پڑھی لکھی ظاہر کرتی ہیں۔

یہ لوگ اِس فن میں کچھ ایسا کمال رکھتے ہیں کہ سَو میں سے شاید ہی دو تین خوش قسمت اِن کے دامِ تزویر سے بچ سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو حسبِ ضرورت اِس فرقے سے پالا پڑا ہے اُن کے ذاتی تجربے قابلِ عبرت ہیں۔ ہم کو بھی اِن کے بعض کُشتگانِ زُور و مکر کی بدبختی اور خانہ بربادی کا ذاتی علم ہوا ہے۔ جن کی شادیاں اِن مشّاطاؤں کے ذریعے سے ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے اِن بدبختوں سے جو کچھ قبلِ شادی بیان کیا تھا۔ اُسکا دسواں حصہ بھی صحیح نہ نکلا۔ اور یہ بیچارے کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔ ہمارے خیال میں اِن مشّاطاؤں کا جادو زیادہ تر اُن بیچاروں پر چلتا ہے جو کسی دوسرے شہر میں جہاں اُنکا کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا، شادی کرتے ہیں۔ مشّاطاؤں کے دھوکا دہی کی دو ایک مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔

ایک لڑکی کے ہاتھ پر جذام کے علامات تھے، اِس عارضہ کی وجہ سے اُس کی نسبت کہیں قرار نہیں پاتی تھی۔ مگر صرف ایک مشّاطہ کی چالاکی سے اُسکی شادی ہو گئی

اُس مشّاطہ نے ایک نوجوان ایرانی سے اُس لڑکی کے حسن و جمال کی اِسقدر تعریف کی کہ وہ لڑکا گرویدہ ہوگیا۔ منگنی کی رسم کے وقت لڑکے کی ماں نے مشّاطہ سے پوچھا کہ اِس لڑکی کے ہاتھوں میں یہ سُرخ تھیلیاں کیوں پہنائی گئی ہیں۔ تو اُس نے فوراً جواب دیا کہ بیگم صاحب! یہ ہندوستان کی ایک رسم ہے، شاید آپ کے ملک میں نہ ہو۔ مشّاطہ کا یہ فقرہ چل گیا۔ اور وہ لڑکی اُس بیچارے ایرانی کے سر منڈھ دیگئی۔

دوسرا واقعہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے، ایک مشّاطہ کسی گاڑی بان کی داشتہ تھی۔ ایک روز اُس گاڑی بان نے اپنی داشتہ سے کہا کہ تو اور بہت سوں کی نسبتیں ٹھہرایا کرتی ہی، اگر میری نسبت بھی کسی بڑے گھر میں ٹھیرادے تو میرا افلاس دُور ہوجائیگا اور میں تیرا ہمیشہ ممنون رہونگا۔ چند مہینوں کی کوشش میں اُس مشّاطہ نے دھوکے سے ایک دولتمند لڑکی کا عقد اُس گاڑی بان سے کرا دیا۔ لطف یہ ہے کہ لڑکی کے ماں باپ بھائی اور دوسرے رشتہ دار روپیٹ کے بیٹھ رہے، اور کچھ نہ کرسکے۔

یہ ہیں ادنےٰ کمالات اُن مشّاطاؤں کے جن کے ہاتھ میں قوم کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی قسمت کا فیصلہ دیا جاتا ہے۔ اِس لئے ضروری بلکہ لازمی ہی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ ہرگز ہرگز اِن کی معرفت کوئی ناتا رشتہ نہ جوڑا جائے اور اگر پردہ یا دوسرے موانعات اِس قسم کی براہِ راست تحریک کے مانع ہوں توکم ازکم اِسمیں کچھ اصلاح ہونی چاہیئے۔

قرابت کی شادی اگرچہ اکثر علمائے طب اس رائے پر متفق ہیں کہ اجنبیوں اور دور کے رشتہ داروں میں تعلقاتِ زوجیت قائم کرنا چاہیئے۔ کیونکہ تاریخی شہادتوں اور تحقیقاتِ طبی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہمیشہ ایک ہی محدود دائرے میں ازدواج ہوتے رہنے سے اولاد کمزور اور امراض خاندانی میں مبتلا ہوگی۔ لیکن بعض رائیں اِس طرف بھی ہیں کہ اگر لڑکے اور لڑکی کی صحت کے متعلق

پورے طبی اطمینان کے بعد قریبی رشتہ داروں ہی میں شادی کی جائے گی تو بُرے نتائج کا پیدا ہونا کچھ ضروری نہ ہوگا - ہماری سوسائٹی کی موجودہ حالت مجبوراً اس دوسری رائے پر عمل کرنے کی صلاح دیتی ہے، کیونکہ یہ بات بوجہ چند در چند اسباب کے اصول معاشرت کے ہماری دسترس سے باہر ہے - کہ غیر خاندانوں میں سے عمدہ لڑکیاں یا لڑکے انتخاب کئے جا سکیں - چنانچہ امریکہ کے مشہور ڈاکٹر ہالک اپنی کتاب میریج گائیڈ (Marriage Guide) میں بیان کرتے ہیں کہ -

" میری رائے میں قرابت کی شادیوں سے اچھے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں - کیونکہ قرابت کیوجہ سے لڑکے اور لڑکیاں چھٹپن سے ایکدوسرے کے مزاج اور چال چلن وغیرہ سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور ان کے میل جول میں کسی قسم کا تصنّع نہیں ہوتا - ابتک لوگوں کا یہ عام خیال تھا کہ قرابت کے رشتہ داروں میں شادی کرنے سے اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے - اور خاندانی بیماریوں کو زور ہوتا ہے لیکن حال کی تحقیقات نے اس خیال کو بالکل غلط ثابت کر دیا ہے، کہ محض قرابت کیوجہ سے اولاد کمزور نہیں ہوتی - اور نہ کوئی بیماری پیدا ہوتی ہے - بلکہ یہ نقص بے جوڑ شادیوں سے ظاہر ہونا ممکن ہے - مثلاً ایک شخص کے خاندان میں اگر کوئی خاص بیماری ہو اور وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرے، جس کے خاندان میں بھی وہی خاص بیماری ہو تو نتیجہ یقیناً بُرا نکلیگا - یا اگر لڑکا اور لڑکی دونوں کمزور ہوں تو اُن کی اولاد بھی کمزور ہوگی - غرض صرف قرابت سے کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا "

شادی خواہ اپنوں میں کی جائے یا غیروں میں، ہماری رائے میں بحالت موجودہ انتخاب، کا یہ عام طریقہ شاید کچھ بُرے نتائج سے محفوظ رکھ سکے - کہ لڑکے کی ماں بہنیں یا اور رشتہ دار عورتیں جس لڑکی کو انتخاب کرنا چاہیں - تو ایک مناسب مدت تک بغیر اپنا اصل مطلب لڑکی والوں پر ظاہر کرنے کے لڑکی کے مزاج چال چلن کو بغور

دیکھیں اور پھر یہ فیصلہ کریں کہ اس لڑکی کا مزاج اُس لڑکے سے ملتا ہے یا نہیں۔ اگر اُس کی مرضی کے موافق ہو تو نسبت کریں ورنہ چھوڑ دیں۔ ہمیشہ تعلیم یافتہ لڑکی کو جاہل پر ترجیح دینا چاہیے۔ کیونکہ خود تعلیم ہزار خوبیوں کی ایک خوبی ہے، ہندوستان کی عورتیں بوجہ کم علمی اور جہالت کے اس طریقے کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہیں اور بجائے اسکے صرف لڑکی کی آنکھ، ناک، رنگ رُوپ دیکھنے اور جہیز وغیرہ دریافت کرنے کے بعد فوراً منگنی کر دیتی ہیں۔ جسکے بعد ہی لڑکی دُولھا کی کُل رشتہ دار عورتوں سے پردہ کرنے لگتی ہے یہانتک کہ دولھا کے ہاں کی ماماتک سے بھی چھپا دی جاتی ہے۔ شاید اسکی علتِ غائی یہ ہو کہ لڑکی کی بُرائیوں اور بھلائیوں دونوں پر پردہ پڑ جائے۔ اور کوئی رائے قائم کرنے کا موقع ہی باقی نہ رہے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ شادی ہونے تک جانبین کو خواہ بواسطہ ہی سہی، ایک دوسرے کی پُوری کیفیت معلوم ہوتی رہے لڑکی والوں کو بھی لڑکے کے چال چلن اور عام لیاقت کی پُوری حالت دریافت کر لینا چاہیے۔ اگر کوئی لڑکا پڑھا لکھا، شریف اور نیک چال چلن ہو تو اُسکو اُس دولتمند لڑکے پر ترجیح دینا چاہیے، جو محض جاہل اور ناخواندہ ہے۔

اس کے علاوہ سب سے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ اس ہونے والے تعلق ازدواج کی نسبت لڑکے اور لڑکی کی رائے بھی ضرور دریافت کرنا چاہیے۔ اور اُنکو ایسے ذرائع علم بہم پہنچائے جائیں کہ وہ بھی حتّی الوسع اپنی رائے قائم کرنے کے قابل ہو سکیں کیونکہ نباہنا تو اِن ہی دونوں بیچاروں کو ہے جن کی کوئی رائے ہی اس اہم معاملے میں نہیں لی جاتی۔

میاں بیوی کا باہمی برتاو

بیوی کا برتاو اپنے شوہر کیساتھ

یہ بات مسلّم ہے کہ مرد کی ترقی و تنزّل۔ عزّت و ذلّت۔ بہادری و بُزدلی جُرأت

دلبستی وغیرہ عورت ہی کے قبضے اور اختیار میں ہے۔ وہ بُرے سے بُرے مرد کو نیک اور فرشتے کو شیطان بنا سکتی ہے۔ اسلئے شادی کے بعد عورت یہ سوچے کہ مجکو اب کیا کرنا چاہیئے۔ مگر یہ خیال ضرور رکھے کہ جو بات اُس کے شوہر کے لئے مضر ہے وہ خود اُسکے حق میں بھی بُری ہوگی۔ سب سے پہلا کام جو عورت کو بعد شادی کے کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ اپنی اصلی رائے جو شوہر کی نسبت قائم ہوئی ہو۔ اُسے وہ دل ہی دل میں اس طرح پوشیدہ رکھے کہ اُسکے شوہر کو کبھی نہ معلوم ہو سکے، مگر خفیہ طور پر اسکی اصلاح میں کوشش کرتی رہے۔ یہ بات بہت مضرت رساں اور نقصان وہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر کی ناکامیوں اور برائیوں پر اُسکو ملامت کرے۔ اُسکی غلطیوں کو بار بار دُہرائے اور اُسکی بزدلی کو اُسکے مُنہ پر بیان کرے۔ بلکہ بیوی کو چاہیئے کہ وہ اپنے شوہر کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرے کہ وہ اُسکو دنیا کا سب سے بڑا آدمی جانتی ہے۔ اُس کے سامنے ہمیشہ اُسکی جرأت، ہمت، بہادری۔ اور لیاقت وغیرہ کا ترانہ گایا کرے اِس طرزِ عمل کا اکثر یہ نتیجہ نکلا ہے، کہ جب شوہر اپنے آپ میں وہ خوبیاں نہیں پاتا، جن کے ہونیکا اُسکی بیوی کو یقین ہے، تو وہ اُن بھلائیوں کو اپنے آپ میں پیدا کرنیکی کوشش کرتا ہے

اگر کسی عورت کا شوہر زمانے کے ہاتھوں معرضِ زوال و فلاکت میں آجائے اور اسوجہ سے اُسکے دل پر مایوسی چھا جائے۔ تو اُسکی بیوی کو چاہیئے کہ ہمدردی اور آیندہ کی اُمیدوں سے اُسکی ہمت بندھائے۔ اور جرأت پیدا کرے۔ یہ وہ زینہ ہے جس سے اُسکا شوہر پھر بامِ عروج پر پہونچ سکتا ہے۔ اُس سے ایسی مایوسانہ گفتگو نہ کرے، جس کی بدولت وہ اور پست ہمت ہو جائے۔ بلکہ اُسکی ایسی دلجوئی کرے کہ وہ اور اولو العزم ہو جائے۔

رسو (Rousseau) کے اِس عمدہ قول پر عورت و مرد دونوں کو عمل کرنا چاہیئے کہ "کیا انسان کے لئے یہ امر مشکل ہے کہ وہ کسی سے اِسلئے محبت کرے

کہ خود محبوب بن جائے، اور ہر دل عزیزی اسلئے اختیار کرے کہ زندگی خوشی سے بسر ہو اور دوسرے کی عزت اسواسطے کرے کہ لوگ خود اُسکی عزّت کریں"

جس عورت میں سمجھ نزاکت اور نرمی ہوگی وہ ہر مزاج کے مرد کو خوش رکھ سکتی ہے۔

رسو (Rousseau) نہایت عمدگی سے بیان کرتا ہے کہ۔

"عورت کی سب سے پہلی اور سب سے ضروری صفت حلم اور ملائمت ہے۔ اکثر مردوں میں بہت سے عیوب ہوتے ہیں اور وہ عموماً تندمزاج پائے جاتے ہیں۔ اسلئے عورت کو چاہیئے کہ ابتدا ہی سے برداشت کرنا سیکھے۔ اگرچہ اُسکی حق تلفی اور ناانصافی ہی کیوں نہ کی جاتی ہو، شوہر سے جو قصور اور زیادتی ہو اُسکو بغیر شکایت کے برداشت کرے اس صفت سے مرد کو فائدہ نہیں پہونچتا۔ بلکہ یہ حلم خود عورت کے لئے مفید ہے"

عورت کی بدمزاجی اور خودسری سے سوا سے گھر کی بُرائیوں میں زیادتی اور شوہر کی بدعادتوں میں ترقی ہونے کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے۔ عورت کو سمجھنا چاہیئے کہ مرد پر فتح پانے کے یہ ہتیار نہیں ہیں، بلکہ اُسکی نرمی تندمزاج مرد پر ایک نہ ایک روز ضرور فتح پائیگی۔ اور اُس کے مزاج کی اصلاح کریگی۔

یہ غلط خیال ہے کہ عورت اپنے حُسن کیوجہ سے اپنے شوہر پر حکومت کرتی ہے اور وہ اُسی تازیانے سے اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ حُسن کے ساتھ اُسکی نیک مزاجی اور محبت اُسکو شوہر پر بے روک ٹوک غالب کردیتی ہے۔

شوہر کا برتاؤ بیوی کیساتھ

اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرتا ہو تو وہ زیادہ لائق ملامت نہیں ہے کیونکہ بچپن ہی سے اُسکو زوجہ کے حقوق کی تعلیم نہیں دی گئی ہے، وہ بیچارہ یہ جانتا ہی نہیں کہ بیوی کے کیا حقوق ہیں، اور اُسکے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ اُسنے اپنے بچپن میں بطور قومی تعلیم کے بعض نیم مُلّاؤں اور جُہلا سے صرف یہ سُنا ہے کہ بیوی کے ساتھ

مثل کنیز کے برتاؤ کرے۔ وہ مرد کی قیدی ہے، اگر اپنی مہربانی سے مرد اُسکے ساتھ اچھا سلوک کریں تو بُرا نہیں ہے، جسوقت مکان میں داخل ہو، مرد کو چاہیے کہ اپنے آپ کو نہایت ہی غضبناک اور غصہ ور بنالے۔ نوکروں کو خوب ڈانٹے ڈپٹے اور ایسی حرکتیں کرے کہ جس سے اُسکی بیوی کے دل میں اُسکا رعب اور دہشت بیٹھ جائے۔ شوہر کو چاہیے کہ اپنی بیوی سے کبھی ہنسکر بات نہ کرے تاکہ وہ گستاخ نہ ہو جائے۔

مختصر یہ کہ اسیطرح کی بہت سی باتیں اپنی شادی سے پہلے سُنتا اور بہت سے لوگوں کو اُن پر عمل کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور جب خود اپنی شادی ہوجاتی ہے تو وہ بھی اُن ہی اُصول پر کاربند ہوتا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ اکثر نئی روشنی کے تعلیم یافتہ مرد بھی بہت نہیں تو تھوڑے ان پُرانے اُصول پر عامل نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف بچپن کی ناقص تعلیم یا سُنی سُنائی باتوں کا نتیجہ ہے جو مغربی تعلیم کے اثر سے بھی پوری طرح سے زائل نہ ہو سکا۔

اگر بچپن ہی سے لڑکوں کے دلوں میں یہ جما دیا جائے کہ بیوی شوہر کی کنیز یا قیدی نہیں ہے، بلکہ ایک سچی رفیق اور غمگسار دوست ہے تو اُمید ہے کہ وہ اپنے زمانہ تاہل میں بہت کچھہ اسپر عمل کریگا۔ اور ایک قدرتی حق کے طور پر وہ اُسکو عزت اور حُسنِ سلوک کا مستحق سمجھیگا۔

مرد کو چاہیے کہ اپنی بیوی سے محبت، دلداری۔ خوش کلامی۔ رحم دلی۔ قدردانی اور حوصلہ افزائی کے ساتھ برتاؤ کرے، کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ شادی کے بعد عمدہ ترین زندگی تحمل اور تامل کے ساتھ بسر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ مثل ایک ایسی سلطنت کے ہے کہ جس پر مصالحت و مشارکت حکومت کی جا سکتی ہے۔

شوہر کو چاہیے کہ بیوی کو ہرگز تلخ اور تُرش جواب نہ دے اور اُسوقت تک خاموش رہے جب تک دونوں کا غصہ فرو نہ ہو جائے اگر کسی کی بیوی تُندمزاج ہو

تو شوہر کو چاہیئے کہ اُس کے ساتھ نہایت ہی نرمی اور ملائمت سے برتاؤ کرے۔ جیساکہ **سُقراط** اپنی تندمزاج بیوی سے پیش آیا کرتا تھا۔ اِس سے بہت جلد اُسکی بیوی کی تُندمزاجی کی اصلاح ہو جائیگی۔ یہ ایک سچّا مقولہ ہے کہ "ایک نرم جواب غیظ وغضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے"

عورتیں عموماً اپنے کاموں میں مردوں کی مداخلت کو پسند نہیں کرتیں۔ اِس لئے شوہر کو چاہیئے کہ امورِ خانہ داری میں دخل نہ دے، اگر کوئی بات قابلِ اصلاح دیکھے تو اُسکو مشورے کے طور پر کسی مناسب موقعہ پر اپنی بیوی کو سمجھا دے

مرد کو کاہل الوجود نہ بنا رہنا چاہیئے۔ اور ہر وقت عورتوں میں گھسے رہنے کی عادت نہ ڈالے۔ کیونکہ یہ قدرتی بات ہے کہ کوئی متنفّس ہر وقت کی بیجا حکومت کو طیب خاطر گوارا نہیں کرسکتا۔

بیوی کے چال چلن کے متعلق بغیر کافی ثبوت یا شہادت کے بدگمان ہونا شوہر کے لئے نہایت ہی رنج اور تکلیف کا باعث ہے۔ اگر بدقسمتی سے کسی غلط فہمی کی بنا پر شوہر کے دل میں یہ شک پیدا ہو کہ اُسکی بیوی عاصمہ نہیں ہے تو ایسی حالت میں اُسکو بڑے صبر اور استقلال سے اُسوقت تک خاموش رہنا چاہیئے جبتک کہ اُسکا شک پایۂ ثبوت کو نہ پہونچ جائے۔ اِس میں شک نہیں کہ ثبوت ملنے پر اُس سے کنارہ کشی اختیار کرنا بہتر ہی کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اُسکی بیوی بدکار نہ ہو تو سب سے پہلے وہ خود اپنی بُری عادتوں کی اصلاح کرے اور بدکاری سے بچے"

اگر کوئی شخص دنیا ہی میں دوزخ کا مزا چکھنا چاہے تو وہ ایک سے زیادہ بیوی کرے، جس سے دنیا میں اُسکو کبھی راحت نصیب نہ ہوگی۔

بیوی کے ساتھ بدکلامی کرنا اور مار پیٹ سے پیش آنا شوہر کے بدترین صفات میں سے ہے۔

ناظرین! اسیر مضمون ختم ہو چکا۔ اور اب میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ مگر مجکو یہ اندیشہ ہے کہ اِس مضمون کی بہت سی باتیں پُرانے خیال کے حضرات کو بُری معلوم ہونگی۔ اور شاید بعض باتیں نئی روشنی کے نوجوانوں کو بھی ناپسند ہونگی۔ اِس میں میرا قصور نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی شخص دنیا میں سب کو خوش نہیں رکھ سکتا۔

ہمارے ملک میں دو زبردست پارٹیاں ہیں ایک نئے خیال کی دل دادہ، دوسری پُرانے رسموں کی شیدا۔ اِن دونوں کے حسب خواہش کوئی مضمون لکھنا نہایت ہی دشوار ہے۔ تاہم میں نے اِس امر کی کوشش کی ہے کہ دونوں کے عیوب و صواب پر بغیر کسی طرفداری کے نظر ڈالوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ مجکو اس میں کہانتک کامیابی ہوئی۔

یہ مضمون نہایت وسیع ہے اور اسپر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ہر ملک کی حالت جُدا ہے۔ خصوصاً ہندوستان کا ملک جہاں مختلف اقوام کے میل جول سے مختلف صورتیں پیدا ہو گئی ہیں اس امر کا زیادہ تر محتاج ہے کہ ایسے ضروری اور دلچسپ مضمون کے ہر پہلو پر بحث کی جائے۔ اور اُن خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کی جائے جو ہماری سوسائٹی کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہیں۔ میں نے مقدور بھر اس میں کوشش کی ہے۔ اگر ہمارے ملک کے کسی نوجوان مرد یا عورت کو اِس میں سے کوئی بات پسند آئے یا اِس سے کسی قسم کی مدد ملے تو میری محنت کا اِس سے بڑھ کر کوئی صلہ نہیں ہو سکتا۔

سید محمد تقی

ترب بازار۔ جام باغ۔
حیدر آباد دکن۔ ۲۵۔ اگست ۱۹۰۶ء

وقت کا مناسب استعمال

ایک حکیم کا قول ہے کہ "دنیا میں جتنے لوگ ہیں، سب قلتِ وقت کے شاکی پائے جاتے ہیں، مگر نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو وقت اُن کی ضرورت سے زیادہ اُن کے پاس موجود رہتا ہے۔" اُسی حکیم کا یہ بھی قول ہے کہ "ہماری زندگی کے دن تین طریقوں پر گذرتے ہیں نمبر ۱- کچھ بھی نہیں کرتے۔ نمبر ۲- یا کچھ بھی کام کی بات نہیں کرتے ہیں۔ نمبر ۳- یا وہ کام کچھ بھی نہیں کرتے ہیں جو مناسب حال ہو۔ ہم لوگ زبان سے تو یہ کہنے کے عادی ہیں کہ ہماری زندگی بہت تھوڑی ہے، لیکن ہمارے کام سے تو زندگی کے دن تمام ہونے کی طرف سے پورا اطمینان ٹپکتا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ ہم میں سے کُل تو نہیں مگر اکثر لوگ ایسے ہیں کہ جنکی زندگی اگر بیس حصّوں میں تقسیم کی جائے تو کم سے کم اُنیس حصّے ضرور خالی نظر آئینگے جنہیں [illegible] ہم کی خوشی کے حصول کا کوئی نشان نظر آئیگا اور نہ کسی کام کے کئے جانیکا کچھ پتہ چلیگا۔

حاشا و کلّا میں اِس تخمینے میں اُن لوگوں کی زندگی کو شامل کرنا نہیں چاہتا ہوں، جو اپنے کام میں برابر مستعدی کے ساتھ مشغول رہتے ہیں، بلکہ میری مُراد اُن لوگوں کی زندگی سے ہے، جو زندگی کے اِسٹیج پر کبھی یا برابر کام کرتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں اور میں اُمید کرتا ہوں اگر میں اُن کو اُن کی زندگی کے خالی حصص کو بھرنیکے لئے چند طریقے بتاؤں تو میرا ایسا کرنا کوئی غیر متوقع فعل نہو گا۔ وہ طریقے یہ ہیں۔

پہلا طریقہ تحصیلِ نیکی ہے، جس سے عام طور پر دوسروں کی بات سننے اور خوش عنوانی سے سمجھانیکا ملکہ حاصل ہو جائے، نادانوں کو نصیحت کرنا۔ حاجتمندوں کی حاجت برلانا، مصیبت زدوں کو آرام پہونچانا، یہ وہ فرائض ہیں جو ہماری زندگی کی راہ میں ہر روز واقع ہوتے رہتے ہیں۔ ایک آدمی کو اکثر ایک جماعت کی برہمی فرو کرنے

کسی مستحق کی حالت کیساتھ عدل برتنے، حاسدوں کے دلوں کو نرم بنانے، غصیل کا غصہ ٹھنڈا کرنے، اور متعصب کے قلب کی صفائی کرنے کے مواقع پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ وہ کام ہیں، جنکا سرانجام دینا بہت ہی ضروری اور مقتضاے عقل ہے، اور جو شخص اپنے کو ان کاموں میں عقل و شعور کے ساتھ مشغول رکھتا ہے اُسکو بہت بڑی تشفیِ خاطر حاصل ہوتی رہتی ہے۔

ایک اور دوسری قسم کی نیکی ہے کہ جسکا شغل اُن اوقات میں جب نہ کوئی ہمجلیس ہو اور نہ کوئی ہمکلام، بہترین شغل ہے، جس سے خلوت میں جلوت کا مزہ آتا ہے، اس سے میری مُراد وہ ربط و تعلق ہے جو ہر ایک ذی عقل مخلوق کو اپنے وجود کے بڑے موجد کے کیساتھ پیدا کرنا اور بڑھانا چاہیے۔ وہ شخص جو ہمیشہ اپنے مالکِ حقیقی کا دھیان رکھتا ہے سدا شگفتہ خاطر رہتا ہے، اور اُسکو ایک ایسا پائدار سرور حاصل ہوتا ہے کہ جس کے سایہ سے افسردگی نہیں کھٹکتی ہے۔

یہ وہ نشہ نہیں جسے تُرشی اُتار دے

ایسے شخص کو ایسی تسکینِ قلب اور تشفی بخش خوشی حاصل رہتی ہے، جس سے اُس کو پیارے سے پیارے اور اچھے سے اچھے دوستوں کی صحبت کا مزہ آتا ہے۔ گھڑیاں کبھی اسپر سخت نہیں گذرتیں۔ محال ہے کہ اُس کے نزدیک تنہائی کی کُلفت پھٹکنے پائے۔

میں نے یہاں پر آدمی کے نیک ہونے کی ضرورت صرف اس بنا پر بیان کی ہے کہ اسکو کوئی کام کرنے کے لئے ہاتھ آجائے، اور وقت رائگاں نہ جائے۔ لیکن اس سے بڑھ کر اگر یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ تحصیلِ نیکی کوئی وقتی تفریح نہیں ہے بلکہ اسکا اثر ہماری ذات کے ساتھ اُس عالم تک باقی رہتا ہے جہاں ہمیشگی کا پھریرا لہرا رہا ہے۔ اور جہاں ہم سب کو ایک دن ضرور جانا ہے اور یہ کہ یہاں ہم نے اپنے اوقات جسطرح کے اعمالِ نیک یا بد کے نذر کئے ہیں وہاں اسی کے

سطابق ہم کو نتائج بھگتنا پڑینگے ۔ تو وقت کو مذکورہ بالا طریقے پر صرف کرنے کے دلائل اور بھی قوی تر ہو جاتے ہیں اور نیکی حاصل کرنیکی ضرورت سب پر مقدم اور مسلّم ہو جاتی ہے ۔

فرض کرو کہ ایک آدمی کے پاس قلیل مقدار میں راس المال بڑھانے کے لئے ہے اور اُسکو اپنے کُل مال کو اچھے حساب میں تبدیل کرنے کے مواقع حاصل ہیں ۔ تو بھلا ایسے آدمی کے بارے میں کیا خیال کیا جائیگا اگر وہ اس میں سے اُنّیس حصّے یونہی بیکار پڑے رکھے اور بیسویں حصّے کو بھی ایسے کام میں لگائے جو اُسکی تباہی و فلاکت کا باعث ہو ؟ لیکن چونکہ دماغ ہمیشہ اپنی سرگرمی کی حالت میں نہیں رہ سکتا ہے اور نہ ہمیشہ درجۂ اعلےٰ کیطرف کھینچکر مائل رکھا جا سکتا ہے ۔ اس لئے ضرور ہے کہ اس کی حالتِ ادنےٰ کے مناسبِ حال بھی کوئی کام تجویز کیا جاے ۔

اس بنا پر استعمالِ وقت کا کوئی دوسرا طریقہ میرے خیال میں سفید و ناممنوع تفریح اور کھیل ہونا چاہئے ۔ مگر مجھے یہاں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ کُل ذی عقل مخلوقات کا ایسے کھیل میں منہمک ہو جانا جو ممنوع تو نہیں ہے مگر پسندیدگی کی کوئی بات اُس میں بجز اسکے اور کچھ نہو کہ وہ نقصان سے مبرّا ہے ، بعید از عقل ہے کیا کوئی کھیل اس ایک صفت سے بھی متصف ہے ؟ میں تو تعیّن نہیں کر سکتا ۔ بلکہ مجھے تو نہایت ہی تعجب اُسوقت ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ اصحابِ عقل و فہم اپنے وقت کا ایک درجن گھنٹہ تاش کے اُلٹ پھیر اور تقسیم میں ضائع کر رہے ہیں اور اس اِستغراق کے ساتھ کہ بجز اُس کھیل کے چند محاورات اُنکے کوئی دوسری قسم کی گفتگو درمیان نہیں آتی اور نہ سوا‌ے مختلف رنگوں کے اعداد و فرد کا خیال ضبط رکھنے کے کوئی دوسرا خیال اُن کے دماغ میں سماتا ہے ۔ اگر یہ لوگ زندگی کی کمی کی شکایت کریں تو کیونکر کوئی نہ ہنسیگا ۔

یہ تماشاگاہ تفریحِ طبع کے لئے سب سے زیادہ شریفانہ اور مفید دلبستگی کا ذریعہ ہوتی

اگر وہ موزوں و مناسب قواعد سے محصور ہوتی۔

لیکن دماغ اتنی رغبت سے کسی اور کام میں مشغول نہیں رہسکتا ہے جتنی سے کہ وہ کسی حمیدہ خصائل دوست کے سلسلۂ گفتگو میں۔ فی الحقیقت کوئی عطیۂ زندگی ایسا نہیں ہے جسکا مقابلہ اُس خوشی سے کیا جائے جو ایک سلیقہ شعار نیک دوست کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔ ایسے دوست کی صحبت سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ دلکو آرام پہونچاتی اور دماغی بوجھ کو ہلکا کرتی ہے، قوتِ فہمیہ کو صاف کرتی اور ترقی دیتی ہے، علم اور خیال پیدا کرتی ہے، نیکی اور اچھے ارادوں کا بیج بوتی ہے، غصّے کو دباتی اور تسکین دیتی ہے۔ اور زندگی کے خالی از کار اوقات کے لئے شغل نکال دیتی ہے۔

وہ آدمی، جو، گانے، رنگ آمیزی، دستکاری، اور معماری کا مذاق رکھتا ہے ایک دوسری قسم کا صاحب فہم و دانش سمجھا جاتا ہے، جبکہ اُسکا مقابلہ ایک ایسے شخص کیساتھ کیا جاتا ہے جو ان ہنروں میں سے کسی کا کچھ بھی مذاق نہیں رکھتا ہے۔ مالی، بونے والا، باغبان، کسان، اِن سب کو اُسی حالت میں جبکہ صاحب قسمت کے حق میں صرف اسباب تکمیل ہیں، ایک ملکی زندگی کے لئے سرچشمۂ امداد سمجھنا چاہئے۔ اور جن لوگوں کو ہر قسم کی خلاصی حاصل ہے اُن کے لئے بھی یہ لوگ بہت طرح سے مفید و بکار آمد پائے جاتے ہیں۔

لیکن زندگی کے کُل اشغال تفریح میں سے مفید اور دلچسپ کتابوں کے مطالعے سے بہتر اور موزوں شغل فرصت کے اوقات کو معمور کرنیکیلئے کوئی بھی نہیں ہے۔ لیکن اسکو میں یہاں پر صرف چھُو کر چھوڑ دونگا کیونکہ یہ طریقہ تیسرے طریقۂ متذکرۂ بالا کے حق میں بعض حیثیتوں سے داخل در معقولات کا مصداق ثابت ہوتا ہے، اِسلئے میں اسکو ایک خاص عنوان الگ قائم کرکے کسی وقت دکھلاؤنگا۔

مترجم۔ "ابوالکمال دیسنوی"۔

محنت اور عقل

اگر اُن مشہور اصحاب قلم کے عاداتِ مطالعۂ کتب کا ایک مختصر اور محققانہ خاکہ کھینچا جاوے، جنکی علمی محنت کے طرز کے ساتھ اکثر ہم لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے تو ایک نہایت ہی کار آمد بات ہو گی جب ہم یہ دکھا دینگے کہ بڑے بڑے شعرا، مقرّرین، مدبّرین سلطنت، اور مؤرّخین یعنی کُل اُن لوگوں نے جو چمکیلی اور شاندار لیاقت رکھنے والے ہیں حقیقت میں ویسی ہی سخت محنت کی ہے جیسی لُغت کے بنانیوالوں اور فہرست کتب طیار کرنیوالوں نے۔ اور سب سے زیادہ کُھلی وجہ اُن کی دوسروں پر بزرگی حاصل کرنے کی یہی ہے کہ اُنھوں نے دوسروں سے زیادہ تکلیفیں اُٹھائی ہیں، تو عقل اور کاہلی کے بیجا و فاسد اجتماع کا بہت دور تک بُطلان ہو جائیگا۔ گبن[1] اپنے مطالعے کے کمرے میں، موسم سرما ہو یا گرما، چھ بجے صبح کو داخل ہو جاتا تھا۔ برک[2]۔ طبقۂ انسانی میں سب سے زیادہ محنتی اور اَن تھک تھا۔ لیبنز[3]۔ اپنے کتبخانہ سے کبھی باہر نہیں ہوتا تھا۔ پسکل نے مطالعۂ کتب سے اپنی جان دی۔ سایسرو[4]۔ پڑھنے کی بدولت مرتے مرتے بچگیا، ملٹن۔ کتب بینی کا اُسیطرح پابند تھا جسطرح سوداگر اور وکیل اپنے پیشے کے ہوتے ہیں۔ اُسنے اپنے وقت کے کُل علوم پر پُورا عبور حاصل کر لیا تھا، ہومر کی بھی یہی حالت تھی۔ ریفیل[5]۔ کُل ۳۷ برس زندہ رہا۔ اِس تھوڑے عرصے میں اُسنے فنِ نقّاشی کو اُسکے

نمبر (۱)۔ ایڈورڈ گبن۔ ایک مشہور مؤرّخ۔ (سالِ پیدایش ۱۷۳۷ء سنہ وفات ۱۷۹۴ء۔ نمبر (۲) ایڈمنڈ برک۔ ایک مشہور مقرر اور مدبّر سلطنت۔ پیدایش ۱۷۲۹ء۔ وفات ۱۷۹۷ء۔ نمبر (۳) لیبنز۔ جرمن فلاسفر۔ پیدایش ۱۶۴۶ء۔ وفات ۱۷۱۶ء۔

نمبر (۴) سایسرو۔ رومن مقرر۔ پیدایش ۱۰۶ قبل مسیح۔ وفات ۴۳ء۔

نمبر (۵) ریفیل۔ ایطالین نقّاش۔ پیدایش ۱۴۸۳ء۔ وفات ۱۵۲۰ء۔

موجودہ وقت کے درجے سے اسقدر آگے بڑھا دیا کہ معلوم ہوتا ہے وہی ایک شخص ہی جو اپنے قائم مقاموں کے لئے نمونہ چھوڑ گیا ہے۔

دعویٔ مذکورۂ بالا کے خلاف بھی مثالیں ہیں مگر عموماً بڑے آدمیوں کی سوانح عمریوں میں یہی پایا جاتا ہے کہ جو کچھ اُن کی ناموری ہوئی وہ محنت ہی کی بدولت ہوئی۔ اُن کی سوانح عمری کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوگا کہ اُن لوگوں نے اپنی زندگی کا نصف اوّل حصہ غربت و افلاس کی مکروہ تاریکی میں گذارا ہے، نہ اُنکا کوئی خبر گیراں ہے نہ مددگار۔ اُن سے ہیٹی عقل والے اُن کو حقارت کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مگر وہ اپنی دُھن کے ایسے پکے ہیں کہ اِن باتوں کو کچھ خیال میں نہیں لاتے۔ تم دیکھوگے کہ جب سب خواب استراحت میں ہیں تب وہ سوچ رہے ہیں، جب لوگ سرگرمِ عیش و عشرت ہیں تب وہ پڑھ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندرونی اثر ہے جو اُن کی دلجوئی ان لفظوں سے کررہا ہی "گھبراؤ نہیں۔ تم ہمیشہ دنیا کے طبقۂ ادنےٰ پر نہ رکھے جاؤگے، بلکہ ایک دن فخرِ روزگار بنوگے"۔ چنانچہ وہ وقت آیا اور موقع نے بھی ہاتھ بڑھایا تو ان لوگوں نے تاریکی سے نکلکر عامیانہ زندگی کے اُس میدان میں قدم رکھا جو عزت و تمکنت کی روشنی سے منور تھا۔ وہ تمکو غنیمت اوقات سے مالامال اور دماغی جدّ و جہد اور محنت کے میدان کے قوی رہ نورد نظر آئینگے، لوگ ان میں سے کسی ایک کی علمی معراج کو دیکھکر پکار اُٹھتے ہیں "عقل کا اعجازی پُتلا" ہاں وہ عقل کا اعجازی پُتلا ہے اور کیوں نہو؟ وہ محنت کا بھی تو اعجازی پُتلا ہے، صرف اپنی ہی تدابیرِ دماغی پر بھروسہ کرنیکے بدلے اُسنے ہزاروں دماغ کو چھان مارا ہے۔ وہ پُشتہا پُشت کے فراہم کردہ موادِ عقل سے فائدہ اُٹھاتا ہی اور اپنے کو اُس آخری خط یا جو حدی پر پہنچاکر چھوڑنا چاہتا ہے جہاں تک کہ علم نے ترقی کی ہے کیونکہ اُسنے ہمیشہ اپنی زندگی کا مقصد یہی رکھا ہے کہ فطرت کے ہر ایک دماغی عطیہ کی مدد اُس ہر ایک تدبیر سے کرتے رہنا چاہیئے جسکا خیال علم کے ذریعے سے دل

میں پیدا ہوا اور جہاں تک محنت اجازت دے، اُس میں غور و فکر سے کام لینا چاہیے ۔

اِسلئے اگر کسی نوجوان نے اپنی زندگی تحصیل علم میں مشغول کر دی ہے تو اُسکو چاہیے کہ بلا خوف اور شک حصول نتائج اپنا کام کئے جائے ۔ اُسکو علم کے ابتدائی ناخوشگوار مزے تاریکی، مشکلات، احتیاج، اور غم سے جو بعض وقت تحصیل علم کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکاتے ہیں، بھڑکنا نہیں چاہیے ۔ بلکہ اُسکو اپنے محافظ فرشتوں کیطرح علم کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے، یہی علم آخرش اُسکو روز روشن دکھلائیگا ۔ اور دُنیا دیکھیگی کہ وہ اکتساب کے خزانے کا مالک ہے ۔ قوتِ متخیلہ سے مالامال ہے، گنجینۂ تدابیر ہے ۔ مباحثِ عقلی میں مُستحکم و مضبوط ہے، اور عقل و وقوف میں اپنے ساتھیوں سے ممتاز ہے ۔

"ابوالکمال دسنوی"

کیا عورتیں فطرۃً ناقص العقل ہیں؟

※

ہمارے وہ دوست جو آزادیِ نسواں کے دشمن اور رسم و رواج اور اِلف و عادت کے طوقِ غلامی میں اسیر ہیں، اور جنکو بیچارے فرقۂ نسواں سے للّٰہی بُغض و عداوت ہے، ہمیشہ اِس بات پر نہایت زور دیا کرتے ہیں کہ عورتیں ناقص العقل ہیں اور اُن کے قوائے دماغی مردوں کے قوائے دماغی کے مقابلے میں بہت کمزور ہیں، اور عورتوں کے اِس سُقم و نقص کو اُن کی سلبِ حُرّیت کی وجہ ٹھیراتے ہیں ۔ اگرچہ ہمارے دوستوں کا یہ دعوےٰ بلا دلیل بھی منجملہ اُن دیگر ابلہ فریب دلائل کے ہے، جنکو ہمارے فاضل دوست محض اپنے دلوں کو خوش کرنے کے لئے گڑھ لیتے ہیں، لیکن چونکہ ہماری قوم کے اکثر افراد عموماً اِس مرضِ متعدّی میں سرتاپا گرفتار ہیں کہ جب کوئی رسم و رواج کے سانچے میں ڈھلی ہوئی جھوٹی بات بھی اُن کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو وہ بلا کسی تردّد اور بلا کسی پس و پیش کے اُسے فوراً مان لیتے ہیں ۔ اور جب کوئی بندۂ خدا اُس کے خلاف کچھ بولتا ہے

تو وہ کبھی اسکی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ صدق و کذب کی جانچ کریں، اور اپنی قوتِ فیصلہ سے کبھی کچھ کام لیں۔ اِسلئے ہمارے دوستوں کو عوام النّاس کی اِس کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کا خوب موقعہ ہاتھ آیا اور سبھوں نے بنی نوع انسان کے اس نصف حصّہ پر اپنی جھوٹی فضیلت قائم کرلی۔ بلا کسی استدلال کے مرد اعلےٰ اور عورتیں رذیل و ذلیل افرادِ انسانی تسلیم ہوگئے۔ اور اِسلئے عورتیں مردوں کے مظالم و نفس پرستیوں کا تختۂ مشق قرار پائیں۔

لیکن اگر حقیقتِ امر پر غور کیا جائے، اور انصاف پسندی و راستبازی کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو صاف طور سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عورتیں قوائے دماغی میں مردوں سے کسیطرح کم نہیں ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ اِس مسئلے پر رائے زنی کرنے سے پہلے اُن بڑے بڑے حکمار و علمائے فزیالوجی کے فیصلوں پر بھی غور کرلیں، جنھوں نے سالہا سال تک نہایت باریک بینی محنت اور جانکاہی سے عورت کے نیچر کی تحقیقات کی ہے۔ کیونکہ بغیر اسکے صرف اپنی قوتِ واہمہ سے کام لینا ہمکو صحیح نتیجے کے استخراج سے باز رکھیگا۔ ڈاکٹر **لسبکوف** کی تحقیق ہے کہ:—

"عورت کے دماغ کا وزن (۹۰) اور مرد کے دماغ کا وزن (۱۰۰) ہے مگر عورت کے جسم کا وزن (۸۳) اور مرد کے جسم کا وزن (۱۰۰) ہے"

ڈاکٹر **ویروڈ** کہتا ہے۔ کہ:—

"وزنِ جسم کے لحاظ سے عورت کا دماغ مرد کے دماغ سے وزنی اور بڑا ہے"

پروفیسر **موننٹی جازا** اپنی کتاب "عورتوں کی فزیالوجی" میں لکھتا ہے کہ:—

"اِس بات پر بحث و مباحثہ کرنا کہ عورتوں کا دماغ مردوں کے دماغ سے چھوٹا اور وزن میں کم ہے اور اُسکے پردہاے محافظِ دماغ بہ نسبت اُن کے جو مردوں کے دماغ میں پائے جاتے ہیں، کمزور ہیں، بالکل بے سُود اور عبث ہے۔ کیونکہ اِس

اختلاف سے مردوں اور عورتوں کے قوائے عقلیہ کا اختلاف ثابت نہیں ہوتا ......
.... مرد کس قدر خود غرض اور مغرور ہیں کہ اپنی بڑائی کے زعم میں علم تشریح میں بھی مکروفریب سے باز نہیں آتے اور صرف اس بات پر قناعت نہیں کرتے کہ عورتوں کی نسبت دنیا میں وہ نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں بلکہ زبردستی سے اس بات کا دعوے کرتے ہیں کہ عورتیں اُن کے مقابلے میں ادنے صنف انسانی ہیں اور اُن کی اور بندروں کے درمیان ایک برزخ ہیں۔ اور اس دلیل کی بنا پر وہ عورتوں کے فطری حقوق کو غصب کرتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ وُہی اِن کی مائیں ہیں۔ لیکن حقیقۃ الامر یہ ہے کہ علم تشریح کی رو سے مرد اور عورت میں کچھ بھی فرق نہیں۔ نہ عورتوں کی جسمانی ترکیب مردوں کی جسمانی ترکیب سے کمتر ہے اور نہ اِس لحاظ سے مردوں کو عورتوں پر کوئی فضیلت و فوقیت ہے۔ اگر دونوں میں کوئی اختلاف ہے تو اسکا سبب اُن کے مختلف کام اور مختلف فرائض ہیں۔"

پروفیسر فرشلو کہتا ہے کہ:—

"میں نے ریاضی۔ علم الاخلاق اور فلسفہ کی تعلیم مدّتوں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ دی ہے۔ مگر میں نے اِن دونوں میں سے کسیکی لیاقت اور قابلیت میں کوئی فرق نہیں پایا۔ بلکہ دونوں کے درجوں کی نسبت ہمیشہ مساوی رہی ہے۔"

ایک نہایت ہی مستند کتاب "مین اینڈ ومین" میں لکھا ہے کہ:—

بہت سے بڑے بڑے مشہور و معروف ڈاکٹروں شلاً کلین ونگ۔ ٹیڈمین۔ ریڈ۔ ویگز، ولسیبیق وغیرہ جنھوں نے اپنی ساری عمر انسانی دماغ کی تحقیقات اور تشریحات میں صرف کی ہے، مرد و زن کے دماغی فرق کو صحیح طور سے دریافت کرنیکے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ مرد اور عورت کے دماغ کا وزن اُن کے جسم کے وزن کی نسبت سے جانچا جائے۔ واقعی یہ طرزِ استدلال زیادہ تر اصولِ منطق پر مبنی ہے

اِس مستحکم منطقی اُصول کیساتھ مرد و زن کے دماغ جانچنے سے یہ بخوبی ثابت ہوا ہے کہ مردوں کے دماغ کی بہ نسبت عورتوں کا دماغ یا تو زیادہ ہے، یا مساوی ہے۔ کئی سال ہوئے کہ اِس بات کو انگلستان، فرانس، اور جرمنی میں ڈاکٹر پارچینی، ڈاکٹر ٹیڈمین، ڈاکٹر تھرنام، وغیرہ نے دریافت کیا تھا۔ حال ہی میں ڈاکٹر بسکوف نے بھی اپنی مبسوط کتاب میں، جو صرف دماغ انسانی کی بحث میں لکھی گئی ہے، یہ لکھا ہے کہ "عورت کے دماغ کا وزن (۹۰) اور مرد کے دماغ کا وزن (۱۰۰) ہے مگر عورت کے جسم کا وزن (۸۳) اور مرد کے جسم کا وزن (۱۰۰) ہے۔" ڈاکٹر ویرو ڈ نے بھی اسی طرح اِس مر واقعی کو دکھایا ہے اور لکھا ہے کہ "وزنِ جسم کے لحاظ سے عورت کا دماغ مرد کے دماغ سے وزنی اور بڑا ہے۔" لہٰذا اب یہ بات بخوبی پایۂ ثبوت کو پہونچگئی ہے کہ عورت کا دماغ یا تو مرد کے دماغ سے زیادہ ہے یا مساوی ہے۔"

غرض اسیطرح کی بیسیوں دلیلیں بڑے بڑے حکما اور علما کی اِس بارے میں ملتی ہیں کہ مرد اور عورت کے قُوائے دماغی میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ علم تشریح کی تحقیقات کی رو سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عورتوں کے دماغ مردوں کے دماغ سے کمزور نہیں تو بڑے ہیں۔ کیونکہ اِس بات کو ہر شخص جانتا ہے کہ سالہا سال سے عورتیں مردوں کی خطرناک غلامی میں گرفتار ہیں اور مردوں کا جابرانہ برتاؤ ہمیشہ اِن بیچاریوں کو ذلت کے انتہائی درجے میں رہنے پر مجبور کرتا رہا ہے اور کبھی ان کو اپنی خلقی اور طبعی قوتوں سے کام لینے کا موقعہ نہیں دیا گیا ہے۔ برخلاف اِسکے مردوں نے ہمیشہ اپنی فطری قوتوں سے کام لیا ہے اور میدان علم و عمل میں ہزاروں برس سے برابر دوڑ دھوپ کرتے رہے ہیں اِسلئے یہ بات لازمی تھی کہ اِن دونوں کے قوائے دماغی میں بہت بڑا بیّن فرق پڑجاتا لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ عورتیں اپنی اِس گئی گذری حالت میں بھی جبکہ اِن کے نیچر میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا ہے اور اِن کی صحتِ جسمانی اور نظامِ اعصاب میں خرابی پیدا ہوگئی ہے

قوائے دماغی میں مردوں سے کسیطرح کم نہیں ہیں تو یہ صاف بات ہے کہ اگر ان کو اپنے قوائے عقلیہ سے کام لینے اور اُسکو ڈولپ کرنے کا موقعہ دیا جاتا تو اُن کے قوائے دماغی کی مردوں کے قوائے دماغی کے مقابلے میں کیا حالت رہتی؟ مصر کے ایک فاضل مصنف **عزت لو قاسم بک امین** نے اپنی بے نظیر کتاب "تحریر المرأۃ" میں عورتوں کی موجودہ حالت کے بارے میں لکھا ہے کہ:-

"عورتیں بھی مردوں کیطرح انسان کی جنس میں داخل ہیں - اگر دونوں کی جسمانی ترکیب پر غور کرو تو صاف معلوم ہوگا کہ اعضاء - حواس - عقل و فکر - جذبات و خیالات اور اُن تمام باتوں کے لحاظ سے جو انسان ہونے کے لئے درکار ہیں، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے - موجودہ حالت میں جسمانی اور رُوحانی قوتوں کے لحاظ سے مردوں کو عورتوں پر جو فضیلت اور فوقیت حاصل ہے، اُسکا سبب یہ ہے کہ مرد ہزاروں برس سے علمی اور عملی ترقیوں کے میدان میں برابر دوڑتا رہا ہے - اور عورت ان قوتوں کے استعمال سے محروم رہی ہے - اور ایسی پست حالت میں رہنے پر مجبور کیگئی ہے جو بلحاظ مختلف زمانوں اور ملکوں کے مختلف رہی ہے"

ہمارے اکثر دوست عورتوں کی متلون مزاجی - زُود اعتقادی - کوتاہ اندیشی ، بیصبری، ناسعاملہ فہمی، اور جلد بازی وغیرہ کو اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ان باتوں میں مردوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے اور ان کو ناقص العقل ٹھیراتے ہیں، لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ عورتوں کی موجودہ حالت کب اس بات کی مقتضی ہے کہ اُن کا مردوں کے ساتھ تقابل کیا جائے - کیا ہم ایک ایسے بیل کی نسبت جو کولھو میں بندھا ہوا اور ایک ہی جگہ گردش کرنے پر مجبور ہو یہ رائے قائم کرسکتے ہیں کہ اس میں اپنے محور سے آگے چلنے پھرنے یا دوڑنے کی طاقت نہیں ہے؟ یا ایک شیر کے بارے میں جو پنجرے میں بند ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسمیں آدمیوں پر حملہ کرنیکی

قوت نہیں ہے؟ یا ہم ایک چڑیا کو جو قفس میں ہے، اُڑنے کے ناقابل سمجھ سکتے ہیں؟
اگر ہم اس بیل و شیر اور چڑیا کے حرکات و افعال کا مقابلہ ایک ایسے بیل اور شیر اور چڑیا سے کریں، جو بالکل آزاد ہیں، اپنے آپ مالک ہیں، حرکات و افعال اور ارادوں میں مستقل بالذات ہیں تو ہمارا یہ باہمی تقابل کسقدر قابلِ مضحکہ ہوگا۔ اسیطرح ہم کیونکر مقابلہ کر سکتے ہیں عورتوں اور مردوں کا جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نہایت ادنےٰ اور جاہل و ان پڑھ مرد بھی ایک بڑی معزز خاتون سے مقابلۃً اپنی حریت سے کامل طور پر متمتع اور اگر اپنے قوا سے عقلیہ کو علم کی ایک شاخ یعنی مطالعے سے مکمل و پختہ نہ کر سکا تو علم کی دوسری شاخوں یعنی مشاہدہ اور تجربہ وغیرہ سے ڈولپ کر لیتا ہے۔ افسوس ہم عادت اور نیچر میں تمیز نہیں کر سکتے اور عارضی اسباب سے جو مصنوعی فرق پیدا ہو گیا ہے اُسکو طبعی اور خلقی فرق سمجھے ہوئے ہیں۔

اگر عورتیں فطرۃً ناقص العقل ہوتیں تو خداوند عالم جو عورتوں کے نیچر سے ہم سے زیادہ واقف ہے کبھی اُن کو قابل بازپرس اور اپنے کردار و افعال کا جوابدہ نہ ٹھیراتا۔ اُس حکیم مطلق کے احکام مرد و عورت دونوں کے بارے میں بالکل ایک ہیں۔ ناقص العقل عورتوں اور کامل العقل مردوں کے افعال کی جزا و سزا میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔ یہ بات لازمی تھی کہ عورتیں اپنے نقص عقل کیوجہ سے نیک و بد کے ثواب و عذاب سے مستثنٰے ہوتیں لیکن نہ تو کسی ربانی قانون نے کوئی اس قسم کی مراعات عورتوں کے ساتھ کی ہے اور نہ کسی شرع میں عورتوں کی ذمہ داریاں مردوں سے کم ہیں۔ اور اگر انسانی قانون اور رسم و رواج کو دیکھا جائے تو عورتیں مردوں سے بھی زیادہ قابلِ بازپرس ہوتی ہیں۔
غرض دنیا میں کوئی ایسی حجتِ شرعی یا برہانِ منطقی نہیں ملتی جس سے عورتوں کا فطرۃً ناقص العقل ہونا ثابت ہو سکے۔ لہذا ہمارے دوستوں کا صرف بعض عارضی اسباب اور خاص خاص قسم کے تمدن اور معاشرت کیوجہ سے جو کچھ مصنوعی فرق پیدا ہو گیا ہے اسکی بناء پر عورتوں کو فطرۃً ناقص العقل کہنا کسقدر قابلِ مضحکہ ہوگا۔ ہم اپنے اس قسم کے

دوستوں کی خدمت میں فرقۂ نسواں کی طرف سے یہ چھوٹی سی نظم جو اُن کی موجودہ حالت سے بہت کچھ مناسبت رکھتی ہے عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے:—

وَهُوَ هٰذَا

"چاندی کی انگوٹھی پہ جو سونیکا چڑھا جھول — اوچھی تھی لگی بولنے اِترا کے بڑا بول

چاندی کی انگوٹھی سے کہ نہ میں ساتھ رہونگی — وہ اور ہی میں اور، یہ ذِلت نہ سہونگی

میں قوم کی اونچی ہوں بڑا میرا گھرانا — وہ ذات کی گھٹیا ہے نہیں اُسکا ٹھکانا

میری سی چمک اُسمیں نہ میری سی دمک ہے — چاندی ہے کہ رانگ مجھے اِسمیں بھی شک ہے

میری سی کہاں چاشنی، میرا سا کہاں رنگ؟ — وہ مول میں اور تول میں میرے نہیں پاسنگ

اے دیکھنے والو! تمھیں انصاف سے کہنا — چاندی کی انگوٹھی بھی ہے کچھ گہنوں میں گِنا؟

یہ سُنتے ہی چاندی کی انگوٹھی بھی گئی جل — اللہ رے ملمع کی انگوٹھی تری چھل بل

سونیکے ملمع پہ نہ اِترا مری پیاری! — دو دِن میں بھڑک اِسکی اُتر جائیگی ساری

کچھ دیر حقیقت کو چھپایا بھی تو پھر کیا؟ — جھوٹوں نے جو سچّوں کو چڑایا بھی تو پھر کیا؟

مت بھول کبھی اصل کو اپنی، اری احمق! — جب تاؤ دیا جائیگا ہو جائیگا مُنہ فق۔

سچّے کی تو عزت ہی بڑھیگی جو کریں جانچ — مشہور مثل ہے کہ نہیں سانچ کو کچھ آنچ

کھوٹے کو کھرا بن کے نکھرنا نہیں اچھا — چھوٹے کو بڑا بن کے ابھرنا نہیں اچھا"

(ملمع کی انگوٹھی)

جو لوگ ہمیشہ عورتوں کے فطرۃً ناقص العقل ہونیکو ثابت کرنے کے درپے رہتے ہیں اور سراسر بے اصل اور لاطائل دلائل سے عامۂ خلائق کو دھوکا دیتے، تعصب سے حق کو چھپاتے، بندگانِ خدا کو جان بوجھ کر بہکاتے اور گمراہ کرتے، لوگوں کے تعصب اور جہالت و ناواقفیت سے فائدہ اُٹھاتے اور اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھتے ہیں، اُن کو چاہیے کہ یورپ و امریکہ ممالکِ متمدنہ کے عورتوں کی حالت پر غور کریں۔

پچھلے چند ہی سال میں اِن مقامات کی عورتوں نے جو ترقیاں کی ہیں وہ اِس بات کی کافی شہادت ہیں کہ عورتوں میں نیچرل طور پر نقصِ عقل نہیں ہوتا۔ مہذب و ترقی یافتہ ممالک میں کونسا ایسا شعبۂ علمی ہے جس میں وہاں کی خواتین نے بے اِنتہا ترقی نہیں کی ہے۔ اِسی بنا پر بعض اہل الرّاے کہتے ہیں کہ اِس صدی کے اختتام تک عورتیں مردوں سے علم و کمال اور ترقی کے میدان میں ہزاروں میل آگے بڑھ جائینگی۔ اِس کے علاوہ خود ہمارے ملک میں اور ہماری اِس گئی گذری حالت میں کئی مثالیں اِسی قسم کی ملتی ہیں۔ پارسی اور ہندو عورتوں کو چھوڑ کر صرف مسلمان عورتوں ہی کو لیجیے۔ بعض نادر الوجود خواتین اِن میں بھی ایسی ہیں (بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ گذشتہ چند سال سے آزادیِ نسواں اور تعلیم نسواں کی جو چیخ پکار کی جاتی ہے اُسکی بدولت پیدا ہوگئی ہیں) کہ اُن کا علم و فضل باوجود اِس کے کہ ان کی تعلیم پردے کی بدولت غیر مکمّل رہتی ہے، اکثر تعلیم یافتہ مردوں سے کم نہیں ہوتا اِن کے علم و فضل، اِن کی لیاقت، اِن کی فراست و دانائی کا ثبوت اِس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ اِن کے نہایت اعلےٰ درجے کے پاکیزہ مضامین کی نسبت جو وقتاً فوقتاً "خاتون" میں شائع ہوا کرتے ہیں، ہمارے اُن دوستوں کو جن کے خیال میں عورتوں کا آئیڈیل بالکل انسان نما بندر کا ہے، یہ یقین ہے کہ ان کے لکھنے والے "داڑھی والی عورتیں" ہوتی ہیں — پس یہ کسقدر حیرت و استعجاب کی بات ہے کہ خود مشاہدہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ عورتیں فطرتاً عقل میں مردوں سے کم نہیں ہیں۔ فرقۂ نسواں کو ناقص العقل کہنا بالکل جھوٹ اور سراسر بے اصل ہے، لیکن ہمارے انصاف پسندی و راستبازی کی ڈینگیں مارنیوالے۔ ہمکو کافر، مردود، مرتد۔ ملعون وغیرہ کیا کیا کہنے والے نہایت ایماندار و پاکباز، مذہب اسلام کے سچے حامی اور پیرو۔ برگزیدۂ بارگاہ خداوندی دوست اپنے اِسی بے سرے راگ کے الاپنے میں منہمک و مستغرق ہیں کہ عورتیں ناقصاتُ العقل ہیں۔ خداوندِ عالم نے اُنھیں ناقص العقل پیدا کر کے مردوں کا

محکوم بنایا ہے اور مردوں کو ان پر فضیلت دی ہے۔

بفرض محال اگر ہم عورتوں کو فطرۃً ناقص العقل مان بھی لیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ناقص العقلی سلب حرّیت کیوجہ اور فطری حقوق کے غصب کرنیکا باعث ہوسکتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو کتنے مرد ایسے نکلینگے جو عقل وشعور میں عورتوں سے بدرجہا کم ہیں۔ پھر کیوں نہیں ان سے بھی ایسا سلوک کیا جاتا۔ اگر عقلوں کا اختلاف انسان کو آزادی سے محروم کرنیوالا ہے تو پھر ہمکو یہ بھی ضرور ماننا پڑیگا کہ اہل یورپ جنکی عقل کے کرشموں کا ایک عالم معترف ہے اور جنکی عقل کی ضیا ہماری آنکھوں کو خیرہ کررہی ہے۔ اس بات کا ہم پر حق رکھتے ہیں کہ ہمکو اپنا غلام سمجھیں اور ہمیں حرّیت سے متمتع نہونے دیں۔ اسکے ساتھ ہی ہمکو یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہمارے قوائے عقلیہ نہایت کمزور ہیں اور بمقابل ہمارے اہل یورپ کے قوائے عقلیہ نہایت قوی واعلےٰ ہیں لیکن جب ہم اہل یورپ کی کسی فضیلت وتفوق (من حیث الانسان) کے قائل نہیں ہیں تو پھر کس منہ پر اس بات کا دعوےٰ کرسکتے ہیں کہ انہی امور کیوجہ عورتیں ہم سے کمتر درجہ رکھتی ہیں، اور ہماری محکوم ہیں

غرض کسی طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتی کہ عورتیں فطرۃً ناقص العقل ہیں اور ہم کو اُن پر کسی قسم کی فضیلت و برتری حاصل ہے۔

لہذا ہمارا موجودہ طرز عمل جس سے خدا کی مخلوق کی اتنی بڑی حق تلفی ہورہی ہے جسکی بدولت بنی نوع انسان کے بہترین حصّے کا دن دہاڑے قتل ہورہا ہے۔ محض ہمارے سراسر ظلم۔ تعصب۔ خودپسندی۔ خودغرضی۔ اور نفس پرستی پر مبنی ہے۔ پس اے ہمارے مہربان دوستو! خدا کے غضب سے ڈرو۔ اُس منصف حقیقی کے عدل و داد کا خیال کرو۔ یاد رکھو! تمھارا اسطرح آستینیں چڑھا چڑھا کر حامیان نسوان کی سچی باتوں پر اُلجھنا اُس قادر مطلق کی بارگاہ میں کام نہ آئیگا۔ کیا جواب دوگے جب تم سے تمھارے ان کرتوت کے بارے میں پوچھا جائیگا کہ کیوں عورتوں

کو قید رکھا؟ انھیں ہر قسم کی جسمانی و روحانی مصائب میں گرفتار کیا؟ طرح طرح کی تکلیفیں دیں؟ اپنی نہایت جھوٹی اور بے اصل فضیلتیں ثابت کرکے انپر بیجا جابرانہ۔ ظالمانہ، اور وحشیانہ حکومت کی؟۔ اُن کے فطری حقوق غصب کئے۔ اور طرح طرح کے مظالم و زیادتیوں کا نشانہ بنایا؟ نظامِ عالم کو درہم و برہم کرنے کی کوشش کی ———؟ شاید تمھارے دل میں یہ خیال ہوگا کہ اُسوقت عورتیں اپنی فطری فیاضی اور فراخ حوصلگی سے تمھاری تمام خطائیں معاف کر دینگی، اور تمھیں خداوند تعالےٰ کے غضب و غصہ سے بچالینگی، مگر کہیں اسی پر نہ بھُول بیٹھنا۔ بیشک عورتیں رحمدل ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ہی وہ ایسی سرکش، نافرمانبردار، محسن کُش اور احسان فراموش نہیں ہیں کہ اُس منتقمِ حقیقی کے خلاف مرضی کوئی کام کریں۔

راقم

سیّد خورشید علی۔

حیدرآباد دکن۔

امام احمدؒ بن حنبل رح

امام صاحب نے جس درجہ شہرت اور عام مقبولیت حاصل کی اسکا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ تعصب کے دائرے سے باہر ہونے کے بعد اس جامع شخص کی تمامتر علمی کوششوں کے زیر بار احسان ہونا پڑتا ہے، لیکن افسوس کہ ابتک اِس نامور کی قابل قدر لائف سے بالکل لوگ بیخبر ہیں۔ اِس بنا پر ہم اس آرٹیکل میں امام صاحب کے خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے اُن کے چند اصول اور مسائل بھی بیان کرینگے، جن سے امام صاحب کی علمی زندگی کا معیار بخوبی قائم ہوسکیگا۔

گو امام صاحب کی عام حالت بھی دلچسپی سے خالی نہیں لیکن اختصار مدِنظر رکھکر

اس سے قطع نظر کرتے ہوئے اُن کی قابلِ قدر لائف کے بعض حیرت انگیز سبق کو بھی زیر نظر رکھینگے۔

نسب امام ابو عبداللہ احمد بن حنبل بن ہلال بن اسد بن ادریس بن عبداللہ بن حیان بن عبداللہ بن انس بن عوف بن قاسط بن مازن بن شیبان بن ذہل بن ثعلبہ بن عکابہ بن صعب بن علی بن بکر بن وائل بن قاسط بن ہنب بن اقصیٰ بن دعمی بن جدیلہ بن ربیعہ بن نزار بن معد بن عدنان الشیبانی المروزی؛ ہذا ہو الاصح۔

گو امام صاحب کے نسب میں جس درجہ اختلافات کی بھرمار ہے اِس کے لحاظ سے کوئی قطعی فیصلہ کرنا ایک امرِ دشوار تھا لیکن تتبع و تلاش کا یہ ایک لازمی نتیجہ تھا۔

پیدائیش امام صاحب کی والدہ شہر مروؔ سے بغداد گئیں۔ اور وہیں آپ ربیع الاول کے مہینے ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے[1] لیکن بعض روایتوں سے اِسکے برعکس ثابت ہوتا ہے۔

تحصیلِ علم کے لئے مختلف مقامات کا سفر و اساتذہ۔ امام صاحب نے اُسی قرب وجوار میں تحصیل علم کی۔ حدیث کی سماعت کے لئے وطن کو چھوڑکر کوفہ، بصرہ، مدینہ، یمن، اور شام کی سیاحت کی۔ امام صاحب سعید بن قطان۔ سفیان بن عیینہ۔ محمد بن اسمٰعیل۔ مسلم بن حجاج۔ جیسے[2] اشخاص کے فیضان تعلیم کے زیادہ ممنون ہیں۔

مسئلۂ خلق قرآن اور انتقال زمانے کی نیرنگیوں پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد یحییٰ دمیت[3] کا خیال نہایت وسعت کیساتھ دل میں جگہ پاتا ہے۔ امام صاحب جیسے شخص کا بغداد کی سرزمین سے اُٹھ جانا ایک غیر معمولی حادثہ سے کم نہ تھا لیکن یحییٰ دمیت کا تطابق بجز ان تغیرات عالم کے ممکن بھی نہ تھا۔ خلق قرآن کا مسئلہ ایک زمانے سے اشاعرہ و معتزلہ کے درمیان پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اب تک وہ اپنی پُرانی روش پر قائم تھا۔ خلفائے بنو عباس سے جبکہ مامون الرشید کا بغداد پر دَور دَورہ تھا یہ مسئلہ نہایت ہی ناز و نعم سے

[1] دیکھو تاریخ ابن خلکان صفحہ ۳۰ قلمی۔ [2] از تاریخ ابن خلکان صفحہ ۳۰ قلمی۔ [3] دیکھو ابن خلکان صفحہ ۱۳۱ قلمی

قاضی احمد بن داؤد کی گود میں پرورش پایا تھا، قاضی صاحب نے رفتہ رفتہ خلیفہ مامون الرشید کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا جسکی وجہ سے قاضی صاحب کا پہلو اور بھی قوی ہو گیا، ۲۱۸ھ میں جبکہ مامون الرشید نے وفات پائی اور اُن کے بھائی معتصم باللہ دار الخلافت کے متولی ہوئے اُسوقت مامون الرشید نے یہ وصیت کی کہ تم ہمیشہ قاضی احمد بن وداد کے قدم بقدم رہنا اور اُن کی راے سے ہر کام کو انجام دینا۔

قاضی صاحب نے اپنے میں وسعت پاکر چاہا کہ دربارۂ حدوث قرآن تمام علما و مشائخ ہمارے مؤید اور ہم خیال بن جائیں، اس بناپر ایک اعلان دیا گیا کہ جو شخص اس سے اعراض کریگا وہ فوراً تہ شمشیر کیا جائیگا۔

خلیفہ کی اس ظالمانہ حرکت نے بغداد میں ایک عجیب تہلکہ پیدا کردیا، کسی کے ہوش و حواس قائم نہ تھے، ادھر تو قتل کا خیال اودھر خدا کا خوف غرض مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی هٰؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰؤُلَآءِ کا مضمون تھا۔

بعض علما نے تو موافقت ظاہر کی، اور بعض چھپ گئے لیکن اکثروں نے اعراض کرکے شہادت کا درجہ حاصل کیا۔

علی سبیل البدلیت امام صاحب تک نوبت پہونچی، چونکہ امام صاحب دیندار آدمی تھے اسلئے اُن کو مخالفت کرنے میں ذرا بھی تاٗمل نہ ہوا، گو قاعدہ کے لحاظ سے امام صاحب کی موت کا وقت سر پر آچکا تھا، لیکن قاضی صاحب کی غیور طبیعت نے عین وقت پر امام صاحب کو بچالیا جسکی علت غائی یہ تھی کہ احمد بن حنبل کا ہماری موافقت کرنا ایک بہت بڑے گروہ کا ہمارے ہم خیال بنالینا ہے - لہذا امام صاحب محبوس کردیے گئے امام صاحب نے اٹھائیس ۲۸ مہینے قید خانے کی مصیبت کو جھیل کر جمعہ کے دن ربیع الاوّل کے مہینے ۲۴۱ھ سنہ دو سو اکتالیس میں ایک ہفتے کی بیماری کے بعد وفات پائی اس وحشت ناک خبر نے تمام بغداد میں

ـــــــــــــــــ

۱ علما خلق قرآن کے ایسے مخالف تھے جیسے کوئی مسلمان مذہبی حیثیت سے کسی کافر کا جانی دشمن ہو۔ ۱۲

ہل چل مچادی۔

باوجود اِس بات کے کہ امام صاحب ۲۸ مہینے لوگوں کی نظروں سے غائب رہے، لیکن امام صاحب کیواسطے لوگ ماہی بے آب ہو رہے تھے۔ لوگ جوق جوق آتے تھے اور جنازے کی نماز بار بار ہوتی تھی مُصلّیین کی تعداد یہ ہے، مرد - ۸ لاکھ۔ عورت ۶۰ ہزار امام صاحب کے انتقال کے دن بیس[1] ہزار یہود، مجوسی، نصاریٰ مسلمان ہوئے۔ امام صاحب باب حرب[2] میں دفن کیے گئے۔

اِس واقعہ کو مؤرخوں نے یوں بھی قلمبند کیا ہے کہ مامون قاضی احمد بن دواد کے عقیدے کے موافق کلام اللہ کے حدوث کا قائل تھا اور امام احمد بن حنبل قدیم مانتے تھے۔ خلیفہ کے حکم سے دونوں میں مناظرہ ہوا۔ آخر ابن ابی دواد بحث میں غالب آئے امام احمد بن حنبل سے گو جواب نہ بن سکا مگر اُنھوں نے اپنی زبان سے حدوث قرآن کا اقرار نہ کیا، اپنے عقیدے پر قائم رہے۔ بلکہ اور ترقی ہوگئی۔ معتصم باللہ نے تازیانے لگانے کا حکم دیا ۳۳ کوڑے لگائے گئے، اور قید خانے میں بھیجے گئے۔

قاضی احمد ابن ابی دواد نہ صرف مامون کے ہم خیال ہونیکی وجہ سے مقرّب بارگاہ تھے بلکہ اُن کی کارنمایاں ترقیوں نے جو دفعتًا حاصل ہوئی تھیں۔ خلیفہ کے دل میں اپنا سکّہ بٹھالیا۔ گو قاضی احمد بن دواد نے خلفاے بنو عبّاس سے مامون، معتصم، واثق، متوکّل چار خلیفوں کا زمانہ پایا تھا، لیکن اُنکا رسُوخ جو تدریجًا بڑھتا گیا وہ تحریر سے باہر ہے۔ احمد کو جس زمانے میں خلیفہ کا تقرب حاصل ہوا اُسکے پہلے دربار کے دستور کے موافق کوئی شخص گفتگو میں مُبادرت نہیں کرسکتا تھا، حاضرین خاموش منتظر رہتے تھے کہ خلیفہ گفتگو کا سلسلہ شروع کرے تو عرض معروض کیجائے۔ احمد کا یہ رسُوخ کہ بغیر پابندی جب چاہتے گفتگو کرتے تھے۔

[1] دیکھو ابن خلکان۔ صفحہ ۴۰۔ [2] وجہ تسمیہ باب المریم باب الحرب منسوب ہے حرب بن عبد اللہ کی جانب (جو اصحاب ابی جعفر سے تھے) اور محلہ حربیہ بھی اُنھیں کیطرف منسوب ہے۔

Half Mile (1) Rahat Ullah (2) Amir Ahmad (3) Syed Mehdi
Long Jump (1) Ali Hosen (2) Abbas Mirza
High Jump (1) Ali Hosen (2) Syed Mehdi
Quarter Mile Handicap (1) Abbas Mirza (2) Masud Alam

Under 16

100 yards (1) Abdur Rahman Ariff (2) Aziz Khan
Quarter Mile (1) Abdur Rahman Ariff (2) Sarfraz Ali (3) Khurshid Alam
Long Jump (1) Afzal Khan (2) Tasiruddin
High Jump (1) Ibrahim Beg (2) Abdur Rahman Ariff

Under 14

100 yards (1) Yasinuddin (2) Azizullah Khan
300 yards (1) Yasinuddin (2) Hosen Khan (3) Mohd. Ibrahim

Under 12

100 yards (1) Asad Ali (2) Sher Bahadur

Under 10

100 yards (1) Abul Qasim

The marks obtained in the House Competition were as follows :- Morison Court 41, Macdonnell House 37, Mumtaz House 35, English House 18, Zahur Ward 3.

for, is not what Budayun has been in the past—their interest lies in the fact that there are buried the mortal remains of a very pious saint, belonging to the Chistia sect of Sufism. His name is Qidavat-ul-Salkin, Sultan-ul Arfin. All over India, you will hear pious Mohammedans, repeating the names of all the saints in the Chistia sect in the genealogical order, as a religious exercise. Thousand of pilgrims come to see his tomb annually, when the time is spent in recounting the miracles of the saint, in deep meditation and prayers.

I have finished. Such is Budayun, such the part it has played in the history of India, and such the men it produced.

KARIM HYDER LODHI,

School Athletic Sports.

The School held Sports of their own this year which took place on March 18th and 19th. The meeting was quite a success, there were several exciting races, some good individual performances, and considerable enthusiasm over a House competition which was introduced. Every individual success counted so many points for the successful competitor's house and the closeness of the result—there were only six points dividing the three leading houses—was a gratifying feature of the competition.

With regard to individual contests, the open 100 yards and quarter mile, and the under 16 quarter all produced excellent finishes, the dead heat between Ghulam Akbar and Waiz Hosen being intensely exciting.

Mrs. Archbold kindly gave away the prizes at the end of the sports and the Head Master has presented medals to the members of the winning house team.

Appended are the detailed results :—

Open events.

100 yards	(1) Syed Mehdi	(2) Waiz Hosen	(3) Ghulam Akbar
Quarter Mile	(1) Ghulam Akbar Waiz Husin-dead heat		(3) Syed Mehdi.

Deccan in the short period of 30 years. Well, Budayun also was attacked by that famous warrior king, Alauddin Khilji. After a short stay at Budayun, Alauddin left for Delhi. He gave orders to the Subha of Budayun, whom he left behind, to have some repairs carried out in the mosque, which had previously been the ancient temple of the Hindus. This mosque is a big one, very spacious and it contains the tombs of two famous men. One was Alauddin Seyed, of the Seyed Dynasty of the Afghan Rulers of India who chose Budayun as his place of retirement after he had been pensioned by Bahlol Lodhi, who was a governor of the provinces east of Delhi, and who subsequently usurped the place of the Seyeds. The other is Ildos, the governor of Ghazni, who died at Budayun while on a pilgrimage.

IV.—In the Moghul period Budayun was, as we learn from the historians of this city, given to Nurjahan's brother by Jahangir. But, in this period, Budayun is only known for the great men that it produced. One of them is the famous Mulla Abdul Qadir, the historian, who, as has been justly remarked by several authorities, was known for impartiality and accurate sifting of facts. He wrote the "Muntakhib-ul-Tarikh," a work dealing with the Moghul period. Mulla Abdul Qadir was the only man out of a host of court flatterers, who refused to sign the paper declaring Akbar's right to be the Prophet of God. Instead of signing his name, he wrote over hemstich in Persian, namely, حیف که در دین نبی رخنه کرے پیدا شد meaning "Alas, that a schism-creator is born in the prophet's religion." Akbar was much displeased ; the mulla left the court, took refuge in his native city of Budayun. Akbar sent his soldiers to arrest him. People would not open their doors to the mulla, for fear of incurring the king's wrath,—only the Seyeds of Budayun gave him shelter. The Seyeds were put to death, Mulla Abdul Qadir fled to Persia, the soldiers were only able to arrest his wife and children. They took them before Akbar but he pardoned them and after a short he allowed even the mulla to come back to India. He died shortly after his return. Such small incidents remind us that even a high-minded king, like Akbar was not free from something of a zealot's bigotry. Mention might be made here of two other men, the mullas Jamal and Kamal, the two famous Qazis in Aurangzeb's time. Budayun has not been wanting in poets also—the most famous of the whole number being Nawab Zahurullah Khan Nawa whose poetic name was Tooti-i-Hind. His works have been lost. But that which the orthodox Mohammedans care

was promised in a dream that he would be a king one day—I mean, Subukatgin. We also know the name of Jaipal who was the Raja of Lahore. It is not generally known that India was at that time divided into many states. Some states were as big as a modern province of India and the Rajas of these states, though not very friendly with each other during the internal wars, could yet combine in a common cause against a foreign foe. Of the many allies of Jaipal at the time when Subukutgin invaded the Punjab, one was the Raja ot Budayun. The part that Budayun played does not end here. I have related the above in order to prepare you for what happened to Budayun afterwards. After the lapse of a few years when Jaipal had bound himself by an agreement to pay so much to the treasury of Ghazni, as tribute and to be always a firm and faithful ally of Subukutgin, Subukutgin sent some ambassadors to Lahore to enquire of Jaipal why he had not been regular in the sending of the tribute. Jaipal took these men prisoners and for greater security, sent them to the Raja of Budayun. This roused the anger of Subukutgin who sent his Chief Commander of the Forces, namely, Masud Salar-i-Gazi to punish Jaipal for his treachery. Musud over-ran the Punjab, crossed the Jumna and attacked Budayun. It is said that the general destroyed everything before him with fire and sword, was merciless, wherever he went but it may be mentioned here that one of the ambassadors had been a tutor of Masud in his younger days and when he came to know that the Raja ot Budayun had the ambassabors put to death, he was still more cruel and relentless. He stormed the fort, massacred the inhabitants, looted the city, put the Raja to death with his own hands and having laid the city in ruins, returned to Ghazni. The site of this battle is still distinguishable by the ruins outside the walls of the city and by the graveyard which covers an area of two square miles. Some of the graves are very long and the popular legend about these is that they belong to men of gigantic stature, who at one time, during the days of the good old pious Brahmins, had defiled the sacred territory.

III.—Nothing is known of Budayun after this until we come to the Khilji Dynasty of Turkish descent, that ruled the provinces around Delhi, for a period of 30 years from 1290—1320 A. D. Very little is known of this dynasty though, judging from the part that this dynasty has played in the History of India, we should have expected greater attention paid to the kings who conquered the whole of

thought so myself. But I am inclined to think that our descendants will have the same feelings wiih regard to this present period and will perhaps envy us the stirring times in which we lived.

I am etc.,

G. P. GOODALL.

Papers of the Historical Society.

BUDAYUN.

I.—It might seem strange that a man from the very North of India should write about a city which he has not even seen and perhaps it might kindle a smile on your faces that of all the cities, I should have chosen Budayun for the subject of this paper. I shall feel amply rewarded if I in this paper am able to bring your attention to this much neglected city, which though it has not figured so prominently in the history of India, has still some claim on our attention. Budayun lies in the Rohilkhund Division of the United Provinces of Agra and Oudh. It is now a collectorate, with a population as large as that of Aligarh. It is a very old city. The scanty information that we have about it, does not help us very much in fixing the date of its foundation. There is no doubt that it was founded by the Hindus when they crossed the river Sarsawati and conquered the fertile plains, watered by the Ganges and the Jumna. We are sure also that Budayun was held as sacred as Benares by the Hindus. The "Budayan" is a corruption of the words "Ved-Maho," meaning, the Home of the Vedas. It is clear from this fact that Budayun has been at one time a seat of learning and though there are no records of its later history until we come to the Mohammadan Period, we can, with safety say that it attracted men from far and near to its schools where the sacred Vedas were taught. Beyond a temple which was converted into a mosque by Shams-ud-Din Altamash, and an ancient fort which has been built, destroyed and rebuilt several times, there is nothing more of the Hindu Period worthy of our attention.

II.—The first appearance of Budayun was at the time when the Mohammadan invasions began through the Khyber Pass, We know in history, the name of the soldier who was

in this matter tend much more to alienate the members of the party that has now been defeated. Of course I do not forget that in Germany there is nothing like so clear a division into two great parties as in England, and this may modify the Emperor's difficulties in the future, giving him the opportunity of a greater number of political alliances and the chance of more effectively playing off one party against the other. But the general principle is sure to operate to some extent, and the more the Emperor joins himself to political parties the less will be his influeuce with the nation as a whole. The comparison in this respect between Germany and the United Kingdom presented itself to all of us when we read the Emperor's speech. Here the King never shows any political bias to one party or the other. He is above all party controversies and divisions and both parties are alike in turn his loyal ministers. And this is surely a much stronger position for a Sovereign and a much sounder and more durable constitution for a country than what we have recently seen in Germany.

In the Transvaal we are certainly face to face with a remarkable position. Within a few years after the conclusion of a long and bitter war we have established representative Government in the country which was the seat of the war and one of the Generals who opposed us most strenuously is now the first Prime Minister of the new Government. What we must hope for is clearly this :—that the war shall be forgotten, its bitter memories buried in the past ; that all people in the new colony shall regard themselves as fellow-citizens of a common country, and that such country shall be governed with one sole object, the happiness and prosperity of its inhabitants, for this is the only legitimate object of any government.

I have referred to the new Russian Duma but its composition and future are still too unknown and too uncertain to justify any comments. Great forces are in operation in Russia as in so many other parts of the world. No one can complain that this is a dull or humdrum age, either in the sphere of action or of thought, though only the historian living in some future time will be able to see the real and full significance of what is now happening. We often think or feel in reading past history that such and such an age was the great age of new movements, of active impulses and fresh feelings among mankind. I have, at any rate, often

months ago I think I should say "Elections." During the corresponding period of last year the same subject was of course also paramount as we had our own Parliamentary General Election. But this year I am referring to four different elections—those for the London County Council—for the German Reichstag, for the Transvaal Lower House, and for the Russian Duma. The results of each of these elections have been awaited and received with great interest in this country. In London the contest was on the whole a plain one between two parties. Under the party which had a majority in the last Council the rates had steadily increased. This was made the great battle-cry against them and there is no doubt that it was this which principally contributed to their defeat. Whether or not the new Council, in which the opposite party now has a majority, will effect any decrease in the rates remains to be seen. It is doubtful, just as it is doubtful whether the defeated party are to blame for the increase there has been. The change is another illustration of what we call the "swing of the pendulum"—the constant transfer of the confidence of the English electorate from one party to another and back again, sometimes, so far as one can judge solely on the principle (a characteristically English principle) of giving each side a turn. This "swing of the pendulum" certainly has its advantages, for it secures a frequent change of personnel in administrative work and affords a safeguard against any one particular method becoming stereotyped and incapable of adaptation as new needs or fresh circumstances arise. It does not follow that each change of method introduced is an improvement upon the previous one, but at any rate many methods are tried, and on the whole we are entitled to hope that the best ones will, by their own merits, survive.

The German Elections have been watched closely in this country. I will only refer to one point upon which it is instructive from a constitutional point of view to make a comparison between Germany and ourselves, I mean the attitude of the German Emperor. When the results of the elections were known, the Emperor made a speech in which he rejoiced at the victories of one party and referred to the defeated party as the opponents of himself and the country. Now if we may expect the "swing of the pendulum" to operate in Germany as here—and it seems to me that we may—what will be the position of the German Emperor after the next General Election if his so-called opponents happen to win a majority of the seats? And will not his attitude

The College buildings are progressing steadily. The new house for the School is near completion now and materials are being collected on the sites of the Prince of Wales' Science School and the new permanent School (in the Cadell Bagh).

No response whatever seems to have been made to the offer of a prize of Rupees fifteen for the best essay on a set subject. This is unfortunate. The Magazine suffers very greatly from the lack of literary support, at any rate so far as the English portion is concerned. The reason for the late publication of the last and the present issues is simply this, viz., that there has been immense difficulty in collecting enough matter wherewith to go to press. We make another appeal for help to all who are interested in the welfare of College institutions. Articles of literary, historical and of general Mohammedan interest will always be welcomed.

The Riding School had a Tent Pegging Competition which concluded on Sunday, March 31st. Aminullah was the winner. Only members of the Riding School were eligible. The next competition will be open to all members of the College and School.

It is with great pleasure that we announce the withdrawal of the Nawab Mohsin-ul-Mulk's resignation of the Honorary Secretaryship of the Trustees. At this particular time the experience of the Nawab Sahib will be invaluable and it would have been a great blow to the College if it had been deprived of his services. Similarly we cannot well afford to lose the zealous work of Aftab Ahmad Khan Esq., the Honorary Secretary of the Building Committee. He too has withdrawn his resigation. We hope that both of these zealous officers will have even more prosperous periods of office than in the past.

Letters from England—No. 8.

March 1907.

DEAR MR. EDITOR,

If I were asked to state in one word what had roused the greatest interest in England since I last wrote to you two

Staff Club gave a Garden Party "to meet the Old Boys." Saturday was, however, the great day. After lengthy meetings, there was a Garden Party in the Sir Syed Court, given by the present boys to the Old Boys.

The Annual Dinner took place in the evening in the Strachey Hall. It was attended by several Trustees, most of the Staff, about sixty Old Boys, and six hundred members of the College and School. The memorable part of the dinner was the speeches. Mr. Ehsan-ul-Haq and Mr. Ali Imam made most stirring appeals to the students, on whose behalf Abdur Rahman B. A. replied.

On Sunday, March 31st, there was a breakfast given by the present members of the College to the Old Boys. Again several excellent speeches were made, Mr. Ali Imam being even more effective than on the previous evening. Mr. Ghulam-us-Saqlain also spoke very well on the ideals of Sir Syed, and Mr. Mohammad Ali recited with great feeling a poem he had composed for the occasion.

Those of the Old Boys who spoke, and Mr. Ali Imam, laid great stress on the need there was for more frequent visits to the College on the part of the Trustees and the Old Boys. On the whole there can be no doubt that the Old Boys Association has done very good work in rallying so strongly to the support of the College and our most sincere thanks are due to those who worked so willingly and well on this occasion.

The Athletic Sports for the College had to be postponed on account of the closing. It is proposed to hold them in November next. The School Sports were held on Monday and Tuesday, March 18th and 19th. A short account of them will be found elsewhere in this number.

The League Matches both in Football and Hockey will be in full swing by the time this appears in print. There seems every chance of a really keen competition this year as the teams are very evenly matched.

Syed Mustapha Hosain Rizvi B. A. has been made a probationary Deputy Collector and has been posted to the Agra District.

The Aligarh Monthly

April, 1907.

College Notes.

The College re-opened on March 20th and nearly all the first and third year students rejoined. The second and fourth years were mostly absent owing to the near approach of their examinations. Since that time, however, a very fair number have rejoined, as the examinations have been postponed. The postponements are as follows; the Entrance and Intermediate examinations will begin on May 13th and that for the B. A. on August 5th.

The commission of enquiry into the recent disturbances finished its work on March 25th and their report has been submitted to the proper authorities. It is not yet known whether it is to be published or not.

On Thursday, March 28th, Sir Syed's Day, was celebrated in the usual way, a meeting being held in the Strachey Hall in the morning. Mr. Archbold, Aftab Ahmad Khan Esq., Dr. Ziauddin Ahmad and Maulvi Abdullah were the speakers. Later in the day sweets and alms were distributed to the poor in memory of the Founder.

Friday, March 29th, was Good Friday and on that day the old boys began to assemble for the Annual Meetings of the Old Boys' Association. The members of the

نمبر ۵	مئی ۱۹۰۶ عیسوی	جلد ۴

پہلے اور آج کل کے نیک کام

زمانہ ہمیشہ سے بدلتا رہا ہی اور بدلتا رہیگا اور اسکا بدلتا رہنا ہی اچھا ہی۔ مگر جدید تعلیم کے اثر سے جو انقلاب ہندوستان میں ہو رہا ہی وہ نئی قسم کا انقلاب ہی۔ دوسرے ملکوں کی طرز معاشرت. خیالات رسم و رواج و دیگر حالات دیکھنے اور کتابوں اور اخباروں میں پڑھنے سے ہمارے دلوں میں طرح طرح کے ولولے پیدا ہوتے جاتے ہیں اور نئے ولولوں اور نئی اُمنگوں کے ساتھ ہمارے بھلے اور بُرے کاموں کا معیار بھی بدلتا جاتا ہی۔ فاضل ہربرٹ اسپنسر کے اس مقولہ کا پہلا حصہ کہ "ایک غلطی سے نجات پاکر لوگ عموماً دوسری متضاد غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس سے وہ آگے چلکر نکلجاتے ہیں" ہماری حالت پر پوری طرح صادق آتا ہی۔ علم کی روشنی کے اثر سے ہم بہت سی مُضر باتوں کو چھوڑتے جاتے ہیں اور اچھی باتیں اختیار کرتے جاتے ہیں اور اُسی کے ساتھ اپنی بہت سی بھلی باتیں چھوڑتے اور دوسروں کی بُری باتیں اختیار کرتے جاتے ہیں اور ایسا کرنے پر ہم مجبور ہیں اسلیئے کہ نئے علم کی روشنی نے ہماری آنکھوں میں چکاچوند پیدا کردی ہی اور فی الحال ہماری قوت امتیازی پوری طرح کام نہیں دیتی۔ اگرچہ یہ یقینی امر ہی کہ اس انقلاب میں ہمارا ہر قدم فی الجملہ بھلائی کی طرف بڑھ رہا ہی تاہم یہ اندازہ کرنا دلچسپی

خالی نہیں کہ اس کشمکش میں ہمارے بھلے کاموں کا معیار رفتہ رفتہ کس طرح بدلتا جاتا ہی۔ کتنے بھلے کام ایسے ہیں جن کی جگہ دوسرے اچھے کام قائم ہو گئے ہیں کتنے ایسے ہیں جو بالکل متروک ہو گئے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو پہلے نہ تھے اور اب رائج ہو گئے ہیں۔ ذیل میں چند کام درج کیے جاتے ہیں جو پہلے زمانہ میں اچھے سمجھے جاتے تھے۔

(۱) ذوی القربیٰ۔ یتیموں۔ مسکینوں۔ مسافروں۔ سائلوں اور غلاموں وغیرہ کی مدد کرنا۔

ذاتی اخراجات اور نمود و نمایش کے سامان اسقدر بڑھ گئے ہیں کہ خاص اولاد کی تعلیم مشکل ہو سکتی ہی۔ اسلیے عزیز و اقربا کے اخراجات برداشت کرنے کا دستور بہت کم ہوتا جاتا ہی

یتیموں کے لیے صرف یتیم خانوں میں دیا جاتا ہی جن کی تعداد بہت کم ہی۔

مسکینوں مسافروں۔ سائلوں وغیرہ کو بلا امتیاز ضرورتمندی و غیر ضرورت مندی کے دیا جاتا تھا۔ اس میں اصلاح کی کوشش ہو رہی ہی۔ بہرحال اس قسم کی خیرات بھی بند ہوتی جاتی ہی اور جب تک کہ محتاج خانے جن میں تعلیم یافتہ لوگ اطمینان کے ساتھ دیکھیں قائم نہونگے اس خیرات کا زیادہ رواج نہوگا۔

(۲) پل و مسجد و چاہ و مہانسرائے بنانا۔

پُل گورنمنٹ اس کثرت سے بناتی ہی کہ پبلک کو اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی مسجدیں مسلمانوں کی آبادیوں میں حسب ضرورت موجود ہیں اور اگر ضرورت ہوتی ہی تو کم حیثیت اور کم تعلیم یافتہ مسلمان بنوا دیتے ہیں۔ اسلیے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اسطرف توجہ کی ضرورت نہیں ہوتی چاہ اور مہانسرائے بنانے کا رواج بھی اب نسبتاً کم ہوتا جاتا ہی۔

(۳) مطب کرنا اور دوائیں تقسیم کرنا۔

پہلے زمانہ میں اکثر خوشحال اور با اثر لوگ بغیر کسی معاوضہ کے غربا کا علاج نیک کام سمجھ کر کرتے تھے اور باوجود دیگر ضروری مشاغل کے دن کے چند گھنٹے مطب کے لیے مخصوص کر دیتے تھے۔ اسکے علاوہ اکثر [illegible] دواؤں کا ذخیرہ تقسیم کے لیے رکھتے تھے اور بعض لوگ زیادہ قیمتی

علی گڈھ منتھلی

جلد (۵)	جون سنہ ۱۹۰۷ء	نمبر (۶)

تجرُّد اور اِزدواج

نمبر (۲)

ہمنے اپنے مضمون مندرجہ عنوان میں جو اپریل سنہ ۱۹۰۷ء کے **علی گڈھ منتھلی** میں شائع ہو چکا ہے، یہ بیان کیا تھا کہ "آجکل کی نئی روشنی کے تعلیم یافتہ نوجوان عموماً دو وجوہ سے تجرد کو ازدواج پر ترجیح دیتے ہیں، یعنی بعض تو آمدنی کی کمی کا عذر پیش کرتے ہیں اور بعض ہم مذاق بیوی کے نہ ملنے کا" ہم بخوفِ طوالت اُن پر کافی بحث نہ کر سکے، مضمون کے شائع ہونیکے بعد ایک صاحب نے پٹنے سے بذریعہ خط مہربانی فرماکر ہمکو مضمون کے اِس پہلو پر روشنی ڈالنے اور اِس کمی کو پورا کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہم اُن کی اِس یاد دہانی

کا شکریہ ادا کرتے ہیں- اور اس نمبر میں شادی نہ کرنے کے اُن دونوں اہم عذرات پر بحث کرنے کی کوشش کرینگے۔

آمدنی کی کمی کی وجہ سے شادی سے اجتناب

"میری آمدنی میں اتنی گنجایش کہاں، جس سے میں بیوی بچوں کی پرورش کا بار اُٹھاسکوں،" یہ شادی نہ کرنے کا ایک عام عذر ہے، جسکو آجکل کے نوجوان پیش کرتے ہیں، لیکن جب اِس امر پر غور کیا جاتا ہے تو یہ عذر اکثر بے بنیاد ثابت ہوتا ہے- کیونکہ جو لوگ شادی سے اجتناب کرتے ہیں- وہ اپنی آمدنی کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے، اور اسلیئے گو اُن کی آمدنی کتنی ہی زیادہ کیوں نہو وہ اپنے آپ کو شادی کے قابل نہیں خیال کرتے- علاوہ اسکے مجرد تو اپنی اکیلی ذات پر بہت زیادہ خرچ کرتا ہے، اور جب متاہل ہو جاتا ہے تو اُسی آمدنی میں کئی نفوس کی پرورش ہو جاتی ہے، اور پہلے سے زیادہ خوش بھی رہتا ہے-

ہمکو افسوس ہے کہ ہماری سوسائٹی میں ایسی فضول خرچی بڑھتی جاتی ہے، جس سے خوشی میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا مگر جیب ہلکی ہو جاتی ہے، اس میں شک نہیں کہ اکثر مثالیں ایسی بھی موجود ہیں جہاں آمدنی کی کمی کی وجہ سے انسان شادی اور اُس کے متعلقہ لوازمات کے بار کا متحمل نہیں ہوسکتا- لیکن اسکے ساتھ ہی قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسقدر آمدنی ہو تو ایک انسان شادی کرسکتا ہے؟ مگر اسکا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے، کیونکہ آمدنی ایک اعتباری شے ہے ایک شخص کی آمدنی سو روپیہ ماہوار ہے اور وہ اُسے کم سمجھتا ہے، مگر دوسرا پچاس روپیہ ماہانہ آمدنی ہی کو بہت خیال کرتا ہے- ہر شخص کی حیثیت مختلف اور حالات مختلف ہیں، اسلیئے کبھی ہمیں دوسروں کی ریس نہیں کرنی چاہیئے، بلکہ ہمکو بجائے خود یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہم خوشی اور سادگی سے اپنی زندگی کسقدر آمدنی میں بسر کرسکتے ہیں- اگر یہ معیار پیش نظر رکھا جائے تو انسان تجرد کے اکثر مادی اور اخلاقی مصائب سے نجات پا سکتا ہے- تاریخ کے

دیکھنے سے بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں جسمیں مرد کو اکثر بی بی کی بدولت دنیوی شہرت حاصل ہوئی ہے، اور دینی امور میں بھی عورتوں نے اپنے شوہروں کو بڑی مدد دی ہے -

فیریڈے (Faraday) کہتا ہے کہ :-

"مجکو شادی کے بعد جتنا عیش و آرام اپنی بی بی کی ذات سے نصیب ہوا، اور دنیوی کامیابیوں میں جسقدر میری بی بی نے مجکو مدد دی، کسی دوسری طرح پر اُسکا حاصل ہونا بہت مشکل ہے"

مصنف ہاؤ ٹو بی ہیپی ٹو میریڈ { How to be happy though married }

ایک واقعہ لکھتا ہے کہ :-

"جب لارڈ ایلڈن کا تقرر خدمت لارڈ چانسلری پر ہوا تو بادشاہ نے اُسکو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ تم میری جانب سے اپنی بی بی کا شکریہ ادا کرو - لارڈ موصوف نے اِس عنایت و نوازش کے جواب میں کہا کہ حضور اِس خصوصیت سے جو میری بی بی کا شکریہ ادا فرماتے ہیں، میں اُسکا مطلب نہیں سمجھا" بادشاہ نے جواب دیا میں ہی خوب جانتا ہوں کہ تجھے تمھاری بی بی کا کسقدر ممنون ہونا چاہیے، کیونکہ تم اپنے آپ کو انگلستان کے کسی قصبے کا پادری بنانا چاہتے تھے، لیکن تمھاری بی بی ہی نے تم کو میرا لارڈ چانسلر بنایا"

مولوی اسلم صاحب جیراجپوری اپنی کتاب "اہلبیت" میں لکھتے ہیں:-

"آنحضرتؐ فرمایا کرتے تھے کہ "میں جب کفار سے کوئی بات سنتا تھا اور وہ مجکو ناگوار معلوم ہوتی تھی تو خدیجہؓ سے کہتا تھا وہ اِسطرح سمجھاتی تھیں کہ اُس سے میرے دل کو تسکین ہو جاتی تھی اور کوئی رنج مجکو نہیں ہوتا تھا کہ خدیجہؓ کی باتوں سے وہ ہلکا اور آسان نہو جاوے" اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خدیجہؓ کسقدر ثابت القلب اور مستقل مزاج تھیں کہ جن امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے اولوالعزم اور بھاری بھرکم رسول کے پاؤں ڈگمگا جاتے تھے وہ ثابت قدم رہتی تھیں اور آپ کی ٹوٹی ہوئی ہمت

بند ھایا کرتی تھیں۔ اِسطرحپر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ صرف زندگی کی شریک تھیں بلکہ رسالت کی کامیابی میں بھی ایک قوی اور زبردست بازو تھیں،،۔ اکثر اوقات مرد کو بیوی بچوں کیوجہ سے اپنی ترقی کے لئے بڑی کوشش کرنی پڑتی ہے، اور جب کبھی وہ اپنی کوشش میں ناکامیاب ہونے کیوجہ سے مایوس ہوجاتا ہے، تو اُسکی بی بی اور بچے اُسکو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اِس دنیوی جنگ میں مثل ایک ہیرو کے مقابلہ کرے، اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی بی بی اور بچوں کے لئے۔ کرّین (Curran) کہتا ہے:۔

"جب میں پہلی مرتبہ عدالت میں تقریر کر رہا تھا اُسوقت اگر مجکو اپنی بی بی اور بچوں کا خیال نہ آتا جنکی پرورش میرے ذمہ تھی تو میں فوراً اُس مقدمہ کو چھوڑ دیتا اور پیشہ وکالت سے دست بردار ہوجاتا"

کیا متموّل اور کیا کم آمدنی والے دونوں کو چاہیئے کہ وہ بیوی کی دولت اور جہیز پر نظر نہ رکھیں بلکہ اُس میں وہ قابلیت تلاش کریں جسکی وجہ سے اپنی آمدنی میں ترقی ہو۔ کیونکہ قابلیت ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ اور وہی غربت کو امارت۔ اور امارت کو غربت کی شکل میں ظاہر کرتی ہے۔ لہٰذا درحقیقت سلیقہ شعار بیوی کا شوہر دولتمند اور بدسلیقہ بیوی کا میاں غریب ہے۔ ورنہ اِس فیشن ایبل دنیا میں حقیقی غربت و امارت کے حدود قائم کرنا مشکل ہیں۔ بلکہ درحقیقت بیوی کی موجودگی کے بعد ہی کسی کی غربت و امارت کا فیصلہ ہوسکتا ہے اور سلیقہ شعار بیوی کا خوش قسمت شوہر ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ "میں اپنی بیوی کی کفایت شعاری اور سلیقہ مندی کی بدولت امیر بن رہا ہوں" اور بے سلیقہ بیوی کا بدقسمت شوہر ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ "میں اپنی بیوی کی بدسلیقگی اور فضول خرچی کی بدولت مفلس ہو رہا ہوں"

دنیا میں کوئی انسان خواہ وہ امیر ہو یا غریب، ایسا نہ ملیگا جس کا دل دنیوی تفکرات اور روحانی صدمات سے خالی ہو۔ لیکن جو لوگ متاہل ہیں وہ اپنی بی بی کے پیار اور محبت کی

بدولت بہت کچھ ایثار رنج دور کر سکتے ہیں۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ ڈیون پورٹ آڈمس {Devenport Adams} اپنی کتاب۔ ومنس ورک اینڈ ورتھ {Women's work and worth} میں لکھتا ہے کہ۔

"مرد پر بہت سے روحانی اور دلی صدمات پیش آتے رہتے ہیں۔ جو قید خانے کی بلاؤں سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہوتے ہیں، مگر صرف پیاری بیوی کی ہمدردی ہی ایک ایسی چیز ہے جو مرد کو اس حالت میں بہت کچھ مدد دیتی ہے۔ بہت سے واقعات ایسے پیش آتے ہیں کہ مرد اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اور تفکرات دنیوی سے نجات حاصل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے، ایسے نازک وقت میں بھی بی بی کا پیار او محبت ہی اُسکے حق میں مسیحا کا کام دیتی ہے" علاوہ ان سب خوبیوں کے شادی اکثر مصائب اور آلام و امراض سے بچاتی اور راحت و مسرت کا باعث ہوتی ہے۔ اسلئے اگر ہم اُسکے لئے تھوڑی تکلیف بھی برداشت کرلیں تو کچھ ایسی بڑی بات نہیں۔ علاوہ ازیں بی بی بچوں کے وجود سے انسان میں ایثار کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جو انسانی نیکیوں میں بہت قابلِ قدر ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوجائیگا کہ شادی نہ کرنے کے لئے جو آمدنی کم سمجھی جاتی ہے وہ اسوجہ سے کم نہیں کہ ہم اس میں زندگی بسر نہیں کر سکتے، بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی حالت کا مقابلہ اُن لوگوں سے کرتے ہیں، جو ہم سے زیادہ متموّل ہیں۔ ایسے موقعوں پر ہمیں ہمیشہ اُن لوگوں سے مقابلہ کرنا چاہیئے جو ہم سے متموّل تو کم ہیں مگر ہم سے زیادہ خوشی و خوبی کے ساتھ اپنے بی بی بچوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ اُصول انسان کو دنیا میں بہت سی تکلیفوں اور غلطیوں سے بچاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ انسان ہر طرف دِقتوں اور مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی کوشش اور تدبیر سے اِن دِقتوں کو کم کردیں نہ کہ اپنے اوہام اور خیالات

خام سے اُن کو اور زیادہ مشکل اور ناقابلِ برداشت بنالیں۔ ورنہ زندگی کا بسر کرنا سخت دشوار ہوجائیگا۔

مصنف ہاؤ ٹو بی ہیپی تھو میریڈ {How to be happy though married}

لکھتا ہے کہ:۔

"اگرچہ متاہل زندگی بہت سی ذمہ داریوں اور تفکرات سے پُر ہوتی ہے لیکن کیا مجرّد آدمی ان سے بری ہے؟ مجرّد کا نہ تو کوئی ایسا دوست ہوتا ہے جس پر وہ پورا بھروسہ کرسکے، اور نہ اُسکے اخراجات ہی کسیطرح متاہل سے کم ہوتے ہیں اور اسپر بھی اُسکو بہت ہی کم راحت نصیب ہوتی ہے۔ وہ اپنی زندگی سے آپ بھی بہت ہی کم فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اور سوسائٹی کو بھی اُس کے وجود سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ بقولِ کابٹ (Cobbett)

"یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ جب تک تم کسی کے گھر نہ جاؤ یا کسی کو اپنے پاس نہ بلاؤ کوئی بات کرنیوالا نہ ملے۔ تمھارے رنج و راحت کا کوئی شریک اور ساتھی نہ ہو اور اور کوئی تمھارا ایسا دوست نہ ہو جو ہر وقت تمھاری بہتری کا دم بھرتا ہو۔ تم ہی اپنے دُکھ درد کا علاج کرلو تو کرلو لیکن کوئی تمھارا سچا ہمدرد نہ ہو۔"

یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ازدواجی زندگی فکر اور تردّد سے مبرا ہے۔ لیکن کیا فکر اور تکلیف زندگی کے ہر حصے کیلئے لازمی نہیں ہے؟ جو شخص دنیوی تکلیفوں سے گھبراتا ہی اُسکو لازم ہے کہ وہ دنیا کو چھوڑ دے۔ ڈاکٹر اسمائلس کا قول ہے کہ۔

"ہر انسان کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ دنیا کے کاروبار کی سختی برداشت کرکے ہوشیار و بیدار ہوجائے۔ بہ نسبت اِسکے کہ عیش و بے پروائی کی تاریک حالت میں اپنی زندگی بسر کرے۔ اگر دنیا میں مشکلوں کا وجود نہ ہوتا تو کوششوں کی بھی کوئی ضرورت نہوتی۔ اگر رنج و صعوبت ناپید ہوتی تو تحمّل و استقلال بھی معدوم ہوجاتا۔

پس مشکلات و تکلیفات اور صعوبات کی وجہ سے کوئی نقصان اور ضرر نہیں ہوتا۔ بلکہ اِن سے اصلاح کی قوت اور نیکیوں کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں۔"

اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ متاہل زندگی میں خوشی کم ہے اور رنج زیادہ۔ پھر بھی ازدواج کو تجرد پر ترجیح دینا پڑتا ہے، کیونکہ تجرد کی حالت میں صحبت اور لطفِ زندگی بہت کم نصیب ہوتا ہے۔

ہم مذاق بیوی کا نہ ملنا

ہم مذاق بیوی نہ ملنے کا عذر ایک ایسا عذر ہے کہ جسکو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ اِس کمی کو پورا کرنے کے ذمہ دار لڑکی کے والدین ہیں، اُن کو چاہیے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو زمانے کی رفتار کے موافق تعلیم دیں اور اُن کو اُن کے آیندہ شوہروں کے ہم مذاق بنانے کی کوشش کریں۔ اگرچہ ہندوستان میں تعلیم نسواں کے مسئلے نے اب کچھ کچھ عملی صورت اختیار کرلی ہے۔ لیکن پھر بھی اِسکی رفتار بہت دھیمی ہے۔

نئی روشنی کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اُن کے ہم خیال بیوی نہ ملنے کا ایک یہ سبب بھی ہے کہ لڑکیوں کے والدین قدرتی طور پر اسبابِ کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ اُن کی پیاری لڑکیوں کی آیندہ زندگی راحت و آرام سے بسر ہو۔ اُنھوں نے غلطی سے اس مقصد کے حاصل ہونے کا یہ ذریعہ سمجھا ہے کہ لڑکیوں کو دولتمندوں کے پلّے باندھا جائے، اگرچہ اُن کی تعلیمی اور اخلاقی حالت کیسی ہی ذلیل اور خراب کیوں نہو۔ اسلیئے وہ ہمیشہ دولتمند شوہروں کی تلاش میں رہتے ہیں اور اُن کو تعلیم یافتہ شریف نوجوانوں پر محض اُن کی دولت کیوجہ سے ترجیح دیتے ہیں، جس میں بسا اوقات تو اُن کی کوئی نہ کوئی خاندانی اغراض مخفی ہوتی ہیں، اور دوسرے درجے میں اِس جاہلانہ خواہش کا پورا ہونا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن یہ دِقت ہمارے نوجوانوں کے راستے سے صرف اُسی وقت دُور ہو سکتی ہے، جب کہ خود لڑکیوں کے نفوس کو اعلٰے تعلیم سے منور کیا جائے۔

جس سے وہ اس بات میں تمیز کر سکیں کہ حقیقی مسترت و راحت وہی ہوتی ہے جو علم اور اہلِ علم کی صحبت میں حاصل ہوتی ہے، اگر اسطرح لڑکیوں کا معیارِ مذاق بدل جائے تو پھر تعلیم یافتہ نوجوانوں کو تعلیم یافتہ بیوی کا ملنا کچھ دشوار نہ رہیگا۔ اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مرضی کے خلاف اُن کے اولیا، اوصیا کو بھی اپنے ذاتی و خاندانی اغراض کے حصول میں اُن کے بھینٹ چڑھانے کی جرأت نہو سکا کریگی۔ اور تجرد کے نقصانات سے ہزاروں تعلیم یافتہ اور ہونہار نوجوانوں کی زندگی معرضِ خطر میں نہ رہیگی۔ اور اُسوقت اُن کی تعلیم سے ملک کو حقیقی فائدہ پہونچیگا۔ کیونکہ اُسیوقت اُن کے دلوں کو حقیقی راحت وسکون ہوگا۔ اور ایک خفیہ فرشتہ ہر وقت اُن کی مدد کو تیار ہوگا۔ لیکن اتنا فرض نوجوان تعلیم یافتوں کا بھی ہے کہ وہ بھی تعلیمِ نسواں کے پھیلانے اور اسکو وسیع پیمانے پر جاری کرنے اور اُس کے رستے میں سے قوی سے قوی مشکلات کے ہٹانے میں کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ حصہ لیں ورنہ لبِ شکایت بند کریں، اور جیسی بھی گھانس پات بیویاں ملیں۔ اُن ہی پر قناعت کریں اور تجرد اختیار کر کے سوسائٹی کی اخلاقی وجسمانی حالت کو صدمہ پہونچانے کے مجرم نہ بنیں۔ اگرچہ اِسصورت میں اُن کو پکے پکائے لقموں کے ملنے میں کچھ دیر ضرور لگیگی، لیکن قوم کے حق میں اِسکا نتیجہ عمدہ نکلیگا، اور کچھ نوجوانوں کو دَورانِ انتظار ہی میں قومی شہادت کا درجہ حاصل ہوگا، لیکن دوسری پُشت اُن کی سعی کا پھل کھائیگی۔ اور جو شجرۂ ممنوعہ اُن کے لئے حرام تھا، آیندہ نسلوں کے لئے وہ حلال ہو جائیگا۔

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ بدچلن اور عیاش متموّل نوجوان کی حالت بعد شادی کے درست ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو بہت شاذ۔ ورنہ عموماً وہ اپنی دولت کو بدکاری میں لُٹاتا رہتا ہے، اور کبھی ایک بی بی پر قناعت نہیں کرتا۔ اور نہ اُسکی قابلیت کی قدر کرتا ہے، بعض لوگ تو یہ غضب کرتے ہیں کہ دولت کی خاطر اپنی لڑکیوں کو مُسن اور متاہل اشخاص کے عقد میں دیدیتے ہیں۔ ہم اپنے بیان کی تائید میں

کئی مثالیں پیش کر سکتے ہیں لیکن ہم اِسکی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ اِس قسم کی ہزاروں نظیریں ہر شخص اپنے گردوپیش خود دیکھ سکتا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ تمام دولتمند جاہل اور بدچلن ہوتے ہیں، یا تمام تعلیم یافتہ لائق شریف اور نیک ہی ہوتے ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ نئی روشنی کے تعلیم یافتوں میں بھی بعض "پڑھے لکھے جاہل" اور بدچلن بھی ہیں، ہمارا مطلب یہ ہے کہ ستمول پر ہمیشہ تعلیم یافتہ نیک رویہ اور ہونہار نوجوان کو ترجیح دینا چاہیے۔ اِس اصول پر عمل کرنے سے ہماری قوم کی تمدنی حالت بہت جلد درست ہوسکتی ہے۔ ایسی حالت میں بھی ہمارے مجرد دوستوں کو نہیں چاہیے کہ بغیر جستجو اور تلاش کئے ہم مذاق بیوی کے نہ ملنے کا عذر پیش کردیں، اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم مذاق بیوی مشکل سے ملتی ہے، مگر یہ نہیں کہ ملتی ہی نہ ہو۔ ایک بیوی ہی پر کیا منحصر ہے، جتنی اچھی اور قابلِ قدر چیزیں ہوتی ہیں وہ سب ہی مشکل سے ملتی ہیں، محنت اور جستجو شرط ہے، صرف اِس خیال سے کہ ہم مذاق بیوی کا ملنا دشوار ہے، ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ بلکہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہمیں معمول سے زیادہ تلاش اور محنت کرنی چاہیے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ اپنی بیویوں سے راضی اور خوش رہتے ہیں اور اُنھیں دل سے چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اِس نعمت سے محروم رہیں۔

چونکہ یہ معاملہ ہر ایک شخص کی مختلف حالت اور حیثیت پر موقوف ہے، اِس لئے ہم اسپر زیادہ بحث نہیں کرسکتے، اِس میں ہر صاحب کو اپنے فہم اور تمیز سے کام لینا چاہیے۔

ترپ بازار - جام باغ -
حیدرآباد دکن - جون سنہ ۱۹۰۶ء

سید محمد نقی

عربی زبان کی فضیلتیں

عرصہ ہوا ہمارے کالج میں ایک سوسائٹی لجنۃ الادب قائم کیگئی تھی جس کا مقصد عربی تحریر و تقریر کی مشق بڑھانا تھا۔ ڈاکٹر یوسف ہورووٹس صاحب پروفیسر عربی نے پھر اُس سوسائٹی کو حال میں زندہ کیا ہے، اُن کی دلچسپی اور عربی کی اعلےٰ قابلیت سے بہت کچھ امید ہے کہ طلبا پر اچھا اثر پڑیگا۔ اور وہ بہت جلد عربی بولنے اور لکھنے لگینگے، یہ بھی ایک اتفاقیہ خوش قسمتی ہے کہ اُسکے آنریری سکرٹری مولوی حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری ہیں، جو منجملہ اُن لوگوں کے ہیں، جنکی عربی دانی ہندوستان میں نمونتاً پیش کی جاتی ہے اور جو زمانہ حال کے انلائنٹڈ اور روشن خیال علما کیلئے قابل تقلید مثال ہیں۔

اس لجنہ کا پہلا اجلاس ۸۔ جون سنہ ۱۹۰۷ء کو ہوا جسمیں مولوی محمد اسلم صاحب آنریری سکرٹری نے عنوانِ مندرجۂ بالا پر ایک مضمون پڑھا۔ چونکہ وہ مضمون بعض طلبا کی سمجھ میں نہیں آیا اسلئے اُن سے خواہش کیگئی کہ وہ اُسکا ترجمہ اُردو میں کردیں تاکہ ہر ایک کی سمجھ میں آجائے اور کوئی اُسکے نفع سے محروم نہ رہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہمارے تمام ناظرین کیلئے بھی یہ مضمون نہایت دلچسپ ثابت ہوگا۔

اڈیٹر

زبان۔ اُن آوازوں کا نام ہے، جنکے ذریعے سے ہر ایک قوم اپنی اغراض کا اظہار کرتی ہے، ان آوازوں کی نوعیت اور طرزِ ادا میں ہر قوم اور ہر ملک کے لوگوں میں لہجوں کے بدل جانے سے اِسقدر اختلافات واقع ہوگئے ہیں کہ جنکا شمار کرنا مشکل ہے۔ حال

کے محققین علم اللسان نے فلولوجی کے اُصول سے اِن تمام زبانوں کو بحیثیت اُن کی تہذیب کے مدارج کے دو قسموں پر تقسیم کیا ہے، مرتقی (شائستہ) اور غیر مرتقی (ناشائستہ)

غیر مرتقی- وہ زبانیں ہیں جنمیں الفاظ زیادہ صرف ہوں اور معانی کم ادا ہوں اِس قسم کی حبشیوں کی زبان ہے، جو جنوبی افریقہ کے باشندے بولتے ہیں- نیز امریکن انڈینز کی زبان بھی ایسی ہی ہے، چین کی زبان بھی اِسی طبقے میں ہے-

غیر مرتقی زبانوں میں خاص صفت یہ ہوتی ہے کہ اُن کے تمام الفاظ جُدا جُدا ہوتے ہیں -اور اسم، فعل، اور حرف میں کسی قسم کا فرق نہیں ہوتا- اور جبکہ اُسکی طرف دوسرے الفاظ جو بذاتِ خود اپنے معنی پر بالاستقلال دلالت کرتے ہیں، مضاف کر دیے جاتے ہیں تو ایک ہی لفظ کبھی اسم ہوتا ہے، کبھی فعل، کبھی حرف-

مرتقی زبانیں اپنی وسعت اور اسلوبِ ادا کے تعدد اور انواع تعبیر کے کثیر ہونے کی وجہ سے ممتاز ہوتی ہیں، اور اسمیں تمام اقوام اور ممالکِ متمدنہ کی زبانیں شامل ہیں، اب یہ متمدنہ اقوام کی زبانیں صرف اور اشتقاق کی قابلیت کے لحاظ سے دو قسم پر منقسم ہو جاتی ہیں- "منصرفہ" اور "غیر منصرفہ"

غیر منصرفہ کے تحت میں تورانی جسکی ایک شاخ ترکی بھی ہے، نیز تاتاری منغولی وغیرہ زبانیں داخل ہیں- غیر منصرفہ زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسے جامد اصول سے مرکب ہوتی ہے، جنمیں تغیر قبول کرنے کی قابلیت ہی نہیں ہوتی- اُس میں اشتقاق کی صرف یہ صورت ہوتی ہے کہ آخر میں ایسے حروف بڑھا دیے جاتے ہیں، جنکے فی نفسہ کوئی معنی نہیں ہوتے-

منصرفہ زبانیں وہ ہیں، جو اشتقاق اور تغیر قبول کرنیکا مادہ رکھتی ہیں خواہ اُن کے آخر میں کوئی حرف بڑھا دیا جائے، خواہ بیچ میں ڈالدیا جائے، اِن منصرفہ زبانوں کی دو نہایت عظیم الشان قسمیں ہیں-

(۱) **آریہ** - اسکا دوسرا نام "یافثیہ" بھی ہے یعنی یافث ابن نوحؑ کی طرف منسوب ہے کیونکہ آرین زبان بولنے والے تمام یافث کی اولاد ہیں - اُسکی بھی دو قسمیں ہیں - **جنوبی زبانیں**، مثلاً فارسی، افغانی، سنسکرت وغیرہ جو جنوبی ایشیا میں بولی جاتی ہیں اور **شمالی زبانیں** جسمیں یوروپ کی تمام زبانیں ہیں -

آرین زبانوں کی امتیازی صفت یہ ہے کہ وہ ایسے اصول (اصلی الفاظ) سے بنی ہوں، جنمیں تصریف، اِدراج ہو سکتا ہے، اُنمیں اشتقاق اسطرح پر ہوتا ہے کہ آخر میں ایسے حروف یا الفاظ بڑھا دیے جاتے ہیں جو فی نفسہ معنی رکھتے ہیں - مثلاً انگریزی میں اُسکی مثال یہ ہے -

(Thank) شکر گزار - (Thankful) شکریہ -

(unthankful) ناشکر گزار (unthankfulness)

ناشکری - ایسا ہی دوسری زبانوں میں بھی ہے -

(۲) **سامیہ** - اسکو سام بن نوحؑ کی نسبت کی وجہ سے سامیہ کہتے ہیں - اسمیں تین قسم کی زبانیں شامل ہیں -

(۱) آرامیہ - اسکی دو شاخیں کلدانی اور سُریانی ہیں - آرامی بابل کی قدیمی زبان ہے - اور سب سے پہلے دنیا میں یہی زبان علمی زبان تھی - کیونکہ ابتدا میں تمدن کا آغاز بابل ہی سے ہوا ہے - کئی صدی گذرنے کے بعد آرامی زبان اپنے اصلی مرکز سے ہٹ گئی، اُسکے بہت سے الفاظ بدل گئے وہی اُس کی بگڑی ہوئی شکل کلدانی کہی جاتی ہے، اور پھر کئی صدی گذرنے کے بعد کلدانی زبان نے ایک تیسری شکل اختیار کر لی، جو سُریانی کے نام سے موسوم ہوئی -

(۲) **عبرانی** - اس زبان کی دو شاخیں تھیں فینیقیہ فینشیا میں اور قرطجنیہ کارتھیج میں بولی جاتی تھی - اب یہ دونوں زبانیں مُردہ ہیں، آجکل بنی اسرائیل کے بعض لوگ

جو عبرانی بولتے ہیں وہ اصل عبرانی نہیں ہے، بلکہ اُس میں بہت سے الفاظ آرامی (سریانی، کلدانی) زبان کے ملے ہوئے ہیں، اور یہ اُسوقت ملے تھے جب اہلِ بابل نے انکو اپنے یہاں قید کر رکھا تھا۔

(۳) عربی۔ تمام سامی زبانوں میں یہی زبان سب سے بلند پایہ ہے۔ پہلے یہ جزیرہ نماے عرب میں محصور تھی، یہانتک کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ اُسیوقت سے اِس زبان کی ترقی بھی شروع ہوگئی۔ اور رفتہ رفتہ دنیا کے چاروں کھونٹ میں پھیلگئی۔ اِسلام کے ساتھ ساتھ یہ عالم میں دوڑتی رہی۔ ہندوستان سے مغرب الاقصےٰ اور جبلِ طارق تک اور بحرِ اسود سے بحرِ عرب تک پھیلگئی۔ اِسکے اوپر اللہ نے یہ ایک عظیم الشان اِحسان اور کردیا کہ اُسمیں قرآن نازل فرمایا، جو اِسکے لئے نہ صرف ثبتِ دوامی کا پروانہ ہوا، بلکہ اُسکو تغیّر اور تبدّل سے محفوظ کردیا، اور ہمیشہ قرآن کے ساتھ اِسکی ترقی کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

سامی زبانوں کی بڑی صفت یہ ہے کہ وہ زیادہ تر اُن الفاظ سے مرکّب ہوتی ہیں جو ۳ حرفی ہوتے ہیں جنمیں اشتقاق ہوتا ہے، یعنی اُن میں کوئی حرف یا لفظ اشتقاق کے لئے بڑھانا نہیں پڑتا، بلکہ حرکات کے تغیّر پر اُنکا دارمدار ہوتا ہے مثلاً عربی میں ''قَتلٌ'' ہے، جو اپنے معنی مصدری پر دلالت کرتا ہے۔ اب صرف حرکات کے بدلنے سے متعدد مشتقات اُس سے نکل آئینگے، اِسم بھی، فعل بھی، صفت بھی۔ جیسے قَتَلَ ماضی معروف، قُتِلَ ماضی مجہول۔ قِتلٌ دشمن جنگ آور قُتُلٌ جمع قاتل، علیٰ ہذا اُقتُلْ۔ اِنھیں حرکات میں سے کبھی ایک کو کھینچ دیتے ہیں جیسے قَاتَلَ، قَاتِلٌ، قَتِیلٌ۔ مَقتُولٌ، قَتَّالٌ۔ وغیرہ۔

اِن سامی زبانوں میں بہت سے خاصّے ہیں جنمیں یہ سب مشترک ہیں۔ اور تمام دنیا کی زبانوں سے وہ خاصّے اُن کو ممتاز کرتے ہیں۔ ایک خاصّہ تو یہ ہے کہ اِن میں

چند حروف ایسے ہیں کہ اِنکے سوا کسی دوسری زبان کا آدمی اُن کو اچھی طرح نہیں ادا کر سکتا مثلاً ح۔ ع۔ ق۔ ص۔ ط۔ وغیرہ۔

دوسرا یہ ہے کہ اِن میں مؤنث اور مذکر کی، افعال اور ضمائر میں تمیز ہوتی ہے تیسری بات یہ ہے کہ صرف اِنھیں زبانوں میں ضمیریں فعل، اِسم اور حرف تینوں کے ساتھ مستقل ہوتی ہیں۔

اب اِس بات میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے کہ ان سامی زبانوں میں کونسی زبان اصلی ہے، کیونکہ اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ عبرانی، سریانی، کلدانی، عربی وغیرہ وغیرہ سب ایک ہی جڑ سے پیدا ہوئی ہیں۔

قدما میں سے بہت سے لوگوں نے یہ کہا کہ اِن سامی زبانوں کی ماں عبرانی زبان ہی متاخرین کہتے ہیں کہ اصل سریانی ہے اور عبرانی اور عربی اُس کی فرع ہیں۔ لیکن صحیح رائے یہ ہے اور یہی ہمارا دعوےٰ ہے کہ عربی تمام سامی زبانوں میں اصلی اور قدیم ترین زبان ہے، اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اصلی سامی زبان مٹ گئی تو عربی زبان اُس اصل سے بہ نسبت تمام زبانوں کے زیادہ قریب ہے، اِسکی بہت سی دلیلیں ہیں اُن میں سے چند ہم یہاں پر نقل کرتے ہیں۔

(۱) پہلی دلیل یہ ہے کہ عبرانی اور سریانی زبانوں میں بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں جنکی اصلیت کا پتا نہیں، اور اُن کی حقیقت بالکل مبہم ہے۔ لیکن اُنکی اصلیت عربی میں ملتی ہی اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی اصل زبان ہے، جس میں اصول اور فروع دونوں محفوظ ہیں، اور سریانی اور عبرانی فرع ہیں۔

(۲) وہ تمام الفاظ اصلیہ جو عبرانی اور سریانی میں ہیں، اور جن سے یہ زبانیں بنی ہیں، محققین علمانے تحقیق کرلیا ہے کہ سوائے چند کے وہ سب کے سب عربی میں پائے جاتے ہیں، اور عربی میں بہت سے الفاظ اصلیہ ایسے ہیں جنکا پتا نہ عبرانی میں ہے نہ سریانی میں۔

اِس سے صاف اِس امر کا ثبوت ہوتا ہے کہ اہلِ عرب نے جنکا حافظہ تمام دنیا کے نزدیک مسلّم ہے، اصل سامی زبان کو محفوظ رکھا، اور اُسکے تمام اصول اُن کے یہاں برقرار رہے۔ بخلاف اسکے سُریانیوں اور عبرانیوں نے کچھ لیا اور کچھ چھوڑا اور جو لیا وہ بھی محفوظ نہ رکھ سکے، بلکہ اُسمیں بھی تغیّر و تبدّل کر دیا۔

(۳) تیسری دلیل یہ ہے کہ تمام عربی الفاظ سوا دو تین کے ایک ہی قانون ایک ہی قیاس کے مطابق گردانے جاتے ہیں، اور قاعدہ جو مقرر ہے وہ کہیں نہیں ٹوٹتا۔ بخلاف اسکے سُریانی اور عبرانی میں شذوذ کثرت سے ہے، اسلئے یہ یقیناً ثابت ہوا کہ عربی زبان اصلی زبان ہے، اُسمیں شروع سے آجتک اُصولاً کوئی تغیر و تبدّل اہلِ عرب نے نہیں آنے دیا۔

(۴) چوتھی دلیل یہ ہے کہ بعض الفاظ عربی میں ایسے ہیں جنمیں ضاد ہے وہی الفاظ عبرانی میں ہیں اور اُنھوں نے ضاد کو صاد بنا لیا ہے، وہی الفاظ سُریانی میں ہیں اُنھوں نے اُس ضاد کو عین بنا لیا ہے۔ مثلاً عربی میں ہے، ارض، ضاق، قبض، عبرانی میں ہے، ارص، صاق، قبص، سُریانی میں ہے، ارع، عاق، قبع۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ عربی میں عبرانی اور سُریانی سے نہیں لئے گئے ہیں، کیونکہ اگر عبرانی سے لئے جاتے تو عربی میں خود صاد موجود ہے، اہلِ عرب بھی اُسکو ارص، صاق۔ قبص بولتے۔ ضاد سے بدلنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ علیٰ ہٰذا سُریانی سے بھی نہیں لئے گئے ہیں کیونکہ عربی میں عین بھی موجود ہے۔ وہ ضاد سے کیوں بدل دیتے۔ آسانی سے ارع۔ عاق۔ قبع۔ پڑھ سکتے تھے، اسلئے یقیناً یہ الفاظ عبرانی اور سُریانی میں عربی سے لئے گئے ہیں، اور چونکہ اُن دونوں زبانوں میں ضاد نہیں ہے اِسلئے عبرانیوں نے ضاد کو صاد سے اور سُریانیوں نے عین سے بدل دیا۔

علامۂ موصلی نے لکھا ہے کہ تاریخی شہادت سفرِ ایّوب سے ملتی ہے کہ عربی

بہ نسبت عبرانی کے قدیم ہے کیونکہ عبرانی میں سب سے پہلی کتاب وہی لکھی گئی اور اُس میں ہزاروں عربی لفظ ہیں -

اِن سب دلائل کے دیکھنے سے اِس امر میں مطلق شبہہ نہیں رہتا کہ عربی زبان اصل سامی زبان ہے اور یہی عبرانی اور سُریانی کی ماں ہے، اور سب سے قدیم ترین ہے - اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اصل سامی زبان مٹ گئی تو یہ اس اصلی زبان سے بہ نسبت عبرانی اور سُریانی کے زیادہ ترقریب ہے، یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ عربی زبان بہ نسبت عبرانی وغیرہ کے کیونکر قدیم ہو سکتی ہے، عبرانی میں عربی سے سینکڑوں برس پیشتر کتابیں لکھی جاتی تھیں - علیٰ ہذا سُریانی بھی - بر شام - جزیرہ، عراق، مادی، فارس اور آرمینیہ میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں، کئی نسلوں تک اُن کی زبان رہی، اور عربی تو اسلام کے بعد لکھی جانے لگی ہے، یہ کیسے اُن زبانوں سے قدیم ترین ہو سکتی ہے -

اِسکا جواب یہ ہے کہ اِن سب باتوں سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ عربی میں اِسلام کے پیشتر کتابیں نہیں لکھی گئیں اور یہ کہ اُسمیں علم نہیں تھا، ورنہ زبانِ عربی عرب برابر ہمیشہ سے اپنے ملک میں بولتے رہے، اشعار کہتے رہے خواہ لکھیں یا نہ لکھیں ہم تو یہ کہتے ہیں کہ عربی، سُریانی، عبرانی - سب کی اصل ایک ہی زبان یعنی سامی زبان تھی - اِسی زبان میں سُریانیوں اور عبرانیوں (یہودیوں) نے تغیر اور تحریف پیدا کر دیا - کیونکہ مدتوں تک وہ بوجہ اُن واقعات اور حادثات کے جو غیر قوموں کی سلطنت سے اُنپر واقع ہوتے رہے، ایک مقام سے دوسرے مقام کو بھاگتے رہے، اور اِن مصائب، تکالیف اور گردشوں کے اثر نے اُن کی اصل زبان کو خراب کر دیا - اُنھیں زبانوں کا نام سُریانی اور عبرانی رکھا گیا - بخلاف اس کے اہل عرب اِن آفات سے ہمیشہ محفوظ رہے، وہ اطمینان کے ساتھ اپنے ملک اور اپنی زبان کی حفاظت کرتے رہے، نہ اُن کے اوپر کسی اجنبی قوم نے حکومت کی

نہ کبھی وہ کسی پر حکومت کرنے گئے اسلئے اصل سامی زبان اُن کے پاس محفوظ رہی۔

ایک صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اہل عرب قحطان یا یقطان کی اولاد ہیں۔ جو عابر یعنی عبرانیوں کے باپ کا بیٹا تھا، اِسلئے عربی زبان کا تعلق یقطان کے ساتھ ہے اور عبرانی کا اُسکے باپ عابر کے ساتھ۔ پھر عربی کیونکر قدیم ہوئی۔ اُسکا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ بے شک اہل عرب یقطان کی اولاد سے ہیں، لیکن یہ کہنا کہ یقطان کی زبان عربی تھی اور اُسکے باپ عابر کی زبان عبرانی تھی۔ ایک سخت نادانی ہے۔ یقیناً باپ بیٹے کی ایک زبان تھی۔ اور یہی وہ اصلی زبان ہے جسکو ہم سامی کہتے ہیں، کیونکہ عابر سام کے پوتے کا بیٹا تھا (توراۃ دسواں باب۔ سفر التکوین) لیکن یقطان کی اولاد نے اسکو زیادہ محفوظ رکھا اور دوسری شاخوں نے اُسمیں تغیّر و تبدّل کردیا۔

اِن سب دلائل کے دیکھنے کے بعد ہر شخص یقین کریگا کہ اہل عرب نے اصل سامی زبان کو نہایت محفوظ رکھا، اور نیز یہ کہ عربی زبان اُن اصلی اور اُمّہات لغات میں سے ہے جو ابتدا میں پیدا ہوئی تھیں جیسے یونانی، فارسی، جرمن زبانیں۔

ایک بات یہ بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ملاحظہ ہے کہ عربی زبان نے عبرانی اور سُریانی بلکہ تمام سامی زبانوں کو دنیا سے نیست و نابود کردیا اور اُن کے بجائے خود مُستولی ہوگئی۔ بلکہ ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ سُریانی زبان جو مدّتوں تک مختلف سلطنتوں کی زبان رہی ہے اب اُسکا نام تک عربی نے مٹادیا۔ اور کوئی قوم اور کوئی مقام ایسا باقی نہیں رہا جو سُریانی کے نام سے موسوم ہو۔ اِس زمانے میں سُریان صرف ایک مشرقی عیسائیوں کے گروہ کا نام ہے نہ کہ کسی قبیلہ یا کسی قوم کا۔ یہ بھی اس بات کی بڑی دلیل ہے کہ جب عبرانیوں اور سُریانیوں کو عربی زبان ملی جو اُن کی اصلی زبان تھی تو اُنھوں نے اپنی بگڑی ہوئی زبانوں کو چھوڑ دیا اور اُسکو اختیار کرلیا۔

اِن سب باتوں کے علاوہ عربی زبان کی اور بہت سی فضیلتیں ہیں، جنکو تمام

محققین علم اللسان متفق اللفظ ہوکر تسلیم کرتے ہیں -

(۱) عربی زبان اسقدر وسیع ہے اور اُسکے الفاظ اصولاً فروعاً اشتقاقاً کثیر التعداد ہیں کہ ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ عربی زبان دنیا کی تمام زبانوں سے وسیع تر ہے کسی زبان میں ایک معنی اِستنے مختلف پیرایوں سے نہیں ادا ہوسکتا جسقدر کہ عربی میں ادا ہوسکتا ہے، انسان اِس زبان کا خواہ کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہو مگر یہ ناممکن ہے کہ اُسکے تمام الفاظ کا اُسکو علم ہو - اور اُس کی باریکیوں اور دقائق سے کماحقّہ واقف ہو - بہت سے الفاظ ایسے ہونگے کہ اُن کے لئے اُسکو ڈکشنری کا مطالعہ کرنا پڑیگا -

(۲) عربی زبان کی ایک عجیب خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ تمام دنیا کی زبانوں کی بہ نسبت فطرتی اصول لسانی سے بہت زیادہ قریب ہے - اُسکی عبارت سلیس اور گفتگو آسان ہوتی ہے اور ایک صحیح خیال کا آدمی باریک سے باریک اور پیچیدہ سے پیچیدہ مطلب کو نہایت صفائی اور خوبی سے عربی میں ادا کرسکتا ہے جسکو طبیعت آسانی سے قبول کرلیتی ہے، اور اُسمیں تصنّع اور تکلّف کی ضرورت نہیں پڑتی - اور فطرتی قانونِ لسانی کی پیروی جس آسانی سے عربی زبان میں ہوسکتی ہے اُس آسانی سے اور کسی زبان میں نہیں ہوسکتی، یہ خصوصیت اگرچہ اِس میں بعض اور بھی سامی زبانیں شریک ہیں لیکن یوروپ کی کسی زبان میں بھی پائی نہیں جاتی -

علامہ شیخ احمد فارس نے اپنی کتاب **منتہی العجب** میں لکھا ہے کہ فرانسیسیوں کی زبان بہ حیثیت ترکیب اور سلاست کے ابتک بالکل بچپن کی حالت میں ہے، یعنی وہ ایک جملہ کہتے ہیں، پھر دوسرا جملہ بولدیتے ہیں اور حرفِ عطف یا ربط درمیان میں نہیں لاتے جس سے سلاست بالکل مفقود ہوجاتی ہے، اور کلام میں مناسبت اور ارتباط نہیں رہتا - بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اُن کا کلام منتظم اور مسلسل وار ہو اسکی کئی وجہیں ہیں - ایک تو یہ کہ وہ سبب اور مسبّب میں علاقہ پیدا کرنے کے لئے کوئی ہما

حرفِ ربط نہیں رکھتے، دوسرے یہ کہ مطابقی معنی میں الفاظ کو کم استعمال کرتے ہیں،
کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک جملے کا حصّہ دوسرے جملے میں داخل کر دیتے ہیں، اور
جملے آپس میں پنجہ کشی کرنے لگتے ہیں، کبھی سطلق کو سفید اور سفید کو سطلق بنا دیتے ہیں
وغیرہ وغیرہ ''۔

(۳) عربی جسطرح بولی اور پڑھی جاتی ہے اُسیطرح لکھی بھی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص
اُسکے حروف اور حرکات سے واقف ہے تو وہ نہایت آسانی سے ہر ایک عربی عبارت
کو جہاں سے چاہے پڑھ سکتا ہے، اُسکے رسمُ الخط کے وہی قوانین ہیں جو فطرتاً
ہونے چاہئیں۔ اور شاید ہی کہیں اُن کی مخالفت ہوتی ہے۔ بخلاف اِسکے یوروپین
زبانوں کو اگر کوئی شخص سیکھنا چاہیئے تو اُسکو ابتدائی نوشت و خواند سیکھنے کے
بعد ایک ایک کلمہ پڑھنا پڑیگا۔ ورنہ خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہو وہ لفظ جو اُسنے
کبھی نہیں پڑھا ہے بشکل سے صحیح لکھ یا پڑھ سکیگا، اِس عیب میں فرنچ اور انگلش حد سے
زیادہ بدنام ہیں۔ اور باوجود اِسکے کہ ترقی علوم و فنون کے لحاظ سے یہ دونوں قومیں
آج آسمانِ علم کا تارا بنگئی ہیں، لیکن رسمُ الخط اِسقدر لغو ہے کہ بچّوں کی ایجاد معلوم
ہوتی ہے، انگریز اور خاصکر اہلِ امریکا تو اب اِسکی طرف متوجہ بھی ہوئے ہیں، لیکن
فرانسیسیوں کو اِسکا کچھہ خیال نہیں، اُنھوں نے آئی کیٹ کے قواعد اور قوانینِ معاشرت
تو اِس خوبی کیساتھ منضبط کرلئے لیکن تعجب ہے کہ ابتک اُن کو یہ نہ خیال آیا کہ اپنی زبان کے
رسم الخط کو ٹھیک کریں۔

علامہ موصلی لکھتا ہے کہ '' یوروپین زبانوں کا نقص دیکھو شلاً ایک لفظ ہے۔
(Chessa) اٹلی کے لوگ اُسکو کچا پڑھتے ہیں۔ جرمن ختس یا ختستا کہتے
ہیں۔ فرنچ اِسکا تلفظ شوس کرتے ہیں، انگریز چوس یا چیوس بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے
کہ بہت سے عجمی الفاظ شلاً ہندی، چینی، عربی، وغیرہ جب یوروپین زبانوں میں جاتے

ہیں تو اُن کی ساری ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی ہے، اور وہ کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک قوم اور ملک کے باشندے طرح طرح سے اُسکا تلفظ کرتے ہیں اور آخر وہ لفظ اِسقدر خراب ہو جاتا ہے کہ اگر اہل زبان کے سامنے اُسکو پیش کریں جس زبان کا کہ وہ لفظ ہے تو وہ ہرگز اُسکو پہچان نہ سکینگے۔

(۴) جن کلامی ضروریات کا انسان محتاج ہے، عربی زبان اُن سب کے لئے کافی ہے۔ اِسلئے اُسکو کسی امر میں کسی عجمی زبان کے لفظ کی حاجت نہیں ہے۔ اگر اہل عرب اِن چند الفاظ کو بھی جو خواہ مخواہ غیر زبانوں سے عربی میں داخل ہو گئے ہیں نکالنا چاہیں تو آسانی سے نکال سکتے ہیں۔ کیونکہ اسی معنی کے ادا کرنے کیلئے اُن کے یہاں خود الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ یہاں پر یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اہل عرب نے تمام علوم دخیلہ غیر زبانوں سے اور خاصکر یونانی سے لئے۔ لیکن تمام علمی اصطلاحوں کے لئے انکو خود اپنی زبان سے الفاظ ملگئے، منطقی اصطلاحات، تصور، تصدیق، جزئی، کلّی، خاصّہ، فصل، وغیرہ وغیرہ سب عربی ہیں۔ طبّی اصطلاحات، معدہ، ہوا، برودۃ شخص، غرض اور تمام امراض اور ادویہ کے نام عربی ہیں۔ علیٰ ہذا فلسفہ، طبعیات، معدنیات، فلکیات، غرض تمام علوم کی اصطلاحیں عربی سے ملگئیں۔ اسکے مقابل میں اگر یورپ کی زبانوں میں دیکھو تو وہاں وہی اصل لاطینی اور یونانی زبان کی اصطلاحیں توڑ موڑ کے رکھی ہوئی ہیں۔

(۵) سوا اے علوم جدیدہ کے وہ تمام علوم جو آج سے دو یا تین صدی پیشتر تمام دنیا میں رائج تھے، اُن کا زیادہ تر ذخیرہ عربی میں ہے۔ میں مثالاً صرف ایک تاریخ کو پیش کرتا ہوں کہ آج ہمارے پاس عربی میں چودہ سو سے زائد تواریخ کی کتابیں موجود ہیں۔ یورپ میں ابتک مشکل سے سو دو سو کتابوں کا ترجمہ ہوا ہوگا۔ اِسلئے اِن علوم کی حیثیت سے دانی باقی ہے اُسوقت تک دنیا کی کوئی زبان عربی سے دُنیا والوں کو مستغنی نہیں کر سکتی۔

اِسکے ساتھ ہی میں یہ بھی کہتا ہوں کہ عربی ہی قدیم زبانوں میں سے ایک ایسی زبان ہی جو برابر ترقی کرتی چلی جارہی ہے، کسی زمانے میں اِسکی ترقی رُکی نہیں، نئی زبانیں نئے علوم دنیا کی پُرانی زبانوں کو میٹتے چلے جاتے ہیں مگر عربی بڑھتی جاتی ہے اور اُسکے ساتھ یہ بھی خوبی ہے کہ عربی کی اصلی حیثیت میں تغیر تبدّل اور تحریف نہیں ہوتی نہ اُسکے الفاظ خراب کئے جاتے ہیں لیکن یہ احسان قرآن کا ہے، جس نے اُسکی اصلی حالت کو اِسطرح جڑ دیا ہے، جسطرح میخیں لوہے کے تختے کو جڑ دیتی ہیں - ذیل میں - میں عثمانی رپورٹوں سے نقل کرکے ایک جدول میں اُن لوگوں کے اعداد و شمار درج کرتا ہوں، جو اِسوقت عربی بولتے ہیں -

ایشیا

ولایت حجاز -	۳و۵۰۰و۰۰۰
یمن -	۲و۵۰۰و۰۰۰
نجد - حضرموت - عمّان - بحرین وغیرہ -	۶و۰۰۰و۰۰۰
ولایت دیار بکر -	۴۷۱و۴۶۲
الموصل -	۳۰۰و۲۸۰
بغداد -	۸۵۰و۰۰۰
ولایت بصرہ -	۲۰۰و۰۰۰
حلب -	۶۹۴و۶۰۴
سیریا -	۶۰۰و۰۰۰
بیروت	۴۰۰و۰۰۰
متصرفیۃ القدس -	۳۴۹و۰۰۰
لبنان -	۲۵۰و۰۰۰

افریقہ

مصر۔		۷و۰۰۰و۰۰۰
سوڈان۔		۱۰و۴۰۰و۰۰۰
طرابلس غرب۔		۸۰۰و۰۰۰
بنغازی۔		۵۰۰و۰۰۰
جزائر الغرب۔		۴و۱۲۴و۰۰۰
مراکش۔		۵و۰۰۰و۰۰۰
تونس۔		۱و۵۰۰و۰۰۰
زنجبار۔		۲۰۰و۰۰۰
ٹوٹل۔		۴۶و۰۲۹و۳۴۶

اِن کے علاوہ اِن ممالک کے پڑوسی اور بہت سے آمد و رفت رکھنے والے لوگ بھی عربی بولتے ہیں، اور یقیناً اِسوقت تمام دنیا میں عربی بولنے والوں کی تعداد پچاس ملین سے کسیطرح کم نہیں ہے۔

اسلم۔ جیراج پوری۔
مدرسۃ العلوم علیگڈھ۔

ہیزلٹ کا خط اپنے لڑکے کے نام

میرے پیارے! تمھارا قیام اب اسکول میں رہیگا اور غالباً تم اُسے دنیا میں داخل ہونیکا پہلا زینہ سمجھو گے، چونکہ میرے قویٰ اب جواب دینے لگے ہیں، اور شاید میری زندگی وفا نکرے اسلیئے میری تمنا ہے کہ تمھارے آداب زندگی کے لئے میں چند نصائح بطور وصیت چھوڑ جاؤں، تاکہ وہ تمھارے کام آئیں، اور اس تقریب سے میری یاد تمھارے ذہن میں باقی رہے، اور کچھ نہیں تو میں اپنی غلطیوں سے تمھیں آگاہ کردونگا، تاکہ اُن سے تم حفظ ما تقدم کا کام لو۔

ہم لوگ جب تمھاری نئی جگہ پر گئے، تو تم نے تکرار کے ساتھ حقارت آمیز الفاظ میں کہا کہ "مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ بیوقوف اور ناپسندیدہ مردوں میں سے ہیں" لوگ سے مُراد اسکول والوں سے تھی، اسمیں تمھارا سراسر قصور تھا۔ ہر شے سے اچھے توقعات رکھنا نہایت عمدہ اصول ہے۔ میرے پیارے! ہمیشہ ہر امر کو صحیح مانو جبتک تمکو اُسکے خلاف کوئی ثبوت نہ ملجائے، اسپر بھی اُن سے آزردہ ہونے کی بجائے اُن کے برداشت کرنے کی کوشش کرو، اگر تم میں اسکی اصلاح کی طاقت نہیں ہے، تم نے کہا "مجھے یقین ہے کہ میں جہاں جارہا ہوں وہ جگہ نہایت ناپسند ثابت ہوگی" یہ غلط تھا۔ دراصل دریغ تمھارا مطلب یہ تھا کہ تم گھر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، کیونکہ تم قبل از آزمائش کہہ نہیں سکتے تھے کہ اسکول تمھیں پسند آئیگا یا نہیں ورنہ تمھارا قبل از وقت یہ کہنا کہ ہم اسکو پسند نہیں کرینگے اسبات کا پتہ دیتا تھا کہ تمھارا ارادہ ہی پسند کرنیکا نہیں تھا۔ کبھی بُرائی کی پیشدستی نکرو یا چونکہ تمھارے مزاج کے موافق کوئی چیز نہیں ہوتی ہے اسلیئے محض اپنی ضد اور

عداوت سے اُسکو اور بھی ناقابلِ برداشت بنادو۔

اوائل میں تم اپنے ہم مکتبوں کیطرف کچھ توجہ نہیں کرتے تھے، بلکہ اُن کے خلاف رہتے تھے صرف اسوجہ سے کہ وہ اجنبی تھے، مگر وہ بھی تم سے اتنا ہی ناواقف تھے جتنا تم اُن سے، اور غالباً یہی وجہ اُن کی علٰحدگی کی بھی ہوئی ہوگی، جسکو تمنے ایک مصیبت خیال کیا۔ اسکو خوب ذہن نشین کرلو کہ ہرگز کسی کیطرف سے بُری راے نہ قائم کرو۔ جب تم اُن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، اُن کو ہرگز بُرا نہ سمجھو جبتک اُنکا برتاؤ تمھارے ساتھ بُرا نہ ہو۔ پھر بھی اُن کی کمزوریوں کو نظرانداز کرنے کی کوشش کرو۔ اِس سے اُن کی مخالفت توڑنے میں وہ مدد ملیگی، جو رنج یا شکوہ و شکایت سے نہیں ملسکتی۔

میرے خیال میں تم چند لڑکوں کے لباس پر نکتہ چینی کرنے پر آمادہ تھے۔ کسی کو اِس بنا پر حقارت کی نظر سے نہ دیکھو۔ کہ فلاں چیز اُسکے مقدور سے باہر ہے۔ اُسکو غربت پر تو ہرگز ہرگز نہیں۔ البتہ میری یہ خواہش ہے کہ تم ظاہری صورت کو دنیا کے طعن و تشنیع سے محفوظ رکھنے کے لئے قائم رکھو مگر تم کو کبھی اُنپر فخر کرنے نہ دونگا، عام تعصبات و توہمات کا تمھیں بندہ نہیں ہونے دونگا۔ اِس سے اعلیٰ نصیحت تو یہ ہو اگر میں یہ کہوں کہ "کسی کو حقارت کی نظر سے مت دیکھو" کیونکہ حقارت سے مُراد دوسرے کے نقائص پر تفاخر اور مسرت ہے، اسکے یہ معنی نہیں کہ تم دوسروں کی کمزوریوں اور بدقسمتیوں سے خوش ہو، اور اپنے آپ کو مبارکباد دو، دوسروں کی کہتری کا احساس اگر اِس میں خودپسندی نہ بھی ملی ہوئی ہو تکلیف دہ ہے، مسرت بخش نہیں۔

تم شکایت کرتے ہو کہ لڑکے تمپر ہنستے ہیں، فقرے چُست کرتے ہیں اور تمھاری پروا نہیں کرتے تمھارے ساتھ گھر کیطرح برتاؤ نہیں کرتے۔ میرے لال! یہی تو سب سے بڑی وجہ تمھارے اسکول بھیجنے کی ہوئی۔ قبل ہی سے اُن لاعلاج دُکھوں اور ناملائم سلوک کا تمھیں عادی بنانا مقصود تھا۔ جو تمھیں دنیا میں نصیب ہونگے۔ تم میرے ساتھ ہنستے تو

رہو گے نہیں، اور ہر شخص سے یہ توقع رکھنا کہ وہ میری ہی طرح تمھارا خیال کریگا، بعید از عقل ہے۔ ابتک تم غارت شدہ لڑکوں میں تھے۔ اور ہر کام میں اپنی ہی ہٹ رکھنے کے عادی تھے۔ کیا گھر میں اور کیا ساتھیوں کے ساتھ تمھیں افسر بننے کا از حد شوق تھا لیکن چونکہ تم نیک بخت اور سمجھدار ہو اسلئے اُمید ہے کہ ایک عرصے میں اس کمزوری پر غالب آجاؤ گے۔ تمھارے ساتھ اب ایسے لڑکے ہیں جو تمھاری برابری کے ہیں یا تم سے بڑے اور مضبوط ہیں، جنکو علاوہ تمھارے توہمات اور خیالات کی خاطرداری کے اور کام پر بھی توجہ کرنا ہے، اور تم اُنکی اس حرکت کو نفرت یا ناانصافی پر محمول کرتے ہو، پہلا سبق تمھیں یہ سیکھنا ہے کہ دنیا میں تمھارے جیسے اور لوگ بھی بستے ہیں جس اسکول میں تم ہو وہاں اور بھی ایسے لڑکے ہیں جنکی تفریحات اور مشاغل (جو کچھ بھی ہوں) اُنکے لیے اتنا ہی قابل لحاظ ہیں، جتنا تمھارے، لہذا اُنکو بھی اُنکے لیے راہ دینی ہوگی۔ جتنا تم بنو گے اور لڑکوں سے الگ تھلگ رہو گے اُتنا ہی تم تنگ کیے جاؤ گے اور ستائے جاؤ گے۔ سچی ہمسری ہی تو اصلی ادب اور عقلمندی ہے، پس ہمیشہ اسکو یاد رکھو کہ تم بہت سے اشخاص میں شخصِ واحد ہو اور ہرگز تم سوسائٹی میں اپنی جگہ کو نہیں بھول سکتے۔ اپنے باپ کے مکان میں تم اپنی مرضی کے مطابق کام کیا کرتے تھے مگر دنیا میں ہر قدم پر ایک رقیب پاؤ گے، تم بادشاہ کی اولاد ہو نہیں کہ لاکھوں کے سیاہ و سفید پر اختیار رہو۔ تم بس اسقدر توقع رکھ سکتے ہو کہ اِن لوگوں کے نصیب کے شریک دار رہو، اور اپنے جھگڑے انکو دوستانہ طور سے طے کرو۔ یہ سب باتیں تم اسکول میں پاتے ہو، میری خواہش یہ ہے کہ جہاں تک جلد ہو سکے اپنی حالت کو سمجھو اور اُسپر قانع رہو۔

میں دیکھتا ہوں کہ تم ہم مکتبوں کا ذکر ایک خاص طریقے سے کرتے ہو، مثلاً "وہ جو ہے ایک اشفاق، وہ جو ہے ایک کریم" از ین قبیل۔ گویا اِن لوگوں کو تم نے خاص کر اپنی لعنتوں کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ یا یہ کہ تم اِنھیں اپنے لائق نہیں سمجھتے ہو۔ دوسروں کا

ذکر بے عزتی سے کرنا بُری عادت ہے کیونکہ اس سے رفتہ رفتہ تم تنگدلی سے انکو یاد کروگے۔

چند بار اگر خفیف طور سے چھیڑے بھی جاؤ تو مناسب یہ ہے کہ اخلاق، حلم اور نرم دلی سے کام لو، نہ یہ کہ بے صبری اور خفگی سے، دوسروں کے عیوب عموماً ہم لوگوں کی بدمزاجی سے پیدا ہوتے ہیں یا اگر وہ حقیقت میں ہیں تو اُن کی اصلاح ناراضی ظاہر کرنے سے نہیں ہو سکتی۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ویسا برتاؤ کرو جیسا ہیملیٹ پلونیس کو بازیگروں کے ساتھ سلوک کرنے کی نصیحت کرتا ہے کہ "اُنکے ساتھ اپنے رتبے کے مطابق برتاؤ کرو نہ کہ اُن کی لیاقت کے مطابق"۔ اگر تم اُن کی ذرہ ذرہ سی باتوں پر جو تمھیں ناپسند ہوں آپے سے باہر ہو جاؤ گے، یا یہ خیال کروگے کہ وہ عمداً تمکو تنگ کرنے کیلئے تُلے ہوئے ہیں تو تم اپنے آپ کو اُنکی بدمزاجی، بدخلقی اور وہم کا نشانہ بنادوگے۔

قبل از وقت دنیا سے لڑنا مت شروع کرو، کیونکہ دنیا خراب سہی، لیکن عارضی قیام کی اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ ہے، اگر ہزل گوئی دنیا کو اعلیٰ تر بنا سکتی تو کب نہ ترقی کے اعلیٰ طبقے پر پہونچ گئی ہوتی، مگر بالفعل اسکی توقع نہیں ہے لاچار ہم لوگوں کو خاموشی کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہی ہوگا۔ دنیا کا سب سے بڑا نقص فیاضی کی کمی ہے، اور یہ کمزوری کسی کو ہر لحظہ بدمعاش یا احمق کہنے سے رفع نہیں ہو سکتی۔ یہ خیال کرو کہ اگر بدمعاشوں کی اور احمقوں کی اتنی کثرت نہوتی، جتنی کہ مشاہدے میں آتی ہے تو ایمانداروں کی اور عاقلوں کی نایابی کے باعث جو قدر و قیمت ہے، نہوتی۔ اور فلسفیانہ طریق سے اگر غور کرو تو بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ دنیا بالکل نکمی ہے تو یہ امر قابل تاسف ہے نہ وجہ ملال۔ ہمیں اختیار ہے کہ لوگوں کے دیوانہ پن پہ آنسو بہاویں، تمسخر کریں مگر ہمیں کوئی حق نہیں حاصل ہے کہ اپنے لئے یا اُن کیلئے اُنھیں بُرا کہیں، نوعِ انسانی سے نفرت کرنا فطرتِ انسانی کی تحقیر نہیں ہے بلکہ اپنی، یا یوں کہیے کہ اپنے عیوب کو دوسروں کے

سر ڈالنا ہے، بہرحال جو کچھ میں نے اس موقعہ پر کہا کبھی نہ بھولنا، میں نہیں چاہتا کہ موجودہ
خرابیوں کی پردہ پوشی کرنے کی کمینی عادت ڈالو۔ یا بری سے بری چیزوں کو سنکر انجان
بنجاؤ۔ میری صرف یہ خواہش ہے کہ عام اور بے دھڑک ہجو کہنے سے کام نہیں نکلتا۔
دوسری طرف وہ لوگ جو خلق اللہ کی نسبت بڑے بڑے منصوبے قائم کرتے ہیں، اکثر
اچھی مثال پیش نہیں کرتے، یا ان کو پستی سے اٹھانیکی کوشش نہیں کرتے۔ وہ صرف اپنے
وہم کی تکمیل کے متمنی ہیں

تمھارے اسکول کے سبق کے متعلق یہ کہنا ہے کہ تم لاطینی اور فرانسیسی زبان
اور علم الرقص سیکھو، (آخری نصیحت ہندوستان کے طالبعلموں پر عائد نہوگی)۔ آخرالذکر
نصیحت پر میں زیادہ زور دونگا۔ چونکہ اوّلاً اسکیطرف لوگ بہت کم توجہ کرتے ہیں دوسرے
دنیا میں یہ کامیابی کیلئے سب سے بڑا آلہ ہے۔ اور اسکا انحصار (علاوہ شکل ظاہری کے
جو اختیاری نہیں ہے) دو چیزوں پر ہے۔ لباس اور طریقہ نشست و برخاست جنکی طرف
توجہ کرے تو ہر شخص حاصل کرسکتا ہے، یہ زندگی کے وہ ادنےٰ سکے ہیں، جنکی مانگ ہر گھڑی
قائم رہتی ہے، اور شاید سال کے یا زندگی کے ختم پر تمھیں معلوم ہوگا کہ ان ذری ذری باتوں
کیطرف عدم توجہی کرنے کے باعث جو جو ذلتیں اور سرد مہریاں تمکو نصیب ہوئی ہیں
ان کی تلافی ہرگز اس عزت یا مدح سے نہیں ہوسکتی جو محض تمھاری لیاقت کیوجہ سے
ہوئی ہو، جب ہم عمداً ان چیزوں سے غفلت کرتے ہیں جنکو ہم جانتے ہیں کہ دوسرونپر
عمدہ اثر ڈالینگی تو اس سے مراد یہ ہے کہ ہم انکی راے کا خیال مطلق نہیں کرتے یا اپنے
کو اس سے اعلےٰ اور ارفع سمجھتے ہیں جسکا خیال کرنا خالی از الزام نہیں ہے۔

اپنی ذات کی آرایش سے لاپروائی کرنا دوسرونکی ذلت کرنا ہے یہ اکثر اچھی
خصلت کی محتاجی نکے باعث ہوتا ہے نہ ناسمجھی کے۔ وہ پرانی مثل کہ "خوش کرنیکی
کوشش کرو اور ہمیشہ تم اس میں کامیاب رہوگے"، کُل معاملات کو روشن کردیتی

سے ہے۔ آدمی عزم کرے تو بدسلیقگی پر ہر وقت غالب آسکتا ہے، لیکن خوش اسلوب چال کیلئے ابتدا میں عادت ڈالنے کی غرض سے اور بھی اکثر حالات میں رقاص کی تعلیم درکار ہے میں ہرگز تمھیں کسی کے آستانے پر لا کھڑا کر کرنے نہ دونگا، اگر تم باقاعدہ کسی کمرے میں داخل ہونا نہیں جانتے، کیا معلوم ہے، شاید اُن میں سے کسی کے ساتھ تمھاری آیندہ زندگی گزرنیوالی ہو۔ بدسلیقگی سے بڑھکر کوئی چیز برا اثر نہیں ڈالتی۔ جو شخص معمولی آداب جلسہ کے برتنے میں پریشان اور مرعوب ہوجاتا ہے، اُسکے حرکات ایک مجرم کے مماثل ہوتے ہیں یا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے میں کوئی خوبی قابلِ اطمینان نہیں پاتا، برخلاف اس کے راست بازی، آزادی اور خودداری دوسرونکو تمھاری طرف سے مطمئن کردیتی ہے، عورتوں میں ادا ایک حُسن ہے اور مردونکے دِلوں پر جلد قبضہ کرلیتی ہے اور دیر تک قابو میں رکھتی ہے، یہ خوبیِ نفس کی ایک ظاہری علامت ہے۔ مردوں میں اسکی کمی ہو تو انکے دِلوں میں جگہ بنا نہیں پڑی سکتے۔

دوسری بات جسکے خلاف تمھیں ہوشیار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کتابوں میں اتنا مت ڈوبے رہو کہ گم ہوکر دوہرے ہوجاؤ۔ اِسکی عادت ہوجانے سے ہرگز چھٹکارہ نہیں ہوسکتا اور یہ عادت سخت مضرت رسان ہوتی ہے، ہونڈھونگی سی آدمی کو ہر خاص و عام میں بے رُتبہ بنا دیتی ہے، بالفعل تم میں کوئی نقص نہیں ہے، اور تمھاری چال میں آزادی کی جھلک ہے۔ کوئی حرکت ایسی نہ کر بیٹھو جسکے باعث تمھارے اعضا معطّل اور تمھارے پٹھے کمزور اور بے دم ہو جائیں، تمامی مفاد کی غرض سے تمھاری چال اُسیقدر سیدھی اور مردانہ ہونی چاہیے جتنے تمھارے افعال۔

تم پڑھنے کے حد سے زیادہ شوقین معلوم ہوتے ہو، اِس زیادتی سے بچنے کا ایک عمدہ طریقہ یہ ہے کہ کھانیکے وقت اور مجمع میں جب اوسنے سے اوسکی گفتگو ہورہی ہو، مت پڑھو، ایسا بھی نہونے دو کہ کھیل کے گھنٹونکو اُسکے پیچھے کھو بیٹھو۔ کتابیں تو صرف ایک ذریعہ واقفیت حاصل کرنیکی ہیں۔ دماغ کے اور مسامات کو جسم کی مانند

جذبات کے حصول کیلئے چھوڑ دینا چاہیے، میں بھی تمھاری عمر سے پڑھنے میں بہت غرق ہوگیا، جس سے مجھے ایسا نقصان ہوا جسکی تلافی مشکل سے ہوسکتی ہے۔ علم کی جو کچھ بھی قیمت ہو، تندرستی اور خوش طبعی کی اُس سے کہیں زیادہ ہے۔

چونکہ تم لاطینی اور فرانسیسی زبان جانتے ہو اور بول سکتے ہو تمھیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ تم اوروں سے علیحدہ خلقت کے انسان ہو۔ دوسرے لوگ بھی تم سے زیادہ واقف ہیں اور زیادہ کرسکتے ہیں، فرق اتنا ہے کہ تم مطالب کو مختلف الفاظ میں ادا کرسکتے ہو۔ پڑھنے کا بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ تنگدلی اور خود غرضی کیلئے تریاق ہو، اور دماغ کو معمولی توہمات اور تعلقات سے پاک کرکے عام مخلوق پر نظر ڈالنے کے لائق بنا دے۔ یہ مت خیال کرو کہ وہ لوگ، جو تمھاری طرح ورجل اور ہومر سے واقف نہیں ہیں اور اس شہرت کو حاصل نہیں کرسکتے، حقیر ہیں، ورنہ تمھاری مثال اُس خدمتگار کی سی ہوگی جو بڑے گھر کا نوکر ہونے کی وجہ سے دوسروں کیطرف بنظر حقارت دیکھتا ہے۔ گو تم شیکسپیر اور ملٹن پر کتنا ہی حاوی کیوں نہو جاؤ، اسکو ممکنات سے سمجھو کہ ایک موچی بھی تم سے زیادہ گویا ہوسکتا ہے۔ لیکن "میں عالم ہوں اور وہ نہیں ہے" بہتر صاحب آپکو اُسپر امتیاز حاصل ہے، مگر اس سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے امتیازات بھی آپ ہی کے حصے کے ہوں، اسمیں شک نہیں، تم نے پہلے کی نسبت بہت کچھ ترقی کی ہے، مگر دوسرے بھی تمھاری برابر قدم اُٹھائے چلے جارہے ہیں، شاید تم استفسار کرو کہ پھر اسطرح تکلیف اُٹھانیکا نفع کیا ہے اگر تمکو عوام الناس پر فوقیت حاصل نہوئی۔ اسکا جواب یہ ہے کہ تم نے کُل معلومات کا مزہ خود لوٹا ہے اور علاوہ بریں اگر تم آگے نہ بڑھتے تو اتنک بہت پیچھے چھوٹ جاتے۔

کسی سے عداوت، کسی کی ہمت نہ توڑو، کسی سے اپنے کو برتر نہ سمجھو۔ اُن کے نقائص تمھاری کمزوریوں کو بانٹ نہیں لینگے، یا چونکہ تمھیں یقین نہیں ہے کہ کُل فوائد کا اجارہ ملجائیگا، اسلئے اپنی لیاقت میں جِلو دینا تضیع اوقات نہ سمجھو۔ یہ ممکن ہے کہ تم اپنے

ان شناساؤں میں سب سے زیادہ لائق ہو، جو اور باتوں ہیں، تم سے گوئے سبقت لیجا چکے ہیں، مثلاً۔ تندرستی میں محنت، مزاج، یا معاملے کی کامیابی میں، یا کسی اور لطیف اور مفید فن میں۔

البتہ ایک یقینی کمزوری مدرسے کی نصابی تعلیم میں یہ ہے کہ اس قسم کی تعلیم انسان کو دنیا کے کام کا نہیں رکھتی، خیالی تصویر عمل سے بالکل جدا اگانہ ہوتی ہے، ایک وہمی اور مجازی باتوں پر زیادہ توجہ کی عادت دماغ سے جوش اور مستعدی کو زائل کردیتی ہے۔ خیالات باطل اور طبعزاد باتوں میں ڈوبے رہنے سے ہم لوگ نازک مزاج عیش پسند مخالفت کے غیر متحمل اور اپنی غربت کو برداشت کرنے کے نالائق بنجاتے ہیں، باریک دلائل پر غور کرنیکے عادی ہونیسے ہم امور دنیاوی پر بطور ایک تماشہ بین کے نظر ڈالتے ہیں اسلئے کسی قسم کا سرمایہ حوادث سے محفوظ رہنے کے لئے جمع نہیں کرسکتے۔ کوئی مستعدی یا تدبیر اس موقع کے لئے ہر معاملے میں ارادہ کرنے سے پہلے سوچنا بھی ضرور ہے کہ اسطرح سوچتے ہی سوچتے وقت گذرجاتا ہے، جبتک ہم لوگ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ فلاں مقصد کے حصول کا سب سے اعلےٰ طریقہ کون ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ وقت ہاتھ سے نکلگیا یا اغیار نے اُسپر دستبرد شروع کردی۔

تم کیرکٹر کا حد سے زیادہ بلند معیار قائم کروگے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ توقعات کی مایوسی کے بعد معیار حد سے زیادہ گرجائیگی ....

سنجیدگی آداب زندگی کی ایک اعلےٰ جُز ہے اور ہر شخص کیلئے کچھ نہ کچھ ناگزیر ہے بیوقوف بنکر شہرت حاصل نکرو، یا لوگوں کے فقرونکا نشانہ بنکر کسی خاص معیار کے متمنی ہونے کے باعث تم لوگونپر البتہ یہ ظاہر کروگے کہ تمھارا مذاق اعلےٰ اور سلیم ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو بے سوچے سمجھے اپنی خوبیوں کو کہہ ڈالتے ہیں اسوجہ سے انکا کوئی خیال نہیں کرتا اور ایسے بھی ہیں جو خاموش رہنے کی وجہ سے عاقل

کہلاتے ہیں، ناصح بنکر ستمانہیں گفتگو نکیا کرو بلکہ عام فہم طریقے سے اور آزادی کے ساتھ اُن باتوں کا اظہار کرو جس سے نہ تمکو اور نہ دوسرونکو تکلیف پہونچے، اور کچھہ خیالات کو اپنے لئے بھی رکھہ چھوڑو، لوگونکی شکایتیں اُن سے دُہرایا نہ کرو، اگر تمھیں کچھہ کہنا نہیں ہے تو مذاق کی باتوں سے لطف تو اُٹھایا کرو، اور عقل کی بات سے اتفاق تو ظاہر کیا کرو ورنہ تمکو گم سُم دیکھکر لوگ تم سے کھنچے کھنچے لگینگے۔ اگر کسی مسئلے سے تمھیں پوری واقفیت ہو تو بھی اُسپر کان دھرو یہ نہیں کہ خواہ مخواہ ہر گھڑی اپنے پسندیدہ خاطر مسئلے کیطرف گفتگو کا رُخ بدلنے کی کوشش کرو۔ اس طریقے سے مانا کہ تم گوے سبقت لیجاؤگے مگر لوگوں کے دلونپر قابو نہیں کر سکتے۔ مجھے خود اُس مسئلے پر مُنہ کھولتے شرم آتی ہے جسپر میں قلم اُٹھا چکا ہوں۔ اپنی اُپج سے کوئی بیہودہ بات چھیڑکر لوگونکو متحیر کر دینا اور ناسمجھونکو اپنی نرالی باتوں سے پریشان کر دینا آسان ہے، مگر مشکل تو یہ ہے کہ ہر شخص سے اُس کی سمجھہ کے مطابق باری باری گفتگو کی جائے۔ دلائل و بُرہان کے حد سے زیادہ دلدادہ نہ بنجاؤ، ورنہ تمھارے کلام سے چاشنی جاتی رہیگی، اگر تم یوں کہو کہ فلاں مضمون کے متعلق یہ باتیں میری سمجھہ میں آتی ہیں۔ تو یہ بہتر ہے بہ نسبت اسکے کہ دوسروں سے خواہ مخواہ کو اپنی رائے منوانیکی کوشش کرو، تم دوسرونکے ساتھ اجمالاً اتفاق ظاہر کرکے سے اتنا سیکھہ سکتے ہو جتنا کہ اُن سے مخالفت کرنیسے نہیں حاصل ہوتا۔ یہ مت سمجھو کہ تم اپنے کو لوگوں سے برتر دکھلاکر اُنھیں دوست بنالوگے۔ تمھارے اس خیال کو وہ ہرگز روا نہ رکھینگے، نہ تمھیں معاف کرینگے، جبتک کہ تم اُنسے قطعی طور سے اعلے نہیں ہو۔ اِسپر بھی یہ خفیف الحرکاتی اور بھی قابل معافی نہیں رہتی۔

اپنے سے اعلے درجے والوں کی یا بڑے پایہ والوں کی صحبت مت ڈھونڈو اس حالت میں کبھی سچی ہمدردی پیدا نہیں ہوسکتی، پہلی قسم کے لوگ تمکو اپنے مشاغل کا مخل تصور کرینگے۔ یہ بھی پسندیدہ امر نہیں ہے کہ کسی مجمع میں تم ذی علم سمجھکر داخل

سکئے جاؤ، اُسجگہ ہزاروں ناملائم نظروں کے نشانہ بنجاؤ گے، اگر تم وہاں کچھ نہ بولو اور سادگی سے پیش آؤ تو وہ سمجھینگے کہ تمھاری یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر قصداً تم اپنی خوبیوں کا اظہار کرو تو اسکو شیخی سمجھینگے، اگر تمھاری خواہش ایک معمولی آدمی بنکر رہنے کی ہے تو تمھارے ساتھی تم سے نفرت کرینگے، اگر اُنمیں تم امتیاز حاصل کرو اور ظرافت اور خوش مزاجی کا ثبوت دو تو تم سے جلینگے، غرض تمکو کسی کروٹ چین نہیں ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ تمھارے دماغ میں یہ مہمل خیال سما جائے کہ اُمرا بدمعاش ہوتے ہیں یا لارڈز بیوقوف ہوتے ہیں، جہانتک مجھے معلوم ہے وہ اتنا ہی ایماندار اور عاقل ہیں جتنا دوسرے۔ یہ ہم لوگوں کی خود بینی کا ایک شعبدہ ہے کہ اُن لوگوں کو جو ہم لوگوں سے کسی ایک جز میں قطعی طور سے فوقیت رکھتے ہیں اُن اوصاف سے بے بہرہ تصور کریں جو اپنی خود ستائی کے باعث ہم اپنے میں پاتے ہیں۔ عوام الناس مشکل سے اسبات کا اقرار کرینگے کہ ہاؤس آف لارڈز کسطرح ہاؤس آف کومنس کی برابری کرتا ہے، عورتوں کو دیکھئے اگر ایک اُن میں سے زیادہ حسین ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ احمق ہے یا ایسی اچھی نہیں۔ اگر مردوں میں کوئی لاکھ پتی ہو تو یہ بات امر مسلّمہ کیطرح مان لی جاتی ہے کہ وہ انجل ہے یا اپنے نام کے حروف نہیں جانتا، یا مصیبت میں مبتلا ہے غرض یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُسکو اپنی سطح کے برابر لاویں۔ جان لو کہ یہ سچ نہیں بلکہ سراسر حسد ہے، دوسروں کی جتنی خوبیاں تم سنو یقین کرو، دوسروں کو اپنے اوصاف کے معیار سے مت جانچو۔ اگر ان میں ایسی باتیں موجود ہیں جو تم میں نہیں ہیں تو کشادہ پیشانی سے اُنکا اعتراف کرو، کبھی حسد نکرو، اگر تم میں یہ صفت مزاجی موجود ہے کہ جہاں تک ثابت پاتے ہو اُسکو تسلیم کر لیتے ہو (مثلاً ایک امیر میں سمجھ اور خوانچہ والے میں خوش مزاجی) یہ بہت سی خوبیوں سے زیادہ ہے۔

(باقی آئندہ)

the fourth Kachari King. They describe its destruction to Kala Pahar. There are similar remains of another city at a place called Kasomari Pathar near the Doyang river. The site of this city also is now covered with forest and has not been fully explored.

MUFIZ-UR-RAHMAN.

way. These buildings were constructed by the Kacharis who were Mongolians and ruled at Dimapur before they were conquered by the Ahoms.

The ruins of Dimapur, which are still in existence, show that at that period the Kacharis had attained a state of civilization considerably in advance of that of the Ahoms. The use of brick for buildings was then practically unknown to the Ahoms, and all their buildings were of timber or bamboo with mud-plastered walls. Dimapur, on the other hand, was surrounded on three sides by a brick wall of the aggregate length of nearly 2 miles, while the fourth or the southern side was bounded by the Dhansiri river. On the eastern side was a fine solid brick gateway with a pointed arch and stones pierced to receive the hinges of double heavy doors. It was flanked by octagonal turrets of solid bricks and the intervening distance to the central archway was relieved by false windows of ornamental moulded brick work. The curved battlement of the gateway, as well as the pointed arch over the entrance points distinctly to the Bengali style of Mahomedan architecture. In this connection it will be remembered that when the Ahom king Rudra Singh determined to erect brick buildings at Rungpore he called in an artisan from Bengal to direct the operations, to which I have already referred. The excellence of the mortar is attested by the fact that, although the building has evidently been shaken on various occasions by earthquakes, it is still in excellent preservation. Inside the enclosure (which has not yet been fully explored) are some ruins of temples, or perhaps a market place, the most marked feature of which is a double row of carved pillars of sandstone, averaging about 12 feet in height and 5 feet in circumference. There are also some curious V-shaped pillars which are apparently memorial stones. No two are precisely like in ornamentations, but all are of one general form, having large semi-circular tops with concentric foliated carving below on the shaft. There are representations of the elephant, deer, dog, duck and peacock, but nowhere is there a human form or head. The inference seems to be that, at this time, the Kacharis were free from all Hindu influences.

There are several fine tanks at Dimapur, two of which are 300 yards square. The first European to describe these ruins was Mr. Grange who visited the locality in 1839. At that time the Kacharis still preserved traditions of their rule there, and attributed the erection of the city to Chakradhvaj,

They are all connected with the Hindu mythology except one which was constructed by a Hindu ascetic Bashistha Muni by name. This temple is at a distance of 7 miles from the town. Its site is exceptionally beautiful—its beauty being enhanced by a range of hills full of rocks, through which a spring of cold water flows with a murmuring sound. It is superfluous on my part to describe the temple, for all the temples in Assam are of the same architecture, no ornamentation being found in them.

I want to describe one or two more. One is the temple of Umananda, situated in the middle of the river Brahmaputra, whose course it divides into two swift streams, and thus presents a very beautiful sight. The temple takes its name from a Hindu god who, it is said, placed one of his feet on it while travelling through Assam. The god's name was Umananda. It is in good condition simply because it is always repaired.

Another and the most interesting and important of all is the temple of Kamakhya. It is a Hindu shrine and frequented by men from Bengal and Behar. The Maharaja of Darbhanga patronises it with an annual grant and he has a house there where he spends a month or two every year. The temple is built on a hill some 350 feet high and situated on the left bank of the Brahmaputra. In ascending this hill eight more small hills are to be crossed one by one. This temple of Kamakhya is somewhat different from others which I have already described. This temple has no dome as others. It is not also round in form at the base where it is somewhat rectangular. On a hill a little above it there is the temple of Bhubaneswari. This temple imparts its name to the hill. The hill is some 400 feet high from the ground. The birdseye view is the most picturesque of all scenes in Assam. The town of Gauhati appears to be contained in an acre of land, the Brahmaputra a mere canal and the roads appear to be some broad lines, and the scene gives a sort of pleasure to the beholder. These two temples cannot be termed ruins for they have been always taken care of by the priests and the Brahmans who are the sole proprietors of them. Gentlemen, you will kindly pardon me if I have deviated from my subject, for these two buildings are not ruins. I have deviated to describe the beautiful scenery the hills present to the beholder.

There are some monumental buildings at a place called Dimapur which is now a Station of the Assam Bengal Rail-

soldiers fired at it but could not dislodge it. There are holes in it to be seen, testifying the statement. It cannot be said to be ruined, for the expense of its repair is undertaken by the government. At the base it is round in form and a little above the ground images of gods and goddesses have been engraved on the walls. The temple is the abode of Hindu ascetics and Brahmans and taken care of by the latter. It is built of thick bricks and blocks of stone.

The third, dedicated to the Hindu god, Vishnu, is on the left side of the Sivadol. It is in a very bad condition. The great earthquake of 1897 which was very disastrous to Assam, crumbled down one half of its dome. It remained deserted for a long time and was, like those at Jaisagar, the abode of stray cattle, but now again has been utilised by the Brahmans. Its walls also, like those of the others have been engraved with stone images of the gods and goddesses. The big tank and the temples present an agreeable sight when viewed from the opposite bank. W. W. Hunter in his statistical account of Sibsagar describes the scene :—'The grand old temples on the south bank of the big tank and the houses peeping through the foliage make up a very picturesque scene.'

Raja Pramat Singh (1744-51) constructed a building called Rung-ghar. It is an amphitheatre for animal fights at Rungpore. The building is two storied and open on all sides, and rectangular in form, but rounded in the two ends. In length it is some 50 yards and some 20 yards in breadth. The roof is not flat but inclines to the opposite sides. In the middle where the two shades meet each other a stone figure with two faces in opposite directions has been carved out. The walls are very thick and seem likely to endure for many years to come. It stands on a field where animal fights are most convenient to be held. The ladder which led up to the second story has now broken down, but the building has not been effected much by the hand of time. On the ground floor the noblest of the city took their seats, while the Raja surrounded by his ministers and tributary chiefs, sat on the second floor and enjoyed the animal fights, of which the most interesting is the buffalo fighting which still prevails in Upper Assam, and enjoyed also the dancing held in the Bengali month of Baishakh.

There are some other temples at Gauhati, the largest town in Assam ; but the names of their builders are not known.

named Jaimati. Hence the name Jaisagar—' Saga r' meaning a sea. The temples are broad at their bases but rise up narrower and narrower to the tops, where each terminates in a dome. These temples are all ruined and desolate and there is no human habitation near them. They have been deserted long since and are resorted to by the wandering cattle instead of by any human being. They appear to be grand from a distance but when viewed from near they present a sorry sight.

The Ahoms of that time could appreciate beauty and and knew well its standard. The tank is square in form and its banks are all made of bricks. The ghat was well paved, but it is now altogether ruined—the bricks having been taken away by the people. The tank is two miles in area, bigger than the tank of Sibsagar, which I shall shortly describe. Its water, though not taken care of by anyone now a days, can be drunk without fear of injury, so transparent it is.

Raja Sib Singh who reigned from 1714 to 1744 constructed a big road named Dhon Ali, the tank and temples of Sibsagar about the year 1722.

The tank named after the Raja, is a very beautiful one, well situated on high ground and surrounded on all sides by a deep ditch. It is, like the Jaisagar, a square in form and each bank is a little short of half a mile. Around it is the civil station of the town. Just in the middle of the south bank are standing majestically three big temples called respectively the Deir, Siva and Bishnu dols—dol meaning in Assami a temple. The Devidol dedicated to the Hindu Goddess Durga, is the smallest of the three, placed on the right-hand side of the Sivadol and resorted to only on the occasion of the Durgapuja, when the goddess is placed in it and sacrifice of goats is made to her. The top of the temple is partly broken down and the whole temple remains always dirty—never perhaps repaired since the extinction of the Ahom sway. It is some 100 feet in height and resemble the other temples of Jaisagar in form and other respects.

The second temple, the Sivadol dedicated to the Hindu god Siva, is the finest of the three and stands midway between the other two. It is some 150 feet high and made of good bricks and in size resembles the pyramid but terminates in a large dome made of gold. During their invasion the Burmese

thousand workmen are said to have erected the building in the course of one year. At one end of the hall rings are fastened on four pillars, each having nine rings. When the Raja takes his seat in the hall, they put a dais in the middle of these four pillars and nine canopies of various stuffs are fastened above it to the rings. The Raja sits on the dais below the canopies, whereupon the drummers beat their drums and gongs."

One of the later Kings of Garhgaon transferred the seat of government to Rungpore immediately to the south of the present town of Sibsagar. Raja Rudra Singh (1696-1714) imported an artisan, named Ghanasyam, from Bengal to teach Mahommedan arts and architecture to his people. The architect built the brick city and the palace at Rungpore, masonry bridges over rivers which still exist, some in good condition and others ruined, dug a great tank called Jaisagar and constructed some temples on its banks.

The palace is a brick building, having two stories above, and one, under the ground. There are nineteen rooms in the underground story and one of them is quite dark and is the abode of serpents and other reptiles. It has no door except a small window, through which one cannot pass without stooping. Some people say it is the lying in room of the queen, but others assert it to be the hiding place of the royal family at the time of peril. The second assertion seems to be probable, for with arms and ammunitions provided, one can easily defend himself for a considerable space of time. There is a popular saying that in the dark room there is a flight of staircase which leads up to the Dikhu river, a mile off. But now a days the path is altogether closed by the accumulation of dust and broken bricks. It is said that a raja did actually save himself and his family by escaping through this underground way, when the Burmese invaded Assam. The palace is now falling here and there and appears to be a dark, dismal-looking brick building nearly covered over with jungle and enclosed by a brick wall. The roof also has fallen through in several places, but the walls seem firm, though here and there great holes are to be seen in them as well as in the flooring, made by people searching for treasure.

The temples and the tank of Jaisagar—Raja Rudra Singh accepted Hinduism and dedicated the temples to several gods and goddesses, and the tank itself to his queen

the earliest seat of Government of the Ahom princes in Assam, and remained the capital till their prosperity began to wane. The fort and palace are situated on the banks of the Dikhu river, some distance to the south-east of Sibsagar town. The fort had bastions at the corners which are now destroyed. The magazine was situated at a short distance east of the fort. The royal palace, one of the oldest buildings in the province is described by Robinson in his Descriptive Accounts of Assam as having been 'surrounded by brick walls about two miles in circumference, but the whole town and its suburbs appear to have extended over many square miles of country. The ruins of gateways, built chiefly of masonry are still to be seen within the fortified circumvallations which surrounded the town. It may be observed that one of the gateways is composed principally of huge blocks of stone bearing marks of iron crampings, which show that they once belonged to far more ancient edifices. From this evidence alone, were there no other, it might safely be presumed that, long antecedent to the conquest of the Ahoms, the country had been inhabited by a race far advanced in some of the arts of civilised life.' The ancient building is fast going to pieces, though not altogether by the hand of time, for the Survey Report for 1867–68 shows:— 'It is a great pity that the Assam Tea Company are allowed to carry away the bricks, they have already pulled down the gates, a portion of the palace, and the wall enclosing the palace.'

A Mahommedan historian who accompanied Mir Jumla in the latter's campaigns to Assam, says:—"The town of Garhgaon has four gates, built of stone and mortar, the distance of each of which from the palace is 3 kos—one kos equalling two miles. Near the raja's palace are large houses. The town looks large, being a cluster of several villages. Round about the palace an embankment has been thrown the top of which is fortified by a bamboo palisade, instead of by walls, and along the sides of it a ditch runs and is always full of water. The circumference exceeds two miles. Inside are high and spacious buildings. The Audience Hall of the Raja, which is called 'Solang' is 120 cubits in length and 30 in width. It has 60 pillars, each about 4 cubits in circumference. The palace is decorated with ornaments and curiosities. The sides of this palace are embellished by extraordinary wooden trellis-work. Inside there are brass mirrors highly polished, and if the sun shines on one of them, the eyes of the bystanders are perfectly dazzled. Twelve

the Football Club was " at home" on the ground to both teams and many guests.

The names of the winning team are :—Syed Masud-ul Hasan (Capt ., Mohammad Haidar Khan, Syed Askari Hasan, Syed Nooruddin, Mohammad Jan Khan, Ali Ahmad Khan, Mirza Aziz Ahmad, Sikandar Khan, Shaikh Nazr-ul-Hasan, Abul Barkat, and Mohammad Mohiuddin.

Papers of the Historical Society.

The Ruins of Assam.

Assam is one of the Provinces of the British Indian Empire, lying in the eastern corner. The name 'Assam' originates from a Sanskrit word 'Asama,' meaning unparallelled. Some say it took its name from the Ahom Kings who ruled the country up to its final annexation to the British Indian Empire in the year 1838.

Assam proper comprises the districts of the Brahmaputra Valley alone, and subsequently the Hill districts and the Surma Valley districts were added to it by the Government of India to make up the present province of Assam.

Before the conquest by the Ahoms Assam was ruled by the Bodo Kings belonging to the Mongolian race. Early in the thirteenth century a band of hardy hillmen wandered into the eastern extremity of the Brahmaputra Valley,. led by chance rather than any deepseated design, and quite unconscious of the fact that their descendants were destined to bring the whole valley under their rule and to set a limit to the eastward extension of the empire of the Mogul conquerors of India. These were the progenitors of the Ahoms. They were an off-shoot of the great Tai or Shan race which spreads eastward from the borders of Assam over nearly the whole of further India and far into the interior of China.

These Ahoms had their capital at Garhgaon at a distance of ten miles from Sibsagar town in Upper Assam. At that time Garhgaon was a fortified city, the walls of which are no longer in existence, but traces of them can be found here and there. W. W. Hunter, Director-General of the Survey Department, describes Garhgaon as follows.—"It was

In each case the other side scored first, but this score only made the Lower Classes team play harder and they eventually won.

The positions of the teams are as follows.

			Points	
1	Second year / First year	... ...	10	out of 6 matches,
3	Seventh and Eighth Classes.		9	,, ,, ,, ,,
4	Fourth year / Lower classes.	... ...	4	,, ,, ,, ,,
6	Entrance Class	... ...	3	,, ,, ,, ,,
7	Third year ...	... ...	2	,, ,, ,, ,,

To settle the Championship and the possession of the Maharaj Singh Challenge Shield and the Club medals, extra games had to be played between the two leaders. The first game was played on Wednesday, May 22nd, before a good crowd of spectators. The First Year won the toss and played with a strong wind at their backs. The game was very fast and well-fought. The Second Year lost Abdul Wahab after a few minutes, but it is only fair to say that Mohammad Haidar of the other side was suffering greatly from a touch of the sun and was feeling ill all through the game. The match was a draw. Five minutes extra each way were played, but even then no goal was scored. The Second game was fixed for Friday, May 24th. It was a better game even than the first. The Second Year were without Abdul Wahab and Basit Ali, both of whom had been hurt in the first match. On the other side Mohammad Haidar was still below his usual form and Naimullah played for Askari who had also been hurt.

Both goals had some narrow escapes. Finally about ten minutes before time the ball was successfully cleared from a corner kick against the First Year and was passed up the field to Masud, who got through his opponent's defence in fine style and beating the goal-keeper scored the only goal of the match after one of the best runs seen on the ground. Both teams played harder then ever and the Second Year nearly scored just on the point of time.

The First Year thus won the Maharaj Singh Challenge Shield and the League medals. The prizes were given away by Kunwar Maharaj Singh to say farewell to whom

It was seen at the very opening that three teams were distinctly good while the rest were above the average of the last few years. Great keenness was shewn in every game and the results were at times unexpected. There is something to be said for practically every team as in one way or another they all distinguished themselves.

The Fourth Year had a team which made up in energy what it lacked in knowledge of the game. Though they were frequently outclassed, they set a very good example of keenness to all the others. They won two out of their six matches and did better than was at first expected. The Third Year never seemed to get together until they had played half their games and they certainly had some bad luck. But making all allowance for this they were the disappointing team of the year. Still their experience this season ought to make them a better and stronger combination for 1908. The Second Year possessed the best balanced team of all. They ought to have won every match but owing to a certain slackness drew two games in the early part of the season. Thus the fight was very doubtful to the end. The First Year showed great dash. They went in to every game with the fixed idea of winning. They were admirably led by their Captain, Masud-ul-Hasan, who promises to be one of the best players that the College has ever produced. They had bad luck in their game with the Second Year on April 20th, when they lost by one to nil. A violent storm broke over the ground in the second half of the game and the First Year had to play in the teeth of it.

The Entrance Class were a very fair team, but never got well together. Their Captain, Mohammad Akbar, and Abbas Mirza were the two best players on this side. The combined Seventh and Eighth classes had an excellent school team. They played hard and had the advantage of having an experienced and hard working Captain in Abdur Rahman of Peshawar. They came very near winning the Championship as they were only defeated by one goal to love by the first year. This goal was scored late in the second half of the game from a well placed corner kick. Had the School team won this game they would have been top of the League, and if they had drawn the game they and not the First Year, would have had to play the deciding match against the Second Year.

The Lower classes did very well indeed, until they lost two of their best players. As it was, they won two matches.

quite as much as we do in England, and perhaps they study him more.—In one other way is the birthday celebrated this year, namely, by the publication to-day of a little book by Professor Walter Raleigh in the well-known series of "English Men of Letters"—a series which was for a long time edited by the present Secretary of State for India. I do not know when the series was first started—certainly many years ago—but not until now has it included a book on the greatest of all English Men of Letters. Perhaps it required a brave man to tackle such a subject, for (quite apart from all the controversies as to whether Shakespeare did or did not write the plays attributed to him) those plays are so voluminous, so wonderful in their comprehensiveness, so real in their characters, that Shakespeare must always remain a marvel and a mystery. Let me copy out, for the benefit of those of your readers who do not know it, Matthew Arnold's oft-quoted sonnet on Shakespeare :—

> Others abide our question. Thou art free.
> We ask and ask—Thou smilest and art still,
> Out-topping knowledge. For the loftiest hill,
> Who to the stars uncrowns his majesty,
> Planting his steadfast footsteps in the sea,
> Making the heaven of heavens his dwelling place,
> Spares but the cloudy border of his base
> To the foil'd searching of mortality ;
> And thou, who didst the stars and sun beams know,
> Self-school'd, self-scanned, self-honour'd, self-secure,
> Didst tread on earth unguess'd at—Better so.
> All pains the immortal spirit must endure,
> All weakness which impairs, all griefs which bow,
> Find their sole speech in that victorious brow.

I am, Mr. Editor,

Yours &c.

G. P. GOODALL.

The Football League.

This year the competition has been better than ever. Seven teams entered and all the matches were played out, none going by default. Four teams from the College and three from the School took part. The league games began on Saturday, April 6th, and finished on Saturday, May 18th.

their interest therein. Here is April once again ; last week we all received our member's tickets with a list of the matches to be played this season by our county eleven ; boys are looking to their bats and pads and cricket boots in readiness for next term ; our smaller local clubs are, as usual, looking forward to their first match on the "last Saturday in April," our newspapers discuss the probable composition of the chief county elevens and their various prospects in the struggle for the championship ; all things, in fact, seem but incidental music to the old song that Summer is coming in, for certainly cricket is now a days one of the chief joys of summer to almost all classes of English people. The game is played by Knight and Squire, Yeoman and Ploughman, Merchant and Man of Law, Parson and Citizen. Even to many of those unfortunate ones who cannot see the ball more than about half way down the wicket, the forbidden fruit is sweetest, and the grapes certainly are not sour. They also pay their homage to the King with the collar of cobbler's wax. Long may he reign.

I am writing this on April 23rd St. George's Day and also the anniversary of the birth and death of Shakespeare. Strange—to those who notice coincidences—that England's greatest poet was born and died on the day appropriated in our calendar to England's Patron Saint. Now a days the observance of Saints Days has very largely died out in England ; for example, I have to-day been asked twice why the flags were flying upon some of our public buildings, and neither of my interrogators knew, until reminded that it was St. George's Day. The celebration of the day as Shakespeare's birthday is however growing. By this I to not mean that all of us remember the anniversary or that here is anything like a universal observance of it, but each year we are, I think, more and more reminded of it. At one of the principal London theatres the week in which the 23rd of April comes is generally devoted to the performance of Shakespeare's plays ; in provincial towns Shakespeare Societies, where they exist, will perhaps hold their Annual Meetings on the 23rd ; while at Stratford-on-Avon (his home) there is always a Shakespeare festival which includes processions and meetings as well as numerous performances of the plays in the great Memorial Theatre. This year too the celebration has been extended to the continent, one of our best companies having given several performances in Berlin before large houses—for the Germans take Shakespeare *au grand sérieux*, and read him (according to some people

The Football and Hockey League games are now finished. The First Year came out champions in football and the Second Year disposed of all other classes in the Hockey League. The Football Eleven has gone to Calcutta, and has a programme of six or seven matches to get through. As soon as this team is back the Cricket XI goes to Naini Tal to play two matches. The Hockey Club has an ambition to tour in Bombay and Hyderabad in the early part of the Long Vacation.

Lately we have been receiving some very able criticisms on the magazine and its shortcomings. It has been alleged that we charge a very high price for very little matter. Admitting that the price, *i.e.*, the annual subscription, is high, the remedy is in the hands of our critics and other well wishers of the College. If they will only send in suitable articles we shall be most pleased to publish them Prizes have been offered again and again for articles and essays, but it is eighteen months since any response was made to our offers. Several numbers of this paper have been dependent almost entirely on the contributions from England. Moreover the paper, with which this magazine is compared and rightly compared unfavourably, as far as English printed matter goes, contains no vernacular part at all. The Aligarh Monthly has an average of twenty five pages per month of Urdu in addition to the English part. All the same we thank our critics, and once again the Editor appeals to all, who read the magazine, to help in this matter and to remove the reason for the criticisms.

Another correspondent writes controverting our account of the happenings of last February, which was published one or two months back. It has been deemed inadvisable to publish his letter as it would only be the raising again of a matter which is better dropped altogether.

Letter from England—No. 9.

April 1907.

DEAR MR. EDITOR,

"In the spring a young man's fancy lightly turns to thoughts of—cricket," and not only young men but old men and middle-aged men and even (or rather especially) schoolboys and enthusiastic lady admirers of the game revive

The Aligarh Monthly

June, 1907.

College Notes.

The last month has been occupied almost entirely by examinations, both College and University. The result is that very little class work has been possible. Nearly the whole of the staff had to invigilate several days each week.

The College Examinations were satisfactory on the whole. The top man of the Third year was Minhajuddin, who has done very well in other examinations hitherto. He would probably have shown better results this year had he not been weakened by a steady low fever. In the first year examination Mohammed Haidar was first. He created a record, being at the head of the list in every subject which he took. In both examinations there were several others who did very well. It is to be hoped that all will continue to improve as they have during the last year. We do not get enough men in the first division. It is not because the necessary ability does not exist in the College, but because the necessary effort is not made. A College as large as Aligarh ought to do better in this respect in the University Examinations than it does. Steady work is what is wanted.

We are very sorry to lose Kunwar Maharaj Singh who was transferred to Lucknow at the end of May. In every way he has shewn himself a good friend of the College, and especially of the games. The Football Club in particular owes much to him, though it must not be forgotten that he was a well-wisher of all three clubs.

جلد (۵) جولائی سنہ ۱۹۰۷ء نمبر (۷)

انڈیا کی زراعت پر اُسکی افزایش آبادی کے اثر

اُس سے پہلے کہ میں اپنے اصل مطلب کو بیان کروں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اُصولِ آبادیِ انسان لکھوں جس سے اصل مطلب بخوبی سمجھ میں آئے۔ گو یہ اُصول ہنوز کماحقہٗ پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچے، مگر اُنپر علم ہونا ضرور ہے، انگلینڈ میں ملتھس صاحب ایک بڑے نامور پادری تھے، اُنھوں نے آبادی انسان کے باب میں ایسا ایک دلچسپ مضمون لکھا کہ جس کے سبب سے پولیٹکل اکونومی (علمِ نظام مدن) میں ایک باب اُصول آبادی انسان کا اضافہ ہوگیا ہے، گو اصولِ آبادی انسان جو اُنھوں نے قائم کئے تھے وہ معرضِ بحث میں آنکر کچھ بدل گئے، مگر اُنمیں سے جو انڈیا کی آبادی سے متعلق

ہو سکتے ہیں وہ میں بیان کرونگا۔

آبادی اور اُسکی خوراک کا تناسب

مُستقل بڑھنے کا میلان جانداروں کا اسطرف ہے کہ وہ اُس خوراک سے زیادہ ہو جائیں، جو اُنکی پرورش کے لئے تیار ہوئی ہو۔

ڈاکٹر ڈرکلس صاحب لکھتے ہیں کہ نباتات وحیوانات کی بالطبع تولید ایسی ہے کہ جسکی کوئی حد مقرر نہیں ہوسکتی، مگر اُنکا اجتماع اور باہم ایکدوسرے کی غذا میں مداخلت کرنا اِس حد کو مقرر کر سکتا ہے، اگر دنیا میں سوا سوئے کے درخت کے کوئی اور درخت نہ ہوتا تو وہ پھیل کر ساری روسے زمین کو بھر دیتا، اگر دنیا میں سوا ایک قوم کے کوئی اور باشندہ نہوتا تو صرف اُسی ایک قوم سے کُل دُنیا معمور ہو جاتی، مثلاً صرف ایک انگریزی قوم ہوتی تو وہ ساری دنیا کو آباد کر دیتی۔ یہ بات ایسی سچ ہے جسمیں کسیکو حُجت کرنے کی مجال نہیں۔ نیچر (فطرت) نے کُل حیوانات اور نباتات میں تخمہاے تولید وارواح بڑی فراخ دستی سے تقسیم کئے ہیں مگر اُن کی پرورش کے لئے غذا اور خوراک کے عطا کرنے میں ایسی تنگدستی کی ہے کہ وہ اُن کے لئے کافی وافی نہیں ہوتی۔ زمین میں جو تخمہاے ہستی موجود ہیں اگر وہ بغیر کسی روک ٹوک کے آزادانہ اپنا نشو ونما دکھلائیں تو بتدریج چند ہزار برس میں لاکھوں دنیاؤں کو آبادی سے پُر کر دیں، لیکن اسکے ساتھ احتیاج کا متکبر قانون سب جگہ پھیلنے والا ایسا بنایا ہے کہ وہ آبادی کو حدودِ مقررہ سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ اِس قانون کے سبب سے نباتات وحیوانات کی نسلیں سکڑی جاتی ہیں اور انسان اپنے کسی بھی جد وجہد سے اِس قانون کی جکڑبندی سے اپنے تئیں چھڑا نہیں سکتا۔ یہ قانون اِن کی افزایش کا سخت مانع ہے۔ نباتات او رقسمت حیوانات میں اِس بات کا دیکھ لینا آسان ہے کہ اِن کی قوی عقل حیوانی مجبوراً اِنکی نوع کی افزایش کرتی ہے مگر اِس میں بھی شک نہیں

ان کی عقل حیوانی کی اس بات میں سخت مزاحمت کی جاتی ہے۔ کہ ان کی اولاد کی پرورش کیو اسطے غذا کا سامان مہیّا ہو۔ اسلئے جہاں آزادی ہے وہاں افزائش و آبادی اپنا زور دکھاتی ہے، مگر غذا اور مسکن کی محتاجی ان زوروں کو دبا دیتی ہے۔ غذا اور مسکن کی محتاجی کے اثروں کو انسان کی حالت میں جانچ پڑتال کرنا ایک بڑا امر ادق ہے۔

حیوان کیطرح انسان اپنی نوع کے بڑھانے میں مجبور نہیں مگر اس میں حیوان سے زیادہ ایک عقل ہی جو اسکو اس فکر و تردد میں ڈالتی ہے کہ میں جن بچوں کے وجود کا سبب ہونگا۔ انکی پرورش کے سامان کو بھی مہیّا کرسکونگا یا نہیں۔ اگر عقل نے اسکو یہ صلاح دی کہ وہ نہیں کرسکیگا تو وہ رک جاتا ہے، تجرد یا کوئی اور طریقہ اختیار کرتا ہی، جسکے اکثر برے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اگر عقل نے اسکے برخلاف صلاح دی تو آبادی بڑھتی چلی جائیگی، جس کی پرورش کے لئے غذا بہم نہو گی۔ یہ انسان کی طبیعت کا قانون ہی کہ اس کی زندگی بغیر غذا کے ناممکن ہے، اسلئے درحقیقت آبادی انسان کبھی اسقدر زیادہ نہیں ہو سکتی کہ اُسکے لئے ادنےٰ سے ادنےٰ غذا بھی میسر نہ ہو۔ غرض خوراک کا مشکل سے میسّر ہونا افزائش آبادی انسان کا بڑا مزاحم و مانع ہے۔ یہ مشکل کہیں نہ کہیں آنکر پڑتی ہے اور اُسکا اثر کسی نہ کسی مصیبت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور نوع انسان کے بڑے حصّے کو مصیبت کے خوف و خطر میں ڈالتا ہے۔

آبادی کا مستقل میلان یہ ہے کہ وہ اپنی غذا کے وسائل سے آگے بڑھ جائے مگر جو اسباب ہم نے اوپر بیان کئے ہیں وہ اُسکو بڑھنے نہیں دیتے، وہ آبادی اور غذا کو ہموار اور ہمقدم رکھتے ہیں، اب ہم یہ تحقیق کرتے ہیں کہ آبادی کو کامل آزادی کے ساتھ قدرتی افزائش ہو اور انسان سب طرح سے بخیر و خوبی سعی و کوشش کر کے زمین کی پیداوار کو بڑھائے تو آبادی اور غذا میں کیا تناسب ہوگا۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ دنیا میں کوئی ملک ابتک ایسا دریافت نہیں ہوا کہ اُس کے باشندوں

سے اوضاع واطوار پاک وسادہ ونیک ہوں اور غذا کے وسائل افراط سے ہوں اور نوجوانوں کے شادی بیاہ کی بھی کوئی روک ٹوک اس خوف کے سبب سے نہ ہو کہ اہل وعیال کی پرورش کا سامان بہ دِقت ودشواری میسر ہوگا۔ وہاں بدعادتوں سے شہروں میں رہنے سے بیماری پیدا کرنیوالوں پیشوں کے کرنے سے سخت مشقتِ شاقہ کے اٹھانے سے نوعِ انسان ضائع نہ ہوتی ہو۔

خواہ ازدواج کا کوئی قانون آئین مرتب ہوا ہو یا نہ ہوا ہو انسان کی طبیعت اور نیکی کا اقتضا یہ ہے کہ وہ کسی عورت کے ساتھ رشتہ بندی کر کے اس سے مباشرت کرے جسکے لئے کوئی روک ٹوک نہ ہو اور آبادی کے ویرانی کے اسباب نہوں تو وہاں آبادی کی وہ کثرت ہوتی ہے کہ کہیں اور نہیں ہوتی۔

شمالی امریکہ میں غذا کی بہت افراط ہے، وہاں کے باشندوں کے اوضاع واطوار کردار بھی پاک ونیک ہیں، نوجوانوں کے ازدواج کے لئے بھی یوروپ کی نسبت تھوڑے موانع ہیں، وہاں ڈیرہ سو برس سے یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر بیس پچیس برس میں آدمیوں کی آبادی دوچند ہو جاتی ہے۔ اس مدت میں بعض شہروں میں ولادتوں سے زیادہ موتیں ہوتی ہیں تو اس ملک میں اس کمی کا ایفا اور حصّوں کی افزایشِ آبادی سے ہو جاتا ہے، جو اوسط پیمانے سے زیادہ ہوتی ہے۔ جن بستیوں میں صرف اہلِ زراعت ہی رہتے ہیں اور ان میں بہت کم لوگ برے مراسم اور عادتیں رکھتے ہیں۔ بیماری پیدا کرنے والے پیشے بہت کم لوگ جانتے ہیں وہاں پندرہ ہی سال میں آبادی دوچند ہو جاتی ہے، مگر اس امر محقق میں سب متفق ہیں کہ بعض ملک ایسے ہیں کہ ان میں پچیس سال میں آبادی دوچند ہو جاتی ہے۔ پھر اس سلسلۂ ضرب ا و ۲ و ۴ و ۸ وغیرہ میں آبادی کی افزایش ہوتی ہے۔

یہ حال تو آبادی کی افزایش کا ہے، اب زمین کی پیداواروں کی شرح

افزایش کا تحقیق کرنا گو آسان نہیں مگر کامل طور پر یہ امر محقق ہے کہ ایک محدود ملک میں زمین کی پیداواروں کی افزایش میں جو نسبت ہوتی ہو وہ آبادی کی افزایش کی نسبت سے بالکل مختلف ہوتی ہے، دس ارب آدمیوں کی آبادی ایسی ہی آسانی سے دوچند ہوسکتی ہے جیسے کہ ایک ہزار آدمیوں کی آبادی۔ مگر اس افزایش آبادی کی پرورش کے لئے غذا کسی طرح بآسانی نہیں حاصل ہوسکتی۔ ضرور ہے کہ انسان مقید بمکان و مسکن ہوا اور جہانتک اُسکو زمین سیر حاصل و شاداب ملتی ہو اُس میں ایکڑ پر ایکڑ زراعت کی افزایش کرتا جاتا ہو۔ زمین مقبوضہ کی صلاحیت واہلیّت پر پیداواریں موقوف ہوتی ہیں، وہ بمنزلہ ایک فنڈ کے ہوتا ہے جو کُل آراضی کی طبیعت کے متقضار کے موافق بجائے زیادہ ہونے کے کم ہوتا جاتا ہے۔ لیکن آبادی جسکے لئے وہ غذا مہیّا کرتا ہے بڑے زور سے بڑھتی چلی جاتی ہے اُسکا یہ بڑھنا کبھی تھکتا نہیں۔ ایک زمانے کی افزایش آبادی دوسرے زمانے کی افزایش آبادی کو اور زیادہ قوی کردیتی ہی، جسکی کوئی انتہا نہیں۔

چین و جاپان کے حالات دیکھنے سے یہ اچھی طرح شبہہ ہوسکتا ہے کہ انسان کی محنت پردازی خواہ کیسی ہی اعلیٰ سے اعلےٰ طریقے سے اپنا کام کرے مگر ان ملکوں میں سالہا سال میں ایکدفعہ بھی آراضی کا پیداوار، دوچند نہ کرسکیگی۔ بیشک کرۂ زمین پر زراعت سے خالی بہت سے حصے پڑے ہیں اور تقریباً غیر آباد ہیں۔ ان کم اور چھدری آبادی کے اضلاع کے باشندوں کو نیست و نابود کرنا یا اُن کو کسی ایسے کونہ کھدرے میں ڈھکیلنا جہاں وہ بھوکے مرجائیں، انسانیت اور محاسن اخلاق سی بعید معلوم ہوتا ہے اور اُنکو عقلمند اور محنت پرداز بنانا ایک عرصۂ دراز کا کام ہے۔ وہیج سہج ہوسکتا ہے۔ اس عرصے میں افزایش آبادی باقاعدہ ہم قدم پیداوار کی افزایش کے ساتھ چلی جائیگی۔

یہ امر شاذ و نادر واقع ہوتا ہے کہ علم اور محنت پردازی کا کوئی اعلےٰ درجہ ایک ہی دفعہ اِن لاوارث زرخیز زمینوں پر اپنا اثر کرے۔ جیسا کہ بعض دفعہ کولونیز یعنی نوآبادیوں میں ہوتا ہے کہ وہاں پیداوار بنسبت ہندسیہ (رو بینو وغیرہ) میں تعجب خیز جلدی کیساتھ بڑھتا ہے، مگر یہ قاعدہ مدّت تک قائم نہیں رہتا۔ امریکہ میں یونائیٹڈ اسٹیٹس میں پیداوار کی افزایش جاری ہے اور یقین ہے کہ آیندہ جاری رہیگی۔ مگر اُس تیزی کیساتھ نہیں جو پہلے تھی۔ ملک میں سے انڈین یعنی وہاں کے باشندوں کو پرے ہٹاتے اور بھگاتے جاتے ہیں یہانتک کہ اُن کی کُل نسل ملیامیٹ ہو جائیگی اور پھر ملک میں وسعت پانے کی گنجایش نہیں رہیگی۔

یہ قاعدہ رو سے زمین کے اُن کُل حصّوں پر جنکی آراضی میں زراعت ناقص طور پر ہوتی ہے ایک درجے تک صادق آسکتا ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے بڑے بڑے حصّوں کے باشندوں کا نیست و نابود کرنا تو ذرا بھی خیال کرنے کے قابل نہیں۔ تاتاریوں اور حبشیوں کا مہذّب و محنت پرداز بنانا ایک عرصۂ دراز کا کام ہے اور اِس میں کامیابی غیر مستقل اور غیر محقق۔ یوروپ جیسا آباد ہوسکتا ہے، ایسا آباد نہیں ہے۔ اِس میں انسان کی محنت پردازی کی توقع اچھی طرح ہوسکتی ہے۔ انگلینڈ اور سکاٹلینڈ میں زراعت کے سائنس پر بڑی توجہ کی جاتی ہے، اور ان ملکوں میں غیر مزروعہ آراضی بھی بہت سی پڑی ہے۔ جزائر برطانیۂ اعظم میں بہت سی حالتیں ایسی موجود ہیں کہ وہ پیداوار کے حق میں امرت ہیں۔ یہاں ہم یہ مان سکتے ہیں کہ حتی الامکان عمدہ حکمت سے اور زراعت کی اعلےٰ درجے کی مدد کرنے سے اِس جزیرے کا اوسط پیداوار اوّل پچیس سال میں افزایش پاکر دو چند ہو جائے۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ آیندہ پچیس سال میں آراضی کے پیداوار کے چوچند ہونے کو ہم مان سکیں۔ یہ خواص آراضی کے علم کے بالکل برخلاف ہے۔ بنجر زمین کے قطعات کو نشو و نما دینا بڑی

محنت اور مدتِ دراز کا کام ہے - جو فنِ زراعت میں ذرا سا بھی شعور رکھتے ہیں وہ اِس بات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ جب زراعت کو وسعت دی جاتی ہے تو اُسکے پیداوار سالانہ کے اوسط میں زیادتیاں پہلے اوسطوں کی سی ہوتی ہیں اور وہ بتدریج بالاضافت باقاعدہ کم ہوتی جاتی ہیں - آبادی اور خوراک کی افزائشوں کے تناسب بخوبی دیکھنے کے لئے ایسا فرض کرنا چاہیے گو وہ اپنی صحت کا مدعی نہ ہو - مگر وہ زمین کی پیداوار کی قوت کے حق میں مفید ہو گو وہ ہمارے تجربے میں بھی کبھی نہ آیا ہو زمین کی حالت موجودہ کے اوسط پر خیال کر کے ہم بخوبی کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی محنت پرورازی کی بہترین حالت میں بھی ممکن نہیں کہ غذا نسبت حسابیہ سے زیادہ بڑھ سکے -

یہ جو افزائشوں کی مختلف شرحیں ہیں اُن کے لازمی اثروں کو ملا کر دیکھیں تو عجب حیرت ہوتی ہے فرض کرو کہ انگلستان کی آبادی ایک کروڑ دس لاکھ آدمیوں کی ہے اور اِس میں پیداوار اراضی بھی اتنا ہوتا ہے کہ آسانی سے اُن سب آدمیوں کا پورا پیٹ بھر جاتا ہے اب اوّل پچیس سالوں میں آبادی دوچند ہو کر دو کروڑ بیس لاکھ آدمیوں کی ہو گئی اور پیداوار بھی دوچند ہو گیا تو وہ کُل آبادی کا پیٹ بھر دیگا، اب آئندہ پچیس سال میں سلسلۂ ضربیہ کے موافق آبادی چار کروڑ چالیس لاکھ ہو گئی اور غذا جو پیدا ہو گی وہ سلسلۂ حسابیہ کے موافق تین کروڑ بیس لاکھ آدمیوں کی خوراک کے لئے کافی ہو گی، پھر آئندہ پچیس سال میں آبادی آٹھ کروڑ اسّی لاکھ آدمیوں کی ہو گی اور غذا کا سامان نصف آدمیوں کے لئے پیدا ہو گا - اور اوّل صدی کے آخر میں آبادی سترہ کروڑ ساٹھ لاکھ آدمیوں کی ہو گی غذا پانچ کروڑ پچاس لاکھ آدمیوں کی پیدا ہو گی، باقی ماندہ پورے ایک لاکھ آدمی بے غذا رہینگے اب اِس جزیرہ کی جگہ کُل روے زمین کو لو اور اس سے آدمیوں کی نقلِ مکان کو خارج رکھو اور یہ فرض کر لو کہ کُل دنیا میں دس ارب آدمی رہتے ہیں تو نوع انسان کی آبادی سلسلۂ ہندسیہ یا ضربیہ ا و ۲ و ۴ و ۸ و ۱۶ و ۳۲ و ۶۴ و ۱۲۸

اور ۲ و ۳ و ۴ و ۵ و ۶ و ۲۵ وغیرہ میں بڑھیگی اور غذا سلسلۂ حسابیہ (جمع و تفریق)
و ۶ و ۷ و ۸ و ۹ وغیرہ میں بڑھیگی دو صدیوں میں آبادی اور خوراک کی نسبت ۲۵۶ اور
۹ کی ہوگی اور تین صدیوں میں ۴۰۹۶ و ۱۳ کی اور دو ہزار سال میں ان دونوں میں وہ فرق
ہوجائیگا جسکا حساب کرنا دشوار ہوگا اس فرض میں زمین کی پیداوار کی کوئی حد مقرر نہیں
کی گئی اُسکو دائمی افزایش اسقدر ہوسکتی ہے کہ جو مقدار فرض کرو اس سے زائد ہو
مگر اسپر بھی ہر زمانے میں آبادی کی قوتِ افزایش کو غذا کی افزایش پر برتری ہوگی۔ پس
نوع انسان کی آبادی کو ایسا روک دینا کہ وہ غذا کے ساتھ ہمسری و برابری کرے
احتیاج کے مستحکم قانون کا کام ہے کہ وہ اپنا عمل کرکے اس قوی قوت کی مزاحمت کرکے
آگے نہیں بڑھنے دیتا۔

آبادی کیلئے انسداد عظیم اور اسکے عملونکی طریقے

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ آبادی اور خوراک میں تناسب مختلف ہوتے ہیں
اسلئے خوراک کی کمیابی پیدا ہوتی ہیں، ایامِ قحط میں تو وہ آبادی کا کام تمام کردیتی ہے۔
اور بہت سی بیماریاں پیدا کرتی ہے اسکے سوا اخلاقی اور مادی اسباب ایسے ہوتے
ہیں کہ وہ اجسامِ انسانی کو ضعیف اور مضمحل اور فنا کردیتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے انسان کو عقل دی ہے جسکے سبب سے وہ اور حیوانوں
میں اشرف اور ممتاز سمجھا جاتا ہے، مہذب و شایستہ قوموں میں یہ عقل انسان کو سمجھاتی
ہے کہ جن لوگوں کے بہت سے اہل و عیال ہیں وہ کیسی رات دن تکلیفیں اُٹھاتے ہیں یہ دیکھکر
وہ سوچتا ہے کہ فی الحال اگر اپنے میلانِ طبع کے موافق میں نکاح کرونگا تو جو کچھ مال
اسباب میرے پاس ہے اور جو میری آمدنی ہے جسکو میں اکیلا خرچ کرڈالتا ہوں
اگر اسپر میں نے کچھ تھوڑا سا اضافہ کرلیا تو بھی وہ اُن بچوں کی پرورش کے لئے کافی نہیں
ہوگا جنکے وجود کا سبب دنیا میں میں ہوا ہوں۔

بالفعل تمدّن کی جو حالت ہے وہ اُسکے دل میں یہ تفکّرات اور تردّدات پیدا کرتی ہے کہ وہ کبھی یہ نہیں پسند کریگا کہ سوسائٹی میں اُسکا درجہ کم ہو جائے۔ اور وہ اپنی پہلی عادتوں کو چھوڑ دے۔ مجھے کوئی کام ایسا ملتا ہوا نظر نہیں آتا کہ جسکے سبب سے میرے اہل و عیال کا گزارہ ہو جائے، جو میں اپنے تجرّد کی حالت میں محنت کرتا اُس سے زیادہ مشقتِ شاقہ کا میں متحمل نہیں ہونگا۔ جو تعلیم و تربیت میری ہوئی وہ میں اپنی اولاد کی نہیں کرا سکونگا۔ خواہ میں کیسی ہی کوشش و سعی کروں مگر اپنی اولاد کو چیتھڑے پہننے سے اور بھیک مانگنے سے اور سخت افلاس سے نہیں بچا سکونگا، میں نہیں چاہتا کہ سوسائٹی میں ذلیل و خوار ہوں۔ اور اپنی آزادی کو کھو کر خیرات کے ٹکڑے لوگوں کے ہاتھ سے لیتا پھروں۔ یہ خیالات بہت آدمیوں کو مہذّب و شایستہ قوموں میں جلد نکاح کرنے سے باز رکھتے ہیں، میں اسکا نام نفس کُشی رکھتا ہوں جس میں قوائے بہیمہ انسان کے اختیار و قابو میں رہتے ہیں (اِن باتوں کا خیال انڈیا میں مطلق نہیں، شادی بیاہ بغیر سوچے سمجھے کر لیتے ہیں) اگر اِس نفس کُشی میں کوئی بدکاری پیدا ہو تو بلاشبہ اُسمیں اُصولِ آبادی کے موافق بہت ہی کم بُرائی ہے۔ اِس میں صرف ایک قدرتی میلانِ طبع کو روکنا پڑتا ہے جو تھوڑی دیر کے لئے طبیعت کو نا ملائم معلوم ہوتا ہے اور کچھہ رنج دیتا ہے۔ یہ بُرائی اُن بُرائیوں کی نسبت بہت تھوڑی ہے جو آبادی کے اورانسدادوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

مگر جب نفس کُشی کے انسداد میں بدکاری پیدا ہوتی ہے تو اُسکی بُرائیاں ظاہر ہیں کہ زناکاری بچوں کی پیدایش کو روک دیتی ہے۔ انسان کو ذلّت و خواری کے گڑھے میں گرا دیتی ہے، مرد پر تو جو کچھہ اثر ہوتا ہے وہ ہوتا ہی ہے مگر عورت کی عصمت میں فرق آنے سے اُس کی ساری خوبیاں اور خصائل کی نیکیاں خاک میں ملجاتی ہیں اس قسم کی عورتیں بڑے شہروں میں بہ نسبت قصبات و دیہات کے زیادہ رہتی ہیں جب یہ بد اخلاقی عورت مرد میں پھیلجاتی ہے تو گھر کی ساری خوشیوں کے سرچشمے

زہرآلود ہو جاتے ہیں۔ زن و شو کی محبت اور اولاد اور والدین کی باہمی شفقت بہت ضعیف ہو جاتی ہیں۔ غرض سوسائٹی کی خرمی اور نیکی میں قطعی کمی ہو جاتی ہے۔ دغا فریب و سازشوں اور اخفائ نتائج کا بازار کھل جاتا ہے۔ بدکاریاں پھیلجاتی ہیں۔ اِن انسدادوں کے علاوہ یہ اور انسداد ہیں۔ ایسے پیشے جو امراض پیدا کرتے ہیں۔ سخت جفاکشی۔ ہر موسم کی سختی کی برداشت۔ افلاس کی جفاکشی۔ بچوں کی بُری پرورش۔ بڑے شہر۔ ہر قسم کی فضولی۔ لڑائیاں وبائیں۔ امراض متعدیہ۔ قحط طاعون۔

افزایش آبادی کے انسدادوں کا امتحان کیجیے تو اُن کی یہ تین مدیں بنینگی۔ اخلاقی[1] رکاوٹ، بدکاری[2]، فلاکت[3]۔

اگر آدمی نکاح نکرے اور زنا بھی نہ کرے تو ٹھیک وہ اخلاقی رکاوٹ کہلاتا ہے۔

زناکاری۔ وضع غیر فطری۔ جوروؤں کو چھوڑ دینا اور اُن کے نتائج کا اخفا فریب و دغا سے، یہ سب بدکاری کی مدیں ہیں۔

انسداد جو ضروری قوانین نیچر سے لاعلاج پیدا ہوئے ہیں وہ فلاکت کی مدمیں داخل ہیں، اور وہ انسداد جو ہم اپنے آپ پیدا کرتے ہیں جیسے کہ لڑائیاں، بداعتدالیاں اور بہت سے جنسے بچ جانا ہمارے اختیار میں ہے وہ اِن تین مدات میں سے کسی دو مدوں کے اندر داخل ہیں۔ جو ملک ایسے ہیں کہ اُن کی طبیعت ہی ایسی ہے کہ صحت کو قائم نہیں رہنے دیتی وہاں آدمی بہت مرتے ہیں اور جو ملک صحت بخش ہیں اُن میں آدمیوں کی عمر دراز ہوتی ہے۔

ہر ملک میں یہ انسدادات اپنا عمل کم و بیش کرتے ہیں۔ باوجود اُن کی اشاعت عامہ کے آبادی میں یہ مستقل تنگ و دو رہتی ہے کہ وہ وسائل خوراک سے آگے بڑھ جائے۔ جسکے سبب سے غریب آدمیوں پر وہ مصیبت آتی ہے کہ الاماں۔

بالفعل جو سوسائٹی کی صورت ہے، اُس میں یہ اثر جسطرح پیدا ہوتے ہیں اُن کو

بیان کرتے ہیں، فرض کرو کہ ہر ملک میں خوراک اسقدر موجود ہے کہ وہ اُسکے کُل باشندوں کا باآسانی پیٹ بھر دیتی ہے، نہایت خراب تمدن کی حالت میں کُل آبادی کی تعداد پہلے اُس سے بڑھ جاتی ہے کہ اُسکے لئے خوراک کا سامان تیار کیا جائے۔ مثلاً انگلستان میں ایک کروڑ دس لاکھ آدمیوں کا جس خوراک سے پیٹ بھرتا تھا وہ ایک کروڑ پچاس لاکھ آدمیوں میں تقسیم ہو تو غریب آدمیوں پر بڑی تنگی ہوگی۔ اور بعض ان میں سے قریب المرگ ہونگے، کام کی نسبت محنتی مزدوروں کی تعداد زیادہ ہوجائیگی، اُجرت کا میلان کمی کیطرف ہوگا اور خوراک کے مول کا میلان افزایش کیطرف۔ مزدور کو اپنی پہلی مزدوری پانیکے لئے زیادہ کام کرنا پڑیگا۔ ایسی مصیبت کے ایام میں بیاہ شادی کرنے کے لئے ہمت کم ہوجائیگی۔ اور کنبے کی پرورش ایسی مشکل ہوجائیگی کہ بجائے آبادی کی ترقی کے اُسکا تنزل ہوگا۔ اسی اثنا میں کہ اُجرت کی ارزانی اور مزدوروں کی فراوانی اور محنت پر دازیکی زیادتیکی ضرورت ہے، اہل زراعت کی ہمت اس طرف مصروف ہوگی کہ وہ اپنی زمین کی زراعت میں زیادہ کوشش کریں۔ وہ نو توڑ زمینوں میں تردد زیادہ کرینگے، پرانی زمینوں میں کھات اچھی طرح ڈالینگے اُسکی نشو و نما میں ہمہ تن مصروف ہونگے۔ یہانتک کہ حالتِ سابقہ جو زراعت کی ترقی کرنے کی آغاز میں تھی پھر بحال ہوجاتی ہے۔ مزدوروں کی حالت سنبھل جاتی ہے اور آبادی کی رکاوٹیں بھی ڈھیلی ہوجاتی ہیں، تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد ان ترقی و تنزل کا اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، جو عوام النّاس کی نظر سے مخفی ہوتا ہے اور ہوشیار مشاہدہ کرنیوالوں کو بھی اُسکے اوقات کا حساب کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اوپر کے سارے بیانونکا خلاصہ یہ ہے:

(۱) وسائل خوراک ضرور آبادی کو محدود کرتے ہیں۔

(۲) جہاں وسائلِ غذا کی افزایش ہوتی ہے وہاں آبادی بھی بڑھتی ہے، بشرطیکہ کوئی زبردست انسداد آگے سے نہ ہو۔

(۳) یہ انسداد اور وہ انسداد جو آبادی کی قوتِ اسعے کو پسیت کرتے ہیں اور اُس کے اثروں کو وسائلِ غذا کے ساتھ ہموار رکھتے ہیں، اُن کے یہ تین عنوان ہیں - اخلاقی رکاوٹ[۱] بدکاری[۲] - فلاکت[۳] -

ہم نے جو یہ اوپر ملتھس صاحب کے اصولِ آبادی لکھے ہیں اگر پڑھنے والے اُن کو ذہن نشین کر لینگے تو انڈیا کی آبادی اور خوراک کے بیانات کو جو آیندہ ہم لکھینگے ایسی اچھی طرح سمجھینگے کہ اُن کو بڑا لطف آئیگا -

ملتھس صاحب کے اصولِ آبادی اور خوراک پر اعتراضات اور اُنکی جوابات

اِن اعتراضوں اور اُن کے جوابوں کا پڑھنا بھی ہماری غلطیوں کو درست کریگا - اسلیے ہم اُن کو لکھتے ہیں -

مسٹر سیڈلر ممبر پارلیمنٹ انگلینڈ نے ایک کتاب قانونِ آبادی لکھی ہے جسکی لارڈ سکولی نے اپنے جواب کے مضمونوں میں بڑی مٹی پلید کی ہے - اُنھوں نے آبادی کا یہ اصول قرار دیا ہے کہ جہاں آبادی گنجان کثرت سے ہوگی وہاں ولادتیں کم اور موتیں زیادہ ہونگی اور جہاں آبادی کم ہے وہاں بالعکس حال ہوگا یعنی ولادتیں زیادہ اور موتیں کم ہونگی جسکے معنی یہ ہیں کہ اگر اور سب حالات بدستور رہیں تو انسان کی اولاد کی افزائش کو اُسکی تعداد کے ساتھ تبادلِ معکوس کی نسبت ہوگی - یہ اصول بالکل غلط ہے -

مسٹر سیڈلر خیال کرتے ہیں کہ آبادی کے اُصول جو مسٹر ملتھس نے قائم کیے ہیں وہ موحدین اور عیسائیوں کے مذہب کے خلاف ہیں وہ مسٹر ملتھس کے اصول کو اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ اُن کے اصولِ آبادی میں ایک بُرائی ہے اور یہ بُرائی اتفاقی نہیں بلکہ مدامی ہے - یہ برائی ایسی نہیں کہ وہ کبھی کبھی واقع ہوا کرے بلکہ وہ اپنا عملِ بد سدا کرتی رہتی ہے - یہ بُرائی خفیف نہیں بلکہ بڑی کثیف ہے - وہ سریع الزوال نہیں وہ

ملائم نہیں، بلکہ یہ بُرائی ایسی مصائب پیدا کرنیوالی ہے کہ جسکے مقابلے میں تمام وہ بُرائیاں ہیچ ہیں جو انسان نے اپنی شرارت اور خباثت سے مصائب انگیز پیدا کی ہیں۔ یہ وہ بُرائی ہے جسکا کوئی علاج نہیں اِلّا ایک ہی جس سے اب تک چشم پوشی کیگئی ہے۔ لیکن اب ایسا صاف صاف بیان کیا جاتا ہے کہ جو مسٹر ملتھس کے اصول کی بُرائی کو اُسکے مبدء تک پہنچا دیگا کہ تمام قوانین قدرت (لاز آف نیچر) خدا کے بنائے ہوئے ہیں وہ جو خیر محض ہے، یہ اُسکی شان سے بعید ہے کہ وہ ایسا شرارت آمود قانون بنائے کہ جس سے انسان کی اولاد تو بڑھے اور اُسکی پرورش کیلئے خوراک کا سامان نہ بڑھے۔ اس قانون سے خدا ے تعالےٰ کے اوصاف اور بدائی پر الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسا بُرا قانونِ فطرت بنائے۔ یہ مسٹر سیڈلر کا اعتراض لچر اور لغو ہے اسلئے کہ اس سے زیادہ کوئی امر محقق نہیں ہے کہ دنیا میں اخلاقی اور مادّی بُرائی ہے، جیسے خدا کا خیر محض اور نیک ہونا مانا جاتا ہے، ایسا ہی دنیا میں بُرائی کا ہونا مانا جاتا ہے۔ اب مسٹر سیڈلر کا یہ کہنا بے معنی ہے کہ آبادی کی افزایش کی بُرائی کی صورت اور بُرائیوں کی صورتوں سے جو دنیا میں موجود ہیں جُداگانہ ہے۔ یہ بُرائی بڑی ہے اور بُرائیاں چھوٹی ہیں، جب وہ اس بات کے قائل ہیں کہ دنیا میں بُرائیاں ہیں تو پھر ان میں افزایش آبادی کی بُرائی کو بڑا اور اَور بُرائیوں کو چھوٹا قرار دینا ایک بے معنی بات ہے جب خدا کے بنائے ہوئے قوانین میں بُرائی موجود ہے تو اُسکے چھوٹے اور بڑے قرار دینے سے خدا تعالیٰ کی شان بری الذمہ نہیں ہوسکتی۔ یہ کہنا کہ وہ قوانین فطرت۔ جو زلزلے، طوفان باد و باراں قحط و وبائیں جنسے بیشمار آدمی ہلاک ہوتے ہیں اور بعض اوقات ملک کے ملک ملیامیٹ ہوجاتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کے تازیانے ہیں کہ جنسے انسان کی تعداد باقاعدہ مرتب ہوتی رہتی ہے اور احکم الحاکمین جب انسانوں کی بداعمالیوں کا انبار ہوجاتا ہے تو وہ اپنے قہر کو اُنکی صورت مین نازل کرتا ہے

کہ انسان متنبہ ہو کر اپنی بدکرداری سے باز رہے، خدا تعالیٰ کی ذات کو الزام سے بری نہیں کرتا، اصول آبادی بالطبع انسان کے لئے برائیاں پیدا کرتا ہے جبکا ظاہر میلان و رجحان ہمیشہ اس طرف ہے کہ آدمیوں کی تعداد ایسی زیادہ ہو کہ اُن کی پرورش کے لئے سامانِ خوراک مہیا نہ ہو سکے، لیکن کیا یہ قوانین فطرت خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے نہیں ہیں کہ جیسے زلزلہ طوفان باد و باراں خشکسالی قحط جنکے آنے سے بیشمار آدمی ہلاک ہوتے ہیں؟ ان کی نسبت یہ عذرات گھڑنے کہ وہ بعض حصّوں میں واقع ہوتے ہیں اور کبھی کبھی آتے ہیں اِسنے انسان کو بہت فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ملتمس صاحب کے اُصولِ آبادی کیطرح زلزلہ مدامی ہوتا اور زمین ہمیشہ لرزتی رہتی۔ اگر طوفانِ باد و باران ہمیشہ مدامی ہوتے اور آسمان ہمیشہ پتیل کیطرح ہوتا کہ اسپر کبھی ابر قطرہ فشاں نہیں آتا۔ اِن قوانین مستقل کو خدا تعالےٰ کیساتھ منسوب کرنا اسکو بڑا ظالم و ستمگر قرار دیتا تھا۔ کبھی ہم اُسکو رحیم و کریم نہیں کہہ سکتے، یہ اُسکی بڑی کریمی اور رحیمی ہے کہ وہ اِن حادثات کو کبھی کبھی بھیجکر ہمکو ہماری بداعمالی سے متنبہ کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک مُعمّا ہے۔ جو کبھی حل نہیں ہو سکتا۔ کہ خدا تعالیٰ تو خیر محض ہو، وہ انسان کو ایسا نہ سرشت بنائے۔ کہ اسکی بداعمالی کے سبب سے اُسکو اپنے قہر کو زلزلوں اور طوفانوں، قحطوں و وباؤں کی صورت میں نازل کرنا پڑے۔ اصل یہ ہے کہ انسان میں خدا تعالیٰ نے کوئی استعداد اور قابلیت ایسی نہیں دی کہ وہ اِس امر کو تحقیق کر سکے کہ دنیا میں برائی کہاں سے آئی اور کیوں آئی۔ پس جیسی اور قوانین قدرت میں برائیاں ہیں ایسی ہی ملتمس صاحب کے قانون فطرت اصول آبادی میں برائی ہے۔ جیسے اور برائیوں کا ہونا قوانین فطرت میں کسی مذہب کے خلاف نہیں ہے اور نہ اُس سے کچھ خدا تعالیٰ کی ذات پر کوئی الزام لگایا جا سکتا ہے ایسے ہی ملتمس صاحب کے اصول کی برائی کی نسبت کہا جاتا ہے اِس سے خدا کے خیر محض ہونے پر اعتراض نہیں ہوتا۔

ہم لوگ جب ایسے حادثات ارضی و سماوی رونما ہوتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ یہ قہر الٰہی ہمارے شامت اعمال کے سبب سے نازل ہوا ہے۔ یہ کہنا خدا کیساتھ بڑی گستاخی اور بے ادبی کرنی ہے کہ وہ خود خیر محض ہو اور انسان کو ایسا بد سرشت پیدا کرے جسکے سبب سے یہ مہلک حوادث پیدا کرنے پڑیں۔

اس تمہید کو یہ نہ سمجھنا کہ مونچھیں داڑھی سے اور سینگ سر سے بڑھ گئے ہیں، مضمون بھی بڑا ہے جو کئی جزوں میں لکھا جائیگا۔

انڈیا کی افزایش آبادی

نیبر صاحب لکھتے ہیں کہ انگریزی عملداری سے پیشتر یہاں بادشاہوں اور والیان ملک اور حوالی وموالی کے پاس تو دنیا کا سارا سامان عیش وطرب آسایش وآرام موجود ہوتا تھا، باقی رعایا پاس فقط وہی چیزیں جو ضروریات زندگی میں داخل ہیں ہوتی تھیں اور اسکے سوا سامان آسایش وآرام نہیں ہوتا تھا۔ آبادی بہت کم تھی۔ وہی زمینیں جو زرخیز ہوتی تھیں کاشت میں آتی تھیں۔ انکا پیداوار اس فراط سے ہوتا تھا کہ سب آدمیوں کا پیٹ بھر جاتا تھا اور بچ رہتا تھا اور اپنی احتیاجوں کے موافق اور اسباب بھی ہوتے تھے، رعایا سب کاشتکار تھی۔ ۱۷۸۹ء میں گورنر جنرل نے اعلان کیا کہ تین برس میں بڑی تدقیق کے ساتھ تحقیق کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ تہائی بنگال ویران اور غیر آباد پڑا ہے۔ اس حالت میں اُن ہی زمینوں میں زراعت ہوتی ہے جو سب سے زیادہ زرخیز وسیر حاصل ہیں۔ ان زمینوں کے زمیندار اپنے کاشتکاروں کے ساتھ بڑا نیک سلوک کرتے ہیں، ان میں رقابت ہمیشہ اس بات میں رہتی تھی کہ کاشتکار ہمارے پاس اچھے ہوں۔ اس زمانے کی طرح کاشتکاروں میں رقابت اس بات میں نہ تھی کہ زمین ہم کو ہاتھ لگے۔

پس ایسی حالتوں میں وسائل زندگی آسانی سے حاصل ہوتے تھے، صرف رعیت کی بہبودی و آسودگی کے لئے یہ محافظت کرنی پڑتی تھی کہ وہ لُٹ نہ جائے اور اُسکے سر پر تلوار نہ چل جائے - جب برٹش گورنمنٹ قائم ہوئی تو اُسنے رعیت کو لوٹ اور غارت سے اور اُنپر تلوار چلنے سے بچایا اور ان مصیبتوں سے بچانے کے سوا اور اور آفتوں قحط اور وبا سے بھی محفوظ کیا - جب مدعی وبائیں یہاں آتی ہیں تو اُن سے لڑنے کے لئے ہندوستانی و انگریزی ڈاکٹروں کا لشکر سید ان جنگ میں موجود ہوتا ہے - کونین کا انبار لگا ہوتا ہے کہ وہ بخار کو دُور کرے - اور رعیت کی رسائی اس تک آسانی سے ہو - یہ تو گورنمنٹ کی قدرت سے باہر تھا کہ وہ قحط کا انسداد پوری طرح کرے، مگر اور مزاحمتیں جو افزایش آبادی کے لئے تھیں اُنکا انسداد کیا تو آبادی کی افزایش شروع ہوئی وہ تہائی نہیں بڑھی، بلکہ سہ چند - ۱۸۰۰ء میں جو رقبہ دو کروڑ دس لاکھ آدمیوں کو خوراک دیتا تھا اب وہ ۱۸۸۱ء میں چھ کروڑ تیس لاکھ آدمیوں کو غذا اپیٹ بھر کے دینے لگا - پس اسلئے برٹش گورنمنٹ میں تنازع فی البقا کا بازار گرم ہوا -

برٹش اضلاع کو جنکی آبادی ہندوستانی ریاستوں کی آبادی کی نسبتاً فی الحال سہ چند گُنجان تھی - اُسکا پیٹ بھرنا پڑا - عموماً برٹش انڈیا میں ۲۱۲ آدمیوں کی آبادی فی مربع میل ہے اور اگر صوبجات نو مقبوضہ برہما اور آسام ملا لئے جائیں تو ۲۴۳ آدمیوں کی آبادی فی مربع میل ہے، ہندوستانی ریاستوں میں ۹۰ آدمیوں کی آبادی فی مربع میل ہے - مشرقی سرحد پر آسام کو اور سمندر پار برہما کو خارج کرو تو برٹش انڈیا میں تقریباً بحساب اوسط چند آبادی کو بہ نسبت ہندوستانی ریاستوں کے خوراک کھلانی پڑتی ہے -

آئرلینڈ اور انڈیا کی آبادی کا مقابلہ

آئرلینڈ کے چھوٹے زمینداروں کی حالت بیان کی جاتی ہے کہ وہ بڑی خلاکت

میں رہتے ہیں، آخر مردم شماری کے موافق آئرلینڈ میں ۱۶۹ آدمیوں کی آبادی فی مربع میل تھی۔ شمالی انڈیا میں تیرہ ضلعے آئرلینڈ کی برابر ہیں جنمیں سے ہر ایک کو ۱۶۸ آدمیوں کی فی مربع میل پرورش کرنی پڑتی ہے یعنی ہر ایک آدمی کو ایک ایکڑ زمین پر اپنی بسر اوقات کرنی پڑتی ہے، اس حساب میں وہ زمینیں بھی جو مرطوب اور ویران اور غیر قابل زراعت ہیں داخل ہیں، خارج نہیں۔ قحط کمیشن کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کے دو تہائی کاشتکاروں میں سے ہر ایک کے پاس دو یا تین ایکڑ زمین ہے اگر ہر کاشتکار کے اہل وعیال چار ہوں تو دو کروڑ چالیس لاکھ آدمیوں کو ایک کروڑ چالیس لاکھ ایکڑ زمین پر تنازع فی البقا پر نوبت پہنچیگی۔ یعنی ہر ایک کو نصف ایکڑ پر، پس انڈیا کی مزروعہ زمین اس نزاع کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ انگلش مین جو محب انسان ہیں وہ یہ حسابات دیکھکر ایسے مضامین لکھتے ہیں جنکی پیشانی پر "خوں آشامی زندگانی" لکھا ہوتا ہے۔ آئرلینڈ میں مثل برطانیہ اعظم بہت سے شہر ہیں جو صنعت و حرفت کے مرکز ہیں اسکے برخلاف انڈیا میں کل آبادی کی گذر زندگانی زمین کی زراعت پر منحصر ہے، انڈیا میں صرف ۵ فیصدی آدمی قصبوں اور شہروں میں رہتے ہیں، یعنی بیسویں حصے سے زائد شہروں میں نہیں رہتے۔ نوّے فیصدی آبادی سے کچھہ کم وبیش زمین کی پیداوار سے اپنی بسر اوقات کرتی ہے، پس انڈیا بالکل زراعتی ملک ہے، بہت سے قصبات ایسے بھی ہیں کہ وہ دیہات کے مجموعے ہیں، جنکے اندر ہل چلتے ہیں، اور مویشی چرتے ہیں اور سارے کاروبار زراعت کے ہوتے ہیں۔

آبادی کے بڑھنے سے خشکی میں جنگلی جانوروں کا اور تری میں مچھلیوں کا کم ہونا

پہلے ملک میں سے آبادی کی افزائش نے تمام قسم کے وحشی جانوروں کو خشکی

ہیں اور مچھلیوں کو تری میں گھٹا دیا ہے۔ بنگال میں اسی فیصدی آدمی مچھلی کھاتے ہیں۔ کاشتکاروں کے لئے یہی سب سے اچھی خوراک ملسکتی ہے۔ مچھلیوں کی قیمت پہلے کی نسبت دوچند ہوگئی ہے۔ ایک وقت میں مچھوے بڑے دولتمند ہوگئے تھے اُنھوں نے دریاؤں اور تالابوں کو مچھلیوں سے خالی کردیا۔ اب مچھلی کے کھانے کی جتنی ضرورت ہے اُتنی پیدا نہیں ہوتی۔ جہاں تالاب اور دریا مچھلیوں سے خالی ہوگئے ہیں وہاں مچھوؤں نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا ہے۔

آبادی کی افزایش سے ایسی جماعتیں بڑھگئی ہیں جنکے پاس زمین نہیں۔

اب آبادی ایسی بڑھ گئی ہے کہ ہر کاشتکار کو زراعت کیلئے کوئی ذراسا قطعہ بھی کاشت کیلئے نہیں ہاتھ آتا، پس اسلئے بہت سے آدمی زراعت زمین کے کام سے خارج ہوگئے ہیں، اب وہ اور محنت و مزدوری کرنے لگے ہیں۔ اُن کی حالت بڑی خراب ہے، جب قحط پڑتا ہے تو سب سے زیادہ اُسکی بلا اُن کے سر پر پڑتی ہے۔

کاشتکاروں پر اِس افزایش آبادی کے دو طرح کے اثر ہیں، اوّل اُنکو زمین اُن کی محنت کا معاوضہ اسپنے پیداوار سے کم دیتی ہے اور اُن کو اپنی تھوڑی سی آمدنی کا بہت زیادہ حصہ نسبتاً زمیندار کو دینا پڑتا ہے آبادی کی افزایش کے سبب سے اُن زمینوں کو کاشت کرنا پڑتا ہے جنکا پیداوار اچھا نہیں ہوتا۔ جب ملک ویران سمجھا جاتا تھا تو اچھی سیر حاصل زرخیز دیہات کی زمین اضلاع میں بوئی جوتی جاتی تھی اور باقی زمین ہندوستانی عملداری میں ویران محسوب ہوتی تھی۔ لیکن جب انگریزی عملداری میں آبادی کی افزایش ہوئی تو کم حاصل زمینوں کی بھی زراعت

کرنی پڑی تاکہ خوراک میسر ہو۔ اُن زمینوں پر سخت ریاضت کرنے سے بھی ثمرہ تھوڑا ملتا ہی۔ یہ امر واقعی ہے کہ بنگال کے صوبہ کا ایک تہائی ویران ہونا گورنمنٹ کی بدنصیبی تھی مگر اسمیں کاشتکار کے لئے کوئی سختی نہ تھی دیہات کی عمدہ زمینوں کو وہ کاشت کرتا تھا، اور ضلع کے عمدہ دیہات میں بوتا جوتا تھا، باقی زمین ہندوستانی عملداری میں ویران محسوب ہوتی تھی، لیکن جب برٹش گورنمنٹ میں آبادی بڑھی تو اُسکو کم حاصل زمینوں میں کاشت کرنی پڑی۔ بتدریج اُسکو اپنی سخت محنت بڑھانی پڑی کہ اُسنے زیادہ خوراک حاصل کرے۔

جب آبادی کی افزایش ہوئی تو زمینوں کو زراعت کے لئے فرصت نہیں دیگئی ہزاروں ایکڑ زمین پر ہر سال دو فصلیں بوئی جوتی کاٹی جانے لگیں۔ سوا اسکے آس پاس کے جنگل کاٹ کے ہل چلانا پڑا اور لکڑی کی جگہ گوبر کے اُپلے جلانے پڑے۔ پس اِس طرح سے کھیت اچھی کھات سے محروم ہوئے، پہلے لکڑیاں جلاتے تھے، اُن کی راکھ کی کھات ڈالتے تھے اور گوبر کی بھی کھات کام میں لاتے تھے۔ پس جنگلوں کے کٹنے سے وہ دو طرح کی کھات سے محروم ہوئے، ایک لکڑی کی راکھ کی کھات سے دوم گوبر کے اُن اجزا کی کھات سے جو زراعت کو خوب نشو و نما دیتے ہیں۔

جنگلوں کا کٹنا

بہت سے آزمودہ کار و تجربہ کار کہتے ہیں کہ انڈیا کے بعض قطعات میں جنگل اس کثرت سے کٹ گئے ہیں کہ اسکے سبب سے اُنکی آب و ہوا بدل گئی ہے جنگل اور اُسکے اندر جو اُگتا ہے وہ بارش کو پیدا نہیں کرتا، لیکن بارش کی کشش کرتا ہے۔ پہاڑ جسپر جنگل ہو وہ رطوبت و تری کو امانت رکھتا ہے، اگر اس پہاڑ پر سے جنگل کو اُڑا دیجئے تو وہ ایک چٹیل میدان ہو جائیگا اُسپر جو برسات کی بارش ہوگی تو اُسکے پانی کی رَوئیں اور سیلاب

بڑی خطرناک رواں ہونگی، یہ بنجر خشک زمین نہ نباتات کو اُگائیگی نہ رطوبت اور تری کو امانت رکھیگی، یہ بھی لوگ کہتے ہیں کہ اسی سبب بعض اضلاع میں قحط کی خشک سالیوں کی افراط ہوگئی ہے، قدیمی والیانِ ملک کاشتکاروں کو اُن جنگلوں کے کاٹنے کے لئے نوکر رکھتے تھے یا اب گورنمنٹ جو جنگل باقی رہ گئے ہیں اُن کی حفاظت کے واسطے ایک محکمہ جنگلات کا رکھتی ہے جسمیں روپیہ خرچ ہوتا ہے۔

مویشی کی چراگاہوں میں کمی ہونا چلنا اور مویشی کا مریض ہونا

دیہات میں جو پہلے زمینیں مویشی کے چرنے کے لئے تھیں اب اُن میں زراعت کے لئے ہل چلنے لگے ہیں اور سبب اضلاع میں مویشی کی راس کافی خوراک کے نہ ملنے سے کمزور ہوگئی ہے۔ اب کھیتوں میں بیلوں سے اتنا کام نہیں ہوتا جتنا کہ پہلے ہوتا تھا مویشی میں اب خطرناک وبائیں آتی ہیں اور اُسکے مُنہ اور پاؤں میں بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جس نے بنگال میں ہزاروں مویشی کو مار ڈالا اور مجبوراً گورنمنٹ کو کمیشن کیٹل پلیگ یعنی مویشی کی وبا کا تقرر کرنا پڑا۔ بنگال میں مویشی کے پاؤں اور دہانوں کی بیماریاں پھیل گئیں اب کسانوں کو مشقتِ شاقہ اُٹھاکر اپنا رزق اُن کم حاصل زمینوں سے حاصل کرنا پڑا جنکو وہ سو برس پہلے اُنگلی بھی نہیں لگاتے تھے۔ سیر حاصل زمینوں پر یہ آفت آئی کہ اُنکو وہ کھات ملنا موقوف ہوا جس سے وہ خوب ہری بھری ہوتی تھیں۔ اُن میں متواتر کاشت ہونیسے اُنکی قوتِ نمو میں ضعف آیا، مویشیوں کو یہ مصیبت پیش آئی کہ اُنکی چراگاہوں میں کمی ہوئی جسکے سبب سے اُن کی توانائی اور تنو مندی میں ضعف آیا۔ یہ ہمارا دُنیا بیان کُل انڈیا سے متعلق نہیں ہے بلکہ فقط اُن اضلاع سے متعلق ہے، جن کی زراعت کا رقبہ بڑھ گیا اور آبادی اتنی بڑھ گئی کہ اُن کے واسطے کافی خوراک اُن اضلاع کی زمینیں نہیں پیدا کر سکتیں، مگر اس ہمارے بیان سے اُن الم ناک عبرت انگیز

پیشین گوئیوں کی کچھ تصدیق ہوتی ہے جو یہ کہہ رہی ہیں کہ انڈیا میں اصل خوف یہ نہیں کہ اس کے فائی نینس (خزانہ) کا دوالہ تھوڑے دنوں کے لئے نکل جائے بلکہ سب سے زیادہ اصل اندیشہ یہ ہے کہ ہمیشہ کیلئے اُسکی زراعت کا دوالہ نکلجائے۔

۵- جولائی ۱۹۰۸ء۔　　ذکاء اللہ۔

آریہ و اَن آریہ قومیں اور سنسکرت و پراکرت زبانیں

(نمبر۲)

(سلسلہ کے لئے، ماہ مارچ ۱۹۰۸ء کا پرچہ علی گڈھ منتھلی ملاحظہ ہو)

مہا بھارتھ کے بعد، کرو راج کے حالات　کرو راج (جو مصلحتاً، چندروز تک، دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا) پھر، بہ دستور سابق، ایک سالم راج ہو گیا- اور بخت بلند نے، اُس عظیم الشان سلطنت کا مالک بے درد ہر راجہ پریچھیت کو بنا دیا - دارالحکومت، اُس وسیع مملکت کا، ابتداً میں بہت زمانے تک تو، اندرپرست ہی بنا رہا، جو پانڈوں کا آباد کیا ہوا تھا اور اُن کے دَوْرِ دَوْرَے میں، کمال رونق و آبادی اُس کو حاصل تھی؛ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ زمانے کے ہیر پھیر سے، بعد کو شہر دِلّی میں منتقل ہو گیا، جو غالباً، کسی زمانے میں نیا آباد ہوا تھا- اور اب تک آگاہ دلوں کو عبرت دلانے کے لئے بصد آن بان موجود ہے- فی زماننا بہشت آئیں اندرپرست کا صرف نام ہی نام رہگیا ہے۔

ستائیس۲۷ پشت تک تو پریچھیت کی اولاد، بڑی شان و شوکت سے- اندرپرست میں راج کرتی رہی؛ مگر اٹھائیسواں۲۸ راجہ، کھیم راج، بڑا سُست و غافل ہوا؛ جسکو اُس کے وزیر نے قتل کر ڈالا، اور آپ راج گدی کا مالک بن بیٹھا- اُس نمک حرام کا نام وِسَرْب تھا۔

دِسرَت کے بعد، ایک دوسرے گھرانے میں اور دوسرے کے بعد، تیسرے خاندان میں، یکے بعد دیگرے یہ مغصوبہ راج منتقل ہوتا گیا۔ اور تینوں مختلف گھرانوں* کے اڑتیس ۳۸ راجے مالک تخت و تاج ہوتے گئے۔ اڑتیسواں راجہ، یعنی تیسرے گھرانے کا اخیر فرمانروا راجپال ہوا؛ جو اُجّین کے راجہ بکرماجیت کا ہمعصر تھا۔

راجپال پر، کماؤں کے راجہ، شکھونتا نے بڑے زور شور سے حملہ کیا، اور اُسکو مار کر، اندرپرست یا دِلّی کی پُرانی سلطنت پر قبضہ کرلیا؛ لیکن یہ قبضہ اُسکا قائم نہ رہا۔ اور چند روز کے بعد ہی، مہاراجہ بکرماجیت نے ایک فوجِ جرّار سے چڑھائی کرکے شکھونت کو نکال باہر کیا۔ اور کروؤں کے قدیم اور آبائی راج پر، پورا پورا تسلط کرکے، اُسے، اپنی زبردست قلمرو میں شامل کرلیا۔

اگرچہ سات سو برس تک، وہ سلطنت اُسی بااقبال اور نامور راجہ کی اولاد کے قبض و تصرف میں رہی، جن کی ماتحتی میں اُسکو ہر طرح کی ترقی و سرسبزی کی اُمید تھی مگر چونکہ قابضینِ سلطنت ہمیشہ خود اپنی پُرانی راجدھانی، اُجّین ہی میں رہا کرتے تھے اِسلئے اُس زمانۂ طویل، یعنی سات سو برس تک دِلّی کا تخت خالی، سُنسان اور ویران پڑا رہا۔ عبرت! عبرت!! عبرت!!!۔

سات سو برس کے بعد، اِنقلاب زمانہ نے ایک اور ہی خاندان کو تخت و تاج کا مالک بنایا، جو تواریخ میں تواریا تومر کے لقب سے ملقب ہے، اِن لوگوں نے تختگاہ دِلّی کو (جو مدت سے خالی اور ویران پڑا ہوا تھا) اپنے قدومِ میمنت لزوم سے از سرِنو آباد و پُررونق کیا۔

---

* ، غالباً، اِنھیں مختلف گھرانوں کے دَورِ حکومت میں، سنہ عیسوی سے تقریباً، ساڑھے پانچسو برس ۵۵۰ پہلے ایران کے بڑے شاہنشاہ، داراے اوّل نے اور دارا سے کم و بیش دو سو ۲۰۰ برس کے بعد، اسکندرِ اعظم یونانی نے، ہندوستان پر حملے کئے۔ ۱۲

اِکیس (۲۱) پُشت تک، تومر خاندان والے، علی التسلسل برسرِ حکومت رہے۔
اِس کے بعد، ہندوستان پر اہلِ اسلام کا قبضہ ہوا۔ اور آریوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ سچ ہے ؎
نہیں پادشاہی کچھ آخر خدائی
جو ہے آج اپنی تو کل ہے پرائی
مسلمانوں کے حملے تو، آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا ہی سے شروع ہوگئے تھے، جن کے مزید حالات، آگے چلکر معلوم ہونگے۔
لیکن یہ حملے، سب کے سب، صرف سندھ کی راہ سے ہوئے، اور اُن کی پامالی، فقط، سندھ، گجرات، چتوڑ وغیرہ تک ہی محدود رہی اور دِلّی (جسکو ہندوستان کا دروازہ کہتے ہیں) اور اُسکے سوا، اور شمالی سلطنتیں اُن کے برباد کُن اثروں سے اب تک بالکل محفوظ تھیں، کیونکہ قوم افغان (جس سے اور راجگانِ لاہور سے، دوستانہ معاہدہ تھا) بڑی دلیری سے غنیم کی سدِ راہ ہوتی تھی، جس سے اِن اطراف کی سلطنتیں کافی طور پر محفوظ رہتی تھیں۔
لیکن تخمیناً ۹۷۵ء میں، سلطان محمود غزنوی کے باپ امیر نصیر الدین سُبکتگین نے، توڑ جوڑ کرکے افغانوں کو اپنا بنالیا اور بلا روک ٹوک، چڑھائی کرکے پہلے ہی حملے میں ہندوستان کے کئی قلعے لیلئے اور بہت سامالِ غنیمت لیکر، اپنے ملک کو لوٹ گیا۔
اِسکے جواب میں راجہ جے پال والیِ لاہور نے، لشکرِ کثیر کے ساتھ سندھ پار ہوکر خود سبکتگین کے ملک پر حملہ کردیا، مگر شکستِ فاش اُٹھائی۔ آخرش اِس شرط پر صُلح ہوگئی کہ شاہِ ہند ایک مقررہ تعداد روپیوں اور ہاتھیوں کی، سال بسال امیر کو ادا کیا کریگا۔ اور چونکہ اُسوقت زرِ تاوان پُورا پُورا ادا نہ ہوسکا، اِس لئے راجہ کی درخواست پر سُبکتگین کیطرف سے چند معتمد الیہم ساتھ کردیے گئے۔ کہ اُنھیں کی

معرفت وہ موعودہ زرِ بقیہ چلا آئے۔

لیکن گھر پہنچکر، بد اندیش مشیروں کی صلاح سے راجہ بدعہدی کر بیٹھا۔ اور اُن معتمدین کو قید میں ڈال رکھا۔ یہ خبر پاتے ہی سبکتگین ایک لشکر جرّار لیکے جے پال پر طوفان کی طرح چڑھ آیا۔ باوجودیکہ یہ بلا خود جے پال کی بُلائی ہوئی تھی، مگر ہمسایہ سلطنتوں نے، اس موقع پر، ہمدردی اور مآل اندیشی کا پورا پورا ثبوت دیا۔ چنانچہ اِدھر بھی دِلّی، اجمیر، کالنجر اور قنّوج کی فوجیں، لاہور کی فوج کے ساتھ مِلکر ایک لشکرِ عظیم تیار ہوگیا۔ اور دونوں حریفوں سے، کنارۂ لغان پر مقابلہ ہوا جسمیں ہندوؤں کو شکست کامل ہوئی سُبکتگین سے تو پھر کوئی لڑائی ہندوؤں سے نہیں ہوئی۔ لیکن اُسکے بیٹے، سلطان محمود غزنوی کے بارہ[۱۲] حملے تواریخ میں مشہور ہیں جو ۱۰۰۱ء اور ۱۰۲۴ء کے درمیان میں ہوئے تھے، تواریخ کی تقریباً سب کتابیں، ان حملوں کے بیان سے بھری پڑی ہیں، اسلئے اُن کے اعادے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی؛ البتہ ان دِنوں کے واقعات میں سے یہ امر قابلِ تذکرہ ہے۔ کہ سلطان کے متواتر حملوں اور نگرکوٹ، تھانیسر، اور متھرا کی بربادیوں سے متاثر ہوکر، قنّوج کے راجہ کنوار رائے نے (جو خاندانِ گوڑ سے تھا) مصلحتاً، دشمن کی اطاعت اختیار کر لی، اس پر آس پاس کے راجے، عموماً اور راجۂ دِلّی خصوصاً اُس سے اتنا ناراض ہوئے۔ کہ والیٔ کالنجر نے غریب کو جان ہی سے مار ڈالا۔

اُسوقت سے ہند کے سربرآوردہ راجاؤں کے دو فریق ہوگئے۔ ایک میں، والیانِ قنّوج اور گجرات شامل تھے۔ اور دوسرے گروہ میں دِلّی، اجمیر اور چتوڑ کے راجے داخل تھے۔ اور آپس میں سبھوں کے یہ معاہدہ ہوا کہ گاڑھے وقتوں میں، ہر ایک سلطنت اپنی دوست سلطنتوں کی معین و مددگار رہے۔

خیر یہ سب تو جملۂ معترضہ تھے، جو واقعاتِ آئندہ کے، بخوبی سمجھ میں آجانیکیلئے

معرضِ بیان میں آگئے، اب پھر ہم اصل واقعہ یعنی آریوں کے انتزاعِ سلطنت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

دہلی کے تونور خاندان کا بیسوان راجہ (جسکا نام، اننگ پال تھا) کوئی اولادِ نرینہ نہ رکھتا تھا۔ اُس کے صرف دو بیٹیاں تھیں۔ اُن میں سے ایک راجہ جے چند راٹھور*، والیِ قنوج کو بیاہی تھی اور دوسری کی شادی اجمیر کے قومی راجہ ہمیسور چوہان سے ہوئی تھی۔

آریوں کی سلطنت کا خاتمہ کرنیوالا، پرتھی راج، عرف راجہ پتھورا اِسی بہادر چوہان کا بیٹا تھا، جسکو اُسکے نانا والیِ دِلّی نے اپنے بعد کی گدّی نشینی کے لئے گود لیا تھا۔

---

* راٹھور، اپنے تئیں مہاراجہ رام چندر کے دوسرے بیٹے، کُش کی اولاد بتلاتے ہیں۔ اسیطرح اُدے پور کے رانا، اُن کے بڑے بیٹے، لَو، کی نسل میں ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ جن کا گھرانہ ہمیشہ سے معزز چلا آتا ہے، ایساکہ دوسرے راجاؤں کو مہارانا۔ اُدے پور ہی، اپنے پیر کے انگوٹھے سے، پیشانی پر تِلک دے کر، گدّی نشین کرتے تھے۔ قنوج میں راٹھوروں کی سلطنت کا بانی سری چندر دیو، ہوا جو جے چند راٹھور سے پانچ پشت پہلے تھا۔ قِصّہ یوں ہے کہ جب کنور راے مارا گیا تو قنوج کی راج گدّی کچھ روز خالی پڑی رہی۔ آخر کار، سری چندر دیو نے دکھن سے آکر، قنوج کو بزورِ بازو دخل کرلیا۔

بارہویں صدی عیسوی میں جب قنوج میں اہلِ اسلام کا عمل دخل ہوگیا تو راٹھور میواڑ کی طرف چلے گئے۔ لیکن وہاں برابر فاتحین کے دست و بازو بنے رہے۔ اور فتوحات میں ان کی بڑی مدد و معونت کرتے رہے، بلکہ انصاف یہ ہے کہ ہند کی اسلامی فتوحات میں بڑا حصّہ انھیں کی جانفشانیوں کا ہے۔

چنانچہ حسب قرارداد، انَنگ پال کے بعد، اُسکا نوجوان ناتی، اُسکا جانشین، قرار پایا۔ اُسوقت اُسکی عمر صرف آٹھ برس کی تھی۔ لیکن بخت واتفاق سے، دِلّی و اجمیر کی سی دو دو زبردست سلطنتوں کا مالک بن گیا۔

یہ بات، اُسکے قدیم حریف، راٹھور قنوّج کو سخت ناگوار گذری، جو دامادی کی حیثیت سے، چوہان کے مقابلے میں تختِ دلّی پر مساویانہ داعیہ رکھتا تھا۔ اُس نے ایک کم عمر لڑکے کو دِلّی بلکہ سارے ہند کا، مہاراجادھیراج تسلیم کرنے سے، صاف اِنکار کر دیا۔ بلکہ اِس معزّز لقب کا خود دعویدار ہوا۔ اور معاہدہ باہمی کے مطابق، گُجرات کا راجہ بھی، اُسکا ہم آواز او رہم آہنگ بنا

والیِ قنوّج نے اِس تقریب سے، سہو سید جگ*، اور نیز اپنی دختر نیک اختر کی شادی کی تقریب سے، سُیمبر جگ†، ترتیب دینے کی تیاریاں کیں۔ اور اُن موقعوں پر قدم رنجہ فرمانے کے لئے ہندوستان کے کل راجاؤں کو دعوتیں دیں۔

شاید مجھ کو پرتھی راج کی وجہ غیر حاضری بتلانے کی ضرورت نہیں ہے، غالبًا غور کرنیوالی طبیعتیں خود سمجھ جائینگی۔ دستور تھا کہ ایسے موقعوں پر، چھوٹی بڑی جلسے کی سب قسم کی خدمتیں والیانِ ریاست ہی کو، سپرد کیجاتی تھیں اِسی لئے جب پرتھی راج خود نہ آیا، تو اُس کی ایک سونے کی مُورت بنوا کر بہ طور دربان کے ڈیوڑھی پر کھڑی کر دی گئی۔

یہ ہتک آمود خبر پاتے ہی، پرتھی راج ایک سو آٹھ چیدہ بہادر سرداروں کو ساتھ لیکر بہ طور یلغار عین جشن کے روز قنوّج جا پہنچا اور اُس لڑکی کو (جس کے لئے سُیمبر جگ رچایا گیا تھا) لے بھاگا۔ راٹھور نے تعاقب کیا اور اُن ایکسو آٹھ

* جلسۂ قربانی۔ † جلسۂ شادی۔

سرداروں میں سے ۶۴ چونسٹھ کو تہ تیغ کر ڈالا۔

اِسی باہمی نقاص کے زمانے میں، شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان پر ایک زبردست حملہ کیا۔ یہ حملہ سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے تقریباً دو ۲۰۰ سو برس کے بعد ہوا، گو اس عرصۂ دراز میں ہندوؤں کی حالت بہت کچھ سنبھل گئی تھی، اور اگر وہ کوشش مشترکہ سے کام لیتے، تو اِس بلاے ناگہانی کا علاج اُن کے ہاتھ میں تھا، لیکن آپس کی نا اتفاقی نے اُن کو ایسے زور آور حملے کے روکنے کے قابل نہ رکھا۔

تُرکوں اور ہندوؤں سے کئی لڑائیاں ہوئیں اور طرفین کی بہادرانہ زور آزمائیوں* کے بعد آخر ش ہندو راجہ مغلوب ہوا۔ اور مسلمان فتحیاب ہوئے۔ پس دہلی کے فتح ہوتے ہی ہندوستان میں اِسلامی سلطنت کی نیو پڑ گئی۔

چندر بنسیوں کے مزید حالات۔ گزشتہ مارچ کی اشاعت میں، ہم لکھ آئے ہیں کہ کوشل راج، اجُدھیا سے اُجڑ کر پہلے بلبھی پور میں قائم ہوا۔ اور تین سو اسّی ۳۸۰ برس کے بعد وہاں سے برباد ہو کر ایدر میں منتقل ہو آیا۔

ایدر میں آٹھ فرمانروا، اطمینان اور استقلال کے ساتھ، یکے بعد دیگرے حکمرانی کرتے گئے، مگر پھر اُن کے گھر ہی میں ایسی خانہ جنگی قائم ہوئی جس سے اُس راج کا نام و نشان ہی مٹ گیا یعنی آخری راجہ کو، خود اُسکے بیٹوں ہی نے اِتفاق

---

* اُن لڑائیوں کے حالات، پرتھی راج راسا میں مفصل مندرج ہیں۔ جس کا مصنّف چند بھاٹ ساکن کانگڑا ہے۔ یہ کتاب اُس زمانے کی زبان میں نظم لکھی گئی ہے۔ اور بہت صحیح ہے۔ اِتنے زمانے کے بعد اب اِس بات کا ملی کرنا سخت مشکل ہے کہ وہ زبان ہند کے کِس خطّے کی زبان تھی؟۔

کانگڑے کی، یا دِلّی و قنوج کی، یا متھرا و آگرہ کی، یا راجپوتانہ کی؟

کر کے شکارگاہ میں مار ڈالا۔ بُرے کام کا نتیجہ بھی بُرا ہوتا ہے۔ اُن پدر کشوں کے آپس میں بھی اتفاق قائم نہ رہا۔ اور وہ ناخلف، تقریباً، سب کے سب، آپس ہی میں کٹ مرے۔ صرف اُن کا ایک چھوٹا سا بھائی (جسکا نام، باسپا یا باپا تھا) بھاگ کر، بھانڈیر گڑھ میں، پناہ گزیں ہوگیا، اور مدتوں وہاں گڑریوں کے ساتھ، اپنے منحوس دن گزارتا رہا۔

گڑریوں کی محنتی اور چالاک صحبت کی بدولت، اُس ہونہار کی خاندانی شجاعت میں، ایک غیر معمولی تحریک پیدا ہوئی۔ چنانچہ اِس اِفلاس اور آوارگی کے زمانے میں شجاعت اور بہادری کے عجیب عجیب قصّے اُس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں*۔

ایک روز، تذکرۃً، باپا کی ماں نے اُس سے کہا کہ مہاراجہ چتّوڑ (جو پرمرا خاندان سے ہیں) وہ تیرے قرابتی ہیں، یہ سُنکر اُسکی افسردہ اُلُو العزمی تازہ ہوگئی اور چوپانی کے ذلیل پیشے سے اُسکو دلی نفرت پیدا ہوگئی۔

جب اُنھوں نے اِس قصّے کو اپنے ہمجولیوں سے دُہرایا، تو وہ لوگ بھی آمنّا و صدّقنا کہتے ہوئے اُسکے ساتھ ہوگئے، چنانچہ اُن جاں نثاروں کو ساتھ لیکر، وہ فوراً دربارِ چتّوڑ میں جا دھمکا اور اپنی ساری رام کہانی کہہ سُنائی اور شرافت و عالی نسبی کے بڑے بڑے ثبوت پیش کئے۔ راجہ کو اس کی پُر درد اور عبرت انگیز داستان سُنکر اُسکی بیکسی و بےبسی پر کمال رحم آیا اور اُس مصیبت زدہ کی بڑی عزت و توقیر کی۔

* رنچھور بھٹ لکھتے ہیں کہ :۔ باپا تین شو[۳] پانچ گز لمبا دوپٹہ ہ[؟] کمر لپیٹتا تھا، سولہ[۱۶] ہاتھ کا چولہ پہنتا تھا۔ اُسکا کھانڈا ایک من سے زیادہ وزنی تھا۔ اور دُرگا جی کی پرستش کے وقت، دو بھینسوں کو برابر کھڑا کرکے، ایک ہی ضرب میں بلی دیتا تھا۔

اور چار بکروں کو اکیلے چٹ کر جاتا تھا۔ ۱۲

لیکن ارا کینِ دربار کو، راجہ کے اس بے محل سترحمانہ برتاؤ سے براہِ حسد کمال رنج گزرا۔

اتفاق یہ کہ چند روز کے بعد ہی ایک سخت دشمن نے چتوڑ پر چڑھائی کی اور بڑی نبرد آزمائی کا وقت آیا۔ راجہ نے سب سرداروں کو اپنی اپنی ماتحت فوجیں لیکر مقابلے کے لئے طلب کیا۔ سبھوں نے بالاتفاق، حاضری سے انکار کر دیا۔ اور صاف صاف کہلا بھیجا کہ اُسی سے مدد مانگو، جسکو سر چڑھایا ہے۔

نازک مزاج باپا کو اس طعن و تشنیع کی تاب کہاں؟ وہ فوراً، موجودہ شاہی لشکر کو ہمراہ لیکر، دلیرانہ و بیباکانہ اُس ہیبت ناک دشمن سے جا متقابل ہوا۔ اور نہایت پامردی سے لڑکر، اُسپر فتح نمایاں حاصل کی۔

یہ سخت دشمن کون تھا؟ یہ محمدؐ بن قاسم، افواج اسلام کا بہادر سپہ سالار تھا۔ جو خلیفۂ ولید اموی کی طرف سے ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عربوں کا ایک تجارتی جہاز بندرگاہ دیول میں ہندوؤں کیطرف سے گرفتار کر لیا گیا۔ مسلمانوں نے اسکا تاوان اور معاوضہ وہاں کے حاکم، راجہ داہر سے طلب کیا۔ اُسنے صاف انکار کیا۔

اسی پر دمشق کے خلیفۂ ولید نے محمدؐ بن قاسم کو چھ ہزار (۶۰۰۰) سپاہیوں کی جمعیت کیساتھ روانہ کیا۔ یہ واقعہ ۷۱۱ء کا ہے۔ اسی زمانے میں مسلمانوں نے، جبرالٹر، واقع شمالی افریقہ پر بھی حملہ کیا تھا۔ اور سلطنتِ اُندلس (اسپین) کا بُنیادی پتھر، گویا اُسی وقت رکھا گیا تھا۔

الغرض! محمدؐ بن قاسم بڑی کامیابی سے، دیول، حیدرآباد، سندھ اور سیہوان کو مطیع کرتا ہوا، نہایت تیزی کے ساتھ الورا تک گھس آیا۔ جو سندھ کا دار الحکومتہ تھا۔

وہاں ایک گھمسان لڑائی واقع ہوئی جسمیں ہندوؤں کو شکستِ فاش ہوئی - اور بہادر داہر، بڑی پامردی اور مردانگی سے لڑکر مارا گیا -

داہر کے مارے جانے کے بعد اُس کی بیوہ بڑی دلیری اور استقلال کے ساتھ شہر کی حفاظت کرتی رہی، لیکن رسد اور سامانِ جنگ ختم ہو جانے کے سبب سے آخر ش پسپا ہوئی -

رانی خود تو گرفتار ہو گئی، مگر اور راجپوتنوں نے جوہر کیا، اور دہکتے دہکتے آگ کے شعلوں میں جل مریں -

اُدھر، بیرونِ شہر سے عام باشندے تلواریں میان سے گھسیٹ کر لشکرِ اسلام پر ٹوٹ پڑے، لیکن آخر کار شجاعانِ عرب کے نیزوں کی تاب نہ لا سکے اور پوری ہزیمت اُٹھائی -

بعد ازیں ملتان فتح کیا گیا - اور داہر کی ساری سلطنت مسلمانوں کے قبضے میں آگئی - اسلامی سپہ سالار، قنوج کا ارادہ رکھتا تھا - لیکن ایک ناگہانی آفت کے سبب سے یہ کام رُک گیا -

الغرض محمد بن قاسم، سندھ اور گجرات وغیرہ فتح کرتا ہوا، طوفان کیطرح چتوڑ پر آگرا - اگرچہ سندھ اور گجرات کی فتوحات سے اُس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے - لیکن بہادر باپا نے اُسے شکستِ فاش دی - اور تعاقب کرتا ہوا اُسکو کمبے تک بھگا لے گیا - جو غالباً، بلبھی پور کے متصل تھا -

کمبے، باپا کے آبا و اجداد کا ملجاؤ ماویٰ تھا - محمد بن قاسم نے اُسپر قبضہ کر کے، اپنی طرف سے وہاں ایک حاکم مقرر کر دیا تھا - جسکا نام سلیم تھا -

سلیم نے مصلحتاً اپنی لڑکی کی شادی کر کے باپا سے صلح کر لی - باپا کمبے سے واپس آکر شاہی خاندان کے دستور سے (جو پہلے اُسکے برخلاف تھے)

پہلے راجہ، یعنی اپنے محسن کو تخت سے اُتار کر، خود راج گدّی پر جلوہ افروز ہوگیا۔
اور جب ملک کا سارا انتظام حسب دلخواہ کرلیا، تو اپنے ملک و مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہوگیا اور اپنی مسلمان بی بی کے ساتھ (جو سلیم کی بیٹی تھی) خُراسان کو چلا گیا اور وہاں بہت سی اولاد چھوڑ کر مرگیا
یہ طویل روایت، رشتین صاحب کی ہے، جسکی صداقت کا اُن کو دعوے ہے۔ لیکن پنڈت رنچھور بھٹ مصنف تاریخ راج پرستی اور مُلّا ابوالفضل، مصنف آئینِ اکبری، دونوں باپا کی اقبالمندی، عروج اور سخنوری کو ہاریت رشی اور برنج نالی، رکھیشر کی بشارت اور دعاؤں کے نتیجے قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ انھیں بزرگوں نے خوش ہو کر اُسکے اچل راج یعنی سلطنتِ لازوال کی نسبت پیشین گوئیاں کی تھیں۔
چنانچہ وہ بشارتیں پوری ہوئیں، اور باپا نے چتوڑ پر بہادرانہ حملہ کر کے، سنّوراج موری کو شکستِ فاش دی اور اُس مضبوط قلعے کو اُس سے چھین لیا۔ اور خود راجہ ہو کر راول کا لقب اختیار کیا۔ اُسکے بعد اُس کی نسل کے اور اور راجے بھی اسی لقب سے ملقّب ہوئے۔
سنّوراج کے نام کے ساتھ (جو موری کا لفظ لگا ہوا ہے)
اِس سے پایا جاتا ہے کہ وہ مُوریہ خاندان سے تھا، جس کا مورثِ اعلیٰ مگدھ دیش کا طاقتور راجہ چندر گپت تھا۔
چندر گُپت کا زمانہ سنہ عیسوی سے تین سَو برس قبل اور باپا کا کچھ زیادہ سات سَو برس بعد ہوا۔ اِس حساب سے دونوں کا درمیانی زمانہ ہزار برس قرار پاتا ہے۔
اِس عرصۂ دراز میں تختِ مذکور پر کتنے نئے نئے خاندان قائم ہو ہو کر،

نیست و نابود ہو گئے ہونگے، بلکہ خود مگدھ راج کی راجدھانی، پاٹلی پتر (پٹنہ) ویران ہو گئی تھی۔

دیکھو! چین کے دو سیاح ہستیان، فاہیان[1] اور ہاو ابن تسانک[2] کے سفر نامے۔ پہلا سنہ ۴۰۱ء میں یہاں تیرتھ کو آیا تھا۔ اور دوسرے نے سنہ ۶۳۱ء میں، اس ملک کے اکثر حصوں کی سیر کی تھی، پاٹلی پتر کی نسبت، اول الذکر، حیرت و حسرت کے ساتھ لکھتا ہے کہ اس کے حصار کی دیواریں گر پڑی ہیں، اسکے عالیشان پھاٹک اور مضبوط کھڑکیاں بوسیدہ ہو کر زمین بوس ہو گئی ہیں۔ سنگتراشی اور بت تراشی کی لاجواب صنعتیں (جو آدمی کے کام نہیں معلوم ہوتیں) اب خاک میں ملگئی ہیں۔ آخر الذکر کے وقت میں تو وہ عظیم الشان شہر بالکل ویران ہو گیا تھا۔

پس باپا کا سنوراج موری کو شکست دینا، نہایت ہی قابل لحاظ اور غور طلب بات ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

خیر! کچھ ہو، باپا راول کے بعد، اس کی نسل کے پچیس[25] راجے، چتوڑ کے تخت پر یکے بعد دیگرے جلوہ افروز ہوتے گئے۔

لیکن اسکے عہد سے کچھ مدت بعد تک، مسلمانوں نے کوئی اور حملہ ہندوستان پر نہ کیا۔ اور اس راجہ کے بیٹے اور پوتے کی سلطنت میں کوئی واردات یاد رکھنے کے قابل واقع نہیں ہوئی، مگر اسکے پرپوتے کھمن راول کو (جو بڑا بہادر تھا) تخت پر بیٹھتے ہی مسلمانوں سے زور آزمائیاں کرنی پڑیں۔ جس نے آٹھ سو بارہ[812] عیسوی سے آٹھ سو چھتیس[836] تک، چوبیس[24] برس تک حکمرانی کی۔

اس مدت فرمانروائی میں، اسے خراسان کے دو، دو حاکم، محمود اور ماموں الرشید سے بڑے بڑے مقابلے کرنے پڑے۔ لیکن وہ بہادر تقریباً سب میں کامیاب ہوا۔ ماموں، ایک بڑی فوج لیکر، چتوڑ پر چڑھ آیا۔ لیکن ہند کی سب

طاقتیں، جوشِ ہمدردی* دُور بینی، اور مآل اندیشی میں اگر طاقتِ چتوڑ کی شریک ہوگئیں، اور بہادر اور اُلوالعزم عربوں کو شکستِ فاش دی۔

اِن فتوحات سے دوست و دشمن کے دلوں میں کھمین راول کی شجاعت و ہیبت کے سکّے بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ وقت پیکار ہندو سپاہیوں کے دلوں میں اُس کے نام سے تہوّر اور دلاوری پیدا ہو جاتی تھی۔

راول لقب، یعنی باپا کی نسل کا آخری راجہ، کرن سنگھ راول ہوا اور اُس کے باپ کا نام سمر سنگھ راول تھا۔ اسی سمر سنگھ کو پرتھی راج کی بہن، پرتھا نامی بیاہی تھی۔ اور اسی قرابت کی وجہ سے سمر سنگھ موصوف، بارہ ہزار چیدہ جوانوں کو ہمراہ لیکر، اپنے سالے، پرتھی راج کی مدد کو اُس لڑائی میں شریک ہوا تھا۔ جو اُس سے اور شہاب الدین غوری سے ہوئی تھی۔ اور جس لڑائی نے آریوں کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

تواریخی مواد کی کمی ہندوستان میں یہی دو شاہی خاندان قدیم سے صاحبِ حکومت چلے آئے ہیں۔ سورج بنسی اور چندر بنسی، اور انھیں دونوں سے اِس وسیع اور زرخیز جزیرہ نما میں وقتاً فوقتاً، چھوٹی بڑی سلطنتیں اس قدر قائم ہوکر برباد ہوتی گئیں، کہ اُن کی ایک مکمّل اور قابلِ اعتبار فہرست بھی تیار ہونی سخت دشوار ہے، اور ہر ایک کے تواریخی واقعات کو اوّل سے آخر تک، تفصیلوا قلمبند کرنا اور اُن واقعات سے قرینِ قیاس نتیجے پیدا کرنا اور ایک واقعہ سے دوسرے کا تعلق بتلانا تو سراسر محال اور غیر ممکن ہے۔

اسکی وجہ یہ خیال میں آتی ہے کہ ہندوستان میں تاریخ کو ایک مہتم بالشان

* لکھا ہے کہ اِن لڑائیوں کے وقت ملک کے ہر حصّے سے راول کو کافی مدد پہنچیں، حتّٰی کہ عورتوں نے گہنے اُتار کر اور سُوت کات کر مدد بھیجی تھی۔ ۱۲

علم سمجھ کر، اُسکی تدوین و ترتیب کے لئے کبھی قوتِ متفقہ اور کوشش مشترکہ سے کام نہ لیا گیا بلکہ بے پروائی سے یہ کارِ عظیم، پایہ تخت کے ایک ادنے رُکن، یعنی کبیشوروں اور بھاٹوں کے سپرد کر دیا گیا، اور کبھی اُسکی تصحیح و تصدیق نہیں کیگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ علم تاریخ کا، اہمیت کے لحاظ سے اُس زمانے میں وہ پایہ نہ تھا، جو فی زماننا اُسکو حاصل ہے۔ اور اِس بارے میں ہندوستان ہی کی تخصیص نہیں، بلکہ تقریبًا پردۂ زمین کی سب مہذب قومیں اِس غفلت اور بے پرواہی میں شریک ہیں سب سے بڑی دِقت اِس ملک کی تواریخ نویسی میں یہ آن پڑی ہے کہ اگر بودھوں کے سنوں کو (جنکا حساب، شاکیہ منی گوتم بدھ سے کیا جاتا ہے) چھوڑ دیں تو تنقید واقعات کے لئے، راجہ بکرم سے پہلے کوئی سن و سمت یہاں نہیں ملتا۔ مہاراجہ رام چندر اور مہاراجہ جدھشٹر دونوں کو ہندوؤں کی مذہبی انجمن میں، صدر نشینی کے درجے حاصل ہیں، لیکن تواریخی حیثیت سے، اُن مقدس بزرگوں کے کارناموں کے سنہ و سمت کا بھی پتہ ٹھکانا نہیں لگتا، تابہ دیگراں چہ رسد۔

بااین ہمہ، اگر کوئی بے تعصب دل اور صلح کل دماغ، انگریزوں کی سی قوائے متجسسہ و ممیزہ، اہل عرب کی سی سرگرمی اور عزم و ہمت، جرمن کی سی علم دوستی، اور ہندوستانیوں کا سا تحمل اور ٹھنڈا مزاج اور ساتھ ان نعمتوں کے فرصت کافی اور اطمینان کامل رکھتا ہو۔ تو اُسکے لئے اب بھی علم ادب، علمی اصطلاحات، مقامات اور اشخاص کے نام، ناٹک، ناول، مذہبی روایتیں، مقامی قصے، عام کہانیاں، کہاوتیں، کبتائیں، (ہر قسم کی) قصہ طلب سگلے، حوالہ طلب فقرے گیت، راگ، گنوار و نظمیں، پُرانے سکّے، جیستمبہ (ستونِ فتوحات)۔ کیر تستمبہ (ستونِ نیکنامی)، دھرمستمبہ (ستونِ مذہبی) عمارتوں کے کتابے صورتیں ـــ

الغرض اس قسم کے بہت کچھ سواد جمع ہیں، جن کی مدد سے وہ فی الجملہ ایک با اصول و باقاعدہ تاریخ ہند مرتّب کر سکتا ہے۔ وہ اِن ہی بوسیدہ، از کار رفتہ، اور منتشر و پریشان مصالحوں سے تواریخ ہند کا ایک ایسا عالیشان محل اُٹھا سکتا ہے جس کا نظارہ ناظرین کے لئے باعث مسرت و شادمانی نہیں تو موجب عبرت و حیرانی ضرور ہو سکتا ہے۔

تاریخی زمانوں کی تقسیم۔ تسہیل بیان کے لئے مؤرّخوں نے ہند کے کُل تاریخی واقعات کو پانچ زمانوں پر تقسیم کیا ہے۔

(۱) وَیدِک ایج، یعنی زمانۂ بید۔ (۲) ایپک ایج، یعنی رزمیہ شاعری کا زمانہ۔
(۳) رَیشنلِسٹک ایج، یعنی زمانۂ عقل و حکمت۔ (۴) محمڈن پیریڈ۔ یعنی زمانۂ اہلِ اسلام
(۵) انگلش پیریڈ، یعنی سلطنت انگریزی کا زمانہ۔

اوّل تین زمانے اِس ملک کی نہایت ہی قدیم تاریخ اور خاص آریہ قوموں سے متعلق ہیں اور ہمارے مضمون کو بھی اِن ہی زمانوں سے تعلق ہے۔

باقی اخیر کے دو زمانے، اِس ملک کی تواریخِ حال اور غیر ملکی فاتحین سے علاقہ رکھتے ہیں، اور ہمارے مضمون کو، اُن سے کچھ تعلق نہیں۔

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ وَیدِک زمانہ میں، ایرانی آریوں نے ستلج اور سرسوتی کے ساحلی ملکوں، بلکہ تمامی پنجاب کو دخل کر لیا تھا۔ اور مدتوں وہیں بسر اوقات کرتے رہے۔

ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ ایپک ایج میں، اُن لوگوں نے پورب کی طرف پیش قدمی کی اور گنگا اور ہمالیہ کی درمیانی سرزمینوں اور وادیوں میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں مثلاً:۔

کوشل راج، بدیہہ راج اور کاشی راج۔ وغیرہ

ہم یہ بھی لکھ آئے ہیں کہ اِسی ایپک زمانے میں ترکستانی آریوں نے

گنگا اور جمنا کے دو آبے میں پریاگ راج قائم کیا - اور ایک مدت کے بعد اسی ایک سلطنت سے دو اور زبردست سلطنتیں قائم ہوگئیں - یعنی گرو راج، اور پنچال راج

اب ہم کو یہ بیان کرنا ہے کہ رشتیلیسٹک ایج، یعنی زمانۂ علم و حکمت میں ان لوگوں نے اپنے کو تمامی ہند میں پھیلا دیا -

اس وقت یہ لوگ خلیج بنگالہ سے لیکر بحیرۂ عرب تک اور بندھیاچل سے لیکر راس کماری تک چھا گئے تھے، بلکہ راس کماری سے بھی آگے جزیرۂ سراندیپ تک بڑھ گئے -

اور ان ملکوں میں صرف اپنی نوآبادیاں ہی قائم نہ کیں بلکہ وہاں انکی بڑی بڑی زبردست شاہنشاہیاں قائم ہوگئیں، جنکا ایک مختصر سا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے :-

مگدھ دیش مگدھ دیش یا جنوبی بہار، ایپک ایج میں، مہابھارت کے پہلے ہندو تہذیب کے اندر پورے طور پر شمار ہونے کے قابل نہ تھا - لیکن رشتیلیسٹک ایج کے ابتدا ہی میں یہ ملک ہندو نوآبادیوں سے بھر گیا اور دیکھتے دیکھتے یہاں ایک ایسی زبردست پادشاہت قائم ہوگئی، جو کسی زمانے میں ہندوستان کی کل سلطنتوں سے فوجی قوت اور ملکی انتظام میں فرد گنی جاتی تھی - اور ایک وقت میں ہند کی بڑی بڑی طاقتیں اس کی سطیع اور فرماں بردار تھیں -

بنگال اور اڑیسہ انھیں زمانوں میں ہندو آریوں نے پورب کی جانب قدم بڑھا اور بنگال و اڑیسہ کو فتح کرکے وہاں اپنی نوآبادیاں قائم کیں -

گجرات معلوم ہوتا ہے کہ گجرات میں بھی بہت پیشتر ہندو نوآبادیاں قائم ہو چکی تھیں، کیونکہ سری کرشن (جو ایپک ایج کے نامی بہادروں اور مہابھارت کی خونریز لڑائی میں شریک تھے) انھوں نے کسی مصلحت سے جب اپنی پرانی

راجدھانی متھرا کو چھوڑ کر گجرات میں سمندر کے کنارے دوارکا بڑی بسائی تو اُس ملک کو ہندوؤں سے آباد پایا۔ کسی زمانے میں گجرات کی شاد ستر قوم ایک طاقتور ہندو قوم تھی۔

مالوہ۔ مالوہ بھی، ہندوؤں سے پہلے ہی آباد ہو گیا تھا۔ اور بودھوں کی مذہبی یادداشتوں سے ایسا دریافت ہوتا ہے کہ اُجین کے راجے رشتیلیشک ایج کے پہلے ہی سے ہندو تہذیب میں اعلےٰ درجے کے ترقی یافتہ شمار کئے جاتے تھے۔

اندھراراج۔ ہندو نوآبادیوں اور فتوحات کی موجیں لہراتی ہوئی بہت ہی جلد، بندھیاچل کو ٹپ گئیں۔ اور نربدا اور کرشنا ندیوں کے درمیانی ملکوں میں اُن کی ایک نہایت ہی زبردست اور بہت ہی بڑی سلطنت قائم ہو گئی، جس کا نام اندھرا تھا۔

اِس جنوبی شاہنشاہی کا دارالحکومت موجودہ اُمراوتی کے متصل تھا۔

چند ہی صدی کے درمیان، قوم اندھرا، ہندوستان کی زبردست قوموں میں سے ہو گئی۔ اور تمامی سلطنت میں جگہ جگہ پر نیاسے شاستر یعنی علم قوانین کے مدارس قائم ہو گئے، جہاں اس علم کی بخوبی تعلیم ہوتی تھی۔ یہ سلطنت، تخمیناً چار سو چھتیس علیسوی میں مٹ گئی۔

کرشنا کے آگے کی سلطنتیں۔ ہندو فتوحات کی موجیں لہراتی ہوئی آگے کو برابر بڑھتی گئیں۔ اور آناً فاناً کرشنا ندی کے آگے کی زمینیں اُن کی برکت سے سرسبز و شاداب ہو گئیں، اور اُس صوبہ کی ابتدائی دراویڈین قوموں نے ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کو خود بہ خود بہ خوشی قبول کر لیا۔

اور کچھ زمانے کے بعد اِنھیں مفتوحہ زمینوں میں، (جو کرشنا سے

راس کماری تک پھیلی ہوئی تھیں) ہندوؤں کی تین پُر زور سلطنتیں قائم ہوگئیں جن کے نام یہ ہیں :-

(۱) چول - (۲) چیرا - اور (۳) پنڈیا -

جزیرۂ سراندیپ یا لنکا جزیرۂ سراندیپ بھی، ابتداہی میں ہند وسوداگروں کا گذرگاہ ہوگیا تھا - وہاں کی بیش قیمت پیداوار کی طمع اُنھیں وہاں کھینچ لے گئی - اور پھر عام لوگ بھی بتدریج اِس ٹاپو سے واقف ہوتے اور وہاں جاکر آباد ہوتے گئے

بنائے سلطنت کی نسبت یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ تقریباً سنہ ۵۰۰ سے پانچسو برس پیشتر مگدھ دیش کے راجہ سنگھ باہو کا بیٹا (جسکا نام بجے تھا) کسی بے اعتدالی اور بے عنوانی کے سبب سے باپ کے حضور سے نکال دیا گیا تھا - وہ سمندر کی راہ سے جزیرۂ مذکور میں آیا - اور اُسکو فتح کرکے ایک شاہی خاندان کی بنا ڈالی

الغرض، سنہ عیسوی سے پانچسو برس پیشتر ہی تک سارا ہندوستان (جنگل اور پہاڑ چھوڑکر) پورے طور پر ہندوؤں سے آباد ہوگیا - اور صرف آبادہی نہیں ہوا، بلکہ اُن آباد قطعات میں، اُن کی بڑی بڑی اور قوی قوی سلطنتیں قائم ہوگئیں -

مگدھ دیش کے مزید حالات ان سلطنتوں میں مگدھ دیش کی سلطنت طاقت وشہرت کے اعتبار سے، سب سے زیادہ ممیز و ممتاز تھی -

یہاں کے راجے اکثر اوقات ہند کے بڑے بڑے زرخیز خطّوں کے مالک رہے ہیں

یہاں کے حکمراں، ہندوستان کے اور اَور فرمانرواؤں کی بہ نسبت زیادہ تر آزاد خیال، وسیع الاخلاق، روشنضمیر، انسان دوست، زمانہ شناس

مصلحت بین اور مآل اندیش ہوئے ہیں -
اُن کو مغرب کی بہتیری نامبرآوردہ سلطنتوں (مثلاً:- یونان اور بابل وغیرہ) کے ساتھ اکثر دوستانہ برتاؤ رہا ہے -
پایۂ تخت اس مملکت کا، ابتدائً راجگڑھ تھا - اور پھر پاٹلی پتر (پٹنہ) کو منتقل ہوگیا، جن کے مزید حالات آگے چلکر معلوم ہونگے -
ہم کو تاریخی حالات اِس سلطنت کے دوسری دوسری سلطنتوں کی نسبت کچھ زیادہ معلوم ہوئے ہیں جو ذیل میں لکھے جاتے ہیں -

(باقی آیندہ)

سنڈا - پوسٹ آفس عطاسرائے پٹنہ
۳۱ - جون سنہ ۱۹۰۷ء -

خاکسار دیانت حسین عفی عنہ -
وظیفہ خوار دولت انگلشیہ

کالج کے متعلق خبریں

نواب سر محمد فیاض علی خاں صاحب کو - کے - سی - آئی - ای کا خطاب

ہمکو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے کالج کے معزز پریسیڈنٹ اور اس ضلع کے نامور رئیس نواب سر محمد فیاض علی خاں صاحب سی - ایس - آئی رئیس پہاسو کو پچھلی سالگرہ کے موقعہ پر - کے - سی - آئی - ای کا خطاب ملا نواب صاحب موصوف کا خاندانی اعزاز اُن کی ذاتی خوبیاں اور قومی کاموں میں دلچسپی اور فیاضی اسی کی مستحق تھی کہ گورنمنٹ کیطرف سے اس قسم کی عزت افزائی ہو - ہم نواب صاحب موصوف کو اُن کے جدید اعزاز پر مبارکباد دیتے ہیں -

حاجی عبدالشکور خاں صاحب کا انتقال پُر ملال -

ہم نے نہایت افسوس کے ساتھ سُنا کہ کالج کے پُرانے ٹرسٹی اور اس ضلع کے معزز رئیس حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب رئیس بھیکم پور نے ۲۰ - جولائی سنہ ۱۹۰۷ء کو حج سے مُراجعت کرتے ہوئے بمقام جدہ

انتقال کیا۔ مرحوم ایک باعلم، باوضع پرانے رئیس تھے۔ حکام اور اہل ضلع سب انکا احترام کرتے تھے۔ سید مرحوم اس ضلع کے رؤسا میں نواب سر فیض علی خاں مرحوم کے بعد اُن کی سب سے زیادہ عزت کرتے تھے، ہر کار خیر کے لئے اُنکا دست کشادہ تھا۔ اور مدرسۃ العلوم کے ابتدائے زمانہ سے بڑے معاون تھے خدا اُن کو غریق رحمت کرے۔ اور پس ماندوں کو انکا عمدہ جانشین ہونے کی توفیق دے

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کا دورہ۔ تعطیل گرما میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب روہیلکنڈ و اودھ و بھوپال کا دورہ کرینگے اور کنڈر گارٹن سسٹم پر لکچر دینگے

گورنمنٹ کی امداد صیغۂ تعلیم نسوان کو۔ گورنمنٹ صوبہاے متحدہ آگرہ و اودھ نے زنانہ نارمل اسکول علیگڈھ کی تعمیر کے لئے مبلغ پندرہ ہزار روپیہ نقد صیغۂ تعلیم نسواں کو عطا فرمایا اور وعدہ کیا کہ اس سکول کا نصف خرچ مبلغ ما ۵ روپیہ ماہوار تک ادا کریگی

حضور بیگم صاحبہ بھوپال کی فیاضی بیگم صاحبہ بھوپال نے مبلغ پانچہزار روپیہ نقد صیغۂ تعلیم نسواں کو اس غرض سے عطا فرمایا ہے کہ تعلیم نسواں کے لئے سلسلہ وار کورس کی کتابیں تالیف کی جائیں۔ بیگم صاحبہ موصوفہ جو نہایت علم دوست و روشن خیال فرمانروا ہیں اور اس صیغہ کو مبلغ سو روپیہ ماہوار کی امداد پیشتر سے دیتی ہیں، ہر طرح پر شکریہ کی مستحق ہیں۔

گرمی کی بڑی تعطیل۔ یکم اگست سنہ ۱۹۰۶ء سے کالج واسطے تعطیل موسم گرما بند ہوگا اور ۱۱ نومبر سنہ ۱۹۰۶ء کو کھلیگا۔ مسٹر آرچبولڈ پرنسپل اور مسٹر ریس ہیڈ ماسٹر ولایت تشریف لیجائینگے اور باقی یورپین پروفیسر بجز مسٹر ملر ریسن کے جو بیمار ہوکر منصوری چلے گئے ہیں، کشمیر جائینگے۔

ڈیوٹی ڈیپوٹیشن اس سال ڈیوٹی کیطرف سے ڈیپوٹیشن بزنگون۔ ممالک متوسط اور صوبہاے متحدہ آگرہ و اودھ میں دورہ کرینگے۔

(کتبہ احقر البرایا محمد یحییٰ) (ساکن علیگڈھ)
(مطبوعہ ریاض ہند پریس علیگڈھ)

very nice game this day too. They made several attempts and in everyone of them when they were nearly to shoot a goal they were sent back by the referee being off side. At last in the end after very many unfruitful attempts from our opponents we lost one goal in their favour. Here we finished our matches in Calcutta.

In conclusion I must say that there our defeats were wholly and solely due to our usual disadvantage in having to play on grass. I can remark with a safe conscience that our game was in every way superior except in dodging but we could not beat them simply because we could not keep ourselves steady on the lawn.

On behalf of my team and myself I beg to lay our most hearty thanks before Prince Gholam Mohammed and Mirza Shojaat Ali Beg Sahib. We spent an excellent morning with the Prince at a breakfast and received a handsome donation from Mirza Sahib. I have also to thank our friend Moin-ud-Din Mirza for his nice entertainment. I would like to advise my successor to take the team again to Calcutta next year because we cannot find a better game elsewhere. In the end I again thank our hosts for their kind entertainment.

TASADDUQ AHMAD.

Captain.

C. C. M. Press,—Cawnpore.

ed by the club and partly by the kindness and generous help of some donors whose names with thanks I shall publish later on. Unfortunately five of our very good players left the College last year and thus we could not muster a very good team and leaving Aligarh on the 25th of May last we reached Calcutta on the 27th and put up there in a very nice and comfortable house of our host Haji Ahmed Karim Arif. Our most sincere and hearty thanks are due to him and his brothers Messrs Solaiman Arif and Yakub Arif whose fatherly care and friendly intercourse we shall ever remember. We could not play any game for two days. On the 30th we played our first match *vs.* Zanorion Association. The ground was covered with thick grass. They kicked off and in five minutes our centre scored one goal. The half time was called without any score from either side. After a few minutes in the second half our own men shot two goals one after another for our opponents which totally depressed our team. Masud tried up to the last to equalize but in vain. In this match our centre half Noorulla got severly hurt in the second half of the game. The next day we played against Muslims. This game was rather interesting. Both the sides were struggling hard but could not score and till when there were only 3 minutes to time, the referee blew the whistle for foul against us. Their left in put the ball right into the goal, our goalkeeper got hold of it but was pushed with it into the goal ; thus we lost the match by 1 to nil. In this match Raza and Karim were severely injured. On the 31st of May and 2nd of June our fixture was with the Medical and Sibpur Colleges respectively, but they could not play—Medical on account of some unforeseen circumstances and Sibpur on account of evening storm. On the 3rd of June we played with a stronger team E. B. S. R. and Telegraph combined. Our members made a very good show specially Masud, Raza, Iqbal and Mushtaq who not only in this match but throughout played a very nice game. Iqbal the conspicuous figure in the defence received a severe knock and could not play in the next match. Masud had a clear run from the centre and shot a goal but soon after they equalized and half time was called without any further score from either side. After a few minutes in the second half, Raza, scored a goal by a very nice put from the corner but unfortunately we lost this game too owing to two consecutive penalties against us. On the 5th we played against the Nationals. This was the strongest of all the teams we encountered there and to our great disadvantage our right half Abdur Rahman was seriously hurt as soon as the match began and could not play for the rest of the time. Raza and Masud played a

VOLUNTEERS.

Brett, *b*. Salam	... .	0
Schaefer *b* Shafqat	... ...	4
Plomer *b* Shafqat	... ...	0
Capt. Barlow, *c*. Raza. *b*. Salam	... ...	8
F. Richardson, *c*. Taqi, *b*. Shafqat	. ...	6
Phipps, *b*. Salam	... ...	6
E. Blunt, *b*. Salam	.. ...	24
Weston, *b*. Shafqat	... ...	0
O'Brien, *b*. Shafqat	... ...	3
Sevenoakes *not out*	... ...	0
McGinn, *run out*	... ...	0
Extras	... ...	7
Total	...	58

BOWLING ANALYSES.

		O.	M.	W.	R.
E. Blunt	...	19	nil	3	75
Phipps	...	19	nil	5	53
McGinn	...	5	nil	nil	20
Weston	...	7	nil	nil	19

M. A. O. COLLEGE.

		O.	M.	W.	R.
Salam	...	8	1	4	22
Shafqat	...	7	nil	5	29

SALAM-UD-DIN,
C. Captain.

The Football Eleven in Calcutta.

Our victory in Southern India last year led us to make a tour to Calcutta where it is said Association Football is at its best. Owing to the shortness of funds this our earnest desire was delayed till last May when we started partly support-

Syed Hasan,	*Run out*	... 18	Did not bat.
Ahmad Ali,	*Run out*	... 34	
Rahatullah, *c.* Barlow, *b.* Stockwell		... 5	
A. Haleem, b. Walters		... 3	
A. M. Taqi, *l. b. w. b.* Walters		... 0	
Ishaque,	*Run out*	... 4	
Samad,	*Not out*	... 35	
Alay Hasan, *c.* and *b.* Walters		... 14	
Extras		... 13	
	Total ...	146	

BOWLING ANALYSIS.

NAINI TAL.

	1st Innings. O.	W.	R.	M.	2nd Innings. O.	W.	R.	M.
Walters ...	16	3	61	nil	1	1	6	nil
Shipley ...	7	1	25	nil	...	...	...	...
Stockwell ...	4	1	18	nil	...	...	...	..
Wilson ...	9	nil	29	1	1	nil	4	nil

M. A. O. COLLEGE.

	1st Innings. O.	W.	R.	M.	2nd Innings. O.	W.	R.	M.
Salam ...	14	5	15	3	14	2	22	4
Shafqat ...	15	5	34	2	19	4	34	4
Rahatullah ...	2	nil	2	1	4	1	9	1
Samad ...	1	nil	4	nil	8	2	26	nil

2ND MATCH.

M. A. O. COLLEGE.

Raza, *c.* and *b.* Phipps	...	... 4
Shafqat, *c.* and, *b.* Phipps	..	... 51
Salam-ud-Din, *c.* Weston, *b.* Phipps ...		... 6
Syed Hasan, *not out*	...	... 60
Ishaque, *c.* Weston, *b.* Blunt	...	... 14
Ahmad Ali, *l b. w. b.* Blunt	...	.. 18
Haleem, *b.* Phipps	.	... 2
Rahatullah, *Run out*	...	... 10
Samad, *b.* Phipps	...	... 2
Taqi	...	did not bat.
Alay Hasan	...	
Extras ...	...	... 18
Total	...	184

Our next fixture was a one day game with the Volunteers. This team was very weak. Only Mr. E. Blunt could make double figure getting 24 to his credit out of a total of 58 runs. Mr. Phipps bowled pretty well.

Of our players Syed and Shafqat played very well, scoring 51 and 60 not out. Our total was 184 for 8 wickets.

Before I conclude I think it my duty to thank most heartily Haji Ismail Khan Sahib Rais Datavli, for his very kindly arranging for our boarding and lodging. He did his best to make us comfortable. My specially thanks are due to Mrs. and Mr. Cairy who took special interest in us and very kindly entertained us to a tea party.

The following are the scores :

Naini Tal Gymkhana.

1st Innings.		2nd Innings.	
Capt. Strafford, *b.* Salam ...	0	*c.* Raza, *b.* Shafqat...	29
Capt. Wilson, *b.* Shafqat ...	10	*b.* Salam ...	0
Muttra Dutt *Not out* ...	18	*Run out* ...	27
Ram Lal, *b.* Salam ...	5	*c.* Taqi, *b.* Samad ...	4
Capt. Barlow, *c.* Samad, *b.* Salam ...	5	*b.* Samad ...	7
T. M. Holmes, *c.* Taqi, *b.* Salam	7	*b.* Rahatullah ...	3
Shipley, *c.* Taqi, *b.* Salam ...	0	*b.* Shafqat ..	6
R. F. Hibbert, *b.* Shafqat ...	0	*b.* Shafqat ...	0
P. Walters, *c.* Taqi, *b.* Shafqat	7	*Not out* ...	3
F. A. Walkins, *b.* Shafqat ...	0	*b.* Shafqat ...	4
L. C. Stockwell, Shafqat ...	0	Stumped (Syed) *b.* Salam	3
Extras ..	7	Extras ...	9
Total ...	60	Total ..	95

M. A. O. College.

1st. Innings.		2nd Innings.	
Raza, *Run out* ...	4	*Not out*	6
Shafqat, *c.* and *b.* Shipley ..	1	*b.* Walters	5
Salam, *c.* Muttra Dutt, *b.* Walters ...	15	*Not out*	

manner, and with little gathering, as people are quite tired and very little energy is left in them.

It is important to note here that only the lower classes and common people have belief in these ceremonies. The middle class who are educated and many of the higher classes hold Majlises to recite elegies as it is done in these provinces also. It seems that these silly beliefs had their origin during the time of the rulers of the Golcunda kingdom. Many of these festivities and ceremonies are of the Hindu origin. This is perhaps the reason why the Hindus take part in these things equally as the Mohammadans.

It is a matter of great satisfaction to see that India is not the same as it was two centuries ago. The Mohammadans are showing signs of regeneration as their co-religionists are doing in other parts of the globe. People are benefiting themselves from Western ideas and education. We have peace and prosperity in the land. It is therefore not idle to think that these superstitions and beliefs will die out with the disappearance of ignorance and false notions from the minds of the people, and the true religion will shine out as it did in the first seven centuries of Hegira.

SYED MOHI UDDIN,

M. A. O. COLLEGE,

13 June, 1907. *Aligarh.*

Naini Tal Tour.

We started on our hill tour on the 9th of June. Our first match was with the Naini Tal Gymkhana. Seeing the results of the Ranikhet week we expected a strong team to play us, but owing to press of business some of their best players could not turn up.

Our players who had been practising on such a fast wicket as that of Aligarh could not make a good show of their batting, especially in the first match on a loose wicket like that of Naini Tal. Muttra Dutt, Capt. Wilson and Capt. Strafford were the chief contributors to Naini Tal side. The first named played the ninteenth century cricket, securing only 18 runs in two hours. On our side all played tolerably well especially Ahmed Ali and A. Samad who got 34 and 35 not out respectively.

is worth mentioning. Their approach is known to the spectators some ten minutes before they come into sight, as they march singing an Arabic verse very loudly and beating a small drum which each of them carries in his hand. Their dress is not like that of the regular soldiers, they remain bare footed, and they have only an arquebus, a dagger and a sabre. They are not equipped with any new weapon.

Let us now return to some other peculiar features of the Moharram days in Hyderabad.

On the night of the 7th the *alams* of every Mohalla are carried on the roads in procession with a great many torches, while people play with their big sticks, while they go along now and then raising the cry of 'Ali' or 'Husain.' On the 8th usual festivities continue but nothing important takes place. The night of the 9th is full of ceremonies and is of great importance. In the early part of the night, the *alams* are carried in the same way as before, but with greater pomp. After 11 or 13 o'clock almost all the Taboots of the city are carried in a line one after the other through the main road of the city passing the Nizam's palace. They are then brought back to their respective Imam Baras in the morning. Of course no noise is made in this procession of the Taboots as it is accompained a part of the army and a large number of police constables who keep order with a stern hand. They are carried with great solemnity which is suited to such occasions The last ceremony of the night is most ridiculious. At 3 or 4 in the morning. "Nàl Saheb" as the public calls it, is carried in the same way as the alams, but with much greater pomp. It is surrounded with thousands of people, who generally belong to the low class. These men go all the way playing with their sticks in a very rude manner. The origin of Nàl Saheb is briefly this. This Nàl or horse shoe is believed to be one of the shoes of the horse which was with Imam Husain at Karbala. It is said, it was brought in Hyderabad, but when and how, is unknown. It is set up in a wooden frame with a long stick holding that frame, which is decorated with rich ornaments. Common people generally have many strange beliefs in it and call it 'Nàl Saheb' out of their feelings of reverence that they have for it. This finishes the ceremonies of the night. The 10th is not so important. All the *alams* and Taboots are carried from 2 o'clock in the afternoon to the river side, and there they are stripped of their valuables and simply frames of wood are left; while some of them are even totally destroyed. They are carried in less zealous

On the 5th there is a procession of all the Nizam's forces, called the Lungar Procession, which adds much to the enjoyment of the people, though it has no connection with Moharram ceremonies. As to the origin of this procession the story runs thus. Sikandar Jah, the great grandfather of the present Nizam, when he was a child, was once going to his palace on an elephant. The elephant went mad in the way. The driver and his attendants tried much to pacify the animal, but all was futile. He, carrying the child, fled from the city towards a forest, while the driver and his attendants either fell from him or jumped away to save their lives. Other elephants who were in attendance pursued him, but failed to catch hold of him. Great search was made in the neighbouring forests but no trace was found either of the child or of the elephant The people became hopeless of the life of the prince. After two days, the elephant himself returned to the city with the child on his back. The child was alive. The Begum the Prince's mother, ordered that the elephant should have a golden 'Lungar' or chain on one of his feet and a procession of all the troops should be made in honour of this event the next day, the 5th of Moharram. This Lungar Procession exists even to this day. On this day all the troops march past in front of H. H, the Nizam's palaces. They start at the southern end of the Chowmahlla palace, and passing through the balcony where H. H. the Nizam sits receiving greetings of the troops, march to the prime minister's palace, come to 'Char Minar,' a building in the centre of the city, where they disperse. As the Moharram is the first month of the Mohammadan era, the soldiers get their new uniforms in which they look very majestic when they pass in a line. The procession begins at 9 or 10 in morning with salvoes of artillery and comes to an end at 4 in the afternoon. First of all the city police Kotwal on a huge elephant comes with the mounted and ordinary police. Then Colonel Afsarul Mulk Bahadur C. I. E. the Commander-in-Chief of H. H. the Nizam's forces comes in sight on an Arab charger leading the cavalry, and other regular troops. Of the cavalry, the African, which is called, "Shiddi ka Risala," with their jet black colour and woolly hair, wearing the long Turkish caps and their swords drawn which shine brightly in the sun, are worth having a look at.. Of the infantry the 'Maisram' or the Arab regulars march singing some Arabic song with their bagpipes which seem very pleasant to the ear. Following these regulars come in sight the artillery drawn by big stallions from Australia. After this the irregular cavalry and infantry, poorly dressed, come under the leadership of their respective Jagirdars, who hold land for keeping an army to help the state in time of need. Of these the Arab infantry

Let us now turn to explain how the Moharram ceremony has sprung up in the Mohammadan religion. Moharram is the first of the Arabic Lunar months. On the 10th of this month in 61 A. H. Husain the younger grandson of the Prophet with his handful of followers, was massacred ruthlessly by *Yazeed* at Karbala on banks of the river Euphrates. They are called "Martyrs of Karbala." Thenceforth the first ten days of the month have been observed with great solemnity in all the Moslem world. The poets wrote elegies and poems sorrowing for the martyrs and describing in detail what had happened in the battle. No doubt, some of them to make their poems pathetic and touching employed exaggeration and made use of their own inventions which are the chief trait of their class. In some countries banners are put up in these days in remembrance of the banner which was with the martyrs in the battle. These are called "Alams."

In India also Moharram is changed. Taboots or Tazias are made in remembrance of the funeral of the great martyr Imam and many other ceremonies are observed which are not performed in any other Islamic countries. However, in spite of these, the people of Upper India solemnize the sad event with mourning, In Hyderabad Moharram took quite a different shape. The people instead of showing signs of mourning by their conduct in this month, indulge in all kinds of enjoyments and merry makings.

When the first moon appears on the night before the first of this month, the people make merry noises which show their feelings of joy. On the 18th the Alams are set up in every Imam Bara which is built in every Mohalla of the city for this purpose. These Alams are decorated with beautiful cloth and ornaments. The wrestlers have their matches in front of these buildings, and people see them with great eagerness. From the 3rd or 4th you will see different batches of persons with drums and big long bugles together with three or four persons painted from head to foot like lions. They go from one part of the City to another and roar and perform tricks and in the end ask money from the people. Some paint themselves like monkeys and others put up the appearance of bears and go abegging in same way. Another batch would contain persons who wear masks, play various tricks and cut jokes Small theatricals are also set up, and there old plays, such as *Gul-i-Bakaoli* and *Harishchandra* are performed, very badly though. All these festivities are performed by the common people, but some uneducated nobles also patronize them by visiting them and giving them pecuniary help.

Papers of the Historical Society.

MOHARRAM IN HYDERABAD.

If we look back at the histories of the nations before the birth of Jesus Christ, we find, that people all over the world had wonderful superstitions and strange beliefs. The Romans who were the only civilized nation after the decay of the Hellenic Empire and civilization, believed in numerous superstitions and observed in the guise of their religion such horrible festivals and ceremonies that we shudder to think of them at the present time. The fights of the gladiators with the lions in the arena, the Bacchanalian orgies, the saturnalian festivities are but a few among many instances of this kind. It was no fault of their religion however. Every religion teaches people to be of good morals and manners, and restrains them from evil deeds, giving them a code that they must abide by. In the beginning the principles are properly observed, but as the time goes on, people leave them: the religion remains only in form and new beliefs and ceremonies take their place. This happens either because of their remoteness from religious circles and religious influences or as is sometimes the case, because of their contact with people of different religions and facts. Such was the cause with the Romans. In the beginning all these festivals, mentioned above, were meant for the good of the people. But when they came into contact with other barbarous nations, all of them lost their true meaning and became quite changed.

Up to the reign of Humayun the Mohammadans were of pure habits, unalloyed with any beliefs or superstitions of Hinduism. When Akbar took the reins of the empire in his hands, he tried to consolidate the empire which was in a state of anarchy then. The Rajputs were independent. The Pathans of the family of Sher Shah and big Zemindars were giving him trouble in Bengal and Behar. Akbar endeavoured to build his kingdom into one strong united empire by introducing intermarriages with the Rajput families, which were the most powerful and consequently a source of danger to him. He himself married with some Rajput princesses and had his sons married in the same way. This, no doubt, was the most statesman-like policy from one aspect, but harmful from another. He did not foresee that the religion and morals of the people were going to be influenced by the close social intercourse with the Hindus. The marriage ceremonies, the funeral obsequies, the birth rites, were all Hinduised.

hockey *team* were the better balanced lot, and therefore deserved to win the league championship, though if the competition had been on the 'Knock-out' system, it is not at all improbable that the match fighting qualities of the other team and the wonderful vigour of their best player--Masud-ul-Hasan—would have carried them to the top.

The only match of the series which requires any special comment was the one referred to above; it was a hard, close game all through, and the close watch kept by Noor-ud-din and Masud-ul-Hasan on their opponent's most dangerous forward—Moinuddin Mirza—was a quite exemplary demonstration of defensive play. With regard to the other teams, the 3rd and 4th Years (combined) suffered from an insufficiency of habitual hockey players, a remark which also applies to the 9th class. The Entrance class and the 8th and Lower had both to play without one of their best players, Ahmad Mirza in the one case and Hafiz-ud-din in the other, this being one of the misfortunes of the competition having to be held so late in the year. The Entrance had a useful attack but were unsound in defence : with a little more strength in the latter department they would have gone very near winning. The last match in the competition was a walk over, the Eighth and Lower classes giving way to the First Year in view of an important football engagement of the latter the next day. In conclusion, one of the most noticeable feature of the competition this year was the lack of combination exhibited by the various teams. Might it not be possible to arrange another year a few practice games in order to get such heterogeneous collections as class teams must inevitably be a little more together beforehand ? The competition as a whole would benefit greatly thereby. The names of the winning team and a table of results is given below.

First Year Team.

S. Moinuddin Mirza (Captain)
Mohd. Nurullah
S. Ali Raza Bilgrami
Syed Husain Rizvi
Islam Nabi
Mohd. Husain
Naimullah Khan
Ehsanul Haq
Meer Ali Raza
Nazir Hasan Ansari,

Final positions.

2nd Year ...	9	points.
3rd & 4th Years	4	„
1st Year ...	8	„
Entrance Class		
9th Class ...	3	„
8th and Lower ...	2	,

essed the faculty of concentration to a greater degree than his contemporaries. We however know better. We know that Sir Isaac was mad. Would we could go mad like that ! So by the way, was Shakespeare mad. He was mad when he made his will, as any sane person can see if they go to look at that document.

Napoleon was mad—after 1800—Lord Rosebery says so. He had ploughed so long the lonely furrow of supreme power, that his star of Destiny became a genuine hallucination, and not a mere catch phrase to gull an enthusiastic and emotional populace.

Bach—above all Bach was mad. And so was Beethoven. And not only were all these great men's minds unhinged and ill balanced, but in their bodies they one and all carried the seeds of disease which in more than one of the instances quoted brought them prematurely to the grave.

This hypothesis that the manifestations of genius are those of a pathological condition, arising from a variety of causes, and resulting in abnormal intellectual activity, is clearly the only really convincing description of genius which has ever been put forward.

We commend it to all those readers of the Aligarh Monthly who may feel that their minds are tottering after reading this article.

Hockey League Competition.

The above competition, which was held during the months of April and May, ended in a victory for the Second year. They secured 9 points out of a possible 10, playing a pointless draw with the First Year and winning all their other matches. They were on the whole the best side in the competition, but they had a very tight match with the First Year, and if the latter had previously succeeded in beating instead of drawing with the Entrance Class, we might have had a struggle for first place as long drawn out and as full of chance with regard to result as that which was witnessed between the same two teams in the Football League. 'Honours Easy' however was perhaps the most fitting result, and in addition to this, the Second Year as a

as there will be an opportunity later, to use him in support of the opposition theory. Bach arises from a long line of musicians many of them eminent, nearly all of them talented, and with an atmosphere of music pervading the whole house for generations preceding the birth of the genius himself. Here, say the Galtonians, is indeed a convincing argument for our view and so they would say indefinitely but space forbids. There have been numberless modifications of the hereditary theory. Probably everyone who entered into a controversy on this fascinating topic could by suitable and prolonged argument be reduced to view the matter in any light whatever.

We propose therefore merely to mention in passing, two offshoots from the theory which by reason of their authors distinction stand out prominently from the others.

The first is due to Karl Pearson who suggests that the percentage of genuisses in a nation is a function partly of the stock and partly of the system of education in vogue. It is wise not to discuss this question until we have really discovered an educational system ; as a wit recently remarked, England has seen the effects of two types of education in the past—the Religious and the Irreligious—we now await with interest the development of genius under the Birrelijious code.

The other point of view is that of Carlyle (or was it Hamlet ?) that "genius is the infinite capacity to take pains." No article could possibly be complete without this hackneyed phrase but, although the writer feels quite equal to the task of defending this definition to the exclusion of all others, his sympathies for the moment are wholly enlisted on behalf of the Lombroso School, where tenets will now shortly be set forth.

Boldly stated, this remarkably Italian theory holds that the genius is as mad as a March hare. So supremely mad is he, that to him the sane plodders around him are merely inane. He cannot see, so deranged is his mind, how it is that others cannot see as he does or as far. He is the last, or almost the last, degenerate product of an effete ancestry amongst whom for generations these has flourished insanity, mental instability and disease. By far the most convincing support for this theory is found in an appeal to a series of admitted geniuses, admitted—not by themselves but by others.

Sir Isaac Newton—in so many words—used to support the definition of Carlyle, used to say in fact that he merely poss-

ception of the Genius. No doubt whatever, much of the glamour which surrounds him is woven about a mere name by the willing imagination of his admirers. To come into daily contact with him, to see him eat his breakfast, to hear him tread on the cat is to bring him as a man more within our range. Still there is a big balance for discussion left over, even after the glamour has departed.

There is, for example his great intellectual productiveness and the fact that he produces largely without effort, his genuine eccentricities entirely free from "pose" and the physical peculiarities which almost invariably attend him and which alone would differentiate him from the herd. He stands alone—one of the mile-stones along the road of progress, an isolated and pathetic figure. Having arrived at a belief that the man of genius differs from the rest of us in something more than degree, it remains to describe how talented onlookers holding a like belief have been led to regard these fascinating human anomalies.

In our own country the prevailing view seems to be that intellectual freaks of any kind form a glorious monument to the theory of Heredity, considered apart from degeneracy or disease. Geniuses, on this view, arise as the more or less perfect products of a long line of efficient ancestors. The particular environment, training and enthusiasms of preceding generations are each invoked by turn to explain the formation of a Being who combines in himself all the specialised capacities of his forefathers in an extraordinary state of perfection. In short the genius is to be looked on as a healthy example of the cumulative effects of heredity along particular lines.

It is not a necessary part of this theory that any *individual* ancestor should have exibited abnormal characteristics or capacities ; the genius-product simply takes unto himself all the intellectual sap from the various branches of his own family tree, and the result is an entirely abnorm al intellectual outburst.

The hereditary or Galtonian idea of Genius is thus founded largely on an examination of the mental tendencies and intellectual eminences attained by members of certain remarkable families. Mental peculiarities entirely healthy are often found to extend back for generations ; and in many cases a family boasting perhaps dozens of talented scions has been found finally to culminate in an undoubted Genius. As an example it is interesting to take the case of Bach, especially

I have to acknowledge the receipt of a letter from an Old Boy, now resident in England. He touches on the following:—(1) scholarships (2) a college newspaper (3) the elections in the Union during the last few years. Under the circumstances I have no option but to refrain from publishing his letter, though his suggestions will certainly be considered by the parties concerned.

The Genius as Hero.

No one will cavil at the statement that genius is best observed and discussed from outside the Pale. The introspections alone of an Aristotle or a Goethe would not be of much use in solving the riddle of Genius, however entrancing those Aristotelian egoisms might be for their own sake. An approach to the solution is much more likely to result from acute observations made by some of the humble though normal disciples of these great men. And for this reason ; one of the most constant incapacities of persons really endowed with the surpassing powers we call genius is their inability to analyse their own mental processes. In their minds the result attained, while subject to the test of logic, seems to be reached independently of logic; to be arrived at in a bound ; while the rest of us, perhaps ten, perhaps a hundred years behind, plod. painfully and controversially and often conscientiously to the same result.

The writer is inclined to regard this inspiration for the truth, this power intuitively to leap to a right conclusion, as the basis for a definition of Genius which has been and always will be hard to complete—but there will inevitably be dissentients from an attempt to define the Divine spark. After all the real object in view is to describe the efforts which have been made to bring the Genius into line with the rest of mankind.

When really present, Genius will be admitted by everyone. We shall only dispute over those who sit on the fence of brilliance which separates the Striving Talented from those who cannot help it

Bernard Shaw said the other day that he would like to see the staffs of the many London journals put into carts, labelled, and paraded, around the streets, so that we all might behold what manner of man it is that makes our opinions for us. Probably a process similar to this would seriously modify our con-

The Scientific Society labours under the disadvantage of having few members available for the reading of papers. This is a drawback which time can remove. The Shakespeare Society and Mr. Ashcroft's Essay Reading Society for School boys are both fully employed.

The Union Club has had some interesting debates. It is a pity that the present building is so illsuited for large meetings. A lack of good ventilation makes attendance at a debate a very great trial for everybody in these hot months.

The Football Tour to Calcutta was a useful experience for the team. They lost every match by a narrow margin, but they came back having learnt several useful lessons in the art of the game.

The Cricket XI visit to Naini Tal was most successful. They had a pleasant week in the hills winning both their matches easily.

We have not received any response to our appeal for more literary support. The problem of keeping this magazine "afloat" will soon become extremely difficult. The long vacation is now close at hand and there will be for most students three months of comparative leisure. We offer a prize of Rs. fifteen for the best essay on

"Mussulmans and Commerce."

The subject has been proposed before but drew no compositions at all. It is one of practical importance at the present day; hence we make no excuse for putting it forward a second time. Essays should be sent to the Editor, Aligarh Monthly, not later than October 1st, 1907.

It is with profound regret that we have to announce the death of a promising Old Boy of the College, Tarafdar Hosain. The deceased graduated from Aligarh in 1904, taking a 2nd Division in the B. A. Examination. Since that time he had been working as a master in the School as well as reading for the LL. B degree. Lately, however, he had had to give up some of his work owing to the excessive strain on his strength. Only some few weeks ago he was talking hopefully of his future, and we understand that he was actually a nominee for a good Government post when he died. He was a good type of the Aligarh Student, whom we could ill afford to lose.

The Aligarh Monthly

July, 1907.

College Notes

The last month has been very quiet so far as College events have been concerned. After the Intermediate and Entrance examinations the Entrance Class and Second Year went away home. The School is now full again, however, and those who wish to send their sons to it should write first to the Head Master to learn whether there are any vacancies There is very great pressure on the accomodation. The same will certainly be the case with the College in a short time, as new students are arriving already from the Punjab and Eastern Bengal. The Allahabad University results will be out by the time this issue appears, and there will at once be more demand for accomodation than there will be available supply.

In the Building Department there is considerable activity. The re-roofing of the Syed Mahmood Court is going on, and it is to be hoped that most of the work will be done before the rains break seriously.

The various societies are in full swing. The Arabic Society has begun operations and bids fair to be very popular. The Historical Society has its programme full to the end of the term. The next session will see the division of the Historical Society into two sections. Then we hope that it will flourish exceedingly.

جلد (۵)	ستمبر ۱۹۰۷ء عیسوی	نمبر (۹)

۷۸۶

(سلسلہ کے لئے پرچہ علی گڈھ منتھلی ۔ بابت ماہ جولائی ۱۹۰۷ء ملاحظہ ہو)

آریہ و ان آریہ قومیں اور سنسکرت و پراکرت زبانیں نمبر (۳)

یہ پتا لگانا سخت مشکل ہے کہ بنیاد اس سلطنت کی کب پڑی، اور بانی اسکا کون تھا؟ اور پایۂ تخت* اسکا کہاں تھا؟ - لیکن یہ متحقق واقعہ ہے کہ مگدھ کا قوت ور راجہ جراسندھ

* قیاس غالب ہی کہ جراسندہ کا پایۂ تخت بھی راجگڑہ ہی میں ہو، کیونکہ اُن اطراف میں اور کہیں شاہی نشانات نہیں پائے جاتے جیسے راجگڑہ میں پائے جاتے ہیں، راجگڑہ سے چھ میل پورب ایک پہاڑی ندی کے بائیں کنارے گریک کی پہاڑی کی چوٹی پر ایک پختہ اونچا چبوترہ بنا ہوا ہے لوگ اسکو جراسندہ کا موڑھا کہتے ہیں، اُس کے متصل ہی جنوب کیطرف

مہابھارتھ کی خونریز جنگ میں شریک تھا۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ ایک ایج، یعنی رزمیہ شاعری کے زمانے میں مگدہ دیش ہندو تہذیب کے دائرے میں مشکل سے شمار ہوسکتا تھا، لیکن جب جراسندہ کی قوت وسطوت پر خیال جاتا ہے، تو دل میں اُس خیال کی وقعت باقی نہیں رہتی۔

جراسندہ جراسندہ، پُورَوَ بنسی راجہ تھا، اور متھرا کے راجہ کنس کا سسُر تھا، کنس سری کرشن کا ماموں اور سورسینی راج کا بادشاہ تھا۔ جو بعد کو برج دیش کے نام سے مشہور ہوا۔

مہابھارتھ کے بعد، جن دنوں، راجہ پرچھیت کی اولاد اندرپرست میں راج کرتی تھی، اُسی زمانے میں جراسندہ کی نسل مگدہ میں برسرِ حکومت تھی۔

ایک فہرست اٹھائیس[۲۸] فرمانرواؤں کی دستیاب ہوئی ہے۔ لیکن وہ محض ساقط الاعتبار ہے۔ کیونکہ اُس میں حکمرانوں کے صرف نام ہی نام ہیں، اور باقی کوئی کیفیت اُن کے متعلق نہیں لکھی (یہ روایت، مسٹر آر۔ سی۔ دت۔ کی ہے)

اُس زبردست راجہ کے باغ کا نشان دیتے ہیں۔ راقم نے اُسکو پہاڑ کے اُوپر جاکر دیکھا وہ چبوترہ تخمیناً دس گز اونچا اور دس ہی گز کے گھیرے میں ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ اُس زمانے میں اِسقدر بلند نہوگا جتنا اب ہے۔ جیسے جیسے اُس کی جڑ کی مٹی بہتی گئی وہ زیادہ اُبھرتا اور اُونچا ہوتا گیا۔ بہرکیف اگر جراسندہ کا باغ یہاں پر ہو تو راجگرہ میں اُسکا پایۂ تخت ہوسکتا ہے۔ اِس میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی۔

کیونکہ چھ میل کا فاصلہ کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ راجہ نے کبھی کبھی جی بہلانے کے لئے اِس خوش منظر موقع پر باغ لگایا ہو۔ اُس پر چڑھنے سے بہت دُور تک نگاہ جاتی ہے اور وہ چبوترہ چھ سات کوس سے نظر آتا ہے۔ ۱۲

مارشمین صاحب، یوں تحریر فرماتے ہیں کہ جراسندہ کے بعد اُس کے خاندان کے بائیس[22] راجاؤں نے بڑے رُعب اور دبدبے کیساتھ حکمرانی کی، لیکن تیئیسواں[23] راجہ (جس کا نام ریپنجی تھا) ایسا غافل و بداقبال ہوا، کہ اُسکے وزیر، سُونک نامی نے اُسکو قتل کر ڈالا اور آپ تخت و تاج کا مالک بن بیٹھا۔

غاصب، سونک کے بعد، پانچ راجے اور مجہول الحال تخت نشین ہوئے، جن کی کچھ کیفیت معلوم نہیں۔[1]

ناگ بنس۔ اِن اٹھائیس[28] حکمرانوں کے بعد (جو غالباً نہیں، بلکہ یقیناً جراسندہ اور سونک کی نسل میں ہونگے) تخمیناً سنہ عیسوی سے چھہ یا سات سو برس پہلے ششنیہ ناگ[2] نامی ایک راجہ نے ایک نئے اور مشہور خاندان کی بنیاد ڈالی، جو تواریخ میں ناگ بنس کے نام سے موسوم ہے۔

ششنیہ ناگ کی چوتھی پشت میں بمبسار ہوا۔ جس نے ۶۳۷ یا ۷۴۳ قبل مسیح سے، ۵۸۵ یا ۵۹۸ قبل مسیح تک، باون[52] برس تک فرمانروائی کی۔

اِسی راجہ کی طویل حکومت کے زمانے میں، شاکیہ مُنی گوتم بُدّھ نے بودھ

---

[1] غور کرنے سے، دونوں مؤرّخوں کی تحریر کا نتیجہ، ایک ہی معلوم ہوتا ہے، البتہ صاحب بہار کی روایت میں نسبتاً کچھہ تفصیل زیادہ ہے ۱۲

[2] تاتاریوں کے حملے ہندوستان پر، وقتاً فوقتاً، برابر ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک حملہ اُن کا مگدھ پر اُسوقت میں ہوا ہے، جبکہ غاصب سونک کی اولاد وہاں راج کرتی تھی۔ اِن لوگوں کو قوم تکشک کے نام سے یاد کیا گیا ہے، جس سے مُراد ایسی قوم ہے، جس کا تمغہ سانپ ہو۔ اِنھیں وجوہات کی بنا پر یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا عجب ہے کہ ناگ بنسیوں کا مورث اعلیٰ (ششنیہ ناگ) بھی قوم تکشک سے ہو۔

مذہب کا وعظ کہا، جس کو اوّل اوّل ہندوؤں نے اختیار کیا، اور اب تمامی بنی آدم کے تیسرے حصے کا یہی مذہب ہے۔

بمبسار، مگدھ کے با اقبال اور صاحب جاہ وجلال راجاؤں میں تھا۔ اُس کے دورِ حکومت میں پایۂ تخت راجگڑھ بڑی رونق اور اوجِ اقبال پر تھا۔

شاکیہ مُنی گوتم بدھ، پہلے ایک نامی راجہ کے بیٹے تھے۔ راج کاج اور ساری شان و شوکت دُنیوی کو لات مار کر، ریاضت و تپسیا کے لئے دشت نوردی اور بادیہ پیمائی اختیار کی، پھرتے پھراتے وہ راجگڑھ پہونچے، اور راجہ بمبسار کو اپنا معتقدِ خاص اور ارادتمند با اختصاص بنا لیا۔

چونکہ خاص سے عام تک، سب لوگ برہمنی مذہب کے خوگر ہو رہے تھے۔ جو زمانۂ لامعلوم سے اُن کی جبلت میں خمیر ہو رہا تھا۔ اور بودھ مذہب سراسر اُس کے برخلاف تھا، اسلئے اِس نئے اعتقاد کے سبب سے، سب لوگ بمبسار سے سخت ناراض بلکہ اُس کے جانی دشمن ہو گئے۔ چنانچہ خود اُسکے ناخلف بیٹے اجاتشترو نے اُس کو قتل کر ڈالا، اور راج گدی کا مالک بن بیٹھا۔

گو، آخر کو اجاتشترو کی دشمنی بودھ مذہب سے رفتہ رفتہ کم ہو گئی، بلکہ پھر وہ اُس مذہب کا بدل معتقد ہو کر اکثر اُسکے دینی کاموں میں مدد دیتا رہا۔ مگر مذہب کے اِنقلابِ عظیم نے نظامِ سلطنت میں غایت درجے کی ابتری پھیلا دی، اور کچھ ایسی بدعملی تمام ملک پر چھا گئی، کہ اُسکا انسداد کارکنانِ سلطنت کے اختیار میں نہ رہا۔

الغرض، بمبسار کے بعد اجاتشترو، حضرت عیسیٰؑ سے ۵۸۵ یا ۵۸۴ برس پہلے تخت نشین ہوا۔ اور کاروبارِ سلطنت کو مُبصرانہ نظر سے دیکھنے لگا۔ سلطنت کو اُسکے زمانے میں اچھی رونق و وسعت حاصل ہوئی۔

اگر اجاتشترو کے نامۂ اعمال سے، پدر کشی کے گُناہِ کبیرہ کو کچھ دیر کے لئے

محو کر ڈالا جائے، اور اُسکے باقی کارناموں کو بنظرِ انصاف دیکھا جائے، تو وہ بے شک استحسان کے لائق ٹھیرینگے، خصوصًا سلطنت کے حق میں تو اُسکا زمانہ بلاشبہہ قابلِ لحاظ ترقی کا زمانہ ہوا۔

اُسوقت میں مگدھ راج نسبتًا نہایت وسیع اور قوی ہو گیا تھا۔ پورب میں تو اُسکا رعب داب انگا راج تک پہونچا ہوا تھا، جسکا دار الامارۃ چنپا نگر میں تھا۔ جو موجودہ بھاگل پور کے قریب واقع تھا۔ اور شمال و مغرب میں اجات شترو نے کوشل اور کاشی راج وغیرہ کو فتح کر کے اپنی وسیع مملکت میں شامل کر لیا تھا

ایک قوم تورانیوں کی (جو وجین* بولی جاتی تھی) ہمالیہ کو ٹپ کر ہندوستان میں آئی۔ اور شمالی بہار میں ایک حکومت قائم کر لی۔ طاقتور اجات شترو نے اُس کو نکال باہر کیا، اور اُسکے مفتوحہ ملک کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

سب کچھ تھا، مگر سلطنت کے تبدیلِ مذہب سے، جو عام ناراضی تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی، اُسکا اِنسداد اجات شترو سے بھی نہ ہو سکا۔ خود شاہی خاندان والوں میں سے اکثر لوگ اپنے پُرانے مذہب سے روگردانی نہیں چاہتے تھے۔

اِس عام ناراضگی نے محل میں بھی خانہ جنگی پھیلا رکھی تھی، چنانچہ اجات شترو کے بعد بھی، تین یا چار راجے ایسے بدراہ ہوئے۔ جو اپنے اپنے باپوں کو مار کر مالکِ تخت وتاج ہوتے گئے، مگر اُنکا حال کچھ معلوم نہ ہوا۔

اِس زمانے میں لوگوں کے چال چلن بہت بگڑ گئے تھے اور تمام ملک میں فسق و فجور پھیل گیا تھا۔ وہ بد فطرت طبیعتیں جو برہمنی مذہب کی سخت قید و بند کے سبب سے التذاذِ نفسانی کا موقع نہ پاتی تھیں، بودھ مذہب کی آزادی نے اُن کو شتر بے مہار

* یہ لفظ انگریزی ہے، جو مسٹر آر۔ سی۔ دت کی۔ ہسٹری آف انڈیا سے لیا گیا ہے۔ ہندی، اردو اور فارسی تاریخوں میں، اِس قوم کا پتہ نہ چلا۔

کر دیا۔ اِس میں کوئی شبہہ نہیں کہ آزادی انسان کے لئے رحمتِ الٰہی ہے۔ لیکن جن لوگوں کے ساتھ اُسکا برتاؤ کیا جائے اُن کی اُفتاد و رجحانِ طبع کا اندازہ کر لینا ضرور ہے کیونکہ آزادی اگر شریف النفس اور نرم دلوں کیلئے آبِ حیات ہے تو شریر النفس اور سنگدلوں کے حق میں سمِ قاتل ہے

جوہرِ جامِ جم از طینتِ کانِ دگر ست ؛ تو توقع زگلِ کوزہ گران میداری

آخر کار، رعایا نے آئے دن کی بدنظمی اور بدعملی سے تنگ آکر شِشنیہ ناگ* وزیر کو (جو وِشالی† کی بیسوا رانی کا بیٹا تھا) راج گدّی پر بٹھا دیا۔

یہ شخص نہایت ہی فہیم، دانشمند، ذہین، ہتین اور تیز تھا۔

ششنیہ ناگ کے بعد، اُسکا بیٹا، کال اشوک (جسکو کاک برن بھی لکھا ہے) تخت و تاج کا مالک ہوا۔ اور نہایت حزم و احتیاط سے حکمرانی کرتا تھا۔

گو اُس کے باپ کو رعایا کی رضامندی اور مشورے سے تخت و تاج ملا تھا، لیکن اہالیانِ دربار اور ارکانِ دولت پر اُس کو مطلق وثوق اور اعتبار نہ تھا۔ اور راج دربار کے انتظام سے اُسے بدظنی رہتی تھی۔

---

* عجب نہیں کہ یہ شِشنیہ ناگ بھی اُسی قوم تکشک کی نسل سے ہو جس سے شِشنیہ ناگ اول تھا

† وِشالی، پٹنہ سے اُتر گنگا پار، ترہت کے علاقہ میں اُن دنوں ایک راجدھانی تھی۔ اور جب راجدھانی تھی تو لامحالہ ایک شہر، یا کم از کم ایک قصبہ تو ضرور ہوگا۔ لیکن اب تو وہ ایک اُجڑی ہوئی بستی رہ گئی ہے، جو بسہڑ کہلاتی ہے۔

وِشالی کی رانی ایک بیسوا تھی اور گوتم بدھ کے مُریدوں میں تھی۔

وِشالی میں شادی بیاہ کا دستور نہ تھا۔ گویا سچ مچ تریا راج تھا۔

(آئینۂ تاریخ نما نمبر (۳))۔

دار الحکومۃ کا راجگڑھ سے پٹنہ کو منتقل ہو جانا

غالباً*۔ انھیں بے اطمینانیوں سے متاثر ہو کر وہ دار السلطنۃ کو راجگڑھ سے منتقل کر کے پٹنہ لے گیا۔ جو اُس کی دادی کے وِشالی راج کے قریب تھا۔

پٹنہ اُس زمانے سے تھوڑے دن پیشتر ایک چھوٹا سا گانوں تھا۔ اور پشپ پور بولا جاتا تھا شاکیہ مُنی گوتم بدھ، راجگڑھ جاتے ہوئے وہاں ایک ہرکارے کی چوکی میں شب باش ہوئے تھے۔ راجدھانی ہونے پر آباد ہو گیا، اور پاٹلی پور کہلانے لگا، اور بعد کے زمانوں میں پاٹلی پور سے پاٹلی پُتر اور پاٹلی پتر سے پٹنہ اور پٹنہ عظیم آباد ہو گیا۔

کال اشوک کے بعد، ناگ بنس میں، ایسے ایسے راجے ہوئے۔ جن کو نہ تو برہمنی مذہب والے مانتے تھے، اور نہ بودھ مت والے بہتر جانتے تھے، دو میں سے، کسی فریق نے اُن کا کچھ حال نہیں لکھا۔ اور نہ اُن کی کوئی یادگار باقی ہے۔

ناگ بنسی راجاؤں کی تعداد بیان کی گئی ہے بہ ایں تفصیل:—

سِشِنیہ ناگ اوّل سے بمبسار تک - ... ... ۴ - راجے

بمبسار کے بعد سے سِشِنیہ ناگ دوم کے پہلے تک ... ... ۴ - ″

*حقیقت یہ ہے کہ راجگڑھ کا خورشید اقبال، بمبسار ہی کے زمانے میں اوج کمال پر پہنچکر، حضیضِ زوال کی جانب مائل ہو چکا تھا، پھر اُسکی لازمی ویرانی کِس کے روکے رُک سکتی تھی۔ اب وہ عظیم الشان شہر، ایک چھوٹی سی اونچی نیچی ناہموار اور اُجاڑ سی بستی رہ گیا ہے۔ اُس ویرانی پر بھی اُس کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات اور ہزاروں قسم کے عجائبات تقریباً تین ہزار برس کے گذشتہ جاہ و جلال کی یاد بہ صد حسرت و عبرت دلانے کے لئے کافی ہیں۔

ستشیہ ناگ دوم اور اُسکا بیٹا، کال اشوک - - - ۲ - راجے
میزان ۱۰ "
(مجہول الحال راجے اس فہرست سے مستثنیٰ ہیں)

نند بنس۔ الغرض، اِن گمنام راجاؤں کے بعد، ناگ بنس کا سنہ عیسوی سے تین سو ستر ۳۷۰ برس پہلے خاتمہ ہوگیا۔ اور دَوُرِ دوّار سنے پاٹلی پور کی راج گدّی پر ایک نئے شاہی خاندان کو جلوہ افروز کیا۔ جو نند بنس کہلاتا ہے اور اُسکا سورث اعلےٰ مہانند تھا، کہ وہ بھی اُسی تکشک قوم کی نسل سے تھا۔ جس کی اولاد میں گذشتہ ناگ بنسی راجے تھے۔، مگر مہانند کی ماں، ایک شُدری عورت تھی۔

یہ راجہ عیسوی صدی سے تین سو تینتیس ۳۳۳ برس پہلے اِسکندر اعظم یونانی کا ہمعصر تھا۔ اور اِسی کے آخری دَوُر میں یونانی فوج سکندر کی ماتحتی میں ہند کے مغرب وشمال کے کوہستانی ملکوں کو مطیع کرتی ہوئی سندھ کے پار اُتر آئی۔ اور سکندر فوج کی بیدلی اور ماندگی کی وجہ سے وہیں سے لوٹ گیا۔

اُسوقت مہانند کی فوج میں، تیس ہزار ۳۰۰۰۰ سواروں چھ لاکھ ۶۰۰۰۰۰ پیادوں، اور نو ہزار ۹۰۰۰ ہاتھیوں کی جمعیت تھی۔ اِسی بنا پر گمان کیا جاتا ہے کہ سکندر کی فوج پر مہانند کی کثیر التعداد اور جرّار فوج کا ایسا رعب اور خوف طاری ہوا کہ باوجود طرح طرح کی ہیبت اور طمع دلانے کے بھی اُسنے پیچھے ہٹنے کے سوا آگے بڑھنے کا نام نہ لیا

جیسا کہ ہندو راج میں اکثر دستور رہا ہے، مہانند کو بھی اُسکے وزیر نے قتل کرڈالا جس کی مفصل کیفیت معلوم نہیں، لیکن وہ نمک حرام اپنے خراب مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا، اور اُسکو سلطنت نہ ملی۔

مہانند نے پینتیس ۳۵ برس سلطنت کی، اور بعد ازاں اُس کے نو ۹ بیٹوں میں سے آٹھ بیٹوں نے مِلکر پندرہ ۱۵ برس تک پادشاہت کی۔ اِسطرح سے پچاس برس یعنی ۳۷۰ قبل مسیح سے ۳۲۰ قبل مسیح تک برسرِ حکومت رہ کر نند بنس بھی ختم ہوگیا۔

اور موریہ بنس سریر آرائے سلطنت ہوا، جس کا حال آگے درج ہے۔

سوریہ بنس مہانند کا ایک بیٹا ایک نائن کے بطن سے تھا جس کا نام چندر گپت تھا یہ لڑکا نہایت ہی عقیل، ذہین، فہیم، اور ذکی تھا۔ اُس کے وہ آٹھ* بھائی، جو دوسری رانیوں سے تھے، اپنے کو بڑا صحیح النسب خیال کرتے اور غریب چندر گپت کو ذلیل و خوار سمجھتے اور نیچی نظروں سے دیکھتے تھے۔ حالانکہ خود اُن کا باپ مہانند بھی ایک شودری کے بطن سے تھا۔ نتیجہ اِس برادرانہ نفاق و حسد کا یہ ہوا کہ اُن اُٹھوں نے بالاتفاق چندر گپت کی طرف سے باپ کو نہایت بدگمان کر دیا، اور یہاں تک دونوں باپ بیٹوں میں نفاق ڈلوا دیا کہ اُسکو محل میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔

وہ روٹھ کر سکندر کے لشکر گاہ میں چلا گیا اور چند روز تک وہیں ٹھہرا رہا۔

بعد ازاں سکندر کو جب اُسکا پتا لگ گیا تو فوراً اُسکے ساتھ مخاصمانہ کارروائی شروع کر دی، لیکن چالاک چندر گپت جان بچا کر بھاگ گیا۔

سکندر کے چلے جانے کے بعد، چندر گپت نے شمال و مغرب کے لڑاکے جوانوں کا ایک لشکرِ عظیم طیار کیا اور ۳۲۲ء قبل مسیح میں مع لشکر دار الحکومت پاٹلی پترا (پٹنہ) میں پہنچکر اُن مغرور آٹھ بھائیوں کو (جو اُسے حقیر و مُبتذل سمجھا کرتے تھے) قتل کر ڈالا اور آپ تختِ فرمانروائی پر رونق افروز ہو گیا۔

اُس کے تیس[۳۰] سالہ یا چوبیس[۲۴] سالہ دَورِ دَورے میں، مگدھ دیش کی سلطنت ایک ایسی وسیع اور عظیم الشان سلطنت ہو گئی جس کی وسعت پٹنہ سے لیکر سندھ دریا تک پھیلی ہوئی تھی۔ سب پُرانی قومیں، مثلاً:— کوشل۔ بدیہہ، اور کاشی وغیرہ اُس نوجوان اور زبردست سلطنت کی مطیع اور فرمانبردار ہو گئیں بلکہ تمام شمالی ہند کو اُس نے اپنی وسیع قلمرو میں شامل کر کے متحد کر لیا۔

* یہ آٹھ شہزادے مع چندر گپت، نو نند کہلاتے ہیں۔

چندر گپت کو سوتیلے بھائیوں کے قتل اور حصول سلطنت میں چانکیہ[1] نامی ایک مہا پنڈت برہمن سے بڑی مدد ملی تھی، بلکہ انصاف یہ ہے کہ اُسی کی عاقلانہ اور مدبرانہ (مگر فریبانہ) کارروائیوں نے چندر گپت کو مہاراجا دھیراج چندر گپت بنا دیا[2]۔

چندر گپت نے بھی، صاحب تاج و تخت ہونے پر، اُس کو اپنا وزیر اعظم اور مشیر خاص مقرر کر کے اُس کی منت بیکراں اور احسان بے پایاں کا شکریہ ادا کیا۔

چندر گپت کی ماں کا نام "مُرا" تھا، اسلئے برہمن مؤرخوں نے (غالباً براہ تمسخر و مضحکہ) اُس کو موری خاندان کا بانی اور اُس کی آئندہ نسلوں کو موریہ لکھا ہے۔

سلیوکس مگدہ دیش کے، مغربی تعلقات بآسانی سمجھ میں آنے کے لئے، اس موقع پر اسقدر لکھدینا ضرور ہے کہ اپنے پایہ تخت مقدونیہ کو لوٹتے وقت شاہنشاہ اعظم اسکندر نے بابل پہنچکر، عین جوانی ہی میں انتقال کیا، اور چونکہ اُسکے بعد اُسکا کوئی جانشین نہ تھا، اسلئے اُس کی ساری عظیم فتوحات کو سپہ سالاروں اور صوبہ داروں نے آپس میں بانٹ لیا۔

اُنھیں غاصبین میں سے ایک سلیوکس تھا، جس نے اپنے مغصوبہ ملک کا دارالسلطنۃ بابل کو مقرر کیا اور ایک لشکر عظیم لے کر، ہندوستان پر چڑھ آیا۔ تاکہ اسکندر اعظم کی ناکامی کا بدلہ لے۔

---

[1] ٭ چانکیہ، بڑا قابل پنڈت تھا، اس کی ایک تصنیف نظر راقم سے بھی گذری ہے جس کا نام "چانکیہ نیتی درپن" ہے۔

[2] ٭ یہ واقعہ مدرا راکشش میں مفصل مندرج ہے۔
گو وہ کتاب، ایک ناٹک کی کتاب ہے۔
مگر تاریخانہ پہلو لیئے ہوئے ہے۔

اِس سے اور چندر گپت سے، ایک جنگِ عظیم بھی ہوئی - لیکن لڑائی میں ہندو راجہ ہی کا پلہ بھاری رہا - مگر آخر کو فیما بین صلح ہوگئی -

سلیوکس کو پانسو[۵] ہاتھی، سال بسال دیے جانے کا اقرار ہوا - مگر عوض میں اُسے چندر گپت کو اپنی پیاری بیٹی دینی پڑی - علاوہ اُسکے سندھ کے مشرقی کنارے کا وہ سارا ملک اُسکو حوالہ کرنا پڑا، جو سالہا سال سے یونانیوں کے دخل و تصرف میں چلا آتا تھا -

میگاستھنی — صلح ہوجانے کے بعد دونوں سلطنتوں کے درمیان رشتے اتحاد اور یکجہتی کے قائم ہوئے اور مستحکم رہنے کے لئے مہاراجہ چندر گپت کے دربار میں سلیوکس کا ایک سفیر رہنے لگا - جس کا نام میگاستھنی تھا - میگاستھنی، ۳۱۷ سے ۳۱۲ قبل مسیح تک، یعنی پانچ برس کامل یہاں رہا - اور اِس مدتِ قیام میں اُس نے تمامی ہندوستان کی نسبت عموماً اور مگدہ دیش کی نسبت خصوصاً بہت سی بکار آمد و ایقینی تحقیقیں بہم پہنچائیں - جو اپنے اپنے موقع پر معرضِ بیان میں آئینگی -

پٹنہ — وہی پٹنسپ پور (پٹنہ)، (جو گوتم بدھ کے زمانے میں ایک چھوٹا سا گانوں تھا) دار السلطنتہ ہوجانے کے سبب سے ڈھائی تین سو برس کے عرصے میں ایسے اوج موج کا شہر ہوگیا - کہ ناسبردہ میگاستھنی، اسکی آبادی اور رونق کا حال یوں تحریر کرتا ہے :-

یہ شہر آٹھ میل سے زیادہ لمبا اور ڈیڑھ میل سے زیادہ چوڑا ہے - کاٹھ کی شہر پناہ سے بڑی مضبوطی کے ساتھ محصور ہے، جس میں پانسو ستر[۵۷۰] برج چونسٹھ[۶۴] دروازے اور متعدد کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں - تین طرف تیس[۳۰] ہاتھ گہری کھائی سے گھرا ہوا ہے - اور اُس کی اُتر جانب گنگا موجیں مار رہی ہے -

مہاراجہ چندر گپت نے عیسوی صدی سے دو سو نوے[۲۹۰] برس پیشتر جہان فانی

سے عالم جاودانی کیطرف کوچ کیا اور تیس۳۰ برس تک بڑی شان و شوکت سے حکمرانی کی۔

چندر گپت کے بعد اُسکا بیٹا، بندوسار،* تاج و تخت کا مالک ہوا۔ اور ۲۹۰ قبل مسیح سے ۲۶۲ قبل مسیح تک، ۲۸ برس حکمران رہا۔ سیلوکس نے چندر گپت کی پرانی دوستی کو تازہ کرنے کی غرض سے اس راجہ کے پاس بھی دوسرا ایلچی بھیجا۔ بندوسار کے سولہ رانیوں سے ایک سو ایک لڑکے تھے۔ اُن میں سے اشوک (جو آخر کو دھرم اشوک اور پریہ درشی کے نام سے موسوم ہوا) نہایت ہی عقیل اور موصوف بہ جمیع صفات حسنہ تھا۔

اشوک، اپنے باپ کے وقت میں اُجّین کا ناظم تھا۔ وہاں ایک سیٹھ کی بیٹی سے (جس کا نام دیوی تھا) شادی کی، اُس سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی پیدا ہوئے، بیٹے کا نام مہیندر اور بیٹی کا سنگھ متا یا سمترا تھا۔ یہ دونوں بھائی بہن تارک دنیا ہو کر فقیر ہو گئے۔

باپ کی وفات کی خبر پاکر، اشوک دار الخلافہ میں سنہ عیسوی سے دو سو تریسٹھ ۲۶۳ برس پہلے تخت نشین ہوا۔ تخت پر بیٹھتے ہی، اُس نے اپنے سگے بھائی تشی نامی کو زندہ رکھکر، بندوسار کے باقی ننانوے بیٹوں کو قتل کر ڈالا۔

بس اُس سے یہی تو ایک بڑا بھاری جرم صادر ہوا۔ جس کا کفارہ میرے نزدیک غیر ممکن ہے۔ ورنہ اُسکے اور کام بالکل خیر ہی خیر ہیں۔

یہ راجہ پہلے برہمنوں کا بڑا معتقد تھا، لیکن ایک اتفاقی واقعہ سے اس مذہب سے روگرداں ہو کر بودھ مذہب پر ایمان لایا اور اُس مذہب میں ایسا سرگرم تھا کہ دینی حیثیت سے اُسکو بودھ مذہب کا پتلا کہنا روا ہے اور دنیوی حیثیت سے خیر مجسّم

* تاریخ میں صاحب نے چندر گپت کے بیٹا کا نام، متر گپت لکھا ہے، اور کوئی حال اُسکا نہیں لکھا۔ واللہ اعلم بالصواب ؏

سمجھنا زیبا۔

چالیس، اکتالیس برس تک اُس نے سلطنت کی، اور اس مدت مدید میں اُسنے مذہبی کاموں کے علاوہ، رفاہ عام اور راحت رسانی خلائق کے اسقدر اور ایسے ایسے کارہائے نمایاں کئے، جن کا انحصار اس مختصر میں نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم اس مضمون کو کسی آئندہ پرچے کے لئے اُٹھائے رکھتے ہیں۔ غالباً ہم کو اُس کے کارناموں کی تفصیل کا موقع پالی حرفوں کے بیان کے ساتھ ملیگا۔

پریہ ورشی (اشوک) کے بعد اُس کا بیٹا، کُنال (جسکو دھرم وردھن بھی کہتے ہیں) راج کا مالک ہوتا مگر سوتیلی ماں کے مکر و فریب سے تنگ آکر اُس نے تخت و تاج کو سلام کیا اور ہمیشہ باہر ہی باہر رہا۔*

* کُنال پر اُسکے باپ کی ایک چاہیتی رانی (جس کا نام تشیہ رکشتا تھا) عاشق زار تھی، اور اُسکو اپنے دام تزویر میں لانا چاہتی تھی۔ لیکن نیک اور پرہیزگار کُنال کو ہمیشہ اُس سے انکار رہا۔ اُس رنجش کو وہ بدفطرة جی میں لئے رہی اور موقع وقت کی منتظر تھی۔ اتفاقاً، کُنال کو اِنسداد فتنہ کی غرض سے تکشلا دیش جانا پڑا۔ شقی و مکارہ رانی نے دھوکے سے ایک سادہ کاغذ پر اشوک کی مُہر کرالی، اور تکشلا کے سالار فوج کے پاس، اُسی سادہ کاغذ پہ یہ جعلی حکم بھجوا دیا کہ کُنال کو اندھا کرکے بھیجدو۔ چنانچہ اس فریب آمیز اور فتنہ انگیز حکم کی پوری پوری تعمیل کی گئی۔ جب نابینا کُنال باپ کے پاس حاضر کیا گیا تو راجہ کا دل اپنے نور چشم کے حال پُرملال پر بہت کُڑھا۔ اور اپنی بے احتیاطی اور غفلت پر اُس کو کمال نداست و پشیمانی ہوئی۔

بدکردار رانی کو زندہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا۔ کُنال کی کماحقہٗ دوا کی، اور اُس کی آنکھیں اچھی ہوگئیں۔ مگر اُس نے پایۂ تخت کا رہنا پسند نہ کیا۔ اور پھر اپنی جاگیر تکشلا کو چلا گیا ۱۲

پس کُنال کے دو بیٹوں میں سے بڑا بیٹا (جس کا نام سَمپر دی تھا) اپنے دادا کا جانشین ہوا اور اپنے آبائی دین یعنی بودھ مذہب پر قائم رہا۔

کُنال کا دوسرا لڑکا (جس کا نام جلوک تھا) کشمیر کی نظامت پر بھیجا گیا وہاں اُس نے سابق کے دین، یعنی بودھ مذہب کو ترک کر کے شِو پرستی اختیار کی۔

جلوک اور والیِ باختر سے (جس کا نام یو تھِڈیمُس تھا) کسی بات پر لڑائی ہو پڑی جس میں جلوک نے اپنے حریف کو شکستِ فاش دی۔

(باقی آئندہ)

)✻(

سنڈا ڈاکخانہ عطاسرائے ضلع پٹنہ۔
۲- اگست ۱۹۰۷ عیسوی۔

دیانت حسین عفی عنہ۔
وظیفہ خوار سرکار انگریزی۔

شیخ آذری اسفرائنی

علی گڈھ منتھلی، مطبوعہ اگست ۱۹۰۷ء، میں شیخ آذری کا حال منشی سید دیانت حسین صاحب نے لکھا ہے۔ مگر منشی صاحب کو افسوس ہے کہ شیخ کا اصلی نام معلوم نہ ہو سکا نہ یہ معلوم ہوا کہ اسفرائن کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ اور شیخ کا کلام بھی، کچھ شعر دل کی، ایک غزل کے علاوہ اُنکی نظر سے نہیں گُزرا۔ چونکہ خود منشی صاحب کو اور اکثر ناظرین کو شیخ آذری کا نام، کچھ اور کلام اور اسفرائن کی حقیقت دریافت کرنے کی خواہش ہو گی، اسلئے مضمونِ ہذا بطریقِ اختصار ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

شیخ کا نام حمزہ بن عبد الملک الطوسی البیہقی[1] اور فخر الدین یا جلال الدین[2] لقب تھا۔ شیخ

(۱) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ۱۲ (۲) تذکرہ مرآت الخیال ۱۲

کے والد اسفرائن میں حاکم تھے، اسی نسبت سے یہ اسفرائنی مشہور ہوئے۔

اسفرائن، خراسان میں، نہایت سرسبز و آباد قصبہ ہے۔ یہاں کے باغات[1] مشہور ہیں۔ یہ قصبہ ۳۷ عرض بلد اور ۵۷ طول بلد پر واقع ہے[2]

شیخ کو عنفوانِ جوانی میں شعر و سخن کا شوق ہوا۔ چونکہ آذر ماہ میں پیدا ہوئے تھے، آذری تخلص اختیار کیا۔ طبیعت میں خداداد موزونی تھی، تھوڑے ہی دنوں میں اُن کی شاعری کا ڈنکا بجگیا۔ اُمرا و سلاطین تک اِن کی رسائی ہوئی، اُن لوگوں کی مدح میں خوب خوب قصیدے لکھے، چنانچہ اُسی زمانے میں، شاہرخ سلطان کی شان میں ایک قصیدہ بطور نغز لکھا جسکا مطلع یہ ہے ؎

چیست آن آبے کہ تخم فتنہ بر می افگند	خسرو گردون ز سہم او سپر می افگند

افسوس ہے کہ مجھے یہ پورا قصیدہ نہ ملا۔ مگر دولت شاہ سمرقندی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "درین قصیدہ داد سخنوری دادہ"۔

زمانے کا دستور ہے کہ جہاں کوئی اہل کمال کھڑا ہوتا ہے وہیں معترض بھی موجود ہو جاتے ہیں۔ شیخ کی یہ شہرت دیکھکر، ایک شخص خواجہ عبد القادر نام، انکا معارض ہوا۔ سلمان ساوجی کے چند قصیدے جواب لکھنے کے لئے دیے۔ شیخ نے نہایت خوبی اور نکتہ سنجی کے ساتھ جواب لکھے۔ جو کُل ارباب کمال و اکابر زمانہ کو پسند آئے۔ بادشاہ بھی اِن قصیدوں سے بہت محظوظ ہوا، شیخ کی تعریف و توصیف کی۔ اور ملک الشعرائی کے عہدہ پر مامور کرنے کا وعدہ کیا۔

اِسی اثنا میں توفیقِ غیبی رہنما ہوئی۔ شیخ کو دنیا سے تنفر اور عقبیٰ کا خیال پیدا ہوا ؎

اودر طلبِ حکومتے مے فرسود
حق سلطنتِ فقر بدو لطف نمود

(۱) تذکرۂ آتشکدۂ آذر ۱۲ (۲) انسائیکلوپیڈیا برطانیکا۔ اڈیشن ۱۰۔ جلد ۳۴۔ نقشہ پرشیا ۱۲

شیخ آذری زخارفِ دنیا سے مُنہ موڑ کر قبلۃ العارفین شیخ محی الدین الطوسی الغزالی کے حلقۂ فیض میں داخل ہوئے۔ اخذِ طریقت کیا اور علمِ حدیث کی کتابیں ختم کیں۔ پھر ادائے فریضۂ حج کا خیال ہوا۔ حج کو روانہ ہوئے۔ یہ سفرِ حج ہی میں تھے کہ شیخ محی الدین کا حلب میں انتقال ہوگیا۔ حج کے بعد یہ سیّد نعمت اللہ ماہانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سیّد نعمت اللہ، امام عبد اللہ یافعی کے مرید تھے۔ شیخ آذری نے سیّد کی توجہ سے کمالاتِ باطنی حاصل کئے۔ اور اجازہ و خرقہ پایا۔

شیخ آذری علاوہ شیخ محی الدین طوسی اور سیّد نعمت اللہ ماہانی کے اور بھی اکثر اولیاء کبار کی زیارت و صحبت سے مشرف و مستفیض ہوئے۔ دو بار حج پیادہ پا کیا، برس روز تک مکّۂ معظّمہ میں مقیم رہے اور کتاب سعی الصفا حرم شریف میں لکھی۔ اِس کتاب میں مکّۂ معظّمہ کی تاریخ اور مناسکِ حج کا بیان ہے۔

شیخ آذری اسبے حج سے لوٹتے وقت ہندوستان آئے اور دہلی ہوتے ہوئے دکن پہونچے۔ یہاں اُسوقت سلطنتِ بہمنیہ کا نواں[9] تاجدار احمد بہمن شاہ حکمراں تھا۔ شیخ نے متعدّد قصیدے اُسکی مدح میں لکھے اور گرانبہا صلے پائے۔ بادشاہ کی فرمایش سے بہمن نامہ لکھنا شروع کیا۔ جب اِس کتاب میں بادشاہِ وقت تک کا حال لکھ چکے، ملاحظہ کے لئے بارگاہِ سلطانی میں پیش کیا، اور وطن جانے کی رخصت چاہی۔ احمد شاہ نے کہا "اِن دنوں سید محمد گیسو دراز کے انتقال سے، میرے دل پر نہایت صدمہ ہے، تمھاری ملاقات سے جی بہلجاتا ہے، اب اپنی جدائی کا داغ مجھے نہ دو،" بادشاہ کی اِس گفتگو سے ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ شیخ کس رتبہ کے آدمی تھے۔ اور بادشاہ کی نظر میں کیسی وقعت اُن کی تھی۔ الغرض، شیخ نے جب اسقدر التفات دیکھا، قدردان بادشاہ کی خاطر شکنی گوارا نہ کی، اپنے اہل و عیال کو وطن سے یہیں بُلا لیا اور رہنے لگے۔

تھوڑے دنوں کے بعد جب بحکم سلطانی احمد آباد بیدر بسایا گیا اور وہاں ایک عالیشان قصر شاہی بنا، شیخ نے اُس قصر کی تعریف میں یہ دو شعر کہے ؎

حبّذا قصر مشیّد کہ زفرط عظمت	آسمان پایۂ از سدۂ این درگاہ است
آسمان ہم نتوان گفت کہ ترک ادب است	قصر سلطان جہان احمد بہمن شاہ است

حسن اتفاق سے، شیخ آذری کے پیر بھائی، سید نعمت اللہ کے مرید ملا شرف الدین مازندرانی وہیں موجود تھے، ملا کو خوشنویسی میں ید طولےٰ تھا۔ ان دونوں شعروں کو، بخط جلی، ایک بڑے پتھر پر نہایت خوشخط لکھا۔ اور تلنگانہ کے مشہور سنگ تراشوں سے کندہ کر کے اُس پتھر کو قصر کے دروازے پر لگایا۔ شیخ کی خوش قسمتی سے ایک دن بادشاہ کی نظر اُس کتبہ پر جا پڑی، پوچھا "کس کے شعر ہیں"؟۔ شاہزادہ علاء الدین رکاب میں حاضر تھا، عرض کی "شیخ آذری کا کلام ہے" احمد شاہ بہت خوش ہوا۔ شاہزادہ کو شیخ سے دلی خلوص تھا، اس موقع کو غنیمت سمجھا، التماس کی کہ "شیخ کو بمقتضائے حب الوطن، وطن کی لو لگی ہے۔ اُنکا بیان ہے کہ اگر حضور سے رخصت مرحمت ہو تو نصف حج اکبر کا ثواب نذر دینے کو طیار ہیں"۔ بادشاہ ہنس پڑا، شیخ آذری کو بلوایا اور خزانچی کو حکم دیا کہ چالیس ہزار تنگہ سفید شیخ کے لئے حاضر کرو۔ تنگہ سفید ایک تولہ چاندی کے برابر ہوتا تھا۔ شیخ کی نظر جب ان تنگوں پر پڑی، بولے لَا تحمل عطایاکم اِلّا مطایاکم۔ (آپکی بخششوں کو نہیں اُٹھا سکتے مگر آپ ہی کے باربرداری کے جانور) بادشاہ متبسم ہوا، فرمایا کہ بیس ہزار تنگے راہ خرچ کیلئے اور دیے جائیں، پھر خلعت خاص اور پانچ پانچ غلام حبشی و ہندی مرحمت کئے اور اذن رخصت دیا۔ شیخ نے شکریہ میں، غضائری کے قصیدے کا یہ مشہور قطعہ پڑھا ؎

صواب کرد کہ پیدا نہ کرد ہر دو جہان	یگانہ ایزد داد ادب نظیر و ہمال
وگرنہ ہر دو جہاں الف تو بخشیدے	امید بندہ نماندے بہ ایزد متعال

شیخ آذری جب بارگاہِ سلطانی سے رخصت ہوئے، وعدہ کر گئے کہ زندگی بھر بہمن نامہ کا تتمہ لکھتا رہونگا۔ چنانچہ سال بھر تک جسقدر لکھتے، ہر سال وطن سے دکن بھیجدیا کرتے تھے۔ اگرچہ شیخ کی زندگی ہی میں احمد شاہ کا انتقال ہوگیا مگر یہ جب تک زندہ رہے اپنے وعدے پر قائم رہے۔ چنانچہ بہمن نامہ بہمنیہ کے گیارہویں فرمانرا: ہمایوں شاہ بہمنی کے زمانہ تک شیخ آذری کی تصنیف ہے۔ اُسکے بعد سے اختتام دولتِ بہمنیہ تک اور شعرا: نظیری و سامعی وغیرہ کے ملحقات ہیں۔

شیخ کے انعام سلطانی پانے کا حال، اس مضمون میں، تذکرۂ خزانۂ عامرہ، مصنفۂ مولٰنا سید غلام علی آزاد بلگرامی، سے لکھا گیا ہے۔ مگر اور اصحاب تذکرہ؛ شلاً دولت شاہ سمرقندی، حاجی لطف علیخاں آذر وغیرہ لکھتے ہیں کہ احمد شاہ نے ایک لاکھ دکنی روپیہ، کہ پچاس ہزار درم کے برابر ہوتا تھا، شیخ آذری کو بطور انعام دیا اور چاہا کہ شیخ شکریہ میں پادشاہ کو سجدہ کریں، مگر شیخ نے نہ انعام لیا نہ سجدہ کیا۔ دونوں روایتوں کے تطابق کے لئے یہ ممکن سمجھا جاسکتا ہے۔ کہ سجدہ نہ کرنے اور انعام نہ لینے کا واقعہ کسی اور موقع پر ہوا ہو، وقتِ رخصت نہوا ہو، کیونکہ اِن اصحابِ تذکرہ نے موقعِ انعام کا ذکر نہیں کیا ہے، اور انعام کی تعداد میں بھی فرق ہے۔

بہرکیف، اِس میں شک نہیں کہ شیخ کے مزاج میں حرصِ جاہ اور طمعِ دنیاوی مطلقاً نہ تھی، قناعت اور بے نیازی بغایت تھی۔ ایک اور موقعہ پر جس کا اکثر تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے، شیخ نے روپے واپس کئے ہیں:-

سلطان محمد بایسنقر نے جب عراق کا عزم کیا۔ شیخ آذری کی زیارت کو آیا۔ شیخ نے عدل و انصاف کے متعلق چند نصیحتیں کیں۔ بایسنقر کو نہایت اعتقاد ہوا براہ عقیدت تھیلی بھر اشرفیاں نذر دیں۔ شیخ نے قبول نہ کیا اور یہ شعر پڑھا ؎

زر کہ ستانی و برافشانیش	بہتر ازان نیست کہ نستانیش

القصہ شیخ آذری، ہندوستان سے وطن جاکر تیس ۳۰ برس تک خانہ نشین رہے۔ ۸۲ برس کی عمر پائی۔ اور ۸۶۶ھ ہجری میں انتقال کیا۔ خواجہ احمدی مستوفی نے یہ قطعہ تاریخ لکھا۔ ؎

دریغا آذری شیخ زمانہ	کہ مصباح وجودش گشتہ بی ضو
چراغ دل بمصباح حیاتش	بانوار حقائق داشت پرتو
چو او مانند خسرو بود در شعر	ازان تاریخ موتش گشت خسرو ۸۶۶

شیخ آذری "اسفرائن" میں، اپنی خانقاہ میں مدفون ہوئے۔ وفات کے سال، اپنی کُل املاک کو صلحا و زُہّاد و فقرار و طلبا کے مصارف کے لئے شیخ نے اپنی خانقاہ میں وقف کردیا تھا۔

شیخ کی تصنیفات:-

بہمن نامہ تا زمان ہمایون شاہ بہمنی، تاثیۃ الکبریٰ، جواہر الاسرار، سعی الصفا، ملغرای ہمایوں، عجائب الغرائب، عجائب الدنیا، عجائب الاعلیٰ، کلیات قصائد و غزل،

شیخ کے شاگردوں میں طالب جاجرمی مشہور شاعر گزرا ہے۔ طالب نے اکثر شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی غزلوں پر غزلیں جواباً لکھی ہیں۔ مناظرۂ گوے وچوگان ایک مثنوی بھی اُسنے اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ جسکو شیراز میں تصنیف کرکے عبداللہ بن ابراہیم سلطان کے نام سے معنون کیا ہے۔

افسوس کہ یہ رشید شاگرد، اُستاد کی زندگی ہی میں سنہ ۸۵۴ ہجری میں مرگیا۔

شیخ آذری کے معاصرین:۔

خواجہ فخرالدین اوحدی مستوفی، مولنا حسن سلیمی، امیر شاہی، مولنا علی شہاب ترشیزی وغیرہ تھے۔

ازانجملہ علی شہاب ترشیزی اور شیخ آذری میں اکثر مناظرہ و مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دن شیخ نے یہ رباعی لکھکر مولنا علی شہاب کو بھیجی ؎

سر دفتر ارباب ہنر خواجہ علی ست	ای آنکہ ترا لطفِ طبیعت ازلی ست
خواہی تو مرا پسند و خواہی مپسند	داند ہمہ کس کہ حمزہ اُستادِ علی ست

حمزہ، شیخ آذری کا نام تھا۔ مولنا نے جواب میں یہ رباعی لکھی ؎

اے حمزہ بدانکہ عرشِ حق جای علی ست	بر کتفِ رسول از شرف پای علی ست
اُستادِ علی ست حمزہ در جنگ، و لے	صد حمزہ بعلم و فضل لالای علی ست

ہرچند مولنا کی یہ رباعی نہایت خوب ہے، مگر چونکہ اُن کا نام علی تھا اور اپنی طرف کنایہ کیا ہے۔ اسلیئے سوءِ ادب سے خالی نہیں ہے۔ برخلاف اِس کے شیخ آذری کی رباعی میں جو ایہام ہے، اُس میں یہ رکاکت نہیں ہے۔

شیخ آذری کے چند اشعار یہ ہیں:— از قصیدہ

ای برون از عقل ما عشقِ ترا رائے دگر	گفتگوی ما ہمہ جائے و تو جائے دگر
صد ہزاران گنجِ اِلّا اللہ داری در وجود	اژدہای لاست بر ہر گنج اِلّاسے دگر
ہست در میدانِ میقاتِ کمالِ کبریات	صد ہزاران طور و بر ہر طور موسائے دگر
گر بقدر ہمتِ عشاقِ خود سازی مقام	برتر از جنّت بباید ساخت ماوائے دگر
ہر کسے را از تو در جنّت تماشائے بود	ما نمی خواہیم جز رویت تماشائے دگر
باخریداران بہا کن باغِ جنّت را کہ ہست	مفلسانت را درین بازار سودائے دگر

نعمتِ خوانِ کرم بہ ہر کہ خواہی عرضہ کُن
صوفیانہ است ازین خوان ذوقِ حلوائے دگر

نیست عنقائی حزو را در قدم راہے کہ ہست
در پسِ قافِ قدم ہر گوشہ عنقائے دگر

گر چنین ستان ببازارِ قیامت بگذریم
بر سرِ ہر کو برانگیزیم غوغائے دگر

از غزلیات

نہ بُد ہنوز درِ خلوتِ ازل مفتوح
کہ دستِ عشقِ تو میزد در سراچۂ روح

خمارِ شامِ عدم در دماغِ جانہا بود
کہ ریخت مہرِ تو در جامِ مے شرابِ صبوح

لبِ حسد نمکِ روح ناچشیدہ ہنوز
کہ بود شورِ تو در سینۂ و دلِ مجروح

بہ آبِ سیکدہ زان پیشتر کہ غسل کنیم
بدستِ عشقِ تو کردیم توبہائی نصوح

گہی بیادِ تو طوفان زا ذرمی برخاست
کہ بود غرقۂ بحرِ عدم سفینۂ نوح

ایضاً عاشقانہ

جانے کہ داشت کرد فدای تو آذری
شرمندہ از تو گشت کہ جانے دگر نداشت

اشکباریِ فراق کا اظہار کس لطیف پیرایہ میں کرتے ہیں:-

بہ چشمِ آذریِ خویش در نمی آئی
ترا کہ گفت تماشائے جویبار مکن

کم رتبہ آدمی کی بھلائی برائی پر نظر نہیں کی جاتی، اس مضمون کو یوں باندھا:-

زمہولِ روزِ شمار آذری چہ میترسی
تو کیستی کہ دران روز در شمار آئی

ذرا سی تکلیف کے خیال سے جو ڈرتا ہے اُسکا مقصد حاصل نہیں ہوتا اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں:-

آذری! از گلِ این باغچہ بوئے نہ برند
نازکانے کہ ز آزردنِ خار اندیشند

ہر چیز کا فیصلہ روزِ ازل ہی میں ہو چکا ہے، کوئی بات سرنوشتِ ازل کے خلاف نہیں ہو سکتی، اسکو فرماتے ہیں۔

کہ داند تا قلم چون رفت در ردّ و قبولِ ما!	ہمہ از انتہا ترسند و من از ابتدا ترسم

ہر بات خدا کے اختیار میں ہے، کوئی کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

گر خصم بے شمار شود، آذری، مترس	آن کس کہ جان ستاند و جان میدہد یکی ست

دوستوں سے محبت ایسی رکھنی چاہئے کہ مرنیکے بعد وہ اور زیادہ قدر کریں۔

خوش حیاتیست کسے را کہ پس از جان دادن	دوستان بر سرِ خاکش بہ زیارت آیند

قطعہ فی الموعظہ

ز حکمت بیاموز ست نکتۂ	کہ در ہر دو عالم شوی سرفراز
لباسِ طریقت چو در بر کنی	ز ذلت مرنج و بہ عزت مناز

ہجو

اینیائی کاتب، شیخ، کا دیوان لکھتے تھے، اکثر مقام میں کتابت میں غلطی ہو گئی تھی، شیخ نے غلطیاں دیکھیں، نہایت رنجیدہ ہوئے، اور یہ قطعہ فرمایا ہے

دیوانِ بندہ را کہ اینیا سواد کرد	تنہا درونہ شعرِ مجدّد نوشتہ است
از نظم و نثر ہر چہ بطبعش خوش آمدہ	دیوانِ بندہ پُر ز خوشامد نوشتہ است
ہر جا کہ لفظ دید، مثلاً دید در سخن	دست تصرفش ہمہ را ابد، نوشتہ است
اکنون شریکِ مہترِ دیوان بندہ او ست	زیرا کہ بیشتر سخن خود نوشتہ است

خاکسار
محمد ریاض حسن خیال
رسول پور ضلع مظفر پور۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۰۷ء

زندگی

ازمولوی حامد حسن صاحب قادری متوطن بچھراؤں ضلع مرادآباد

[یہ خیالات مینے ایک انگریزی نظم میں دیکھے تھے انکو کچھ تصرف کرکے اردو نظم کا جامہ پہنا دیا ہے]

حامد حسن قادری

اے زندگی عجیب ترا رنگ ڈھنگ ہے — دنیا کی عقل تیرے سمجھنے میں دنگ ہے

اے زیست سچ ہے تجھ میں تماشا عجیب ہے — شادی بعید تجھ سے ہے اور غم قریب ہے

اے زندگی تماشے ہیں تجھ میں ہزار ہا — انداز اور کرشمے ہیں تجھ میں ہزار ہا

اے زندگی ہر ایک ترا کام ہے نیا — آغاز سے ہے جو طرفہ تو انجام ہے نیا

لیکن جو کوئی تیری حقیقت کو پا گیا — وہ دو جہاں کی نعمت و راحت کو پا گیا

سمجھا نہ جسنے تجھ کو وہ نادان ہی رہا — دنیا کے رنج و غم سے پریشان ہی رہا

جب تک نہ کوئی زیست کے رنج و الم سہے — دنیا کے گرم و سرد کا دکھ اور غم سہے

جب تک پڑے نہ سابقہ خوف و ہراس سے — جب تک نہ کچھ ہو واسطہ امید و یاس سے

جب تک نہ گزریں تیرے تماشے نگاہ سے — جب تک نہ گزرے کوئی ترے غم کی آہ سے

جب تک نہ دیکھے تیرے نشیب و فراز کو — ممکن نہیں کہ جان سکے تیرے راز کو

ممکن نہیں کہ چین ملے غم سہے بغیر — شادی نہ ہوگی کلفت ماتم سہے بغیر

برداشت دکھ کرو تو ہے سکھ کی امید بھی — کوشش کرو تو وید کی ہو تمکو دید بھی

صدمے سہو تو نام بھی ہوگا جہان میں — محنت کرو تو پاس بھی ہو امتحان میں

کوشش کرو جو کھودنے میں دل سے جان سے — کچھ شک نہیں کہ لعل نکالو گے کان سے

غوطہ لگا نہیں جو مشقت اُٹھاؤ گے — اسمیں نہیں ہے شک دُرِ یکتا بھی پاؤ گے

سچ تو یہ ہے کہ شادی و غم ساتھ اگر نہ ہوں
دن زندگی کے لطف سے ہرگز بسر نہ ہوں

ایذا نہو تو عیش کی راحت کی قدر کیا
راحت اگر نہو تو مصیبت کی قدر کیا

دنیا میں شادماں ہی اگر ہر گھرانہ ہو
اور غم کے نام تک سے کوئی آشنا نہو

دنیا کے نیک و بد سے کسی کو خبر نہ ہو
شادی و غم کے فرق سے واقف بشر نہ ہو

گر مبتلائے رنج و الم اک جہان ہو
مفقود انبساط کا نام و نشان ہو

لطف خوشی سے کوئی بشر بہرہ ور نہو
دلپر کسی کے شادی و غم کا اثر نہ ہو

ممکن نہ ہو تمیز امیر و فقیر میں
فرق آئے کارخانۂ ربِّ قدیر میں

اے زیست اسلئے نہیں تو ایک حال پر
ہے تو کمال پر تو کہیں ہے زوال پر

سلطان اپنے حال میں ہے مست و شادماں
درویش اپنی کھال میں ہے مست و شادماں

اے زیست الغرض تری حالت عجیب ہے
غم ہے ترا عجیب مسرت عجیب ہے

حامد حسن قادری از بچھراؤں ضلع مرادآباد۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ پنجاہ سالہ دہلی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۷ء تک

*

اپنا عرضِ حال۔

میں دہلی میں پانچ پیڑھی سے رہتا ہوں، اس میں شاہانِ تیموری کی اولاد کی تعلیم و تربیت کا شرف میرے آباؤ اجداد کو حاصل رہا ہے، یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اپنے اس خاندان میں اور دنیا کے اس بڑے نامور شہر میں پیدا ہوا اس میں پلا۔ بڑا ہوا بوڑھا ہوا۔ ہر آدمی کو جو بڑے شہر میں پیدا ہونے سے فائدے

حاصل ہوتے ہیں وہ تھوڑے بہت مجھے بھی حاصل ہوئے، اسکی آب و ہوا نے کبھی کسی مرض کے اُلجھیڑے میں پھنسایا نہیں، ساری عمر صحت کامل عطا کر کے زندہ دل و خوش باش تازہ و توانا رکھا، چھتر (۷۶) برس سال کی عمر میں مُردہ دل نہیں بنایا، نہ کسی ہوش و حواس میں خلل آنے دیا۔ اسی کے کالج مرحوم کے بے مثل و بےنظیر اساتذہ کامل پروفیسر رامچندر اور مولوی امام بخش صہبائی کی شاگردی سے علوم ریاضیہ و طبعیہ و ادبیہ سے کچھ آشنا ہوا۔ اسی کی اردو زبان نے میری یہ یاوری کی کہ میں نے ایک سو چھپن کتابیں اور رسالوں اور اخباروں میں صدہا مضامین یہ سب تقریباً ساٹھ ہزار صفحوں میں چھپوا کر شائع کئے۔ منجملہ اُن کے دلی کے سلاطینِ اسلام کی تاریخ ہے، جسکے بغیر ایشیا کی تاریخ جسم بے جان و پوست بے مغز ہے۔ چھ سات ہزار صفحے اسکے سیاہ کئے اور اُسکے غدر ۱۸۵۷ء کی تاریخ جسکے بدون تاریخ بغاوتِ ہند تن بے سر و سرِ بے مغز ہی، تحریر کی، جسکے صدہا صفحے ہیں۔ اسیکی بود و باش نے یہ ہمت بندھوائی کہ اس عمر ہفتاد و پنج سالہ میں کرزن نامہ کو لکھکر اپنی تاریخ برٹش انڈیا کی اُسکی ابتدا سے ۱۹۰۵ء تک تکمیل کی، جسکے پانچ ہزار کئی سو صفحے پہلے لکھ چکا تھا، جس میں، میں نے بڑے بڑے مؤرخوں کی مستند و معتبر تاریخوں سے مضامین اخذ کر کے اپنی زبان میں نقل کئے تھے۔ اب میں اپنے وطنِ عزیز کی تاریخ بچشمِ خود دیدہ لکھتا ہوں، کہ غدر ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۰۷ء تک پچاس سال کے اندر دلی کے ہر طرح کے حالات میں غدر کے سبب سے کیا خاص انقلابات اور زمانے کے اقتضا سے کیا تمام تغیرات واقع ہوئے کہ جسکے سبب سے پرانا شہر نیا شہر ہوگیا۔

اگرچہ یہ تغیرات ایسے واقعاتِ عظیمہ نہیں ہیں کہ وہ کوئی بڑی تاریخی وقعت رکھتے ہوں لیکن وہ دنیا کے ایک مشہور نامور شہر کے واقعات ہیں جو ہرگز فراموش نہیں ہونے چاہئیں، بڑوں کی چھوٹی باتوں کو بھی نہیں بھولنا چاہئے اُن کی چھوٹی باتوں میں بھی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ ہر تغیر کے ساتھ ایک تمہیدی مضمون لکھا ہے، جس سے چھوٹی بات

بھی بڑی بات ہوگئی ہے ۔ یہ مضامین تغیرات کی اصل کو قوانین نیچر کے موافق بتاتے ہیں، یا عجب طرح کی آگاہی دیتے ہیں۔ مجھے اس تاریخ کے لکھنے میں بڑی آسانی تھی، کہ کورا کاغذ سامنے رکھا تھا، قلم ہاتھ میں اور دوات قلمدان میں تھی، واقعات دماغ میں تھے۔ بغیر کسی کتاب کے مطالعہ کی محنت اٹھانے کے بلا تکلف لکھتا چلا گیا اور اپنے دل کو خوش کرتا گیا کہ میں اپنے وطن کا حق ادا کر رہا ہوں، جو مجھ پر واجب الادا تھا۔

اس تاریخ کو تین[۳] بابوں میں تقسیم کیا ہے، اوّل[۱] باب میں اسکے فزیکل یعنی مادی تغیرات لکھے ہیں، جسمیں اسکی عمارات اور سڑکوں و نہروں وغیرہ کے حالات بیان کئے ہیں کہ غدر سے پہلے ان کی صورت کیا تھی اور اب کیا ہے۔ باب[۲] دوم میں۔ پولیٹکل یعنی گورنمنٹ کے انتظامات مالی و دیوانی و فوجداری کے تغیرات کہ پہلے کیا تھے اور اب کیا ہیں۔ باب[۳] سوم میں مورل یعنی اخلاقی و تمدنی و معاشرت کے تغیرات کہ پہلے کیسی تعلیم و تہذیب و اخلاق و اوضاع و اطوار تھے اور اب کیسے ہیں۔

باب اوّل

(فزیکل یعنی مادّی تغیرات)

غدر کا پہلا تغیر کہ جسنے شہر کا نام شاہجہاں آباد اڑا دیا ۔

※

غدر کے تغیرات کی پہلی بسم اللہ یہ تھی کہ اُسنے شہر کا نام شاہجہاں آباد حرف غلط کی طرح حک کر دیا۔ جو شخص سکا قائل نہیں وہ عاقل نہیں کہ دلی دنیا کا ایسا مشہور شہر ہے کہ جسکے ہم عمرو ہم عصر روے زمین پر چند ہی شہر زندہ ہونگے کہ انقلابات دہر نے انکو مردہ نہ کیا ہوگا۔ اسی شہر میں یہ اعجاز و سحر ہے کہ وہ بوڑھا ہوکر پھر اپنے تئیں جوان بنالیتا ہے۔ جب کبھی انقلابات اور حادثات روزگار کی کالی گھنگھور گھٹا نے اسکے رُخ روشن پر تاریکی کی نقاب ڈالی تو اُسکے آفتاب اقبال نے نصف النہار پر چمک کر اپنی تیز شعاعوں

سے اُسے چیر پھاڑکر پرے ہٹا دیا - جیسا مہر و ماہ پرکسوف وخسوف لگنے سے داغ نہیں لگتا ایسے ہی اِسپر آفات کے نازل ہونے سے کوئی دھبا نہیں پڑتا - جیسا آفتاب نئے نئے موسموں کی بہار دِکھانے کے لئے اپنے برجوں میں مقامات بدلتا ہے اور اسکی رفعت و اعتلا میں ذرا فرق نہیں آتا ایسے ہی دہلی اپنے مکانات بدل بدل کر اپنی نئی نئی بہاریں دِکھاتی ہے اور اپنی شان وشوکت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی - جب آفات عظیمہ اسکو اپنی جگہ پر ستاتی ہیں تو وہ اپنے ہمسایہ میں تھوڑی دُور کھسک کر پھر آباد وشاد بیٹھ جاتی ہے -

اُسکی اِس قدامت کو دیکھئے کہ وہ راجہ یدھشٹر کی راجدھانی تھی اپنا پیارا نام اندرپرست رکھتی تھی جب وہ اندر کی استھان تھی تو اندر کا اکھاڑا اور سرگ کیوں نہو گی پھر اُسنے ہندوؤں ہی کے راج میں اپنا نام اندرپرست سے بدلکر دِلّی رکھا - ہندوؤں کی پرانی سنسکرت کی پستکوں میں جو دِلّی کے اوصاف لکھے ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا باقی نہیں رہا جو اُسکی بزرگی اور تقدس کو یاد دِلاتا ہو - مرورِ دہور نے اُن سب کو مٹا دیا نہ ہندوؤں کی کوئی شاہانہ عمارت ایسی ہے کہ وہ اُنکی سلطنت کی صولت وسطوت کو دکھائے ، نہ کوئی اُنکا مندر و تیرتھ ایسا ہے کہ اُن کے مذہب وملت کی شان وعظمت بتلائے - صرف ایک راے پتھورا کے قلعے کے کھنڈر باقی ہیں جو اپنی استواری گونگی کو گنگی زبان سے بتلاتے ہیں (اِس قلعہ کے نام پر مجھے اپنے اُستاد صہبائی مرحوم کا یہ کہنا یاد آگیا کہ خاقانی وانوری کا کلام متانت میں راے پتھورا کا قلعہ ہے اور نظیری وعرفی کا کلام نزاکت میں لال قلعہ ہے) دوسرا نگم بودھ کا گھاٹ ہے جو کبھی کسی زمانے میں وید پڑھنے کے لئے ویدکے وِدھیارتیوں کا پاٹ شالا تھا ، اب وہ مرگھٹ میں مُردوں کے لیجانیکا راستہ بتلاتا ہے ، کبھی اِس میں ہوم کے شعلے اُٹھتے ہونگے جس سے ہندوؤں کے دل روشن ہوتے ہونگے - اب اُس میں مُردوں کی ہڈیوں کے

دہنوئیں اُٹھتے ہیں جو آسمان کو سیاہ رو بناتے ہیں۔ کبھی وہ تیرتھ تھا جاتری آتے ہونگے
اب تو وہ تیرتھ مانا نہیں جاتا مگر اتبک یہ اُسکے تقدّس کا اثر ہندوؤں کے دلوں میں چلا
جاتا ہی کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ مُردہ یہاں تھوڑی سی لکڑیوں میں جلکر خاکستر ہو جاتا ہے اور وہ
بیکنٹھ میں سیدھا چلا جاتا ہے۔ سوم نیلی چھتری ہے وہ کوئی پرستش گاہ نہیں ہے وہ
جمنا کے کنارے پر ہے ۱۹۰۰ء میں جسکے خوشنما پتھروں کے لئے ڈائرکٹر آرکیولو
جی کل کی یہ تجویز تھی کہ وہ اُکھڑ کر میوزیم کلکتہ میں رکھے جائیں، لیکن اُسکے اندر مندر رکھا۔
اِسلئے ہندوؤں نے پتھروں کو اُکھڑنے نہ دیا جو اُکھڑے ستھے اُن کو واپس لیکر پھر جموا دیا
یہ جمنا کے دیکھنے کیلئے نہیں ہے بلکہ پوجنے کے لئے۔ مگر وہ دہلی سے کچھ مخصوص نہیں ہے
اسکا تو سارا طول اوّل سے آخر تک پُجتا ہے۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہی کہ متھرا و بنارس
کی طرح دلّی میں ہندوؤں کا نہ کوئی مندر رہے نہ کوئی تیرتھ ایسا ہی کہ وہ انکا قبلہ و کعبہ بنتی
اور دُور دُور ملکوں سے جاتریوں کو بلاتی اِس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہاں پر سری کرشن نے
جنم نہیں لیا کہ وہ متھرا پوری کیطرح پجتی وہ شیوجی کی پوری بھی نہ تھی کہ کاشی جی بنکر پرستش گاہ
بنتی۔ اب تو وہ تجارت کا تیرتھ ہے کہ ہندو تاجر اسکے نار نبکر دُور دُور سے آتے ہیں
بجائے اسکے کہ اُسپر کوئی نذر بھینٹ چڑھائے خود نذر بھینٹ اُس سے لے جاتے ہیں۔

جب دلّی میں سے ہندوؤں کا راج گیا تو اُن کی جگہ مسلمان براجے اُن کے
جے جے کارے مدّتوں تک پکارے گئے اُن کی وہ دار السلطنت بنکر سارے ہندوستان
کی دل بنی۔ جیسے دل کا اثر سارے جسم میں استیلا رکھتا ہے ایسا ہی دِلّی کا اثر کل ہند
میں استعلا رکھتا تھا وہ دار السلطنت کے علاوہ اُنکی دار العلم بھی بنی جسکی تہذیب و تعلیم کی
شعاعوں نے سارے ملک کو منوّر کیا۔ اِس میں نئے نئے بادشاہوں اور شہنشاہوں
نے اپنے ساخت نئے نئے دار السلطنت بنائے۔ اور اُن میں اپنے عظیم الشان قلعے اور
رفیع المکان قصر و محل بنائے جنکے نئے نئے نام یہ مشہور ہوئے۔ کلوکھیڑی۔ فیروز آباد۔

تیسری - جہاں پناہ تغلق آباد - مگر یہ سب اُجڑ اُجڑ اکر ویران ہوئے۔ ۵۴ میل کے رقبے میں جابجا اُن کی عمارات کے کھنڈر زبانِ حال سے یہ شعر پڑھ رہے ہیں ۔

بوم نوبت میزند بر گنبد افراسیاب		پردہ داری میکند بر قصر قیصر عنکبوت

ان سب شہروں کی بربادی کی مکافات یہ ہوئی کہ اُنکی جگہ پہلے سب شہروں سے زیادہ باشان و شکوہ شاہجہاں آباد آباد ہوا جس کے بِنا کی تاریخ اور اُسکے بانی کا نام اِس مصرعہ سے معلوم ہوتا ہے ع - شد شاہجہاں آباد از شاہجہاں آباد - (۱۰۶۰ھ / ۱۶۵۰ع) اسکی تعریف میں یہ شعر زبان زدِ خلائق ہوا -

	کہ او در شاہجہاں آباد باشد		کسے را زندگانی شاد باشد

گو اس شہر پر کئی دفعہ سخت حادثات واقع ہوئے مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا نہ ٹلا نہ اُجڑ کر پُرانی دِلّی بنا - شاہ عالم شہنشاہِ دہلی کے زمانے میں اسیرِ فلاکت اور نکبت کے ایسے آثار نمودار ہوئے کہ سودا نے اسکے حسبِ حال شہر آشوب لکھا - جسکا ایک بند نیچے لکھا جاتا ہے -

مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا		جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا		کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا

کہ جسکی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

اسی بادشاہ کے عہد میں خاندانِ تیمور کی بھی سلطنت سدھاری - اِسکی جگہ ۱۸۰۳ء میں انگریزی عملداری آئی - اگرچہ وہ زیب و زینت اور رونق جو شاہانِ سلف کے زمانے میں حاصل تھی اِسوقت جاتی رہی مگر اسکی بجائے انگریزی عملداری آنے سے زیادہ معاوضہ اُٹھا جان و مال کی حفاظت اور منصفانہ طریقہ کی حکومت کا ملا - سچ پوچھو تو اِس عملداری سے شاہجہان آباد کے بھاگ جاگ گئے کہ لُوٹ کھسوٹ اِسمیں سے گئی، عافیت و راحت آئی - گئی ہوئی رونق پھر اُسمیں آنی شروع ہوئی، معلوم نہیں کسکی نظر اُسکو کھا گئی کہ ستمبر ۱۸۵۷ء

میں غدر کا طوفان وہ برپا ہوا کہ سودا کا شہر آشوب اُسکے حسبِ حال ہوا۔ میں اُسکے ایک ایک بند کو پڑھتا تھا اور اپنے شہر کے حسبِ حال پاتا تھا۔ اِس غدر نے ایسے شہر کو ایسا برباد کیا کہ کبھی پہلے برباد نہیں کیا تھا۔ جب ستمبر ۱۸۵۷ء میں پھر انگریزی عملداری آئی ہے جسنے اُسکے سارے باشندوں کو اُنکا سارا اسباب لُوٹ کر شہر بدر کیا، اُنکے پاس سوا ایک بنی اور دو گوش کے کچھ اور نہ تھا۔ سب عورتیں بچے پامالِ مرگ ہوئے، بہتسے مرد پھانسیوں پر چڑھے، بہتسے گولیوں سے مرے مگر قاعدہ ہے کہ ہر قہر کا خاتمہ مہر و رحم پر ہوتا ہے۔ سر جان لارنس ہیں جنکے اہتمام و انتظام سے شاہجہان آباد فتح ہوا اُن ہی کے دل میں خدا نے ایسا رحم پیدا کیا کہ اُنھوں نے اپنے لطف و کرم سے اُسکے دوبارہ بسنے کا حکم دیدیا اور اپنی قوم کو سمجھایا کہ تم جو دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجانی چاہتے ہو، یہ سمجھو کہ خدا نے جیسا ہم پر رحم کیا ہے کہ گئی ہوئی سلطنت کو دلا دیا ہے ایسا ہی رحم تم دِلّی والوں پر کرو اُنھوں نے دِلّی کو اُجاڑ کر پُرانی دِلّی نہیں بنایا کہ اُسمیں بڑے کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے جنمیں اُلّو بولتے، چمگادڑیں بیٹ کرتیں، ابابیلیں بولتیں، درندے اپنے بھٹ بناتے، اِسطرح شہر تو آباد ہو گیا مگر اُسکا نام شاہجہان آباد مٹ گیا۔ پہلے اہلِ شہر اپنے تئیں ساکنِ شاہجہان آباد کہتے تھے، یہی نام دستاویزوں میں لکھاتے تھے۔ اب اُنکی اولاد کو یاد بھی نہیں کہ ہمارے باپ دادا اپنے وطنِ مالوف کو شاہجہان آباد کہتے تھے، میں خود اپنے تئیں غدر سے پہلے ساکنِ شاہجہان آباد کہتا تھا۔ غدر کے بعد میں نے پھر یہ نہیں کہا کہتا کس سے کوئی اُسے سمجھتا بھی نہ تھا۔ دہلی کا اِطلاق مدتسے کسی شہر پر نہ ہوتا تھا ملک کے ایک حصے پر ہوتا تھا۔ شہر کے باہر سارے پُرانے دار السلطنت پُرانی دِلّی کہلاتے تھے انگریزی عملداری میں اِسکا اطلاق ضلع پر ہوتا تھا۔ عدالتوں کی چپراسوں اور مہروں پر دہلی کا نام کندہ ہوتا تھا۔ گزٹ میں حکّام کا تقرر تغیُّر تبدُّل دہلی کے نام سے ہوتا تھا۔ غرض مسلمان دِلّی کا نام مٹا کے کوئی مسلمانی نام اسکا ہمیشہ کیلیئے قائم نہ کر سکے مگر اسکے نام میں بار ہا ہوتز بڑھا کے دِلّی کو دہلی بنایا یہ اُنکے تصرف کی یادگار ہے۔ دِلّی کے آدمی اپنی نادانی و نخوت سے اپنے

سر پر چاروں طرف سے آفتیں لاتے ہیں اور اُن سے نکلنے کا رستہ نہیں رکھتے۔ نادر شاہ کے زمانہ میں اُسکے قتل
ہونے کی جھوٹی خبر اُڑائی اور اُسکے قزلباش سپاہیوں کو جنکو اپنی محافظت کیلئے متعین
کرایا تھا قتل کر دیا جسکے سبب سے اپنا قتل عام کرایا۔ غدر میں اپنی نادانی سے باغیوں کے ساتھ
شریک ہوکر اپنا شہر دھڑی دھڑی لٹوایا مگر اس نادانی کیساتھ انکی عقل و ہنرمندی بھی ایسی ہی
کہ وہ اپنے اُجڑے دیار کو پھر ایسا آباد کر لیتے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہی کہ وہ اُجڑا ہی نہیں تھا۔

برٹش گورنمنٹ نے اِس شہر کو اپنا دار السلطنت و صدر مقام و مرکز نہیں بنایا کہ اسمیں وہ رونق و شان
و شوکت پیدا ہوتی جو دار السلطنتوں میں ہوا کرتی ہی مگر اسکو دار التجارۃ ایسا بنا دیا کہ وہ اب بھی ہندوستان
کے نامور شہروں میں شمار ہوتا ہی۔ بادشاہ کو کسی شہر کا دار السلطنت بنانا ایسا دشوار نہیں جیسا کہ دار التجارۃ
بنانا۔ دار السلطنت تو صرف اُسکے حکم دینے سے اور اُسمیں اپنی سکونت اختیار کرنے سے اور عالیشان
محل و قصر بنانے سے بن جاتا ہی مگر دار التجارۃ بنانے کے لئے اُسکو بڑے سامان تیار کرنے پڑتے ہیں۔ دہلی
جب دار التجارۃ بنی ہی کہ اُسکو اوّل ریلوں کا مرکز بنایا ہی۔ اُسمیں سات لینیں چلتی ہیں اور اُسکی بہت سڑکوں
کو درست کیا ہی، دریا کے پلوں کو بنایا ہی، اور بہت سے سامان جمع کئے۔ اب اسمیں دولت تاجروں
کے گھروں میں اتنی جمع رہتی ہی جتنی کہ پہلے پادشاہی کے خزانوں اور امیروں کے گھروں میں، ریل کے اسٹیشنوں پر
اتنے روپے کا مال اسباب پڑا رہتا ہی کہ اسمیں دو تخت طاؤس شاہجہانی بنتے ہیں۔ تجارت کی گرم بازاری
نے آٹھ سات بنک اور پندرہ بیس ملیں جاری کرا دی ہیں۔ گو شاہجہان آباد دار السلطنت نہیں رہا
اور اُسکا نام بھی مٹ گیا کہ کسیکی زبان پر نہیں آتا مگر اُسکی زبان اقلیم سخن میں ایسی کرّ و فر سے فرمانروائی کر رہی ہے
جیسے کبھی اسکے شہنشاہ ملک پر فرمانروائی کرتے تھے۔ ہندوستان میں ایک سو چھ[۱۰۶] زبانیں بولی جاتی ہیں
مگر کوئی زبان اسکی زبان کی برابر نہیں بولی جاتی۔ ہندوستان کی ہر سمت میں کوئی شہر ایسا نہ ہوگا کہ اُس میں اِس
زبان کے سمجھنے والے اور بولنے والے نہ ہونگے۔ اُردو ہی جسکا نام ہم ہی جانتے ہیں داغ ÷ ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہی
گو شاہجہان آباد کے بادشاہوں کی ٹکسالوں کے سکوں کا کہیں پتا نہیں مگر اسکی زبان کے ٹکسالی سکوں کا رواج
سارے ہندوستان میں ہی وہی سب سے زیادہ کھرے اور بیش بہا سمجھے جاتے ہیں۔

ذکاء اللہ۔

علیگڈہ کالج کی یاد

جن دنوں گلزار کالج میں کہ تھا اپنا گذر	۱	کیا کہیں کس لطف سے ہوتی تھی واں اپنی بسر
گرم و سردِ دہر کی کچھ بھی خبر ہمکو نہ تھی	۲	رہتے تھے آرام و آسایش سے بےخوف و خطر
پلتے تھے گودوں میں ہر دم رہبرانِ قوم کی	۳	کیا کہیں ہم ہائے کسکی لگ گئی ہمکو نظر
ناصحِ مشفق کی تقریریں ادب آموز تھیں	۴	راہ سیدھی سے بھٹک کر پانوں پڑتا تھا اگر
بلبلِ رنگیں نوا کیطرح ہم تھے نغمہ سنج	۵	بیٹھتے تھے دوستوں سے ملکے جب باہمدگر
شام کی دلکش نشستیں صبح کے وہ مشغلے	۶	کچھ تو بتلا ہمنشیں وہ کیا ہوئے شام و سحر
شوقِ علم اب بھی ہے لیکن وہ کتبخانہ کہاں	۷	رات دن جسکی کتابیں رہتی تھیں پیشِ نظر
شب کو وہ پرجوش بحثیں یونین کی اب کہاں	۸	چھٹ گئیں ہم سے کہ گویا خواب تھا وقتِ سحر
ساری دنیا کی کبھی خبروں پہ رہتا تھا عبور	۹	اب یہ عالم ہے کہ اپنی بھی نہیں ہمکو خبر
اب کہاں وہ جلسۂ احباب اور انگلش ڈنر	۱۰	ایک کالج کیا چھٹا گویا چھٹے سب سیر
چھٹ گیا وہ دلکشا گلزار ہم سے ناگہاں	۱۱	بن گئے آشفتہ دل اور ہو گئے شوریدہ سر
کیا کیا اے چرخ ہم اس جور کے قابل نہ تھے	۱۲	جی بھی بھر کر دیکھنے پائے نہ تھے اُسکو مگر
لا پھنسایا ایسے بیگانوں میں ظالم کیا کیا؟	۱۳	ہو گئی جنمیں سراسر زندگی اپنی بتر
ہم سمجھتے تھے یگانہ جنکو اپنے ذہن میں	۱۴	اُنمیں بھی پایا نہ کچھ قومی اخوت کا اثر
عالموں سے اُنکو نفرت لیڈروں سے سوءِ ظن	۱۵	یہ وتیرہ ہو گیا ہے پڑھ کے سب علم و ہنر
گرچہ ہے دعوائے اسلامی و لیکن با ایں ہمہ	۱۶	تختۂ مشقِ ستم اسلام ہے المختصر
پاسِ غیرت اور حمیت نام کو جنمیں نہ ہو	۱۷	الحذر از صحبتِ آن مہربانان الحذر
وائے بر ما گر نباشد درد در دلِ ما عشقِ قوم	۱۸	وائے بر چشمے کہ تر باشد نہ از خونِ جگر
یا خدا آباد وار آن کالجِ ملجائے قوم	۱۹	باد دائم برقرار آن مہدیِ شیدائے قوم

فخر الدین احمد سیوہاروی

the Native States could not stop them. The Birtish troops followed Chitoo defeating his men severally, he was near to being caught, when he was devoured by a tiger, while he was hiding himself in a den to escape the British troops.

There was peace for a time, but Karim Khan being intelligent and tactful, again collected these men round him and performed similar atrocities. He was born at Berasya a village near Bhopal; his father died when he was eight years old. He lived with his uncle till the time when he was employed by a Scindhia and afterwards by a Holkar. Being intelligent and daring he was asked by Amir Khan to join him. Subsequently he married a lady of that branch of Bhopal which settled at Ruthgarh. He was however taken prisoner by the English troops and confessed all that he had done before the Resident. He was pardoned and sent to a village near Gorakhpore, which was given to him by the English. His followers had meanwhile spread themselves and formed into small bands who are known as Thugs and Dacoits. There are certain out of the way and remote places, where even, now, these men are found. Of course they are not so cruel and daring as their forefathers were. Special arrangement is made for the extermination of these men by the Government which is known by the name of Thugs and Dacoits Department. Let us hope that in the near future there will be no such people at all.

———:o:———

C. C. M. Press, Cawnpore.

leaders kept their agents in the different districts. Whenever an expedition was intended, these agents spread the news. The people, having no homes, readily joined the few Pindari bands as their expedition progressed, so their number progressed, because the Pindaries in the words of Melcom 'fed upon their own carcasses.' People, who have been looted joined them, because in this way only, they could save what they possessed. Before starting on an expedition, these men, superstitiously consulted the auguress or omens. If unfortunately, the omen was bad they abandoned the scheme, even if the enemies were before them and if, by chance, the omen were bad, they would never raise their hands—not for life ; disregard of an omen was considered as sacriligious. As their number increased capable leaders also came forward. They regularly divided the people in durrah or camps under the leadership of other less capable men. The tactics of warfare were unknown. Daring and valour were their only military assets. They attacked with fury because they had a double motive, firstly greed after plunder, secondly a a passion for distinction in battle which their leaders readily recognized. Urged no by these two motives, nothing on earth could daunt them. Another thing of interest is that they had no recognized leader except in their last days, when they had become unwieldy in number. They placed themselves under "*Lubberias*" "who were not selected for each expedition." The Lubberias marched in front and and may be compared to Harawal of the Rajputs. *i. e.* Vau. When an expedition was made, the Lubberia's moving out with his standard was a sign for march.

They had no tents, no baggage. A soldier had only a long lance, a shield and a sword. The sword was very seldom used, while a footman had only sword and shield or a bow and some arrows. Every Pindari supplied himself with lance, sword and shield and other fighting things and thus uniformity could not be maintained. In this, especially their intangibleness, lay their chief strength. They spread themselves, whenever they were defeated and had no idea of a retreat.

As is said above, the Native States supported these men, but when the British Government subjugated Malwa, they abandoned them. It was a difficult task to subdue these men because, like the Hydra, when an effort was made to crush one head, others arose in its place. Chitoo was their leader at this time. Being adventurous and daring in nature, he had often had raids in the territories surrounding his camps. And

help to their plundering expeditions: they entertained their leaders and in short showed them every possible courtesy. Sometimes they bestowed "*Jagirs*" on them. As said above the early Marahtas had one Poonapah Pindari as their auxillary. It was during the reign of Baji Rao I, that he introduced one Ghaziuddin Pindari, into Central India, by bestowing on him a *Jagir* in Malwa which afterwards came to be the rendezvous of the different Pindari "*Durrahs*" or Divisions.

Malwa at this period was absolutely in a chaotic condition. Baji Rao took advantage of the situation and thought fit to get rid of Ghaziuddin, who was daily becoming strong and a possible block to his ambition, by assigning him a Jagir in that province. Besides this, many other circumstances were favourable to their progress. Malwa is a rich and fertile tableland extending over a vast territory. It, like many other countries, has undergone a sway of several dynasties, which in the end have not been able to influence the people. The country was not a one united whole, but a medly of innumerable petty "*Jagirdars*," who were masters of the souls and property of their people. At the time, like Greece of old, every Jagirdar was termed a Raja, though his territory might not exceed one district of to-day and his army, a handful of badly equiped men. Unlike in interest and having no ties of union these petty states were unable to withstand the plundering expeditions of the Pindaries. The native states, being jealous of one another, sought the help of these men to overthrow their rivals. Thus they sold themselves for lucre to any state who offered them the highest amount and cared nothing about the after results. One of the Holkers had gone even so far as to present a golden flag, known as the '*Zeri*' to one of these, thus recognising their existence.

It is a long and tedious task to trace the career of this band further. After the lapse of a certain period of time, they were formed into regular troops by able leaders. The greatest of them were *Chitoo* and Karim Khan. The former had assumed the title of Nawab Mohomed Khuda-Dad-Khan, Mustaqim Jang. It would be difficult to compare these plunderers, since very little is known of them. But Karim Khan must be given precedence. Although he was not so brave and daring as Chitoo, he was certainly a good and prudent man, not rash. His idea was to carve out a career for his progeny.

The interesting feature in the Pindaries is the mode of their warfare. They were not regular fighters. But the

with the Marahta armies in the reign of Aurangzeb. Notwithstanding all efforts to trace the origin of these men, it is perhaps best to call them obscure freebooters. Various conjectures are made as to the derivation of the term Pindari but the one most becoming is this that *Pind* in the aboriginal language of Malwa, means a 'highwayman' and those men who belonged to this band were known as Pindaries.

Pindaries may be compared to the band led by the condottieri of Italy in the middle ages. Like the Tartars they had neither the means nor the inclination to settle and repose. They came and went over a province, now rich and fertile, like a passing storm of thunder and hailstones, and left the country in a helpless state, quite destitute of everything afterwards. They neither spared children, women, nor aged men—not even unripe fields.

It is a mistake to take them as Marahtas. Marahtas, of course, began by plundering, but they had one aim in view, which they meant to achieve, *viz.*, the escape from the cruel hands of Aurangzeb, as they say, which I have sound reasons to doubt, and other Mahommedan rulers of the Deccan and the establishment of a monarch of their own. They were quite justified in doing so because kingdoms are not made in one day and without zeal energy and a certain feeling of "go up." They take a considerable time to become ripe. Though the Pindaries were like the early Marahtas in character and habit yet there were some essential points of difference. The Marahtas were one tribe ; united and animated by the ties of universal brotherhood and prejudices of religion. They were not impelled by a mere sense of plunder and rapine and the ambition of their martial leader. This sense of religion and the common ties of brotherhood gave the Marahtas a union in action as well as in interest. Whereas the Pindaries had no one religion, no ties of brotherhood, not even a spark of national feeling. They did not possess those bands of union which unite men in adversity. They were composed of the men of all lands and all religions.

Such were the people who acquired the chief power in Central India especially in Malwa, though they did not take a deep root there, in the latter half of the 18th and the begining of the 19th century. As is usually the case with such unprincipled hands that they gain power when backed by some other power, very like them in nature, so actually was it with the Pindaries. The Marahtas found in them a very good

he will not be successful in attaining his object. The appearance of an empty water-vessel implies the same thing. But if instead of one he meets with seven one-eyed men, it does not signify anything. A jackal crossing a man's path ahead of him from right to left forbodes some accident.

There is a superstition about shoes also. If accidentally one of the shoes of a man when he takes them off gets upon the other, he is supposed to be starting upon a journey very soon.

Also you can make certain predictions by means of some strange signs. If one feels a tendency to scratch the palm of one's hands, one is supposed to come into possession of some unexpected wealth. If a man's eyes wink involuntarily and continuously, he believes himself destined to certain loss.

Lastly there is more or less everywhere in India a kind of local superstition, I mean superstition connected with places. In every part there is one place or other of great notoriety. The neighbouring people do not mention its name especially in the morning believing that some unforseen thing would happen to them during the day. A person happens to mention the name, his companions try to take off the bad effect which it portends, by cursing it outright as if it were some living rational being capable of being daunted by their words.

This is a general outline of the whims of the ignorant mass of the people especially of those who are a little removed from cities or towns. But there has been growing a class of men who although they do not absolutely disbelieve anything yet doubt everything. But as long as there is wanting that class of defiant men who will actually by their adventure show their friends that the spirits and ghosts are mere airy nothings and that every exhibition of their superstitious beliefs is but a whimsical caprice, the people will remain as they have been for centuries.

MOHD. ALHASAN.

"The Rise and fall of the Pindaries."

The Pindaries are mentioned by Parishta and they date so far back as 1689, when Poonapah, a Pindari leader, was

A somewhat similar belief of transferring diseases is very common amongst the villagers. They make a small ditch where two paths cross each other, and bury in it leaves of certain plants, and a few pice wrapped in a red cloth, and lay some charm over it. The disease of the man in whose favour it has been prepared is transferred to one who happens to step over it first. This is a practice which does not seem to die out. Such diseases may possibly be cured, of course, but there is no knowing about the traveller in whom the disease has been supposed to be engendered. This above consideration may justify the continuation of this absurd belief.

Another curious fact about bearded men is that whenever any hair of their beard falls off, they are always very particular about cutting it into two.

If you ask them the reason why they do so, they will tell you that it is done to avoid any charm being wrought, for a whole hair is a very easy medium There are other things associated exactly with the same belief.

Indian sportsmen have many superstitions about shooting. It is supposed to be a very bad omen to mention the word knife during a shooting trip so that if the party returns unsuccessful (which the mention of the word implies) the whole blame lies on the man who mentioned the prohibited word. A perfect and presumably old shikari will never go a shooting on Thursday. He believes that if one does not observe this restriction one is to come to grief some day or other.

Many shikaris do not shoot pigeons because tradition has connected them with the conviction that if shot, some instantaneous harm might be done to the shooter. Very black deer are often supposed to be the transformed bodies of genii so that one avoids taking aim at them.

There are many superstitions about omens. The odd numbers 3,13 and 23 are thought to be bad numbers. People take care not to fix the dates of marriages on these dates. I do not understand why the number 13 is so particularly unfortunate as to be notorious everywhere. In England it is also supposed to be a bad number.

If a man when he is going out comes across a one-eyed man, he is sure to mutter and curse him, believing that

Besides this important spirit, they have got other nameless spirits which torment them in various ways. As a rule, the haunts of some of the spirits are supposed to be the river-ghats where the bodies of dead men are burnt. It would be accepted as crucial test of one's courage, if one were to go to any such ghats at midnight and come back safe.

The belief in wood-demons is also common. There are no solitary peepal or banyan trees but are connected with some traditional legends about these spirits.

Many a benighted lonely traveller would relate how he saw a giant form sudenly crossing his path and how he was handled if he had no steel weapon with him or how a tree cracked and the demon vanished into it, if he happened to possess any such instrument. The lower spirits are supposed to be daunted by steel instruments.

Any old large house that has been unoccupied for a time is sure to be haunted by genii. Those vacating their houses take special care to appoint some men to live in them and to see that they are provided every day with light. Genii are supposed to take the form of black dogs or white cats to visit houses especially on Thursday night.

It is also commonly believed that the phosphorescent light is the torch of the lower spirits which is lighted when they hold their uncouth revels.

There is one particular aspect of the credulity of the Indians which applies to some extent even to the moderately educated class. Every sudden death, more or less without any apparent cause, is accounted for as being brought about by witch craft; and if the deceased had any enemies, his family makes no scruple in believing that they were at the bottom of it. Some of the neighbours would very likely relate that he had seen, the other day, a *bán* coming down upon the house of the deceased. *Bán* is a Hindi word which means a rocket. It is supposed that one of the various ways of practising witch-craft is by means of a *bán*, which is prepared by putting in an earthen pot a lighted candle with a mimic man made of flour, with needles pierced in his sides. This whole arrangement flies into the air by the magical power and alights at the destination when shortly afterwards, the desired form is known to have been done.

over supernatural powers. After having been absorbed in this pursuit for a long time, he succeeded—so the tradition says—in securing the forced services of a powerful genius. He prepared a kind of lamp inscribed with charms which when lighted called in his attendant spirit before him.

Now, he could carry out all his desires with the aid of his supernatural servant and consequently he lived a very magnificient life, often extending his bounty to the poor. He returned to his home afterwards where he did not keep his old habits, but began to misuse his power in morally objectionable ways.

One day when he had infringed some terms of their mutual contract the genius killed him in order to get rid of his master, who had made himself such simply by force.

As the death of Sheikh Saddo was an unholy one, his ghost was liberated to do mischief to the people.

So far has been the tradition, so far it is not at all uncommon, in consideration of the numerous similar stories of the oriental mythology. But what especially concerns us here is the firm hold that this belief the ghost has in on the people from that time up till the present. It is a striking feature to note that his ghost instead of haunting the house, actually possesses the people. This constant trouble has led to a method of appeasing the ghost by celebrating annually Sheikh Saddo's day, in which the folk prepare a kind of cake, generally known as Sheikh Saddo's *gùlgùla*. Only those who are already visited by the spirit can safely eat this cake and if any other person ever tastes of it, he ensures the visit of the spirit to himself without fail, so that if he would henceforth live a peaceful life, he is bound to celebrate Sheikh Saddo's day.

So particular is this spirit about its own day being observed, that if any one of its favourites fails to be punctual about the observance-day, the spirit comes to him in full fury and does not leave him unless the family members promise to pay some penalty in the form of more devotion that year.

Every Tuesday and Wednesday, especially in the summer season, crowds of men and women flock at the tomb of Sheikh Saddo which is situated near Amroha, to make sacrifices of goals which are generally known as Sheikh Saddo's goals.

once round its axis. Its outer surface consists of incandescent gaseous mixture, in which violent disturbances often occur. The temperature of the sun is so high that we cannot possibly form an adequate idea of it. It is dissipating heat at a tremendous rate, but is not cooling down apparent[illegible]. The Sun of today is just as hot as it was some 2 [illegible] years ago. Several causes tend to keep up the [illegible] temperature of the sun. It is not possible to enter into [illegible] details here. One of the potent causes is the contracti[illegible]on of the Sun. It is contracting at the rate of, roughly [illegible] speaking, about 2 miles a year. [illegible]

But as the Sun cannot go on contracting indefinitely time will come when its temperature will begin to fall, till it completely cools down, and ceases to be a source of heat and light to us. That day may be very distant yet (it is calculated that the sun will take some 5 millions of years to cool down completely); but it is sure to overtake us sometime or other ; and long before that day is reached the present form of life would be impossible on this planet.

An account of the Indian Superstitions.

In giving an account of the Indian superstitions one is, of course, apt to look into the different religions of India which are so full of interesting material for such a subject. But this will be beyond the scope of my paper owing to the great diversity of religions, making the description too long. I shall confine myself only to such superstitions as are more or less common to every community and at the same time known to different parts of India.

To begin with, I shall take up Sheikh Saddo. This man was a resident of Amroha, a town in the Moradabad District. It is not exactly known when he lived but probably it was in the 15th century.

Nothing definite, about his early history, is known, until we hear of him as a student of one of the Schools at Jaunpur—then a great seat of learning where people from various parts of India came to receive their education. As a student we hear very little of him, for he was always given to testing the virtue of magic in giving him control

Of the other planets, Mars has two Satellites or Moons, attending it. Jupiter has four (another very small Satellite has recently been discovered) Saturn eight, Uranus, four visible ones, Neptune, one while no Satellites are yet discovered attached to Venus or Mercury.

Besides the above mentioned permanent members of the Solar System, there are some stray visitors to this system. These are the comets. Comets are very small objects ; of irregular shape, (not globular like planets or Satellites) but sometimes, very beautiful to look at. They sometimes appear with almost startling unexpectedness, they rapidly swell in size to an extent that in superstitious ages, called forth the utmost terror; and again disappear often never again to return. Sometimes they become permanent members of the Solar System, in which case they revolve round the sun just like an ordinary planet. Many comets are characterised by possessing a long luminous tail, which consists of some very fine gaseous matter in as much as the stars can be seen through it. This tail of the comet increases in length as the object approaches the sun, being longest when the comet is nearest the sun, but always points away from the sun. It seems to be repelled by the sun, while the comet on the whole is attracted. Many comets are without tails and look like ordinery small stars. Many of these are caught by the sun and the planets, and swell the masses of these bodies, many escape altogether and never return.

We will conclude this article with a few passing remarks on the Lord of the Solar System, the Sun itself. This luminery is the life and soul of the whole System. It is the source of our heat and light ; and therefore the cause of almost all the well-known natural phenomena. Astronomers have succeeded in the diffcult task of ascertaining the exact size of the luminery. The diameter of the sun is 865,000 miles. This bare statement fails to convey to the mind an adequate idea of the vastness of its dimensions. Suppose a railway line laid round the sun, and we start on the journey, on a mail train moving at 40 miles an hour ; it will take about 8 years to accomplish our journey if we travel day and night without intermission. Or take one million globes as big as the earth ; unite them in one. This new globe will not be quite so big as the Sun.

The distance of the sun from the earth is about 92, 700,000 miles. The Sun takes about 26 or 27 days to turn

ent planets take different periods of time to complete one revolution round the sun. Mercury the nearest, takes 88 days or about 3 months; Venus, 225 days or about 7½ months. The earth takes 365 days, *i e.*, one year. Mars takes 687 days or about one month less than 2 years; Jupiter takes 12 years; Saturn 29 years; Uranus 84 years; and finally Neptune 165 years.

Let us now compare the sizes of the planets. Taken in order of their sizes they are as follows :—

Jupiter, Saturn, Neptune, Uranus, Earth, Venus, Mars, and Mercury.

Jupiter is by far the biggest of all the planets; so big that all the other planets together will not form a globe so big as itself. It is 1200 times as big as the earth by volume, though only 310 times as heavy. This shows, that this planet, as well as some other planets, such as Saturn &c., are not quite solid yet. Saturn, which comes next is about 800 times as large as the earth and over 80 times as heavy. Uranus and Neptune are also very big bodies being hundreds of times as large as the earth. Venus has about the density and size of the earth, only very slightly smaller. Mars is much smaller; while Mercury is only $\frac{1}{24}$ of the weight of the earth.

Many of the planets are attended by what are called Satellites (in ordinary language, moons) which are smaller bodies revolving round the planet. With one of these we are quite familiar. It is the Moon. It is attached to our earth and revolves round it. It takes, as we know, about 27 days to complete one revolution. This body being our nearest heavenly neighbour attracts naturally good deal of attention, and is a magnificient telescopic object. It always presents the same surface towards the earth; which means that the time taken to turn once on its axis is the same as taken to complete one revolution round the earth. We are thoroughly familiar with this side of the Moon. We know all the mountains, seas, oceans, valleys craters &c., &c., on its surface. There is not a corner left unexplored. So, it is said that we are better acquainted with the surface of the Moon than we are with the surface of the earth. Looking at the maps of Australia or Africa you will still find there, regions marked unexplored. There are no such regions on the surface of the Moon.

named above Le Verrier of France and Adams of England set themselves to solve the problem, and both independently were able to solve it. The calculations were long and tedious. Difficulties and uncertainties almost unsurmountable. But everything was overcome. It was announced to the world that if a telescope were fixed at a certain place in the heavens a planet would be seen and it would be possible to recognise it by its disc. And when the telescope was fixed at the place specified, the planet was actually there and possessed as predicted a visible disc. The object was watched for a few days, it changed its position among the stars. It was thus a planet without doubt. Thus was Neptune discovered, a discovery which is and must remain unique in the history of astronomy. I conclude its discovery in the words of an eminent astronomer :—

"We picture the great astronomer (Le Verrier) buried in profound meditation for many months ; his eyes are bent, not on the stars but on his calculations. No telescope is in his hands ; the human intellect is the instrument he alone uses, with patient labour, guided by consummate mathematical artifice, he manupulates his columns of figures. He attempts one solution after another. In each he learns something to avoid; by each he obtains some light to guide him in his future labours. At length he begins to see harmony in those results where before there was but discord. Gradually the cloud disperse, and he discerns with a certainty little short of actual vision the planet gathering in the far depths of space. He rises from his desk and invokes the aid of a practical astronomer and lo ! there is the planet in the indicated spot."

Besides these 8 well-known big planets there is a horde of exceedingly small planets revolving round the sun, between the paths of Mars and Jupiter. These are called the minor planets. The mass of some of these is so small that a bullet fired or a cricket ball skilfully hit will never return to the planet. It will be able to overcome the attraction of the planet and fly away in the space.

The paths pursued by the planets in their course round the sun; *i. e.*, their orbits, are not circular. They are elliptical, the sun being not at the centre, but at one of the foci. These ellipses are almost circular. They do not all lie in one plane ; but they angle which they make with the ecliptic or the plane of the earths orbit, is very small. Differ-

were known to mankind from almost prehistoric ages. These are Mercury, Venus, Mars, Jupiter and Saturn. All these planets are magnificent heavenly objects which will attract the attention of any admirer of nature;—though Mercury is rather difficult to see as it rises and sets immediately with the sun. It is said that Copernicus, the great expounder of the solar system, expressed his sincere regret that he never enjoyed the opportunity of beholding the planet Mercury. Venus, the magnificient morning and evening star, and Jupiter, are about the most brilliant stars of the heaven, and consequently quite conspicuous. Mars attracts attention by its peculiar red colour, which when the planet is nearest the earth is very brilliant. Saturn is also a conspicuous object and must have attracted attention by the fact that its position among the stars constantly changes. For a long time these five planets were supposed to be the only wanderers in the heavens that changed their position among the fixed stars, and influenced in a peculiar manner the destiny of man. The discoveries of Uranus and Neptune belong to a much later period, but they are of the greatest interest to us, especially that of Neptune. These two planets, although big masses, are so very remote from the earth, that they can be hardly seen with the unaided eye, and this accounts for their not being discovered before. Uranus was discovered by Herschel in the year 1781, and Neptune by Le Verrier and Adams in 1846. The trained eye of Herschel, with the aid of a beautiful telescope which he had himself constructed, and which was far more accurate and powerful than any possessed by any body else was able, in the course of his examination of the stars, to perceive a visible disc in a star; and the idea was at once suggested to him that it might be a comet or a planet, as stars do not possess visible discs. Its course was followed. It changed its position among the stars. It was clearly then a planet. Thus was Uranus discovered. The discovery of Neptune is far more interesting. In fact it has no parallel in the history of astronomy. It was noticed that Uranus did not follow accurately, the path required by Kepler and Newton's laws and that irregularities in its motion could not wholly be accounted for by the disturbing influence of Jupiter and Saturn: So there must be some other object some where in the universe, that attracted it, and caused the perturbations. It must be a planet, for the stars by virtue of their enormons distance, cannot exert any appreciable influence on Uranus. But everything else about this planet if it existed was unknown; its distance, its mass; velocity in space etc. etc. The two mathematicians

and so did the whole starry universe. The movements of the planets being completed were explained in the following manner. Each planet was supposed to revolve in a circle, the centre of which described another circle round the earth.

Such was the system of astronomy which prevailed in Europe for over fourteen centuries; and was only discredited at an epoch nearly simultaneous with that of the discovery of the new world. The true arrangement of the Solar System was then expounded by Copernicus. The life long labours of this sage established, as the first principle, that the diurnal movement of the heavens was due to the rotation of the earth on its axis. "Copernicus pointed out the fundamental difference between real motions and apparent motions; he proved that the appearances presented in the daily rising and setting of the sun and the stars could be accounted for by the supposition that the *earth* rotates, just as satisfactorily as by the more cumbrous supposition of Ptolemy. He shewed moreover that the latter supposition must attribute an almost infinite velocity to the stars, so that the rotation of the entire universe round the earth was clearly a preposterous supposition. The second great principle which has conferred immortal glory on Copernicus assigned to the earth its true position in the universe. Copernicus transferred the centre about which all the planets revolve from the earth to the sun; and established the somewhat humiliating truth that our earth is merely a planet persuing a track between the paths of Venus and of Mass, and subordinated like all the other planets to the supreme sway of the sun.

The establishment of these grand truths revolutionized the whole astronomical world. Other very important and equally grand discoveries followed in quick succession. I have no space in this article even to approach the brilliant works of Galileo, Kepler, Newton, Laplace, and others which have completed our knowledge of the solar system ; or to describe the Nebular, or other hypotheses which attempt to explain the way in which the solar system originated. I will confine myself to the description of the system itself.

The solar system consists of the sun with a member of bodies revolving round it. These bodies are called planets or wanderers. There are some eight of these. Beginning from the one nearest the sun and taken in order, they are :—

Mercury, Venus, the Earth, Mars, Jupiter, Saturn, Uranus and Neptune. Of these 8 planets, five excluding the Earth

innumerable shining points, that are scattered all over the sky? Where are they located? What supports them? Are they all similar? What is the Sun? How hot, how big, how distant? Is the sun that rose and set today identical with the one that had risen and set yesterday or the one that we know by experience will rise and set tomorrow? What is the moon, and how is it related to our earth? And connected with these questions is another that naturally arises: What is our Earth and what are its relations with the rest of the universe? In ancient astronomy what is most interesting to note is the extravagant estimate of the importance of the earth in the scheme of the heavens. And what was more natural? The earth seemed so big—of almost infinite extension, so grand, so beautiful, so full of wonders. What were those small shining particles, or the two comparatively bigger orbs,—the sun and the moon when compared with the earth? What was more natural than to assume that the earth was the best and by far the biggest in the creation, and that all the other heavenly bodies, the stars, the sun and the moon, did the homage that was their due and went round and round the earth. And if since then our ideas have changed and the true position of the earth in the universe has been recognised what a cruel shock it has been to the vanity of man who even now sometimes assumes himself to be the most intellectual and the most important being in the whole creation.

But we will not tarry on these points. The very old idea that the earth was flat and rested on the back of some huge animal and that earthquakes were caused by the occasional groans and restlessness of this monster under the enormous weight of the earth, underwent some modification. The most popular theory which was regarded as the final authority or question of astronomy for over fourteen centuries was Ptolemy's. "He perceived that the earth's figure was globular, and he demonstrated it by the same arguments that we employ at the present day. He fancied that this globe was poised in what he believed to be the centre of the universe. He admitted that the diurnal movement of the heavens could be accounted for by the revolution of the earth on its axis, but unfortunately he assigned reasons for the deliberate rejection of this view. The earth according to him was a fixed body; it possessed neither rotation round an axis nor translation through space, but remained constantly at rest at the centre of the universe." The sun and the moon moved in circular orbits round the earth as centre

mal record of the Intermediate, in which nearly 67 % of the Aligarh candidates failed, and none did really well.

In this number will be found the first essay of the Scientific Society—the new body of which mention has already been made. We believe that there is a great future before the society and we hope to publish its essays regularly, or at any rate whenever they are not on so technical a subject as to be beyond the interest of the average reader.

Speaking generally, all the societies did very well in the last hot weather. Meetings were well attended and plenty of interest was shewn by the members. Hence prospects are good for the future. The programme of the Historical Society is already arranged to the end of February 1908. There is the new Arabic Society, which should now be able to settle down to the fulfilment of its objects.

The Captains for the various games for the year 1907-08 have been appointed. They are as follow :—For Cricket, Abdul Halim, IV Year ; for Football, Abdus Samad IV Year ; for Hockey, Muhammad Akram Khan, IV Year, re-appointed.

The Athletic Sports Secretary is Syed Ali Raza Bilgrami. The Riding School Captaincy is vacant as yet.

Several complaints have reached the Editor regarding non-delivery of the magazine. This we deeply regret ; and subscribers are asked to report at once and directly to the Editor, in case the monthly issues do not reach them. The Manager and Assistant-Manager will be glad to have these defects pointed out to them.

The Historical Society's prize for the best essay on a subject connected with Indian History is again offered. Essays must be sent in to the Principal before the end of November next.

The prize is of the value of Rupees one hundred and forty-four.

The Solar System.

From very early times the starry Heavens attracted the attention of philosophers, and set them thinking. There was ample food for their meditation. What are those

The Aligarh Monthly

August, 1907.

College Notes.

We have received the following correction for the article on the last Cricket season. It refers to the averages and reads thus :—"Alay Hasan should be included in the average list with the record of 4-0-44-26 average 11 and Ali Hosain should appear among the "also batted" with scores of 13, 3, 0,* 6.*

As usual there is very little to use as material for College notes during the vacation months. No reports from Duty Deputations or Conference Agents have been received and the College itself is closed with the exception of the Law Class, which was to continue during part of August.

The annual report of the Principal is not yet out and the results of the B. A. Examination are not to be expected till the end of this month. Nerly sixty candidades from Aligarh appeared in this year's examination. On their work some few deserve a fairly good position in the list. It is to be hoped that for their own sakes and for that of the College all do well. We want a success to counterbalance the dis-

*" Signifies not out."

بڑے بڑے مدارس ہوتے تھے، اور مذہبی ہی گروہ کے ہاتھ میں اس علم کا عَلَم تھا، فلسفۂ اشراقیہ اُسی زمانے کی یادگار ہے۔

تحقیق سے فلسفہ کا سرچشمہ مصر وہندوستان ثابت ہوتا ہے، یونان میں انھیں ملکوں سے فلسفہ گیا، فلاسفۂ یونان جیسے، **تالیس، اناکثاغورس، فیثاغورث، افلاطون**، بیشمار مال و دولت صرف کرکے مصر وہندوستان کے معابد میں، جو اُسوقت مدارس کا کام دیتے تھے، آتے تھے، اور علمی فیض حاصل کرکے اپنے اپنے وطن کو واپس جاتے تھے[۱]۔

یورپ میں ابتدائی فلسفہ ایک خانہ بدوش گروہ لیگیا، ان لوگوں کا اصلی وطن یونان تھا، یونان سے جلاوطن ہوکر مصر میں آباد ہوگئے تھے اور مصر سے اُنھوں نے یورپ کا رُخ کیا، مصر و یونان سے جو علوم یہ اپنے ساتھ لائے، اُنکی یورپ میں اشاعت کی۔

علوم طبعیہ کا سب سے پہلا معلّم جس نے سب سے پہلے اوراقِ فطرت کا مطالعہ کیا، **تالیس** ملطی ہے جو سنہ ہجرت سے بارہ سو (۱۲۰۰) برس پہلے تھا۔ اُس نے کہربائیت یعنی رگڑنے سے جو قوتِ کشش پیدا ہوتی ہے، اُسکو دریافت کیا تھا۔ لوہا اور کسی چیز کو رگڑنے سے اتنی قوّتِ کشش پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ پر، کاغذ، جیسی ہلکی ہلکی چیزوں کو اُٹھالے،

تالیس کی نصف صدی کے بعد **فیثاغورث** پیدا ہوا۔ جسکی نسبت مشہور ہے کہ وہ فلسفۂ طبعی کا سب سے پہلا مُدوّن ہے، اسنے علم طبعی میں ایک رسالہ لکھا جسکا نام "**الموافقات الطبیعیّۃ**" رکھا، اِس رسالے میں اُسنے حسب ذیل مسائل لکھے تھے۔ سمع، ابصار، قوتِ جذب، روشنی کے رنگ، رنگ کی نسبت اُسنے یہ ظاہر کیا تھا کہ مرئیات میں خود رنگ نہیں ہوتا، بلکہ روشنی کا وہ ایک اثر یا نتیجہ ہے۔

فیثاغورث کے بعد **امفیدوکل** نے جو جزیرۂ صقلیہ کا رہنے والا تھا، اور

[۱] الازہار البدیعہ۔ ص ۲۔ و مباحۃ المعارف۔ ص ۹۷۔

فلسفۂ طبعی وہ علم ہے جسمیں اِن تین چیزوں سے بحث کی جائے۔

(۱) اجسام کے عام طبعی خواص۔

(۲) میکنکس،

(۳) اُن قوانینِ فطرت یا علل کا بیان جنکے موافق ایک جسم دوسرے جسم میں کوئی اثر پیدا کرتا ہے۔

قدیم علوم کی تاریخ چونکہ قدامت کی تاریکی میں گُم ہے اِسلیئے یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ اُن کا پہلا موجد کون ہے، لیکن ظنِ غالب یہ ہے کہ تمام علوم میں سب سے پہلے انسان نے **طبعیات** ہی کی طرف توجہ کی ہوگی۔ جسکا مقصد گردوپیش کی چیزوں کا مطالعہ کرنا ہے، کیونکہ عقلِ سلیم تسلیم نہیں کرتی کہ انسان کی چاروں طرف روزانہ سینکڑوں حوادثِ طبعی ہوتے رہے ہوں اور انسان اُن کے اسباب و علل کی طرف توجہ نکرے

قرائن بتاتے ہیں کہ انسان کے گردوپیش جو چیزیں ہونگی، انسان بار بار اُن سے ایک ہی قسم کا اثر و نتیجہ دیکھکر یہ سمجھتا ہوگا کہ نتیجہ اس چیز کا خاصّہ ہے، اور یہ امر اس واقعہ کی علت ہے، مثلاً جب اُسنے بار بار دیکھا کہ آگ چیزوں کو جلا دیتی ہے، منجمد کو سیّال اور سیّال کو گیس بنا دیتی ہے، تو کچھ دنوں کے تجربہ میں اُسکو یہ یقین ہوگا کہ جلانا اور مادّہ میں رقت پیدا کرنا آگ کا خاصّہ ہے، رفتہ رفتہ ایک مدت میں اِس قسم کے کافی مسائل کی مقدار جمع ہوگئی، جسکو آج ہم **طبعیات** کہتے ہیں۔

آغازِ آفرنیش کے جو بقیہ آثار وحشی قوموں میں موجود ہیں، اُن سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہی کہ لوگ پہلے عموماً فطرتی حوادث کی علت، جن، دیو، پری، روحانیات کو ٹھہراتے تھے۔ اسی لیئے قدیم قومیں اُنکی پرستش کرتی تھیں۔ ہرایک قسم کی تاثیر کے لیئے ایک ایک خدا مانتے تھے، مثلاً ربّ النار، ربّ العقل، ربّ البحر، ربّ الحسن، اور یہی سبب کہ فلسفہ اُس زمانہ میں مذہبی اسرار میں شمار کیا جاتا تھا۔ اور عموماً معابد فلسفہ کے

بڑے بڑے مدارس ہوتے تھے، اور مذہبی ہی گروہ کے ہاتھ میں اس علم کا عَلَم تھا، فلسفۂ اشراقیہ اُسی زمانے کی یادگار ہے۔

تفحص سے فلسفہ کا سرچشمہ مصر و ہندوستان ثابت ہوتا ہے، یونان میں انھیں ملکوں سے فلسفہ گیا، فلاسفۂ یونان جیسے، **تالیس**، **اناکثاغورس**، **فیثاغورث** **افلاطون**، بیشمار مال و دولت صرف کر کے مصر و ہندوستان کے معابد میں، جو اُسوقت مدارس کا کام دیتے تھے، آتے تھے، اور علمی فیض حاصل کر کے اپنے اپنے وطن کو واپس جاتے تھے[۱]۔

یورپ میں ابتدائی فلسفہ ایک خانہ بدوش گروہ لے گیا، ان لوگوں کا اصلی وطن یونان تھا، یونان سے جلاوطن ہو کر مصر میں آباد ہو گئے تھے اور مصر سے اُنھوں نے یورپ کا رُخ کیا، مصر و یونان سے جو علوم یہ اپنے ساتھ لائے، اُنکی یورپ میں اشاعت کی۔

علوم طبعیہ کا سب سے پہلا معلم جس نے سب سے پہلے اوراقِ فطرت کا مطالعہ کیا، **تالیس ملطی** ہے جو سنہ ہجرت سے بارہ سو برس پہلے تھا۔ اُس نے کہربائیت یعنی رگڑنے سے جو قوتِ کشش پیدا ہوتی ہے، اُسکو دریافت کیا تھا۔ لوہا اور کسی چیز کو رگڑنے سے اتنی قوتِ کشش پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پر، کاغذ، جیسی ہلکی ہلکی چیزوں کو اُٹھا لے،

تالیس کی نصف صدی کے بعد فیثاغورث پیدا ہوا۔ جسکی نسبت مشہور ہے کہ وہ فلسفۂ طبعی کا سب سے پہلا مُدوِّن ہے، اسنے علم طبعی میں ایک رسالہ لکھا جسکا نام "**الموافقات الطبیعیۃ**" رکھا، اس رسالے میں اُسنے حسب ذیل مسائل لکھے تھے۔

سمع، ابصار، قوتِ جذب، روشنی کے رنگ، رنگ کی نسبت اُسنے یہ ظاہر کیا تھا کہ مرئیات میں خود رنگ نہیں ہوتا، بلکہ روشنی کا وہ ایک اثر یا نتیجہ ہے۔

فیثاغورث کے بعد امفیدوکل نے جو جزیرۂ صقلیہ کا رہنے والا تھا، اور

---

[۱] الازہار البدیعیہ۔ ص ۲۔ و مباحثۃ المعارف۔ ص ۹۷۔

اکسینو فانس نے جو مدرسہ ایلیا کا بانی تھا، اور اُن کے بعد دیمو کریٹ اور لوسیپ وغیرہ نے طبعیات کو ایک ممتاز حد تک ترقی دی، جواہر فردہ کی تحقیق کی۔ اِن لوگوں میں سے دیمو کریٹ نے خصوصیت کیساتھ طبیعیات میں بہت کچھہ اضافہ کیا، سقوط اجسام کا قاعدہ دریافت کیا، ہوا، ضوء، نار، پر بھی اسنے گفتگو کی۔[۱]

سنہ ہجرت سے قریباً بارہ سو برس [۱۲۰۰] پہلے افلاطون پیدا ہوا۔ افلاطون سقراط کا شاگرد تھا، افلاطون نے اور علوم کے ضمن میں طبیعیات کی بھی تجدید کی، افلاطون سے پہلے محققین فطرت کا جولانگاہِ تحقیق روشنی کا مسئلہ تھا اور گمانِ غالب یہ ہے کہ مرایا محرقہ (آتشی شیشہ) افلاطون سے پہلے دریافت ہو چکے تھے۔ افلاطون سے علوم ذہنی کو غیر محدود فائدہ پہونچا، فلسفہ الٰہیات اسی کے عہد میں نشو ونما پاکر بڑھا۔ افلاطون نے دو مشہور شاگرد چھوڑے جنھوں نے طبیعیات کی کچھہ نہ کچھہ امداد کی، پہلا شاگرد لوکورس کا رہنے والا تھا، کہربائیت کے متعلق اُس کی جو رائے تھی اُس میں قدیم خیالات کا شائبہ پایا جاتا ہے، کہربائیت کے متعلق اُسکی تحقیق تھی کہ کہربائیت ایک لطیف مادہ ہے، یا کوئی رُوحانی چیز ہے جو کہربا سے نکلکر اجسام کو اپنی طرف کھینچتی ہی

افلاطون کا دوسرا شاگرد ارسطاطالیس تھا، ارسطاطالیس سنہ ہجرت سے ۹۷۸ برس پہلے مقدونیہ کے حدود میں پیدا ہوا تھا۔ اُسنے کامل تیس برس تک افلاطون کی خدمت کی، افلاطون کے انتقال کے بعد اُسنے شہر مدلی میں سکونت اختیار کی، ارسطو کی بھی گو تمامتر توجہ ذہنی علوم کیطرف تھی، لیکن وہ فلسفہ طبعی سے بھی بے خبر نہ تھا، اُسنے ثقلِ ہوا کی تعیین کی، آواز کی علت دریافت کی، ہوا کے تموجات کو اسکا سبب ٹھہرایا، عناصر کا آب و باد و خاک و آتش میں انحصار کیا۔

اِسی زمانے میں ارسطو کا معاصر ایک اور فلسفی ارفتیاس نام تھا، میکینکس کی

---

[۱] الازہار البدیعہ ص ۳۔

بنیاد اسی نے ڈالی، جرِ ثقیل کے لئے دولاب اسی نے پہلے بنایا، اور کسی چیز کے دبانے یا اُٹھانے کے لئے پیچ یا شکنجہ ایجاد کیا۔

یہ سب تحقیقات اسکندر مقدونی کے عہد میں ہوئیں جسکے دربار سے ارسطاطالیس کو تعلق تھا۔ اسکندر کی وفات کے بعد بطلیموس جو اسکندر کی فوج کا ایک سپہ سالار تھا اُسنے مصر دبالیا، خاندانِ بطالسہ جسنے ایک مدت تک مصر پر حکومت کی، اسی بطلیموس کیطرف منسوب ہے۔ بطلیموس نے نوسو (۹۰۰) برس قبل از ہجرت ایک مدرسہ قائم کیا چونکہ خود بھی بطلیموس فلسفہ کا ماہر تھا، اسلئے اس مدرسے کا پروازِ شہرت انتہائی حد تک پہونچ گیا، بطلیموس نے چاند کی حرکت دریافت کی، اسکے بعد مصر میں طبعیات کی امداد پر اور بہت سے ایجادات ہوئے۔

سنہ ہجرت کے سات سو پچاس (۷۵۰) برس پہلے طبعیات وہندسہ کا مشہور عالم ارشمیدس پیدا ہوا، جزیرۂ صقلیہ اُسکا وطن تھا، ارشمیدس اقلیمِ فطرت کا سب سے زیادہ باجبروت بادشاہ گزرا ہے۔ ارشمیدس کے زمانے میں دشمنوں نے جزیرۂ صقلیہ کا محاصرہ کرلیا، ارشمیدس بھی جزیرہ میں موجود تھا۔ یہ اپنے وطن کو طبعیات وہندسہ کے زور پر چھ (۶) مہینے تک دشمنوں کے حملے سے بچاتا رہا۔ عزلت نشین ہوکر نئے نئے آلاتِ جنگ کی ایجاد اور ہندسی اشکال سے راستہ نکالنے میں مشغول تھا۔ اس خدمت کے انجام دینے میں وہ اسقدر مصروف تھا کہ جزیرۂ صقلیہ فتح بھی ہوگیا، دشمن شہر میں داخل ہوگئے، فوج کا ایک سپاہی پیک اجل بنکر اُس کمرے میں بھی گھس آیا، جہاں ارشمیدس اقلیدس کی رُو سے دشمنوں سے بچنے کے لئے راستہ نکال رہا تھا سپاہی نے کچھ پوچھا، ہمہ تن مصروف حکیم کو اُسوقت تک کچھ خبر نہوئی جبتک تلوار نے اُسکے دو (۲) ٹکڑے نہ کردیئے[1]

[1] الازہار البدیعہ۔ ص ۳۔

ارشمیدس کے بعد اکتیز بیوس نے پانی اُٹھانیکا ایک آلہ بنایا، اور ایک قسم کی کمان بنائی جو ہوا کے زور سے تیر پھینکتی تھی، اُسی زمانے میں جر ثقیل کا بھی ایک آلہ ایجاد ہوا جس سے پتھر وغیرہ بہت آسانی سے اُٹھ جاتے تھے۔ اور یہ مسئلہ بھی دریافت ہوا کہ حرارت ہوا کو پھیلا دیتی ہے۔

رومانیوں نے طبعیات پر کوئی احسان نہیں کیا، کیونکہ جنگی کارناموں کے سوا اُن کی آنکھوں میں کسی چیز کی عزت نہ تھی۔ سلطنت اور سلطنت کے لئے وضع قانون اُن کی زندگی کا مقصد تھا۔

چین نے علم طبعی میں ایک حدتک ترقی کی، یہ معلوم کرکے اس ترقی کی قیمت اور بڑھ جاتی ہے کہ چین نے اُسوقت ترقی کی جب یورپ وحشی تھا۔ چینی جو اکثر زبانوں میں اسی نام سے مشہور ہے، چین سے نکلی ہے۔ قبلہ نما، صنعت طبع، شیشہ گری، کاغذ سازی، تصویر کشی، بارود، ہاتی دانت، کے کام چین کے ایجادات ہیں

طبعیات اور مسلمان

مسلمانوں کے اصلی تصنیفات اور اصلی فلسفہ کے مرکز دو مقامات تھے، بغداد[۱] اور اندلس، بغداد[۲] کی تمام نادر کتابیں نذر دجلہ ہوئیں۔ اندلس کا سرمایہ کچھہ تو یورپ نے لوٹ لیا۔ اور اکثر حصہ دشمنوں نے برباد کرڈالا، آج متاخرین کی تصنیفات میں سینکڑوں صفحے کے اُلٹنے پر اسلامی تحقیقات کے ذرے کہیں کہیں چمکتے نظر آجاتے ہیں جنکو ہم یہ لکھکر پیش کرتے ہیں[۵]

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

مسلمانوں نے طبعیات میں بہت سے مسائل اور آلات کا اضافہ کیا، طبقات الارض

---

[۵] الازہار البدیعہ۔ صہ ۴۔

کے سبادی دریافت کیے، معدنیات کی جستجو کی، چنانچہ المعجب فی اخبار المغرب میں جہاں اندلس کے دریا اور نہروں کا حال لکھا ہے وہاں کی معدنیات کا بھی حال بیان کیا ہے کہ اندلس میں کہاں کہاں سونا چاندی، گندھک، کافور وغیرہ ہوتا ہے۔ ابن المؤدب نے پتھروں کی تحقیق وتفتیش میں عمر بسر کی (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۲۱)

ابن کیسان نے بتایا کہ اعراض، خوشبو وغیرہ جواہر سے مرکب ہیں ابن ہیثم کی تحقیق تھی کہ نور کے چھوٹے چھوٹے ذرے ہیں، متکلمین نے ثابت کیا کہ جسم اجزاے ذرہ سے مرکب ہے۔ ابن حیان نے تحلیل اجسام کی ترکیب نکالی، تقطیر اور تخمیر کے آلے بنائے۔ بعض اجسام کے اجزاے ترکیبی نکالے۔ خازن مزنی المتوفی سنہ ۴۳۰ھ نے ہوا میں انکسار نور کی مقدار متعین کی۔ ابو ریحان نے ثابت کیا کہ فلزات کا وزن پانی اور ہوا میں بدل جائیگا اور نیز ہوا اور پانی میں تفاوت وزن کی بھی تعیین کی۔ ان اوزان کے دریافت کرنیکے لئے ایک آلہ بنایا، ابو علی جبائی اور ابو ہشام نے پانی میں تیرنے اور ڈوبنے کے قواعد مقرر کئے۔ ابن بیطار، غافقی، ابن الرومیہ ابن جلجل نے نباتات کی تحقیق کی، انکا معاینہ کیا، انکے خواص کتابوں میں مدوّن کئے بوزجانی، بیرونی، طوسی، نے علم ہیئت پر اضافہ کیا۔ فارابی نے موسیقی کا عجیب وغریب آلہ ایجاد کیا، ابوالبرکات بغدادی نے زمین کے چشموں کی علت دریافت کی، اور ثابت کیا کہ کون وفساد میں ہوا پانی نہیں ہوتا حکماء اسلام نے یونانیوں کے دوراز کار مسائل کا انکار کیا۔ اُن کی تنقید کی، میکنیکس کو ترقی دی، کل سے پانی اُٹھانیکا طریقہ ایجاد کیا، جرثقیل کے مسائل پر اضافہ کیا، آلات بنائے، فن آلات پر کتابیں لکھیں، جن میں سے حسب ذیل کتابوں کے آثار تاریخوں میں ملتے ہیں۔

الکواکب الدریۃ، تصنیف علامہ تقی الدین[۱]۔

---

[۱] کشف الظنون۔ ص ۱۵۸ ج ۱۔

کتاب آلات الحرب - تصنیف موسیٰ بن شاکر۔ [51]

کتاب الآلات الظلیة - تصنیف ابراہیم بن سنان۔ [52]

حیل بنی موسیٰ [53] - یہ کتاب اب موجود ہو یا نہو مگر ساتویں صدی تک موجود تھی، ابن خلکان کی نظر سے یہ کتاب گزری ہے ابن خلکان نے اس کتاب کی تعریف بھی کی ہے

(ابن خلکان ج ۲ - ص ۷۹)

کتاب الآلات تصنیف بدیع الزمان [54]

کتاب الآت الرصد تصنیف خازن مرنی۔ [55]

کتاب الآت الرصد تصنیف ابو الحسن علی بن راجل [56]، ابو الحسن تیسری صدی میں تھا - اسکی یہ کتاب فرنچ میں ترجمہ ہو کر ۱۸۳۵ء میں پیرس سے دو جلدوں میں شائع ہوئی - یہ تعداد ان کتابوں کے علاوہ ہے جو غیر زبانوں سے عربی میں ترجمہ ہوئیں

گھڑی مسلمانوں نے بنائی اور نہ صرف بنائی بلکہ گھڑی سازی کو ایک علم بنادیا جسکا نام علم الانکامات رکھا، الن جنکیسن نے اپنی مشہور کتاب نیچرل فلاسفی میں گھڑی کی تاریخ لکھتے ہوئے لکھا ہے۔

قد تفنن العرب کثیراً فی هذه الساعة واتقنوها اتقاناً عظیماً ... ولم تستعمل الساعة فی اوربا قبل الحادی عشر، والظاهر انها نقلت الیها عن العرب [57]

عربوں نے گھڑی سازی میں بہت سی جدتیں پیدا کیں، اور بہت ہی عمدہ گھڑیاں طیار کیں ... یورپ میں گھڑیاں گیارھویں صدی سے پہلے نہیں استعمال ہوئیں اور ظاہر ہے کہ گھڑی عرب سے یورپ میں آئی -

سب سے پہلی گھڑی ہارون رشید کے عہد میں بنی، ہارون رشید نے شارلمین

[51] کشف الظنون ص ۱۰۶ ج ۱ - [52] کشف الظنون ص ۱۰۷ ج ۱ - [53] کشف الظنون ص ۱۰۸ ج ۱

[54] کشف الظنون ص ۱۵۸ - ج ۱ [55] اکتفاء القنوع ص ۲۴۹ [56] اکتفاء القنوع ص ۲۴۹ [57] دروس الاولیة

کو جو تحفے بھیجے تھے، اُن میں ہاتھی، بندر، کپڑوں کے علاوہ ایک عجیب و غریب گھڑی بھی تھی، جسمیں بارہ دروازے تھے، ایک گھنٹہ پورا ہونے پر ایک آواز پیدا ہوتی تھی جسکے ساتھ ہی دروازہ کھلتا تھا اور اُسکے سامنے ایک سوار کھڑا نظر آتا تھا، یہ اپنی قسم کی سب سے پہلی گھڑی تھی، جو یورپ کو مسلمانوں سے ملی تھی۔ آج ہم جسطرح یورپ کے عجائبات صنعت دیکھکر محو حیرت بن جاتے ہیں، اُسیطرح یورپ اس انسانی طاقت سے بالاتر صنعت کو دیکھکر متحیر رہگیا، شارلمین کے درباری اُسکو جادو کا کرشمہ سمجھے، گھڑی کی از خود حرکت دیکھکر اُن کو یقین تھا کہ اسمیں کوئی جن بیٹھا ہوا اُسکو ہلا رہا ہے۔[۵۱]

اندلس میں حضرت عثمانؓ کا لکھوایا ہوا قرآن مجید تھا۔ عبدالمومن نے اُسکے واسطے بڑے اہتمام کئے تھے، ہر ورق کے حاشیے میں بیش قیمت جواہرات کے پھول بنوائے تھے۔ سونے چاندی سے اُسکو مرصع کیا تھا۔ قرآن مجید کا ہر ورق حسن صنعت کا منظر تھا۔ تم خیال کر سکتے ہو کہ جب اس اہتمام سے یہ قرآن مجید مزین کیا گیا تھا، تو یہ کب ہو سکتا تھا کہ انسان کی انگلیاں اُسکو چھو چھو کر میلا کریں۔ صناعین اندلس نے اُسکے لئے ایک رحل بنائی تھی، جو ایک صندوق کے اندر تھی صرف کنجی کے ایک اشارے سے صندوق کے پٹ کھلجاتے تھے اور رحل خود بخود بلند ہو کر کھل جاتی تھی۔ جسکے ساتھ قرآن مجید بھی کھلجاتا تھا۔ اور کنجی کے دوسرے اشارے سے رحل سمٹکر مع صندوق کے بند ہو جاتی تھی۔[۵۲]

مامون بن ذوالنون اندلس کا ایک خلیفہ تھا اُسنے طبعیات اور ہندسہ کی مدد سے ایک عجیب عمارت بنوائی تھی، اس عمارت کے وسط میں ایک نہر تھی۔ نہر کے بیچ میں شیشے کا ایک قبہ تھا، شیشہ سونے چاندی کی اعلے سے اعلے صناعیوں کی تصویر تھا۔ گنبد کی چوٹی سے ایک فوارہ جاری تھا، فوارہ کا پانی اس قرینے سے چاروں طرف گرتا تھا

[۵۱] سیاحۃ المعارف۔ ص ۱۱۱۔ ۲۲۔ [۵۲] نفح الطیب ج ۱ ص ۲۸۷۔

کہ قبّے کے رنگین شیشے پر پانی کا ایک نقرئی غلاف پڑجاتا تھا - اِس گنبد میں تختِ شاہی تھا جسپر بیٹھکر مامون دربار کیا کرتا تھا - مگر چاروں طرف سے پانی کی اِن بوچھاروں پر بھی قبائے شاہی کے دامن کا ایک کونہ بھی تر نہیں ہوتا تھا[۱]-

قبۃ الزہراء، اندلس کی ایک مشہور عمارت تھی جسکی جلالتِ شان کا صرف اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُسمیں سونے چاندی کی اینٹیں تھیں - دس ہزار مزدور اور ڈیڑھ ہزار جانور اسمیں روزانہ کام کرتے تھے - پہلی محرم سنہ ۳۲۵ھ کو اسکا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا، اس عمارت میں جو اور عجائباتِ صنعت تھے انکو چھوڑکر اسمیں ایک عجیب و غریب پارہ کی نہر تھی، اس نہر میں خدا جانے کیا طلسم تھا؟ اور سامنے کی دیواروں پر کس قسم کا صیقل تھا کہ جب بادشاہ اپنا جوشِ غضب دکھانا چاہتا تھا تو شاہی ایما سے کوئی آہستہ سے نہر کو ہلا دیتا تھا، ہلانا تھا کہ غضب ہوجاتا تھا، دربار کی چاروں طرف کی دیواروں پر اس شدت سے بجلی سی کوئی چیز کوندنے لگتی تھی کہ لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی تھیں اور سارے دربار پر ایک عام رعب طاری ہوجاتا تھا، تختِ شاہی کے بنانے میں بھی ایک عجیب حکمت صرف کیگئی تھی - آفتاب جیسے جیسے حرکت کرتا تھا، شاہی تخت بھی گھوم گھوم کر آفتاب کے مقابل ہوجاتا تھا[۲]-

ابوالقاسم عباس جو حکیم الاندلس کے نام سے مشہور ہے، اُسنے اپنی معلومات سے حیرت انگیز عجائبات دکھائے، اندلس میں کوئی شیشہ نہیں جانتا تھا - سب سے پہلے اندلس میں اسی نے پتھر سے شیشہ نکالا، اُسنے ایک نئی قسم کی گھڑی نکالی، جسکا نام اُسنے منقال رکھا تھا - حکیم الاندلس نے ایک عجیب و غریب گنبد آسمان کی شکل کا بھی بنایا تھا، جسمیں دیکھنے والوں کو رعد، ابر، ستارے، بجلیاں، سب تخیل کی نگاہ سے نظر آتی تھیں - مومن بن سعید ایک اندلسی شاعر نے اِس گنبد کا تذکرہ کرکے ابوالقاسم عباس کی ہجو لکھی ہے، جسکا ماحصل یہ ہے کہ سب کچھ تو بنا چکے، اب خدائی کا

[۱] نفح الطیب ص ۲۴۷ ج ۱ - [۲] نفح الطیب ص ۲۴۷ ج ۱ -

دعوے اکیوں نہیں کرتے،

اُڑنے کے مصنوعی پر جنکو لگا کر آدمی کچھ دُور تک اُڑ سکتا ہے یورپ میں ایک فرانسیسی لوہارنے بنائے تھے، جسکا نام پاسینہ تھا - پاسینہ کے بعد بلینشر نام ایک دوسرے فرانسیسی نے اس مفید ایجاد کو کچھ ترقی دی، برابر لوگ اسمیں کوشش کرتے رہے - آخر کار ۱۸۰۶ء میں یہ ایجاد تکمیل کو پہونچی -

مگر دراصل اسکے پہلے موجد مسلمان ہیں، یہی ابو القاسم عباس پہلا اُڑنیوالا ہے علامہ مقری نے اسکا اسطرح تذکرہ کیا ہے -

واحتال فی تطییر جثمانه وکسا نفسه الریش ومدّله جناحین فطار فی الجو مسافة بعيدة ولكنه لم يحسن الاحتيال فی وقوعه فتاذّی فی مؤخره[۱]	ابو القاسم نے اپنے اُڑنے کی بھی ایک تدبیر نکالی تھی، اپنے بدن میں پر لگائے تھے اور دو بازو بنائے تھے، جن سے کچھ دُور تک ہوا میں اُڑا لیکن اچھی طرح اُتر نہ سکا، گر پڑا - اور گُدی میں چوٹ آئی،

مقیاس الماء جس سے دریا میں پانی کا گھٹاؤ بڑھاؤ معلوم ہوتا ہے عبد العزیز بن مروان نے جزیرۃ الصناعۃ میں بنوایا تھا - جزیرۃ الصناعۃ کی آبادی بھی عجب قسم کی تھی، جزیرۃ الصناعۃ، فسطاط اور جیزہ کے درمیان واقع تھا، لوگ کشتی پر بیٹھ کر آتے جاتے تھے، فسطاط سے جزیرے تک پُل تھا اور جزیرے سے جیزہ تک پُل تھا انھیں دونوں پُلوں سے لوگ آتے جاتے تھے[۲]

روئی سے کاغذ بنانا مسلمانوں نے یورپ کو سکھایا - شکر بنانے کی ترکیب یورپ نے مسلمانوں سے سیکھی، واٹر مل سب سے پہلے مسلمانوں نے اندلس میں بنایا اور بڑے بڑے کارخانے قائم کئے - [۳] جنگی جہازات طیار کئے -

---

۱ نفح الطیب ص ۲۳۱ - ج ۲ - ۲ تاریخ مسعودی ج ۱ ص ۴۳۴ -

۳ سیاحۃ المعارف ص ۳۲۰ -

دریاؤں اور نہروں سے واٹر پمپ کے ذریعہ دُور دراز مقامات میں پانی لیجانے کی راہ پہلے مسلمانوں نے نکالی، حاکم بامر اللہ خلیفۂ مصر کے ایما سے ابن ہیثم بصری المتوفی سنہ ۴۲۹ھ نے دریائے نیل سے کھیتوں میں پانی لانے کی تدبیر نکالی[1]، مگر راستہ کی دشوار گزاری کو دیکھکر ابن ہیثم کی ہمت نہ پڑی، بہرحال اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمان اپنے عہد میں اِس قسم کے کام انجام دیتے تھے۔

عام خیال ہے کہ طبعیات کی باقاعدہ تعلیم گو مسلمانوں میں ہوتی ہو مگر آلات کی مدد سے مسائل طبعیہ کا ثبوت یورپ کی ایجاد ہے مگر ہمکو اسکے تسلیم کرنے میں بھی تامل ہے، یہ ضرور ہے کہ اِس کثرت سے ہر مسئلہ کا ثبوت آلات سے نہ تھا، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں میں طبعیات کے لیے اس قسم کے آلات کا رواج تھا، اور اِس قسم کے آلات اُنھوں نے خود بنائے جن میں سے حسب ذیل ہم کو معلوم ہیں، اور کتابوں میں انکا تذکرہ ہے۔

طبعیات کا ایک　یہ مسئلہ ہے کہ عالم میں کوئی جگہ خالی نہیں ہے دنیا کا ہر نقطہ ظرف کسی نہ کسی چیز سے بھرا ہوا ہے، ہم جس چیز کو خالی کہتے ہیں، اُسکا مطلب یہ ہے کہ اُسمیں کوئی سائل یا جامد چیز نہیں ہے ورنہ کونسی جگہ ہوا یا اثیر سے خالی ہے، یہ بالکل محال ہے کہ دنیا میں کوئی ذرا سی جگہ بھی خالی ہو، جہاں کوئی جگہ خالی ہونی چاہتی ہے فوراً ہوا اُسکے بھرنیکے لئے دوڑتی ہے، اس مسئلے کو اصطلاح طبعیات میں عدم خلا کہتے ہیں، عدم خلا کے ثبوت پر بہت عقلی دلائل قائم ہیں مگر بعض اہل فہم نے مشاہدہ اور تجربہ سے بھی اسکو ثابت کیا ہے اور اُسکے لئے خاص خاص آلات بنائے ہیں۔

قدح الجور، یہ ایک ظرف ہے جو کسی خاص ترکیب سے بنایا گیا ہے، اسمیں نہر وا

[1] طبقات الاطبا - ج ۲ - ص ۹۰ -

درجے بنے ہوئے ہیں، جہانتک پانی بھرنا ہوتا ہے، اگر سب سے نیچے درجے تک یا کل ظرف پانی سے بھرا ہوگا تو پانی پیالے میں ٹھہرا رہیگا۔ اور اگر ایک درجہ بھی پانی ان دونوں سے کم یا زیادہ ہوگا تو سارا پانی گرجائیگا اور ایک قطرہ بھی پانی میں باقی نہ رہیگا[1]

قدح العدل، یہ بھی ایک خاص قسم کا بنایا ہوا پیالہ ہے، جس میں درجے بنے ہوئے ہیں اگر سب سے کم درجے تک پانی رہیگا تو باقی رہیگا اور جہاں اس سے ذرا بھی پانی بڑھا فوراً کل پانی گر پڑیگا[1]۔

زراقات۔ یہ ایک تانبے کی لمبی مخروطی نلی ہے، جسکا ایک دہانہ چوڑا ہے اور دوسرا بالکل تنگ، نلی پر نشان کے نمبر دیے رہتے ہیں، اُسکے اندر ایک تیلی ہوتی ہے جو ایک طرف سے تو تیلی ہوتی ہے اور دوسری طرف سے اتنی موٹی ہوتی ہے کہ چوڑے دہانے کے اندر آسانی سے آجا سکے۔ اس نلی کو پانی سے بھردو اور تیلی سے چوڑے دہانے کو بند کردو، اور تنگ دہانہ زمین کی طرف نیچے لٹکادو، ایک قطرہ بھی نہ گریگا۔ اب اُس تیلی سے زور کرکے پانی گراؤ تو گر جائیگا۔ پہلے کیوں نہ گرا؟ اِسلئے کہ اگر گرجاتا تو نلی میں خلا ہوجاتا اور ہوا کسی طرف سے اُس میں جا نہیں سکتی تھی، کیونکہ ایک دہانہ تو تیلی سے بند ہے اور دوسرا سوراخ پانی سے رُکا ہے[2]۔

سراقات، یہ بھی ایک نلی ہے، جسمیں پانی بھرا ہوتا ہے، اُسمیں دو سوراخ ہوتے ہیں، ایک وسیع اور ایک نہایت تنگ، اگر بڑا سوراخ بند کردیں تو دوسرے تنگ دہانہ سے پانی ہرگز نگریگا۔ ہاں اگر اوپر کا بڑا سوراخ کھولدیا جاے تو ہوا کے آنے کی چونکہ جگہ ہوجائیگی، اِسلئے پانی گرجائیگا[2]۔

سراقات کی ایک دوسری شکل یہ ہے کہ اُس نلی میں تیلی لیکر اُسکا تنگ دہانہ

[1] کشف الظنون ص ۱۰۸ ج ۱۔ [2] شرح مواقف ج ۲ ص ۹۷۔

پانی میں ڈالدو پھر فوراً تیلی کچھ دور تک اوپر کھینچ لو پانی بھی فوراً اوپر چڑھ آئیگا، کیونکہ تیلی کھینچ لینے سے نلی کچھ خالی ہو جائیگی، اور اوپر کا سوراخ تیلی سے بند ہے نیچے کا دہانہ پانی میں ہے۔ اب ہوا تو کسی طرف سے اُس خلا کو بھر نہیں سکتی اسلیئے پانی اوپر چڑھ جاتا ہے اور اُس خلا کو بھر دیتا ہے۔

آلۃ التقطیر، تحلیل جز اکے لیئے قرع انبیق کے نام سے مشہور آلہ ہے۔

آلۃ وزن الفلزات۔ ابوریحان بیرونی کی تحقیق ہے کہ اگر کسی چیز کا وزن پانی کے بغیر سو تولے ہو تو پانی میں اُسکا وزن کچھ کم ہو جائیگا، نیز اگر ترازو کے ایک پلّہ میں کوئی ایسی چیز ہو جسکا ثقل نوعی کم ہے اور دوسرے پلے میں ایسی شئے ہو جسکا ثقل نوعی پہلے سے زیادہ ہو تو گو دونوں پلّوں کا وزن ہوا میں برابر ہو مگر جب پانی میں دونوں پلّوں کو رکھینگے تو ثقیل الوزن شئے کا پلّہ بھاری ہو جائیگا، اور اگر ایک پلّہ پانی میں ہو اور دوسرا ہوا میں تو ہوا کا پلّہ جھک جائیگا خواہ وہ ثقیل الوزن ہو یا خفیف الوزن۔

ان سب صورتوں میں تفاوت اوزان کیا ہوگا؟ اسکے دریافت کرنے کے لئے بیرونی نے مذکورۂ بالا آلہ خوارزم میں بنایا تھا، اس آلہ کی جو تصویر لوگوں نے لوگوں نے الفاظ سے کھینچی ہے وہ بالکل ناقص ہے، لیکن جو کچھ ہے وہ ہدیۂ ناظرین ہے اس آلہ کی شکل کی نسبت جو بیان کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ایک لمبی سی ٹیڑھی ٹونٹی تھی، ٹونٹی کے نیچے ایک ہلکی سی ترازو لگی تھی، جس سے اُس پانی کا وزن معلوم ہوتا تھا جو اُس ظرف سے گرتا تھا، فلزات خوب صاف کر کے اُس ظرف میں ڈال دیے جاتے تھے۔ آلۃ الوزن پانی سے بھرا رہتا تھا۔ ظاہر تھا کہ جب پانی سے بھرے ہوئے کسی برتن میں کوئی چیز ڈالی جائیگی تو کچھ نہ کچھ پانی ضرور گر جائیگا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ پانی اُس چیز کی ضخامت اور جسامت کے موافق باہر گریگا، یہی پانی ٹونٹی سے نکلکر ترازو کے ایک پلّے میں جمع ہوتا تھا، اِسی پانی کے وزن سے فلزات کا وزن دریافت ہوتا تھا

مثلاً صاف سونا جسکا وزن ہوا کی ترازو میں سو تولہ تھا، اگر پانی میں ڈالدیں تو ضرور پانی میں کچھہ وزن کم ہو جائیگا جتنا کم ہوگا وہ یہ آلہ بتائیگا، سو تولہ سونا ڈالنے سے اُس آلہ سے کچھہ پانی نکلکر ٹونٹی کے نیچے کی ترازو میں گرپڑتا تھا، ترازو سے معلوم ہو جاتا تھا کہ کتنا پانی گرا، اُس پانی کا جتنا وزن ہوتا تھا، اُتنا وزن سونے کے اصلی وزن سے گھٹا دیا جاتا تھا، باقی وہ وزن نکل آتا تھا جو پانی میں سونے کا باقی رہتا تھا اس آلہ سے اور بھی ثقل ور وزن کے بہت سے عجائبات ظاہر ہوتے تھے[۱]

سید سلیمان

دہلی میں شاہجہاں آباد کی عمارات کے تغیرات

(نمبر ۲)

دہلی ایسی جگہ بسی ہو کہ جس میں جلب منفعت اور دفع مضرت کے وہ سارے سامان اور اسباب موجود ہیں جو بڑے شہروں میں ہونے چاہئیں۔ اس کی ایک جانب میں جمنا اسکے پانوں تلے لوٹ رہی ہو کہ جس سے سارے شہر کے آدمیوں کو پانی کا آرام اور نفع ملتا ہے دوسری طرف اسکے سر پر اراولی پربت کی ایک شاخ جھوم رہی ہے کہ اسکو دشمنوں سے پناہ میں رکھتی ہے۔ اُسکے گرد اگرد چراگاہیں بہت سی ہیں، جنسے مویشی کو چارہ گھاس پیٹ بھر کے آسانی سے ملتا ہے۔ اسکے گرد زمین زرخیز ہے جسکے پیداوار سے سارا شہر سیر ہوتا ہے۔ اسکے چاروں طرف ہندوستان کے دُور دُور کے شہروں تک ایسے رستے بنے ہوئے ہیں کہ ہر قسم کا اسباب تجارت اسکے بازاروں میں بے تکلف آتا جاتا ہے۔ ایشیا میں اسکا ایسا مقام ہے کہ اسکا بادشاہ اُولوالعزم

---

[۱] شرح مقاصد۔ ج ۱ ص ۳۷۴۔

کشور کشا چاہے تو مغرب میں اپنا بایاں ہاتھ پھیلا کر فارس و ترکستان کو اور مشرق میں دایاں ہاتھ پھیلا کر چین کو اور دونوں پانوں پھیلا کر ایشیا کے تمام ملکوں کو اپنے قدموں تلے لا سکتا ہے - اِن خوبیوں کو دیکھ کر ہندوؤں نے اپنے راج میں اُسکو راجدھانی بنایا اور اُن کے بعد مسلمانوں نے اپنی سلطنت میں اسکو دار السلطنت مقرر کیا۔

ہر قوم کے شاہی خاندان کی عظمت و شوکت اُسکے دار السلطنت کی عمارات رفیع الشان سے نمایاں ہوتی ہے، اِسلئے سلاطین اپنے دار السلطنت کو عمارات عالیشان و مکانات رفیع البنیان سے زیب و زینت دیتے ہیں۔ اُستوار قلعے حصار اور عظیم الشان محل و قصر بناتے ہیں، اُن میں گل بُوٹے پتھروں پر کندہ کرا کے گلزار کی بہار دکھاتے ہیں اور تعمیر عمارات کے ہر قسم کے صنّاع دُور دُور سے بلاتے ہیں، اور عجیب صنعتوں کے کام بنواتے ہیں، اُنمیں باغات اور باغات میں نہر و حوض و تالاب بنا کے اُن کو سر سبز و شاداب کرتے ہیں - اگر دار السلطنت کی رونق اور زیب و زینت کا سامان ایک بادشاہ کے عہد میں پورا نہیں ہوتا تو دوسرا بادشاہ اُسکا جانشین اُسکو پورا کرتا ہے - اُمرا شاہی عمارات بنا کے اپنی امارت کی نمایش کرتے ہیں، مگر جب خاندانِ شاہی کا زوال آتا ہے تو پھر دار السلطنت پر وبال آتا ہے اُسکی بہار پر خزاں آجاتی ہے اور عمارات کی پت جھڑ ہو جاتی ہے - دوسرا خاندانِ شاہی جو پہلے تباہ شدہ خاندان کا قائم مقام ہوتا ہے وہ اپنی قدرت اور شوکت دکھانیکے لئے پہلے دار السلطنت کی اُدھیڑ بُن شروع کرتا ہے - اور اپنا ایک نیا دار السلطنت مقرر کرتا ہے اور پہلے دار السلطنت کی عمارات کو مسمار کر کے اُن کے مصالحہ کو اپنی عمارات میں لگاتا ہے - غرض ہمیشہ ایک دار السلطنت بگڑتا ہے اور دوسرا سنورتا ہے - اِسطرح دِلّی میں سات دار السلطنت بنے اور بگڑے ؎

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت	رفت و منزل بدیگری پرداخت

مسلمانوں کی سلطنت کا آخری دار السلطنت شاہجہان آباد تھا، شاہجہان نے آباد کیا تھا
پہلے مسلمان بادشاہوں کو اپنے ساڑھے چار سو برس کی بادشاہی میں ایسا دار السلطنت
بنانا میسّر نہیں ہوا تھا، جیسے آفتاب غروب ہو کر اپنی روشنی کو چاند میں دکھاتا ہے۔
ایسے ہی شاہجہاں آباد کی بعض عمارات مسلمانوں کی سلطنت کے غروب ہوئے
آفتاب کی روشنی تاباں کرتی ہیں، جیسے غروب ہوئے آفتاب کی غائب حرارت کو
زمین نمایاں کرتی ہے ایسے ہی مسلمانوں کی سلطنت کے غروب شدہ آفتاب کی حرارت کو
دلّی کی عمارات کے کھنڈرات دیواروں کے سایہ تلے سردی کیصورت میں اپنی بہار دکھاتے
ہیں۔ شاہجہاں آباد کا بانی شاہجہاں فنِ تعمیر میں وہ ملکہ رکھتا تھا کہ شاید ہی دنیا میں دو چار
ہی بادشاہ ایسے گزرے ہوں جو اس فن میں اسکی ہمسری کر سکیں۔ اسنے جتنی عمارات
بنائیں اُن میں وہ صنعت ہے کہ نہ جسکا بیان الفاظ میں ہو سکے، نہ وہ تصویر میں کھینچ سکے
نہ فوٹو میں اُتر سکے جس عمارت عالیشان کو اُسنے بنوانا شروع کیا تعجب ہے کہ وہ اسکی عمر میں
ختم ہو گئی۔ ورنہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ کے عہد میں جو بڑی عالیشان عمارت بنی
شروع ہوتی ہے وہ پوری نہیں بنتی کہ اسکی عمر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ خاص اسی بادشاہ کی
خوش اقبالی تھی کہ اسکی زندگی میں اتنی عمارات عالیشان پوری تعمیر ہو گئیں۔ تاریخ میں مثال
بھی ایسی بے نظیر ہے، جیسی اسکی عمارتیں بے مثل ہیں۔ ان عمارات کی صنعت میں عجیب
سحر و طلسم ہے کہ جب انپر آثار کہنگی نمودار ہوئے انکا دُور کرنیوالا اور از سرِ نو تازہ بنانیوالا
پیدا ہو گیا۔ جب کسی نے انپر اپنا دستِ ستم اُٹھایا تو اُنکا نیچا کرنے والا اور ستم کی مکافات
پیدا کرنیوالا پیدا ہو گیا۔

آگرہ تاج شاہجہاں کی عمارات کا سرتاج ہے جب لارڈ ولیم **بنٹنگ** کے عہد
میں یہ تباہی آئی کہ اُسکا سنگ مرمر اُکھڑ کر اس سبب بکنا شروع ہوا کہ وہ بہت روپے
کو بکتا تھا، بعض عمارتیں مسمار ہو گئیں، انگریزوں کے عیش و طرب و رقص و سرود کے

جلسوں میں جو اُسکے اندر ہوتے تھے اُسکے تمام جواہر انگریز اُکھیڑ اُکھیڑ کر لیگئے - مگر ان سب نقصانوں کی مکافات لارڈ کرزن نے کردی کہ تاج کو پھر آراستہ اور پیراستہ کردیا جیسا کہ وہ شاہجہاں کے عہد میں تھا -

دنیا میں مسجد نبویؐ اور مسجد مکی (حرم) و مسجد بیت المقدس کا تقدس مشہور ہی کہ اُن کی برابر کسیکو وہ تقدس نہیں حاصل ہو سکتا اسلئے جامع مسجد اُنکی برابر تقدس میں نہیں ہی، مگر حسانت میں دنیا کی کل مساجد سے زیادہ ہے، جب آثار کہنگی اُسپر نمودار ہوے تو کوئی نہ کوئی مرمت کرنیوالا اُسکا پیدا ہوگیا - اخیر میں نواب کلب علیخاں والی رامپور نے تو اسکی مرمت وہ کرائی کہ اگر شاہجہاں زندہ ہوتا تو اس سے زیادہ مرمت نہ کراتا - لارڈ کرزن نے اسکے حوض کے چاروں کونوں پر سنگ مرمر کے چار ستون نہایت خوبصورت بنوا دیے - جس سے صحن کی رونق دوچند ہوگئی - سنہ ۱۸۵۷ء میں فتح دہلی کے بعد بہت انگریز یہ چاہتے تھے کہ وہ مسمار ہو مگر لارڈ لارنس نے اُسکو منہدم ہونے سے بچا دیا، غدر میں شہر پر مہینوں تک گولہ زنی رہی مگر اُسکا بال بیکا نہوا - لاہوری دروازے پر باغیوں کا توپ خانہ چلتا تھا، جسنے انگریزوں کو پُرانی عیدگاہ پر اس مسجد کی سیدھ میں مورچہ نہ بنانے دیا، جس سے سیکڑوں گولے اسپر آ نکے پڑتے اور اسکا کام تمام کرتے

قلعہٴ دہلی جو شاہجہاں کا بنایا ہوا ہے اسکے اندر بعض عمارات کو انگریزوں نے دہلی سکے فتح ہونے کے بعد مسمار کردیا - دہلی کے ڈاکٹروں کی یہ راے تھی کہ اسکے اندر ہماری چھاونی ہی، اسکی فصیل کے سبب تازی ہوا نہیں آتی اسلئے بیماری زیادہ رہتی ہے بہتر ہوگا کہ اسکی فصیل ڈھائی جائے مگر میرٹھ کے ڈاکٹروں نے کہا کہ دلی کے ڈاکٹروں کی راے غلط ہے اسکی فصیل چھاونی میں ملیریا بخار کو آنے نہیں دیتی اسلئے وہ برقرار رکھنی چاہیے اسطرح فصیل مسماری سے بچ گئی اور پھر لارڈ کرزن نے قلعہ کی مرمت ایسی شروع کرائی ہے کہ اسمیں پھر سارا نقشہ

شاہجہاں کے وقت کا نظر آئیگا - خلاصہ یہ ہے کہ شاہجہاں کی عمارات میں یہ دو باتیں عجیب وغریب ہیں - اول ایسی متعدد و عالیشان عمارات اُسکی زندگی میں بنی شروع ہوئیں اور ختم ہوگئیں - دوم ابتک اپنے اوپر تین سو برس کے عرصے میں زوال نہیں آنے دیا -

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ جب شاہی خاندان کا زوال آتا ہی تو اُسکے ساتھ ہی اُن کے دار السلطنتوں پر بھی وبال آتا ہے گو اسکی مستثنےٰ مثالیں ہونگی جنکو زوال نہ آیا ہوگا مگر قاعدہ یہ ہے کہ کل کا حکم اکثر پر لگتا ہے - کوئی شخص اگر بادشاہی خاندانوں اور اُن کے دار السلطنتوں کے اقبال اور جاہ وجلال ور زوال کی سیر کرنی چاہے تو وہ دہلی کے گرد ساٹھ میل کے رقبے میں آکر دیکھ لے کہ اسمیں کسطرح سات دار السلطنت بنے اور بگڑے - اس میں ابتک مسلمانوں کی بعض عمارات اور اکثر کھنڈرات ایسے موجود ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو فن تعمیر میں وہ کمال حاصل تھا کہ دنیا میں کوئی اُن کی ہمسری اور برابری نہیں کرسکتا تھا - فن تعمیر سب صنعتوں پر مقدم ہے وہ قوم کی شائستگی اور تہذیب کا پیمانہ اور اسکی سلطنت کے جاہ وجلال کا معیار ہے پس ان عمارات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی اور اُن کی سلطنت کی قدرت وعظمت وجلالت وصولت اپنی معراج پر پہنچ گئی تھی - اُن کے سلاطین نے اپنی نام ونمود اور یادگار کیواسطے اپنے دار السلطنتوں کے شہروں کو عالیشان بے مثل پایدار آباد کیا اور اُن کے گرد فصیلیں وحصار استوار بنائے - اور فصیلوں کے گرد خندقیں کھدوائیں، اُن کو پانی سے بھرا تاکہ دشمن کو اُن تک رسائی دشوار ہو - پھر اُنمیں ایوان وقصر ومحل کو نقش ونگار اور بیل بوٹوں سے آراستہ کیا، اُمرا نے اپنی ثروت کے اظہار کیواسطے بوقلموں رنگا رنگ مکانات تعمیر کرائے - غرض یوں دار السلطنت کو جنت کا نمونہ بنایا - اب ہم اِن سات دار السلطنتوں کا باعتبار زمانہ کے بالترتیب مختصر بیان کرتے ہیں گو ہمارا اصلی مقصود یہ ہے کہ صرف اخیر دار السلطنت شاہجہان آباد کے تعمیرات

کا بیان کریں جنکو مفصل بیان کرینگے۔

اوّل دار السلطنت اندرپرست یعنی پرانی دلّی۔

شاہجہاں آباد کے جنوبی میدانوں میں عمارات کی ویرانی عجب کیفیت دکھاتی ہی ان ہی میں ہندوؤں کی روایات کے موافق اندرپرست تھا، جسکو پانڈؤں کی راجدھانی ہونیکا شرف راجہ یدھشٹر کے زمانے سے چلا آتا ہے جسکا ذکر مہابھارت میں بہت اچھی طرح کیا جاتا ہے۔ اس راجدھانی کے چھوڑنے کی عجب حکایت بیان کی جاتی ہی کہ ایک راجہ کے کھانے کی تھالی پر سے جو سرپوش اُٹھایا گیا تو اُس کے اندر سے مکھی نکلی، جس سے راجہ یہ اشارہ غیبی سمجھا کہ ہمارے اقبال پر زوال آیا کہ جو اس ناچیز مکھی کو یہ گستاخی پر جرات ہوئی، پس وہ راج پاٹ تیاگ کر سیدھا ہمالیہ کے برفستان میں جاکر فنا ہوا۔ پہلے بھی اور اب بھی ہندوؤں کا یہ یقین ہی کہ اندرپرستھ کا وہاں مقام تھا، جہاں پُرانا قلعہ اب موجود ہے اُسکے پاس ایک چھوٹا سا گانوں بھی ہی جسکا نام اندرپت ہی جو اندرپرستھ کے نام کا پتا بتاتا ہے۔ مگر پُرانے قلعہ کی فصیل اُس زمانے کی نہیں ہے وہ ہمایوں کی بنائی ہوئی ہے۔ اُس شہر کا نام ونشان اب باقی نہیں ہے کہتے ہیں کہ وہ سنہ ۱۴۵۰ قبل از مسیح آباد ہوا تھا۔

اندرپرستھ کے بدلے میں دلّی کا نام بھاٹوں کے کبتوں میں لیا جانے لگا۔ ایک کبت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے اِس شہر کو ۷۹۲ برسوں تک چھوڑ دیا، اننگ پال نے سنہ ۷۳۶ء میں اسکو از سر نو آباد کیا۔ بیچ میں دلّی کا نام گمنام شہروں میں داخل ہوگیا۔ محمود غزنوی کے حملوں میں جو سنہ ۱۰۰۰ء میں ہوئے تھے اسکا نام نہیں لیا گیا کہ وہ کوئی بڑا شہر تھا۔ اننگ پال کے تواری کے راجاؤں نے سو برس تک بخیر وخوبی راج کیا۔ جب محمود غزنوی نے قنوج کو تاخت وتاراج کیا تو وہاں کے چوہان راجپوت راجاؤں نے سنہ ۱۱۵۱ء میں دلی کو اپنا دار السلطنت بنایا

جسکا آخری راجہ پرتھوی راج (رائے پتھورا) تھا۔ جسکے دادا نے پرانی دلی میں لال کوٹ تعمیر کرایا تھا۔ ۱۱۹۳ء میں پرتھوی راج تلدوڑی کے میدان میں سلطان شہاب الدین غوری سے لڑکر مارا گیا۔ تو پھر یہ پرانی دلی مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی۔ اور اس کے اوّل بادشاہ قطب الدین ایبک نے اسکو اپنا تختگاہ بنایا اور اسنے عمارات کی تعمیر شروع کی جنمیں سے قطب منار اُسکی یادگار ابتک موجود ہے۔

دوسرا دار السلطنت سیری

جب یہ اوّل خاندان ترکوں کا تباہ ہوا اور اسکا قائم مقام دوسرا خاندان خلجی ہوا تو پرانی دلی کا رقبہ آبادی کی افزایش کے لئے کافی نہ رہا اور اسکی نواح شمال و مشرق میں آبادی پھیلنی شروع ہوئی اور مغلوں نے بھی اُسپر حملہ کیا تو سلطان علاء الدین خلجی ۱۳۰۳ء میں اپنی سپاہ کو سیری میں پناہ کے لئے لیگیا اور جب مغل یہاں سے چلے گئے تو اُسنے دوسرا دار السلطنت سیری بنایا۔

تیسرا دار السلطنت تغلق آباد

جب دوسرے خاندان خلجی کو بھی زوال آیا تو تیسرا خاندان تغلق اُسکا جانشین ہوا اُمرا خلجی نے سیری کو سلام کیا تو تغلق شاہ نے ایک نیا شہر تغلق آباد مشرق کیطرف پانچ میل احاطہ کا آباد کیا۔ جسکی ویرانی کی یہ حکایت بیان کیجاتی ہے کہ سلطان نظام الدین نے اُسکو بد دعا دی کہ "وہ رہے اُوجڑ یا بسے گوجر" اس بد دعا کا اثر تغلق آباد پر ابتک چلا جاتا ہے

چوتھا دار السلطنت جہاں پناہ

پُرانی دلی اور سیری میں آبادی زیادہ ہوتی جاتی تھی اور اُسکی محافظت اچھی طرح

نہیں ہو سکتی تھی اسلیے محمد تغلق نے جو دوسرا بادشاہ اس خاندان کا تھا ان دونوں شہروں کے گرد ایک فصیل کھنچوائی اور شہر کا نام جہاں پناہ رکھا اسکی بھی فصیل کا ایک حصہ ابتک موجود ہے

پانچواں دار السلطنت فیروز آباد

جب محمد شاہ کا مستقل جانشین فیروز شاہ ہوا۔ تو اُسنے بھی ایک نیا شہر فیروز آباد سنہ ۱۳۵۴ء میں سیری کے شمال مشرق میں پانچ میل پر آباد کیا۔

چھٹا دار السلطنت شیر شاہ اور اسلام شاہ کا

جب مغلوں کی سلطنت کا آغاز ہوا تو ہمایوں نے سنہ ۱۵۳۴ء میں پرانے قلعہ کی فصیل بنا کے اسکا نام دین پناہ رکھا۔ پھر شیر شاہ نے ہندوستان سے ہمایوں کو نکال دیا تو شیر شاہ اور اُسکے بیٹے اسلام شاہ نے ایک چھٹا شہر آباد کیا اور اُسکی فصیل بنائی۔ اُس میں فیروز آباد کا ایک حصہ بھی داخل تھا۔ اِس شہر کی چند فیٹ فصیل اب بھی موجود ہے

ساتواں آخری دار السلطنت شاہجہان آباد

یہ آخری شہر دار السلطنت شاہجہاں نے سنہ ۱۶۴۸ء میں شاہجہاں آباد آباد کیا ہے جسنے فیروز آباد کی اور پہلی فصیلوں کے مسالوں کو اس اپنے شہر کی عمارات میں لگایا اور اسکی پیروی کر کے اسیطرح اُمرا نے بھی اپنی بڑی عالیشان عمارات بنائیں۔ پس ہم نے تاریخ وار ساتوں دار السلطنتوں کا بیان لکھ دیا۔

دار السلطنتوں کے جلد جلد تبدیلیوں کے باب میں ہندوؤں کی اس ضرب المثل کا بیان کہ شہروں کو دریا اور بادل اور بادشاہ آباد کرتے ہیں، خالی از لطف نہیں۔ دریا اور بادل پانی سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں دریا نہ ہو، یا بادلوں کی بارش سے

ندی نالے تال تلیاں نہ بھرتی ہوں وہاں کسی شہر کا آباد ہونا ناممکن ہے - ان دار السلطنتوں کے آس پاس جمنا بہتی تھی مگر وہ ایسی چنچل و چھلاوا ہے کہ اپنے بہنے کے مقامات کو بدلتی رہتی ہے، امحدود حدود میں بہنا جانتی نہیں - اِسکے کناروں کی مٹی ایسی نرم اور پولی ہے، کہ جب برسات میں وہ بارش سے یا ہمالیہ کی برف گلنے سے چڑھتی ہے تو اپنے کناروں کو کاٹتی ہوئی کہیں سے کہیں بہنے لگتی ہے - پس اسکی روانی کا تلوّن دار السلطنتوں کے مقامات بدلنے میں کچھ اثر کرتا تھا، مگر اصل سبب اُن کے بدلنے کا وہی تھا جو اوپر ہم نے اوّل بیان کیا ہے -

شاہجہاں آباد جو مسلمانوں کی سلطنت کا آخری دار الملک تھا اِس کی سرگذشت مسلمانوں کے اور دار السلطنتوں کی سی نہیں ہو کہ اُسکو کسی بادشاہ نے غارت کر کے ویرانہ بنا دیا ہو، بلکہ اس میں سنہ ۱۸۰۳ء میں انگریزی عملداری ہوگئی جسنے اِس شہر کو تباہ نہیں کیا اور خاندانِ تیمور کی بادشاہی کا نام ونشان نہیں مٹایا بلکہ اسکا بادشاہ بے اختیار برائے نام برقرار رکھا ڈھنڈوروں میں یہی پٹتا رہا کہ خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا حکم سرکار کمپنی کا، مگر سنہ ۱۸۵۷ء میں یہ صورت نہ رہی، عجب خدا کی قدرت کا جلوہ نظر آیا کہ مئی سنہ ۱۸۵۷ء ہی میں سرکار کی سپاہ نے بغاوت کی اور اِس سپاہ کے ہزاروں سپاہی پیدل اور سوار لاکھوں روپیہ کا خزانہ اور بڑا اسامان حرب وضرب لیکر دلّی میں آئے اور اُنھوں نے اِس برائے نام بادشاہ کو جو سرکار کمپنی کا ایک لاکھ روپیہ کا پنشن خوار تھا پھر بادشاہ بنا دیا اور ڈھنڈورے میں سے حکم سرکار کمپنی کا اُڑا دیا -

۱۱ - مئی سنہ ۱۸۵۷ء سے ستمبر سنہ ۱۸۵۷ء تک چار مہینے کئی روز تک بہادر شاہ بادشاہ رہا - انگریزوں نے اِس شہر کو بڑی بہادری سے فتح کیا، بادشاہ کو برہما میں جلا وطن کیا، جسکے سبب سے شاہجہاں آباد کے حالات میں تغیرات کا آغاز ہوا - سب سے اول شہر کی فصیل میں تغیرات ہوئے ہیں اسلئے ہم اسکا بیان اول لکھتے ہیں -

شاہجہان آباد کی فصیل کے تغیرات

آثار الصنادید میں لکھا ہے کہ شاہجہان نے اس شہر کی فصیل چونے اور پتھر کی چار لاکھ روپیہ خرچ کر کے بنوائی تھی، اسکا طول چھ ہزار چھ سو سٹھ گز تھا، عرض چار گز، بلندی نو گز تھی - اسکے ستائیس ۲۷ برج دس دس گز قطر کے تھے اسکے نیچے پشتہ باہر کیطرف دو ڈھائی گز کا تھا اور اسکے آگے گہری خندق تھی - مگر یہ خندق دریا کی جانب میں نہ تھی اور فصیل بھی دریا گنج کے گرد دریا کی طرف نہ تھی، مگر جب سنہ ۱۸۰۳ء میں انگریزی عملداری آئی اور دریا گنج میں اسکے لشکر نے چھاونی بنائی اور سنہ ۱۸۰۴ء میں مرہٹوں کا بھی حملہ ہوا، تو سرکار کو حصار استوار کی ضرورت ہوئی، شاہجہانی فصیل جو اسوقت ٹوٹی پھوٹی پڑی تھی اسکی مرمت بتفصیل ذیل کرائی - دریا کی سمت میں دریا گنج کے گرد فصیل قلعہ کی کھائی تک بنوائی - پہلے فصیل میں برج جا بجا تھے اور ان میں بندوق لگانیکی - جیاں بنی ہوئی تھیں، مگر توپوں کے چڑھانے کا سامان کچھ نہ تھا، انگریزوں نے بسیٹ پون یعنی گرگج دمدمے و گھونگس بنوائے اور ان کے نام بتفصیل ذیل اس زمانہ کے بڑے بڑے نامور انگریزوں کے نام پر رکھے -

موئر برن - گارسٹن، اکٹر لونی، ولزلی، خندق اور پشتہ کی مرمت کی اور تمام مکانات جو فصیل کے آس پاس تھے، ان کو مسمار کیا تاکہ فصیل کے آگے کھلا میدان توپوں اور بندوقوں کے مارنے کے لئے ہو - مارٹیلو برج بنوائے جو فصیل سے جدا تھے مگر ان کے اور فصیل کے درمیان پل ایسے تھے کہ جب ان کو چاہو باندھ لو یا ہٹا لو - غرض ان کے بنانے سے یہ تھی کہ اگر شہر کے اندر کوئی ہنگامہ فساد برپا ہو تو انپر سے توپیں مفسدوں پر چلائی جائیں - خلاصہ یہ ہے - کہ انگریزوں نے اس فصیل کو برج و بارہ و گرگج و دمدمے و گھونگسوں سے ایسا استوار بنا دیا کہ اسپر سینکڑوں توپیں چڑھ سکتی تھیں، جنکو تھوڑا سا لشکر بھی چلا کے حملہ آوروں کے لشکر جرار کو بھی کوسوں تک شہر کے پاس پہنچنے نہیں دیتا - انھوں نے تو اپنے بچاؤ کے

لیے حملہ آوروں سے یہ فصیل بنائی تھی، مگر اسکی کیا خبر تھی کہ غدر ہوگا تو ہم کو خود اس فصیل کو توڑنا پڑیگا۔ وہ ہمکو چار مہینے کئی دن تک جھلائیگی اور ہم پر گولے بندوق چلائیگی اور شہر کے پاس نہ آنے دیگی، جب تک ہمارے سینکڑوں سروں کو نہ اڑائیگی، ہم کو قدم اندر نہیں رکھنے دیگی۔

شاہجہاں آباد کے گرد یہ فصیل ساڑھے پانچ میل طول میں ہے، جنوب شرق میں ڈھائی میل، جس میں دریا کی طرف قلعہ کی پون میل کرسی فصیل کی برابر اونچی سنگ سرخ کی بنی ہوئی داخل ہے، اس فصیل سے باہر وہ ڈھائی میل یہ پہاڑی ہے، جسپر انگریزوں نے اپنے مورچے باغیوں سے لڑنے کے لئے بنا کے شہر پر کئی مہینے تک گولے برسائے اور شمال میں آدھ میل فصیل پر کشمیری دروازے سے موری دروازے تک گولے ایسے مارے کہ فصیل کھڑ گنجی ہوگئی، جابجا اسمیں کھنداسئے پڑ گئے، موری دروازے کا کرنج گولوں سے مسمار ہوکر ڈھیر ہوگیا۔ کشمیری دروازے کی فصیل کو گولوں سے توڑ کر اور اسکے کواڑوں کو باروت کے پیپوں سے اڑا کر انگریزی سپاہ داخل ہوئی اور پھر سارے شہر کو کئی دن میں فتح کر لیا۔

اس شہر کی یہ فصیل ایسی حسین اور حصین ہے کہ ہندوستان میں کسی اور شہر کی نہ تھی، لیکن اب اسکی بہار کے دن گئے خزاں کے دن آئے جابجا اسکے انجر پنجر ڈھیلے ہوتے جاتے ہیں۔ پچاس برس سے مرمت نہیں ہوئی۔ سرکار کا ارادہ تو اسکے مسمار کرنے کا تھا مگر وہ استوار ایسی تھی کہ لاکھوں روپیوں میں وہ منہدم ہوتی اسلئے اسکو ڈھایا نہیں۔ وہ اگر اسیطرح بے مرمت پڑی رہیگی اور اس کی دیوار میں جابجا درسپٹے رہینگے تو بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلیگی اور اس شکستہ حالی میں بھی اپنی بے مثالی کو دکھائیگی۔

فصیل کے گرد پُشتہ اور خندق

باہر کیطرف فصیل کے نیچے پانچ سات فیٹ عرض کی پٹری تھی، اور اُس کے آگے گہری خندق تھی، پُشتہ تو بدستور ہے مگر خندق کے وسط میں کشمیری دروازے سے لیکر دلی دروازے تک بیچوں بیچ میں چونے اور پتھر کی نالی اوپر سے کھلی ہوئی بنادی ہے جسمیں شہر کی موریوں کا پانی بہتا ہے اور دلی دروازے کے قریب جاکر جمنا میں ملتا ہے، اب خندق میں برسات کا پانی پہلی طرح سے نہیں بھرتا، اسی نالی میں ہوکر دریا میں جاملتا ہے۔

شاہجہان آباد کی فصیل کے دروازے و تغیرات

مسلمان پادشاہوں کو کشمیر و کابل دروازوں کے نام سے زیادہ تعلق رہتا تھا اسلئے اُنھوں نے شہروں کے رُخ پر شہر کے دروازے بناکے اُن کے نام کشمیری، کابلی، لاہوری، اجمیری رکھے۔ ایک دروازے سے باہر پُرانی دلی کو راستہ جاتا تھا اسلئے اُسکا نام دہلی دروازہ رکھا۔ اِن دروازوں سے اِن شہروں کو سڑکیں جاتی تھیں، رات دن مُسافروں اور اسباب تجارت کی آمد و رفت رہتی تھی۔ سرکار کمپنی کا دار السلطنت شہر کلکتہ تھا، اُسکو زیادہ تعلق کلکتہ سے رہتا تھا۔ اِسلئے اُسنے دریا کیطرف مشرق و جنوب میں قلعہ کی بغل میں ایک دُھرا دروازہ ایک آنے کا دوسرا جانے کا بنایا، اُسکا نام کلکتہ دروازہ رکھا، جو نہایت موزوں نام تھا۔ اب ہم دریا کی مشرقی سمت سے شروع کر کے بہ ترتیب ہر دروازے کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) کلکتہ دروازہ

سب سے اوّل اس سمت میں کلکتہ دروازہ ہے جسکی عمر سب دروازوں سے

کم ہوئی، حالتِ طفلی میں موت آگئی، جب کلکتہ اور دلی میں ٹرنک روڈ (شاہراہ) گنگر
کی بن کے تیار ہوئی تو وہ شاہجہاں آباد کے چاندنی چوک کی سڑک سے اس طرح
ملائی گئی کہ اسکی سیدھ میں جمنا پر سلیم گڈہ کے متصل کشتیوں کا پل باندھا گیا
اور اسکی سیدھ میں دریا میں اونچا پختہ پشتہ بنایا گیا اور اسپر کنکر کی سڑک بنائی گئی
اور اس سڑک کا تین در کا پل سلیم گڑہ کے پل کے محاذی نہایت خوبصورت بنایا گیا
اسکے پاس سامنے فصیل توڑ کے دوہرا دروازہ ایک آنے کا دوسرا جانے کا
بنایا گیا اور اسکی پیشانی پر یہ کتابہ سنگ مرمر کا لگایا گیا۔ (کلکتہ دروازہ ۱۸۵۲ء)

شہر کے سب دروازوں سے زیادہ اس دروازے پر آمد و رفت رہتی تھی۔
شہر سے پورب کی کل ڈاکیں اس دروازے میں ہو کر جاتی تھیں۔ ادہر سے کرانچیاں
اور چھکڑے اسباب تجارت سے لدے ہوئے شہر میں آتے تھے۔ شہر کی خوردنی
کی چیزیں جمنا پار سے آتی تھیں۔ صبح کیوقت لدے ہوئے گاڑی چھکڑوں، اہل اصطبل
گدھے ٹٹوؤں کا تانتا نہیں ٹوٹتا تھا۔ اتوار کو ایک میلہ کلکتہ دروازے کے آگے سڑک
پر ہوتا تھا جسے دیکھکر سارا شہر خوش ہوتا تھا۔ اسکا ذکر میلوں کے باب میں کرونگا۔
اس دروازے کو جیسا ایک سڑک ٹرنک روڈ نے بنوایا تھا ایسا ہی اسکو دوسری
ریل کی سڑک نے ڈھوایا۔ جب شہر میں ریل کی سڑک آئی تو جمنا پر اسکا آہنی پل
بنا جسنے کشتیوں کے پل کو اڑایا، پھر ریل کی یہ سڑک سلیم گڑہ کے وسط میں
گذری، جسکے سبب سے اس دروازے کو ڈھانا پڑا۔ اس کے بجائے ریل کی سڑک
کے نیچے دو تنگ در بنائے گئے جسکے اوپر کتابہ کلکتہ دروازہ ۱۸۵۲ء لگایا گیا
گیا۔ وہ دوہرے فضا دار دروازے تھے یا اب اسکی جگہ یہ دو تنگنا، در ہیں۔

(۲) نگم بودہ دروازہ

کلکتہ دروازے کے آگے تھوڑی دور پر نگم بودہ دروازہ ہے جو [illegible]

کمپنی نے فصیل کی مرمت کے ساتھ بنوایا تھا وہ شاہجہانی دروازہ نہیں ہے - غدر سے پہلے اس دروازے میں سے سارے ہندو عورت مرد جمنا میں اشنان کرنے آتے تھے اور اُن کے مُردے اسمیں سے مرگھٹ میں جلانیکے لئے جاتے تھے کاتک کے مہینے میں سورج نکلنے سے پہلے نہانیوالوں کا یہاں جمگھٹ لگا رہتا تھا اُسکے آگے فصیل سے باہر جمنا بہتی تھی، اور اُسکے پیچھے فصیل کے اندر جمنا کی نہر جاری تھی، اور اُسکی ایک چادر چھوٹتی تھی - اُسکے آس پاس مندر بھی بہت سے تھے اور اُنکو بندر گھیرے رہتے تھے، ان بندروں کو مندروں میں خوب بھوجن کھانیکو ملتے تھے، نہر اُن کے تیرنے کے لئے اور اُسکے اوپر درخت رہنے کیلئے موجود تھے - بندروں کا تماشا جو یہاں دیکھنے میں آتا تھا ایسا کہیں اور شہر میں نظر نہیں آتا تھا کہ کبھی بندر درختوں میں لٹکتے ہیں کبھی ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگیں مارتے ہیں، پھُننگیوں پر چڑھتے ہیں، بندریاں بچوں کو پیٹے لگائے پڑی پھرتی ہیں - یہاں یہ بندروں کا تماشا ابتک بھی موجود ہے، لیکن نہر ایک گندہ نالہ ہوگئی ہے اُس کی پہلی چادر کا پتا نہیں، جمنا نے بھی اپنا رُخ نگم بودھ سے پھیر لیا ہے، کیا اسکے نیچے بہتی تھی اب دو میل کے فاصلے پر چلی گئی، جہاں اسکا پانی بہتا تھا وہاں اب بیلا ہے جہاں صاف پانی اپنی لہریں دکھاتا تھا اب وہاں گھاس پھُوس اور جنگلی درخت اپنی سبزی دکھاتے ہیں - یہاں نگم بودھ کے گھاٹ بہت سے خوبصورت پختہ بنے ہوئے تھے جو اب ویران ہوتے جاتے ہیں، بعض بالکل سنگین تھے وہ اب کھنڈر ہوگئے ہیں، کسی کی چھتیں اور دیواریں گری پڑی ہیں، کسی کے ستون و مرغولے اُفتادہ ہوکر الگ پڑے ہیں، غرض اُن کے دیکھنے سے بڑی عبرت ہوتی ہے کہ یہاں کیا انقلاب ہوا ہے کہ نہ دریا بہتا ہے نہ وہ گھاٹ کھی جھیل بھل رہتی ہے کہ برہمن ستون پر صندل گھس رہے ہیں، سندور و سفیدہ پیس رہے ہیں -

عورتیں مرد نہا نہا کے اُن کے پاس آتے ہیں، اُن کو پیسے یا اناج دیتے ہیں، وہ اُن کے ماتھوں کو صندلی و سُرخ تلک طرح طرح کے لگاتے ہیں، مندروں میں سنکھ اور گھنٹے بج رہے ہیں، پوجا پاٹ ہو رہے ہیں، یا اب وہاں کتے لوٹ رہے ہیں، دس پانچ کنگال جدا جدا پڑے ہیں جنکی صورتوں سے گھن آتی ہے، کچھ مفلسوں کے گھر آباد ہیں، اِن گھاٹوں میں ایک مسجد بھی تھی۔ سنکھ اور اذان کی آوازیں ہم ساز تھیں، وہ اب بھی آباد ہے۔ اِس دروازے کے پاس ہندوؤں نے چندہ کر کے فصیل توڑ کر ایک کھڑکی خوبصورت بنائی ہے اور اُسکے آگے ایک آہنی پُل بنا کر سڑک مرگھٹ تک بنائی ہے، اس کھڑکی میں سے پُل پر سے ہندوؤں کے مُردے ارتھیوں میں مرگھٹ پر جلنے جاتے ہیں۔ ہندوؤں نے بہت کوشش کی کہ جمنا اِن گھاٹوں کے نیچے بہے، اسکے لئے ایک نالہ بنایا مگر برسات نے اُسکو توڑ تاڑ برابر کیا۔ جمنا کے حال میں ہم لکھینگے کہ پہلے اسکا کیا حال تھا اور اب کیا ہے۔

(۳) کسیلے گھاٹ کا دروازہ

یہ دروازہ بھی شاہجہانی نہیں ہے، سرکار کمپنی نے اُسکو فصیل کی مرمت کے ساتھ بنوایا ہے، غدر سے پہلے اِس دروازے پر آدمیوں کی چنداں آمد و رفت نہیں رہتی تھی۔ مگر وہ میگزین کے پاس تھا اسپر تلنگوں کی ایک کمپنی کا جنگی پہرہ رہتا تھا، اِسکے تلنگے اِس دروازے کے باہر فصیل کے ایک دھس کے نیچے اپنا چوکا برتن کیا کرتے تھے، دال روٹی پکاتے تھے۔ کالج بھی قریب تھا اسکے بعض شریر لڑکے فصیل پر چڑھ کے اُن کے چوکے میں کوئی چیز پھینکدیتے تھے، جسکے سبب سے انکا پکا پکایا کھانا حرام ہو جاتا تھا، اِسکی شکایت اُن کے

افسروں نے کالج کے پرنسپل سے کی جسکے سبب سے یہ حکم ہوا کہ جو لڑکا اس فصیل پر چڑھیگا اُسپر جرمانہ کیا جائیگا۔ اب نہ وہ میگزین ہے نہ کالج ہے نہ تلنگوں کا پہرہ چوکی ہے، نہ اُنکا چولھا توا ہے، دروازہ ہمیشہ کھلا پڑا رہتا ہے، اُسکو کوئی بند بھی نہیں کرتا

(۴) لال دروازہ

یہ دروازہ بھی شاہجہانی دروازے کیطرح کا پٹا ہوا تھا وہ سنگ سُرخ کا بنا ہوا دروازہ تھا۔ اُسکے پٹاؤ کے نیچے فرش ڈھلوان تھا، اس میں غدر سے پہلے آدمیوں کی آمد ورفت چنداں نہ تھی مگر ڈھونڈ نگر اسکی راہ سے جمنا تیر کر پار چرنے بہت جاتے تھے، اب وہ بند ہوگیا۔ شہر کے یہ چار دروازے دریا کی سمت جنوبی میں سے جنمیں کوئی شاہجہانی دروازہ نہ تھا۔

(۵) کشمیری دروازہ

یہ شاہجہانی کشمیری دروازہ مثل اور دروازوں کے اکہرا تھا مگر منیجر رویت ملٹری بنگال انجنیر نے اسکو دُھرا دروازہ ایک آنیکا دوسرا جانیکا بنا دیا اور اُسکے آگے ایک چوک گھیر کر اُسکی دیوار چونے اور اینٹ کی بنوائی، اس چوک میں بہت سے مکانات بنوائے جنمیں تلنگے اور اُنکا افسر لفٹنٹ رہتا تھا۔ غدر سے پہلے ان تلنگوں کی ایک کمپنی کا پہرہ رہتا تھا۔ اسکا سبب یہ تھا کہ اس دروازے کے باہر سول لین اور سپاہ کی چھاؤنی تھی اور خزانہ اسکی بغل میں تھا، اس دروازے کے ساتھ ایسی خصوصیتیں تھیں کہ کسی اور دروازے کے ساتھ نہ تھیں کہ نہ کسی ہندو کی ارتھی نہ کسی مسلمان کا جنازہ، نہ بیلوں کی گاڑی چھکڑا اسباب سے لدا ہوا جانے پاتا تھا نہ کوئی براتِ ہندو مسلمانوں کی جاسکتی تھی، اس دروازے کی ایّامِ غدر کی

سرگزشت میری تاریخ ایّام غدر میں پڑھو۔ بعد فتح دہلی اس احاطے میں پولیس اسٹیشن تھا مگر اب ایک طرف اسکے دو خوبصورت کوٹھیاں بنگئی ہیں۔ دوسری جانب کے مکان ویران پڑے ہیں۔ اُسکے چوک اور کچہری کے احاطے کے درمیان لوہے کا جنگلہ لگ گیا ہے، دروازے کے باہر پُل پر ایک جنگلہ لگا ہوا ہے، جو آنے جانے کے رستوں میں حدِّ فاصل ہے۔ دونوں دروازوں کے بیچ میں باہر کیطرف ایک پتھر لارڈ ہیبر بگلا رنے نصب کرایا ہے، جسپر اُن مردانِ دلاور کے نام زندہ جاوید ہو رہے ہیں، جنھوں نے اپنی جانیں ایّام غدر میں اِسکے کواڑوں کے باروت سے اُڑانے میں قربان کیں۔

(۶) موری دروازہ

یہ دروازہ شاہجہانی نہیں ہے، یہاں ایک مرہٹے سردار کی حویلی شاہ عالم کے زمانے میں تھی، اُسنے اپنی حویلی کے لئے یہ دروازہ اِسلئے بنایا تھا کہ اگر کوئی کڑا وقت آئے تو وہ اِس دروازے کی راہ سے شہر سے باہر بھاگ جائے، شہر کے اندر دشمن اُسکو نرغہ نہ کرلیں۔ اِس دروازے کی سرگزشت میری تاریخ ایّام غدر میں پڑھو، غدر سے پہلے اِسکے پاس شہر کے اندر بڑے بڑے اُمرا کے مکانات اور حویلیاں تھیں۔ غدر کے بعد یہ دروازہ بالکل مسمار ہوکر ایک چوڑا راستہ شہر سے باہر جانیکا ہوگیا، حویلیوں کی صورتیں تو کچھ انگریزی سپاہ کے لوگوں نے بگاڑیں اور کچھ اور طرح سے بگڑیں، اُن کی ہندوستانی صورت انگریزی صورت میں تحویل ہوگئی۔ کیا پہلے وہ مسلمان اُمرا کی بڑی حویلیاں تھیں، یا اب انگریزی وضع کی کوٹھیاں ہیں، ایک ہندوستانی حویلی نے مورتھ برگ ہوٹل میں اپنی جون بدلی ہے، غرض اِس دروازے کے آس پاس شہر کے حصے کی ایسی صورت بدلی ہے کہ وہ پہچانا نہیں جاتا کہ غدر سے پہلے اِسکی کیا شکل تھی، بازار نیا بنا ہے اس میں انگریزی

اسباب کی زیادہ دکانیں ہیں۔ کشمیری اور موری دروازے کے درمیان فصیل کے اندر پہلے اِتنی انگریزی وضع کی کوٹھیاں نہ تھیں جتنی اب ہیں۔

(۷) کابلی دروازہ

موری دروازے سے آگے کابلی دروازہ ہے جو غدر سے پہلے اپنی شاہجہانی صورت رکھتا تھا، لیکن غدر کے بعد وہ ڈھا دیا گیا، فصیل توڑ کر بہت چوڑا راستہ شہر سے باہر جانے کا بنا دیا گیا ہے۔ ریل کا کوئین بُرج اِس دروازے کے پاس بنایا گیا ہے، پہلے اِس دروازے کے پاس سے فصیل کے ایک جنگلے کی راہ سے شہر میں نہر آتی تھی، سو اب بھی آتی ہے۔ اِسکے پاس بھی ریل کے سبب سے بہت سی حویلیوں کی صورت بدل گئی ہے۔ پہلے مکانات کی اب کوٹھیاں بنگئی ہیں اسباب تجارت کی آمد و رفت کی آسانی کے لئے ایک چھوٹا دروازہ فصیل کو توڑ کر بنایا ہے اور اس سے ایک سڑک ریل کے ڈفرن بُرج سے ملائی ہے، اس دروازہ کے پاس نواب وزیر کی حویلی تھی جسکے چوبیس چوک مشہور تھے۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر کچھ اور ہی صورت کی ہو گئی ہے، اب کوئی اُسکا نام بھی نہیں لیتا، اُس کے ٹکڑوں کے نام کچھ اور لئے جاتے ہیں۔

(۸) لاہوری دروازہ

کابلی دروازے سے آگے لاہوری دروازہ شاہجہانی تھا، اِس دروازے پر آمد و رفت اِس کثرت سے رہتی تھی کہ اسکی وسعت اسکے لئے کافی نہ تھی، اس کی تنگی تکلیف دیتی تھی، اسلئے غدر سے تین چار برس پہلے اسکو ڈھا کر بہت چوڑا اُدھر اور دوسرا ایک آنیکا دوسرا جانیکا بنایا۔ پھر غدر کے بعد یہ نیا دروازہ بھی اور اُسکے آس پاس

کی فصیل کا کچھ حصّہ ڈھایا گیا اور اِس شہر کے باہر ایک نیا بازار بننا شروع ہو گیا، جسکا نام صدر بازار رکھا گیا، اِس دروازے اور اُسکی کچھ فصیل ڈھانے سے کھاری باولی اور صدر بازار میں کوئی حدِّ فاصل باقی نہیں رہی۔ باہر کی آبادیاں، تیلی واڑہ، ہندوراؤ کا باڑہ، کشن گنج و پہاڑ گنج شہر کی آبادی سے ایسے ملگئے کہ وہ اُسکے بڑے محلے معلوم ہونے لگے، جسکے سبب سے شہر کی وسعت اور آبادی سوائی ڈیوڑھی ہوگئی۔ شہر کے اُسطرف آبادی بڑھتی جاتی ہے اور اُسمیں رونق اور زیب و زینت شہر کی آبادی سے ذرا بھی کم نہیں، اسکے بازار چاندنی چوک کے بازاروں سے کم نہیں۔ مکانات کا کرایہ اور اُن کی قیمت شہر کے آباد محلّوں سے کم نہیں۔ غرض اس آبادی نے اور اُس کے بازاروں نے شہر کی رونق کو دوچند کر دیا ہے۔ اب اس دروازے کے باہر متھرا اور دہلی کی ریل کا اسٹیشن بنا ہے اور الگزینڈر یم دے کا ایک بڑا کارخانہ بن رہا ہے۔

(۹) اجمیری دروازہ

لاہوری دروازے کے آگے شاہجہانی دروازہ اجمیری دروازہ ہے مگر اِن دونوں دروازوں کے درمیان ایک فراش خانہ کی کھڑکی ہے۔ اِس کھڑکی کے قریب پر دہلی متھرا کی ریل کا ایک چوبی پل بھی بنا ہے، جسکے سبب سے مسلمانوں کو شہر کے باہر چکر کھا کر اپنے جنازوں کو قبرستان میں لے جانا پڑتا ہے۔ اجمیری دروازے کی کلائی ڈھا کر ایک سڑک بنائی گئی ہے جو قطب کو جاتی ہے، اس دروازے کے پاس ریل کا ایک کارخانہ ہے جسمیں تعمیر عمارات کا مسالہ پتھروں اور کاٹھ کا جو ریل میں آتا ہے، اُترکے سارے شہر میں جاتا ہے، جسکے سبب سے ٹھیلوں کا تار نہیں ٹوٹتا۔ لاہوری دروازے سے اجمیری دروازے تک فصیل کے باہر متھرا دہلی کی ریل کے سبب سے بالکل شکل بدل گئی۔ ریل کا اسٹیشن اور بہت سے اور مکانات ریل کے متعلق بن گئے ہیں۔ شہر کے باہر اُسطرف چونے کے بھٹوں اور پزاوں

کی قطاریں ننگی ہیں اور چونہ پیسنے کی بہت چکیاں چلتی ہیں۔

(۱۰) ترکمان دروازہ

اجمیری دروازے سے آگے شاہجہانی دروازہ ترکمان دروازہ ہے جو اپنی حالت پر بدستور قائم ہے مگر اُسکے کواڑ مثلِ دیوار کھڑے رہتے ہیں، کبھی اُنکو جنبش نہیں ہوتی۔

(۱۱) دِلّی دروازہ

ترکمان دروازے کے آگے دِلّی دروازہ ہے جسکی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ پُرانی دِلّی اُسکے سامنے ہے اور اُسکے محاذی پُرانی دِلّی کا کابلی دروازہ بھی نہایت خوبصورت کھڑا ہے، اِس دروازے سے لگی ہوئی دریا گنج کی چھاونی ہے، جسکی سپاہ قواعد کیلئے جب اِس دروازے سے گزرتی تھی تو مویشیوں کی آمد و رفت اسکی صف بندی میں خلل ڈالتی تھی اِسلئے اِس دروازے سے تھوڑی دُور پر فصیل کو توڑ کر اور کھائی کو پاٹ کر اُسکے اوپر دیوار کھینچکر پُل کیصورت بنادی ہے اور دروازے کے اوپر ایک کالا بورڈ لگادیا ہے جس میں لکھا ہے کہ "دِلّی دروازے کے اندر سے کوئی مویشی آنے جانے نہ پائے" انکی آمد و رفت نئے پھوٹے دروازے سے رکھی جائے اس دروازے کے ایک کواڑ کی چول ٹوٹ گئی تھی، حکام نے اُسکی مرمت نہیں کرائی بلکہ اُسکے دونوں کواڑ اُتار کر میوزیم میں اُٹھوا دیے، بس اب یہ دروازہ بن کواڑوں کا رہ گیا۔ اجمیری دروازے سے دِلّی دروازے تک فصیل کے باہر یہ تغیر ہوا ہے کہ پہلے میدان تھا اب اُسمیں گھوسیوں نے اپنے رہنے کے کچے مکان چھپر کے بنالیے ہیں اور اُنکی گائیں بھینسیں وہیں رہتی ہیں، اسلئے شہر اُن کی غلاظت سے پاک و نظیف ہوگیا ہے

اِس دروازے سے آگے تھوڑی دُور پر دریا کے کنارے تک شاہجہانی فصیل اور خندق دونوں ختم ہوگئی ہیں۔ یہاں دریا کیطرف سرکار کمپنی نے اپنی چھاونی

دریا گنج کی محافظت کیلئے فصیل قلعہ کی کھائی تک چونے اور پتھر کی بنائی تھی۔ مگر اسکی صورت جابجا فصیل کی نہیں رہی بلکہ اُسکی جگہ لوگوں نے اینٹ چونہ کی دیواریں بناکر اُنپر کوٹھیوں کے دروازے بنائے ہیں کہ دریا کی سیر خوب دکھائی دے۔

(۱۲) زینت المساجد کا دروازہ (۱۳) راجگھاٹ کا دروازہ

اِس جدید فصیل میں دریا کیطرف دو دروازے زینت المساجد اور راجگھاٹ کے ہیں۔ زینت المساجد کے دروازے کے سامنے پہلے جمنا کی کشتیوں کا پُل تھا، جسپر سے جمنا پار سے بڑی آمدورفت شہر میں رہتی تھی۔ جسکے سبب سے ہر وقت اِس دروازے پر میلا لگا رہتا تھا۔ مگر یہ پل غدر سے چند سال پیشتر سلیم گڈھ کے نیچے بدل گیا تھا تو پھر یہاں سنسان ہو گیا، فصیل کے اندر راجگھاٹ کے پاس پتھر گھٹی کا محلہ تھا وہ مسمار ہو گیا، اِس میں بہت سے مندر تھے، اب صرف یہ دروازہ رہگیا ہی جو بہت نشیب میں ہی جب برسات میں دریا چڑھتا ہے تو اِس دروازے میں پانی بھر جاتا ہے اسمیں نیچے اُترنیکا زینہ بنا ہوا ہے، اِسکے باہر دو چار گھاٹ بھی ہیں۔ تھوڑے سے ہندو اِس دروازے سے جمنا نہانے جاتے ہیں۔ فصیل کے باہر گھاس پھوس کی سرسبزی رہتی ہے۔

(۱۴) خضری دروازہ۔

یہ دروازہ قلعہ کے اندر اُس چوک کی کرسی کے نیچے ہے جو بڑی بیٹھک اور دیوان خاص کے درمیان ہے، اِس دروازے کے آگے غدر سے پہلے پتنگ بازی و کبوتر بازی ہوتی تھی۔ ہاتھیوں کی آپس میں اور ریلیوں کی باہم اور رینڈھوں کی آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں، اب یہاں اِن سیر تماشوں میں کوئی نہیں ہوتا۔ دھوبیوں کے پتھروں پر کپڑوں کی سِلوں پہ شناشن ہوتی ہے۔ کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ جہاں بادشاہ کے درشن رعایا کیا کرتی تھی یا اب دھوبیوں کے کپڑے سوکھتے ہیں۔

(۱۵) سلیم گڈھ کا دروازہ

سلیم گڈھ میں یہ دروازہ نیل کی چھتری کے سامنے تھا اور بجنسہ بند رہتا تھا اب تیغہ ہو گیا ہے۔

خلاصہ

شاہجہاں نے دریا کی جانب میں خضری دروازہ کے سوا کوئی دروازہ نہیں بنایا اسکے سوا سات دروازے تین مشرق میں اور چار جنوب میں دریا کی جانب میں پیچھے بنائے گئے ہیں۔ ان دروازوں میں کچھ تکلف نہیں ہے، فصیل کو توڑ کر کواڑ لگا دیے ہیں، شاہجہانی دروازے بڑے خوبصورت بنے ہوئے ہیں۔ ایک دروازہ اندر ہے دوسرا باہر، دونوں دروازوں پر چھپت لداؤ کی پٹی ہوئی ہے اور اُسپر کنگورے دار نرگس داں بنی ہوئی ہیں، دروازوں کے چاروں کونوں پر ہشت پہل دیواریں کھڑی ہیں اور اُنپر خوبصورت کنگورے بنے ہوئے ہیں۔

ذکاء اللہ۔

---

faces between the rod and air, or between the rod and water is fixed. To arrange the equilibrium, only the surface be tween the liquid and the air is moveable, and this is the reason that sometimes the surface of water seems to be depressed near the rod, and sometimes, according to its nature it seems to be raised about the general level of the liquid.

Now take the case of water, air, and a glass tube of narrow bore. Water in the tube will be raised above the level of water.

If we take two tubes of different bores, water will rise to the greater height in the tube of narrower bore, than in the other and the height to which it will rise is given by

$$h = \frac{2 \, T \cos a}{r \, g}$$

∴ for the same liquid the height risen is inversely proportional as the radius of the tube.

Liquid will rise up for all values of a less than 90^0, in the case of the angle of 90^0 it will neither rise nor be depressed and in the case of the angle of more than 90^0, the value of h will be negative, and hence it will be depressed.

Soil in the fields, and large lumps of clay are supplied with water with the help of this attraction. Blotting paper helps in blotting only by this means.

Take some water and dissolve some salt in it. Place one end of a wick in the solution and keep the other vertical. Water, together with the salt in solution, will rise up. In this way all the salts contained in manure which is supplied to poor soil dissolve in water, when water is present, and consequently, plants get nourishment from the materials held in manure, and dissolved in water.

No doubt there are some other things, such as osmotic pressure, etc. which help the trees and plants to get water and materials far necessary for their growth. But capillary attraction which also plays a greatest part in this respect.

In a stormy sea, sailors throw oil or sand soaked with oil, on to the surface of the water to reduce the surface tension in the one part of the sea, near the ship, and consequently to lessen the effect of the waves or the breakers on the ship.

KHUDA BAKHSH.

contractile force of the filus, consequently if we introduce are open glass tube, into the bubble the latter will grow smaller till it disappears.

The effect of Surface Tension on Liquids.

When a drop of a liquid is free from allbut its own molecular force, we find that it assumes a perfectly spherical form. To prove this we take two liquids which, when in contact, do not mix with one another. To eliminate the effect of gravity, they should be of equal densities. Carbon dsulphide tinged with Iodine, and a solution of Zinc Sulphate will serve the purpose. By means of pupette, introduce Carbon disulphide solution in the zinc sulphate solution and lowly and carefully allow it to flow from the pipette. The spherical forms of Carbon disulphide will be seen through' the solution. The surface of the Carbon disulphide drops will be attracted towards the interior of the drops, and it would seem as if it were surrounded by an elastic membrane. The surface of the drop will, behave just like a membrane, and will oblige the sphere to keep its spherical form.

Now of all the figures of the same exterior surface, it is the sphere, which has the smallest volume. Now as the drops of a liquid are obliged to keep this spherical forms the surface tension therefore tends to make the drop as small as possible. Rain drops and dew drops have their spherical form by virtue of this surface tension.

The property of surface tension has been utilised from time immemorial. Shot towers were formed to make lead shots. Lead was melted on the top of the towers and then it was poured into a sieve from which it dropped down in the form of small balls, being condensed before it touched the surface of a vessel, of water below.

3. *Capillary attraction* :—

If we place three liquids which do not combine with one another, in contact, they will assume a position of equilibrium depending on the values of the surface tension for the three liquids.

Now suppose that the three things in contact, are a solid, such as a glass rod, a liquid, and third a gas, say air. In this case the direction of the surface tension along the sur-

surface tension of water is greater than that of alcohol. Again to prove the fact that surface tension varies with the amount of a substance dissolved in the liquid , place a piece of camphor on the surface of water ; it will swim hither and thither just like a living thing. The cause is this that camphor dissolves in water from all sides, but not in equal quantities, and when it dissolves in greater quantity on one side than on the other, the surface tension becomes less in one direction than in the other, and consequently the camphor is attracted towards the other side. We can also see this fact by changing the surface tension in the case of a shallow layer of water, by bringing a glass rod already dipped in ether, over the surface of water.

Soap Films :—If a metal ring is dipped in a soap solution, and a small loop of cotton or silk, already moistened with the solution be placed on the film, this loop can be made to take up any form, and it retains that form because surface tensions inside and outside the loop balance each other and the loop remains as it is ; but on breaking or piercing the film within the loop, as the thread will be attracted equally from all sides, it is natural that the loop must take the circular form. Now it is a mathematical problem that of all the fiqures having equal perimeter, it is the circle which has the greatest area ; and as the loop is obliged to take the form of a circle, it is plain, that the remainder of the film tends to occupy as small an area as is possible.

This surface tension can be measured practically in the case of soap films, but the calculation and experiments must be very delicate to give correct and accurate results.

Take a rectangular wire as shown in the figure; dip this frame in a soap solution, and a film will be formed; now wire ED will take a fixed position, then knowing the length of this wire and the weight W we can calculate surface tension of the film, but as the film has two sides the surface tension, then, will be equal to $\frac{wg}{L} \times \frac{1}{2}$ where G = gravity L = length of the wire W = wt. attached to it + wt. of wire. For the purpose above mentioned, it is convenient to use a frame as shown in the figure.

E D. W

Now we know that in case of a soap bubble the pressure of the air inside the bubble fails completely to balance the atmospheric pressure outside and the

of liquid will stick to the rod, owing to the molecular forces between the solid molecules and the liquid molecules. If we add more water to the small quantity already stuck to the rod, a drop will be formed at the lower end of the rod which will remain there till it is too large or too heavy to be pulled back by the molecular attraction when it will fall to the ground, owing to another attraction—gravity which acts upon it. Similarly it can be proved and shown that there is a great attraction between the molecules of liquids,

(2). Surface Tension is caused by these molecular attractions.

Take the case of a liquid, say water, and of a molecule A, which lies in the interior of the liquid.

If we describe a sphere round the molecule A, with A as centre and the range of molecular forces as radius: then all the molecules outside this sphere have no molecular attraction upon the molecule A. So the molecule A will be equally attracted from all sides, by the molecular attractions of those molecules which are within the sphere. Take the case of another molecule (B) nearer the surface of the water, suppose that the sphere round it partly lies above the surface of water, then the molecular forces which influence it will not balance one another, and consequently the molecule will be attracted towards the interior of the liquid. Another molecule which is on the surface, will be attracted towards the interior of the liquid with still more attractive force. In short these surface molecules will be attracted towards the interior with moer force, than any others nearer the interior of the liquid. It is clear that all the molecules on the surface of a liquid, are drawn towards the interior part. Hence the phenomena of surface tension. Surface tension varies with the nature of a iiquid as well as with its temperature. Even a slight change in the nature of a liquid has a considerable effect upon the surface tension. Surface tension hinders evaporation, and at the critical temperature it vanishes.

To illustrate that surface tension varies with the liquid, take a shallow layer of water, and bring a drop of alcohol by means of a glass rod, and slowly and carefully place the drop on the surface of the water; water will be attracted from the place where the drop touches the surface, and will show that the

(1). Constitution of matter;—matter is regarded by the chemist and the physicist as composed of aggregations of minute particles; every substance whether solid, liquid, or gaseous consists of a vast number of extremely small particles called molecules. These molecules exert forces upon one another, which according to their nature are of two kinds, physical or chemical. Physical forces are those which do not tend to break these aggregations or, in other words, the integrity of the molecules, while chemical forces are those which,' when brought into play, change the nature of the molecules.

The attractive forces play an important part in the economy of nature, and always have a great effect keeping the molecules in position. But these molecular forces are sensible only when the distances between the molecules are exceeding small that is, when the distance is too small to be measured by any known means. They exert their influence in solids, as well as liquids.

An example of this molecular attraction is seen in the manufacture of lead pencils when lead pencils are formed out of graphite, some powder or sawdust is left behind, this is collected and exposed to a great pressure so that the molecular attractions come into play and this powder is converted into a solid mass and then sawn to form some inferior sort of pencils. Examples might be multiplied to prove the fact that there is a great molecular attraction between the molecules of solids. If two pieces of lead which have quite bright and even planes of contact, be pressed together with a slight screwing motion, they adhere as if the formed one mass. The process of gilding, silvering, nickelsing are the practical uses of these molecular forces. In the cement used in buildings, these molecular forces are very great.

This molecular attraction is not exerted by the solids alone, but it may be seen in the case of a solid and a liquid, in which case it was formerly given the name of adhesion. Formerly there were two distinct terms applied to the molecular forces exerted by the liquids and solids. Forces between the liquids and solid molecules were called by the name of adhesion, while those betweea the molecules of the same liquid were called cohesion, but now both of them come into the one and the same head, 'molecular attraction.'

If we dip a glass rod in water and take it out, a portion

always a pier stretching out into the sea and used by the visitors as a promenade and there are also one or more concert halls or theatres. Golf is also nowadays so much played that no big seaside resort would be complete unless there were golf links quite close. I think I have now mentioned all the usual " attractions " of an ordinary seaside holiday resort.

It may be thought that if our holiday resorts are so much alike there cannot be much change for a visitor in merely going year after year from an inland house artificially organised for business to a seaside town artificially organised for holiday-making, and in fact one of our newspapers remarked the other day that the most difficult thing to do at a pleasure resort is to persuade oneself that one is obtaining pleasure. But this is rather a cynical view for it is a man's our fault (given ordinary good health if he cannot on his holiday obtain the best and purest of afl physical pleasures life and movement in the open air in the country away from towns and buildings whether inland or seaside. My little holiday resort in Wales, for instance. is an ideal spot for this. Half an hour's walk will take one out of sight of the houses, an hour's walk out of sight of the town, and then one can walk (and I often have done) all day without meeting anybody—over beautiful hills with more beautiful views of other hills beyond—down wooded vallays with clear streams straight from the mountains, so cool and clean that a bath in their pools is as much to be preferred for pure pleasure to a bathe in the sea as (let us say) an apple is to be preferred to a raw potato. One of our best prose writers of recent years thought so too. "To wash (he says) in one of God's rivers in the open air seems to me a sort of cheerful solemnity or semi-pagon act of worship. To dabble among dishes in a bedroom may perhaps make clean the body; but the imagination takes no share in such a cleansing" *R. L. Stevenson*; (Travels with a Donkey) such a life is indeed both change and rest and exercise all combined in one.

G. P. GOODALL.

Essays of the Scientific Society—No. 2.
Surface Tension

The title of my paper is Surface Tension in general, but as the subject is a wide one and beyond the scope of a paper like this, I will confine my remarks to the discussion of a few simple experiments, illustrating the subject.

But as to the visitors : the place will be full (during the summer months) of English families lodging in furnished rooms in the terrace houses and staying only for short periods, each family quite possibly knowing no other family in the town. The object of their visit is to obtain a change from their ordinary surroundings and daily life and to take rest and healthy exercise, of which latter they partake according to their tastes in very various proportions. The children spend the greater part of the day on the beach, paddling with bare feet and legs in the sea, or digging with toy spades in the sand, or riding on donkeys (a great treat for a little town child) or listening to a troop of inferior musicians and singers with blacked faces who are a standing institution in most holiday places. The children's mothers will perhaps begin the day (after breakfast) by "shopping" in buying the food for the family and probably the rest of their day will be spent in watching the children, at the same time reading a novel from the circulating library or doing a little needlework. The men will first of all buy a newspaper—for however much the average Englishman may talk about enjoying a change he cannot exist without his daily paper—then they may lounge about doing nothing,—or play cricket on the sands, or help to look after the children, or take a boat and row for an hour or two, or go off for walks in the country or excursions to places of interest such as old castles or abbeys, waterfalls or woods, or perhaps simply to the next seaside resort along the coast to see what it looks like. All the visitors—children, mothers and fathers seem to buy a large number of picture post cards to send to their friends and the Post Office must nowadays carry a largely increased number of post cards since the introduction of this craze. (I remember once seeing a man at the summit of Snowdon who spent the whole of his time between his arrival at the summit and starting to descend in eating a large meal and addressing picture post cards to let his friends know he had reached the top. To him those who anxiously kept watch to have a good view from the top of the mountain would probably appear foolish sentimentalism.

There is generally a fair amount of sea-bathing at holiday resorts but the bathing-vans are stuffy and uncomfortable and it is preferable to go a little way outside the town before breakfast where one may undress on the sands with plenty of fresh air and elbow room and the sun and wind to assist the towel. This would not be allowed within the limits of the houses. At large seaside resorts there is nearly

numbers have increased, our buildings, funds and staff have not increased even in equal proportion. Ten or fifteen years ago Aligarh was *pice generis* in its ideals and methods of training. To this the College owes the position it actually won. But times have changed. Other Colleges have taken the good parts of Aligarh system, and, profiting by our experience, have been able perhaps to avoid some of the faults inevitable in a pioneer institution. Thus nowadays we have many competitors, some better equipped than ourselves in certain directions. This competition is not a fact to be deplored; on the contrary we ought to be glad of such an opportunity for fresh effort. We must overhaul our machinery revise our methods. Aligarh with nearly 1000 members cannot be run on exactly the same lines as in the days when our venerable founder could take his boys for a drive in two or three carriages.

Letters from England Number IX.

DEAR MR. EDITOR, *August 1907.*

Last month I spent a short holiday at a small Welsh seaside holiday resort. I do not think that seaside holiday resorts are such a well recognised part of life in India as here, and perhaps therefore a few notes about my holiday may interest your readers.

First, as to the place. Imagine a beach by the seashore, chiefly of shingle but with a certain amount of sand, with scores of small wooden huts on wheels called bathing-vans which are used by bathers for the purpose of undressing and dressing; above the beach a broad road or pathway from a quarter to half a mile in length (called the parade or promenade) with grass, covered and uncovered, and here and there a few automatic penny in the slot machines; behind the beach a terrace of brick or stone houses three-storeys high, all of the same or very similar design and every one used as a lodging-house for visitors; behind this terrace the railway line and behind that more terraces of similar houses and the house with its shops and the houses of the permanent inhabitants of the place. Such is a typical English seaside holiday resorts; I say *English* because, although the particular one I have in mind is in Wales, yet most English ones are of the same kind and the Welsh seaside resorts exist for (and by means of) English visitors.

The Duty deputations up to the middle of September had not very encouraging reports to make of their progress. The following extract from the Pioneer will show however that the prospects of the Rangoon deputation are very fair and we hope that it at any rate will be successful.

RANGOON, 19TH SEPTEMBER.

A large meeting of the Mahomedans of Rangoon was held last evening under the presidentship of Sir Charles Fox, Chief Judge, to welcome four members of the Duty Deputation from Aligarh, viz:—Mr. T. A. K. Shervani, (Secretary), Mr. A. Siddiki, Mr. M. Obeidullah, and Mr. A. Siddiki. The chairman opened the proceedings by introducing the members who were accorded a hearty welcome. Mr. A. R. Siddiki gave the past history of Aligarh College, and related what the late Sir Syed Ahmed had done to promote higher education, in which he was more than successful. The aims in establishing the College were briefly sketched, and it was hoped it would expand into a Mahomedan University, and bring about a speedy regeneration. The deputation, had come to Burma with a definite scheme, namely ;—to collect funds for forwarding the boarding house income, of which a certain amount would be specially devoted to establishing a scholarship for a student from Burma. Owing to the absence of such accommodation, the College had to refuse admission to some 200 students recently. Other speakers expressed themselves in sympathy with the aims and object, which prompted the Duty deputation to visit Burma. The chairman closed the proceedings with an impressive address cordially supporting the endeavours of the deputation. The young men forming the deputation and the history of the College had strongly impressed upon him the belief that something could be done, if the community chose to do it, to raise their sons to a higher level of life, and to open to them the true benefit of a good sound education on proper lines.

The mention of work done for the College by the Duty Society gives rise to the thought which may be put in question form "Are we as a College keeping abreast of the times?" Much might be written in answer to this, but the following few lines must here suffice.

There never was greater need for earnest singlehearted effort on the part of the friends of Aligarh than now. Our

The Aligarh Monthly

October, 1907.

College Notes.

A magazine edited from a remote Kashmir village, whither any news of the outside world penetrates very slowly, cannot be expected to show an imposing series of items as College Notes. A master of descriptive writing could fill pages with his impressions of the beauty of this country; of its varied panorama of vale and mountain, forest and stream, skies and flowers; snow clad peaks and fertile fields; but such writers are rare in any land and it would seem a useless profanity to attempt—adequately to describe Kashmir.

The Nawab Mohsin ul Mulk, who is still in Bombay, has been circularising prominent Mussulmans throughout India with a view to expressing on behalf of the community the thanks of the Mussulmans to the Government for recognising so fully their claim to greater influence in the various Councils. The Nawab has also been congratulated in an open letter on the success of last year's deputation to H. E. the Viceroy, in which he took so prominent a part